دارالعلوم دیوبند کا ترجمان
دارالعلوم
جنوری
حبیب الرحمٰن قاسمی

باسمہ تعالیٰ

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

ماہ رمضان سنہ ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۹۹۸ء

جلد ۸۳	شمارہ ۱	فی شمارہ ۔/۶	سالانہ ۔/۶۰

نگراں: حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر: حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم۔ دیوبند، سہارنپور۔ یو۔پی

سالانہ بدل اشتراک:
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۔/۴۰۰ روپئے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۔/۱۰۰ بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۔/۸۰
ہندوستان سے ۔/۶۰

Ph. 01336-22429 Pin-247554

Composed by Nawaz Publications, Deoband

(۵) سال چہارم سال پنجم سال ششم سال ہفتم اور دورۂ حدیث کے امیدواروں کا امتحان داخلہ تحریری ہوگا امتحان ۱۱ر شوال المکرم ۱۴۱۸ھ سے شروع ہوگا۔

(۶) شعبۂ دینیات کے قدیم طالب علم کے لئے سال اول عربی میں داخلے کے واسطے پرائمری درجہ پنجم کی سند ضروری ہوگی نیز ان طلبہ کا فارسی حساب اور اردو املاء کا امتحان لیا جائے گا۔

اور داخلہ کے خواہشمند جدید طلبہ کے لئے پرائمری درجۂ پنجم کے مضامین کی صلاحیت ضروری ہوگی اور فارسی اردو، اردو رسم الخط اور صرف و نحو کی اصطلاحات کی جانچ ہوگی۔

سال چہارم، سال پنجم سال ششم سال ہفتم اور دورۂ حدیث کے لئے پچھلے درجات کی تمام کتابوں کا امتحان تحریری ہوگا۔

سال چہارم کے لئے قدوری (از کتاب البیوع تا ختم) ترجمۃ القرآن (سورۂ بقرہ یا سورۂ ق سے آخر تک) شرح تہذیب، نفحۃ العرب اور کافیہ یا شرح شذور الذہب یا شرح جامی کا تحریری امتحان ہوگا۔

سال پنجم کے لئے کنز الدقائق مع شرح وقایہ ثانی یا شرح وقایہ اول، دوم اصول الشاشی، تلخیص المفتاح یا دروس البلاغۃ، ترجمۃ القرآن (آل عمران تا سورۂ مریم) (سورۂ یوسف سے سورۂ ق تک) اور قطبی کا تحریری امتحان ہوگا۔

سال ششم کے لئے ہدایہ اول، نور الانوار، مختصر المعانی، سلم العلوم، مقامات حریری کا تحریری امتحان ہوگا۔

سال ہفتم کے لئے جلالین، ہدایہ ثانی، حسامی، میبذی، دیوان المتنبی کا تحریری امتحان ہوگا درجہ ہفتم میں داخلہ کے لئے قرآن کریم صحیح مخارج سے پڑھنا لازم ہوگا۔ دورۂ حدیث کے لئے ہدایہ آخرین مشکوٰۃ شریف، شرح عقائد نسفی، نخبۃ الفکر اور سراجی کا تحریری امتحان ہوگا، نیز پارۂ عم صحیح مخارج کے ساتھ حفظ ہونا ضروری ہوگا اس کا امتحان بروقت لیا جائے گا۔

(نوٹ) اپنی سابقہ تعلیم کی کوئی بھی سند کسی کے پاس اگر ہو تو داخلہ فارم کے ساتھ منسلک کردیں۔

(۷) سال اول و دوم میں نابالغ بیرونی بچوں کا داخلہ نہ ہوگا۔

(۸) جو طالب علم اپنے ساتھ صغیر السن بچوں کو لائے گا ان کا داخلہ ختم کردیا جائے گا۔

(۹) جن امیدواروں کی وضع قطع طالب علمانہ نہ ہوگی مثلاً غیر شرعی بال، ریش تراشیدہ ہونا ٹخنوں سے نیچے پاجامہ ہونا یا دارالعلوم کی روایات کے خلاف کوئی بھی وضع ہو ان کو شریک

امتحان نہ کیا جائے گا اور اس سلسلے میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔
(۱۰) سرحدی صوبوں میں سے آسام و بنگال کے امیدواروں کو تصدیق نامہ وطنیت پیش کرنا ضروری ہوگا تصدیق نامہ کی اصل کاپی پیش کرنا ضروری ہوگا فوٹو اسٹیٹ کاپی قبول نہیں کی جائے گی اور یہ تصدیق نامہ وطنیت کسی بھی وقت واپس نہ ہوگا۔
(۱۱) جدید امیدواروں کو لازم ہوگا کہ وہ دارالعلوم میں آتے وقت تاریخ پیدائش کا سرٹیفکٹ لیکر آئیں یہ سرٹیفکٹ کارپوریشن میونسپل بورڈ ٹاؤن ایریا یا گرام پنچایت کا ہونا ضروری ہے۔
(۱۲) جدید امیدواروں کے لئے سابق مدرسہ کا تعلیمی و اخلاقی تصدیق نامہ اور مارک شیٹ (نمبرات کتب) پیش کرنا ضروری ہوگا۔
(۱۳) نجی تصدیقات یا سماعت کا اعتبار نہ ہوگا۔
(۱۴) غیر ملکی امیدوار تعلیمی ویزا لیکر آئیں ٹورسٹ ویزا پر داخلہ نہیں ہوگا۔ فارم برائے شرکت امتحان کے ساتھ پاسپورٹ و ویزا کی فوٹو اسٹیٹ پیش کریں۔
(۱۵) بنگلہ دیشی امیدواران حسب ذیل علماء کرام سے تصدیق لیکر آئیں (۱) مولانا شمس الدین صاحب قاسمی جامعہ حسینیہ ارض آباد میرپور ڈھاکہ۔ (۲) مولانا حافظ عبدالکریم صاحب محلہ چوکی دیکھی سلہٹ، بنگلہ دیش۔
(۱۶) کیرالہ کے امیدواران مندرجہ ذیل علماء کرام کی تصدیق لیکر آئیں (۱) مولانا نوح صاحب (۲) مولانا حسین مظاہری (۳) مولانا محمد کویا قاسمی۔ یہ تصدیقات درخواست برائے شرکت امتحان کے ساتھ فوٹو اسٹیٹ کی شکل میں پیش کرنی ہوں گی داخلہ فارم کے اجراء پر اصل تصدیقات پیش کرنا ضروری ہوں گی۔
تنبیہ :- طلبہ کو خاص طور پر یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ امتحان کی کاپیاں کوڈ نمبر ڈال کر ممتحن کو دی جاتی ہیں اس لئے امیدوار صرف انہیں درجات کا امتحان دیں جن کی وہ تیاری کر چکے ہیں۔ بوقت داخلہ جدید فارم میں جو پتہ لکھا جائے گا اس میں آئندہ کبھی بھی کسی طرح کی ترمیم نہ ہوگی۔

قدیم طلبہ کے لئے

(۱) تمام قدیم طلبہ کے لئے بیس شوال تک حاضر ہونا ضروری ہے۔
(۲) جو طلبہ تمام کتابوں میں کامیاب ہوں گے ان کو ترقی دیجائے گی جو طلبہ دو کتابوں میں

ناکام ہوں گے ان کا ضمنی امتحان داخلہ امتحان کے ساتھ لیا جائے گا بصورت کامیابی ترقی دی جائے گی ورنہ بلا امداد سال کا اعادہ کر دیا جائے گا اعادۂ سال کی رعایت صرف ایک سال کے لئے ہوگی اور دوسرے سال بھی اعادہ کی نوبت آئی تو داخلہ نہیں ہو سکے گا۔

(۳) عربی سال اول میں مشق تجوید کے اور سال دوم میں جمال القرآن کے نمبرات بسلسلۂ ترقی درجۂ اوسط میں شمار ہوں گے بقیہ سالوں میں تجوید و کتابت کے نمبرات بسلسلۂ ترقی درجہ اوسط میں شمار نہ ہوں گے، البتہ فوائد مکیہ اور صرف عربی کے نمبرات ترقی و اجراء امداد کے سلسلے میں شمار کئے جائیں گے۔

(۴) حسب تجویز مجلس شوریٰ شعبان ۱۴۱۷ھ بقاء امداد کے لئے ۳۳ اوسط لانا ضروری ہوگا۔

(۵) تکمیل ادب میں صرف ان فضلاء کا داخلہ ہو سکے گا جن کا دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں اوسط کامیابی ۴۴ ہو اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ ہو۔

(۶) امیدواروں کے زیادہ ہونے کی صورت میں نمبرات اور انٹرویو کو وجہ ترجیح بنایا جائے گا۔

(۷) ایک تکمیل کے بعد دوسری تکمیل کے لئے ضروری ہوگا کہ امیدوار نے سابقہ تکمیل میں کم از کم ۴۵ اوسط حاصل کیا ہو اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ رہا ہو۔

(۸) ایک تکمیل کی درخواست دینے والے دوسری تکمیل کے امیدوار نہ ہو سکیں گے۔ الا یہ کہ ان کے درجۂ تکمیل میں تعداد پوری ہونے کے سبب ان کا داخلہ نہ ہو سکا ہو۔

(۹) دار الافتاء کے فضلاء کا کسی شعبہ میں داخلہ نہ ہوگا۔

(۱۰) جس کی کوئی بھی شکایت دار الاقامہ، تعلیمات یا اہتمام میں کسی بھی وقت درج ہوئی ہو اس کو دورۂ حدیث کے بعد کسی بھی شعبہ میں داخل نہیں کیا جائے گا۔

(۱۱) کسی بھی شعبہ میں داخلہ لینے والے قدیم فضلاء کی فراغت کے بعد ہی سند فضیلت دیجائیگی۔

(۱۲) کسی بھی تکمیل میں علاوہ افتاء کے داخلہ کی تعداد ۲۰ سے زائد نہ ہوگی اور وہ تعداد مقابلہ کے نمبرات کے ذریعہ پوری کی جائے گی۔

دیگر شعبوں کے بارے میں

دار العلوم دیوبند کا بنیادی کام اگرچہ عربی دینیات کی تعلیم ہے لیکن حضرات اکابر نے مختلف دینی اور دنیوی فوائد و مصالح کے پیش نظر متعدد شعبے قائم فرمائے، شعبۂ تجوید حفص اردو عربی، شعبۂ خوشنویسی، دار الصنائع وغیرہ۔ ان شعبوں میں داخلہ کے لئے درج ذیل قواعد پر عمل ہوگا۔

دارالافتاء(۱) دارالافتاء میں داخلہ کے امیدواروں کے لئے وضع قطع کی درستگی کی اہمیت سب سے زیادہ ہوگی اس میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔
(۲) دورۂ حدیث سے دارالافتاء کے لئے صرف وہ طلبہ امیدوار ہوں گے جن کا اوسط کامیابی ۴۵ ہوگا
(۳) کسی بھی تکمیل سے دارالافتاء میں داخلے کے امیدوار کے لئے سابق تکمیل میں اوسط ۴۶ر حاصل کرنا ضروری ہوگا۔
(۴) دارالافتاء میں داخلہ کی تعداد ۲۵ سے زائد نہ ہوگی اور کوشش کی جائیگی کہ معیار مذکورہ کو پورا کرنے والے ہر صوبے کے طلبہ کو داخلہ دیا جائے لیکن اگر کسی صوبہ سے کوئی امیدوار مندرجہ بالا شرائط کا حامل نہ پایا گیا تو دوسرے صوبوں سے یہ تعداد پوری کرلی جائیگی ان ۲۵ طلبہ کی امداد جاری ہوسکے گی
(۵) دارالافتاء میں ممتاز نمبرات سے کامیاب ہنے والے دو طلبہ کا انتخاب تدریب الافتاء کے لئے کیا جائے گا یہ انتخاب دو سال کے لئے ہوگا اور ان کا وظیفہ ۸۰۰ر روپے ماہوار ہوگا۔

شعبۂ دینیات، اردو، فارسی شعبۂ حفظ قرآن

(۱) شعبۂ دینیات اردو، فارسی اور شعبۂ حفظ میں مقامی بچوں کو داخلہ دیا جائے گا۔
(۲) دینیات کے درجۂ اطفال شعبۂ ناظرہ اور شعبۂ حفظ میں مقامی بچوں کا داخلہ ہر وقت ممکن ہوگا۔
(۳) دینیات کے بقیہ درجات میں داخلہ ذی الحجہ کی تعطیل تک کیا جائے گا اس کے بعد داخلہ نہیں کیا جائے گا

شعبۂ تجوید حفص اردو عربی

(۱) حفص اردو میں وہ طلبہ داخل ہوسکیں گے جو حافظ ہوں قرآن کریم ان کو یاد ہو اور وہ اردو کی اچھی استعداد بھی رکھتے ہوں نیز انکی عمر اٹھارہ سال سے کم نہ ہوں ان طلبہ میں ۹۰ کی امداد جاری ہوسکے گی۔
(۲) شعبہ حفص عربی میں ان طلبہ کو داخل کیا جائے گا جنہیں قرآن کریم یاد ہو اور وہ عربی میں شرح جامی یا سال سوم کی تعلیم حاصل کرچکے ہوں ان طلبہ میں دس کی امداد جاری ہوسکے گی۔
(۳) ان طلبہ کی پورے اوقات مدرسہ میں حاضری ضروری ہوگی۔

قرأت سبعہ عشرہ

(۱) اس درجہ میں داخلہ کے لئے حافظ ہونا ضروری ہے اور یہ کہ وہ عربی کی سال چہارم تک کی جید استعداد رکھتے ہوں۔

(۲)اس درجہ میں داخل طلبہ کے لئے حفص عربی سے فارغ ہونا ضروری ہے اوران کی تعداد دس سے زائدنہ ہوگی اور ان دس کی امداد مع وظیفہ خصوصی جاری ہو سکے گی۔

شعبۂ خوشنویسی

(۱)اس درجہ میں داخل طلبہ کی تعداد تیس ہوگی اوران کی امداد جاری ہو سکے گی۔

(۲)داخلہ کے امیدوار میں فضلاء دارالعلوم کوترجیح دی جائے گی۔

(۳)شعبہ میں مکمل داخلہ کے امیدواروں کوامتحان داخلہ دیناضروری ہوگااور صرف اس فن کی ضروری صلاحیت رکھنے والوں کو داخل کیاجائے گا۔

(۴)قدیم طلبہ اگر فن کی تکمیل نہیں کر سکے ہیں تو ناظم شعبہ کی تصدیق اور سفارش پر ان کا مزید ایک سال کے لئے غیر امدادی داخلہ کیاجائے گابشرطیکہ کوئی شکایت نہ ہو۔

(۵)جو طلبہ مکمل امدادی یاغیر امدادی داخلہ لیں گے ان کواوقات مدرسہ میں پورے چھ گھنٹے درسگاہ میں بیٹھ کر مشق کرناضروری ہوگا۔

(۶)جو طلبہ عربی تعلیم کے ساتھ کتابت کی مشق کر چکے ہوں اور ناظم شعبہ ان کی صلاحیت کی تصدیق کریں تو دورۂ حدیث کے بعدمکمل داخلہ اور امداد میں ان کوترجیح دیجائے گی۔

(۷)تمام طلبہ کے لئے طالب علمانہ وضع اختیار کرناضروری ہے۔

(۸) پہلے نصف سال میں مقررہ تمرینات کی تکمیل نہ کی گئی توداخلہ ختم کردیاجائے گا۔

دارالصنائع

(۱)طالب علمانہ وضع قطع کے بغیر داخلہ نہیں لیاجائے گا۔

(۲) معلم دارالصنائع جن کی صلاحیت کی تصدیق کریں گے ان کوداخل کیاجائے گا۔

(۳) پہلے تین ماہ میں کام کی تکمیل نہ کی گئی توداخلہ ختم کردیاجائے گا۔

(۴)اس شعبہ میں دس سے زائد کاداخلہ نہ ہو سکے گا۔اوران سب کی صرف امداد طعام جاری ہو سکے گی۔

(۵)اوقات مدرسہ میں پورے وقت حاضر رہ کر کام کرناضروری ہوگا۔

احکام رمضان المبارک و مسائل

از :۔ ادارہ

رمضان المبارک کے روزے رکھنا اسلام کا تیسرا فرض ہے جو اس کے فرض ہونے کا انکار کرے مسلمان نہیں رہتا اور جو اس فرض کو ادا نہ کرے وہ سخت گناہگار فاسق ہے۔

روزہ کی نیت :۔ نیت کہتے ہیں دل کے قصد و ارادہ کو زبان سے کچھ کہے یا نہ کہے۔

روزہ کے لئے نیت شرط ہے اگر روزہ کا ارادہ نہ کیا اور تمام دن کچھ کھایا پیا نہیں تو روزہ نہ ہوگا۔

مسئلہ :۔ رمضان کے روزے کی نیت رات سے کرلینا بہتر ہے اور رات کو نہ کی ہو تو دن کو بھی زوال سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے تک کرسکتا ہے بشرطیکہ کچھ کھایا پیا نہ ہو۔

جن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

(۱) کان اور ناک میں دوا ڈالنا۔ (۲) قصداً منہ بھر قے کرنا۔ (۳) کلی کرتے وقت حلق میں پانی چلا جانا (۴) عورت کو چھونے وغیرہ سے انزال ہو جانا۔ (۵) کوئی ایسی چیز نگل جانا جو عادۃً کھائی نہیں جاتی جیسے لکڑی، لوہا، کچا گیہوں کا دانہ وغیرہ (۶) لوبان یا عود وغیرہ کا دھواں قصداً ناک یا حلق میں پہنچانا، بیڑی، سگریٹ حقہ پینا اسی حکم میں ہیں۔ (۷) بھول کر کھا پی لیا اور یہ خیال کیا کہ اس سے روزہ ٹوٹ گیا ہوگا پھر قصداً کھا پی لیا۔ (۸) رات سمجھ کر صبح صادق کے بعد سحری کھانا۔ (۹) دن باقی تھا مگر غلطی سے یہ سمجھ کر کہ آفتاب غروب ہو گیا ہے روزہ افطار کرلیا۔

تنبیہ :۔ ان سب چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے مگر صرف قضا واجب ہوتی ہے، کفارہ لازم نہیں ہوتا۔ (۱۰) جان بوجھ کر بدون بھولنے کے بی بی سے صحبت کرنے یا کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور قضا بھی لازم ہوتی ہے اور کفارہ بھی۔ کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے ورنہ ساٹھ روزے متواتر رکھے بیچ میں ناغہ نہ ہو ورنہ پھر شروع سے ساٹھ روزے پورے

کرنے پڑیں گے اور اگر روزہ کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کھانا کھلاوے۔ آج کل شرعی غلام یا باندی کہیں نہیں ملتے اس لئے آخری دو صورتیں متعین ہیں۔

وہ چیزیں جن سے روزہ ٹوٹتا نہیں مگر مکروہ ہو جاتا ہے

(۱) بلا ضرورت کسی چیز کو چبانا یا نمک وغیرہ چکھ کر تھوک دینا، ٹوتھ پیسٹ یا منجن یا کوئلہ سے دانت صاف کرنا بھی روزہ میں مکروہ ہے۔ (۲) تمام دن حالت جنابت میں بغیر غسل کئے رہنا۔ (۳) فصد کرانا کسی مریض کے لئے اپنا خون دینا جو آج کل ڈاکٹروں میں رائج ہے یہ بھی اس میں داخل ہے۔ (۴) غیبت یعنی کسی کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنا یہ ہر حال میں حرام ہے روزہ میں اس کا گناہ اور بڑھ جاتا ہے۔ (۵) روزہ میں لڑنا جھگڑنا، گالی دینا خواہ انسان کو ہو یا کسی بے جان چیز کو یا جاندار کو ان سے بھی روزہ مکروہ ہو جاتا ہے۔

وہ چیزیں جن سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور مکروہ بھی نہیں ہوتا!

(۱) مسواک کرنا۔ (۲) سر یا مونچھوں پر تیل لگانا۔ (۳) آنکھوں میں دوا یا سرمہ ڈالنا۔ (۴) خوشبو سونگھنا۔ (۵) گرمی اور پیاس کی وجہ سے غسل کرنا۔ (۶) کسی قسم کا انجکشن یا ٹیکہ لگوانا (۷) بھول کر کھانا پینا۔ (۸) حلق میں بلا اختیار دھواں یا گرد وغبار یا مکھی وغیرہ کا چلا جانا۔ (۹) کان میں پانی ڈالنا یا بلا قصد چلا جانا۔ (۱۰) خود بخود قے آجانا۔ (۱۱) سوتے ہوئے احتلام (غسل کی حاجت) ہو جانا۔ (۱۲) دانتوں میں سے خون نکلے مگر حلق میں نہ جائے تو روزہ میں خلل نہیں آیا۔ (۱۳) اگر خواب میں یا صحبت سے غسل کی حاجت ہو گئی اور صبح صادق ہونے سے پہلے غسل نہیں کیا اور اسی حالت میں روزہ کی نیت کر لی تو روزہ میں خلل نہیں آیا۔

وہ عذر جن سے رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہوتی ہے

(۱) بیماری کی وجہ سے روزہ کی طاقت نہ ہو، یا مرض بڑھنے کا شدید خطرہ ہو تو روزہ نہ رکھنا جائز ہے بعد رمضان اس کی قضاء لازم ہے۔ (۲) جو عورت حمل سے ہو اور روزہ میں بچہ کو یا اپنی جان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو روزہ نہ رکھے، بعد میں قضاء کرے۔ (۳) جو عورت اپنے یا کسی دوسرے غیر کے بچہ کو دودھ پلاتی ہے اگر روزہ سے بچہ کو دودھ نہیں ملتا، تکلیف پہنچتی ہے تو روزہ نہ رکھے پھر قضا کرے۔ (۴) مسافر شرعی (جو کم از کم

اڑتالیس میل کے سفر کی نیت پر گھر سے نکلا ہو) اس کے لئے اجازت ہے کہ روزہ نہ رکھے پھر اگر کچھ تکلیف و دقت نہ ہو تو افضل یہ ہے کہ سفر ہی میں روزہ رکھ لے اگر خود اپنے آپ کو یا اپنے ساتھیوں کو اس سے تکلیف ہو تو روزہ نہ رکھنا ہی افضل ہے۔ (۵) بحالت روزہ سفر شروع کیا تو اس روزہ کا پورا کرنا ضروری ہے اور اگر کچھ کھانے پینے کے بعد سفر سے وطن واپس آگیا تو باقی دن کھانے پینے سے احتراز کرے اور اگر ابھی کچھ کھایا پیا نہیں تھا کہ وطن میں ایسے وقت واپس آگیا جبکہ روزہ کی نیت ہو سکتی ہو یعنی زوال سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل تو اس پر لازم ہے کہ روزہ کی نیت کرلے۔ (۶) کسی کو قتل کی دھمکی دے کر روزہ توڑنے پر مجبور کیا جائے تو اس کے لئے توڑ دینا جائز ہے پھر قضا کرلے۔ (۷) کسی بیماری یا بھوک پیاس کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ کسی مسلمان دیندار ماہر طبیب یا ڈاکٹر کے نزدیک جان کا خطرہ لاحق ہو تو روزہ توڑ دینا جائز بلکہ واجب ہے اور پھر اسکی قضا لازم ہو گی۔ (۸) عورت کے لئے ایام حیض اور بچہ کی پیدائش کے وقت جو خون آتا ہے یعنی نفاس اس کے دوران میں روزہ رکھنا جائز نہیں ان ایام میں روزہ نہ رکھے بعد میں قضا کرے۔ بیمار، مسافر، حیض و نفاس والی عورت جن کے لئے رمضان میں روزہ رکھنا اور کھانا پینا جائز ہے ان کو بھی لازم ہے کہ رمضان کا احترام کریں سب کے سامنے کھاتے پیتے نہ پھریں۔

روزہ کی قضا

(۱) کسی عذر سے روزہ قضا ہو گیا تو جب عذر جاتا رہے جلد ادا کرلینا چاہئے۔ زندگی اور طاقت کا بھروسہ نہیں قضا روزں میں اختیار ہے کہ متواتر رکھے یا ایک ایک دو دو کرکے رکھے۔ (۲) اگر مسافر سفر سے لوٹنے کے بعد یا مریض تندرست ہونے کے بعد اتنا وقت نہ پائے کہ جس میں قضا شدہ روزے ادا کرے تو قضا اس کے ذمہ لازم نہیں سفر سے لوٹنے اور بیماری سے تندرست ہونے کے بعد جتنے دن ملیں اتنے ہی کی قضا لازم ہو گی۔

سحری

روزہ دار کو آخری رات میں صبح صادق سے پہلے پہلے سحری کھانا مسنون اور باعث برکت و ثواب ہے نصف شب کے بعد جس وقت بھی کھائیں سحری کی سنت ادا ہو جائے گی لیکن بالکل آخر شب میں کھانا افضل ہے اگر مؤذن نے صبح سے پہلے اذان دے دی تو سحری کھانے کی ممانعت نہیں جب تک کہ صبح صادق نہ ہو جائے۔ سحری سے فارغ ہو کر روزہ کی نیت دل میں کرلینا کافی ہے اور زبان سے بھی یہ الفاظ کہہ لے تو اچھا ہے۔ بِصَوْمِ

غَدٍ نَّوَیْتُ مِنْ شَہْرِ رَمَضَانَ۔

افطاری آفتاب کے غروب ہونے کا یقین ہو جانے کے بعد افطار میں دیر کرنا مکروہ ہے ہاں جب ابر وغیرہ کی وجہ سے اشتباہ ہو تو دو چار منٹ انتظار کر لینا بہتر ہے اور تین منٹ کی احتیاط بہر حال کرنا چاہئے۔

کھجور اور خرما سے افطار کرنا افضل ہے اور کسی دوسری چیز سے افطار کریں تو اس میں بھی کوئی کراہت نہیں ہے افطار کے وقت یہ دعا مسنون ہے اَللّٰہُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ اور افطار کے بعد یہ دعا پڑھے ذَھَبَ الظَّمَاءُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ

تراویح (۱) رمضان المبارک میں عشاء کے فرض اور سنت کے بعد بیس رکعت سنت مؤکدہ ہے۔ (۲) تراویح کی جماعت سنت علی الکفایہ ہے محلّہ کی مسجد میں جماعت ہوتی ہو اور کوئی شخص علیحدہ اپنے گھر میں اپنی تراویح پڑھ لے تو سنت ادا ہو گئی اگر چہ مسجد اور جماعت کے ثواب سے محروم رہا اور اور اگر محلّہ ہی میں جماعت نہ ہوئی تو سب کے سب ترک سنت کے گناہ گار ہوں گے۔ (۳) تراویح میں پورا قرآن مجید ختم کرنا بھی سنت ہے کسی جگہ حافظ قرآن سنانے والا نہ ملے یا ملے مگر سنانے پر اجرت ومعاوضہ طلب کرے تو چھوٹی سورتوں سے نماز تراویح ادا کریں، اُجرت دے کر قرآن نہ سنیں کیونکہ قرآن سنانے میں اجرت لینا اور دینا دونوں حرام ہے۔ (۴) اگر ایک حافظ ایک مسجد میں بیس رکعت پڑھ چکا ہے اس کو دوسری مسجد میں اسی رات تراویح پڑھنا درست نہیں ہے۔ (۵) جس شخص کی دو چار رکعت تراویح کی رہ گئی ہوں تو جب امام وتر کی جماعت کرائے تو اس کو بھی جماعت میں شامل ہو جانا چاہئے اپنی باقی ماندہ تراویح بعد میں پوری کرے۔ (۶) قرآن کو اس قدر جلد پڑھنا کہ حروف کٹ جائیں بڑا گناہ ہے اس صورت میں نہ امام کو ثواب ہوگا نہ مقتدی کو جمہور علماء کا فتویٰ یہ ہے کہ نابالغ کو تراویح میں امام بنانا جائز نہیں۔

اعتکاف (۱) اعتکاف اس کو کہتے ہیں کہ اعتکاف کی نیت کر کے مسجد میں رہے اور سوائے ایسی حاجات ضروریہ کے جو مسجد میں پوری نہ ہو سکیں (جیسے پیشاب، پاخانہ کی

ضرورت یا غسل واجب اور وضو کی ضرورت) مسجد سے باہر نہ جائے۔(۲) رمضان کے عشرۂ اخیرہ میں اعتکاف کرنا سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے یعنی اگر بڑے شہروں کے محلہ میں اور چھوٹے دیہات کی پوری بستی میں کوئی بھی اعتکاف نہ کرے تو سب کے اوپر ترک سنت کا وبال رہتا ہے اور کوئی ایک بھی محلہ میں اعتکاف کرے تو سب کی طرف سے سنت ادا ہو جاتی ہے۔ (۳) بالکل خاموش رہنا اعتکاف میں ضروری نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے البتہ نیک کلام کرنا اور لڑائی جھگڑے اور فضول باتوں سے بچنا چاہیے۔(۴) اعتکاف میں کوئی خاص عبادت شرط نہیں نماز، تلاوت یا دین کی کتابوں کا پڑھنا پڑھانا یا جو عبادت دل چاہے کرتا رہے۔(۵) جس مسجد میں اعتکاف کیا گیا ہے اگر اس میں جمعہ نہیں ہوتا، تو نماز جمعہ کے لئے اندازہ کرکے ایسے وقت مسجد سے نکلے جس میں وہاں پہنچ کر سنتیں ادا کرنے کے بعد خطبہ سن سکے۔ اگر کچھ زیادہ دیر جامع مسجد میں لگ جائے جب بھی اعتکاف میں خلل نہیں آتا۔(۶) اگر بلا ضرورت طبعی و شرعی تھوڑی دیر کو بھی مسجد سے باہر چلا جائے گا تو اعتکاف جاتا رہے گا خواہ عمداً نکلے یا بھول کر اس صورت میں اعتکاف کی قضا کرنی چاہئے۔(۷) اگر آخری عشرہ کا اعتکاف کرنا ہو تو ۲۰ تاریخ کو غروب سے پہلے مسجد میں چلا جائے اور جب عید کا چاند نظر آجائے تب اعتکاف سے باہر ہو۔(۸) غسل جمعہ یا محض ٹھنڈک کے لئے غسل کے واسطے مسجد سے باہر نکلنا معتکف کو جائز نہیں ہے۔

شب قدر

چونکہ اس امت کی عمریں بہ نسبت پہلی امتوں کے چھوٹی ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایک رات ایسی مقرر فرمادی ہے کہ جس میں عبادت کرنے کا ثواب ایک ہزار مہینہ کی عبادت سے بھی زیادہ ہے لیکن اس کو پوشیدہ رکھا تاکہ لوگ اس کی تلاش میں کوشش کریں۔ اور ثواب بے حساب پائیں رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں شب قدر ہونے کا زیادہ احتمال ہے یعنی ۲۱ویں، ۲۳ویں، ۲۵ویں، ۲۷ویں، ۲۹ویں شب اور ۲۷ویں شب میں سب سے زیادہ احتمال ہے ان راتوں میں بہت محنت سے عبادت اور توبہ و استغفار اور دعا میں مشغول رہنا چاہئے۔ اگر تمام رات جاگنے کی طاقت یا فرصت نہ ہو تو جس قدر ہو سکے جاگے اور نفل نماز یا تلاوت قرآن یا ذکر و تسبیح میں مشغول رہے اور کچھ نہ

ہو سکے تو عشاء اور صبح کی نماز جماعت سے ادا کرنے کا اہتمام کرے حدیث میں آیا ہے کہ یہ بھی رات بھر جاگنے کے حکم میں ہو جاتا ہے ان راتوں کو صرف جلسوں تقریروں میں صرف کر کے سو جانا بڑی محرومی ہے تقریریں ہر رات ہو سکتی ہیں عبادت کا یہ وقت پھر ہاتھ نہ آئے گا۔

البتہ جو لوگ رات بھر عبادت میں جاگنے کی ہمت کریں وہ شروع میں کچھ وعظ سن لیں پھر نوافل اور دعا میں لگ جائیں تو درست ہے۔

ترکیب نماز عید اول زبان سے یا دل سے نیت کرو کہ دو رکعت نماز عید واجب مع چھ زائد تکبیروں کے پیچھے اس امام کے۔ پھر اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لو اور سبحانك اللّٰهم پڑھو پھر دوسری اور تیسری تکبیر میں ہاتھ کانوں تک اٹھا کر چھوڑ دو اور چوتھی میں باندھ لو اور جس طرح ہمیشہ نماز پڑھتے ہو پڑھو۔ دوسری رکعت میں سورت کے بعد جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہہ کر پہلی، دوسری اور تیسری دفعہ میں ہاتھ کانوں تک اٹھا کر چھوڑ دو اور چوتھی تکبیر میں بلا ہاتھ اٹھائے رکوع میں چلے جاؤ۔ باقی نماز حسب دستور تمام کرو۔ خطبہ سن کر واپس جاؤ　　والحمد لله
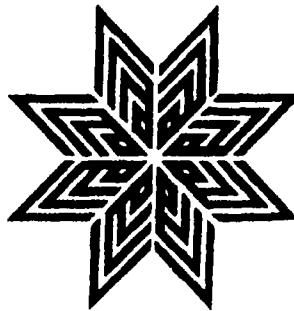
جن بری عادتوں کا تعلق زبان سے ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کو سنگین جرم اور گناہ عظیم قرار دیا ہے ان میں سے ایک چغلخوری بھی ہے۔ چغلخوری یہ ہے کہ کسی کی ایسی بات دوسرے کو پہنچانا جو اس شخص کی طرف سے اس دوسرے آدمی کو بدگمان اور ناراض کرکے باہمی تعلقات خراب کردے۔ چونکہ آپسی تعلقات کی درستی وخوشگواری اور حسن معاشرت اور باہم میل ومحبت تعلیم نبوی کے مقاصد میں سے ہے اس لئے جو چیز باہمی تعلقات کو خراب کرکے بغض وعداوت اور مخالفت ومنافرت پیدا کرے ظاہر ہے کہ وہ بدترین درجہ کی معصیت ہوگی۔ اور آخرت میں اس کا بہت برا انجام سامنے آئے گا۔

وعید:۔ قرآن کریم میں اس کو کافرانہ خصلت فرمایا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

هَمَّازٍ مَشَّاءٍ بِنَمِيمٍ۔ (سورۂ قلم) طعنہ دینے والا، چغلی کھانے والا۔

واضح رہے کہ یہ آیت کافر ولید بن مغیرہ یا ابوجہل یا اسود بن یغوث یا اخنس بن شریق کے بارے میں نازل ہوئی ہے (حاشیۂ بخاری ص: ۷۳۱ج: ۲)

دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے:۔ ویل لکل ھمزۃ لمزۃ۔ ایک تابعی ابوالجوازءؒ نے اس آیت کے سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ سے سوال کیا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں جن کی برائی اللہ تعالیٰ نے "ویل" (ہلاکت) کے ذریعہ فرمائی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے ارشاد فرمایا:۔

ھم المشاؤون بالنمیمة المفرقون بین الاحبة الناعتون للناس بالعیب
یہ لوگ چغلیاں لگانے والے، دوستوں کے درمیان جدائی ڈالنے والے اور لوگوں کے عیب بیان کرنے والے ہیں۔

(تفسیر کبیر بیروتی ج: ۳۲، ص: ۸۷۔ حاشیۂ بخاری مختصراً)

یہ آیت وسورت بھی ولید بن مغیرہ۔یا اخنس بن شریق۔یا امیہ بن خلف جیسے بڑے کافروں کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔(تفسیر کبیر)

حدیث(۱):۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے میں نے سنا:۔

لایدخل الجنة قتات۔(بخاری ج:۲،ص:۸۹۵۔ مسلم ج:۱،ص:۷۰)چغلخور آدمی جنت میں داخل نہ ہوسکے گا۔

حدیث(۲):۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دو قبروں کے پاس سے گذر ہوا۔ آپ نے (ان دونوں قبروں کی طرف اشارہ کر کے) فرمایا کہ ان دونوں قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے۔ اور جن گناہوں کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے ان دونوں کی نظر میں اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہ تھی۔یا یہ کہ لوگوں کے لئے ان گناہوں سے بچنا کچھ دشوار نہیں ہوتا۔ پھر ان گناہوں (جن کی وجہ سے ان دونوں کو عذاب ہو رہا تھا) کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

اما هذا فكان لايستتر من البول واما هذا فكان يمشي بالنميمة

(بخاری ج:۱،ص:۳۵، مسلم ج:۱،ص:۱۴۱)

بہر حال یہ قبر والا تو پیشاب سے پرہیز نہیں کرتا تھا (اس لئے عذاب ہو رہا ہے) اور یہ دوسرا چغلخوری کرتا پھرتا تھا (اسکو چغلخوری کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے)

حدیث(۳):۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

ألاأُنَبِّئُكُمْ مَا الْعَضْهُ؟ هي النميمة القالة بين الناس (مسلم ج:۲،ص:۳۲۵)

کیا میں تمہیں خبر نہ دوں کہ جھوٹ اور بہتان کیا چیز ہے؟ پھر فرمایا کہ وہ چغلخوری ہے جو لوگوں میں پھیل گئی ہو (اور پھر فساد کا سبب بن جائے)

حدیث(۴):۔ حضرت عبدالرحمٰن بن غنم اور اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

خيار عباد الله الذين اذا رُأوْا ذُكِرَ الله وشرار عباد الله المشاؤن

بالنميمة المفرقون بين الاحبة الباغون البراء العنتَ (مشکوۃ ص:۴۱۵)

اللہ تعالیٰ کے بہترین بندے وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ یاد آجائے اور بدترین بندے وہ ہیں جو چغلیاں کھانے والے، دوستوں میں جدائی ڈلنے والے ہیں اور اس کے طالب وساعی رہتے ہیں کہ اللہ کے پاک دامن بندوں کو کسی گناہ سے ملوث یا کسی مصیبت اور پریشانی میں مبتلا کریں اس حدیث میں بدترین انسان ان لوگوں کو قرار دیا گیا ہے جو عادۃً چغلخور ہوں اور چغلیاں کھاکھا کے دوستوں میں پھوٹ ڈلوانا جن کی عادت اور دلچسپ مشغلہ ہو اور جو بندگان خدا کو بدنام اور پریشان کرنے کے درپے رہتے ہیں۔

حدیث (۵):۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لایبلغنی احد من اصحابی عن احد شیئا فانی أحب أن أخرج الیکم وانا سلیم الصدر (مشکوۃ ص:۴۱۴)۔

میرے ساتھیوں میں سے کوئی کسی دوسرے کی بات مجھے نہ پہنچایا کرے، میں چاہتا ہوں کہ جب میں تم لوگوں میں آؤں تو میرا دل (سب کی طرف سے) صاف اور بے روگ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث کے ذریعہ امت کو سبق دیا کہ دوسروں کے متعلق ایسی باتیں سننے سے بھی آدمی کو پرہیز کرنا چاہئے جن سے اس کے دل میں بدگمانی کی کدورت اور رنجش وغیرہ پیدا ہونے کا امکان ہو۔ (لیکن یہ واضح رہے کہ جن موقعوں پر شرعی ضرورت اور دینی مصلحت کا تقاضا ایسی باتیں کہنے یا سننے کا ہو وہ مواقع اس سے مستثنیٰ ہونگے)۔

اگر کوئی چغلی سنے تو کیا کرے:۔ حضرت امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں فرمایا ہے کہ جو شخص چغلی سنے اس کو چھ چیزوں کا التزام کرنا چاہئے۔

اولاً:۔ یہ کہ اسکا اعتبار نہ کرے، کیونکہ چغلخور فاسق ہوتا ہے اس کی شہادت بھی قبول نہیں ہوتی۔

ثانیاً:۔ یہ کہ اسکو چغلی کھانے سے منع کرے نصیحت کرے اور اس پر چغلخوری کی برائی واضح کرے۔

ثالثاً:۔ یہ کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے واسطے بغض رکھے، کیونکہ وہ اللہ کے نزدیک مبغوض ہے اور ایسے شخص سے نفرت کرنا واجب ہے جس سے اللہ تعالیٰ نفرت کرے۔

رابعاً:۔ یہ کہ چغلخور کی چغلی کی وجہ سے اپنے غیر موجود بھائی (جس کے بارے میں چغلی کی گئی

ہے) کے متعلق بدگمان نہ ہو۔

خامساً:۔ یہ کہ جو کچھ چغلخور نقل کرے اسے سنکر مزید معلومات حاصل کرنے کی جستجو نہ کرے۔

سادساً:۔ یہ کہ جس بات سے چغلخور کو منع کرے اس میں خود مبتلا نہ ہو یعنی اس کی چغلی کسی دوسرے آدمی کے سامنے نقل نہ کرے مثلاً کسی سے یہ کہنا کہ مجھ سے فلاں شخص نے فلاں آدمی کے بارے میں ایسا ایسا کہا ہے۔ (احیاء العلوم ج: ۳، ص: ۳۹۳)

ایک عبرتناک واقعہ :۔ امام غزالیؒ نے بروایت حماد بن سلمہ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنا غلام بیچتے وقت خریدار کو بتلایا کہ اس میں چغلخوری کا عیب ہے خریدار نے اس کے باوجود اس کو خرید لیا۔ چند ہی روز گذرے تھے کہ غلام نے اپنے آقا کی بیوی سے کہا کہ تیرے شوہر کو تجھ سے محبت نہیں ہے اور ممکن ہے کہ وہ تجھے طلاق دیکر دوسری شادی کرلے۔ اگر تو اس کو اپنی محبت کا اسیر کرنا چاہتی ہے تو جب وہ سوجائے تو استرا لے کر اس کی گدی سے چند بال اتار کر مجھے دیدینا۔ میں اس پر منتر پڑھونگا۔ اس عمل سے وہ تیری محبت کا اسیر ہو جائے گا۔ بیوی کو بھڑکانے کے بعد شوہر سے کہا کہ تیری بیوی نے ایک دوست بنالیا ہے اور وہ تجھے قتل کرنا چاہتی ہے میری بات کا یقین نہ آئے تو آج سو کر دیکھ لو وہ تمہیں سوتے میں قتل کر دیگی۔ بہتر یہ کہ آج سونا مت بلکہ اس طرح لیٹ جانا جیسے سو رہے ہو اور پھر دیکھنا کہ وہ کیا کرتی ہے شوہر نے اس کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے سونے کا ڈھونگ بنایا۔ عورت نے یہ یقین کرتے ہوئے کہ اب غفلت کی نیند سو گیا ہے استرا لیا اور گدی کے بال اتارنے کے لئے آگے بڑھی۔ شوہر نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ اور استرا دیکھ کر اس کو یقین ہو گیا کہ یہ مجھے قتل کرنا چاہتی ہے چنانچہ اس نے غضب ناک ہو کر بیوی کو قتل کر دیا۔ بیوی کے رشتہ داروں نے بطور انتقام شوہر کو قتل کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قبیلے آپس میں لڑ پڑے اور جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔ اللہ کی پناہ غور کرنے کا مقام ہے کہ چغلخوری نے کیا کارنامہ انجام دیا اس واقعہ سے جہاں چغلخوری کی شناعت اور برائی معلوم ہوتی ہے وہیں اس کے اعتبار کرنے کی برائی بھی معلوم ہوتی ہے۔ اللھم احفظنا منه

اقوال سلف :۔ (۱) ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی کی چغلی کی آپ نے اس سے فرمایا کہ ہم تیری بات کی تحقیق کریں گے۔ اگر سچ ہوئی تو ہم تجھ سے (چغلخوری کی

وجہ سے) ناراض ہونگے اور اگر جھوٹ نکلی تو تجھے سزا دیں گے۔ اور اگر تو معاف کرانا چاہے تو معاف کردیں گے۔ اس نے عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین مجھے معاف کردیجئے۔

(۲) حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص تم سے کسی کی چغلی کھاتا ہے وہ کسی دوسرے سے تمہاری چغلی کھائے گا۔

(۳) مروی ہے کہ کسی دانشور کے پاس اس کا دوست بغرض ملاقات آیا اور کسی دوسرے کے متعلق کچھ کہنے لگا۔ دانشور نے کہا کہ تم اتنے دنوں میں آئے اور آتے ہی تین جرم کر بیٹھے پہلا یہ کہ تم نے میرے بھائی سے بغض پیدا کردیا۔ دوسرا یہ کہ میرے مطمئن اور خالی دل دماغ کو بے چینی سے بھر دیا۔ تیسرا یہ کہ اپنی دیانتداری کو مجروح کردیا۔

(۴) حضرت مصعب ابن الزبیرؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے خیال میں چغلی کھانے کی نسبت چغلی کا اعتبار کرلینا زیادہ برا ہے اس لئے کہ چغلی کرنے میں صرف حکایت ہے لیکن اعتبار کرنے میں اس کی تصدیق بھی ہے اور آئندہ کے لئے چغلی کرنے کی اجازت بھی۔

(۵) محمد بن کعب القرظی سے سوال کیا گیا کہ مؤمن کو اس کے مرتبہ سے نیچے کرنے والی کونسی خصلت ہے؟ فرمایا (۱) زیادہ بولنا۔ (۲) راز افشاء کرنا۔ (۳) ہر کسی کی بات پر اعتماد کرلینا۔

(۶) بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ چغلخوری تین چیزوں سے مرکب ہے۔ کذب، حسد، نفاق اور یہی تینوں خصلتیں ذلت کے ارکان ہیں۔

(۷) ایک بزرگ نے عمدہ بات فرمائی ہے کہ اگر چغلخور اپنے قول میں صادق بھی ہے تو حقیقت میں وہی شخص تمہیں گالی دے رہا ہے (احیاء العلوم ج: ۳، ص: ۹۳---۳۹۰)۔

فاروق اعظمؓ کی صفت حمیدہ

(عباس محمود العقاد کی تالیف عبقریۃ عمر کے ایک باب "صفاتہ" کا ترجمہ و تلخیص)

از:۔ پروفیسر بدر الدین الحافظ جامعہ نگر نئی دہلی

حضرت عمر ایک غیر معمولی دانش مند، صاحب فراست اور قوی انسان تھے مگر یہ قوت کی صفت ایسی ہے کہ جس میں اور لوگ بھی شریک ہو سکتے ہیں اس لئے آپ کو صرف قوی کہنا کوئی خراج تحسین نہ ہوگا کیونکہ قوت تو صرف ضعف کے برعکس ہوتی ہے پھر قوت اور ضعف کی بھی بہت سی اقسام ہو سکتی ہیں، لیکن یہاں ہمارا مقصد اس قوت سے ہے جو انسان کی جملہ خوبیوں اور عیوب کو سامنے رکھ کر طے کی جاتی ہے۔ فاروق اعظمؓ کی شخصیت کے لئے کن الفاظ سے اس کا تعین کیا جائے۔ یہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ ان کی شخصیت تو ان کے ہمعصروں میں بے مثال نظر آتی ہے۔ ان کی ایک ظاہری قوت بھی تھی جو ظاہری علامتوں سے سمجھی جاسکتی تھی اور ایک باطنی قوت تھی جس کی علامتوں کو دیکھ لینا آسان نہیں تھا بڑی گہرائی سے ان کا مطالعہ کرنے کے بعد سمجھی جاسکتی تھی۔ جیسا کہ ان کے شخصی حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ فاروق اعظم ایک عادل، رحمدل، غیر تمند، دانشمند اور مضبوط ایمان والے انسان تھے۔ ان میں دینی نخوت اور دلیری کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور ہر صاحب نظر انسان ان کی ان صفات جمیلہ کا بخوبی معائنہ کر سکتا تھا پھر یہ بھی خوبی کی بات ہے کہ ان صفات میں کوئی تفاوت نہیں پایا جاتا تھا بلکہ سب یکساں طور پر نمایاں تھیں۔ اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں بعض ان کی خاندانی وراثت سے تعلق رکھتی ہیں بعض انکی زندگی کے تاریخی واقعات ہیں بعض کا تعلق دینی تعلیم سے ہے اور ان ہی سب سے مل کر حضرت عمرؓ جیسی ایک کامل شخصیت کا مجموعہ تیار ہوا ہے۔

فاروق اعظمؓ کسی ایک سبب سے عادل کی صفت سے متصف نہ تھے بلکہ اس کی مختلف وجوہ ہیں آپ وراثتاً منصف اور عادل تھے کیونکہ ان کے آباء واجداد کو باہم قبائل کے نزاعی

معاملات میں تحکیم اور قضاء کا منصب عطا کیا جاتا تھا مثلاً جب ان کے دادا نفیل بن عبد العزیٰ کو عبد المطلب اور حرب ابن امیہ کی قیادت کے جھگڑے میں منصف بنایا گیا تو انہوں نے حرب کے مقابلہ میں عبد المطلب کے حق میں فیصلہ دیا کیونکہ وہ ایک دیانتدار منصف تھے۔ فاروق اعظمؓ اس لئے بھی عادل تھے کہ ان کے والد خطاب اور دادا نفیل نہایت مضبوط اور قوی انسان تھے اسی طرح ان کی والدہ حنتمہ بھی ہشام بن مغیرہ کی صاحب زادی تھیں جو قریش کے نہایت بردبار اور پروقار سردار تھے۔ نہ وہ کسی طاقت کے آگے جھکتے نہ کسی کمزور اور ضعیف پر ظلم کرتے۔ اس کے علاوہ آبائی شرافت و نجابت کے ساتھ جب دین ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تو ان کی شریفانہ عادات واطوار میں مزید نکھار، پائیداری اور استحکام آگیا۔

یوں تو فاروق اعظمؓ کے عدل وانصاف کے دوست و دشمن سب ہی قائل ہیں کبھی کسی کی طرف سے نکیر نہیں کی گئی مگر ان کے عدل کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے سے قریب اور بعید سب کے ساتھ انصاف میں مساوات کا خیال رکھا چاہے ان کا اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو اور یہی عدل کی ایسی مثال ہے جس کی آنے والے حاکموں نے اپنی اتباع اور اقتدا کی ہے۔ فاروق اعظم نے خود اپنے بیٹے کو جب ایک معصیت میں ملوث پایا تو کوڑوں کی سزا دی اور سزا پوری ہونے سے قبل جب وہ جان بحق ہو گیا تو حد کے باقی کوڑے اس کی لاش پر لگائے گئے۔ مگر یہ بیان ان مبصرین کا ہے جو انتہائی مبالغہ آرائی سے حضرت عمرؓ کی شدت دکھانا چاہتے ہیں اور جو لوگ اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کا بیان یہ ہے کہ کوڑے مارنے کی ضرب شدید ضرور تھی مگر اس کے بعد لڑکا تقریباً ایک ماہ زندہ رہا اس کے بعد انہیں زخموں کی وجہ سے جان بحق ہو گیا۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرو بن العاص والی مصر کی روایت ہمارے لئے کافی اور ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن مصر میں عبد الرحمٰن بن عمر اور ابو سرع سر جھکائے ہوئے میرے پاس آئے اور کہنے لگے رات ہم دونوں سے شراب نوشی کا گناہ ہو گیا ہے ہم انتہائی شرمندہ ہیں آپ ہمارے اوپر حد جاری کیجئے، اس پر میں نے ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر نکالدیا مگر عبد الرحمٰن بولے اگر آپ حد جاری نہیں کرتے تو میں اپنے والد کو اطلاع کردوں گا۔ اس پر مجھے خیال آیا کہ اگر میں حد جاری نہیں کرتا ہوں حضرت عمرؓ مجھے معزول کردیں گے، میں یہی سوچ رہا تھا کہ میرے پاس عبد الرحمٰن بن عمر آئے میں کھڑا ہو گیا ان کو خوش آمدید کہا اور چاہا کہ انہیں صدر مقام پر بٹھاؤں مگر انہوں نے انکار کیا اور کہا کہ والد صاحب

نے تو مجھے آپ کے پاس آنے سے منع کیا ہے سوائے اس کے کہ کوئی ضروری کام ہو اور وہ معاملہ یہ ہے کہ میرا بھائی سر تو نہیں منڈوائے گا مگر کوڑے مارنے کا جہاں تک تعلق ہے آپ جو مناسب سمجھیں کریں اس پر حضرت عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ لوگ عام طور پر حد کے ساتھ بال بھی منڈواتے تھے، پھر میں نے ان دونوں کو گھر کے صحن میں نکالا اور دونوں کو ضرب لگائی اس کے بعد ان کے بھائی آئے اور دونوں کا سر منڈوالیا۔ پھر میں نے تو حضرت عمرؓ کو کچھ نہیں لکھا مگر ان کے خط کا انتظار کر رہا تھا جو آیا اور اس کی ابتدا ہی کرخت لہجہ سے تھی، لکھا تھا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم امیر المومنین کی طرف سے عاصی ابن العاص کے نام۔ اے ابن العاص مجھے تیری جرأت اور عہد کی خلاف ورزی پر انتہائی تعجب ہوا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ تجھے معزول نہ کردیا جائے اور یہ بڑی بد نما معزولی ہو گی۔ تم نے عبدالرحمٰن کو اپنے گھر میں ضرب لگائی اور سر مونڈا جبکہ یہ میری مخالفت ہے، بے شک عبدالرحمٰن تو منجملہ اور لوگوں کے تمہاری رعایا میں سے ایک فرد ہے لہٰذا جو عمل تم اوروں کے ساتھ کرتے ہو وہی اس کے ساتھ کرو۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے کہا کہ وہ میرا لڑکا ہے۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے واجبات میں میرے نزدیک کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہے اب ضروری یہ ہے کہ جیسے ہی میرا یہ خط تمہارے پاس پہونچے اس کو فوراً جبہ پہنا کر کجاوہ پر بٹھا کر میرے پاس بھیج دو تا کہ اسے اپنی بدعملی کا نتیجہ معلوم ہو جائے۔ پھر عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کا خط ان کے بیٹے کو سنا کر اور دوسرے بھائی عبداللہ کے ساتھ مدینہ منورہ بھیج دیا۔ اور جواباً لکھ دیا کہ میں نے تو مسلمانوں اور ذمیوں کو اپنے صحن ہی میں سزا دیتا ہوں اسی طرح میں نے عبدالرحمٰن پر بھی گھر کے صحن میں حد جاری کی ہے اس کے بعد اسلم کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن سر جھکائے لڑکھڑاتے اپنے والد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو فاروق اعظمؓ نے فرمایا کیا عبدالرحمٰن تم نے ایسا کیا ہے؟ اس کے جواب میں یہ ابھی کچھ بولے بھی نہ تھے کہ عبدالرحمٰن ابن عوف بولے یا امیر المومنین اس پر حد جاری ہو چکی ہے مگر حضرت عمرؓ نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور جھڑک دیا۔ عبدالرحمٰن ابن عمرؓ چیخنے لگے اور کہنے لگے کہ میں مریض ہوں۔ اور مجھے قتل کرنے والے ہیں حضرت عمر نے ان کو مارا اور ان کو قید کر دیا پھر یہ بیمار رہے اور انتقال فرمایا بس یہ ہے اصل واقعہ جس پر مبالغہ آمیزی کرنے والوں نے حضرت عمرؓ کو بدنام کرنے کے لئے کہا ہے کہ وہ دین کی عائد کردہ ضرورت سے زیادہ سخت تھے، ایسی سختی کی فطرت بھی اجازت نہیں دیتی۔

مگر یہ واقعہ مختلف روایوں کی روایت کے مطابق ایک واقعہ ہے جس میں انتہائی مبالغہ آمیزی سے کام لیا گیا ہے اور یہ بات بالکل قرین قیاس نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس قدر قساوت قلبی سے کام لیا ہو کہ مردہ لاش پر کوڑے مارے یا حد جاری کی جس کی نہ دین اجازت دیتا ہے نہ فطرت انسانی۔ یہ تو محض راویوں کا اختراع ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں اس کے علاوہ اس واقعہ کا کسی قابل اعتماد سند سے بھی تعلق نہیں ہے۔ مگر اس واقعہ میں اور کئی باتیں سامنے آتی ہیں اول یہ کہ عبد الرحمٰن بن عمرؓ نے غلطی سے ایک مشروب پی لیا تھا جس کو وہ مسکر نہیں سمجھ رہے تھے پھر بعد میں معلوم ہوا کہ اس میں نشہ ہے اس لئے وہ فوراً والی مصر حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس آئے اور کہا کہ ان پر حد جاری کی جائے اب اگر وہ ذرا سی بھی رورعایت کرتے ہیں تو شکایت خلیفہ تک پہونچ جائے گی، یہاں باپ اور بیٹے کے دینی مزاج کی گہرائی واضح ہو رہی ہے اس کے بعد حضرت عمرو بن العاص کو دیکھئے یہ سب کچھ جانتے ہوئے کہ خلیفہ کا بیٹا ہے اگر اس سزا سے بچ گیا تو کبھی باپ کا جانشین بھی ہو سکتا ہے مگر انہوں نے اپنا فرض ادا کیا دوسری طرف حضرت عمرؓ کو سارا حال معلوم ہو گیا تھا مگر وہ یہ چاہتے تھے کہ والی مصر اپنا فرض پوری ذمہ داری سے ادا کرے اس میں ذرا غفلت اور رورعایت نہ ہونے پائے ورنہ عام مسلمانوں میں اور اللہ کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ اس کے علاوہ ان کا فرزند بھی شرعی حد سے بچا نہ رہے اور ہر شخص اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے حالانکہ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے میں فاروق اعظمؓ کو اپنے چہیتے فرزند سے ہاتھ دھونے پڑے۔ لیکن اس واقعہ سے یہ بھی نہ سمجھنا چاہئے کہ حضرت عمر ہر ایک کے ساتھ اتنے سخت تھے، ان میں عدل قائم رکھنے کے لئے شدت ضرور تھی مگر یہ ایسی عادت نہ تھی کہ ہر ایک کو اسی پر ناپ دیا جائے۔ ایک مرتبہ ایک شرابی لایا گیا آپ نے اس پر سختی کا ارادہ کیا مگر پھر کہا کہ میں تجھے ایک ایسے آدمی کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں جو تیرے معاملہ میں نرمی سے کام لے گا پھر اسے مطیع بن اسود کے پاس بھیج دیا تاکہ اس پر حد جاری کرے۔ اس کے بعد اسے بلوالیا اس نے مے خوار پر نہایت شدت سے کوڑے مارنے شروع کئے آپ اس پر چلائے اور کہا تو نے تو اسے قتل ہی کر ڈالا اب بیس کوڑے کم کر دے کیونکہ تو نے تو بڑی شدید ضربیں لگائی ہیں اس لئے احتیاط کے تقاضے میں آپ نے فرمایا **تعليلها فى الشبهات على ان يقيما فى الشبهات۔** شبہات کے معاملہ میں ذرا تاخیر سے کام لو تاکہ شبہ کسی یقین تک پہونچ جائے۔ ایک مرتبہ کسی قوم کے پاس

سے گذرے وہ لوگ کسی شخص کا محض شبہہ کی بنیاد پر مواخذہ کرر ہے تھے آپ نے فرمایا یہ تمہارے لئے کوئی خوشگوار بات نہیں ہے کہ تم ایک شخص سے صرف شبہ کی بنیاد پر باز پرس کرر ہے ہو یا صرف اس کے شر کے پہلو پر نگاہ رکھے ہوئے ہو۔اسی لئے آپ بسااوقات اپنے والیوں پر بھی غضبناک ہو جاتے تھے کیونکہ وہ بڑی شدت سے معاصی پر حد جاری کردیتے تھے۔ایک مرتبہ آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو بہت سختی سے مخاطب کیا کیونکہ انھوں نے ایک نوجوان شرابی کو کوڑے لگائے اس کا سر منڈوایا اور منہ کالا کر کے یہ بھی حکم دیا کہ اس کا بائیکاٹ کرو۔نہ کوئی اس کے ساتھ کھائے پیئے نہ ہم نشین بنائے،اس نے خلیفہ کے دربار میں شکایت کردی آپ نے حکم دیا کہ نہ اس سے مسلمان ملنا چھوڑیں نہ کھانا پینا ترک کریں اور اگر یہ توبہ کرلیتا ہے تو اس کی شہادت بھی قبول کی جائے۔

ایک مرتبہ آپ کو ایسے شخص کا پتہ چلا جو بار بار مے خواری کا ارتکاب کر چکا تھا آپ نے اس کو ایک خط لکھا جس میں فرمایا میں تیرے ساتھ اللہ کی تعریف کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ گناہوں کا معاف کرنے والا ہے توبہ کا قبول کرنے والا اور شدید عذاب دینے والا ہے بس اسی کی طرف ٹھکانہ ہے جب اس شخص کو یہ تحریر ملی تو اس کو بار بار پڑھتا اور روتا جاتا تھا یہاں تک کہ توبہ کرلی اور شراب چھوڑدی۔اس کی خبر جب فاروق اعظم کو پہونچی تو آپ نے ہم نشینوں سے فرمایا تم بھی ایسا کرو۔اور جب تم اپنے کسی بھائی کو دیکھو کہ وہ گمراہی میں گر گیا ہے تو اسے روکو اور اللہ سے دعا کرو کہ وہ اس کی توبہ قبول فرمائے اور اس پر تم شیطان کے مددگار مت بنو۔اس طرح بعض اور فحش گناہ میں مبتلا ہونے والوں کے بارے میں بھی روایات ملتی ہیں کہ آپ نے سختی سے گریز کیا اور عفوودرگذر سے کام لیا،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ حدود شرعی قائم کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیتے تھے۔لیکن اپنے فرزند کے معاملے میں انہوں نے زیادتی اختیار کی وہ صرف اس لئے تھی کہ عوام اور خواص میں فرق نہ ہو اور عام لوگ اقرباء پروری کا گمان نہ کرلیں۔ اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی اپنے بھائی اور والد کے بارے میں جو مفصل روایت ملتی ہے وہ اس پر شاہد ہے کہ انصاف میں کسی کی زیادتی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا اس لئے ظاہر ہے کہ عدل اور رحمت دونوں فاروق اعظم کی فطری صفات تھیں۔

اس کے علاوہ حضرت عمرؓ بظاہر نہایت سخت مزاج اور موٹا لباس پہننے والے تھے آپ کی گفتگو میں بھی تلخی تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ نرمی اور لطافت میں کمی تھی،گویا ان کی رحمدلی

نرم مزاجی کی طرح بھی ان کی سختی اور درشتی کی نقیض نہ تھی نہ ان کی سختی نرمی کی ضد تھی، جہاں جیسی ضرورت ہوتی اس کا استعمال ہوتا اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ جو لوگ غصہ ور نہیں ہوتے وہ لوگوں میں سب سے زیادہ رحمدل واقع ہوں۔ کبھی ایک آدمی نرم خو ہوتا ہے مگر بغض رکھنے والوں اور ظالموں کے لئے سخت گیر بھی ہوتا ہے ایک آدمی سخت مزاج ہوتے ہوئے کمزوروں کے لئے نہایت نرم دل ثابت ہوتا ہے کبھی ظاہری شکل آدمی کی اندرونی صفات کو پوشیدہ رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے بلکہ اکثر کسی مضبوط اور قوی آدمی کے لئے سختی اس کی فطری نرمی کے واسطے ایک طرح سے حجاب بن جاتی ہے تاکہ یہ نرمی اس کی کمزوری کا مظہر نہ بن جائے۔ بسااوقات دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص جو اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے میں نہایت اہتمام کرتا ہے اپنے معاملات میں سخت گیر ہوتا ہے کیونکہ اسے یہ بھی خوف ہوتا ہے کہ رحم وکرم کی کیفیت اس پر غالب آکر فرض کی انجام دہی میں رکاوٹ ڈال سکتی ہے۔ یہی حال فاروق اعظم کا تھا وہ اپنے فرض کی انجام دہی میں ایک آہنی دیوار تھے مگر سخت روی اور خشونت ان کی طبیعت اور فطرت نہ تھی، وہ جہاں ایک طرف عادل اور منصف کے لقب سے مشہور ہوئے وہاں رحیم وکریم ہونے میں بھی لاثانی ثابت ہوئے اسی لئے کمزور اور ضعیف خواتین کے ساتھ ان کی رحمدلی کا برتاؤ مشہور ہے اس سلسلہ میں ام عبداللہ بنت حنتمہ فرماتی ہیں کہ جب ہم حبشہ کی ہجرت کا سفر کرنے والے تھے تو حضرت عمر میرے پاس آئے اور کہا کیا تم لوگ جارہے ہو، اس زمانہ میں ہمیں ان دشمنوں کی طرف سے بڑی سختیاں اور مصائب جھیلنے پڑرہے تھے اس لئے میں نے حضرت عمرؓ کو جواب دیا۔ ہاں تم لوگوں نے ہمارے اوپر ظلم اور قہر کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں بے حد تکلیفیں پہونچائی ہیں اس لئے ہم ضرور اللہ کی وسیع سرزمین پر نکل جائیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے فراخی اور کشادگی پیدا فرمادے، حضرت عمرؓ نے اس کے جواب میں کہا اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ اور کہتی ہیں میں نے اس دن ان کی آنکھوں میں جو رقت دیکھی اس سے قبل کبھی نہ دیکھی تھی اس کے علاوہ فاروق اعظمؓ کی ہمشیرہ حضرت فاطمہؓ کے ایمان لانے کا واقعہ بھی مشہور ہے جیسا کہ اکثر روایتوں سے ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کرنے کی بناپر اپنی بہن فاطمہ کو اتنا مارا کہ ان کا چہرہ لہولہان ہوگیا لیکن بہن محسوس کررہی تھی کہ اس غیض وغضب کی تہہ میں وہی خطابی جوش دہک رہا ہے جس کا کچھ حصہ میری رگوں میں بھی رواں ہے اس لئے آخر وہ کیوں خاموش رہے۔ اور وہ بھی اسی جوابی جوش میں بولی یا عدو الله أتضربني على

ن اوحد اللہ۔اے اللہ کے دشمن کیا تو مجھے صرف اس لئے زدوکوب کررہا ہے کہ میں اللہ کی وحدانیت کی قائل ہوگئی ہوں، حضرت عمر نے بغیر کسی توقف کے کہاہاں اس پر فاطمہ بولی اچھا تواب جو تیرادل چاہے کر میں تو گواہی دیتی ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور بے شک ہم نے تمہاری مرضی کے خلاف اسلام قبول کرلیا ہے اسی طرح ان کے شوہر کے بارے میں بھی روایات ملتی ہیں کہ ان کو مارا تھااور ان کے سینہ پر چڑھ کر بیٹھ گئے تھے پھر کچھ خیال آیا توان کو چھوڑدیا، شرمندہ ہوئے اور مکان کے گوشہ میں چلے گئے اس کے بعد صحیفہ کے اوراق طلب کئے جو وہ لوگ پڑھ رہے تھے اس میں قرآن کریم کی آیات لکھی ہوئی تھیں، اس کے فوراً بعد حضرت عمرؓ وہاں سے نکلے، حضرت محمد ﷺ کے پاس پہونچے اور آپ کے سامنے اسلام قبول کرلیا۔ اس گفتگو کے دوران ہمارے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ ہم فاروق اعظم کی قلبی کیفیات اور ان پر ظاہری پیچیدہ خلجانات اور خطرات کا اندازہ لگاسکیں جو بنت حنتمہ اور بنت خطاب جیسی دو خواتین سے گفتگو کے دوران انہیں پریشان کئے ہوئے تھے اس وقت ہمارے سامنے وہ جانباز شجاع کھڑا نظر آتا ہے جس کی بہادری اچھے اچھے بہادروں کے دانت کھٹے کردینے میں کبھی پیٹھ دکھانے کے لئے آمادہ نہ ہوئی، جس کے غیض وغضب کی تیز دھار بڑے بڑے لشکروں کی تلواروں کو کند کردینے کا عزم رکھتی ہے یہاں ان دوعورتوں نے سامنے آخر اس کے غضبناک شعلے کیوں سرد ہوگئے۔ اس کا غصہ کیوں ٹھنڈا ہوگیا اس طرح فاروق اعظم کی شجاعت اور بہادری کے شانہ بشانہ ان کے رحم وکرم اور رقت قلبی کے واقعات بھی کم نہیں ہیں جن سے ان کی داخلی کیفیات ظاہر ہوتی ہیں اس سلسلہ میں ایک واقعہ احمد ابن عمران اپنے والد اور دادا کے واسطہ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں فجر کی نماز کے بعد حضرت عمرؓ کے ساتھ چلا، راستہ میں ایک ضعیف جھکی ہوئی کمر والا آدمی نظر آیا آپ نے معلوم کیا کون ہے بتلایا گیا کہ یہ متمم ابن نویرہ یعنی مالک بن نویرہ کا بھائی ہے، آپ نے اس کے بھائی کے لئے مرثیہ سنانے کی فرمائش کی۔ اس نے بڑا دردناک مرثیہ پڑھا اور جب اس شعر تک پہونچا۔

وکنّا کند مانی جزیمۃ حقبۃ — من الدھر حتی قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا کانی ومالکا — لطول افتراق لم نبت لیلۃ معا

اور عرصہ دراز تک ہم جزیمہ قبیلہ کے مے خواروں کی طرح ہم نشین رہے یہاں تک کہا گیا ہے کہ ہم ہرگز جدا نہ ہوں گے لیکن جب مالک اور میں جدا ہوگئے تو طویل جدائی کی وجہ سے

ایک شب بھی ساتھ نہ گزاری۔ اس پر فاروق اعظم نے فرمایا خدا کی قسم یہ تو نابین یعنی میت کے محاسن بیان کرتا ہے اس کے ساتھ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ زید ابن خطاب (بھائی) پر رحم فرمائے پھر آپ نے نہایت دردناک انداز میں کہا کاش میں شعر کہتا تو میں بھی اپنے بھائی کے لئے ویسے ہی روتا جیسے تم اپنے بھائی کے لئے آہ وبکا کر رہے ہو، پھر آپ نے اس سے سوال کیا تمہیں کس قدر شدت غم نے اس کیفیت سے دوچار کیا ہے اسنے کہا میری یہ آنکھ اس غم میں جاتی رہی تو میں صحیح آنکھ ہی سے روتا رہا یہاں تک کہ میری اچھی آنکھ نے گم شدہ بنیائی والی آنکھ کو بھی خوش نصیب کر دیا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔ فاروق اعظمؓ نے فرمایا یہ بڑا شدید غم ہے کہا ہر ایک شخص اپنے ہلاک ہونے والے پر اسی طرح غم کے آنسو بہاتا ہے اس پر متمم نے کہا اگر میرا بھائی بھی یمامہ کی جنگ میں اسی طرح مارا گیا ہوتا جیسے تمہارا بھائی قتل کیا گیا تو میں کبھی نہ روتا۔ اس جملہ سے حضرت عمرؓ کو بڑا صبر وسکون ملا اور آپ نے فرمایا آج تک مجھے کسی شخص نے اس طرح تسلی نہیں دی جس طرح تم نے دی اور تعزیت کے الفاظ کہے دیکھئے یہ بھی ایک رقیق القلب عمر تھے مگر پس پردہ حالانکہ حضرت عمر کو اپنی اس کیفیت پر پردہ ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ تو دیکھنے والا خود در پردہ کیفیت کو سمجھ لیتا تھا اور واقعہ تو یہ ہے کہ رحمدلی جس میں ہوتی ہے وہ خود قابل رحم لوگوں پر رحم کرتا ہے اور اسی کے برخلاف غصہ کا استعمال بھی۔ مگر یہی انسان جسکی دلیری سے بڑے بڑے دشمن کانپ جاتے ہیں کسی رونے والے بچہ کی آواز پر بے چین ہو جاتا ہے اور اپنی نماز تک توڑ دیتا تاکہ اس کی فریاد رسی کی جائے۔

ایک مرتبہ تاجروں کی ایک جماعت آئی اور مسجد کے پاس ٹھہری آپ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے ساتھ رات میں اس قافلہ کی نگرانی کی لہٰذا دونوں وہاں جاکر رات بھر نوافل پڑھتے رہے اس دوران کسی بچہ کے رونے کی آواز آئی تو آپ نے جاکر ماں سے کہا کہ اس کا خیال کرے۔ بچہ پھر رویا تو آپ نے ماں کو توجہ دلائی تیسری بار بچہ رویا تو آپ نے سختی سے کہا تو کس قدر بری ماں ہے کہ اپنے بچہ کا خیال نہیں رکھتی اس پر ماں نے کہا کہ اس بچہ کا دودھ چھڑا دیا گیا ہے کیونکہ دودھ چھوٹنے سے پہلے حضرت عمر کسی بچہ کا وظیفہ جاری نہیں کرتے اس لئے چھڑا دیا گیا ہے آپ نے اس بچہ کی عمر معلوم کی تو پتہ چلا کہ وقت سے پہلے دودھ چھڑا لیا گیا ہے اس پر آپ نے اعلان کر ولیا کہ کسی بچہ کے دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کی جائے اور آئندہ اسلام کے ہر بچہ کو اس کا حق ملے گا اس طرح اور بھی بھوکے بچوں کا قصہ مشہور ہے اور بہتر

ہے کہ بار بار دھرایا جائے اس سلسلہ میں اسلم کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عمرؓ کے ساتھ نکلا اور ہم لوگ صرار کی وادی تک پہونچ گئے وہاں دیکھا کہ ایک جگہ آگ جل رہی ہے حضرت عمر نے فرمایا اسلم: مجھے محسوس ہورہا ہے کہ یہاں کچھ مسافر ٹھہرے ہوئے ہیں اور شاید انہیں سردی یارات کی وجہ سے پریشانی رہی ہے آؤ چلو دیکھیں بس ہم تیزی سے وہاں پہونچے تو دیکھا کہ ایک عورت آگ جلارہی ہے اور اس کے آس پاس بچے شور مچارہے ہیں حضرت عمر نے فرمایا السلام علیکم یااھل الضوء اور آپ نے برا سمجھا کہ اہل نار کہیں۔ عورت نے جواب دیا وعلیکم السلام پھر آپ نے فرمایا کیا میں قریب آسکتا ہوں۔ عورت نے کہا اگر اچھی نیت سے آئے ہو تو آجاؤ ورنہ چھوڑ دو۔ آپ قریب آئے اور کہا تمہارا کیا حال ہے عورت نے کہا شب اور سردی کا عالم ہے پھر آپ نے پوچھا اور بچوں کا کیا حال ہے یہ شور مچارہے ہیں۔ اس نے کہا بھوک کی وجہ سے آپ نے پھر سوال کیا اور ہانڈی میں کیا ہے وہ بولی بس پانی ہے میں اسی سے ان کو تسلی دے رہی ہوں اسی سے یہ سو جائیں گے اور ہمارے اور خدا کے درمیان تو بس عمر ہی ہے اس پر حضرت عمر نے فرمایا خدا تجھ پر رحم کرے بھلا عمر کو تیرے حال کی کیا خبر ہے۔ اس پر وہ بولی وہ ہمارا سردار بنا ہے اور ہم سے غافل ہے اسلم کہتے ہیں کہ سنتے ہی حضرت میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ چلو، میں تیزی سے ان کے ساتھ چلا یہاں تک کہ ہم آٹے کے گودام تک آئے حضرت عمرؓ نے یہاں سے آٹے کا تھیلا لیا پھر کچھ گھی یا چربی لی اور مجھ سے کہا کہ اسے میرے اوپر لاد دو، میں نے کہا آپ کی طرف سے میں لے چلتا ہوں آپ نے فرمایا کیا قیامت کے دن بھی تم میرا بوجھ اٹھاؤ گے لہٰذا میں نے آپ کے اوپر لاد دیا اور ہم تیزی سے چلے۔ وہاں پہونچ کر آپ نے عورت سے کہا لاؤ میں تمہارے لئے حریرہ تیار کرتا ہوں اس کے بعد آپ نے ہانڈی کے نیچے آگ پھونکنی شروع کی، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ دھواں آپ کی ڈاڑھی میں سے نکل رہا تھا، حریرہ تیار ہوگیا تو آپ نے طشتری میں نکالا اور فرمانے لگے لو بچوں کو کھلاؤ، لاؤ میں اسے ٹھنڈا کرتا ہوں۔ جب بچے سیر ہوکر کھا چکے تو عورت نے آپ سے کہا اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر عطاء کرے اس منصب کے لئے عمر سے تو تم زیادہ اچھے ہو۔ اس طرح کی مثالیں آپ کی زندگی میں بہت ملتی ہیں مگر بعض دینی معاملات میں بھی آپ کا رحم وکرم حاوی رہتا تھا چاہے دوسرے لوگ اس کو پسند نہ

کریں۔ مثلاً ایک مرتبہ آپ نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو کسی دروازہ پر کھڑا سوال کر رہا تھا آپ نے اس سے پوچھا کہ آخر تجھے اس حالت پر آنے کے لئے کس چیز نے مجبور کیا ہے اس نے کہا میں جزیہ ادا کرنے اور ضروریات پوری کرنے اور کبر سنی کی وجہ سے ایسا کر رہا ہوں آپ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے کر آئے۔ اور اس وقت کی ضرورت تو پوری کر دی اس کے بعد خازن بیت المال کو لکھا کہ ذرا اس شخص کی حالت اور اس کے ٹیکس پر غور کرو۔ خدا کی قسم ہم نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے کیونکہ ہم نے اس کی جوانی کو تو کھالیا اور بڑھاپے میں رسوا ہونے کے لئے چھوڑدیا۔ انما الصدقات للفقراء والمساكين والفقراء هم المسلمون وهٰذا من المساكين من اهل الكتاب لہٰذا اس سے جزیہ اور ٹیکس اٹھالیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی اطاعت تو رحم و کرم والا ہی کر سکتا ہے۔ اس طرح عمرؓ نے سڑک سے اٹھائے ہوئے بچہ کے لئے بھی اسی طرح ایک سو درھم ماہانہ وظیفہ مقرر کیا جس طرح معروف والدین والے بچہ کو دیا جاتا تھا تاکہ حرام اولاد سے عوام کی نفرت دور ہو۔ آپ کی رحمدلی کا حال تو یہ تھا کہ ان بے زبان جانوروں پر بھی رحم فرماتے جو شکایت کی سکت نہیں رکھتے چنانچہ آپ نے ایک حمال کو بہت ڈانٹا جو اپنے جانور پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ لاد رہا تھا آپ اکثر جانور کی پیٹھ میں ہاتھ ڈال کر دوا لگاتے اور فرماتے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تیری اس تکلیف کے باعث مجھ سے اللہ تعالیٰ سوال نہ کرے اور اسی کے ہم معنی کلام آپ سے منقول ہے کہ اگر ایک بکری کا بچہ بھی فرات کے کنارے مر جاتا ہے تو میں ڈرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ عمر سے سوال کرے گا ذمہ داری کا یہ احساس ایک عظیم احساس ہے جس سے ہم ان کی مجموعی رحمدلی اور عدل و انصاف کی عادات کا اندازہ لگا سکتے ہیں اس کے علاوہ عربوں کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بہت غیور ہوتے ہیں اس لئے اس صفت کے ساتھ اگر فاروق اعظم کو پرکھا جائے تو اس میں بھی آپ منفرد ہی نظر آئیں گے۔ اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ جو آپکے بہترین رفیق اور اچھی طرح آپ کے پہچاننے والے تھے فرماتے ہیں۔ ان الله غيور يحب الغيور وان عمر غيور۔ بے شک اللہ تعالیٰ غیور ہے، غیور کو پسند کرتا ہے اور بے شک عمر غیور ہیں۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ اپنے اصحاب کے درمیان گفتگو فرما رہے تھے اور حضرت عمر بھی ان میں موجود تھے آپنے فرمایا کہ ایک مرتبہ مجھے خواب میں

جنت دکھائی گئی تو اچانک میں نے دیکھا کہ ایک عورت ایک محل کے پاس وضوء کررہی ہے میں نے پوچھا یہ کس کے لئے ہے کہا گیا عمر کے لئے ہے اس پر مجھے عمر کی غیرت یاد آئی اور میں وہاں سے الٹے پاؤں واپس آ گیا۔ حضرت عمر اس پر رونے لگے اور عذر خواہی کرتے ہوئے بولے یا رسول اللہ کیا میں آپ سے زیادہ غیر تمند ہوں اس طرح آپ کی یہ غیر تمندی عام طور پر مشہور تھی اور خاص طور پر خواتین میں اس کا چرچا تھا ایک مرتبہ خواتین حضور کے پاس زور، زور سے باتیں کررہی تھیں کہ اچانک حضرت عمرؓ تشریف لے آئے اور داخل ہونے کی اجازت چاہی بس پھر کیا تھا عورتیں جلدی سے پردہ کرنے لگیں اور حضور کے چہرہ پر مسکراہٹ آ گئی حضرت عمر نے فرمایا یا رسول اللہ باری تعالیٰ ہمیشہ آپ کو مسکراتا رکھے گویا آپ مسکرانے کی وجہ دریافت کرنا چاہتے تھے اس پر حضور نے فرمایا مجھے ان عورتوں پر تعجب ہورہا ہے یہ میرے پاس بیٹھی تھیں لیکن جونہی تمہاری آواز سنی پردہ کرنے لگیں حضرت عمر نے فرمایا یا رسول اللہ آپ زیادہ مستحق ہیں کہ آپ سے ڈریں پھر آپ عورتوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے اے اپنی جانوں کی دشمن تم مجھ سے ڈرتی ہو اور رسول اللہ سے نہیں ڈرتیں اس پر خواتین بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بولیں ہاں اس لئے کہ تم رسول اللہ سے زیادہ درشت اور سخت ہو۔

پھر آپ کی یہی طبعی غیرت تھی کہ اسی کے اشارے پر امہاۃ المومنین کو پردہ کا حکم ہوا جب آپ نے ان میں سے کسی ایک کو رات کی تاریکی میں کسی ضرورت سے راستہ میں جاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا اے فلاں میں نے تمہیں پہچان لیا ہے حالانکہ وہ لمبی چادر میں تھیں مگر آپ کا مقصد اس سے حجاب کی اہمیت کو واضح کرنا تھا لیکن اس سلسلہ میں ایک خاتون نے خود حضرت عمرؓ سے ترش لہجہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا اے عمر تم ہمارے سامنے تھے اور ہمارے گھروں میں وحی نازل ہورہی تھی یعنی یہ کہ اگر حجاب کا اتنا سخت حکم ہوتا تھا تو وحی آجاتی۔

اس کے علاوہ فاروق اعظم کی غیرت صرف خواتین کے پردہ ہی تک محدود نہ تھی آپ میں وطنی عظمت و قار، لباس اور تہذیب کی بھی غیرت تھی اس لئے آپ غیر عربوں میں دوسروں کا اختلاط اور عملی دخل پسند نہ فرماتے نہ عربی سیاست میں دوسروں کی دخل اندازی کو گوارہ کرتے تھے اس سلسلہ میں بہت سی روایات ملتی ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ فاروق اعظم کی غیرت و حمیت صرف دین اور حق کی خاطر تھی اپنی ذات کے لئے نہ تھی۔

امام اھل سنت

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ

عبدالحی فاروقی صدر شعبہ اسلامیات جامعہ ہمدرد نئی دہلی

تاریخ ہند کا وہ دور جس کو عہد سلطنت کہا جاتا ہے دینی نقطۂ نظر سے بڑا خیر و برکت کا دور تھا۔ ہندوستان کے چپہ چپہ پر صوفیاء و مشائخ کی خانقاہیں قائم تھیں اور کتاب و سنت کی تعلیمات سے ملک کا ہر گوشہ منور ہو رہا تھا۔ چنانچہ اودھ کی سر زمین بھی اس دریائے فیض و کرم سے سرسبز و شاداب ہو رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ اور اس کے آس پاس کے قصبات مثلاً کاکوری، سندیلہ، سترکھ، صفی پور بلگرام، خیر آباد، ردولی، اور بہرائچ وغیرہ ایک عرصہ دراز تک مدارس اور خانقاہوں سے معمور تھے۔ علماء و مشائخ کو حکومت وقت کی طرف سے وظائف و جاگیریں ملی ہوئی تھیں جن کی بدولت وہ معاش کی طرف سے بے فکر ہو کر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی، تعلیم و تدریس میں ہمہ وقت منہمک رہتے تھے اور اسی کے ساتھ تذکیۂ نفس و اصلاحی باطن کی خاطر وہ ہر قریہ و ہر قصبہ میں خانقاہی نظام قائم کرنے میں مصروف رہا کرتے تھے لیکن بدقسمتی سے جب یہ زمانہ گذر گیا اور مغلوں کی حکومت کا دور دورہ شروع ہوا تو صورت حال مختلف ہو گئی۔ مغل دور کا ابتدائی حصہ تو پھر بھی غنیمت تھا، دینی معاشرے میں تباہی و بربادی تو اس کے بعد آئی چنانچہ جب مغل دور کا انحطاط شروع ہوا ہے تو حکومت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کے سیاسی و علمی افق پر ایک نئے گروہ نے سر اٹھانا شروع کیا جس کو اب تک کی حکومتوں نے ابھرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ یہی وہ گروہ تھا جس کے یہاں شریعت اسلامیہ کی طرح خدا، رسول، قرآن، جنت و دوزخ اور حشر و نشر جیسے تمام الفاظ ضرور مروج تھے مگر ان کی تعبیریں عام اسلامی معتقدات سے مختلف تھیں۔ مسلم معاشرے میں وہ پیران طریقت، ادیبوں، شاعروں، طبیبوں، قاضیوں مفتیوں اور مدارس میں اساتذہ کے بھیس میں داخل ہو کر اس طرح رچ بس گئے تھے کہ عوام تو عوام خواص کو بھی ان کو شناخت کرنا مشکل

ہو گیا تھا۔ شاطران وقت کا یہ طبقہ اپنے ساتھ اپنا علیحدہ تعلیمی نظام، اپنا الگ ادبی سرمایہ اپنے مخصوص افکار و خیالات اور ایک نیا دینی مسلک لے کر ہندوستان پر مسلط ہوا تھا۔

ہم نے اپنے مقالہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ اودھ کا ماحول مولانا کی پیدائش، تعلیم و تربیت اور تدریسی خدمات وغیرہ پر، دوسرا حصہ تحریک مدح صحابہ و تبرا پر اور تیسرا حصہ دینی و اصلاحی اور علمی خدمات پر مشتمل ہے۔

حصہ اول

اودھ کا ماحول، مولانا کی پیدائش، تعلیم و تربیت اور تدریسی خدمات

اودھ کا سیاسی و سماجی پس منظر

نواب سعادت خاں برہان الملک میرزا محمد امین نیشاپوری (م ۱۷۳۷ء) کو بادشاہ دہلی کی طرح سے اودھ اور اس کے اطراف میں وزیر الممالک بنایا گیا تھا جو مذہباً شیعہ تھے، ان کے بعد یکے بعد دیگرے تقریباً بارہ نوابین یہاں ان کے وارث بنے جو اپنے مخصوص عقائد کے بارے میں بہت پر جوش اور اپنے مذہب کی تبلیغ و ترویج کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کرتے رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی طاقت بڑھانی شروع کردی اور دہلی کی مرکزی حکومت کی روز بروز تنزلی اور انحطاط سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان علاقوں میں اپنی گرفت مضبوط کرلی چنانچہ ایک وقت وہ آگیا کہ نواب غازی الدین حیدر (م ۱۸۲۷ء) نے اودھ میں اپنی مطلق العنان بادشاہت کا اعلان کردیا اور دہلی کے مرکز سے اپنا سیاسی رشتہ قائم کرلیا۔ ان نوابین اودھ میں مذہبی غلو بہت تھا، ان کی عام پالیسی یہ تھی کہ ان کی مملکت میں تمام کلیدی عہدے صرف اپنے ہم مسلک لوگوں کو ہی دئے جائیں اور عام مسلمانوں کو انتظامی معاملات سے دور رکھا جائے تاکہ معاشی اعتبار سے وہ پسماندہ ہو کر ایک ادنیٰ رعیت کی حیثیت سے زندگی گذاریں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے بڑے بڑے سنی خانوادوں اور اہل علم خاندانوں کی جاگیریں اور سرکاری وظائف مختلف حیلوں بہانوں سے ضبط اور موقوف کرنا شروع کردیا۔ اور پھر اسی طرح اکثر دینی مدارس اور خانقاہوں کی امدادیں بھی بیک جنبش قلم موقوف کردی گئیں۔ ان اقدامات سے دینی حلقوں میں تنگ دستی اور مفلوک الحالی پھیلنے لگی لیکن جو لوگ جاگیروں کی

ضبطی اور وظائف کی بندش کے خوف سے اپنا آبائی مذہب و مسلک ترک کردیتے تھے ان کی جاگیریں و وظائف واگذار کردیئے جاتے تھے اس طرح سیکڑوں خاندانوں نے حکمراں طبقہ کا مذہب اختیار کرلیا تھا لیکن جو عزیمت پرعمل کرتے ہوئے اپنے مذہب و مسلک پر بدستور قائم رہے وہ ہمیشہ کے لئے اپنی جائیدادوں اور روزینوں سے محروم کردیئے گئے اور رفتہ رفتہ اپنے مدارس اور خانقاہوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اس طرح علم و عرفان کے وہ سرچشمے جو صدیوں سے رشد و ہدایت کے مرکز بنے ہوئے تھے آہستہ آہستہ ویران ہوتے گئے۔ انہی حالات کا نتیجہ تھا کہ اہل سنت کا وہ طبقہ جو اب تک پوری دلجمعی اور فراغت کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں ہمہ تن مصروف تھا وہ زبانوں پر تالے لگاکر گوشہ نشینی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہوگیا تھا اس قسم کی ابتلاء و آزمائش کا سلسلہ جو نواب براہان الملک کے دور سے شروع ہوا تھا وہ کم و بیش نواب واجد علی شاہ (معزول ۱۸۵۶ء) آخری تاجدار اودھ کے زمانے تک جاری رہا۔

بات صرف یہیں تک محدود نہ تھی بلکہ ارباب علم و فضل اور دنیاوی علائق سے اپنے کو دور رکھنے والے مشائخین عظام کو جسمانی اذیتیں بھی پہونچائی گئیں۔ اس طرح کے دلخراش اور اندوہناک واقعات کی تفصیل میں جانے سے قلم لرزتا ہے اور دل و دماغ اس کے لئے تیار نہیں کہ ان تلخ داستانوں کو دھرلیا جائے۔ تاریخ و تذکرہ کی کتابیں ان واقعات سے بھری ہوئی ہیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م ۱۷۶۲ء) اور ان کے نامور صاحب زادے شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ (م ۱۸۲۴ء) کے ساتھ ان تنگ نظر حکمرانوں نے کیا کچھ نہیں کیا سلسلہ نقشبندیہ کے صاحب سجادہ بزرگ اور اردو زبان کے معروف شاعر حضرت میرزا مظہر جانجاناں دہلویؒ (م ۱۷۸۰ء) کی تو شہادت ہی انہی عناصر کے ہاتھوں ہوئی۔ مولانا حیدر علی فیض آبادیؒ (م ۱۸۸۱ء) کو اسی گروہ نے جلاوطن کرکے حیدر آباد دکن جانے پر مجبور کیا، ان کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے در شیعت میں فیصلہ کن کتابیں لکھی تھیں اسی طرح مولوی حکیم نجم الغنی خاں رامپوری کی بعض کتابوں کا اودھ اور رامپور کی حدود میں داخلہ ممنوع قرار دیدیا گیا تھا کیونکہ انہوں نے شاہان اودھ کے بعض اخلاق سوز اور ناگفتہ بہ حالات کا پردہ چاک کیا تھا۔ اودھ کی شیعی حکومت نے علامہ بحر العلوم مولانا عبد الحی فرنگی محلیؒ (م ۱۸۱۹ء) اور استاذ الاساتذہ ملا حسن فرنگی محلیؒ (م ۱۷۸۴ء) کا لکھنؤ میں رہنا دوبھر کردیا تھا اسی لئے مجبوراً ان حضرات کو وطن چھوڑکر دیار غیر میں پناہ لینی پڑی۔ یہ تمام مثالیں ظلم و تعدی کے ان سیکڑوں

واقعات میں سے چند ہیں جن کا تذکرہ یہاں کیا گیا ہے اودھ میں تاریخ کے اس سیاہ دور میں اہل سنت کی ذی علم اور دینی خانوادوں پر کیا گذری ہے اس کی کچھ جھلک اگر دیکھنا ہو تو مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی کتاب مآثر الکرام اور موجودہ دور کے صاحب قلم عالم دین مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کی کتاب "دیار پورب کے علم اور علماء" کا مطالعہ کرنا چاہئے جن میں اودھ کی عظمت رفتہ پر آنسو بہاتے ہوئے ایسے بہت سے معروف خاندانوں کی نام بنام نشاندہی کی گئی ہے جو گروہی مظالم سے تنگ آکر اپنے آبائی مذہب ومسلک کو بھی خیر باد کر بیٹھے اور آج ان کی اولاد اہل سنت کے دائرے سے خارج ہو چکی ہے۔

قانون قدرت ہے کہ ابتداءً باطل کو طرح دی جاتی ہے کہ وہ جبر واستبداد کے ہر حربہ کو آزما کر دیکھ لے اور دوسری طرف اہل حق کی ثابت قدمی اور حق گوئی کا بھی اچھی طرح امتحان لیا جاتا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ کس حد تک جادۂ حق وانصاف پر چل سکتے ہیں جب یہ تمام مراحل طے ہو چکتے ہیں تب رحمت خداوندی کو جوش آتا ہے اور باطل کے آہنی پنجوں کو مروڑنے کے لئے فرعونیت کے ماحول میں کسی موسیٰ کو لایا جاتا ہے جو حالات کا مقابلہ کر کے حق کی تائید ونصرت کرتا ہے اور اس طرح کفر وشرک کے بادل چھٹنے شروع ہوتے ہیں اور ایمان وعمل کی لطیف وخنک ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔

پیدائش وتعلیم وتربیت

اودھ کا شیعی مرکز پہلے فیض آباد بنا اور پھر لکھنؤ اس کا مامن وملجا بن گیا جہاں آج بھی اس کے بچے کچھے آثار باقی ہیں، اسی لکھنؤ سے سات آٹھ میل کے فاصلہ پر مشہور مردم خیز خطہ قصبہ کاکوری میں مولانا حافظ ناظر علیؒ (م ۱۹۱۱ء) کے گھر حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کی ولادت ہوئی (۱) ان کا نام آپ کے والد کے شیخ حضرت مولانا شاہ عبد السلام صاحب ہنسویؒ نے تجویز فرمایا تھا اور آپ پر توجہ بھی ڈالی تھی اور یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ بیج ڈال دیا گیا ہے انشاء اللہ بار آور ہوگا۔

آپ کی پرورش اور تعلیم وتربیت بڑے ناز ونعم سے ہوئی تھی ابتدائی کتابیں کاکوری، ہنسوہ (ضلع فتح پور دہلی) کوڑہ جہان آباد (ضلع فتح پور) اور تحصیل کماسن (ضلع باندہ) میں مختلف

---

(۱) شجرہ طیبہ مرتبہ مولانا لکھنوی ص۔ ۱۳۰، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ۔

اساتذہ سے پڑھیں جو آپ کے لئے بطور اتالیق مقرر کئے گئے تھے فارسی کی مکمل تعلیم اور عربی کی کتب درسیہ میں جلالین، ہدایہ، قطبی اور نور الانوار تک ضلع فتح پور اور کماسن ضلع باندہ میں مختلف اساتذہ سے پڑھ کر لکھنؤ تشریف لائے اور یہاں استاذ الاساتذہ مولانا شیخ محمد عبدالحی فرنگی محلیؒ (م ۱۸۸۶ء) کے جلیل القدر شاگرد و جانشین اور لکھنؤ کے مرجع خلائق استاذ مولانا سید محمد عین القضاۃ صاحب نقشبندی مجددیؒ (۱) (م ۱۹۲۵ء) سے بقیہ کتب درسیہ پڑھیں بلکہ بعض وہ کتب بھی جو اس وقت نصاب سے خارج ہو چکی تھیں انہی سے پڑھیں۔ (۲) مولانا سید عین القضاۃ سے پڑھنے کا یہ سلسلہ ۱۸۹۴ء۔ ۱۳۱۰ھ سے ۱۸۹۹ء۔ ۱۳۱۷ھ تک رہا اس طرح آپ نے حضرت مولانا ہی کی شاگردی میں مروجہ نصاب تعلیم مکمل کر کے فراغت حاصل کرلی۔ اس کے بعد علم طب کی طرف توجہ کی اور خاندان عزیزی لکھنؤ کے مشہور طبیب مولوی حکیم عبدالولی لکھنویؒ (۳) کی خدمت میں رہ کر طب کی مکمل تعلیم حاصل کی،

---

(۱) حضرت مولانا سید عین القضاۃ صاحب حیدر آبادی ثم لکھنویؒ ۱۸۸۵ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے بچپن میں ہی میں آپ کے والد ماجد سید محمد وزیر آپ کو لے کر معظمہ چلے گئے اور مسلسل گیارہ سال آپکا وہاں قیام رہا ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی پھر مزید تعلیم کے لئے آپ کو والد ماجد حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلیؒ کی خدمت میں لکھنؤ لائے۔ استاذ گرامی نے بڑی محبت اور شفقت سے آپ کو پڑھایا اور اپنا آبائی مکان آپ کو رہنے کے لئے دیا۔ آپ نے مستقل طور پر لکھنؤ میں رہائش اختیار کرلی۔ آپ نے تمام عمر شادی نہیں کی۔ انتہائی سادہ مزاج، مہمان نواز اور متواضع شخصیت کے مالک تھے آپ کا حلقہ درس بہت وسیع اور مقبول تھا اسی لئے آپ کو مولانا فرنگی محلیؒ کا جانشین قرار دیا گیا تھا بیعت و خلافت آپ کو حضرت شیخ موسیٰ جی ترکیسری (م ۱۸۹۱ء) سے تھی جو سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے لکھنؤ میں آپ نے کٹرہ حیدر حسین میں ایک وسیع و عریض عمارت میں قرآن مجید کی تعلیم کے لئے ایک عظیم الشان مدرسہ عالیہ فرقانیہ قائم کیا اور اس میں ساتھ ہی ساتھ تجوید و قرأت سکھانے کا بھی بندوست کیا آج شالی ہند میں حفظ و قرأت کا جو عام رواج ہوا ہے وہ آپ ہی کی بدولت ہوا ہے تدریس میں مصروفیتوں کے ساتھ مولانا نے چند کتب و رسائل بھی تحریر کئے تھے جو اکثر شائع ہو چکے ہیں۔ ۲۸ جنوری ۱۹۲۵ء میں ۶۸ سال کی عمر میں لکھنؤ میں وصال ہوا اور وہاں اپنے مدرسہ کے صحن میں ہی مدفون ہوئے۔ تفصیل کے لئے دیکھیں راقم الحروف کا مقالہ برہان دہلی ۱۹۷۵ء اور ماہنامہ دارالعلوم دیوبند مارچ ۱۹۹۳ء النجم لکھنؤ مرتبہ مولانا لکھنویؒ، نمبر ۱۱۔ جلد دوم ۱۳۴۳ھ

(۲) شجرہ طیبہ ص: ۱۳ راحۃ القلوب بذکر المحبوب (قلمی) مرتبہ مولانا لکھنوی ص: ۳۰

(۳) حکیم عبدالولی ۱۸۷۳ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے دس برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، ابتدائی عربی کی تعلیم مولانا سید محمد مقیم رائے بریلوی سے حاصل کی پھر منطق، فلسفہ و حکمت کی تعلیم مولوی افہام اللہ فرنگی محلی سے حاصل کی طبی تعلیم اپنے والد حکیم عبدالعلی اور چچا حکیم عبدالعزیز مرحوم سے حاصل کی۔

بقیہ اگلے صفحہ پر

اس کے بعد کچھ دنوں مطب بھی کیا مگر مولانا سید عین القضاۃؒ کے مشورے پر مطب کا یہ سلسلہ ترک کر کے علوم دینیہ کی درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔

تدریسی خدمات

تعلیم سے فارغ ہونے کے کچھ ہی دنوں کے بعد حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے آپ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت مدرس عربی بلالیا جو اسی زمانے میں تازہ تازہ لکھنؤ میں قائم ہوا تھا لیکن لکھنؤ کی شیعیت نواز سرزمین سے باوجود وطن ہونے کے کوئی لگاؤ نہ ہونے کی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں کے بعد آپ دہلی چلے گئے اور وہاں مرزا حیرت دھلوی کے مطبع میں بحیثیت مصنف و مترجم کام کرنے لگے، یہاں تین چار سال قیام رہا مگر مرزا حیرت کے بعض انتہا پسندانہ عقائد کی بناء پر یہاں بھی دل نہیں لگا چنانچہ اپنے استاذ عالی مقام کے ایماء اور خواہش پر آپ لکھنؤ واپس آئے اور مدرسہ عالیہ فرقانیہ میں مدرس عربی و فارسی اور مفتی مدرسہ کی حیثیت سے دس بارہ سال تک کام کیا۔ بہت عرصہ کے بعد اہل امروہہ کے اصرار پر ۴۶-۱۹۴۵ء میں آپ نے مدرسہ اسلامیہ عربیہ، محلہ چلہ امروہہ ضلع مراد آباد میں بھی دو سال تک درس دیا تھا اس طرح سوائے ان چند مقامات کے آپ نے۔

بقیہ گذشتہ کا

مطب کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جس میں بیک وقت ساٹھ ستر طلبا شرکت کرتے تھے حکیم سید عبدالحسنی رائے بریلوی شفاء الملک حکیم عبدالحسیب دریابادی اور مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی آپ کے مشہور شاگردوں میں۔ حکیم صاحب یونانی طب کے ساتھ آیورویدک طب کے اختلاط کے موافق تھے اسی سبب سے ۱۹۱۰ء میں آل انڈیا ویدک اور یونانی طبی کانفرنس کے سلسلہ میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کے ساتھ مل کر سرگرم حصہ لیا تھا وہ ملک میں مروج تمام طریقہ ہائے علاج سے فائدہ اٹھا کر طب یونانی کے دامن کو وسیع تر بنانا چاہتے تھے آپ بہت وسیع النظر حوصلہ مند انتہائی مہمان نواز اور ملی درد رکھنے والے طبیب تھے انہیں ادب اور موسیقی سے بھی لگاؤ تھا زندگی کے آخری دور میں تصوف سے بھی دلچسپی رکھنے لگے تھے ۱۴ سال کی عمر میں ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ میں وفات ہوئی۔ نزھۃ الخواطر ج: ۸، ص: ۱۶-۳۱۶ اور خاندان عزیزی مرتبہ حکیم سید ظل الرحمٰن ص: ۲۰۶-۲۱۶ علی گڈھ ۱۹۷۸ء۔

ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی لکچرر شعبۂ دینیات (سنی)
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ابن جوزی چونکہ وعظ میں بے نظیر تھے اس لیے اس موضوع پر ان کی تمام تصانیف زبان واسلوب کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی ہیں لیکن یہ بات ان کی دوسری کتابوں میں نہیں۔ چنانچہ امام ذہبی لکھتے ہیں: وکان کثیرا الغلط فیما یصنفه فانه کان یفرغ من الکتاب ولایعتبره قلت نعم۔ له وهم کثیر فی توالیفه(۱۸)(ابن جوزی تصانیف میں اکثروبیشتر غلطیاں کرتے تھے کتاب لکھ کر فارغ ہوجاتے تھے لیکن اس پر نظر ثانی نہیں کرتے تھے میں کہتا ہوں کہ انہیں تالیف کتب میں اکثر وہم ہوجاتا تھا)

اسی طرح ابن جوزی کی مشہور کتاب "الوفاباحوال المصطفیٰ" کے محقق عبدالواحد اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔یقع السهو فی تصانیفه وانه کان یتم الکتاب فلا یراجعه(۱۹)(ابن جوزی کو تالیف کتب میں بھول چوک واقع ہوجاتی تھی وہ کتاب لکھ کر فارغ ہوجاتے تھے لیکن دوبارہ اسے پلٹ کر نہیں دیکھتے تھے)

ابن جوزی ایک کتاب لکھنے کے بعد اس پر دوبارہ نظر ڈالنے اور اس کی تنقیح وتہذیب کے بجائے فوراً دوسری کتاب کی تالیف شروع کردیتے تھے اس کی وجہ سے ان کی کتابوں کی تہذیب نہ ہوسکی اور نتیجہ میں ان میں غلطیاں باقی رہ گئیں یہ غلطیاں زیادہ تر ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں جن کا موضوع حدیث ہے۔

شیخ موفق الدین نے فرمایا: کان ابن الجوزی امام اهل عصره فی الوعظ وصنف فی فنون العلم تصانیف حسنة وکان صاحب فنون وکان

يدرس الفقه ويصنف فيه وكان حا فظا للحديث وصنف فيه الا اننا لم نرض فی تصانیفه فی السنة ولا طريقته فيها(۲۰)ابن جوزی وعظ میں اپنے زمانے کے امام تھے اور اس فن میں انکی بہت عمدہ تصانیف ہیں اور صاحب علوم و فنون بھی تھے۔ فقہ کا درس دیتے تھے اور اس میں بھی ان کی تصانیف ہیں حافظ الحدیث تھے چنانچہ علم حدیث میں بھی ان کی تالیفات ہیں مگر ہمیں سنت (حدیث) میں ان کی تالیفات اور ان کے طریقہ کار پسند نہیں)

یہی وجہ ہے کہ ابن جوزی کی حدیث کی کتابوں میں فضائل، ولائل و معجزات اور میلاد النبی کے ابواب میں بہت سی موضوع روایتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ محقق (الوفا باحوال المصطفیٰ) مصطفیٰ عبد الواحد نے لکھا ہے کہ ابن جوزی نے کتاب کے مقدمہ میں یہ دعویٰ کیا کہ: لا اخلط الصحيح بالكذب كما يفعل من يقصد تكثير روايته، (میں اس کتاب (یعنی الوفا باحوال المصطفیٰ) میں صحیح روایتوں کے ساتھ باطل اور جھوٹی روایات نہیں ملاؤنگا جیسا کہ تکثیر روایت کے خواہاں لوگ کرتے ہیں) لیکن وہ اپنے اس عہد کو پورا نہ کر سکے۔ اگر چہ ان کی اس کتاب میں بیشتر روایات قابل اعتراض نہیں لیکن بعض روایات ایسی بھی ہیں جو سرے سے باطل اور موضوع ہیں۔ جن میں بعض کو خود انہوں نے موضوعات میں شمار کیا ہے جیسے "این کنت وآدم فی الجنة" (صحابہ میں سے کسی نے دریافت کیا کہ اے نبیؐ آپ اس وقت کہاں تھے جب حضرت آدم جنت میں تھے) اور "لولا محمد ما خلقت آدم" (اگر محمدؐ نہ ہوتے تو میں آدم کو نہ پیدا کرتا) وغیرہ۔ (۲۱)

یہ روایات ایسی ہیں جنہیں خود ابن جوزی نے موضوع کہا ہے اس کے علاوہ ایک بڑی تعداد ان روایات کی ہے جن کے بارے میں انہوں نے سکوت اختیار کیا لیکن دیگر محدثین نے انہیں موضوع بتایا ہے ابن جوزی نے ان روایات کو اپنی کتب جیسے "میلاد النبی" اور "الوفا باحوال المصطفیٰ" میں جگہ دی ہے جیسے مندرجہ روایات:

۱- آپ کی ولادت کے وقت سلاطین عالم کے تخت جنبش میں آگئے۔ دریائے ساوہ خشک ہو گیا اور وادیٔ سماوہ جو خشک تھا جاری ہو گیا کسریٰ (شاہ فارس) کا محل شق ہو گیا اور اس کے کنگرے گر گئے (۲۲)

اس روایت کے راوی کو اگر چہ ابن جوزی نے بیان نہیں کیا لیکن دوسرے ذرائعوں سے معلوم ہوتا ہے اس کے مرکزی راوی مخزوم بن ہانی ہیں جو اپنے والد ہانی مخزوم سے نقل

کرتے ہیں محدثین کے نزدیک یہ دونوں باپ اور بیٹے مجہول ہیں یعنی محدثین اور ائمہ رجال میں ان سے کوئی بھی واقف نہیں چہ جائیکہ ان دونوں کی ثقاہت کے بارے میں معلوم ہو۔ دوسرے یہ کہ مخزوم اپنے والد "ہانی" کی عمر ڈیڑھ سو برس بتاتے ہیں سید سلیمان ندوی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہانی نام کا کوئی صحابی جو مخزومی اور قریشی ہو اور اس کی عمر ڈیڑھ سو برس ہو معلوم نہیں"۔)(۲۳)

۲- آپؐ پیدا ہوتے ہی سجدہ میں چلے گئے اور انگشت مبارک آسمان کی طرف بلند کئے ہوئے اشارہ کر رہے تھے۔(۲۴)

اس روایت کو علامہ سیوطی نے کہا کہ یہ نہایت درجہ منکر ہے(۲۵) دوسرے یہ کہ یہ روایت ابو بکر بن ابو مریم سے مروی ہے جن کے بارے میں محدثین کی رائے یہ ہے کہ یہ ضعیف ہیں(۲۶)۔ اس کے علاوہ اس روایت کے منتہی راوی حضرت ابن عباس ہیں جو واقعہ ولادت کے پچاس برس بعد پیدا ہوئے۔ حضرت ابن عباس یہ نہیں بتاتے کہ انہوں نے اسے کس سے سنا ہے۔ اس لیے یہ روایت مرسل بھی ہے۔ اور سید سلیمان ندوی نے فرمایا ہے کہ یہ روایت سرے سے موضوع ہے۔(۲۷)

۳- آپؐ اس وقت بھی نبی تھے جب آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھے(۲۸)

اس روایت کو علامہ ابن تیمیہ اور طاہر فتنی نے موضوع کہا ہے(۲۹) اسی کے ہم جنس ایک روایت امام ترمذی نے بھی اپنی الجامع میں نقل کی ہے لیکن انہوں نے اس کی بابت فرمایا کہ یہ غریب ہے(۳۰)۔

۴- جب اللہ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا اور ان میں روح ڈالی اور انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ جنت کے دروازہ پر لکھا تھا: لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ حضرت آدمؑ نے کہا اے رب کیا تو نے ایسی بھی مخلوق پیدا کی ہے جو تجھے مجھ سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ فرمایا: ہاں۔ وہ تمہاری اولاد میں سے ہیں اگر وہ نہ ہوتے تو میں تمہیں بھی پیدا نہ کرتا(۳۱)

اس روایت کے راوی عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعم ہیں جو غایت درجہ ضعیف ہیں۔ ان کے بارے میں امام احمد بن حنبل۔ امام نسائی، ابوزرعہ اور ابو حاتم نے کہا یہ ضعیف ہیں۔ علی بن مدینی فرمایا کہ غایت درجہ ضعیف ہیں۔ خود ابن جوزی نے ان کے بارے میں فرمایا کہ تمام ائمہ کا ان کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے۔ ابن خذیمہ نے فرمایا کہ عبدالرحمٰن ان لوگوں میں

ہیں جن سے اہل علم احتجاج نہیں کرتے اس لیے کہ ان کے اندر سوء حفظ کی خرابی تھی۔ ابن حبان نے فرمایا کہ عبدالرحمٰن روایات کو غیر دانستہ طور پر الٹ پلٹ کر دیتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے کثرت سے مرسل روایتوں کو مرفوع اور موقوف کو مسند بنادیا۔ اس لیے محدثین نے انہیں متروک قرار دیا۔ حاکم نے فرمایا کہ عبدالرحمٰن اپنے والد سے موضوع حدیثوں کی روایت کرتے تھے (۳۲)۔ امام ذہبی نے اس روایت کو موضوع کہا ہے۔ (۳۳) حافظ ابن تیمیہ نے فرمایا کہ یہ روایت اسرائیلیات کے قبیل سے ہے اس طرح کی روایتوں کی بنیاد پر شریعت کی بناء جائز نہیں اور باتفاق مسلمین ان سے دین میں کسی طرح کی حجت نہیں کی جاسکتی۔ (۳۴)

۵- جس وقت حضرت عبداللہ کی شادی حضرت آمنہ سے ہوئی اس رات قریش کی سو عورتیں حسد سے مر گئیں (۳۵) (جو حضرت عبداللہ سے شادی کرنے کی خواہشمند تھیں اور اس نور نبوت کو اپنے اندر منتقل کرنا چاہتی تھیں جسے انہوں نے حضرت عبداللہ کی پیشانی پر دیکھا تھا)

مولانا سید سلیمان ندوی نے فرمایا کہ یہ روایت بالکل بے سند اور بے اصل ہے کسی معتبر کتب حدیث میں اس کا پتہ نہیں۔ (۳۶)

اس طرح کی دوسری بہت سی روایات ابن جوزی نے الوفا باحوال المصطفیٰ اور میلاد النبی میں جمع کر دی ہیں جو حدیث کی کسی بھی معتبر کتابوں میں نہیں پائی جاتیں بلکہ عام مسانید و معاجم اور مصنفات مشہورہ تک ان سے خالی ہیں۔ یہ روایات مختلف الفاظ و تعبیر اور بعض حذف و اضافہ کے ساتھ حافظ ابو نعیم اور علامہ بیہقی کی دلائل النبوۃ، سیرت ابن عساکر اور تاریخ طبری وغیرہ میں واقعات میلاد کے تحت نقل کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابیں کتب حدیث کا درجہ نہیں رکھتیں۔ بلکہ یہ فضائل اور تاریخ و سیرت کے قبیل سے ہیں جن میں روایات اور واقعات درج کرتے وقت ان کی اس طرح تحقیق و تنقید نہیں کی گئی جس طرح کتب حدیث میں درج روایات کی گئی ہیں۔ اس لئے ان میں کثیر تعداد میں ضعیف روایات پائی جاتی ہیں۔ خاص طور پر میلاد النبی کے باب میں ان کتب میں درج بیشتر روایتیں صحیح کے درجہ تک نہیں پہنچتیں۔ ابن جوزی نے فضائل و معجزات اور دلائل نبوت کے ابواب میں انہیں کتب سے روایات اخذ کیں اور ان کی روایات کو بلا نقد و تحقیق اپنی کتب میں نقل کر دیا۔ الوفا باحوال المصطفیٰ میں علامہ ابن جوزی نے بیشتر مقامات پر ابن قتیبہ کی سیرت النبی کے

حوالے سے بہت سی روایات نقل کی ہیں اور سیرت ابن قتیبہ میں زیادہ تر روایات توراۃ و انجیل کے حوالے سے نقل ہوئی ہیں۔

علامہ ابن جوزی کی بعض کتابوں میں اس طرح کی روایات پائے جانے کی دو وجہ ہوسکتی ہیں۔

(۱) جیسا کہ یہ بات پہلے بھی کہی جاچکی کہ وہ کتاب لکھ دینے کے بعد اس پر دوبارہ نظر نہیں ڈالتے تھے اس لیے ان کی کتابوں میں یہ روایات باقی رہ گئیں اور پورے طور پر تہذیب و تنقیح نہیں ہو سکی۔

(۲) یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کتابیں انہوں نے اوائل حیات میں لکھی ہوں جب وہ محض جمع روایات کا کام کررہے تھے۔ یہی بات محقق (الوفا باحوال المصطفیٰ) مصطفیٰ عبدالواحد نے بھی بیان کی انہوں نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے یہ کتابیں ان کے ابتدائی زمانے کی ہوں" (۳۷) اگرچہ ان کتب کی بعض روایتوں کو خود انہوں نے موضوعات میں شمار کیا جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا لیکن تمام روایتوں کی تنقیح نہیں ہو سکی نتیجہ میں وہ کتابوں میں باقی رہ گئیں۔

نقد حدیث

ابن جوزی کا شمار بڑے محدثین میں ہوتا ہے۔ رجال حدیث پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ اس لیے وہ نقد حدیث میں بہت مشہور ہوئے اور اس باب میں انہوں نے شاندار کارنامے انجام دیئے انہوں نے ذخیرہ حدیث کی ایک ایک حدیث کو علم روایت اور درایت کے اصولوں پر جانچا و پرکھا نتیجہ میں جو روایتیں موضوع نظر آئیں انہیں العلل المتناہیہ اور موضوعات الکبریٰ میں مختلف ابواب کے تحت جمع کردیں۔ ان روایات میں بخاری و مسلم کی ایک ایک، سنن ابوداؤد کی نو، ترمذی کی تیس، سنن نسائی کی دس، ابن ماجہ کی تیس اور مسند احمد کی اڑتیس روایات بھی شامل ہیں لیکن کتبِ حدیث کی ان معتبر و مستند ترین کتابوں کی روایات کو موضوع قرار دینے پر محدثین نے ان پر سخت تنقید کی ہے۔ چنانچہ ابن جوزی کے اعتراضات کے جواب میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے القول المسدد فی الذب عن المسند للامام احمد اور علامہ سیوطی نے التعقبات علی الموضوعات تصنیف کی اور ان کے اعتراضات کا جواب دیا۔ ائمہ میں حافظ ابن صلاح اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا کہ "ابن جوزی بہت سی ضعیف بلکہ بعض صحیح روایت کو بھی موضوعات میں شامل کردیتے ہیں" (۳۸)۔

اس میں شک نہیں کہ ابن جوزی نقد حدیث کے معاملہ میں سخت واقع ہوئے ہیں لیکن ابن جوزی کے تمام اعتراضات بالکل بے اصل نہیں ہیں بلکہ علمی دلائل اور اصول حدیث پر مبنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر ابن جوزی کے اعتراضات کے نتیجہ میں مسند احمد بن حنبل کی روایات کے سلسلے میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ "مسند میں تین یا چار روایات ضرور ایسی ہیں جن کی اصل نہیں" (۳۹)

مسند احمد بن حنبل کی بعض روایات پر ابن جوزی کے علاوہ حافظ زین الدین عراقی اور علامہ ابن تیمیہ نے بھی سخت قسم کے اعتراضات کیے ہیں اور مسند کی بعض روایات کو موضوع کہا ہے خاص طور پر مسند کا وہ حصہ جو عبداللہ (امام احمد کے بیٹے) اور حافظ القطیعی کے زیادات کے نام سے موسوم ہے جو تگ بھگ مسند کے ایک چوتھائی کے برابر ہے اس پر اعتراضات زیادہ سنگین نوعیت کے ہیں۔ مسند احمد کی بعض روایات پر اعتراضات کے رد میں جہاں تک حافظ ابن حجر کے القول المسدد..... اور علامہ سیوطی کی التعقبات علی الموضوعات لکھنے کا سوال ہے اس میں انہوں نے مسند کا دفاع کیا ہے اور کسی حد تک دینی عصبیت سے بھی کام لیا ہے۔ (۴۰)

علامہ سیوطی نے ابن جوزی کی الموضوعات الکبریٰ کی تلخیص اللآلی المصنوعہ کے نام سے کی ہے اس میں بھی بہت سی روایتوں کا تعاقب کیا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اس میں بعض روایات ضعیف ہیں جنہیں علامہ ابن جوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے لیکن اس میں اکثریت ایسی روایات کی ہے اور اس پر تمام محدثین کا اتفاق بھی ہے کہ وہ موضوع ہیں اس کتاب میں علامہ سیوطی کے تمام اعتراضات درست نہیں۔ اس کے علاوہ علامہ سیوطی کے بارے میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ وہ نقد حدیث کے معاملہ میں تساہلی برتتے ہیں۔

ابن جوزی کے یہاں خاص بات یہ دیکھی گئی ہے کہ وہ نقد حدیث میں صرف رجال ہی سے بحث نہیں کرتے بلکہ متن کی تہہ تک جاکر اس کی اچھی طرح جانچ و پرکھ کرتے ہیں۔ بعض مرتبہ کسی روایت کے تمام راوی ثقہ ہوتے ہیں لیکن ابن جوزی اس کے متن میں چھپی ہوئی خرابی کو دیکھ کر اسے موضوع قرار دیتے ہیں لیکن روایت کی خرابی کو راوی ہی کی طرف منسوب کردیتے ہیں اسی بنیاد پر محدثین نے ان پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ صحیح اور ضعیف روایتوں کو بھی موضوعات میں شامل کردیتے ہیں۔ لیکن ایسی روایات بہت کم ہیں۔ کہ ج ے راوی ثقہ ہوں لیکن حدیث موضوع ہو۔ لیکن بہر حال ایسا بھی ہوتا ہے۔ مثال کے ط

پر حضرت عمرو بن میمون کی یہ روایت کہ انہوں نے زمانہ جاہلیت میں بندر کو دیکھا جس نے زنا کیا تھا اس پر بندروں نے جمع ہو کر اس کو سنگسار کیا حضرت عمرو بن میمون نے فرمایا میں نے ان کے ساتھ سنگسار کیا حافظ ابن عبدالبر نے اس روایت کی بابت فرمایا ہے کہ اس کے رجال ثقہ ہیں لیکن اس کا متن صحیح نہیں۔(۴۱)

اسی بات کو علامہ ابن جوزی نے ایک جگہ فرمایا: **قد یکون الاسناد کله ثقات ویکون الحدیث مقلوبا**(۴۲)(بعض مرتبہ حدیث کی سند میں تمام راوی ثقہ ہوتے ہیں لیکن متن اس کے برعکس ہوتا ہے۔

علامہ ابن جوزی کو نقد حدیث کے دوران جو تجربات ہوئے اور موضوع روایات کی جو نشانیاں اور علامات نظر آئیں انہیں اس طرح بیان کیا۔:**کل حدیث رأیته یخالفه العقول اوینا قض الاصول فاعلم انه موضوع الکتاب والسنة المتواترة اوالاجماع القطعی حیث لا یقبل شیئ من ذلك التاویل اویتضمن الافراط بالوعید الشدید علی الامر الیسیر...... او انفراده بشیئ مع کونه فیما یلزم المکلفین علمه وقطع العذر فیه اوبما صرح بتکذیبه فیه جمع کثیر یمتنع فی العادة تواطئهم علی الکذب وتقلید بعضهم بعضاً** (۴۳)(ہر ایسی حدیث جو عقل کے خلاف ہو یا اصول کو توڑنے والی ہو وہ موضوع ہوگی اس کے اعتبار کی زحمت کی ضرورت نہیں(یعنی اس کے رواۃ کی مزید تحقیق اور ان کی جرح وتعدیل کی ضرورت نہیں)یا ایسی حدیث جو حس اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔یا وہ کتاب وسنت متواترہ کے خلاف ہو یا اجماع قطعی کے بایں طور مخالف ہو کہ کسی طرح اس کی تاویل نہ ہو سکے۔یا حدیث میں ادنیٰ کام پر وعید شدید کا بیان ہو یا ادنیٰ کام پر بہت بڑے اجر وثواب کا وعدہ ہو یا راوی ایسی حدیث نقل کرنے میں منفرد ہو جس کا علم تمام مکلفین کے لیے بلا کسی عذر کے ضروری تھا یا جس میں ایسے مجمع کثیر کی بصراحت تکذیب کی ہو جن کا عموماً جھوٹ پر مجتمع ہونا اور ایک دوسرے کی تقلید میں جھوٹ پر قائم رہنا ممتنع اور محال ہو۔

ابن جوزی نے موضوع حدیث کی پہچان بیان کرتے ہوئے خلاصہ کے طور پر فرمایا: **الحدیث المنکر یقشعر منه جلد طالب العلم** (۴۴)(منکر حدیث کی پہچان یہ ہے کہ اسے سن کر طالب کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں)۔

یعنی وہ روایت اس قدر غیر مانوس اور اس کے متن میں اتنی اجنبیت ہو جسے سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور دل یہ گواہی دینے لگے کہ یہ روایت موضوع ہے۔

ابن جوزی نے ان اصولوں کی روشنی میں ایک ایک حدیث کی اچھی طرح جانچ و پرکھ کی ان اصولوں سے ٹکرانے والی ہر روایت کو وہ موضوع قرار دیتے تھے خواہ اس کے راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوتے۔ یہ اصول بعد میں آنے والے ائمہ و محدثین کے لیے نقد حدیث کے باب میں مشعل راہ ثابت ہوئے اور ان اصولوں کی بنیاد پر حدیثوں کی مزید تہذیب و تنقیح کی گئی۔

ابن جوزی نے نقد حدیث کے باب میں جو نقوش چھوڑے اور جو خدمات انجام دیں وہ دنیا میں جب تک علم حدیث باقی ہے تب تک انہیں بھلایا نہیں جاسکتا۔

حوالے

۱- عبدالحی ابن العماد الحنبلی شذرات الذهب ۴/۳۳۰، بیروت۔

۲- ایضاً ۴/۳۲۸۔ امام ذہبی نے فرمایا: ولد تقریباسنة عشروخمسائة اوقبلها تذکرة الحفاظ ۴/۱۳۴۲۔ سبط ابن الجوزی نے کہا: ولد جدی ببغداد بدرب حبیب فی سنة۔ ۵۱۰ھ تقریبا، مرآة الزمان ۴/۴۸۱، ابن خلکان نے آپکی تاریخ پیدائش ۵۰۸ھ بتائی ہے۔ وفیات الاعیان ۲/۳۲۲، قاہرہ ۱۹۴۸ء۔

۳- شذرات الذہب ۴/۳۳۰۔ تذکرة الحفاظ ۴/۱۲۸۹۔ حیدر آباد ۱۹۷۰ء۔

۴- تذکرة الحفاظ ۴/۱۳۴۲۔

۵- حافظ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۷/۲۹، مطبع دارالفکر العربی ۱۹۳۳ء، مرآة الزمان حیدر آباد ۱۹۵۲ء۔

۶- تذکرة الحفاظ ۴/۱۳۴۲۔

۷- شذرات الذهب ۴/۳۳۰، اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۱/۴۶۸، لاہور ۱۹۶۴ء۔

۸- البدایہ والنہایہ ۷/۲۹، مرآة الزمان ۸/۴۴۲۔

۹- تذکرة الحفاظ ۴/۱۳۴۶، ذہبی، میزان الاعتدال ۲/۱۳۰، مصر ۱۳۲۵ھ

۱۰- عبداللہ بن اسعد الیافعی، مرآة الجنان ۳/۴۷۷، حیدر آباد ۱۳۳۳ھ، البدایہ والنہایہ ۷/۲۹۔

۱۱- مرآة الزمان ۸/۵۰۲۔

۱۲- مرآة الزمان ۸/۴۸۲۔

۱۳- شذرات الذہب ۴/۳۳۱۔

۱۴- تذکرة الحفاظ ۴/۱۳۳۶۔

۱۵- البدایہ والنہایہ، ۷/۲۸۔

۱۶- مطبوعہ بغداد ۱۹۶۵ء۔
۱۷- تذکرہ شذرات الذہب ۴/۳۳۱۔
۱۸- تذکرۃ الحفاظ ۴/۱۳۴۷۔
۱۹- ابن جوزی الوفا باحوال المصطفیٰ۔ مقدمہ محقق مصطفیٰ عبدالواحد، مطبوعہ مصر ۱۹۶۶ء
۲۰- شذرات الذہب ۴/۳۳۱۔
۲۱- الوفا باحوال المصطفیٰ، مقدمہ محقق۔
۲۲- ابن جوزی۔ میلاد النبوی ۳۴ر مع اردو ترجمہ، مطبوعہ لکھنؤ۔
۲۳- سید سلیمان ندوی، سیرت النبی ۳/ ۷۴۲، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء۔
۲۴- میلاد النبوی ۴ر
۲۵- جلال الدین سیوطی، خصائص الکبریٰ ۱/۴۷، حیدر آباد ۱۳۱۹ھ۔
۲۶- ذہبی، تلخیص المستدرک للحاکم ۲/۶۰۲، حیدر آباد ۱۳۴۰ھ
۲۷- سیرت النبی ۳/۷۴۸۔
۲۸- میلاد النبوی ۱۰ر
۲۹- فتاویٰ ابن تیمیہ ۲/۱۹۷۔ قاہرہ ۱۳۲۶ھ، طاہر فتنی، تذکرۃ الموضوعات، ۸۶ بمبئی ۱۳۴۳ھ۔
۳۰- ترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی فضل النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
۳۱- میلاد النبوی ۱۶، الوفا باحوال المصطفیٰ ۳۳۔
۳۲- حافظ ابن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب ۶/ ۱۷۳، حیدر آباد ۱۳۲۶ھ۔
۳۳- تلخیص المستدرک ۲/۶۱۵۔
۳۴- حافظ ابن تیمیہ، کتاب التوسل۔ اردو ترجمہ بنام کتاب الوسیلہ ۱۹۳، لاہور ۱۹۵۰ء۔
۳۵- میلاد النبوی ۲۶۔
۳۶- سیرت النبی ۳/۶۷۹۔
۳۷- مقدمہ محقق الوفا باحوال المصطفیٰ۔
۳۸- حاجی خلیفہ کشف الظنون ۲/۱۹۰۶، طہران ۱۳۸۷ھ۔
۳۹- شیخ طاہر الجزائری، توجیہ النظر ۱۵۴، مصر ۱۳۲۸ھ۔
۴۰- مصطفیٰ سباعی، السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی ۴۹۹، قاہرہ ۱۹۶۱ء۔
۴۱- حافظ ابن حجر، فتح الباری ۷/۱۶۰، بیروت (بغیر سن طباعت)
۴۲- مولانا محمد تقی امینی، حدیث کا درایتی معیار، ص: ۲۶۸۔ ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۱۹۸۰ء۔
۴۳- شمس الدین محمد السخاوی، فتح المغیث ۱۱۴، مطبع انوار محمدی ۱۳۰۳ھ۔
۴۴- ایضاً ۱۱۳۔

آخری قسط

دیار پورب کی ایک علمی وروحانی شخصیت

محی السنۃ مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب بلیاویؒ

از:۔ڈاکٹر عبدالمعید کھیری باغ روڈ مئو ۲۷۵۱۰۱

غازی پور میں اہل بدعت کا فتنہ اور اس کا استیصال

غالباً ۱۹۰۳ء میں مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینویؒ بلیا سے غازی پور آگئے شہر کے ایک محلہ سید واڑہ میں مطب کرنے لگے۔ غازی پور میں آپ کے قیام کی برکت سے اصلاح عقائد کی ایک تحریک چل پڑی جس کی وجہ سے مبتدعین میں ایک شورش برپا ہوئی اور انہوں نے علماء دیوبند کے خلاف غلط پروپیگنڈہ شروع کیا۔ مرتب "مدرسہ دینیہ غازی پور مقاصد اور خدمات کے آئینہ میں" ص: ۱۲ پر تحریر فرماتے ہیں۔

مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی کی آمد کے بعد حرب عقائد کا فتنہ اٹھایا گیا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں یہ فتنہ ختم ہوگیا۔

یہ فتنہ تھوڑے دنوں میں نہیں بلکہ اس کے استیصال میں برسہا برس لگ گئے۔ اس فتنہ کی ابتداء ۱۳۳۰ھ سے ہوئی اور اس کا اختتام غالباً ۱۳۳۸ھ میں ہوا۔ اس کے ثبوت کے لئے مولانا اسحاق صاحب بلیاویؒ کی کتاب "قاطع النزاع" کی تمہید اور ان کی دوسری تصنیف "ابراز الجہل والخداع" ص: ۲، کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس فتنہ کی تفصیل مولانا اسحاق صاحبؒ کی تصنیف لطیف "قاطع الورید من المبتدع العنید" میں گذارش مصنف کے مطالعہ کے بعد سامنے آجائے گی اس فتنہ کی بیخ کنی اور انسداد کا سہرا مولانا بلیاویؒ کے سر ہے حکیم جمیل الدین صاحبؒ کے غازی پور تشریف لانے کے بعد مولانا اسحاق صاحبؒ کی برابر غازی پور آمد ورفت رہا کرتی تھی اور وہ یہاں کے تمام حالات سے باخبر رہا کرتے تھے۔ چنانچہ غازی پور میں جب اس فتنہ نے سر اٹھایا تو مولاناؒ نے اپنے شمشیر قلم سے مبتدعین کے

رد میں کئی معرکۃ الاراء کتابیں تصنیف فرمائیں اوران کی شہ رگ کاٹ کرر کھ دی اور یہ فتنہ اپنے کیفر کردار تک پہنچ گیا اور اہل ہوا اور بدعت کے حوصلے پست ہوگئے۔ مولانا اسحاق صاحب بلیاویؒ کا یہ کارنامہ غازی پور کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا جس کی وجہ سے غازی پور میں علماء دیوبند کو کام کرنے کے لئے زمین ہموار ہوئی اور انہیں بزرگوں کی برکت سے مدرسہ دینیہ غازی پور کا قیام عمل میں آیا۔

مدرسہ دینیہ غازی پور کا قیام اور اس سے ربط و تعلق

مرتب "مدرسہ دینیہ غازی پور" ص:۹ پر تحریر فرماتے ہیں۔

مدرسہ دینیہ کے قیام کا تصور جن بزرگوں کے ذہن میں آیا وہ معمولی دل گردے کے آدمی نہیں تھے یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے شیخ الہندؒ اور مولانا مدنیؒ کی صحبت پائی تھی ان کے دل خدا کے حضور میں جھکے ہوئے تھے ان کے حوصلے بلند اور عزائم پہاڑ سے زیادہ مستحکم تھے۔

مدرسہ کے بانی مولانا عمر فاروق صاحبؒ، مولانا اسحاق صاحب بلیاویؒ کے ہم وطن تھے وہ بھی قاضی پورہ بلیا کے رہنے والے تھے جب پرانا قاضی پورہ دریائے گنگا کی نذر ہو گیا تو جس طرح مولانا اسحاق صاحبؒ اور ان کے بزرگ نئے قاضی پورہ میں منتقل ہوگئے اسی طرح مولانا عمر فاروق صاحب اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ غازی پور آگئے مولانا عمر فاروق صاحبؒ کے چھوٹے بھائی مولانا ابو بکر صاحبؒ شیخ الہندؒ کے شاگرد اور مولانا اسحاق صاحب کے ہم سبق اور دوستوں میں تھے۔ اس لئے دونوں خاندان کے بزرگوں کے تعلقات برابر قائم تھے۔ جب مدرسہ دینیہ کے قیام کا مرحلہ آیا تو دونوں بزرگوں نے بھرپور تعاون فرمایا۔ مولانا ابو بکر صاحبؒ نے مولانا عمر فاروق صاحبؒ کو جو غالباً عمر بھر مجرد رہے کو تاحیات فکر معاش سے آزاد رکھ کر ادارہ کی بے مثال خدمت کی مولانا اسحاق صاحبؒ نے غازی پور کے ماحول کو سازگار اور علماء دیوبند کے لئے زمین تیار کرنے سے لے کر مدرسہ کے قیام تک جو ناقابل فراموش خدمت کی اس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے مرتب مدرسہ دینیہ ص:۴۵ پر مدرسہ کے معاونین اور بانی کے دست راست کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں۔

یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے مدرسہ دینیہ کے لئے وسائل اکٹھا کئے معاونین تیار کئے اپنے اپنے علاقہ سے طلبہ کو تیار کر کے بھیجا اور مدرسہ کے لئے کام کی زمین مہیا کی۔

مرتب نے مولانا اسحاق صاحب کا تذکرہ ص: ۴۶ پر کیا ہے اس کے علاوہ ۱۳۵۰ھ میں جب مدرسہ دینیہ غازی پور کی پہلی مجلس شوری کی تشکیل ہوئی تو اس میں بھی مولانا اسحاق صاحبؒ بلیاوی رکن شوریٰ میں شامل تھے۔

(مدرسہ دینیہ غازی پور ص: ۶۵، اپریل ۱۹۷۸ء)

تصنیفی خدمات

مولانا اسحاق صاحب بلیاویؒ نے تعلقہ داری کی ذمہ داری نبھانے کے ساتھ مطب، درس و تدریس وعظ و تبلیغ امامت نماز پنجگانہ جمعہ و عیدین کے علاوہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری کر رکھا تھا آپ بیک وقت فقیہ محدث، متکلم، مناظر ادیب اور فلسفی تھے۔ تمام فنون سے کامل مناسبت تھی۔ اہل نظر آپ کی تصانیف دیکھ کر ان خوبیوں کا بہت آسانی سے اعتراف کریں گے۔ تمام کتابیں اہل بدعت کے رد میں ہیں۔ راقم کو جو کتابیں دستیاب ہو سکی ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) قاطع النزاع فی مسئلۃ خطبۃ الوداع

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ رمضان کے آخری جمعہ کو جو خطبہ وداعیہ پڑھا جاتا ہے اسکے رو میں لمبی تختی ۱۸ صفحہ کا محققانہ رسالہ ہے۔ ۱۳۳۱ھ میں عزیز المطابع میرٹھ سے چھپا ہے۔

(۲) قاطع الورید من لمبتدع العنید

اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے خود مصنف کتاب مولانا بلیاویؒ رقم طراز ہیں:

قاطع الورید میں چند رسالوں کا جواب اور مبتدعین کے بہت سے مزعومات باطلہ کی تردید ہے چنانچہ مجوزین خطبہ وداعیہ کے تمسکات کا جواب مانعین کے ادلہ کاملہ اور اس کے ضمن میں بہت سی ابحاث شریفہ مثلاً مدارس اور رسائل دینیہ کی ضرورت۔ طالبان علم دین کے لئے بیٹھنے اور رہنے کے لئے مکان کی حاجت فارغ التحصیل طلبہ کو دستار و سند دینا۔ ہر

زمانہ میں صوفیہ کرام کی اصل موثل علم غیب بغیر اللہ غلاف قبر۔ قبہ قبر قیام مولد۔ تعین تاریخ مولد کا منکر اور بدعت ہونا۔ المہند کی تصدیق و توثیق۔ حسام الحرمین کا کید عظیم اور اس کا رد اہل حق پر مفتریات و کذوبات مبتدعین کا جواب وغیرہ وغیرہ اس میں مفصلاً درج ہیں (ابراز الجہل والخداع ص: ۳۔)

یہ کتاب بلالی پریس ساڈھورہ میں ۱۳۳۳ھ میں چھپی ہے یہ کتاب لمبی تختی میں ۱۷۲ صفحات پر مشتمل ہے ہر صفحہ میں بخط خفی پچیس (۲۵) سطریں ہیں اس کے ٹائٹل کور پر مولاناؒ کا نام اس طرح درج ہے۔

از تصنیف حامی سنت ماحی بدعت جناب حکیم مولوی محمد اسحاق صاحب بلیاویؒ کتاب کے اخیر میں حافظ ابو محمد خاں نقاد بلیاوی نے اس تصنیف کی ایک لمبی قطعہ تاریخ لکھی ہے جس کے اول کے دو شعر اور آخر کا شعر یہاں لکھا جاتا ہے۔

خوش کتابے زد رقم اسحاق ذی فضل وکمال
آنکہ براقران خود دارد ہے فضل مزید
خوش کتابے دربیانِ سنت خیر الور کی
دیدۂ اہل بصر ہرگز ندید او ندید
کردہ بدعت را سرو سینہ جدا از ہم بگو
مبتدع را کالمہند قاطع حبل الورید

مولانا بلیاویؒ نے رسالہ ہذا کا مختصر اقتباس کے عنوان سے کتاب کے شروع میں خلاصہ تحریر فرمایا ہے جس میں نہایت اہم، اصولی اور مفید باتیں درج ہیں قارئین کے استفادہ کی غرض سے اس خلاصہ کو خود مصنف کے قلم سے مگر قدرے اختصار کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے مولانا اسحاق صاحبؒ فرماتے ہیں:

”اہل سنت والجماعت کے نزدیک شریعت محمدیہ میں چار اصول متفق علیہا ہیں جن سے احکام شریعت ثابت کئے جاتے ہیں (۱) قرآن مجید (۲) حدیث شریف (۳) اجماع (۴) قیاس۔ جو مسئلہ اصول مذکورہ میں سے کسی سے ثابت ہو گا وہ صحیح ہے ورنہ غیر صحیح۔

رمضان شریف کے آخر جمعہ میں جو خطبہ وداعیہ پڑھا جاتا ہے وہ ان چاروں اصول

میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں ہے مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ بایں وسعت علم اپنے رسالہ "روح الاخوان عن بدیات آخر جمعۃ رمضان" میں فرماتے ہیں کہ کچھ معلوم نہیں کہ یہ خطبہ کب اور کہاں ایجاد ہوا یہاں تک کہ لفظ جمعۃ الوداع بھی ایجاد بندہ ہے جس کی کچھ اصل شریعت میں نہیں علمائے متقدمین ومتاخرین کی کتب فقہ وحدیث میں اس خطبہ وداعیہ کا کہیں نشان تک نہیں ناظرین کو مختصر طور پر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جو لوگ خطبۃ الوداع پڑھنے کو منع کرتے ہیں ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رمضان کے ختم ہونے کا ذکر خطبہ میں کسی عنوان سے آنا ہی نہیں چاہئے بلکہ وہ الوداع الوداع یا شہر رمضان الفراق الفراق یا شہر رمضان وغیرہ اس قسم کے الفاظ کو منع کرتے ہیں جیسے رمضان کو مخاطب کرکے رو کر چلا کر بین کرکے اس کا مرثیہ پڑھا جاتا ہے بوجوہ ذیل۔

(۱) اس قسم کا مرثیہ اخیر جمعہ کے خطبہ میں نہ کبھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا، نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہ تابعین نے نہ مجتہدین نے نہ ائمہ فقہ وحدیث نے اور نہ ان کے بعد صدیوں تک کسی عالم ربانی نے اگر خطبۂ الوداع کے پڑھنے میں کچھ بھی خیر وبرکت ہوتی تو ان تمام عالم کے پیشواؤں سے کیوں چھوٹتا؟ اور شریعت کی کسی کتاب میں اس کا ذکر اجمالاً یا تفصیلاً صراحۃً یا اشارۃً ضرور ہوتا جب کچھ بھی نہیں تو سمجھ لو کہ خطبہ الوداع بالکل بے اصل ہے۔

(۲) شریعت محمدیہ نے مصیبت کے وقت سب کو صبر اور ضبط کرنے کی تاکید فرمائی ہے اور بے صبری ظاہر کرنے سے بشدت روکا ہے چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصیبت کے وقت چلا کر رونے کو کہیں شیطان کی آواز فرمایا ہے اور کہیں احمق بدکار کی آواز اور رمضان شریف کو خاص طور سے صبر کا مہینہ فرمایا ہے پس اگر بالفرض کسی کو رمضان کے ختم ہونے کا کسی وجہ سے صدمہ بھی ہو تو اسکے لئے رونا چلانا بین کرنا وہی بے صبری ہے جس سے شریعت نے بتاکید روکا تھا اور خطبہ میں رونا چلانا اور بھی برا ہے کیونکہ خطبہ جمعہ خدا تعالیٰ کی خالص عبادت ہے اور بعض فقہاء کے نزدیک دو رکعت نماز کے قائم مقام ہے اور خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے وقت کسی کی جدائی پر رونا چلانا کیوں برا نہ ہوگا دیکھو نماز پڑھتے وقت کسی مصیبت یا تکلیف کی وجہ سے اگر رونے کی آواز کسی کے منہ سے نکل

جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے صاحب ہدایت اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ اس میں بے صبری ہے اور کلام الناس کی مشابہت ہے اور وہ جو منقول ہے کہ صاحب زادہ ابراہیم علیہ السلام کی وفات کے وقت حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو اور زبان مبارک سے الفاظ حزن وملال تھے یا بعض صحابہؓ سے حضور پر نور کی وفات پر اظہار رنج وافسوس منقول ہے وہ ہر گز چلاّ چلاّ کر اور بین کے طریقہ سے نہ تھا کیونکہ اس کو تو حضور پر نور بارہا منع فرما چکے تھے۔ چنانچہ اسی وقت حضور پر نور نے بعض صحابہؓ کے شبہ کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ "آنکھوں سے آنسو نکلنے کو اور دل کے غمگین ہونے کو میں نے منع نہیں کیا بلکہ چلاّ کر رونے اور بین کرنے کو منع کیا ہے" اس کے علاوہ حضور پر نور کی اور صحابہ کرام کی وہ حالت خطبہ میں یا کوئی عبادت کرتے وقت نہیں ہوئی تھی اور آج کل کے خطیب خطبہ وداعیہ میں چلا چلا کر روتے ہیں یا رونے کی آواز بناتے ہیں اور بین کے طریقہ سے الوداع والفراق پڑھتے ہیں اور خطبہ جمعہ کا عبادت محض ہو؛ سب کے نزدیک مسلم ہے بنا بریں یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا۔

(۳) شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ جب رمضان شریف ختم ہو جاوے تو خوشی مناؤ۔ اظہار فرح وسرور کرو۔ غسل کرو، اچھے اچھے کپڑے پہنو۔ عطر لگاؤ اور خوب زیب وزینت مشروع کے ساتھ شوکت اسلام دکھلاتے ہوئے عیدگاہ میں جا کر شکرانہ کی نماز پڑھو۔ جس کی تعمیل دنیا کے تمام مسلمان کرتے ہیں لہذا ختم رمضان پر رونا چلاّنا اور بین کرنا حکم مذکور کے خلاف ہے اور جو امر حکم شریعت کے خلاف ہے وہ ناجائز ہے مع ہذا جو ٹھیک دن اور گھڑی رمضان کے رخصت ہونے کی ہے اس دن تو سب کے سب خوشی مناتے ہیں اور بالکل بجا کرتے ہیں لیکن مبتدعین رمضان کے ختم ہونے سے کئی کئی روز پہلے محض اس کی فرضی رخصتی پر روتے چلاتے اور ہائے واویلا کرتے ہیں۔ جو عقل کے بھی خلاف ہے اور خطبۃ الوداع میں یہی ہوتا ہے چنانچہ عوام وخواص سب کو معلوم ہے۔

(۴) آج کل علی العموم یہ حالت ہے کہ عید کا چاند انتیس کا ہوتا ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں کیونکہ رمضان نے احسان کیا کہ ایک دن قبل تشریف لے گئے۔ اور تیس کے چاند سے خوش نہیں ہوتے کیونکہ رمضان اپنا پورا حق لے کر گئے اور اس روداد پر اخیر جمعہ

میں رمضان کے رخصت ہونے پر وہ ہائے واویلا مچاتے ہیں کہ گویا رمضان کے جدا ہونے کا بے حد رنج وافسوس ہے حالانکہ انتیس کے چاند سے خوش ہونا صریح دلیل ہے اس کی کہ رمضان کی جدائی کا کچھ بھی افسوس نہیں بدیں صورت رورو کر الفراق والوداع پڑھنا ایک طرح کی منافقانہ شان ہے جو کسی ذی عقل کے نزدیک جائز نہیں ہو سکتی۔

(۵) جمعہ کے خطبہ میں شرعاً امور ذیل ہوتے ہیں۔

(۱) خدا تعالیٰ کی تعریف (۲) خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور اسکے رسول کی رسالت کی گواہی دینا۔ (۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجنا۔ (۴) وعظ وپند۔ (۵) آیت قرآن مجید کی تلاوت (۶) جمیع مسلمانوں کے لئے دعا کرنا خلفائے راشدین وغیرہم اور کہیں کہیں بادشاہ وقت کے لئے دعا کرنا ع۶ میں داخل ہے ان چھ مضامین کو بزبان عربی جن الفاظ سے چاہے ادا کرے۔ جو مضمون ان مضامین مذکورہ میں داخل نہ ہوگا وہ ناجائز ہوگا جیسے کہ رمضان کی رخصتی کا مرثیہ یعنی الوداع والفراق پڑھنا کہ یہ ان چھ مضمونوں میں سے کسی ایک میں بھی داخل نہیں اور نہ داخل ہو سکتا ہے۔

(۶) مباح اسے کہتے ہیں جس کے کرنے پر کچھ ثواب نہ ہو اور نہ کرنے پر کچھ عتاب نہ ہو۔ ایسی چیز کو جب عام لوگ ضروری یا سنت سمجھتے لگتے ہیں اور ضروری سمجھنے کی علامت یہ ہے کہ خود اس کو ترک نہ کریں اور اس کے چھوڑنے والے پر طعن وملامت کریں اور اس کو بدعقیدہ ہونے کا الزام دیں تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلف سے خلف تک تمام علماء امت محمدیہ کا یہ متفق علیہ فتویٰ ہے کہ ایسے وقت میں اس مباح کا چھوڑنا واجب ہے بلکہ اگر عام لوگ مستحب کو بھی ضروری سمجھنے لگیں تو اس کا چھوڑ دینا بھی ضروری ہو جاتا ہے چنانچہ مولانا عبدالحئی رحمہ اللہ اپنے رسالہ ردع الاخوان عن بدعات آخر جمعۂ رمضان میں صاف لفظوں میں اسکی تصریح وتصدیق فرماتے ہیں تو ایسے وقت میں متفق علیہ فتویٰ کے مطابق اسکو چھوڑ دینا ضروری ہے تاکہ عوام حدود شریعت سے باہر نہ نکلنے پاویں۔ کیونکہ مباح کو سنت یا ضروری سمجھنا شریعت کی حد بندی کو توڑ دینا ہے اور یہ کسی طرح جائز نہیں ہے۔

(۷) مسلمانوں میں جو چیز خلاف شرع رواج پا جاوے وہ رواج سے جائز نہیں ہو سکتی پس خطبۃ الوداع کا رواج کتنا ہی زیادہ ہو جاوے مگر جب وہ دلائل مذکورہ سے خلاف شرع

ثابت ہو گیا تو کبھی جائز نہیں ہو سکتا مع ہذا عندالشرع وہ رواج معتبر ہے جس کا طبائع سلیمہ اور خواص میں سے کوئی بھی انکار نہ کرے اور اس کو ناجائز نہ سمجھے۔ تو ایسا رواج خطبۃالوداع کا کہیں بھی نہیں ہوا کیونکہ ہر جگہ بہت سے علماء معتبر اور اہل طبائع سلیمہ اور بہت سے عام لوگ بھی اس کو ناجائز سمجھتے ہیں اور نہیں پڑھتے چنانچہ مشاہدہ اس کا شاہد ہے۔

(۳)ابراز الجهل والخداع فی فیصلة النزاع

یہ کتاب بھی مولانا بلیاویؒ نے اہل بدعت کی رد میں تصنیف فرمائی ہے لمبی تختی باریک خط میں چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۳۳۸ھ میں مطبع رحمانی دہلی سے چھپی ہے اس کے ٹائٹل کور پر مولانا کا نام اس طرح درج ہے۔

”از تصنیف قامع اساس بدعت مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب بلیاوی)

اخلاق وعادات

آپ نہایت ہی با اخلاق سخی اور کریم النفس تھے آپ کے بڑے بھائی حافظ جان محمد صاحبؒ کا جب انتقال ہوا تو آپ نے اپنے خاص حصہ سے ان کے بچوں کو پچاس ہزار روپیہ کاروبار کرنے کے لئے دیا اس کے علاوہ جب جائداد کی تقسیم ہوئی تو آپ پوری جائداد میں آدھے کے حصہ دار تھے۔ لیکن آپ کے چچا شیخ واجد علی کے کئی لڑکے تھے۔ اس لئے آپ نے ایثار کرتے ہوئے جائداد کا دو تہائی اپنے چچا اور ان کے لڑکوں کو دیا اور خود ایک تہائی حصہ پر اکتفا فرمایا۔ رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا خاص خیال رکھتے تھے اور برابر ان کے یہاں آمد ورفت بھی رکھتے تھے غرباء اور مساکین کا بھی بے حد خیال رکھتے تھے خفیہ طریقہ سے ان کی امداد کیا کرتے تھے بہت سے غریب طلبہ کا خرچ اپنے پاس سے دیتے تھے اس طرح آپ نے بہت سے طلباء کی کفالت فرمائی۔ اور ان میں مدارس عربیہ اور انگریزی پڑھنے والے دونوں قسم کے طالب علم تھے جو بعد میں اونچے مناصب پر فائز ہوئے مختصر یہ کہ مجسمہ اخلاق اور پیکر جود وکرم تھے۔

بیعت و معمولات

آپ شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید اور انہی سے بیعت بھی تھے۔ نماز پنجگانہ کے علاوہ تہجد اشراق چاشت اوابین تلاوت قرآن اوراد و وظائف پر سختی سے پابند تھے۔ نہایت ہی ذاکر شاغل بزرگ تھے رمضان المبارک میں اعتکاف بھی فرمایا کرتے تھے کبھی ساتھ میں علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ بھی ہوا کرتے تھے۔ مولانا کی متروکہ کتابوں میں ایک کتاب جو کئی کتابوں کا مجموعہ ہے اس کتاب کے سرورق کے نیچے کے صفحہ میں ''اوراد معمولہ حقیر'' لکھ کر مولانا بلیاویؒ نے مندرجہ ذیل اذکار تحریر فرمائے ہیں:

استغفر اللہ الحمد للہ سبحان اللہ درود شریف لاالہ الا اللہ ہر ایک صبح شام ۱۰۰ بار۔

لاحول ولاقوۃ الاباللہ۔ اللہم انفعنی بما علمتنی وعلمنی ما ینفعنی وزدنی علما ہر دو صبح شام ۱۰۰-۱۰۰ بار۔

لاالہ الا اللہ بجہر ۵۰۰ بار اللہ اللہ ۴۰۰۰ بار روزانہ

سورہ مزمل ۱ بار یا مغنی ۱۱۱ بار روزانہ۔

جنات کی عقیدت

مومنین صالحین کی مقبولیت خدا داد ہوتی ہے ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لہم الرحمن ودا کا ظہور ہوتا ہے۔ مولانا اسحاق صاحبؒ انہی مومنین صالحین میں تھے جن کی مقبولیت منجانب اللہ تھی جنات آپ کے مکان کی چھت سے برابر سلام کیا کرتے تھے جن کی آواز گھر کے دوسرے لوگ بھی سنتے تھے لیکن سلام کرنے والا نظر نہیں آتا تھا آپ کی وفات تک جنات کی عقیدت کا یہی حال رہا۔

وصال

وصال سے کافی پہلے آپ حج کی سعادت حاصل کر چکے تھے اس وقت صحت کافی اچھی تھی لوٹنے کے بعد بھی کئی برسوں تک صحت مند رہے پھر آپ کو مرض استسقاء لاحق ہو گیا علاج معالجہ سے معتد بہ نفع نہیں ہوا۔ تقریباً دو سال تک آپ اس بیماری میں مبتلا

رہے انتقال سے ایک روز پہلے عشاء کے وقت کسی کو بہت زور سے ڈانٹا زوجہ محترمہ نے پوچھا تو فرمایا کہ شیطان آیا تھا اسی کو ڈانٹ رہا تھا پھر فرمایا کہ تین کام باقی ہیں استنجاء کرنا ہے، وضوء (تیمّم) کرنا ہے اور عشاء کی نماز پڑھنی ہے۔ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد آپ متوجہ الی اللہ ہوگئے کچھ لوگوں نے دنیوی معاملات کے متعلق سوال کیا آپ بالکل خاموش رہے صبح فجر کی نماز کے بعد فرمایا کہ رات میں لوگ مجھے دنیا کی طرف لانا چاہتے تھے لیکن میں تو دوسری طرف (متوجہ) تھا۔ پھر اشراق کے وقت تیمّم فرمایا اور لیٹ کر یا بیٹھ کر نماز اشراق ادا کی اور اس کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ اللہم غفرلہ وارحمہ رحمۃ واسعۃ۔ مولانا کا انتقال ۱۹۳۴ء میں ہوا مہنیہ اور دن کی تحقیق نہیں ہو سکی آپ کی تدفین آپ کے مکان کے وسیع احاطہ میں جو پھلواری کے نام سے مشہور ہے آپ کی والدہ کی قبر کے بغل میں عمل میں آئی۔ راقم سطور آپ کی قبر پر کئی بار فاتحہ خوانی کی سعادت حاصل کر چکا ہے۔

اولاد واحفاد

آپ کے دو لڑکے شیخ عابد حسین مرحوم اور شیخ محمد یعقوب صاحب مرحوم تھے شیخ عابد حسن مرحوم کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ شیخ محمد یعقوب صاحب بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔بی۔ تھے لیکن کبھی وکالت نہیں کی۔ نیک اور دیندار آدمی تھے۔ مصلح الامت شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے بیعت تھے۔ ان کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں لڑکیاں شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں دونوں لڑکے حاجی ممتاز احمد اور حاجی امتیاز احمد انجینئر ہیں اور سعودی عرب میں ملازم ہیں قاضی پورہ بلیا کا مدرسہ تعلیم القرآن انہی دونوں کی نگرانی میں چل رہا ہے مدرسہ کے لئے دونوں بھائی کثیر رقم صرف کرتے ہیں۔ اس مدرسہ کے لئے زمین مولانا اسحاق صاحب کے لڑکے شیخ محمد یعقوب صاحب نے دی تھی اور اس کی بنیاد امام المعقول والمنقول حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ کے دست مبارک سے رکھی گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

☆☆☆

☆

ضروری اعلان

رابطہ مدارس عربیہ دارالعلوم دیوبند سے منسلک مدارس عربیہ کے ذمہ داران حضرات کو مطلع کیا جاتا ہے کہ نصاب میں شامل کئے گئے درج ذیل رسالے طبع ہوگئے ہیں، رکن مدارس کے ذمہ دار حضرات یہ کتابیں مکتبہ دارالعلوم دیوبند سے حاصل فرمالیں تاکہ آئندہ تعلیمی سال کے آغاز میں انہیں شریک درس کیا جاسکے۔

(حضرت مولانا) مرغوب الرحمٰن (صاحب)
مہتمم دارالعلوم دیوبند

(۱) مبادی الفلسفه (عربی) برائے ششم عربی
صفحات: ۴۸ قیمت: ۸/روپے نٹ

(۲) تسهيل الأصول (عربی) چہارم عربی میں اصول الشاشی سے پہلے پڑھائی جائے گی
صفحات: ۴۸ قیمت: ۹/روپے، نٹ

(۳) قصائد منتخبه من ديوان المتنبی، برائے سال ششم عربی
صفحات مع مبسوط مقدمہ: ۱۷۲، قیمت:

(٤) باب الأدب من ديوان الحماسة، ششم عربی میں دیوان متنبیّ کے بعد
صفحات: ۵۲ قیمت

(٥) مفتاح العربيه حصہ اول سال اول عربی میں شامل تمرین عربی کی کتاب (زیر طبع)

ملنے کا پتہ

مکتبہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴

جاری کردہ: مرکزی دفتر رابطہ مدارس عربیہ دارالعلوم دیوبند

باسمہ تعالیٰ

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

ماہ شوال ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۸ء

جلد ۸۳	شمارہ ۲	فی شمارہ ۔/۶	سالانہ ۔/۶۰

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم۔ دیوبند، سہارنپور۔ یو۔پی

سالانہ بدل اشتراک	سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ۔/۴۰۰ روپے پاکستان سے ہندوستانی رقم۔/۱۰۰ بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم۔/۸۰ ہندوستان سے۔/۶۰

Ph. 01336-22429 Pin-247554

Composed by Nawaz Publications, Deoband

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے، اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤدوالا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں۔
- ہندوستان وپاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

کمپیوٹر کتابت نواز پبلی کیشنز دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

یہ انسانی دنیا جب سے وجود میں آئی ہے اس میں کوئی خطہ، کوئی قوم اور کوئی مذہب ایسا نہیں ملتا جس میں فواحش و بدکاری، زنا اور حرام کاری کو مستحسن اور اچھا یا مباح و جائز سمجھا گیا ہو بلکہ ساری دنیا اور اس کے مذاہب ان جرائم کی مذمت اور برائی میں متفق و ہم رائے رہے ہیں کیونکہ یہ مذموم جرائم نہ صرف یہ کہ فطرتِ انسانی کے خلاف ہیں بلکہ اس درجہ فساد افزا اور ہلاکت خیز ہیں جن کے تباہ کن اثرات صرف اشخاص وافراد ہی کو نہیں بلکہ بسا اوقات سارے خاندان اور پورے شہر و قصبہ کو برباد کردیتے ہیں۔ اس وقت فتنہ و فساد اور قتل و غارت گری کے جتنے واقعات سامنے آرہے ہیں ان کی صحیح تحقیق کی جائے تو اکثر واقعات کے پس منظر میں شہوانی جذبات اور ناجائز جنسی تعلقات کا عمل دخل ملے گا۔

البتہ بہت سی قوموں اور اکثر مذاہب میں زنا اور فواحش کی ممانعت کے باوجود اس کے مقدمات اور اسباب و ذرائع کو معیوب و ممنوع نہیں سمجھا جاتا اور نہ ان پر خاص قدغن اور بندش لگائی جاتی ہے۔

مذہب اسلام چونکہ ایک کامل و مکمل نظام حیات یا ور فطرت کے مطابق قانون الٰہی ہے اس لئے اسلام میں جرائم و معاصی کی حرمت کے ساتھ جرائم و معاصی کے ان اسباب و ذرائع کو بھی حرام و ممنوع قرار دے دیا گیا جو بالعموم بطور عادت جاریہ کے ان

جرائم تک پہنچانے والے ہیں۔ مثلاً شراب پینے کو حرام کہا گیا تو شراب کے بنانے، بیچنے، خریدنے اور کسی کو دینے کو بھی حرام کردیا گیا۔ سود کو حرام کیا گیا تو سود سے ملتے جلتے سارے معاملات کو بھی ناجائز اور ممنوع کردیا گیا۔ شرک و بت پرستی کو جرم عظیم اور ناقابل معافی جرم ٹھہرلیا گیا تو اس کے اسباب و ذرائع، مجسمہ سازی و بت تراشی اور صورت گری کو بھی حرام اور ان کے استعمال کو ناجائز کردیا گیا۔

اسی طرح جب شریعت اسلامی میں زنا کو حرام کردیا گیا تو اس کے تمام قریبی اسباب و ذرائع اور مقدمات پر بھی سخت پابندی لگادی گئی چنانچہ اجنبی عورت پر شہوت سے نظر ڈالنے کو آنکھوں کا زنا، اس کی باتوں کے سننے کو کانوں کا زنا، اس کے چھونے کو ہاتھوں کا زنا، اس کے پاس جانے کو پیروں کا زنا ٹھہرلیا گیا۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں وارد ہے۔

''العینان زنا هما النظر، والاذنان زنا هما الاستماع، واللسان زنا الکلام، و الید زناها البطش، والرجل زنا ها الخطی'' (مشکوٰۃ ص ۲۰ باب الایمان بالقدر)

آنکھوں کا زنا (اجنبی عورت کی جانب شہوت سے) دیکھنا ہے، کانوں کا زنا (شہوت سے اجنبی عورت کی) باتوں کی طرف کان لگانا ہے، زبان کا زنا اس سے گفتگو کرنا ہے، ہاتھ کا زنا اس کو چھونا و پکڑنا ہے، پیروں کا زنا اس کی طرف (غلط ارادہ سے) جانا ہے۔

برے ارادے سے کسی اجنبی عورت کی جانب دیکھنا اس کی باتوں کی جانب متوجہ ہونا، اس سے بات چیت کرنا، اس کو چھونا و پکڑنا اس کے پاس جانا یہ سارے کام حقیقتاً زنا نہیں بلکہ زنا کے اسباب و مقدمات میں سے ہیں مگر انھیں بھی حدیث میں زنا سے تعبیر کیا گیا ہے تاکہ امت سمجھ جائے کہ زنا کی طرح اس کے مقدمات و اسباب بھی شریعت میں حرام و ممنوع ہیں۔ انھیں شہوانی جرائم سے بچانے کے لئے عورتوں کے واسطے پردہ کے احکام نازل و نافذ کئے گئے۔

اس موقع پر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ شریعتِ اسلامی کا مزاج تنگی و دشواری کے بجائے سہولت و آسانی کی جانب مائل ہے اس سلسلے میں کتاب الٰہی کا واضح

اعلان ہے ''مَاجَعَلَ عَلَيْكُم فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ '' دین میں تمہارے اوپر کوئی تنگی نہیں ڈالی گئی ہے اس لئے اسباب وذرائع کے بارے میں فطرت سے ہم آہنگ یہ حکمت آمیز فیصلہ کیا گیا کہ جو امور کسی معصیت کا ایسا سبب قریب ہوں کہ عام عادت کے اعتبار سے ان کا کرنے والا اس معصیت میں ضرور مبتلا ہو جاتا ہے، ایسے قریبی اسباب کو شریعتِ اسلام نے اصل معصیت کے حکم میں رکھ کر انھیں بھی ممنوع وحرام کر دیا۔ اور جن اسباب کا تعلق معصیت اور گناہ سے دور کا ہے کہ ان کے اختیار کرنے اور عمل میں لانے سے گناہ میں مبتلا ہونا عادۃً لازم وضروری تو نہیں مگر ان کا کچھ نہ کچھ دخل گناہ میں ضرور ہے ایسے اسباب وذرائع کو مکروہ قرار دیا اور جو اسباب ایسے ہیں کہ معصیت میں ان کا دخل شاذ ونادر کے درجہ میں ہے ان کو مباحات میں داخل کر دیا۔

اس سلسلے کی یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ شریعت اسلام نے جن کاموں کو گناہ کا سبب قریب قرار دے کر حرام کر دیا ہے وہ تمام مسلمانوں کے لئے حرام ہیں خواہ وہ کام کسی کے لئے گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب بنے یا نہ بنے اب وہ خود ایک حکم شرعی ہے جس پر عمل سب کے لئے لازم اور اس کی مخالفت حرام ہے۔

اس کے بعد سمجھئے کہ عورتوں کا پردہ بھی شرعاً اسی سد ذرائع کے اصول پر مبنی ہے کہ ترک پردہ گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب ہے۔ اس میں بھی اسباب کی مذکورہ قسموں یعنی سبب قریب، سبب بعید اور سبب بعید تر کے احکام جاری ہوں گے، مثلاً جوان مرد کے سامنے جوان عورت کا بدن کھولنا گناہ میں مبتلا ہونے کا قریبی سبب ہے کہ عادتاً آدمی ایسی صورت حال میں بالعموم گناہ میں لازمی طور پر مبتلا ہو جاتا ہے اس لئے یہ صورت شریعت کی نظر میں زنا کی طرح حرام ہے، کیونکہ شریعت میں اس عمل کو فاحشہ کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا یہ سب کے حق میں حرام ہوگا۔ البتہ مواقعِ ضرورت علاج وغیرہ کا مستثنیٰ ہونا ایک الگ حکم شرعی ہے اس استثنائی حکم سے اصل حرمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پھر یہ مسئلہ اور حکم اوقات وحالات سے بھی متأثر نہیں ہوتا اسلام کے عہد زریں اور خیر وصلاح میں بھی اس کا حکم وہی تھا جو آج کے دورِ ظلمت اور شر وفساد کے زمانہ میں ہے۔

دوسرا درجہ ترک پردہ کا یہ ہے کہ گھر کی چہار دیواری سے باہر برقع یا دراز چادر

سے پورا بدن چھپا کر نکلے۔ یہ فتنہ کا سبب بعید ہے۔ اس صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر ایسا کرنا فتنہ کا سبب ہو تو ناجائز ہے اور جہاں فتنہ کا اندیشہ نہ ہو وہاں جائز ہوگا۔ اسی لئے اس صورت کا حکم زمانے اور حالات کے بدلنے سے بدل سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد خیر مہد میں اس طرح سے عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا فتنہ کا سبب نہیں تھا اس لئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عورتوں کو برقع وغیرہ میں سارا بدن چھپا کر چند شرائط کے ساتھ مسجدوں میں آنے کی اجازت دی تھی اور ان کو مسجدوں میں آنے سے روکنے کو منع فرمایا تھا اگر چہ اس وقت بھی عورتوں کو ترغیب اسی کی دی جاتی تھی کہ وہ گھروں میں ہی نماز ادا کریں کیونکہ ان کے لئے مسجد کے مقابلہ میں گھر کے اندر نماز پڑھنا زیادہ باعث ثواب اور افضل ہے۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں "ولم يختلفوا ان صلاة المرأة فی بيتها افضل من صلاتها فی المسجد" (التمہید ج۱۱ ص۱۹۶) اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ عورت کی گھر میں نماز مسجد میں نماز سے افضل و بہتر ہے۔

آپ کی وفات کے بعد وہ حالات باقی نہیں رہے۔ بلکہ طبیعتوں میں تغیر اور قلبی اطمنان میں فتور پیدا ہو گیا چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے "ما نفضنا اليدينا عن قبر رسول الله صلى عليه وسلم حتى انكرنا قلوبنا" (التمہید للحافظ ابن عبدالبر ج ۳ ص ۳۹۴ مطبوعہ ۱۴۱۰، و رواہ الترمذی فی الشمائل ص ۲۷ عن انس رضی اللہ عنہ) ہم نے ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کرنے ہاتھوں سے مٹی بھی نہیں جھاڑی تھی کہ اپنے دلوں کی بدلتی ہوئی کیفیت کو محسوس کیا علاوہ ازیں جن شرائط کے ساتھ مسجد میں حاضری کی اجازت دی گئی تھی ان کی پابندی میں دن بدن کوتاہی بڑھتی رہی اسی تغیر حالات کی جانب مزاج شناس نبوت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ فرماتے ہوئے امت کو متنبہ فرمایا ہے کہ آج کے حالات اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے تو عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے روک دیتے اس لئے عام صحابہ کرام نے یہی فیصلہ کیا کہ حالات کی اس تبدیلی کی بناء پر اب عورتوں کا مسجد میں آنا فتنہ سے خالی نہیں رہا اس لئے ان حضرات (رضوان اللہ

علیہم اجمعین) نے عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے روک دیا۔

موضوع زیر بحث سے متعلق اس ضروری تمہید کے بعد احادیث و آثار ملاحظہ کیجئے جن پر اس مسئلہ کا مدار ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار و اقوال پیش نظر رہیں تو مسئلہ کی اصل حقیقت تک پہنچنے میں انشاء اللہ کوئی دشواری نہیں ہوگی اور صحیح حکم منقح ہوکر سامنے آجائے گا۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ جمہور فقہاء و محدثین اس پر متفق ہیں کہ خواتین اسلام پر مسجد میں حاضر ہوکر جماعت میں شرکت از روئے شریعت واجب اور ضروری نہیں اور نہ انھیں اس کی تاکید کی گئی ہے۔ ان تمام احادیث سے جن میں عورتوں کو اپنے گھروں میں نماز ادا کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے یہی حکم شرعی ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرات فقہاء و محدثین بغیر کسی اختلاف کے اس بات کے بھی قائل ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور حیات میں خواتین اسلام جمعہ و جماعت میں حاضر ہوا کرتی تھیں اور انھیں بارگاہِ رسالت سے چند شرائط کے ساتھ اجازت حاصل تھی۔ مسئلہ زیر بحث کا یہ پہلو بھی اس وقت ہمارے غور و فکر کا اصل محور نہیں ہے، بلکہ بحث و نظر کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ اس دور فتنہ و فساد میں جب کہ جنسی انارکی اور شہوانی بے راہ روی کی قدم قدم پر نہ صرف افزائش بلکہ ہمت افزائی ہو رہی ہے، دین و مذہب اور حیا و مروت کے سارے بندھن ٹوٹ گئے ہیں کوچہ و بازار کا کیا ذکر شرور و فتن کی خود سر موجیں گھروں کی چہار دیواری سے ٹکرانے لگی ہیں، کیا ایسے فساد انگیز حالات میں بھی خواتین اسلام اور عفت مآب ماؤں بہنوں اور بہو بیٹیوں کو گھروں کی چہار دیواری سے باہر نکل کر جمعہ و جماعت میں مردوں کے دوش بدوش شریک ہونے کی اجازت مقاصدِ شریعت سے ہم آہنگ اور اصول سدّ ذرائع کے مطابق ہے؟

فقہائے اسلام بیک زبان یہ کہتے ہیں کہ ایسے فساد آمیز حالات میں عورتوں کے لئے گھر سے باہر آکر مسجدوں میں حاضر ہونا مقاصد شریعت اور اصول سد ذرائع کے خلاف ہے اس لئے ان حالات میں شرعاً اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

قرآن کی روشنی میں

"قوموں کا عروج وزوال"

(مولانا) طاہر عبداللہ صدیقی

ہر وہ شخص جس نے دنیا کی تاریخ کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ دنیا میں بہت سی قومیں آئیں اور اپنا وقت پورا کرکے ختم ہوگئیں اور اُنکی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔ اقوام کے اس عروج وزوال کے اسباب کیا ہیں اور یہ اسباب کیونکر واقع ہوئے ہیں انھیں معلوم کرنے کے لئے ہمیں قرآن مجید فرقان حمید سے رجوع کرنا ہوگا۔

اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے۔

"ان الارض لله یورثها من یشاء من عباده والعاقبة للمتقین ○ (الاعراف)

ترجمہ: "بے شک زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کا وارث کردے اور عاقبت ان لوگوں کے لئے ہے جو متقی ہیں۔"

معلوم ہوا کہ زمین اللہ کے سوا کسی کی ملکیت یا میراث نہیں۔ قوموں کو یہ اللہ کے حکم سے عطا کی جاتی ہے کن کن لوگوں کو اللہ رب العزت اس کا وارث بناتا ہے اس کی تفصیل ایک دوسری آیت میں یوں بیان فرمائی گئی ہے۔

" وعد الله الذین آمنوا منكم و عملوا الصلحت لیستخلفنهم فی الارض كما استخلف الذین من قبلهم" ○

ترجمہ: "اللہ نے ان لوگوں کو زمین میں خلیفہ بنانے کا وعدہ کرلیا ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کئے، جس طرح ان سے پہلے والوں کو اس نے خلیفہ بنایا"

معلوم ہوا کہ دنیا میں خلافت حاصل کرنے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں:

(۱) ایمان　　(۲) عمل صالح

اور یہ قانون قدرت ہے کہ جب کسی قوم کو اس کی صلاحیت واہلیت کی بنا پر خلافت عطا کی جاتی ہے تو بلاوجہ اس قوم کو اس کے مقام سے ہٹایا نہیں جاتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَ ماکان ربك لیهلك القریٰ بظلم و اهلها مصلحون" (سورہ هود)

ترجمہ: "ایسا نہیں ہو سکتا کہ تیرا رب قوموں کو بلاوجہ تباہ کردے حالانکہ اس کے باشندے نیک ہوں۔"

اگر کوئی قوم خلافت کی اہلیت کھو بیٹھے یعنی ایمان اور عمل صالح سے دور ہو جائے تو پھر چاہے وہ بظاہر کتنی بھی طاقتور نظر آئے کوئی طاقت اسکو خلافت کے منصب پر بحال نہیں رکھ سکتی۔

ارشاد خداوندی ہے:

" او لم یسیرو فی الارض فینظرو کیف کان عاقبة الذین من قبلهم و کانو اشد منهم قوة" (سورہ یٰسین)

ترجمہ: "کیا لوگ زمین پر سیر نہیں کرتے تاکہ اپنے پیشروؤں کا انجام دیکھیں جو کبھی قوت میں ان سے زیادہ تھے۔"

پھر یہ فرمایا گیا کہ ہلاکت اور تباہی صرف ان ہی قوموں کے لئے خاص کردی گئی ہے جو فسق اور فجور میں مبتلا ہوتی ہیں۔

ارشاد ہے: " فهل یهلك الا القوم الفٰسِقون" (سورہ الاحقاف)

ترجمہ: "اب وہی ہلاک ہونگے جو نافرمان ہیں"

یہ ہے وہ اٹل فیصلہ جو قوموں کے عروج وزوال کے اسباب کی نشاندہی کرتا ہے اور جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ یہی ہوتا رہے گا۔

اللہ کا یہ بھی دستور یا قانون یا اللہ کی یہ سنت وطریقہ درج ذیل آیت سے بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

" سنة الله فی الذین خلو من قبل، و لن تجد لسنة الله تبدیلا" (الاحزاب)

ترجمہ: "یہی دستور تھا ان لوگوں کے لئے جو پہلے گذر چکے اور اللہ کے دستور میں تم کبھی تبدیلی نہ پاؤ گے"

قومیں افراد سے بنتی ہیں اور قوموں کا عروج و زوال افراد کی صلاحیت اور نااہلی سے وابستہ ہوتا ہے، جو قومیں ترقی کرنا چاہتی ہیں انکے افراد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی شخصیت اور صلاحیتوں کی تربیت کریں تاکہ وہ مستحکم ہوں اور ترقی کے زینے طے کریں ہر وہ چیز جو انسان کی شخصیت کو اجاگر کرے خیر ہے اور جس چیز سے شخصیت کمزور ہو جائے وہ شر ہے۔ خودی کی شخصیت کے تین پہلو ہوتے ہیں: جسمانی، ذہنی اور روحانی ان تینوں پہلوؤں کی مناسب نشو نما ہو اور ان میں ہم آہنگی پائی جائے پھر ذاتی زندگی تکمیل کی طرف آگے بڑھتی ہے اور اس سے قوم اور جماعت کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ہر پہلو کی نشو نما کے لئے کافی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترقی پذیر قوموں میں ہمیشہ سے یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اسکے افراد محنت اور مشقت کے عادی ہوتے ہیں اور جب قوم کے زوال کا زمانہ شروع ہوتا ہے تو ان افراد میں راحت پسندی اور عیش و عشرت سرایت کر جاتی ہے۔

بقول اقبال۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

تن آسانی اور راحت پسندی کے خلاف اقبال کہتے ہیں:

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالین ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

اسلام نے انفرادی ذمہ داری اور کوشش و عمل کو زندگی کا اصل اصول قرار دیا ہے اسی کی بدولت انسان خود کو اشرف المخلوقات ثابت کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو کسی بھی شخص کے عمل کو ضائع نہ کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔

" انی لا أضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثی " (آل عمران)

ترجمہ "میں ضائع نہیں کرتا کسی کی محنت تم میں سے کسی مرد کی یا عورت کی"

انفرادی ذمہ داری کا احساس، عمل کی توفیق اور ایجاد و تخلیق کی صلاحیت افراد کی تین یہی بڑی صفات ہوتی ہیں جن کی بنا پر وہ اپنی قوم کو ترقی کے عروج پر لے جاسکتے ہیں چنانچہ

اقبال اپنے خطبات میں لکھتے ہیں:

> "انسان کے لئے مقدر ہو چکا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کی کائنات کی گہری آرزوؤں میں شریک ہو اور اس طرح خود اپنے مقدر اور کائنات کی تقدیر کی تشکیل کرے۔ کبھی وہ کائنات کی قوتوں سے اپنے تئیں مطابق بناتا ہے اور کبھی ان کو پوری قوت کے ساتھ اپنے مقاصد کے مطابق ڈھالتا ہے۔ اس تدریجی تغیر کے عمل میں خدا خود اس کا شریک کار ہوتا ہے بشرطیکہ انسان کی طرف سے اقدام کیا گیا ہو:
>
> " اِنَّ اللّٰہ لا یغیر ما بقومٍ حتّٰی یغیر و ما بِانفُسِہِم۔"
>
> اگر انسان کی طرف سے اقدام نہیں ہوتا اور وہ اپنے وجود کے قویٰ کو ترقی نہیں دیتا اگر وہ زندگی کے بڑھتے ہوئے دھارے کا زور محسوس نہیں کرتا تو اس کی روح پتھر بن جاتی ہے اور مثل مردہ مادہ کے ہو جاتا ہے۔"

(خطبات، ص: ۱۲)

اب افراد سے گزر کر قوم کی طرف بڑھیں تو معلوم ہوگا کہ قوم کی ترقی کے لئے سب سے پہلے اس کے نصب العین کے تعین اور تحفظ کی ضرورت ہے جب کوئی قوم اپنی تہذیب اور اپنی عملی روایات پر یقین نہیں رکھتی اور اپنی عقل کو دوسروں کے طریقوں کی زنجیر میں گرفتار کرتی ہے اور اپنی تمناؤں کو دوسروں سے ادھار لینے میں کوئی تامل نہیں کرتی تو پھر یہ قوم نیابت الٰہی کے حق کی اہل نہیں رہتی۔

قوم اسی وقت زندہ رہ سکتی ہے جب کہ وہ اپنے ناموس کی حفاظت کرے اور اپنے مقصد حیات کو بھلا نہ دے۔ قومیں اپنی سرگزشت کے ذریعہ اپنے مقاصد کا تعین اور اپنے اجتماعی وجود کو مستحکم کرتی ہیں۔

سیاسی محکومیت سے زیادہ خطرناک ذہنی غلامی ہوتی ہے جب کہ کوئی قوم اپنے نصب العین کو چھوڑ کر کسی دوسری قوم کے خیالات و افکار کو اختیار کر لیتی ہے اور انہی کے مطابق عمل کرنا شروع کرتی ہے اسی لئے قوموں کے عروج و زوال میں نصب العین کا بڑا عنصر ہوتا ہے اور قوم کی ترقی کے لئے سب سے پہلے لازمی شرط "تطہیرِ فکر" ہے یعنی افکار کو پاک و صاف کرنا ہوتا ہے۔

اس کے بعد ایک اہم سوال فرد اور جماعت کے باہمی تعلق کا ہے۔ وہی معاشرہ ترقی پسند ہوگا جس میں اس مسئلہ کو بحسن وخوبی حل کیا گیا ہو جس قوم میں فرد اور معاشرہ کا رشتہ مناسب اور فطرت کے مطابق ہوگا اس کی ترقی کے امکانات وسیع ہونگے اور جہاں افراد اور جماعت میں باہمی نزاع اور کشمکش پائی جائے وہاں ترقی مفقود ہوگی۔

فرد اور جماعت کے اغراض و مقاصد میں کوئی دائمی تضاد نہیں۔ وہی معاشرہ فطرت کے مطابق ہوگا جس میں انفرادی خودی کو اپنی نگرانی اور پرورش کا موقع حاصل ہو اور اسکے ساتھ اجتماعی مفاد کو بھی ٹھیس نہ لگے۔ جس طرح وہ شخص جو قافلہ میں سفر کرتا ہے سب کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور سب سے الگ اپنا وجود بھی برقرار رکھتا ہے۔ یہی حال کاروان زندگی کا ہے جس میں ہر فرد سب کے ساتھ بھی اور سب سے جدا بھی۔

فرد کو جماعتی زندگی کی اخلاقی اقدار کا تابع ہونا چاہئے۔ فرد کی شخصیت عمرانی ماحول کے بغیر روشن نہیں ہوسکتی۔ خودی کی تربیت جو زندگی کا مقصد ہے تنظیم ملت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلئے ضروری ہے کہ فرد کے جسمانی اور روحانی قوئ وقف ہوں اجتماعی زندگی کے مقاصد کے لئے وہ زندہ رہتا ہے۔ افراد جلد مٹنے والے ہوتے ہیں لیکن قومیں اپنی آئندہ نسلیں بچانے کے لئے تگ و دو میں رہتی ہیں ان کی زندگی غیر محدود ہوتی ہے۔ یوں سمجھئے اگر چمن کے پھول مرجھا جائیں تو فصل بہار پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جواہرات کے معدن میں سے اگر ایک دو جوہر ٹوٹ جائیں تو معدن میں کوئی کمی نہیں آتی۔

افراد کے دل میں جماعت کی خاطر ایثار اور خود فراموشی کا جو جذبہ پیدا ہوتا ہے اس کو "بے خودی" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ خودی اور بے خودی کے باہمی توازن اور ہم آہنگی کی بنا پر ہی قومیں ترقی اور کامرانی کی شاہراہ پر آگے بڑھتی ہیں۔

فرد جب اپنے آپ کو ملت کا پابند بنالیتا ہے اور معاشرے کی خدمت میں منہمک ہوجاتا ہے تو اس وقت وہ اپنے وجود کے بلند ترین مقام تک پہنچ جاتا ہے فرد اور جماعت کا ایک قسم کا زندۂ عضوی (Organic) تعلق ہے۔ فرد اپنے آپ کو اگر چاہے بھی تو جماعت سے علیحدہ نہیں کرسکتا۔

اسلامی تمدن میں فرد اور جماعت کے تضاد کو جس خوبی سے رفع کیا گیا ہے اور مادی اور روحانی زندگی میں جو امتزاج پیدا کیا گیا ہے وہ خود اس امر کا ضامن ہے کہ اسلامی تمدن ہر قسم

کے جو کھوں میں پڑ کر اور جلا پائے گا اور بڑے بڑے انقلابوں کے باوجود اپنی ہستی کو برقرار رکھ سکے گا۔ انقلابوں کو جھیلنا جماعتوں کی قوت حیات پر دلالت کرتا ہے اور تغیرات سے عہدہ برآ ہونا صرف اجتماعی اقدار ہی کی بدولت ممکن ہے۔ نئے حالات سے مطابقت جماعتوں کو دوام بخشتی ہے۔ ہر انقلاب کے بعد اسلامی تہذیب نے اپنے آپ کو از سر نو زندہ کیا۔ تاتاری حملے کی مثال اسلامی تاریخ میں موجود ہے۔ جسکی بدولت کعبہ کو نئے پاسبان مل گئے۔

اسلامی تہذیب اپنے اندرونی جوش حیات و بقا کی بدولت ہر نمرود کی آگ کو گلزار بنا سکتی ہے۔ انقلاب زمانہ کے شعلے جب گلشن اسلام تک پہنچتے ہیں تو پھر انہی شعلوں سے بہارِ تازہ نمودار ہوتی ہے۔ یونانی علم و حکمت، رومیوں کی جہانگیری، مصری اور ساسانی شان و جبروت سب کے سب ایک ایک کر کے انقلاب زمانہ کے شکار ہوگئے لیکن ملت اسلامیہ کے عزم حیات میں آج بھی کمی نظر نہیں آتی۔

ابتدا میں قرآنی آیات کے ذریعہ تشریح کی گئی ہے کہ نیابت الٰہی اور زمین پر حکمرانی کے لئے ایمان اور عمل صالح ناگزیر ہیں۔ ایک اور موقع پر قرآن نے بتایا ہے کہ ارتقائے مدارج کے لئے ایمان کے ساتھ علم بھی ضروری ہے:

"یرْفعِ اللّٰہُ الذین آمنو منکم والذین اوتو العلم درجٰتٍ" (المجادلة)

ترجمہ: "تم میں سے اللہ ایمانداروں کے اور جنھیں علم دیا گیا ہے ان کے درجات بلند کرے گا۔"

ایمان، عمل صالح اور علم، یہی تین چیزیں ہیں جن کے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں اور جن کی عدم موجودگی میں قوموں کا زوال لازمی ہے۔

بقول اقبال:

ولایت بادشاہی علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ایمان کے بعد دوسرا عنصر عملِ صالح کا ہے۔ نیابت الٰہی انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اپنے عمل اور کردار سے اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کرتے ہیں۔ جس جماعت میں

جوشِ عمل کی بناپر جذب و تسخیر کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو پھر اس کے غلبے اور تسلط کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ وہ اپنے جوشِ کردار اور اعمالِ صالحہ کی بناپر تقدیر کے راز بھی معلوم کر سکتی ہے۔

قوموں کے عروج و ترقی کے لئے ایمان اور عمل صالح کے بعد تیسری اور آخری شرط علم و حکمت کی ہے۔ جس کو اللہ رب العزت نے خیر کثیر کہا ہے:

"وَمَن یُوت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیراً"

قرآن پاک میں انسانی شرف کی بنا چیزوں کی حقیقتوں کے علم کو ٹھہرایا گیا ہے۔ چنانچہ "و علّم ادمَ الاسماء کُلّھا" میں اسی طرف اشارہ ہے۔ انسان اپنے علم کی قوت سے آسمانوں کے سینے شگاف کرتا ہے اور عالم رنگ و بو کو اپنے تصرف میں لاتا ہے۔ انسانی آزادی اور اختیار اس کے علم ہی کا ایک کرشمہ ہے۔ اس علم کی بدولت وہ ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں ساری کائنات اس کے زیر نگیں آجاتی ہے اور عناصر پر اس کی حکمرانی ہوتی ہے۔

قرآن کریم کے دستورِ حیات اور قوانین ہمارے لئے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں اور ہر اعتبار سے لفظ آخر ہیں۔ قوموں کے عروج و زوال کے درج بالا قوانین جو قرآن ہی سے اخذ کر کے بیان کئے گئے ہیں جو آج بھی اسی طرح تازہ زندگی بخش سکتے ہیں بشرطیکہ انھیں حرز جاں بنایا جائے اور پوری قوت اور استقامت کے ساتھ ان پر عمل کیا جائے تو آج بھی مسلم قوم اپنی عظمت رفتہ کو پا سکتی ہے، اسی کو 'اقبال' نے کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے:

عہد نو برق ہے آتش زن ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوام کہن ایندھن ہے
ملت ختم رسلؐ شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

و ما توفیقی الاّ باللّٰہ العزیز

☆ ☆ ☆

رسولِ اکرم ﷺ کو حضراتِ انبیاء سابقین میں فضیلتِ مطلقہ اور جامعیت کمالات نبوت کا مرتبہ و مقام حاصل ہے اور آپ ہر نبی و رسولؑ سے اور پوری جماعت مرسلین کرام سے افضل و اکرم ہیں یہ جمہور علماء امت کا تصور ہے اور امت کے سوادِ اعظم کا عقیدۂ دینی ہے، لیکن اصلاحی مکتب فکر (مولانا فراہی) سے تعلق رکھنے والے چند علماء اس سے متفق نہیں ہیں۔

مولانا حمید الدین فراہی کے شاگرد گرامی مولانا امین احسن اصلاحی (لاہور) نے اپنی کتاب دعوتِ حق میں اس اتفاقی مسئلہ کو اختلافی بنانے کی کوشش کی اور حضور ﷺ کو افضل الانبیاء تسلیم کرنے اور اس حیثیت سے آپ کو پیش کرنے والوں کیلئے نہایت سخت الفاظ استعمال کئے۔

ہندوستان میں اس مکتبہ فکر سے وابستہ مولانا وحید الدین خاں ہیں موصوف نے بھی اس مسئلہ کو اپنی کتابوں میں نمایاں کیا اور اسلام مخالف ہندو حلقوں میں اور دنیا کے مسیحی حلقوں میں خانصاحب کو خوب پذیرائی اور حوصلہ افزائی ملی۔

ذیل میں مولانا اصلاحی کے خیالات نقل کئے جارہے ہیں

دسمبر ۴۵ء کے ترجمان القرآن (جماعت اسلامی مولانا مودودی) میں جو قسط شائع ہوئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"تبلیغ کے مروجہ طریقوں کی غلطیاں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں آنحضرت ﷺ اور دوسرے انبیاء کا مقابلہ کر کے انکو ہیٹا کرنے کی کوشش کی گئی حالانکہ قرآن کریم میں اس طرح کی مطلق ترجیح و تفصیل کی صریح ممانعت کی گئی تھی اور یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر پیغمبر کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت دی ہے اور آنحضرت کی فضیلت کے جو پہلو تھے

وہ تعین کے ساتھ واضح کر دیئے گئے تھے اور خود حضور ﷺ نے تاکید کے ساتھ ممانعت فرمائی تھی کہ دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں آپ کی لئے مطلق فضیلت کا دعویٰ نہ کیا جائے لیکن مسلمانوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو ایک اندھی بہری عصبیت اور قومی جوش کے ساتھ پیش کیا"۔

جہاں تک کسی پیغمبر کی شان میں ادنیٰ گستاخی کرنے اور کسی پیغمبر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں ہیٹا کرنے اور اس کی عظمت کو گرانے کا سوال ہے تو اس کے ممنوع ہونے میں دو رائیں نہیں ہیں

اہل علم اس بات کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں، البتہ کچھ عوامی واعظ ایسا انداز اختیار کر لیتے ہیں یا کچھ کم علم شعراء حضور ﷺ کی تعریف میں ایسا پیرایہ اور مبالغہ اختیار کرتے ہیں جس سے انبیاء سابقین کی شان میں سوء ادب کا شائبہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن عوامی واعظوں کی مذمت کرنے کے بجائے افضل الانبیاء کے عقیدہ ہی کو اندھی بہری عصبیت قرار دینا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

حضور ﷺ نے فرمایا

الانبیاء اخوۃ من کملاَت وامھاتھم شتیٰ دینھم واحد (مشکوٰۃ ۵۰۵) تمام پیغمبر آپس میں علاتی بھائی ہیں اور ان کی مائیں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے

یعنی ایک باپ کی اولاد کی طرح ہیں، یہ علاتی بھائی کہلاتے ہیں دین واحد کو باپ سے تشبیہ دی، دین اور سر چشمہ علم (ذات واحد) ان سب کا ایک ہے۔

اس تشبیہ سے حضرات انبیاء کرام کے درمیان نفس نبوت میں مساوات اور بھائی چارہ جیسی برابری ثابت ہوتی ہے لیکن کیا حقیقی بھائیوں کے اندر بڑے چھوٹے کا فرق اور بڑے کی فضیلت چھوٹوں پر ایک فطری، عقلی اور طبعی امر نہیں ہے۔؟

جمہور علماء امت نے اس مسئلہ پر جو بحث کی ہے، اس پر غور کیجئے مقام افضلیت اور قرآن کریم!۔۔۔ پہلی دلیل۔ اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ قُلْ لَّآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰي لِلْعٰلَمِيْنَ (انعام ۹۰) اور پر بڑے

بڑے درجات کے (۱۸) انبیاء سابقین کا تذکرہ کرنے کے بعد خدا تعالیٰ نے فرمایا "یہ سب لوگ وہ ہیں جنہیں ہم نے کتاب، فیصلہ کی قوت اور نبوت عطاء فرمائی، پھر اگر یہ مشرکین ان کا انکار کرتے ہیں تو اسکی کوئی پرواہ نہیں ہم نے یہ نعمت کچھ اور لوگوں کو سونپ دی ہے جو ان انبیاء کا انکار نہیں کرتے، اے نبی ﷺ! وہی لوگ خدا کی طرف سے ہدایت پر قائم تھے، پس آپ انہی کے راستے پر چلو اور لوگوں سے کہدو کہ میں تم سے تبلیغ ودعوت کے کام کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا، یہ پیغام تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لئے۔

آیت کریمہ میں جو ہدیٰ (**فبھداھم**) کا لفظ آیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ "اکثر علماء تفسیر نے ہدیٰ سے اصول دین (توحید، نبوت و آخرت) مراد لئے ہیں اور حضور ﷺ کو انہی اصول دین میں انبیاء سابقین کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے - کیونکہ شرائع اور جزئیات میں انبیاء سابقین کی تعلیمات کے اندر اختلافات ہیں، البتہ اصولوں میں اتفاق ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی آخر الزماں ﷺ اصول و فروع (دین و شریعت) دونوں پہلوؤں سے ایک مکمل دین لیکر تشریف لائے، پھر انبیاء سابقین کی پیروی کرنے کا کیا مطلب ہے -؟

اس اشکال کا کیا جواب ہے -؟ ------ اس کے جواب میں علامہ آلوسی بغدادی فرماتے ہیں کہ امام قطب رازی نے کشاف (زمخشری) کے حاشیہ پر اس کا یہ جواب لکھا ہے کہ ہدیٰ سے مراد اخلاق فاضلہ اور صفاتِ حسنہ ہیں جیسے حلم، صبر، شکر، زہد وغیرہ۔ خدا تعالیٰ آپ کو ہدایت کر رہا ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ اپنی زندگی کو ان رسولانِ کرام کے اخلاقی کمالات کا مجموعہ اور مکمل نمونہ بنائیں

یقیناً حضور ﷺ کی ذات اقدس میں تمام اعلیٰ اخلاق کی صلاحیت واہلیت موجود تھی، البتہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور عملی زندگی میں انہیں جمع کرنے کے لئے عملی نمونوں کی ضرورت تھی۔

خدا تعالیٰ نے انبیاء کرام کے اخلاق و شمائل کے عملی نمونوں کی پیروی کرنے کی تلقین نبی اکرم ﷺ کو فرمائی۔

ظاہر ہے کہ حضور ﷺ نے حکمِ الٰہی کی تعمیل فرمائی اور آپ کی زندگی فضائل اخلاق

میں سب سے اعلیٰ اور افضل بن گئی۔

شریعت بھی مکمل اور اخلاق بھی مکمل---پھر حضور ﷺ کے افضل الانبیاء ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟۔

وحینئذیکون افضل من جمیعھم قطعاً کماانه افضل من کل واحدٍ

علامہ بغدادی اسکے بعد لکھتے ہیں ---**وھو استنباط حسن**) یہ بہترین استدلال ہے-----(روح دوم ۵۲۴)

امام فخر الدین رازی نے بھی اس آیت کی تفسیر میں یہی لکھا ہے اور صبر و شکر اور زہد و قناعت کے اوصاف میں آپ کی جامعیت سے آپکی افضلیت پر استدلال کیا ہے (تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۸۶)

شیخ محی الدین ابن عربی نے فتوحات مکیہ میں قطب رازی کے استنباط کو پسند کیا اور اپنی طرف سے یہ اضافہ کیا کہ اگر اقتداء کے معروف معنٰی مراد ہوتے تو الفاظ یہ ہوتے ---**فیھم اقتدہ**----

قرآن کریم کی دوسری دلیل!

حضرات انبیاء کے درمیان تفاضل کا تذکرہ کرتے ہوئے خدا تعالیٰ نے فرمایا **تلك الرسل فضلنا بعضھم علٰی بعض ،منھم من کلّم الله ورفع بعضھم درجات** (بقرہ ۲۵۳)

یہ انبیاء جن میں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت عطاء فرمائی، بعض وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا اور ان میں بعض کو درجات عالیہ سے نوازا۔

تفسیر جلالین کے مصنف لکھتے ہیں۔

یعنی حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں پر فضیلت عطا فرمائی، مصنف نے بعض کے لفظ سے سرور عالم ﷺ کی ذات اقدس مراد لی ہے اور درجات عالیہ سے وہ خصائل مراد لئے ہیں جن سے آپ ﷺ کی افضلیت ثابت ہوتی ہے یعنی آپ کی دعوۃ کا عام ہونا، نبوت کا آپ کی ذات پر ختم ہونا اور آپ کی امت کا تمام امتوں سے افضل ہونا اور

کثیر معجزات ودلائل سے آپ کا سرفراز ہونا،

صاحب مدارک التنزیل نے لکھا ہے کہ ابو سعید نیشاپوری نے حضور ﷺ کے ستر خصائص جمع کئے ہیں۔ (جلالین ۳۹)

امام ابن کثیر کا استدلال

آیت بالا کی تفسیر کرتے ہوئے امام ابن کثیر دمشقی نے واقعہ اسراء ومعراج سے استدلال کیا ہے اور بیت المقدس میں تمام رسولوں کی امامت کرنے اور تمام رسولوں سے سبقت لے جاکر حریم قدس تک پہنچنے کی تفصیل بیان کی ہے۔

اگر حضرت موسیٰ زندہ ہوتے؟

حضور ﷺ کا مشہور ارشاد گرامی ہے:

لو كان موسىٰ حياً ماوسعني الاّاتباعي۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کے لئے میری پیروی کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوتا حاصل یہ کہ رسول پاک ﷺ مقتدائے کامل ہیں اور معروف معنی میں آپکو کسی کی اقتداء کرنے کا حکم دنیا آپ کی رسالت کاملہ اور نبوۃ جامعہ کی نفی کرتا، اس لئے امام قطب رازی کی توضیح درست ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب تشریف لائیں گے اور آپ شریعت محمدیہ ﷺ کی اتباع کریں گے یہاں تک کہ نماز میں امامت بھی امام مہدی کریں گے جو آل رسول میں سے ہوں گے۔ آپ نے فرمایا۔

كيف انتم اذا نزل ابن مريم فيكم وامامكم منكم (مشکوٰۃ ۴۸۰) اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم میں ابن مریم نازل ہوں گے اور امام وامیر تم میں سے ہوگا۔

ممانعت کی احادیث

رسول اکرم ﷺ نے اظہار حقیقت کے موقع پر اپنے مرتبہ اور مقام کا تعارف کرلیا اور اپنے آپکو افضل الرسل کے طور پر پیش کیا البتہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے انبیاء سابقین میں سے کسی رسول سے آپ کا موازنہ اور مقابلہ کیا اور حضور ﷺ نے اس مقابلہ

اور تقابل میں دوسرے رسول و نبی کی شان میں کچھ سبکی و سوءادب محسوس فرمایا تو اس موقع پر تواضع و خاکساری کا اظہار ضروری سمجھا اور اس قسم کے تفاضل کی ممانعت فرمائی۔

اس سلسلہ میں کئی احادیث مروی ہیں

امام بخاریؒ نے کتاب الخصومات میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک روز مدینہ منورہ میں ایک یہودی اور ایک مسلمان کے درمیان کسی بات میں جھگڑا ہو گیا۔

مسلمان نے اس جھگڑے میں حضور ﷺ کے افضل ہونے کی قسم کھائی اور کہا

والذی اصطفیٰ محمداً علی العالمین . قسم ہے اس ذات گرامی کی جس نے حضرت محمد ﷺ کو تمام جہانوں پر فضیلت عطاء فرمائی۔

یہودی نے اس کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قسم کھاتے ہوئے کہا۔

والذی اصطفیٰ موسیٰ علی العالمین اس خدا کی قسم جس نے موسیٰ کو تمام جہانوں پر فضیلت دی۔

مسلمان کو غصہ آ گیا اور اس نے اس یہودی کے طمانچہ رسید کر دیا فلطم وجهه۔

یہودی شکایت لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا حضور نے اس صحابی کو طلب کر کے ان سے معاملہ کی تحقیق کی انہوں نے اس کا جواب دیا کہ اس یہودی نے یہ قسم کھائی یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آپ پر فضیلت دی۔

حضور ﷺ نے محسوس کیا کہ اس مقابلہ میں میرے صحابی کے رویہ سے ایک محترم رسول کی شان میں سوءادب پیدا ہوا۔

آپ نے اسکی اصلاح کرتے ہوئے اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں کم درجہ دکھایا اور فرمایا۔

لاتخیّرونی علی موسیٰ علیه السلام مجھے موسیٰؑ کے مقابلے میں افضل اور برتر نہ کہا کرو۔ پھر آخرت کی ایک جزوی فضیلت جو حضرت موسیٰؑ کو حاصل ہو گی بیان فرمائی۔

یعنی موسیٰؑ مجھ سے پہلے ہوش میں آجائیں گے اور میں ان کے بعد ہوش میں آکر دیکھوں گا کہ وہ عرش الٰہی کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں۔

ایک موقعہ پر یہ واقعہ پیش آیا کہ صحابہ کرامؓ حضرت یونسؑ کے مچھلی کے پیٹ میں آنے اور ان سے خدا تعالیٰ کے خفا ہونے کا تذکرہ کر رہے تھے اور اس تذکرہ میں حضورؐ کو برتر قرار

دے رہے تھے۔

آپ حجرہ سے باہر تشریف لے آئے اور نہایت سخت پیرایہ میں فرمایا من قال انا خیر من یونس ابن متّی فقد کذب جو شخص یہ کہے کہ میں حضرت یونس سے افضل ہوں اس نے جھوٹ بولا۔

اعلان افضلیت کی احادیث

ترمذی کی مشہور حدیث ہے۔

عن ابن عبّاسؓ قال جلس ناسٌ مّن اصحاب رسول اللہ ﷺ ینتظرونه قال فخرج حتّی اذا دنامنهم سمعهم یتذاکرون فسمع حدیثهم فقال بعضهم عجباً انّ اللہ اتّخذابراهیمَ خلیلاً وّ قال آخر ماذا بالعجب منه موسیٰ کلّمه تکلیماً وقال اخر فعیسیٰ کلمة اللہ وروحه وقال اخر ادم اصطفاه اللہ فخرج علیهم فسلّم وقال قد سمعت کلامکم وعجبکم انّ ابراهیم خلیل اللہ وهو کذالك وموسیٰ نجیّ اللہ وهو کذالك وعیسیٰ روح اللہ وکلمته وهو کذالك وادم اصطفاه اللہ و هو کذالك الا وانا حبیب اللہ ولافخر وانا حامل لواء الحمد یوم القیٰمة تحته ادم ومن دونه ولا فخر وانا اوّل شافع وّ اوّل مشفّعٌ یوم القیامةولافخر وانا اوّل من یحرك خلق الجنة فیفتح اللہ لی فید خلنیها ومعی فقراء المؤمنین ولافخر وانا اکرم الاوّلین والاٰخرین علی اللہ ولا فخر

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے چند صحابہ بیٹھے ہوئے تھے آپ باہر تشریف لائے ان کے نزدیک ہوئے سنا کہ وہ آپس میں باتیں کر رہے ہیں ایک کہہ رہا ہے عجب ہے یہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو اپنا خلیل بنایا۔ دوسرا کہہ رہا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا ایک کہہ رہا ہے کہ عیسیٰ اللہ تعالیٰ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں۔ ایک نے کہا آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے چن لیا۔ رسول اللہ ﷺ ان پر نکلے اور فرمایا جو کچھ تم نے کہا ہے میں نے سن لیا ہے اور تم تعجب کا اظہار کر رہے تھے کہ ابراہیمؑ خلیل ہیں یہ درست ہے اور موسیٰ اللہ کے ہم کلام ہیں یہ بھی درست ہے اور عیسیٰؑ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں یہ بھی ٹھیک ہے اور آدم کو اللہ نے چن لیا خبر دار میں اللہ کا حبیب ہوں اور فخر سے نہیں کہتا قیامت کے

دن حمد کا جھنڈا اٹھانے والا ہوں اور فخر سے نہیں کہتا آدم اور دوسرے نبی اس کے نیچے ہوں گے میں پہلا سفارش کرنے والا ہوں اور پہلا ہوں جس کی سفارش قبول کی گئی ہے اور فخر سے نہیں کہتا اور میں پہلا ہوں جو جنت کے حلقے ہلاؤں گا میرے لئے وہ کھولا جائے گا۔ میرے ساتھ فقراء مومن ہوں گے اور کوئی فخر نہیں ہے میں اگلوں اور پچھلوں میں اللہ کے نزدیک معزز ترین ہوں کوئی فخر نہیں ہے۔

محدثین (علامہ طیبی) نے اس مستند حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرات انبیاء کے محاسن (صفی اللہ، کلیم اللہ، روح اللہ، خلیل اللہ) سنکر ان کی تصدیق فرمائی اور پھر اپنے مقام (حبیب اللہ) کا اظہار کرکے یہ بتایا کہ میں ان سے افضل، اکمل و جامع ہوں۔

یعنی حبیب میں خلت، ہم کلامی اور شرف کی تمام خوبیاں جمع ہیں محدثین نے خلت اور محبت کے درمیان جو فرق بیان کیا ہے اس پر طویل بحث کی ہے، جسکا حاصل یہ ہے کہ خلت کا بنیادی مفہوم حاجت، افلاس اور کمزوری ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل کا لقب دیا۔

واتخذ اللہ ابراھیم خلیلاً۔ (نساء ۲۵) اور خدا تعالیٰ نے ابراہیم کو دوست بنالیا اس میں اشارہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ میں خدا تعالیٰ کی طرف احتیاج اور غرض اس درجہ کی تھی کہ خدا تعالیٰ نے اس پسندیدہ جذبہ کے سبب انھیں اپنا دوست بنالیا یعنی خلیل وہ ہے جو کسی حاجت و غرض کے تحت کسی کو محبوب بناتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں حبیب کا صیغہ ہے جو فاعل (محبّ) کے معنی میں بھی آتا ہے اور (محبوب و معشوق) کے معنٰی میں بھی آتا ہے اور اس نقطہ میں بے غرض و بے لاگ محبت کرنے کا مفہوم ہے، دوسرے لفظوں میں حبیب کے مفہوم میں اخلاص کا رنگ زیادہ ہے۔ علامہ علی قاری اس بحث کا حاصل یہ قرار دیتے ہیں کہ خلیل مرید سالک اور طالب ہوتا ہے اور حبیب مطلوب و مراد اور مجذوب (جسے قدرت اپنی طرف کھینچتی) ہوتا ہے۔

علامہ علی قاری نے اس اجمالی بحث کے بعد قرآن کریم کی آیات سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

(۱) خلیل اللہ رضاء حق پر چلتا ہے اور حبیب کی رضاء کا حق احترام کرتا ہے، حضور

ﷺ کے بارے میں فرمایا گیا۔

فلنولّینّك قبلةًترضاها وسوف یعطیك ربك فترضی (بقرہ/۱۴۴/والضحیٰ)۔

اے نبی ﷺ! ہم آپ کا رخ اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں اور اے نبی! آپ کو خدا تعالیٰ بہت جلد اتنا عطا کرے گا کہ وہ راضی ہو جائیں گے (۲) خلیل خدا تعالیٰ کے عفو و کرم کی آرزو اور خواہش کرتا ہے۔ فرمایا:

والذی اطمع ان یغفر لی خطیئتی یوم الدین (شعراء ۸۲) خدا تعالیٰ کا تعارف کراتے ہوئے حضرت ابراہیم نے فرمایا۔

اور وہ خدا وہ ہے جس سے میں اس بات کی امید کرتا ہوں کہ وہ میری خطاؤں کو قیامت کے دن معاف کر دے گا اور حضورؐ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا **لیغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تأخر** (فتح/۱)

حدیبیہ کی فتح مبین اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطاء کی تا کہ اس فتح کے نتیجہ میں آپکو مستقبل میں اپنے فضل و کرم کی بڑی دولت سے نوازے۔

مغفرت کے معنی شریعت کی اصطلاح میں گناہوں کی معافی کے بھی ہیں اور درجات کی بلندی کے بھی ہیں۔

ماتأخر (مستقبل) کے ساتھ ماتقدم (ماضی) کا اضافہ عربی کا محاورہ ہے یہ مغفرت کا درجۂ یقین ہے۔

(۳) خلیل دعا کرتے ہیں کہ آخرت میں رسوائی نہ ہو

ولاتخزنی یوم یبعثون (شعراء/۸۷) الٰہی! مجھے قیامت کے دن رسوا نہ کیجیو اور رسول پاک ﷺ کے حق میں یہ اعلان کیا جاتا ہے۔

یوم لایخذالله النّبی والّذین آمنوا معه (تحریم/۸)

قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے نبی علیہ السلام اور ان کے ایمان والے ساتھیوں کو رسوا نہ کرے گا۔

(۴) خلیل دعاء کرتے ہیں کہ قیامت تک میرا ذکر خیر باقی رہے۔

واجعل لی لسان صدق فی الآخرین (شعراء ۸۴) حضور ﷺ کے بارے

میں اعلان کیا گیا۔

ورفعنا لك ذكرك (الم نشرح/۲) اورہم نے اے نبی! آپ کے ذکر کو سر بلندی عطاء کی

(۵) خلیل نے آرزو فرمائی۔ **واجعلنی من ورثة جنة النعیم** (شعراء/۸۵)۔

الٰہی! مجھے جنت نعیم کے وارثوں میں شامل کردے حضورؐ سے خدا تعالیٰ نے وعدہ فرمایا۔

انا اعطینٰك الكوثر ہم نے آپکو اے نبیؐ ہر قسم کی بھلائی اور خیر کا کوثر عطا کیا۔ (سورۂ کوثر/۱)

عبد اللہ ابن ابی کا جواب

عبد اللہ ابن ابی رئیس المنافقین کا واقعہ ہے کہ وہ ایک روز مسجد نبوی میں آیا، صحابہ کرام ذکر الٰہی میں مشغول تھے اس کے خادم نے مسجد کے اندر ایک گدا اور تکیہ بچھایا، یہ اس پر بیٹھ گیا، صدیق اکبرؓ تلاوت کر رہے تھے اس گستاخ نے حضرت صدیق کو مخاطب کر کے کہا **قل لمحمدؐ یاتینا بآیة كما جاء الاولون**۔؟

محمد سے کہہ کہ پہلے رسولوں کی طرح اپنی صداقت کی نشانیاں پیش کرے صدیق اکبرؓ اس غرور و تمکنت کے ساتھ اس چیلنج پر رونے لگے، حضورؐ کو حجرہ کے اندر خبر ہو گئی، آپؐ باہر تشریف لے آئے، آپ کو دیکھ کر

صدیق اکبرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا **قوموا الی رسول اللهؐ نستغیث به من هذا لمنافق** حضورؐ کے استقبال کے لئے کھڑے ہو جاؤ آپ سے ہم اس گستاخ کی شکایت کریں گے اور مدد چاہیں گے۔ آپ نے فرمایا

لایقام لی انّما القیام للّٰه عز وجلّ۔ میرے لئے کھڑا نہ ہوا جائے قیام صرف اللہ ہی کیلئے ہے۔

پھر حضور ﷺ نے اس گستاخ کے چیلنج کا جواب دیا اور وہ پندرہ خصوصیتیں بیان فرمائیں جو اللہ کی طرف سے صداقت کا نشان بنا کر آپ کو عطاء کی گئی تھیں۔

یہ موقع اظہار حقیقت کا تھا! منافقین کے سردار کی نخوت اور اسکے غرور کو توڑنا تھا اس لئے حضور ﷺ نے اپنے فضائل بیان فرمائے۔

معیت حق کا غلبہ

امام رازی تفسیر کبیر میں اسلوب قرآنی کے بڑے بڑے عجیب نکتے اور لطیفے بیان کرتے ہیں امام نے معیت حق کے یقین پر حضرت موسیٰ اور حضور ﷺ کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

فلمّا تراء الجمعان قال اصحابُ موسیٰ انا لمدرکون، قال کلاّ انّ معی ربی سیهدین (شعراء ۶۲)

پھر موسیٰ اور فرعون کے دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا اے موسیٰ! ہم پکڑے گئے تو موسیٰ نے کہا، ہرگز نہیں، بلاشبہ میرے ساتھ میرا پروردگار ہے، وہ ضرور راستہ دے گا۔

ہجرت کے موقعہ پر حضور ﷺ اور آپ کے رفیق حضرت ابو بکرؓ جب غار ثور میں پناہ گزیں تھے تو قریش کے سردار آپ کی تلاش میں غار ثور تک پہنچ گئے، حضرت ابو بکرؓ نے غار کے اندر سے انھیں دیکھا اور ان پر گھبراہٹ طاری ہو گئی حضورؐ نے انھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

إِلاَّ تَنصُرُوْهُ فَقَدْنَصرَهُ اَللّٰهُ إِذْ أَخرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْاثَانِيَ اَثْنَيْنِ إِذْ هُمَافِي الْغَارِإِذْ يَقُوْلُ لِصٰحِبِهِ لاَتَحزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا السُّفْلىٰ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ تبوک کے موقعہ پر منافقین کو مخاطب کر کے فرمایا

اے منافقو! اگر تم رسول پاک ﷺ کی مدد نہ کرو گے تو کیا فرق پڑے گا اللہ تعالیٰ ان کی مدد کر چکا ہے، اب بھی کرے گا، اس نازک وقت کا تصور کرو جب اسے کافروں نے مکہ سے نکالا، اس حال میں کہ وہ دو میں کا دوسرا تھا اور وہ دونوں غار کے اندر تھے، اس وقت انہوں نے اپنے رفیق کو تسلی دیتے ہوئے اس سے کہا غم نہ کرو، بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے، پھر اللہ نے اس کے قلب پر طمانیت کی مزید قوت نازل کر دی اور ان کی مدد فرمائی۔

امام کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعلان میں اپنی ذات کا تصور خدا تعالیٰ کے تصور سے پہلے ہے اور حضورؐ کے اعلان میں اللہ تعالیٰ کی ذات کا تصور اپنی اور اپنے رفیق

کی ذات کے تصور سے مقدم ہے۔

اسلوب عبارت کا یہ فرق بتارہا ہے کہ ذات حق کی معیت و رفاقت کے یقین کا غلبہ حضور ﷺ پر حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں زیادہ تھا۔

حضرت تھانویؒ کی تشریح

حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے حضور ﷺ کے افضل الانبیاء ہونے پر (۴۵ء) میں ایک تقریر کی جو دعوات عبدیت میں شامل ہے اس تقریر میں مولانا نے خلیل اور حبیب کے درمیان معنوی فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

حضورؐ نے انبیاء سابقین کے اوصاف سنکر فرمایا کہ میں حبیب اللہ ہوں۔

اس کا مطلب واضح ہے کہ آپؐ نے حبیب اللہ کے وصف کو دوسرے اوصاف کے مقابلے میں جامع اور کامل قرار دیا ہے۔

حالانکہ خلیل کے مفہوم میں وہ محبت ہے جو دل کے اندر داخل ہو خلیل، خلال (اندر، درمیان) سے ہے، محبت کے مفہوم میں یہ گہری معنویت نہیں ہے

مولانا نے خلت و خلیل کے مفہوم کی وضاحت متنبی کے اس شعر سے کی ہے۔

عذل العواذل حول قلب التا نه　　وهوى الاحبةمنه فى سودائه

برائی کرنیوالوں کی برائی میرے سرگرداں قلب کے چاروں طرف ہی رہتی ہے اور دوستوں کی محبت میرے دل کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔

اسکے بعد مولانا نے حبیب کی صفت کو اہم قرار دیتے ہوئے فرمایا خلیل کے مفہوم میں عاشق و معشوق کے دونوں پہلو داخل ہیں اور حبیب میں صرف محبوب و محبوبیت کا مفہوم ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ حضورؐ پر محبوبیت خداوندی کا رنگ غالب تھا اور یہی آپ کی افضیلت ہے۔

حضرت تھانوی کا بیان کردہ معنوی فرق دوسرے علماء حدیث سے مختلف ہے۔

(باقی)

بدعت اور اہل بدعت

بدعت اور اہل بدعت کی حوصلہ افزائی کرنیوالے بھی افتراء علی الرسول کے مجرم ہیں

از: مولانا حافظ محمد اقبال رنگونی (مانچسٹر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن اور احادیث مبارکہ کی تصریحات کے مطابق شرک کے بعد سب سے بڑی فکری اور عملی گمراہی بدعت ہے بدعت سے اسلام کا چشمہ صافی گدلا ہو جاتا ہے اور جو شخص اسلام کے چشمہ صافی کو گدلا کرنے کی کوشش کرے گا وہ خود ہی دنیا اور آخرت میں گدلا اور میلا ہو جائے گا اسی لئے خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعت سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی صحابہ کرام اور اکابرین امت نے اسے انتہائی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور عارفین امت نے اس سے سوئے خاتمہ کا اندیشہ محسوس کیا ہے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ جس طرح توحید کے مقابل لفظ شرک ہے اسی طرح سنت کے مقابلے میں لفظ بدعت ہے۔ کوئی شخص شرک کرنے کے بعد اپنے آپ کو ہزار اہل توحید میں سے سمجھے اسکا یہ سمجھنا باطل اور مردود ہوگا اسی طرح بدعات اپنانے کے بعد کوئی اپنے آپ کو سنی کہے تو اسکا یہ کہنا غلط ہوگا کیونکہ جس طرح شرک نام ہے توحید کی مخالفت کا اسی طرح بدعت نام ہے سنت کی مخالفت کا سنت کی مخالفت کرنے والا اہل سنت اور سنی کہلانے کا کسی صورت میں مستحق نہیں بدعات کا اپنانے والا پوری طرح شیطان کی گرفت میں آجاتا ہے پھر اسے یہ سوچنے کی توفیق نہیں ملتی کہ ان اعمال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پاک صحابہ کی مخالفت ہوتی ہے یا نہیں؟ وہ کبھی یہ نہیں سوچتا کہ بدعات و محدثات کے اختیار کرنے پر خدا کی ناراضگی اور اسکے عتاب کا مستحق تو نہیں ہو رہا ہے؟ شیطان کا داؤ اس پر اس طرح چل گیا ہے کہ وہ علی الاعلان ان بدعات کو سنت کہتا ہے اور اسے دین کا حصہ قرار دیتے

ہوئے دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور ان بدعات پر عمل نہ کرنے والے کو برا کہتے ہوئے بھی شرم نہیں کرتا آخر کار وہ ان بدعات کا بوجھ لئے سفر آخرت پر روانہ ہو جاتا ہے اور اسے توبہ کی مہلت تک نہیں ملتی بدعت کی ایجاد اور اس پر اصرار کا معنی یہ ہے کہ ہمارا دین ابھی (معاذاللہ) ناقص ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو شریعت لیکر آئے اس میں کمی رہ گئی تھی جو اس بدعت سے پوری کی جارہی ہے۔ بدعت کا ارتکاب کرنے والا گویا یہ کہہ رہا ہے کہ یہ بھی دین کا ایک اہم عمل تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نہیں بتلایا۔ غور کیجئے کیا یہ دین کے کامل ہونے کا کھلا انکار نہیں ہے؟ اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگانا نہیں کہ معاذاللہ آپ نے ہمیں پورا دین نہیں دیا۔ سو یاد رکھئے کہ بدعت کا اثر نہ صرف اعمال پر پڑتا ہے بلکہ بدعت کے ارتکاب سے عقیدہ بھی گدلا اور گندا ہو جاتا ہے اس لئے بدعت کے مریضوں سے ہمیشہ دور رہنا چاہئے۔

بدعت ہر اس عمل کا نام ہے جسے دین سمجھ کر کیا جائے اور اس پر ثواب اور اجر کی امید رکھی جائے مگر اسکی اصل نہ کتاب اللہ سے ملے نہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ نہ آپ کے صحابہ کرام کے عمل سے ملے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ کام اچھا ہوتا اور اس پر ثواب ملتا تو قرآن کریم اس کا ضرور ذکر کرتا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے عمل میں لاتے اور اپنی امت کو اسکی تاکید فرماتے۔ صحابہ کرام جو ہر نیکی کی تلاش میں رہتے تھے وہ ضرور یہ عمل کر گذرتے۔ لیکن جب انہوں نے باوجود داعیہ ہونے کے وہ کام نہ کیا تو یہ فیصلہ کرنا کوئی مشکل نہیں کہ اسلام میں اس عمل کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور جو اس پر عمل کرے گا وہ نہ صرف اسلام کو ناقص سمجھنے کا مجرم ٹھہرے گا بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا منکر ہوگا۔ مشہور محدث حضرت مولانا سید بدر عالم مہاجر مدنی نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں۔

بدعت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوتی ہے اس سے بدتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے بدعت ایک مہلک اور متعدی مرض ہے اسکے مریضوں سے متعدی امراض کی طرح دور رہنا چاہیے قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدعتیوں کو دیکھ کر بڑی نفرت کے انداز میں فرمائیں گے سحقا سحقا لمن بدل بعدی (یعنی جنھوں نے میرے دین میں تبدیلی کی اور بدعات پھیلائیں وہ مجھ سے دور رہیں دور رہیں۔) بدعت کو ایجاد کرنے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہمارا کامل دین گویا ابھی ناقص ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

شریعت میں بھی کمی بیشی کی گنجائش ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد گویا نبوت کی ضرورت باقی ہے اور یہ ختم نبوت کا انکار نہیں تو اور کیا ہے؟ بدعت کا اثر نہ صرف مسلمانوں کے اعمال پر ہوتا ہے بلکہ ان کے عقائد پر بھی پڑتا ہے اس لئے بدعت میں غلو کرنے سے یعنی اسکی زیادتی سے سوء خاتمہ کا بھی اندیشہ ہے۔ آیئے ہم قرآن کریم اور احادیث شریفہ کے آئینہ میں بدعت اور اسکے نقصانات پر ایک سرسری نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ دین میں بدعات پیدا کرنے۔ بدعات کو رواج دینے اور بدعات کو گلے لگانے کا انجام کس قدر خطرناک ہے اسکے دنیوی نقصانات کیا ہیں اور آخرت میں بدعات کا پھل کتنا کڑوا ہوگا۔

(۱) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ وسلم کے اتباع کا حکم فرمایا ہے اور اپنی محبت کا معیار اتباع سنت بتلایا ہے۔ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور آپ کی سنت مبارکہ کا اتباع کرے گا اسے خدا کی خوشنودی اور اسکی محبت حاصل ہوگی۔ قرآن کریم میں ہے

قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله ویغفر لکم ذنوبکم والله غفوررحیم۔ قل اطیعو االله والرسول فان تولوافان الله لا یحب الکافرین

(پ ۳ آل عمران)

(ترجمہ) آپ کہدیں اگر تم اللہ کی محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تاکہ اللہ تم سے محبت کرے اور رسول کا حکم مانو پھر اگر اعراض کریں تو اللہ کو محبت نہیں ہے کافروں سے

اس آیت میں یہ بات واضح کردی گئی کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اتباع سنت ہے۔ خدا کی محبت اور اسکی رضا اتباع میں ہے ابتداع میں نہیں۔ بدعات سے نہ خدا خوش ہوتا ہے اور نہ اسکی محبت اور مغفرت حاصل ہوسکتی ہے۔ حضرت جابرؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے

فمن اطاع محمداً صلى الله عليه وسلم فقد اطاع الله ومن عصى محمداً صلى الله عليه وسلم فقد عصى الله... الحديث (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۸۱)

(ترجمہ) جس نے میری بات مانی اس نے خدا کی بات مانی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی۔

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

کل امتی یدخلون الجنة الا من ابی قیل ومن ابی قال من اطاعنی دخل الجنة ومن عصانی فقدابی . (صحیح بخاری ج۲ ص ۱۰۱۸)

(ترجمہ) میری امت میں سے ہر کوئی جنت میں جائے گا مگر جس نے انکار کیا ہوگا آپ سے پوچھا گیا وہ کون ہونگے۔ آپ نے ارشاد فرمایا جس نے میری بات مانی وہ جنت میں جائے گا اور جس نے میرت بات نہ مانی بس اس نے انکار کر دیا

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت خدا کی اطاعت اور حضور کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ٹھہری اور حضور کا نافرمان جنت کے قابل نہ رہا تو آپ ہی اندازہ فرمایئے کہ جو عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کے مقابل آجائے اور حضورؐ کے پاک صاف دین میں کمی بیشی کا باعث بنے اس عمل اور صاحب عمل پر خدا کا غضب نہ اترے تو اور کیا ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں اضافہ ہو اور خدا کی محبت اور اسکی رضا ملے۔ ہرگز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیرت اور سنت کا مقابل بدعت کو قرار دیا جس میں بتلا دیا گیا کہ بدعات کا نقصان یہ ہے کہ انسان حضور کی سنت اور سیرت کے مقابل آجاتا ہے اور آپ کی سنتوں کے مقابلے پر آجانا صریح گمراہی نہیں تو اور کیا ہے۔ حضرت جابر کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

فان خیرالحدیث کتاب الله وخیرالهدی هدی محمد وشر الا مور محدثاتها و کل بدعة ضلاله (صحیح مسلم ج۱ ص ۲۸۵)

(ترجمہ) بہترین بات اور بیان کتاب اللہ ہے اور بہترین نمونہ اور طریقہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے اور وہ کام بدترین ہیں جو نئے نئے کھڑے جائیں اور ہر بدعت گمراہی ہے سو سنت کو اپنانے کا فائدہ یہ ہے کہ خدا کی محبت اور اسکی مغفرت نصیب ہوتی ہے جبکہ بدعت کو اپنانے اور اسے پھیلانے کا نقصان یہ ہے کہ خدا ناراض ہوتا ہے اور گمراہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ جب خدا ناراض ہو تو پھر بندے کا کوئی نیک عمل بھی قبول نہیں ہوتا

(۲) حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

لا یقبل الله لصاحب بدعه صوما ولا صلاة ولا صدقة ولا حجا ولا عمرة ولا جهادا ولا صرفا ولا عدلا یخرج من الا سلام کما تخرج الشعرة ن العجین (سنن ابن ماجہ ص ۶)

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ بدعتی کا نہ روزہ قبول کرتا ہے نہ نماز نہ صدقہ قبول کرتا ہے اور نہ حج نہ عمرہ اور نہ جہاد اور نہ کوئی فرضی عبادت قبول کرتا ہے اور نہ نفلی۔ بدعتی اسلام سے ایسے خارج ہو جاتا ہے جیسے گوندھے ہوئے آٹے سے بال نکل جاتا ہے۔

آپ ہی سوچیں بدعت کا یہ نقصان کیا کچھ کم ہے کہ ایک شخص اپنی زندگی تو اسلام کے مطابق گذارے۔ نماز روزہ حج صدقہ اور فرائض ونوافل بھی کرتا رہے لیکن بدعت کو بھی محبوب رکھے اور اہل بدعت کو گلے لگائے تو یہ بدعت اسکی نیکیوں کو ایسے کھاجاتی ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھاجاتی ہے۔ عبادت کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ میری عبادت قبول ہو رہی ہے مگر وہ یہ نہیں سمجھتا کہ بدعت ایک ایسا خبیث عمل ہے کہ اس سے اسکا نیک عمل اوپر کو نہیں اٹھتا۔ اللہ کے ہاں اسکے اس عمل کی کوئی وقعت نہیں ہوتی بلکہ بدبختی یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اسلام سے ایسے نکل جاتا ہے جیسے گوندھے ہوئے آٹے سے بال نکال دیا جاتا ہے۔ ہاں اگر وہ آئندہ کیلئے بدعت سے توبہ کرلے تو پھر اس کے عمل کو قبولیت کا شرف نصیب ہوتا ہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ

ابی اللہ ان یقبل عمل صاحب بدعه حتي يدع بدعته (سنن ابن ماجہ ص ۶)

اللہ تعالیٰ بدعتی کے ہر عمل کو رد کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی بدعت چھوڑ دے۔

بدعتی کے ہر عمل کو رد کرنے کی وجہ سوائے اسکے اور کیا ہے کہ وہ اپنے قول و عمل سے اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے وہ ابھی تک ناقص ہے۔ یہ عمل (جو اس وقت میں کر رہا ہوں) بھی دین کا ایک اہم حصہ تھا جو اس دین میں شامل نہیں کیا گیا اور پیغمبر نے اپنی امت کو یہ عمل نہیں بتلایا۔ ظاہر ہے یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کھلا افتراء ہے اور مفتری علی الرسول اسی کا مستحق ہے کہ اسکا ہر عمل رد کر دیا جائے۔ اسلئے کہ دین کامل اور مکمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو پورا پورا دین پہنچا دیا اس میں کوئی کمی بیشی نہیں فرمائی۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر چلنے والا اپنے قول و عمل سے اس کا کھلا اعلان کرتا ہے کہ دین اسلام کامل اور مکمل دین ہے اللہ تعالیٰ نے آپ پر دین کو مکمل فرمادیا اور آپ نے اپنی امت کو نیکی کی ہر راہ بتلادی اور ہر برائی کی نشاندہی کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الا سلام

دینا (پ۶ المائدہ ۳)

(ترجمہ) آج میں پورا کر چکا تمہارے لئے تمہارا دین اور پورا کیا تم پر میں نے اپنا احسان اور میں نے تمہارے واسطے پسند کیا اسلام کو دین

حجتہ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ بتاؤ میں نے خدا کا دین پورا پورا پہنچایا کہ نہیں؟ صحابہ نے کہا جی ہاں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے ہمیں خدا کا دین پورا پہنچایا آپ نے اس وقت اپنا سر مبارک آسمان کی طرف کیا اور فرمایا کہ اے اللہ آپ گواہ رہئے (صحیح بخاری ج ا ص ۲۳۵)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ان تمام اعمال کی خبر دے دی جو نیکی اور بھلائی کی ہے جن کے اختیار کرنے سے خدا راضی ہوتا ہے اور اس عمل پر ثواب حاصل ہوتا ہے اور ان سب امور کا پتہ بتلادیا جن کو عمل میں لانے سے خدا ناراض ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے یا اپنے عمل کے ذریعہ یہ بتائے کہ یہ عمل جواب میں ادا کر رہا ہوں یہ نیکی اور ثواب کا عمل ہے جسکا معنی یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت سے نیکی کی ایک بات چھپائی جسے یہ بدعتی ظاہر کر رہا ہے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) حق یہ ہے کہ ایسا کہنے والا جھوٹ کہتا ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں

من حدثك انه كتم فقد كذب ثم قرات ياايها الرسول بلغ ما انزل اليك من ربك الا يه (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۲۰)

(ترجمہ) جو یہ کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی کوئی بات چھپائی وہ جھوٹ کہتا ہے پھر آپ نے آیت پڑھی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے رسول پہنچاوے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے الآیہ

قرآن کریم اور احادیث کی روشنی میں اہل سنت اس عقیدے کا کھلا پرچار کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی کوئی بات ہرگز نہیں چھپائی اور نہ کوئی ایسا عمل اپنی امت سے مخفی رکھا جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوں اور اس پر ثواب ملے جبکہ بدعت پیدا کرنے اور اسے رواج دینے کا نقصان یہ ہے کہ اس سے معاشرے میں یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ہمارا دین ابھی ناقص ہے ابھی ایسے نیکی کے اور بھی بہت کام تھے جو ہمیں نہیں بتائے گئے۔ اور یہ بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا نہیں تو اور کیا ہے؟ امام دارالہجرہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ

نے بدعت کے نقصانات میں اس بات کو سب سے اہم بتلایا ہے کہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات رسالت پر حملہ ہوتا ہے (العیاذ باللہ) آپ فرماتے ہیں

من ابتدع فی الا سلام بدعة یراها حسنه فقد زعم ان محمداً صلی الله علیه وسلم خان الر سالة لان الله یقول الیوم اکملت لکم دینکم فمالم یکن یو مئذ دینا فلا یکون الیوم دینا (الاعتصام للشاطبی ج ۱ ص ۷۱ ج ۲ ص ۱۵۰)

جو شخص بدعت ایجاد کرتا ہے اور اسکو اچھا سمجھتا ہے تو وہ گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (معاذ اللہ) رسالت (کی ادائیگی) میں خیانت کی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا الیوم اکملت لکم دینکم الایه (آج میں نے تم پر اپنا دین مکمل کرلیا پھر فرماتے ہیں کہ) جو کام اس زمانہ میں دین نہیں تھا وہ آج بھی دین نہیں بن سکتا (الاعتصام للامام الشاطبی ج ۱۔ ص ۷۱ ج ۲ ص ۱۵۰) حضرت مجدد الف ثانی (۱۰۳۵ھ) فرماتے ہیں کہ بدعات کی راہ اپنانا اکمال دین کا انکار کرنا ہے آپ لکھتے ہیں

دین پیش ازیں محدثات کامل شدہ بود و نعمت تمام گشتہ و رضائے حق تعالیٰ بحصول پیوستہ کما قال اللہ تعالیٰ الیوم اکملت لکم دینکم الآیه پس کمال دین ازیں محدثات جستن فی الحقیقت انکار نمودن است بمقتضاے ایں آیت کریمہ۔ (مکتوبات حصہ ۴ ص ۹۴ مکتوب ۲۶۰) دین ان بدعات سے پہلے ہی کامل ہو چکا ہے اور نعمت تمام ہو چکی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اسی دین کامل سے وابستہ ہو چکی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے الیوم اکملت لکم دینکم الآیه سو دین کا کمال ان بدعات میں تلاش کرنا آیت کریمہ کے مضمون سے انکار کرنے کے برابر ہے

(۴) اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس عمل کو آج دین بنا کر اس پر عمل کرنے کی ترغیب اور اسکی تاکید کی جاتی ہے وہ نہ صرف یہ کہ سرے سے دین ہی نہیں بلکہ اس عمل کے موجد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اب جو لوگ اس نئے عمل کو اپناتے ہیں اور اسکے موجد کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یا کسی درجے میں اسکی تکریم کرتے ہیں وہ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو نقصان پہنچانے میں اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ نہ اس عمل کو پذیرائی بخشے نہ اسکے موجد کی عزت کرے بلکہ جس قدر ہو سکے اس عمل اور اسکے موجد کی حوصلہ شکنی کرے۔ حضرت ابراہیم بن میسرہؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ

من وقر صاحب بدعة فقد اعان علی هدم الا سلا م(مشکوٰۃ ص ۳۱)

(ترجمہ) جس نے کسی بدعتی کی مدد کی اس نے اسلام کو گرانے میں اسکا ہاتھ بٹایا

حضرت علامہ شاطبی (۷۹۰ھ) اہل بدعت کی عزت کرنے کے نقصانات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

فان توقیر صاحب البدعة مظنه لمفسد تین تعودان علی الا سلام بالهدم احداهما التفات الجهال والعامه الی ذلك التوقیر فیعتقدون فی المبتدع انه افضل الناس وان ماهو علیه خیر مما علیه غیره فیو دی ذلك الی اتباعه علی بدعته دون اتباع اهل السنة علی سنتهم الثانیه انه اذا وقر من اجل بدعته صار ذالك كالحادی المحرض له علی انشاء الابتداع فی كل شئی وعلی كل حال فتحیا البدع وتموت السنن وهو هدم الا سلام بعینه(الاعتصام ج ۱ ص ۸۴)

(ترجمہ) اہل بدعت کی تعظیم کرنے میں دوایسی برائیوں کا اندیشہ ہے جن سے اسلام کی بنیاد منہدم ہوتی ہے پہلی یہ کہ جاہل اور عوام جب اہل بدعت کی اس عزت افزائی کو دیکھیں گے تو وہ سمجھیں گے کہ یہ بڑا فضیلت والا ہے اور یہ جس قول و عمل پر ہے وہ اس سے بہتر ہے جو دوسرے بتاتے ہیں سو یہ بات اسکی اس بدعت کی پیروی کی طرف لے جائے گی جس کا نقصان یہ ہوگا کہ اہل سنت کے طریقہ کی اتباع نہ ہو پائے گی۔ دوسرا یہ کہ اہل بدعت جب اپنی بدعت کی وجہ سے عزت پائے گا تو وہ گویا ہر عمل میں بدعت پیدا کرنے کی ترغیب دے گا اور ہر کام میں بدعت اختیار کرنے کا داعی بنے گا بہر حال (اہل بدعت کی عزت و تکریم سے) بدعات کی نشو ونما ہوتی ہے اور سنتیں مرتی ہیں اور یہ بعینہ اسلام کو گرانا ہے۔

پیران پیر حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں

جو شخص اہل بدعت کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ ملے گا جو اسکی خوشی کا باعث ہو تو اسنے اس چیز کی حقارت کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی (غنیۃ الطالبین ص ۱۷۶)

(۵) جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو حقارت کی نگاہ سے دیکھیں اور اسکے مقابلے میں اس عمل کو اچھا جانیں جو بدعت ہے تو ایسے لوگ خدا کی لعنت میں گرفتار ہیں حضرت علی مرتضیٰؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ

المدینة حرم مابین عیر الی ثور فمن احدث فیها حدثا او اوی محدثا

فعليه لعنة الله و الملئكة والناس اجمعين لايقبل الله منه صر فا ولا عدلا
(صحیح بخاری ج۲ص ۱۰۸۴)

(ترجمہ) مدینہ منورہ مقام عیر سے لے کر مقام ثور تک حرم ہے سو جس نے اس میں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہو نہ تو اسکا کوئی فرض قبول ہے نہ نفل۔

بدعت پیدا کرنے اور اسے پھیلانے کا نقصان دیکھئے کہ ساری کائنات اس پر لعنت برساتی ہے اور وہ ہے بھی اسی لائق۔ اسلئے کہ وہ خدا کے دین کو برباد کرنے پر تلا ہوا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں اور آپ کے طریقہ کے مقابلے پر ایک عمل وجود میں لارہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بدعت اور اہل بدعت سے اس قدر سخت نفرت ہے کہ آپ اپنے امتی کو یہ نصیحت فرماتے ہیں کہ کسی ایسے شخص کو جو بدعت کا شکار ہے کبھی پناہ نہ دینا ورنہ تم بھی ساری کائنات کی لعنت کے مستحق بن جاؤ گے۔

اس سے پتہ چلتا ہے جو لوگ کسی درجے میں بھی بدعت کو قبول کرتے ہیں اور اہل بدعت کیلئے راستے پیدا کرتے ہیں وہ اپنی جگہ کتنے ہی نوافل اور نیکی کیوں نہ کریں اللہ تعالیٰ کے ہاں انکے یہ اعمال شرف قبولیت نہیں پاتے یہ لوگ ہر لحہ خدائی لعنت میں مبتلا رہتے ہیں یہ لوگ خدا کی زمین پر خدا اور اسکے رسول کے طریقے پھیلانے اور اسکی دعوت دینے کے بجائے ایسے افعال کو وجود دیتے ہیں جس کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر انہی بدعات کی وجہ سے معاشرے میں حق و باطل اور سنت و بدعت کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور پورا معاشرہ اس طرح خدائی پکڑ میں آجاتا ہے کہ ہر طرف جہالت کے اندھیرے رہ جاتے ہیں اور سنت کا نور اٹھالیا جاتا ہے

(۲) حضرت عفیف بن الحارث الثمالیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ

ماا حدث قوم بدعة الا رفع مثلها من السنة فتمسك بسنة خير من احداث بدعة (مشکوٰۃ ص۳۱)

(ترجمہ) کوئی قوم بدعت ایجاد نہیں کرے گی مگر اسکی مقدار میں ان سے سنت اٹھالی جائے گی اسلئے سنت کو مضبوطی سے پکڑنا بدعت کے ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔

اس حدیث پاک میں سنت پر عمل کرنے کا فائدہ اور بدعت پیدا کرنے کا نقصان بتادیا گیا کہ سنت پر عمل کرنا اور اسے مضبوطی سے تھامے رکھنا بڑی فضیلت کی بات ہے اسلئے کہ سنت

پر عمل کرنے میں راحت ہی راحت ہے کوئی خطرہ اور اندیشہ نہیں جبکہ بدعت کے ایجاد کرنے کا کھلا نقصان یہ ہے کہ معاشرے کو سنت جیسی عظیم نعمت سے محروم ہونا پڑتا ہے مشہور تابعی حضرت حسان فرماتے ہیں کہ جب وہ سنت اٹھالی جاتی ہے تو پھر قیامت تک وہ واپس نہیں کی جاتی (مشکوۃ ص ۳۱) آپ ہی اندازہ کریں کہ وہ قوم کیسے خوشحال اور سدا بہار رہ سکتی ہے جو سنت جیسی نعمت سے محروم ہو جائے۔ اسی لئے ہر دور کے اکابرین اور اللہ والوں نے ہمیشہ سنت کے دامن کو مضبوطی سے تھامنے کی تاکید کی اور ہر ایسے قول و عمل سے اجتناب کی تاکید کی جس سے ایک مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کے اسوۂ حسنہ سے محروم ہو جائے

آپ اگر اپنے ارد گرد ایک نظر دوڑائیں تو آپ کو ایسے بہت سے اعمال ملیں گے جنکا دور دور تک اسلام سے کوئی واسطہ نظر نہیں آتا اور نہ ہی وہ اعمال اسلامی تعلیمات سے کچھ لگا کھاتے ہیں مگر افسوس کہ معاشرے میں انہیں اس طرح داخل کر دیا گیا ہے یا جہالت کے مارے افراد نے انہیں اس طرح اپنالیا ہے کہ دین گویا نام ہی ان اعمال کا ہے اور انہیں اپنائے بغیر نہ کوئی صحیح مسلمان سمجھا جا سکتا ہے اور نہ پکا اہل سنت بن سکتا ہے۔ ان وضعی افعال کی بھرمار سے سنت پر عمل کرنے کی راہ بند کر دی جاتی ہے۔ اور اگر کوئی سنتوں پر عمل کرتے ہوئے ان وضعی افعال سے جان چھڑانا چاہتا ہے تو اس پر آواز کسی جاتی ہے کہ اس نے سنت کو ترک کر دیا حالانکہ اس نے جس عمل کو ترک کیا تھا وہ سنت نہیں بدعت تھا۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے تھے کہ

آئندہ زمانے مین بدعت اس طرح پھیل جائے گی کہ اگر کوئی شخص کسی بدعت کو ترک کرے گا تو اسکو کہیں گے کہ تو نے سنت ترک کر دی (الاعتصام ج ۱ ص ۹۰)

یہ کہنے والے کون ہیں؟ وہی جو سنت کو ختم کرنے اور اسکو مٹانے کے درپے ہیں اور اسکی جگہ اپنے وضع کردہ افعال کو لانا چاہتے ہیں۔ انکے اس طرز عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل بن کر نکلے ہیں جو آپ کی امت کو آپ کی سنتوں پر عمل کرنے کے بجائے اپنے طریقے پر چلانا چاہتے ہیں۔ اور یہ چلانا بھی طاعت کے انداز میں ہوتا ہے تاکہ اسے عمل میں لانے والا یہ نہ سمجھے کہ میں کوئی معصیت اور گناہ کا کام کر رہا ہوں۔ یہ وہ خطرناک راہ ہے جہاں شیطان بڑی آسانی سے اپنا شکار کرتا ہے اور اسے آخرت کے سفر پر اس طرح روانہ کرتا ہے کہ اسے توبہ کی توفیق تک نہیں ملتی۔ عارفین امت فرماتے ہیں کہ اس قسم کے لوگوں کے سوئے خاتمہ کا سخت اندیشہ ہوتا ہے۔ (باقی)

از پروفیسر بدر الدین الحافظ جامعہ نگر نئی دلی

فاروق اعظم کی ذہانت اور سوجھ بوجھ

آپ کی ذہانت بے مثال تھی مگر بعض مستشرقین نے ان کی تعریف کرتے ہوئے محدود فکر والا لکھا ہے نیز یہ بھی کہ وہ ایک ہی قیاس اور محدود پیمانہ پر ہر مسئلہ کو سمجھتے تھے فاروق اعظم کے بارے میں اس طرح کا شک وشبہ بے معنی ہے وہ دنیا کو اچھی طرح سمجھتے تھے عوام پر نگاہ رکھتے تھے اور اصول وضوابط کی حدود میں نگرانی کرتے تھے پھر عملی قدم اٹھانے میں ان کے ہاں احتمالات 'شکوک وشبہات ضعف وفساد یا کسی قوت کے اندیشہ کو دخل نہیں تھا۔ آپکے مندرجہ ذیل کلمات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ شر سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے تھے (کیونکہ جب تک آدمی شر کو نہیں پہچانے گا خیر کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا اور جو شر کو نہیں جانتا ہوگا وہ خود اس میں مبتلا ہوگا اسی طرح فاروق اعظم اعذار اور مجبوریوں سے بھی پوری طرح باخبر تھے جس طرح وہ معاصی اور گناہوں سے واقفیت رکھتے تھے آپ نے فرمایا۔

احترسو ا من الناس بسوء الظن . لوگوں کے ساتھ بدگمانی کرنے سے بچو۔

اظهر و النا احسن اخلاقکم والله اعلم بالسرائر ہمارے سامنے اپنے حسن اخلاق کا مظاہرہ کرو پوشیدہ حالات سے تو اللہ تعالیٰ بخوبی واقف ہے "ان اقوال سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک شب زندہ دار محافظ 'عادل اور قاضی کے کیا خیالات تھے' یہاں ایک بات اور قابل غور ہے کہ فاروق اعظم اگر واقعی محدود فکر اور ایک زاویہ سے سوچنے والے ہوتے جیساکہ مستشرقین کا خیال ہے تو انھیں کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ حکومت کے اہم معاملات

میں کبار صحابہ کو بلا کر ان سے مشورہ کرتے بلکہ بعض وقت تو ایک معمولی آدمی سے بھی رائے لیتے تھے پھر کوئی فیصلہ فرماتے 'اگر انھیں اپنی محدود فکر سے فیصلہ کرنا ہوتا تو مشورہ کی ضرورت ہی کیا تھی بلکہ بسا اوقات آپ فرمایا کرتے۔ اخوف مااخاف علیکم اعجاب المرء برایہ زیادہ خوفناک چیز جس کا میں تم سے خوف رکھتا ہوں آدمی کا اپنی رائے سے خوش ہونا اور اس کو بہتر سمجھنا ہے۔ یہ بات وہ شخص کبھی نہیں کہہ سکتا جو اپنی رائے پر گھمنڈ کرتا ہے فاروق اعظم کے دور میں کبار صحابہ اور اہم لوگ موجود تھے جو گاہے گاہے ان کو اپنی رائے سے آگاہ بھی کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے حضرت عمرو بن العاص سے کہا کہ اگر تم کبھی حضرت عمرؓ کے بارے میں کوئی وہم رکھتے ہو تو اپنی بات ان کے سامنے پیش کردو خدا کی قسم میں نے کبھی بھی عمرؓ کو کسی سے تنہائی میں ملاقات کرتے ہوئے رحم و کرم سے برتاؤ کے علاوہ نہیں دیکھا۔ خدا کی قسم عمرؓ تو ایک عقلمند سمجھدار آدمی تھے جو نہ کسی کو دھوکہ دیتے نہ دھوکہ کھاتے اسی طرح آپ مکار نہیں تھے اور نہ کوئی مکار انھیں دھوکہ دے سکتا تھا۔ یہی ایک حد فاصل ہے قابل تعریف عقلمند اور قابل مذمت عقلمند میں یا اس شخص میں جو فاروق اعظمؓ جیسے صحیح فہم رکھتا ہو یا جس کی دانشمندی میں خباثت اور کینہ پروری کو دخل ہو اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض عقلمندیاں دوسروں کو بدگمان کرنے میں کمال رکھتی ہیں کیونکہ انھیں دوسروں سے شر و فتن سے بخوبی واقفیت ہوتی ہے اور یہی حقیقی فرق ہے شر اور خیر میں۔

باطنی فکر کو سمجھ لینے کا ملکہ

دل کا حال جان لینا اور معاملہ کی تہہ تک پہونچ جانا بھی آپ کی خاص صفت تھی اس سلسلہ میں ایک ہی حکایت کافی ہے ایک مرتبہ آپ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو عراق کی ولایت سے معزول کرنے اور حضرت جبیر بن مطعمؓ کو ان کی جگہ متعین کرنے کا فیصلہ کیا اور اس راز کو جبیر سے کہدیا کہ خاموشی سے تیاری کرو کسی سے ذکر نہ کرنا۔ حضرت مغیرہ نے اس کو محسوس کرلیا اور ایک ہم نشیں سے ذکر کیا کہ اپنی بیوی کے ذریعہ کسی طرح اسکی تحقیق کرائے کیونکہ یہ عورت اس کام میں مشہور تھی اسی لئے اسکو لقاطہ النساء کہتے تھے۔ وہ عورت حضرت جبیر بن مطعمؓ کے گھر گئی اور دیکھا کہ ان کی بیوی شوہر کے سفر کی کچھ تیاری میں مشغول ہیں۔ عورت نے پوچھا کہاں جارہے ہیں۔ بیوی نے کہا عمرہ کیلئے' عورت بولی نہیں تم سے

چھپایا ہے اور اگر ان کے دل میں تمہارے لئے ذرا بھی جگہ ہوتی تو تم سے راز نہ چھپاتے' اس پر بیوی کو غصہ آگیا' اتنے میں حضرت جبیر گھر آگئے بیوی کا موڈ خراب دیکھا تو اس کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے بتادیا اس پر حضرت جبیر نے صحیح بات بتادی' ادھر حضرت مغیرہ کو راز کی تصدیق ہو گئی تو وہ حضرت عمر کے پاس پہونچے اور کہنے لگے اللہ تعالیٰ امیر المومنین کی رائے کو بابرکت بنائے اور آپ نے تو جبیر کو عراق کا والی بنادیا ہے، لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی رائے سے واقفیت پر کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا اے مغیرہ گویا کہ میں تو تمہارے ساتھ ہی ہوں۔ تم نے ایسا کیا اور ایسا کیا، اشارہ اس بھید معلوم کرنے والی عورت کی طرف تھا، اور فاروق اعظم کی باتوں سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہوں' پھر فرمایا اور تجھے خدا کی قسم ہے کیا ایسا نہیں تھا۔ اس پر حضرت مغیرہ بولے خدا گواہ ہے بالکل ایسا ہی ہے، اس کے بعد حضرت عمر ممبر پر چڑھے اور پکار کر لوگوں سے کہا۔ **من یدلنی علی المغلط المزیل النسیج وحدہ**، "کون شخص مجھے بتائے گا ایسے آدمی کو جو معاملات کو خلط ملط کرنے والا اور افتراق پیدا کرنیوالا ہو اور کون ہے جو صفات محمودہ میں لاثانی ہو" حضرت مغیرہ فوراً کھڑے ہو کر بولے، ساری امت میں تمہارے علاوہ میں کسی کو نہیں جانتا۔ اس کے بعد فاروق اعظم نے ان کو برابر عراق کا والی بنائے رکھا یہاں تک کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس طرح حضرت عمرؓ اپنی عقل و دانش سے بات کی تہہ تک پہونچ جاتے تھے مگر اس میں کوئی مکر و فریب نہ ہوتا تھا جیسا کہ آپ نے حضرت عمرو بن العاص کے ساتھ ام کلثوم بنت علی کے معاملہ میں کیا۔ اس کے علاوہ غور کیجئے کہ فاروق اعظمؓ نے ایسے مختلف قبائل اور اقوام کے اوپر حکومت کی جن کو متحد کر کے ان سے کام لینا اور امن و امان سے رکھنا ہی مشکل تھا، ان عرب ایران پھر قبطی اور شامی قوموں کے درمیان سے آپ نے فوجی قائد نکالے، ان کی سرداری کیلئے موافق اور مخالف ذہنوں سے کام لیا۔ پھر انتہائی دانشمندی سے ان کی نگرانی کی یہ کسی محدود فکر رکھنے والے انسان کے بس کا کام ہو ہی نہیں سکتا، اس سلسلہ میں آپ کے فیصلوں سے ظاہر ہے کہ اس وقت کی دنیا پر ان کی کیسی نگاہ تھی، اور بات یہ ہے کہ فاروق اعظم کے حتمی فیصلوں سے بعض کج فہم یا خود محدود نظر رکھنے والوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی دائرہ میں سوچتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی عمیق نگاہی سے جب کسی نتیجہ تک پہونچ جاتے تو پھر اسکو نافذ کرنے میں لیت و لعل یا دنیاوی عوائق اور رکاوٹوں کو نگاہ میں نہ

لاتے تھے اسی سے لوگوں کو شبہ ہوتا تھا کہ وہ محدود فکر کے انسان تھے، اسی لئے حقیقی نگاہ سے دیکھیں تو محدود فکر مستشرقین کی ہے فاروق اعظمؓ کی نہیں۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ جو شخص مستقل مزاج ہوتا ہے اور اسکی عملی قوت میں استقامت ہوتی ہے وہ اپنے ارادہ کو نافذ کرنے میں ہچکچاتا نہیں ہے، نہ اس میں پھر کوئی رکاوٹ کارگر ہوتی ہے تو درحقیقت فاروق اعظمؓ کے عمل اور ارادہ میں استحکام اور استقامت تھی جسکو بعض لوگوں نے محدود فکر خیال کیا۔ پھر یہاں استقامت کی بھی دو صورتیں ہیں ایک قادرانہ استقامت دوسری عاجزانہ استقامت۔ یعنی ایک شخص کسی مجبوری اور عجز کی وجہ سے ایک حالت پر قائم رہتا ہے، دوسرا خود اپنے ارادہ اور قدرت رکھنے کے ساتھ ایک کیفیت کو پسند کرتا ہے اور استقامت اختیار کرتا ہے۔ فاروق اعظمؓ ایک قادر اور صاحب استقامت انسان تھے اسی لئے سوچ سمجھ کر جو ارادہ کر لیتے اس پر عمل در آمد کرتے۔

علماء قدیم سے موازنہ

یہاں اگر ہم اس طرح سے سوچنے لگیں کہ فاروق اعظمؓ نے قدیم فلاسفہ اور اساطین منطق وریاضی کی تقلید کیوں نہیں کی تو واقعہ یہ ہے کہ دنیا نے ہمارے سامنے ایسا عمرؓ پیش نہیں کیا جسے ہم افلاطون ثانی یا اقلیدس کا نمونہ کہہ سکیں بلکہ دنیا نے تمام انسانوں کے لئے ایسی شخصیت کو پیش کیا جو ایک عہد جدید کا مؤسس اور تاریخ کا رخ موڑ دینے والا تھا لہٰذا اس طرح اگر ہماری عقل کام کرے تو درست اور صحیح سمت میں سوچنے والی عقل ہوگی، یہ ایسی سوچ اور فکر ہوگی جس کے لئے اسکی تخلیق ہوئی وجود ہوا اور ہمیں وہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے جو فاروق اعظمؓ نے اپنے مصاحبین اور ہمعصروں کے درمیان رہتے ہوئے پسند فرمایا۔

آپ کے عدل میں رعایت نہ تھی

فاروق اعظمؓ بڑے سے بڑے افسر اور عہدہ دار کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کرتے جو ایک عام آدمی کے ساتھ کرتے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمرو بن العاصؓ والی مصر کے صاحبزادہ کے ساتھ ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جس میں ایک دوڑ کے مقابلہ کے دوران ان کا بیٹا اور عام مصری سبقت لے جانے میں ٹکرا گئے، جھگڑا ہو گیا اور صاحب زادہ نے غصہ میں مصری کو

یہ کہتے ہوئے مارا، انا ابن الاکرمین ،میں بڑے لوگوں کا بیٹا ہوں۔ مصری نے یہ مقدمہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں پیش کر دیا اور فاروق اعظمؓ نے فوراً والی مصر اور ان کے صاحب زادہ کو طلب کر لیا۔ اور عام لوگوں کے سامنے مصری کو حکم دیا کہ اپنے مدعا علیہ کو یہ کہتے ہوئے مارے کہ میں ابن الاکرمین کو ضرب لگا رہا ہوں۔ اس کے بعد حکم دیا کہ بیٹے کے بعد والی مصر یعنی باپ کو بھی مارے کیونکہ باپ کی طاقت کے زیر سایہ بیٹے کو یہ جرأت ہوئی ہے۔ اس کے بعد حضرت عمرو بن العاص کو مخاطب کر کے کہا **بم تعبد تم الناس وقدولد تھم امھاتھم احرار** اُتم کس بنا پر لوگوں کو غلام بناتے ہو حالانکہ ان کی ماؤں نے انھیں آزاد پیدا کیا ہے، اس طرح حضرت عمرؓ سے کوئی بھی شکایت کرنے والا مایوس نہیں ہوا بلکہ ان سے خاطر خواہ جواب پایا۔

اسی طرح حضرت خالد ابن ولیدؓ کا واقعہ مشہور ہے جن کو ولایت سے صرف اس لئے معزول کیا گیا کہ انھوں نے بیت المال کے پیسہ سے فاروق اعظمؓ کی نظر میں بے جا خرچ کیا تھا اور ان کے ساتھ عام سپاہی کا سا برتاؤ کیا گیا۔ اسی طرح جبلہ بن ایہم کا واقعہ ہوا جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ نصرانی سے مسلمان ہوا تھا اور حج کے دوران جب ایک اعرابی کا پیر اس کے کپڑوں پر پڑ گیا تو اس نے اعرابی کو سب کے سامنے تھپڑ مارا۔ اس کا مقدمہ فاروق اعظم کے پاس پہونچا تو آپ نے فیصلہ دیا کہ اعرابی بھی اس امیر کو اسی حالت میں تھپڑ مارے کیونکہ اسلام میں ایک دیہاتی اور امیر برابر ہیں۔ ان واقعات سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فاروق اعظمؓ نے عدل و انصاف میں کسی سیاسی مصلحت یا رورعایت کا خیال نہیں رکھا یہاں ایک والی اور امیر کے خلاف نہایت سخت قدم اٹھایا گیا تھا مگر مساوات اور عدل و انصاف کی روشنی میں غور کیجئے تو اگر ایسا نہ کیا جاتا تو برابری اور انصاف کا خون ہوتا، عوام میں اس کا اچھا اثر نہ پڑتا اس لئے انھوں نے اپنی طبعی مضبوطی اور ایمانی قوت کے بل بوتے پر یہ اقدام کیا مگر یہاں اگر مستشرقین کے قول یا الزام کی گہرائی میں جائیں تو وہ اصل میں فاروق اعظمؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کے مابین کشیدہ تعلقات ثابت کر کے اسے اور ہوا دینا چاہتے ہیں تاکہ اسلامی حکومت کی باہمی کشمکش کھل کر سامنے آئے اور مکروہ تصویر کشی ہو لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ حضرت عمرو بن العاص اور ان کے ہمنوا فاروق اعظمؓ کے مقام و مرتبہ کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اور حضرت عمرؓ بھی اسی طرح کے خدشات سے بخوبی واقف تھے بالفرض اگر حضرت عمرؓ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو حضرت عمرو بن العاص کا جوابی حملہ بڑے فتنہ کا سبب بن

سکتا تھا مگر فاروق اعظمؓ کی شخصی وجاہت، ایمانی قوت، دانشمندی دور رسی اور نتائج سے واقفیت ان کے جملہ اعمال کے لئے کافی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت خالد بن ولیدؓ کو معزول کرنے کی ضرورت پیش آئی تو حضرت عمرؓ نے ذرا پس و پیش نہ کی باوجودیکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت خالدؓ نے بھی اپنی معزولی پر قدرے کبیدگی کا اظہار کیا مگر جب لوگوں نے کہا کہ آپ کے اظہار خیال سے فتنہ کا اندیشہ ہے تو اس پر حضرت خالدؓ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ کے ہوتے ہوئے اس کا امکان نہیں ہے۔ عام طور پر سیاست کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ صوبوں کے امراء کو بہرحال خوش رکھا جائے۔ تاکہ وہ خلیفہ وقت کی اتباع کرتے رہیں اور نظام حکومت چلتا رہے مگر فاروق اعظمؓ کے منصفانہ واقعات میں صرف اسلام اور عدل کی برتری نظر آتی ہے سیاسی یا ذاتی مصلحت کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر فاروق اعظمؓ کے عدل و انصاف اور قوت ایمانی کے واقعات کی روشنی میں آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی غور کیا جائے تو معلوم ہوتا کہ وہ عام سیاستدانوں اور حکمرانوں کی دنیاوی روش سے کہیں زیادہ کامیاب و کامران حکمراں تھے۔ اگرچہ انھوں نے آج کے سیاست دانوں کی دانشمندی کی روش اختیار نہیں کی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان دراصل ایمانی قوت سے بلند تر ہے اور یہیں سے فاروق اعظمؓ کو دنیاوی حکمرانوں اور دانشمندوں کے مقابلے میں بلند و بالاتر دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ دوسرے سیاستداں حالات کے مطابق خود سرنگوں ہو جاتے تھے اور فاروق اعظمؓ حالات کارخ اپنی طرف موڑ لیتے تھے اور اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ افکار و اقوال تو نفس انسانی کے تابع ہوتے ہیں اور جب نفس انسانی قواعد و ضوابط کے تابع ہوتا ہے تو اس کا اثر اعمال پر پڑتا ہے اور اگر اس میں وہ صلاحیت نہیں ہے تو پھر نہ اس میں قوت عمل پیدا ہوتی ہے نہ اخلاقی کیفیت اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کی مثال بالکل سفینہ جیسی ہے جو نہر کی سطح پر گھومتی پھرتی ہے اسمیں مسافر بھی ہوتے ہیں اور بادبان بھی، اس کے لئے کچھ ملاح بھی ہوتے ہیں اور ان سب کے اوپر ایک کپتان اور نگراں ہوتا ہے جس کے اشاروں اور ارادوں کی وہ تابع ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اخلاق و عادات کی مثال بس یہ سمجھئے کہ ایک اچھلتی کودتی لہریں لیتی نہر چل رہی ہے جو اپنے مقررہ وقت اور قاعدہ کے مطابق جاری رہتی ہے اور چاروں طرف کی کھیتیاں سیراب کرتی ہے لیکن اس کا بے جا بہاؤ اور تیز رفتاری کو روکنے والے کنارے، پل اور پشتے وغیرہ بھی ہوتے ہیں جو اسے ایک حد کے اندر محدود رکھتے ہیں مگر جب وہ بے ضابطہ اور بے قاعدہ ہو کر

حدود سے باہر نکل جاتی ہے تو پھر آس پاس کی زمینوں اور آبادی کو نقصان کے سوا کچھ نہیں دیتی۔ بس یہیں سے قواعد و ضوابط کی حد بندی کے فوائد واضح ہو جاتے ہیں اور اسی سے قوی اور مضبوط ایمان کی جلوہ نمائی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم یہاں یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ حضرت عمرؓ کے اندر طبعی طور پر تیزی اور شدت تھی جو بسا اوقات ان پر تھوڑی دیر کیلئے حاوی ہو جاتی اور حقیقت آشکارا ہوتے ہی یہ کیفیت زائل ہو جاتی جیسا کہ حضور ﷺ کی وفات کے وقت ہوا اور آپ انتہائی غضب ناک ہو کر فرمانے لگے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کا ذکر کرنے والے کی گردن اڑادوں گا۔ اس کی بعد صدیق اکبرؓ کے آتے ہی ان کی مختصر تقریر نے ان کا غصہ ٹھنڈا کر دیا بلکہ زمین پر گر پڑے اور توبہ کی، پھر سب ہی لوگوں نے محسوس کیا کہ گویا یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہے یہاں یہ حیرت انگیز تغیر قابل غور ہے کہ میدان کارزار میں کبھی نہ جھکنے والا انسان کس طرح آن کی آن میں حق کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے، بس یہی وہ نفس اور ایمان کی دو قوتیں ہیں جن پر ایمان غالب آجاتا ہے۔ لیکن یہ شدت طبع اور تیزی کوئی اول اور آخر نہیں بلکہ ایسے بہت واقعات پیش آئے جن کا نتیجہ ایک ہی صورت میں نمودار ہوا۔

ایک مرتبہ حضرت بلالؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے خادم نے کہا ابھی سو رہے ہیں حضرت بلالؓ نے خادم سے پوچھا تم نے عمر کو کیسا پایا، خادم نے کہا جب وہ غصہ میں ہوتے ہیں تو معاملہ بڑا مشکل ہوتا ہے مگر جب میں قریب ہوتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ انھیں غصہ آرہا ہے تو فوراً قرآن کریم پڑھنے لگتا ہوں بس غصہ کافور ہو جاتا ہے اور یہی دراصل وہ ایمانی قوت ہے جس کے سامنے نفسانی خواہشات کے ضابطے رکھے رہجاتے ہیں۔ یہاں ایک بات اور قابل غور ہے جسے بھولنا نہ چاہئے کہ نفس بھی دو ہوتے ہیں ایک وہ نفس جو نہایت نرم مزاج والی زندگی کو کھینچتا اور قابو میں رکھتا ہے، دوسرا وہ نفس جو مضبوط اور طاقتور زندگی کو قابو میں رکھتا ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

فاروق اعظمؓ اور جمالیات

مندرجہ بالا تمام کیفیات کے باوجود فاروق اعظمؓ زندگی کے جمالیاتی گوشوں سے اعراض کرنیوالے بھی نہیں تھے وہ ہر کیفیت سے آنکھیں دوچار کرتے مگر اس قوت اور مضبوطی کے ساتھ کہ ان کی آزمائشوں میں مبتلا نہ ہو جائیں گے بلکہ اپنی پوزیشن حاوی رکھیں

گے۔ پھر آپ کے لئے اگر کچھ اعراض ضروری بھی تھا تو صرف اس لئے کہ وہ فرحت وسرور کے طبعی دلدادہ بھی نہ تھے، اور اصل میں جب ہم انسانی قوت ارادی کی بات کریں تو ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ انسان مختلف اور متضاد قوتوں سے مرکب ہوتا ہے اسمیں روح، خلق، ذوق، عقل اور جسم سب ہی شامل ہیں اور جسم پر ہر ایک کی قوت کو دخل ہے اور یہ آپس میں مرکب ہوتی ہیں، اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ ایک شخص میں ایک قوت دوسری پر بھاری ہو مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ کمزور یا ضعیف ہے بلکہ ایک طاقت ابھر جاتی ہے اور دوسری اپنی صلاحیت کے باوجود ابھر نہیں پاتی۔ بس یہی حال فاروق اعظمؓ کا تھا کہ بعض قوتوں میں بھاری نظر آتے تھے، اور یہی آپ کی صفات کا حال ہے جنھیں ہم عدل رحمت، غیرت، عقلمندی اور ایمان کا نام دے سکتے ہیں اس طرح پر کہ ان میں کسی کو ترجیح دینا بھی مشکل ہے۔ بالکل اسکی مثال ایسی ہی سمجھئے کہ ایک مرکب دوا مختلف اجزاء سے تیار ہوتی ہے مگر اسکی کیفیت یہ ہے کہ اگر ایک جزا سمیں کمزور ہوتا ہے تو دوسرا اسکی کمی پوری کر دیتا ہے اور استفادہ برابر رہتا ہے۔

یہاں ایک بات اور قابل غور ہے کہ کبھی ہم یہ تمام صفات لوگوں میں نہایت مرتب اور منظم شکل میں دیکھیں گے مگر اسمیں حیرت کی بات یہ نظر آئے گی کہ یہ سب یکجا ایک نفس اور جان میں کیسے عمل پیرا رہتی ہیں اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل حقائق کا سمجھنا ضروری ہے۔ مثلاً عدل بغیر رحم و کرم کی صفت کے جاری نہیں ہو سکتا رحم احسان اور بھلائی سے جڑا ہوا ہے، پھر عدل اور رحم و کرم جوش اور ہمت کے بغیر ممکن نہیں اسی میں غیرت روحی کی بھی ضرورت ہوگی تاکہ آدمی کے ظلم کی مکروہ تصویر اس کی سامنے رکھ سکے۔ اچھا پھر عدل، رحم اور غیرت بغیر عقل اور ہوشیاری کے ممکن نہیں ہیں کیونکہ جب تک ہوشیاری اور عقل نہ ہوگی ہر معاملہ کو اس کے صحیح مقام پر نہیں رکھا جا سکتا، انسان یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ عدل کا مستحق کون ہے کون نہیں ہے، اس کے علاوہ عدل، غیرت، رحمت، عقلمندی سب کچھ ہو اور ایمان نہ ہو تو ان کی نگہبانی ممکن نہیں ہے کیونکہ ایمان ہی تمام نگہبانوں کا نگہبان ہے اور عدل کا صحیح معنی میں طالب ہے، اور یہ تمام صفات صرف ایک ہی غرض اور مقصد کے لئے ہیں یعنی حق کی نصرت اور باطل کی مخالفت۔ اس تفصیل کی روشنی میں اب یہ کہنا مشکل نہیں ہے کہ ان تمام صفات کے مرکب اور مجموعہ کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن ہی نہیں ورنہ عدل کی حقیقت کا وجود میں آنا ہی مشکل ہوگا۔ اور اب یہ کہنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ عدل میں کبھی

نقص ممکن ہی نہیں ہے،

اسی طرح رحمت میں بھی کوئی خامی نہیں ہے سوائے اس رحم و کرم کے جو ہواء وہوس کے تابع ہو کر ظلم وجور کا سبب ہو جائے، یہی حال غیرت کا ہے اسمیں بھی کوئی نقص نہیں ہوتا ہے سوائے اس غیرت کے جو قساوت اور ظلم میں ملوث ہو، اسی طرح تمام صفات نقائص سے خالی ہو سکتی ہیں بشرطیکہ ان کے ساتھ دانشمندی اور ایمان کی قوت موجود ہو کیونکہ یہی صفات آدمی کو تاریکی سے نور کی طرف لاتی ہیں اور ہر حال میں اسکی نگرانی کرتی ہیں۔ پھر بظاہر دیکھا جائے تو یہ جملہ صفات علحدہ ہوتے ہوئے بھی ساتھ ہیں اور جو لوگ فاروق اعظمؓ کو ایک سادہ معمولی اور سطحی نظر سے دیکھتے ہیں وہ ان کی شخصیت کو سمجھنے میں فحش غلطی کرتے ہیں۔ فاروق اعظمؓ تو حقیقت میں ان تمام صفات کا مرکب تھے جس پر توحید اور یقین کی مہر لگی ہوئی تھی اس وضاحت کے بعد بھی اگر کوئی شخص آپ کو شک شبہہ کی نظر سے دیکھتا ہے تو یہ اسکی نگاہ کی کمزوری ہے۔

اس کے علاوہ اگر فاروق اعظمؓ کو موجودہ دور کے فلسفوں تھیوریوں اور نظریات پر پرکھ کر دیکھنے کی کوشش کی جائے تو یقیناً ناکامی ہوگی کیونکہ ان کی شخصیت دنیاوی نظریات سے ماوراء تھی۔ ان کی شخصیت میں کبھی عدل اور رحم متناقض دکھائی نہیں دے گا، ان میں غیرت بھی اور قوت بھی ہوشیاری بھی اور مصلحت پسندی بھی سب اپنے اپنے مقام پر بھرپور زندگی کے ساتھ عمل پیرا ہیں اور دین وایمان کے ساتھ عوام کو نفع پہونچاتی رہیں اسی لئے ان کے رحم وکرم کو ضعف پر محمول نہیں کیا جا سکتا نہ قوت کو جبر و ظلم پر۔

یہی تمام خوبیاں تھیں کہ ان کی وفات پر عاتکہ بنت زید نے کہا تھا۔

رؤف علی الادنیٰ غلیظ علی العدیٰ اخی ثقة فی النائبات منیب

وہ کمزوروں پر مہربان، دشمنوں پر سخت ہے میرا بھائی قابل اعتماد شخص ہے اور مصائب میں خدا کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔

☆ ☆ ☆

دوسری قسط

امام اہل سنت

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ

(ڈاکٹر) عبدالحی فاروقی صدر شعبہ اسلامیات جامعہ ہمدرد نئی د

لکھنؤ میں شیعہ سنی اختلافات کا آغاز

۱۹۰۴ء تک لکھنؤ کے حالات پُرامن رہے تھے، عوام اہل سنت اپنی کم علمی اور کم ما
کی وجہ سے سابق حکمراں طبقہ کی مذہبی تقریبات میں رونق اور چہل پہل کا ذریعہ بنے ہو
تھے اور حد یہ تھی کہ تعزیہ سازی کی صنعت کا اسی (۸۰) فیصد کام سنیوں ہی کے یہاں ہوتا
لہٰذا اس بے حسی اور بے عملی کے ماحول میں سنیوں کی طرف سے کسی قسم کے ٹکراؤ ا
مخالفت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر بدقسمتی سے ۱۹۰۵ء میں ایک شیعہ واعظ مولو
مقبول احمد (۱) دہلی سے لکھنؤ آنے لگے اور انھوں نے یہاں کی شیعی مجالس میں برملا سنیوں
مسلمہ معتقدات پر حملے کرنا شروع کردیئے اور اپنے مخصوص تبرائی اشارات و تمسخرانہ ا
سے سنیوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہونچانے لگے۔ ان کے اس اندازِ تقریر سے لکھنؤ
شیعی عوام اور امراء و نوابین کا طبقہ بہت خوش ہوتا تھا اور بے چارے سنی دل گرفتہ اور ما
ہوکر ان مجالس سے اٹھ آتے تھے۔ جب مولوی مقبول احمد کی حوصلہ افزائی بہت ہونے ا

(۱) مولوی مقبول احمد بن غضنفر علی ۱۸۷۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش سنی گھرانے میں
تھی مگر سات سال کی عمر میں والد کے انتقال ہو جانے سے بعض شیعہ معلمین کے زیر تربیت آنے سے مذہب شیعہ
کرلیا تھا۔ بارہویں جماعت تک انگریزی کی تعلیم حاصل کی پھر شیعی معلمین سے شیعیت کی تعلیم حاصل کی۔ موص
شہرت اپنے زمانہ میں ایک مقرر کی حیثیت سے تھی، تقریر میں مناظرانہ رنگ اختیار کیا کرتے تھے اور زیادہ تر اختلافی
پر بولتے تھے۔ ایک واعظ کی حیثیت سے لکھنؤ، فیض آباد اور جون پور وغیرہ میں بہت بلائے جاتے تھے جہاں اکثر
سنت کو مناظرہ کا چیلنج دیا کرتے تھے۔ بعض اختلافی مسائل پر آپ نے کچھ رسائل بھی لکھے تھے مگر شہرت اردو ترجمہ
مجید کی زیادہ ہوئی جو شیعی عقائد کے مطابق تھا۔ آپ طبیب بھی تھے دہلی میں آپ کا مطب اور دواخانہ بھی تھا۔ ا
دہلی میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

وہ علماء اہل سنت کو مناظرہ کا چیلنج بھی دینے لگے اور تعلی وخود ستائی میں یہ دعویٰ بھی کرنے لگے کہ میرے مقابلہ میں کوئی سنی عالم آنے کی ہمت نہیں کر سکتا، اس طرح شیعہ سنی تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونے لگی۔ مولوی مقبول احمد نے ایسی ہی مناظرانہ تقریریں لکھنؤ کے علاوہ فیض آباد اور جون پور وغیرہ میں بھی کیں اور وہاں بھی اضطراب و بے چینی پیدا ہوئی یہاں تک کہ فیض آباد کی عدالت میں تو ان کو نقض امن کے جرم میں سزا بھی دی گئی۔(۱) لکھنؤ کی صورت حال سب سے زیادہ خراب تھی، مقبول احمد کی دیکھا دیکھی یہاں کے مقامی علماء شیعہ بھی اپنی مجالس میں اسی قسم کا لب ولہجہ استعمال کرنے لگے جس کی وجہ سے دونوں فرقوں میں مزید بے اعتمادی اور نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگے جس کی وجہ سے دونوں فرقوں کے درمیان کئی بار تصادم بھی ہوئے اور کافی جانی و مالی نقصانات ہوئے۔ لکھنؤ میں علماء اہل سنت کے سربراہ حضرت مولانا سید عین القضاۃ صاحبؒ (م ۱۹۲۵ء) اس صورت حال کا بغور جائزہ لے رہے تھے اور حسب موقع وضرورت مسلمانوں کی ہر ممکن امداد ورہنمائی بھی کررہے تھے۔ ابھی تک یہ اختلافات شیعوں اور تعزیہ دار سنیوں کے درمیان ہی خیال کئے جارہے تھے اسی لئے اہل سنت کے علماء وخواص نے ان کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیا مگر جب بات آگے بڑھ گئی اور براہِ راست مذہب اہل سنت پر مجالس میں حملے کئے جانے لگے اور مولوی مقبول احمد ببانگ دہل مناظرے کا چیلنج دینے لگے تو مولانا سید عین القضاۃؒ نے فیصلہ کیا کہ اب مزید خاموشی مناسب نہیں ہے اور مناظرہ کا چیلنج قبول کرلینا چاہیے۔ اس زمانے میں مولانا لکھنویؒ دہلی میں مقیم تھے اور اتفاقاً کسی ضرورت سے اس موقع پر لکھنؤ آئے ہوئے تھے چنانچہ استاذ محترم نے آپ کو بلا کر لکھنؤ کے سارے حالات آپ کے سامنے رکھے اور فرمائش کی کہ آپ مستقل طور پر لکھنؤ آجائیں اور یہاں کے مسائل میں میرا ہاتھ بٹائیں، استاذ مکرم کی اس فرمائش کو آپ ٹال نہیں سکے اور لکھنؤ آگئے، اتفاق سے کچھ ہی دنوں کے بعد مولوی مقبول احمد پھر لکھنؤ پہونچے اور حسب عادت مجلسوں میں مناظرہ کا چیلنج دینے لگے تو مولانا لکھنویؒ نے ان کے پاس کہلوادیا کہ میں مناظرہ کے لئے تیار ہوں، جب اور جہاں آپ کہیں میں وہیں حاضر ہو جاؤں، اس جواب سے دہلوی صاحب گھبرا گئے، ان کو مناظرہ کرنا تو منظور تھا نہیں صرف اپنے فرقہ کو خوش کرنا اور سنیوں کو ذلیل کرنا مطلوب تھا اس لئے انھوں

---

(۱) النجم لکھنؤ، ۱۳ر مضان ۱۳۴۲ھ

نے ٹالنے کیلئے یہ کہلوادیا کہ اس وقت تو مجھے فرصت نہیں ہے آئندہ کسی سفر میں اسکا موقع نکالا جائے گا اور یہ کہہ کر وہ لکھنؤ سے روانہ ہو گئے لہذا اس وقت مناظرہ کی نوبت نہیں آسکی۔

مولانا مرحوم کے مستقل طور پر لکھنؤ آجانے کے بعد حضرت مولانا سید عین القضاۃ صاحبؒ نے ان کو اپنے قائم کردہ مدرسہ عالیہ فرقانیہ کی بھی بعض اہم ذمہ داریاں سپرد فرمادیں اور ایک معقول مشاہرہ مقرر فرمادیا چنانچہ آپ ہی نے اس مدرسہ میں سب سے پہلے درجہ بندی فرمائی، فارسی کے نئے درجات کھلوائے اور عربی تعلیم کا بھی بندوبست کیا، حفظ و ناظرہ اور تجوید کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی جو آگے چل کر اس مدرسہ کا امتیازی وصف ثابت ہوا۔ ان انتظامی اصلاحات کے ساتھ آپ نے بعض تدریسی ذمہ داریاں بھی اپنے ذمہ رکھیں۔

حصۂ دوم

تحریکِ مدحِ صحابہ و تبرا

ان محدود صفحات میں تحریکِ مدحِ صحابہ کی کوئی تفصیلات تو پیش نہیں کی جاسکتی ہیں، اسکے لئے تو علیحدہ سے مستقل ایک کتاب مرتب کرکے پیش کی جارہی ہے اس لئے اس وقت صرف ایک سرسری جائزہ پیش کیا جارہا ہے تاکہ واقعات کا تسلسل برقرار رہے۔ اس تحریک کی ابتداء ۱۹۰۵ء سے ہوتی ہے اور اسی وقت سے مولانا لکھنویؒ کی قیادت میں آپ کے رفقاء نے اس جد و جہد میں حصہ لینا شروع کیا۔ لکھنؤ کے ان دونوں فرقوں میں باہمی کشمکش بدستور جاری تھی جسکی وجہ سے آئے دن فسادات ہوتے رہتے تھے۔ دستور یہ تھا کہ شیعہ اپنے تعزیوں کے جلوس میں مرثیوں اور نوحوں کے ساتھ ساتھ صحابہ کرامؓ کی شان میں بے ادبی کے کلمات (تبرا) بھی استعمال کرتے تھے جس سے اہلِ سنت کی دل آزاری ہوتی تھی۔ اہل سنت اپنی محافل میں صحابہ کرام کی شان میں عموماً اور خلفاء راشدینؓ کی مدح و ستائش میں خصوصاً منظوم خراجِ عقیدت پیش کرتے تھے، آگے چل کر انہی مدحیہ اشعار کو 'مدحِ صحابہ' کہا جانے لگا۔ بعد میں ہر وہ محفل جس میں نظماً یا نثراً صحابہ کرام کا ذکر کیا جاتا مدحِ صحابہ کی محفل کہی جانے لگی۔

۱۹۰۷ء سے سرکاری سطح پر مخالفین اس بات کی کوشش کرتے چلے آرہے تھے کہ اہل سنت اپنے جلسے اور جلوس میں ذکر صحابہ کرامؓ میں یہ نظمیں نہ پڑھ سکیں اور ان پر قانونی طور پہ بندش عائد کردی جائے لہٰذا اس سلسلہ میں انہوں نے بھاگ دوڑ کرکے حکومت سے ایک تحقیقاتی کمیشن کی تشکیل کرالی۔ یہ کمیشن مسٹر ٹی، سی پگٹ (T. C Piggatt) کی سربراہی میں قائم کیا گیا تھا اس لئے اس کو (Piggatt Commission) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس کمیشن میں دو عیسائی، دو ہندو، دو شیعہ اور دو سنی عمائدین نامزد کئے گئے تھے۔(۱) کمیشن کے مقرر ہوجانے کے بعد شیعہ سنی اختلافات کا مسئلہ اب ایک انتظامی مسئلہ بن گیا تھا جسکی وجہ سے اب یہ سرکاری سطح پر بھی مرکز توجہ بن گیا۔ فی الوقت کمیشن کو مندرجہ ذیل امور کی تحقیقات کے لئے مامور کیا گیا۔

۱۔ سالہائے گذشتہ میں شیعہ وسنی فرقوں کو کن کن امور کی انجام دہی کی اجازت دی جاتی تھی۔

۲۔ ہر دو فرقوں کے طرزِ عمل میں اب کس قسم کی تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔

۳۔ کیا کوئی تبدیلی ایسی آئی ہے جس سے دوسرے فرقہ کی دل آزاری ہوتی ہے۔

۴۔ ایسی تجاویز کی سفارش جو آئندہ حالات میں سدھار کے لئے ضروری ہوں۔

کمیشن کی کارروائی شروع ہوئی۔ سنی ممبران میں مولانا عبدالمجید فرنگی محلیؒ (م ۱۹۲۲ء) اور منشی احتشام علیؒ کاکوروی (م ۱۹۴۳ء) اپنے بعض اعذار کو ظاہر کرکے کمیشن سے لاتعلق ہوگئے، اس کے بعد چودھری نبی اللہ بیرسٹر (م ۱۹۲۵ء) کا نام تجویز ہوا مگر وہ بھی ایک پیشی کے علاوہ دوبارہ نہیں آئے۔ اب لے دے کے ایک ہی نام سامنے آیا جو سنیوں کی نمائندگی کمیشن میں کرسکے اور وہ نام تھا حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ کا جنھیں اب کمیشن میں سنی ممبر نامزد کیا گیا تھا۔

مدحِ صحابہ پر پابندی اور سول نافرمانی کا پہلا آغاز

مولانا مرحوم نے کمیشن کی ہر میٹنگ میں شرکت کی اور مسئلہ مدحِ صحابہ کی اہمیت اور ضرورت پر مدلل تقریریں کیں لیکن چونکہ یہ کمیشن شیعوں کی کوششوں سے قائم ہوا تھا اور عیسائی و ہندو ممبران کا جھکاؤ بھی انہیں کی طرف تھا اس لئے اس نے سال کے تین دنوں میں

(۱) النجم لکھنؤ، ۱۲ر مضان ۱۳۲۶ھ

ذکر صحابہ کرنے اور مدح صحابہ پڑھنے پر جبراً پابندی لگادینے کی سفارش کی۔ یہ ممنوعہ تین دن دسویں محرم (عشرہ) بیس صفر (چہلم) اور اکیس رمضان (یوم شہادت حضرت علیؓ) پر مشتمل تھے۔(۱) یہ فیصلہ ۱۹۰۹ء میں ہوا۔ اس فیصلہ سے سنیوں میں اضطراب پیدا ہونا یقینی تھا چنانچہ انہوں نے عیش باغ لکھنؤ کی عیدگاہ میں ایک زبردست احتجاجی جلسہ کیا اور پھر ۱۹۰۹ء کے چہلم سے ان تین ایام میں مدح صحابہ کی پابندی پر احتجاجاً گرفتاریاں دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس احتجاج کی حمایت میں ہندوستان کے ہر صوبہ اور ہر بڑے شہر سے مسلمانوں کے جتھے لکھنؤ آتے اور یہاں مدح صحابہ پڑھ کر گرفتاریاں پیش کرتے تھے اس طرح اب یہ مسئلہ ایک مقامی مسئلہ نہ رہ کر ایک کل ہند مسئلہ بن گیا تھا اور ہر طرف سے حکومت یوپی کے اس غیر دانشمندانہ فیصلہ پر اظہار ناراضگی کیا جانے لگا۔(۲)

علماء کانفرنس

مدح صحابہ پر بندش کا یہ سلسلہ ۱۹۳۶ء تک بدستور باقی رہا اور اہل سنت کا احتجاج، سول نافرمانی اور گرفتاریاں بھی وقتاً فوقتاً جاری رہیں بالآخر ۷ ستمبر ۱۹۳۶ء کو مولانا لکھنوی نے لکھنؤ میں آل انڈیا علماء کانفرنس بلائی جس میں مسئلہ مدح صحابہ کی شرعی حیثیت اور آئندہ کے لئے لائحہ عمل متعین کرنے پر غور کیا گیا۔ کانفرنس نے اپنے آخری اجلاس عام میں اپنے متفقہ فیصلہ کا اعلان کیا کہ موجودہ حالات میں مدح صحابہ ایک ضروری امر ہے۔ اس پر حکومت کی طرف سے کسی ایک فریق کی خوشنودی کے لئے پابندی لگانا مداخلت فی الدین ہے۔ علماء کانفرنس میں شرکت کرنے والے علماء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، سحبان الہند مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ علماء ہند، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید علی حسن مختار جونپوری، مولانا ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر لکھنؤ، مولوی محی الدین قائد ایڈیٹر الجمعیۃ دہلی، ابوالمحاسن مولانا محمد سجادؒ نائب امیر شریعت بہار، مولانا مصطفیٰ حسن علوی استاذ لکھنؤ یونیورسٹی، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مولوی امام الدین پشاوری، مولانا قطب الدین عبدالوالی فرنگی محلی، مولانا محمد شفیع فرنگی محلی،

(۱) ... لکھنؤ ... ۱۳۲ ... جنرل ایڈمنسٹریشن نمبر ۳-۵۶۱ / ۱۴ مجریہ ۱۹۰۹ء

(۲) ... ۱۹۳۶ء

مولانا صبغت اللہ شہید انصاری فرنگی محلیؒ، مولانا محمد عتیق فرنگی محلیؒ، مولانا محمد ناصر فرنگی محلیؒ، مولانا عبدالسلام صاحب فاروقیؒ، مولانا عبدالرحیم صاحب فاروقیؒ، مولانا عبدالمومن صاحب فاروقیؒ، چودھری نعیم اللہ بیرسٹرؒ لکھنؤ، خان بہادر سید احمد حسین رضویؒ لکھنؤ، چودھری خلیق الزماںؒ لکھنؤ، مولوی محمد احمد کاظمیؒ، مولوی محمد نسیم بیرسٹر لکھنؤ، جناب امین سلونویؒ لکھنؤ، علامہ انور صابریؒ دیوبند، حکیم خواجہ کمال الدینؒ لکھنؤ، حکیم عبدالمعیدؒ لکھنؤ اور حکیم عبدالحسیب لکھنؤ جیسے حضرات قابل ذکر ہیں۔ کچھ ایسے حضرات بھی تھے جو خود تو کانفرنس میں شریک نہیں ہوسکے مگر انھوں نے اپنی آراء اور حمایت تحریری شکل میں کانفرنس کے ذمہ داروں کو بھیج دی تھیں جن میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ دیوبند اور علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ دیوبند خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس کانفرنس سے کم از کم دو فائدے ضرور حاصل ہوئے ایک تو یہ کہ مدح صحابہ کی شرعی و دینی حیثیت واضح ہوگئی اور علماء نے یہ فیصلہ کردیا کہ مدح صحابہ عام حالات میں تو ایک امر مستحب ہے مگر جب اس پر پابندی لگائی جائے اور لوگوں کو اس سے روکا جائے تو اس صورت میں یہ مستحب امر واجب ہو جائے گا۔ دوسرا مفید نتیجہ اس سے یہ نکلا کہ پورے ملک کے علماء اہل سنت کی نظر میں اس مسئلہ کی وضاحت ہوگئی اور سب ہی نے حکومت کی اس یکطرفہ کارروائی پر اظہار ناراضگی کیا اور یہ متفقہ فیصلہ کیا گیا کہ مدحِ صحابہ پر اس سہ روز بندش کے خلاف جدوجہد جاری رکھی جائے۔(۱)

(۱) النجم لکھنؤ، ۱۳؍ نومبر ۱۹۳۶ء

الامام نصرابنِ علی الشیرازی الفارسی

(م ۵۶۵ھ کے بعد)

مولانا قاری ابوالحسن اعظمی

الامام ابو عبد الله نصر ابن علی ابن محمد فخر الدین ، صدر الاسلام الشیرازی الفارسی الفسوی النحوی المعروف به ابن ابی مریم القفطی " المعروف به ابن مریم " (انباه الرواة ج۳ ص ٣٤٤) اور سیوطی " یعرف به ابی مریم " (البغیة الوعاة ج ۲ ص ۳۱٤) لکھتے ہیں مگر اغلب پہلا ہی ہے یعنی " ابن ابی مریم "

آپ کا شہر شیراز بڑی علمی خصوصیات کا حامل ہے، اس شہر سے تعلق رکھنے والے بڑے جلیل القدر اور منتخب روزگار علماء اور فضلاء گذرے ہیں، مثال کے طور پر ابو اسحاق ابراہیم ابن علی ابن یوسف ابن عبداللہ الفیروز آبادی ثم الشیرازی ان کے بارے میں درج ذیل تاریخی الفاظ ملتے ہیں۔ " امام عصره زهدا وعلما وورعا ، درس اکثر من ثلاثین سنة وافتی فربما من خمسین سنة " آپ کی وفات بغداد میں ۴۷٦ھ میں ہوئی۔

(۲) علماء محدثین میں سے الحسن ابن عثمان ابن حماد ابو حسان الزیادی الشیرازی، آپ سے امام محمد ادریس الشافعی وغیرہ حضرات نے سماع کیا ہے ۲۴۲ھ میں وفات ہوئی۔

اور محقق ابن الجزری نے بھی یہاں قیام کیا ہے اور یہاں منصب قضاء پر بھی فائز رہے اور آپ کی تدفین یہیں ہوئی۔ اسی علمی شہر کے آپ باشندے تھے،

علم نحو میں آپ بصری مکتبہ فکر اور مذہب کے مالک تھے۔

دوسری نسبت آپ کی الفسوی ہے فسا فارس کا ایک علمی شہر ہے اور فارس کے شہروں میں نہایت مسافت تک اشہر ہے اس شہر سے علماء و فضلاء روزگار کی ایک بڑی تعداد نسبت رکھتی ہے،

" ابن ابی مریم " کے لقب سے ملقب ہونے والے حضرات کی بھی ایک تعداد ہے، مثلاً (۱) برید ابن ابی مریم مالک ابن ربیعه السلولی البصری آپ ثقہ تابعی ہیں آپ سے

والد صحابی ہیں اور اصحاب الشجرہ میں سے ہیں۔(م ۱۴۴ھ)

(۲)ابو بکر ابن عبد اللہ ابن ابی مریم الغسانی الشامی "م ۱۵۶ھ"۔

(۳)ثور ابن زید الدیلی المدنی ثقہ ہیں م ۱۳۵ھ"۔

(۴)سعید ابن الحکم ابن محمد ابن سالم المعروف بہ ابن ابی مریم الأسوانی المصری الشافعی ابورجاء فقیہ م ۳۳۵ھ"۔

(۵) محمد ابن احمد ابن الربیع ابن سلیمان ابن ابی مریم الأسوانی المصری الشافعی ابورجاء فقیہ م ۳۳۵ھ"

(۶)نوح ابن یزید ابو مریم ابن جعونہ المروزی القرشی ابو عصمہ، قاضی مرو علوم کثیرہ کے جامع تھے اسی لئے نوح الجامع سے معروف تھے، واضع حدیث بھی تھے "م ۱۷۳ھ"

(۷)یزید ابن ثابت ابن ابی مریم ابن ابی عطاء الانصاری ابو عبد اللہ الدمشقی۔م ۱۴۰ھ یا اسکے بعد۔

آپ کے شیوخ:۔ نصر ابن علی ایک مفسر الامام المقری اللغوی تھے، یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ کے ہر علم وفن کے متعدد اساتذہ نہ ہوں مگر ترجمہ نگاروں نے صرف ایک استاذ کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں:

تاج القراء محمود ابن حمزہ ابن نصر ابو القاسم الکرمانی النحوی المعروف بتاج القراء آپ کے بارے میں محقق ابن الجزریؒ امام کبیر، محقق، ثقہ، کبیر المحل" جیسے وقیع الفاظ لکھتے ہیں۔(غایۃ النہایہ ج ۲ ص ۲۹۱)

یاقوت حموی آپ کو " **احد العلماء الفهماء النبلاء، صاحب التصانيف والفضل، كان عجباًفي دقة الفهم وحسن الا ستنباط**" لکھتے ہیں، آپ اپنے وطن ہی میں رہ گئے کہیں کا سفر نہیں کیا۔

تاج القراء کی درج ذیل چند مؤلفات کا ذکر بھی ملتا ہے:

(۱)خط المصاحف، (۲) کتاب الهداية فی شرح غایۃ ابن مهران، (۳) کتاب التفاسیر، (۴) کتاب البرهان فی معانی متشابہ القرآن، (۵) والایجاز فی النحو، الایضاح کو مختصر کیا ہے، (۶) النظامی فی النحو، اللمع کو مختصر کیا ہے، (۷) الافادہ فی النحو، (۸) العنوان وغیر ذلک!

تلامذہ: الامام نصر ابن علی کی عظیمت المرتبت کا تقاضا تو یہی ہے کہ آپ کے تلامذہ کی کثیر

تعداد ہو لیکن آپ کے ترجمہ نگاروں نے چند ہی حضرات کے نام ذکر کئے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) مکرم ابن العلاء ابن نصر الغالی (یا الفالی) (غایہ ج ۲ ص ۳۴۷)

(۲) شہاب الدین جمال الاسلام زین الائمہ ابوالحسن علی ابن محمد ابن ابی علی (خاتمۃ النسخۃ الاصل)

(۳) الشیخ الفقیہ عفیف الدین نجیب الاسلام ابو الحسن علی ابن ہبۃ اللہ ابن محمد (خاتمۃ النسخۃ الاصل)

(۴) ابو العلاء حمزہ ابن محمد ابن عبد العزیز ابن محمد (صفحۃ العنوان فی الاصل)

آثار تصانیف: آپ نے علوم القرآن کے موضوعات پر مشتمل جوگرانقدر مؤلفات اور تصانیف یادگار چھوڑی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(۱) الکشف والبیان فی تفسیر القرآن ۸ جلدوں میں

(۲) الافصاح شرح الایضاح فی النحو لابی علی الفارسی

(۳) عیون التصریف

(۴) المنتقی من الشواذ، اس کا دوسرا نام "المنتقی فی علل القراءات" ہے اس کتاب میں آپ نے قراءات شاذہ کو ان کے علل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

(۵) الموضح فی وجوہ القراءات وعللہا، اس کا دوسرا نام "الموضح فی القراءات الثمانی" بھی ہے۔ ۳ جلدوں میں، اس کتاب میں آپ نے آٹھ قراءات کو ان کے وجوہ اور علل کے ساتھ بیان کیا ہے، سات تو مشہور قراء کی اور آٹھویں قراءت امام ابو محمد یعقوب الحضرمی کی۔

الامام نصر ابن علی کی تصانیف و آثار میں یہی مؤخر الذکر ملتی ہے۔

تذکرہ نگار آپ کی اس کتاب کے نام سے متعلق متعدد قیود ذکر کرتے ہیں: مثلاً

(۱) اصلی نسخہ میں اس کا نام "کتاب الموضح فی وجہ القراءۃ وعللہا" ہے۔

(۲) اس کتاب کے خاتمہ پر ہے "تم الکتاب الموضح فی وجوہ القراءات"

(۳) اور اس کتاب سے اپنے مقدمہ میں فرماتے ہیں۔ "وسمیتہ الکتاب الموضح"

(۴) محقق ابن الجزری اپنی کتاب النشر ج اص ۲۱۱ میں قراءت میں حسن ادا کی فرضیت کے سلسلے میں آپ کی مذکورہ کتاب سے نص بیان کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

" قال الشیخ الامام ابوعبداللہ نصر ابن محمد الشیرازی فی کتابہ " الموصح فی وحوہ القراءات....." الخ

(۵) القفطی اس کتاب کا نام "الکتاب الموضح فی علم القرآن" لکھتے ہیں، (انباہ الرواۃ ج ۳ ص ۳۴۵)

مذکورہ تصریحات سے کتاب کے نام میں "الموضح" تو متفق علیہ ہے البتہ اس کے بعد کی قیدیں مختلف ہیں۔ الامام نصر ابن علی کے علاوہ دوسرے بہت سے حضرات نے اپنی کتابوں کے نام "الموضح" رکھے ہیں۔ مثلاً

(۱) الموضح (شرح الہدایہ فی السبعہ للمہدوی (م ۴۳۰ھ کے بعد)، (۲) الموضح فی الفتح والامالہ للدانی (م ۴۴۴ھ)، (۳) الموضح فی معانی القرآن، لابی بکر محمد ابی حسن المعروف بالنقاش الموصلی، (م ۳۵۱ھ) (۴) الموضح فی التفسیر باللسان الاصفہانی لابی القاسم اسماعیل ابن محمد الاصفہانی (م ۵۳۵ھ)، (۵) الموضح فی الفروع لابی نصر عبدالرحیم ابن ابی القاسم القشیری (م ۵۱۴ھ) (۶) الموضح فی النحو لابی بکر محمد بن قاسم ابن الانباری (م ۳۲۸ھ) و لابی بکر محمد ابن حسن الزبیدی (م تقریباً ۳۸۰ھ) و لعلی ابن ابراہیم الحوفی (م ۴۳۰ھ)، (۷) الموضح فی الفرائض لمحمد ابن ابی القاسم الحرانی، (۸) الموضح فی العروض لعبید اللہ ابن محمد الاسدی (م ۳۸۷ھ) (۹) الموضح فی العشر لابن رضوان، (۱۰) الموضح لابی القاسم عبدالوہاب القرطبی۔

مصنف علام اپنی اس کتاب میں از روئے لغت، نحو اور صرف کے الامام ابو علی الفارسی (م ۳۷۷ھ) سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں، نیز اس موضوع پر اہم ترین کتب مثلاً ابن جنی کی "المحتسِب"، (م ۳۹۲ھ) "الکشف عن وجوہ القراءات ... لمکی ابن ابی طالب (م ۴۳۷ھ)، الموضح للدانی (م ۴۴۴ھ) "حجتہ القراءات" لابی زرعہ ابن زنجلہ (پانچویں صدی کے ہیں) اور تفسیر البحر المحیط لابی حیان (م ۷۵۴ھ) وغیرہ سے متاثر نظر آتے ہیں، تو ابو علی الفارسی سے تاثر غالب ہے، لیکن متاثر ہوتے ہوئے بھی آپ کی یہ کتاب بعض امور میں اس سے بھی کہیں آگے ہے۔

اقوال و آراء: اس کتاب اور مؤلف سے متعلق علماء کے اقوال اور آراء سے بھی اس کتاب کی عظمت اور اس کے مؤلف کی جلالتِ قدر کا اندازہ ہوتا ہے:

ابو عبداللہ یاقوت الحموی (م ۶۲۶ھ) اپنی کتاب ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب المسمیٰ "معجم الادباء" میں مصنف کے ترجمہ کے تحت فرماتے ہیں:

"خطیب شیراز و عالمها و ادیبها، والمرجوع الیه فی الامور الشرع

والمشكلات الادبية" (ج ١٩، ص ٢٢٤)

الوزیرابوالحسن علی القفطی (م ۶۴۶ھ) اپنی کتاب "انباہ الرواۃ علی أنباہ النحاۃ" میں لکھتے ہیں:

فارس في اللغة والنحو، و واحد شيراز في الاثبات للنحو، الذى تُشَدُّ اليه الرّحال من العالم" (ج ۳، ص ۳۴۴، ۳۴۵) نیز آپ فرماتے ہیں:

" استاذ عارف، وقفتُ له على كتاب في القراء ات الثمان سمّاه الموضح يدلّ على تمكنه في الفنّ ...." الخ (ج ۲، ص ۳۳۷)

راقم الحروف کو یہ گرانقدر کتاب باعانت حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہ، حاصل ہوئی (فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء) اور پہلی فرصت میں اسکا مطالعہ شروع کیا، اور مصنف کی جلالت قدر صاف طور پر ظاہر ہوئی، ۳ جلدوں میں یہ عظیم کتاب راقم کی مختصر سی لائبریری کی زینت میں اضافہ کا باعث ہے۔

تذکرہ نگاروں نے بالتحدید مصنف کا سال وفات نہیں ذکر کیا ہے۔ لیکن مختلف تحریروں سے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی وفات ۵۶۵ھ کے بعد ہوئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ!!
(مقدمہ الموضح، الدکتور عمر حمدان الکبیسی)

ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ مارچ سنہ ۱۹۹۸ء

جلد ۸۲	شمارہ ۳	فی شمارہ ۔/۶	سالانہ ۔/۶۰

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ : دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانہ بدل اشتراک	سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۔/۴۰۰ روپے پاکستان سے ہندوستانی رقم ۔/۱۰۰ بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۔/۸۰ ہندوستان سے ۔/۶۰

Tel . 01336 - 22429
FAX : 01336 - 22768

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے، اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤدوالا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چند روانہ کردیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دار العلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

ہماری دینی درسگاہوں کا اصل موضوع علوم کتاب و سنت ہیں، انھیں کی افہام وتفہیم، تعلم و تعلیم، توضیح و تشریح تعمیل واتباع اور تبلیغ ودعوت ان مدارس کا مقصود اصلی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ دینی علمی ادارے علوم شریعت کے امین اور نبوت کے فرائض سہ گانہ "تلاوت قرآن، تعلیم کتاب اور تدریس حکمت وسنت" کے وارث ہیں۔

ماضی قریب میں ان تعلیم گاہوں نے اس عظیم امانت کی حفاظت اور اس قابل صد فخر وراثت کو اخلاف تک منتقل کرنے میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے وہ ہماری علمی و ثقافتی تاریخ کا ایک زریں باب ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف اپنے و پرائے سبھی کرتے ہیں اور آج کے انتشار پذیر اور مادی فروغ کے دور میں بھی یہ اسلامی مدارس اپنے وسائل وذرائع کے مطابق مصروفِ عمل ہیں اور ملت اسلامیہ کی اولین واہم ترین بنیادی ضرورت کی کفالت کررہے ہیں۔ اور اس سچائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کفر وشرک کے گھٹاٹوپ اندھیرے اور مذہب بیزاری کے اس ماحول میں اسلامی تہذیب و ثقافت اور دینی رسوم عبادت کے جو روشن آثار نظر آرہے ہیں وہ انھیں دینی درسگاہوں کی خدمات کا ثمرہ ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث ایک لازوال و غیرمتبدل حقائق ہیں۔ اسی کے ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زمانہ ہرآن تغیر پذیر ہے اور ہر جدید دور اپنے جلو میں نئے نئے مسائل لے کر آتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ انسانی افکار ونفسیات میں بھی فرق آجاتا ہے، پھر جدید علوم کی ترقیات اور سائنسی ایجادات واکتشافات دنیا کا رنگ بدلتے رہتے ہیں جس کے زیر اثر اس تغیر آباد عالم میں ان لازوال علوم کی امین وحامل امت کو نئے حالات وواقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور علوم نبوت

کے داعی و محافظ ہونے کی حیثیت سے ہر دور کے تقاضوں اور اس کے چیلنج کا مقابلہ اس احتیاط سے کرنا پڑتا ہے کہ اصل مقصود پر آنچ نہ آنے پائے۔ چنانچہ ہر دور میں اساطین امت نے وقت کے تقاضوں کے تحت تعلیمی خانوں میں جو رنگ بھرا اور حذف و اضافہ حک و ترمیم کا جو بھی عمل کیا وہ اس احتیاط اور بالغ نظری کے ساتھ کیا کہ اصل امانت یعنی منصوص و منقول کی پوری پوری حفاظت اور اس کی روح کی بقا کا کلی طور پر اہتمام کیا اور کسی جہت سے بھی علوم دینیہ کی حیثیت اور مقام و مرتبہ کو مجروح ہونے نہیں دیا۔

خود ہمارے اکابر رحمہم اللہ وکثر اللہ امثالھم نے اپنے عہد میں دارالعلوم دیوبند اور دیگر اسلامی درسگاہوں کے لئے نظام تعلیم کا جو نقشہ مرتب فرمایا تو حالات و زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی اساس اگرچہ رائج الوقت نصاب "درس نظامی" ہی پر رکھی مگر اس کمال بصیرت کے ساتھ کہ کتاب و سنت کی بالادستی کو نظرانداز نہیں ہونے دیا۔ اسلاف کے اسی طرز فکر اور طریقۂ کار کی پیروی کرتے ہوئے ابھی دو سال گزر رہے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے ارباب حل و عقد نے ملک کے صاحب نظر علماء اور دینی علوم میں مہارت و تجربہ رکھنے والے اصحاب درس فضلاء کے مشورہ اور اتفاق سے مدارس دینیہ کے نصاب درس و نظام تعلیم میں مفید ترمیم اور حذف و اضافہ کیا ہے جس میں علوم کتاب و سنت کی بالادستی کو قائم رکھتے ہوئے تقاضائے وقت کے مناسب بعض ایسے علوم و فنون کا اضافہ کیا گیا ہے۔ جو پہلے نصاب میں شامل نہیں تھے۔

اس سب کے باوجود ہمدردان ملت کا ایک طبقہ مدارس دینیہ کے رائج نظام تعلیم کو ناقص، غیر مفید اور ان کے فضلاء کو وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر اور سماج کے لئے غیر نفع بخش بتاتا ہے، اور قوت کے ساتھ یہ تحریک چلا رہا ہے کہ مدارس دینیہ اپنے مقصد و موضوع اور طرز فکر و عمل کے برخلاف منصوص و منقول بالفاظ دیگر کتاب و سنت کو چھوڑ کر یا کم از کم انھیں ثانوی درجہ میں رکھ کر دیگر سرکاری و نیم سرکاری اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نہج پر اپنا نظام تعلیم و نصاب درس مرتب کریں۔

قدیم و جدید کے اختلاف فکر و نظر کا یہ سلسلہ کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اس کی کڑیاں عہد غلامی سے جڑی ہوئی ہیں اور جاننے والے جانتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اسی اختلاف نظریات کے دو الگ الگ مظہر ہیں۔ اور دونوں نظریوں کے حق میں اب تک اس قدر لکھا اور کہا جا چکا ہے کہ اب کسی جانب سے بھی اس پر اضافہ دشوار ہے اس

لئے کیا اچھا ہوتا کہ یہ ہمدردان قوم وملت مدارس دینیہ کومطعون اور ان کے فضلاء کو بے حیثیت کرنے کی جدو جہد کے بجائے اپنے جہد وعمل کا رخ قوم کے ان نونہالوں کی طرف پھیر دیتے جو دینی علوم اور عصری فنون دونوں سے برگشتہ ہیں اورآج بھی جب کہ ہر چہار جانب سے تعلیم کی اہمیت کا چرچا ہورہا ہے ایسے بچوں کی تعداد زیادہ ہے جو یا تو سرے سے تعلیم گاہوں کا رخ بھی نہیں کرتے یا ابتدائی وثانوی مرحلہ میں پہنچ کر تعلیمی سلسلہ کو منقطع کر کے گھر بیٹھ رہتے ہیں۔ اگر یہ ہمدردان ملت قوم کے ایسے بچوں کو حصول تعلیم کی جانب متوجہ اور راغب کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ قوم کی ایک عظیم خدمت ہو گی اور خود ان کے نقطۂ نظر کے مطابق (ان قدیم دینی درسگاہوں کو ان کے موضوع ومنہاج سے ہٹا کر) جو مقاصد وفوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں اس صورت میں ملت کے ایک بڑے حصہ کو ذہنی وعملی انتشار میں مبتلا کئے بغیر کئی گنا زائد فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اور اگر اس تگ ودو اور تقریر وتحریر کا مقصد مدارس دینیہ کے خلاف محض پروپیگنڈہ اور قدیم وجدید کے پرانے اور کسی حد تک مردہ مسئلے کو پھر سے زندہ کرنا ہے تو ہمارے ان دانشوروں کو یہ بھولنا نہیں چاہئے کہ ارباب مدارس اس بارے میں تہی دامن نہیں ہیں ان کے منھ میں بھی زبان اور ہاتھ میں قلم ہے۔ اور محض بلند بانگ دعووں اور سخن طرازیوں کے بجائے ان کی پشت پر علمی، دینی اور معاشرتی اصلاح وخدمات کی ایک مضبوط ومستحکم تاریخ ہے۔ لیکن اس مسئلہ میں الجھ کر انتشار پذیر ملت کو مزید انتشار میں مبتلا کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں اس سلسلے میں ہمارا نظریہ تو بس یہ ہے ؎

لوگ سمجھیں مجھے محروم وقار و تمکیں
وہ نہ سمجھیں کہ مری بزم کے قابل نہ رہا

تقلید شخصی اور علماء امت

حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوری

سوال:۔ آج کل غیر مقلدیت (لامذہبیت) کا فتنہ عام ہو رہا ہے، غیر مقلدین نئے نئے انداز سے غیر مقلدیت کی طرف راغب کرنے کوشش کرتے ہیں اور تقلید کی بہت مذمت کرتے ہیں، تقلید ائمہ کو کفر و شرک تک کہہ دیتے ہیں، اور ائمہ عظام کے متعلق توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ بعض مقلدین ان کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ آپ سے عرض ہے کہ تقلید کی شرعی حیثیت اور تقلید کا ثبوت قرآن و حدیث کی روشنی میں تحریر فرمائیں، محدثین عظام اور علماء امت کا رجحان کس طرف ہے اس کی بھی وضاحت فرمائیں۔ غیر مقلدین جماعتِ محدثین کو اپنے جیسا غیر مقلد تصور کرتے ہیں کیا یہ صحیح ہے؟

امید ہے کہ قدرے تفصیل سے جواب تحریر فرما کر امت کی رہنمائی فرمائیں گے اللہ پاک دارین میں آپ کو جزاءِ خیر عطا فرمائیں اور آپ کے فیوض و برکات کو جاری رکھیں۔ آمین فقط والسلام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله الذى أعلى المؤمنين بكريم خطابه ورفع درجة العالمين بمعانى كتابه وخص المستنبطين منهم بمزيد الاصابة وثوابه والصلوٰة والسلام على النبى وأصحابه وأئمة المجتهدين وأتباعه وأبى حنيفة وأحبابه.

الجواب۔ غیر مجتہد پر ائمہ اربعہ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ میں سے کسی ایک کی تقلید واجب ہے، اس پر جمہور علماء امت کا اجماع ہے اسی میں اس کے ایمان اور اعمال کی سلامتی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مجتہد اور غیر مجتہد اور تقلید کی تعریف بیان کر دی جائے۔

مجتہد وہ شخص ہے جو براہ راست اپنے خداداد فہم و فراست کے ذریعہ کتاب و سنت سے شریعت کے اصول و فروع کا اور دین کے مقاصد کلیہ و جزئیہ کا استنباط اور استخراج کر سکے، اس کے لئے

چند شرائط ہیں۔ مجتہد کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ علوم عربیت یعنی لغت، صرف نحو، اور بلاغت و معانی میں حاذق اور ماہر ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ کتاب و سنت اور اقوال صحابہؓ و تابعین پر پورا مطلع ہو، قرآن کریم کی قراءت متواترہ اور قراءت شاذہ سے بخوبی واقف ہو، اور آیات کے اسباب نزول اور ناسخ و منسوخ سے باخبر ہو تاکہ قرآن مجید کی صحیح تفسیر کر سکے، اور احادیث نبویہ سے بھی بخوبی واقف ہو کہ اس مسئلہ میں کس قدر احادیث اور مرویات ہیں، نیز احادیث کی صحت و عدم صحت ضعف وغیرہ سے بھی پورا واقف ہو، نیز راویوں کے حالات بھی اچھی طرح جانتا ہو، تیسری شرط یہ ہے کہ منجانب اللہ اس کو نور فہم اور فراست ایمانی سے خاص حصہ ملا ہو، ذکاوت اور ذہانت میں ایسا ممتاز ہو کہ بڑے بڑے اذکیاء اور عقلاء کی گردنیں اس کے خداداد فہم کے سامنے خم ہوں، چوتھی شرط یہ ہے کہ اجتہاد اور استنباط کے طریقوں سے واقف ہو۔ جس شخص کے اندر یہ شرائط موجود ہوں وہ مجتہد ہے، ایسا شخص اپنے اجتہاد پر عمل کرے، اور جس شخص کے اندر یہ شرائط موجود نہ ہوں وہ غیر مجتہد ہے۔ اور جمہور علماء امت کا اجماع ہے کہ غیر مجتہد پر ائمہ شریعت کی اتباع اور تقلید واجب ہے۔

(عقد الجید ص ۷، ۸ میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے علامہ بغویؒ سے یہ شرائط نقل کی ہیں اسی طرح مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ نے بھی ان شرائط کو بیان فرمایا ہے۔

تقلید کی حیثیت:

جو شخص درجہ اجتہاد کو نہ پہنچا ہو یعنی وہ غیر مجتہد ہو اس کا کسی عالم و مجتہد کے علم و فہم اور اس کے ورع و تقویٰ پر اعتماد کر کے اس کے قول اور فتویٰ پر دلیل معلوم کئے بغیر عمل کرنا تقلید کہلاتا ہے۔

غیر مجتہد چونکہ از خود قرآن و سنت کے مسائل اور احکام مستنبط کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس لئے اس پر ضروری ہے کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی کی تقلید کرے اور ان حضرات مجتہدین نے محنت اور جان توڑ کوشش کر کے ادلہ شرعیہ (قرآن و حدیث، اجماع امت اور قیاس شرعی) کی روشنی میں جو فقہی مسائل مدوّن اور مرتب فرمائے ہیں ان پر عمل کرے، تقلید ہی کے ذریعہ وہ صحیح طریقہ پر قرآن و سنت پر عمل کر سکتا ہے۔ اگر تقلیدِ ائمہ سے آزاد ہو کر زندگی گذاریگا تو چونکہ اس کے اندر اجتہاد و استنباطِ مسائل کی صلاحیت نہیں بایں وجہ نفس جس طرف مائل ہو گا اس پر عمل کریگا اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ ہوائے نفسانی کا غلام اور بندہ ہو گا شریعت کا پیرو کار نہ ہو گا۔

غیر مقلدین کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مسائلِ فقہ حضور اقدس ﷺ دورِ نبوت میں مدون اور جمع نہ تھے، یہ بعد کی ایجاد ہے لہٰذا یہ بدعت ہے۔

مگر یہ اعتراض ان کی جہالت اور ناواقفیت کی علامت ہے۔ قرآن مجید بھی حضور اکرم ﷺ کے مبارک زمانہ میں کتابی صورت میں یکجا جمع نہ تھا، یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں حضور اقدس ﷺ پر قرآن کریم بیک وقت نازل نہیں ہوا بتدریج تیئس سال میں نازل ہ حالات کے مناسب جب کوئی آیت یا کوئی سورت نازل ہوتی تو آنحضرت ﷺ لکھواد۔ کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہ تو میں کوئی ہڈی یا کسی چیز کا ٹکڑا لے کر حاضر ہو جاتا اور آپ لکھواتے اور میں لکھتا جاتا۔ حضر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات کتابتِ وحی کے فرائض ا دیتے تھے جن میں خلفائے راشدینؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ حضر معاویہؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ حضرت خالد بن ولیدؓ حضرت ثابت بن قیسؓ، حضرت ابان سعید رضی اللہ عنھم اجمعین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے کہ آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کا وحی کو یہ ہدایت بھی فرمادیتے تھے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں فلاں آیات کی بعد لکھا جا۔ اور اس زمانہ میں چونکہ عرب میں کاغذ کمیاب تھا اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلو چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں، اور جانور کی ہڈ پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے گئے۔ اس انداز سے قر مجید متفرق تھا مکمل نسخہ نہیں تھا، کسی صحابی کے پاس ایک سورت لکھی تھی، کسی کے پاس دس سورتیں اور کسی کے پاس چند آیات لکھی ہوئی تھیں۔ (فتح الباری بحوالہ مقدمہ معارف القرآن ۶ ۲، ۷، ۳ از مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم)

الغرض حضور اکرم ﷺ کے مبارک دور میں قرآن مجید یکجا جمع نہ تھا حضور اقدس ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے مبارک زمانہ میں حضرت عمر فاروقؓ کے مشورہ سے کیا گیا، جس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا کہ جنگ یم میں حفاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہو گئی ہے اور اگر مختلف مقامات پر قرآن کریم کے ح اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ناپ

ہو جائے لہذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے حکم سے قرآن مجید جمع کروانے کا کام شروع کردیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کام کے لئے ابتداء تیار نہ تھے اور فرمارہے تھے "کیف تفعل شیئا لم یفعله رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم ؟" جو کام حضور اکرم ﷺ نے نہیں کیا وہ کام کیسے کرسکتے ہو؟ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا" هذا والله خیر "خدا کی قسم !یہ کام بہت بہتر ہے۔اس کی بعد حضرت عمرؓ بار بار یہی بات کہتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا سینہ اس کام کے لئے کھول دیا اور آپ کو شرح صدر ہو گیا اور آپ اس مبارک اور اہم کام کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ خود صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:"فلم یزلْ عمر یُراجعنی حتی شرح اللّٰهُ صدری لذلك ورأیت فی ذلك الذی رأی عمر ۔"حضرت عمر مجھ سے مراجعت کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے میرا سینہ کھول دیا (اور مجھے بھی شرح صدر ہو گیا) اور میری بھی اس بارے میں وہی رائے ہو گئی جو عمر فاروقؓ کی تھی ، ان دونوں حضرات کی اتفاق رائے کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو یہ خدمت انجام دینے کے لئے فرمایا تو انہوں نے بھی یہ سوال کیا " کیف تفعلون شیئاً لم یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم " آپ صاحبان وہ کام کیسے کرسکتے ہو جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا" هو والله خیر "واللہ یہ کام بہتر ہی بہتر ہے،اور پھر آپ ان سے گفتگو فرماتے رہے اس کی مصلحت پیش فرماتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بھی شرح صدر عطا فرمادیا اور وہ بھی اس کام کے لئے آمادہ ہوگئے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "فلم یزل ابوبکر یُراجعنی حتی شرح الله صدری للذی شرح له صدر ابی بکر وعمر "حضرت ابو بکر مجھ سے مراجعت کرتے رہے یہاں تک اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے میرا سینہ بھی کھول دیا جس کے لئے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو شرح صدر ہو چکا تھا،اس کے بعد حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے نہایت جانفشانی اور پوری احتیاط کے ساتھ یہ خدمت انجام دی اور قرآن مجید کا نسخہ مرتب فرمادیا۔(بخاری شریف ج ۲ ص ۷۴۵ باب جمع القرآن کتاب فضائل القرآن)

اگر فقہ کے مسائل اور احکام حضور اکرم ﷺ کے بعد مدون اور جمع ہونے پر اعتراض

ہے اور اسے بدعت و ناجائز کہا جاتا ہے تو جمع قرآن کے متعلق کیا کہو گے ؟؟؟

احادیث کی تدوین بھی حضور ﷺ کی وفات کے بعد ہوئی ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، موطا، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ کتب احادیث بعد میں تصنیف کی گئی ہیں کیا اس کو بھی بدعت کہا جائیگا؟ اور اس سے اعراض کیا جائیگا؟ اور کتب احادیث سے استفادہ ترک کر دیا جائیگا؟ حقیقت یہ ہے کہ نہ فقہ کا مدون ہونا بدعت ہے اور نہ جمع قرآن کو بدعت کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ ہر نئی بات کو بدعت کہہ دینا جہال اور محروم العقل لوگوں کا کام ہے، ہر نیا کام اور ہر نئی بات بدعت ممنوعہ نہیں بلکہ جو کام "فی الدین" ہو یعنی دین کے اندر بطور اضافہ اور کمی بیشی کے ہو اور اسے دین قرار دے کر اور عبادت وغیرہ دینی امور کی طرح ثواب آخرت اور رضائے الٰہی کا ذریعہ سمجھ کر کیا جائے حالانکہ شریعت میں اس کی کوئی دلیل نہ ہو نہ قرآن و سنت سے نہ قیاس و اجتہاد سے جیسے عیدین کی نماز میں اذان و اقامت کا اضافہ یہ تو بدعت ہے اور جو نیا کام "للدین" ہو یعنی دین کے استحکام و مضبوطی اور دینی مقاصد کی تکمیل و تحصیل کی لئے ہو اسے بدعت ممنوعہ نہیں کہا جا سکتا جیسے جمع قرآن کا مسئلہ ، قرآن میں اعراب لگانا، کتبِ احادیث کی تالیف اور ان کی شرحیں لکھنا اور ان کتابوں کا صحیح بخاری، صحیح مسلم وغیرہ نام رکھنا ان تمام امور کو بدعت نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح احکام فقہ کا مدون و مرتب کرنا اور مذاہبِ اربعہ کی تعیین اور ان کا حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی نام رکھنا اس کو بھی بدعت نہیں کہا جا سکتا۔ مذکورہ تمام امور "للدین" ہونے کی وجہ سے مستحب بلکہ ضروری ہیں ،اگر قرآن جمع نہ کیا جاتا تو اسکی حفاظت مشکل ہو جاتی۔ اگر اس پر اعراب نہ لگائے جاتے تو صحیح تلاوت کرنا دشوار ہو جاتا، احادیث کو کتابوں کی صورت میں مرتب نہ کیا جاتا تو آج امت کے پاس احادیث کا یہ معتبر ذخیرہ نہ ہوتا اسی طرح اگر فقہ کی تدوین اور مذاہب اربعہ کی تعیین نہ ہوتی تو آج لوگ خواہشات کے بندے اور غلام ہوتے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ اللہ پاک نے علماء اور مجتہدین کے قلب میں یہ بات الہام فرمائی کہ انہوں نے ضرورت محسوس کر کے فقہ کی تدوین کی اور طہارت، عبادات، معاملات اور بیوعات وغیرہ سے متعلق سینکڑوں مسائل جو قرآن و سنت میں متفرق تھے ان کو یکجا جمع کر کے الگ الگ ابواب میں مرتب کر دیا اور خداداد فہم ثاقب کے ذریعہ اجتہاد و استنباط سے کام لیا اور امت کے سامنے قرآن و سنت کا خلاصہ اور جوہر پکے پکائے تیار خوان کی صورت میں رکھدیا جس کی بدولت امت کے لئے قرآن

وسنت کے مسائل کا تلاش کرنااور ان پر عمل کرنا آسان ہو گیا۔اگر فقہ کی تدوین نہ ہوئی ہوتی تو بتلایا جائے کیا ہمارے اندر یہ صلاحیت ہے کہ ہم براہ راست قرآن وسنت سے مسائل استنباط کرتے ؟ ہمارا حال تو یہ ہے کہ علم تفسیر ،علم حدیث تو کیا، قرآن شریف یا حدیث شریف بلا اعراب کے صحیح نہیں پڑھ سکتے،استنباطِ مسائل کی سمجھ اور صلاحیت تو بہت بلند ہے ان حالات میں تو ائمہ مجتہدین کا احسان مند ہونا چاہئے اور ان کے لئے دعاء خیر کرنی چاہئے۔ اس کے بجائے ان کی شان میں گستاخی کرنا،ان کی توہین کرنا کس قدر محرومی کی بات ہے، ہم تو یہی کہتے ہیں کہ ائمہ مجتہدین کا امت پر بہت عظیم احسان ہے اللہ پاک ہماری طرف سے ان کو بہترین جزاء عطا فرمائے۔ان کے درجات بلند فرمائے آمین۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں :

وبالجملة فالتمذهب للمجتهدين سرٌّ الهمه الله تعالىٰ العلماء وجَمَعَهُم من حيث يشعرون او لايشعرون (انصاف ص۴۷)

الحاصل (ان مجتہدین کا صاحب مذہب ہونا) اور پھر لوگوں کا ان کو اختیار کرنا ایک راز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے علماء پر الہام کیا ہے اور ان کو (اس تقلید پر) جمع کر دیا ہے چاہے وہ اس راز کو جانیں یا نہ جانیں۔

اور تحریر فرماتے ہیں :

اعلم أن فى الاخذ بهذه المذاهب الاربعة مصلحة عظيمة وفى الاعراض عنها كلها مفسدة كبيرة (عقد الجید ص۳۱)

جاننا چاہئے کہ مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے اور ان سے اعراض کرنے میں بڑا مفسدہ ہے۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بھی اس اعتراض کا جواب تحریر فرمایا ہے ناظرین وہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"جواب یہ ہے کہ حاشا وکلا مذاہب اربعہ بدعت نہیں بلکہ چوتھی صدی کے بعد اہل سنت والجماعت انہی چار مذاہب میں محدود ہو گئے جیسا کہ قاضی ثناءاللہ صاحب پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے اور شیخ ابن ہمام تحریر الاصول میں فرماتے ہیں کہ اس امر پر اجماع ہو گیا ہے کہ جو مذہب مذاہبِ اربعہ کے خلاف ہو گا اس پر عمل نہیں کیا جائیگا۔ عہد صحابہ

میں اگر چہ یہ مذاہب اربعہ (حنفی، مالکی شافعی، حنبلی) نہ تھے تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں ان کا ظہور ہوا مگر یہ ایسا ہے جیسا کہ سبع قراءت اور صحاح ستہ کا ظہور تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں ہوا اور حنفی مالکی نسبت ایسی ہی ہے جیسا کہ کہا جائے کہ یہ قراءت حفص کی یا حمزہ کی ہے اور یہ قراءت عاصم کی یا کسائی کی ہے اور یہ حدیث بخاری کی ہے اور یہ حدیث مسلم کی ہے سب کو معلوم ہے کہ صحابہ کے زمانہ میں نہ صحیح بخاری تھی اور نہ صحیح مسلم پس جس طرح بخاری اور مسلم کی طرف کسی حدیث کی نسبت باعتبار تخریج اور اسناد کے ہے اور عاصم اور حمزہ کی طرف کسی قراءت کی نسبت باعتبار روایت کے ہے اسی طرح امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کی طرف نسبت کرنا باعتبار استنباط اور اجتہاد کے ہے یعنی امام اعظمؒ نے اس حدیث کے یہ معنی بیان فرمائے اور امام شافعیؒ نے یہ معنی بیان کئے اصل مقصود حق تعالیٰ شانہ اور اسکے رسول برحق کی اطاعت ہے اور ائمہ مجتہدین کی اتباع کے یہ معنی ہیں کہ ان حضرات کی تشریح کی تفسیر کے مطابق کتاب وسنت پر عمل کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی راسخ فی العلم کی تفسیر اور تفہیم کے مطابق احکام شریعت کا اتباع کرنا عین ہدایت اور عین رشد وسعادت ہے پھر کیا وجہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی طرف نسبت تو جائز ہو اور ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ کی طرف نسبت شرک ہو۔

پس جس طرح بخاری اور مسلم اور صحاح ستہ کی احادیث لسانِ نبوت کے موتی ہیں اسی طرح فقہ حنفی اور فقہ شافعی دریائے دین محمدی کی نہریں ہیں دونوں نہروں کا پانی ایک ہی دریا سے آرہا ہے۔ الی قولہ۔

اور مسائل اجتہادیہ میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ایسا ہے جیسا کہ احادیث کی صحت اور علت میں ائمہ حدیث کا اختلاف ہے اور جس طرح موصول، مرسل، مرفوع، موقوف، صحیح، حسن، ضعیف وغیرہ یہ اصطلاحات نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں نہ تھیں لیکن ائمہ حدیث نے حسب ضرورت زمانہ کلمات نبویہ اور احادیث کے الفاظ کی حفاظت کے لئے یہ اصطلاحیں وضع کیں جو عہد نبوت میں نہ تھیں اسی طرح حضرات فقہاء نے کتاب وسنت کے معانی سمجھنے کے لئے عبارت النص، اشارۃ النص، ظاہر نص، مفسر محکم، وغیرہ، کی اصطلاحات وضع کیں جو عہد نبوت میں نہ تھیں۔

پس جس طرح قواعد محدثین کی پابندی اور اتباع واجب ہے اور کسی شخص کو یہ اختیار نہیں کہ اپنی رائے سے جس حدیث کو چاہے صحیح بتائے اور جس کو چاہے موضوع۔ اسی

طرح اصول فقہ کی پابندی اور اتباع بھی ضروری ہے۔ اور ہرکس و ناکس کو ہرگز اس کی اجازت نہیں کہ قرآن وحدیث کا ترجمہ دیکھ کر جو معنی سمجھے اس پر عمل کرے اور دوسروں کو اسپر عمل کرنے کی تبلیغ کرے اگر اصول فقہ کی پابندی ضروری نہیں تو پھر اصول حدیث کی بھی پابندی نہیں ہوگی۔ جرح وتعدیل اور تصحیح وتصنیف میں ہر شخص کو اختیار ہوگا کہ جس کو چاہے ثقہ اور صدوق بتلائے اور جس کو چاہے کذاب ودجال اور وضاع الحدیث بتائے۔

اور جس طرح ائمہ حدیث کی مساعی جمیلہ پر اطمنان کر کے احادیث کے رجال اور ان کی صحت اور ضعف کو معرض بحث میں نہیں لایا جاتا اور ان کی علمی تحقیقات پر اعتماد کر کے بلا دلیل معلوم کئے ہوئے ان کے قول کو تسلیم کرلیا جاتا ہے حالانکہ اسماء الرجال کی کتابیں اب بھی موجود ہیں۔

اسی طرح ائمہ مجتہدین کے تفقہ اور استنباط اور خداداد نورِ فہم اور نورِ فراست پر اعتماد کر کے ان کے فتاویٰ پر بلا دلیل معلوم کئے اور بلا جانچ وپڑتال کے عمل کرلینا بلا شبہ صحیح اور درست ہوگا۔ ان دونوں تقلیدوں میں اگر فرق ہے تو بتلایا جائے کہ وہ کیا فرق ہے کہ جس کی بنا پر محدثین کی تقلید تو فرض اور واجب ہوگئی اور فقہاء کی تقلید شرک اور حرام ہوگئی۔

حق تعالیٰ کی کروڑہا کروڑ رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں حضرات محدثین پر اور حضرات فقہاء پر کسی نے ہم نابکاروں کو روایت پہنچائی اور کسی نے درایت اور معانی واحکام روایت۔

جس طرح ہم ائمہ قراءت اور ائمہ تفسیروں دونوں ہی کے زرخرید غلام ہیں کہ ایک گروہ نے ہم تک کلام ربانی اسی طرح بلا کم وکاست پہنچایا کہ جس طرح جبریل امین سید الاولین والآخرین پر لے کر نازل ہوئے تھے اور دوسرے گروہ نے ہمیں کلام ربانی کے حقائق اور معارف اور اس کی سحر بیانی سے ہمارے دل کی آنکھیں روشن کیں اسی طرح ہم محدثین اور فقہاء دونوں ہی کے کفش بردار اور پیرو کار ہیں اگر کتب حدیث نہ ہوتیں تو نبی ﷺ کے اقوال وافعال کا علم کہاں سے ہوتا اور اگر کتب فقہاء نہ ہوتیں تو کتاب وسنت پر عمل کیسے کرتے۔ عمل تو بغیر معنی سمجھے ہوئے نہیں ہو سکتا۔ قرآن وحدیث کا اصل مقصود اطاعت ہے اور اطاعت کا مدار معنی پر ہے نہ لفظوں پر خوب سمجھ لو۔ (ص ۱۰۱ تا ۱۰۴)

باقی

رسول اکرم ﷺ کو تمام رسولوں پر فضیلت مطلقہ حاصل ہونے کی ایک دلیل اس ناچیز کے ذہن میں یہ بھی آتی ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے قول و عمل سے الوہیت اور رسالت کی حدود کی حفاظت میں جو کامیابی حاصل کی وہ کسی نبی و رسول اور پیشوائے مذہب کو حاصل نہیں ہو سکی حالانکہ جس طرح ہر نبی نے عقیدہ توحید کی دعوت دی اسی طرح اس نے اس بنیادی عقیدہ کے تحفظ کی بھی کوشش کی اور یہ اس کا بنیادی فرض تھا مگر اس کوشش میں کامیابی حاصل کرنے کا جہاں تک تعلق ہے اس میں حضور علیہ السلام کا درجہ سب رسولوں میں ممتاز اور بلند ہے۔

چنانچہ یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ دنیا کے مذہبی پیشواؤں میں جو پیشوا آج اپنی اپنی قوموں میں مشہور ہیں وہ سب کے سب اپنی اپنی قوموں میں معبود، دیوتا، ابن اللہ اور پرمیشور بنے ہوئے ہیں۔

ویدک دھرم ہو یا سناتن دھرم، بدھ ازم ہو یا جین ازم ان سب کے مذہبی پیشوا کرشن، بدھا اور مہابیر بطور دیوتا کے پوجے جارہے ہیں۔

ایران کے زرتشت (اوستا والے) آتش پرستی کی صورت میں دیوتا بنے ہوئے ہیں، توراۃ کے رسول حضرت موسیٰ کے بارے میں یہود کا عقیدہ الوہیتِ موسیٰ کا نہیں، لیکن حضرت عزیر کے ابن اللہ ہونے کا عقیدہ نظر آتا ہے اور اسی طرح یہودی اپنے علماء، وصوفیا کو صفتِ الوہیت سے متصف کرتے ہیں، یعنی اپنے علماء وصوفیا (احبار ورہبان) کو واضع شریعت قرار دے کر انہیں الوہیت کے درجہ میں لے آئے ہیں۔

علماء انجیل کی تحقیق کے مطابق صرف تین سو برس تک حضرت مسیح کے بارے میں خدا کا بندہ اور رسول کہلانے کا تصور عیسائیوں کے اندر رہا اس کے بعد مسیحی پیشواؤں نے خود بیٹھ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ مسیح ابن اللہ تھے۔

نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے الوہیت اور نبوت کا جو کلمہ طیبہ مقرر کیا اور اس میں محمد رسول اللہ۔ شامل کیا تو پندرہ صدیاں گذر چکی ہیں امت کی زبان پر رسول اللہ ہی جاری ہوتا ہے، حبیب اللہ جاری نہیں ہوتا، حالانکہ آپ نے اس صفت سے اپنا تعارف کرایا۔

اسی طرح کلمہ شہادت میں رسول کے ساتھ عبدہ کی صفت لگائی اور دوسری کوئی صفتِ کمال، (رؤف رحیم) نہیں لگائی۔

عملی زندگی میں حضور ﷺ نے تواضع، عاجزی اور بندگی کی جو روش اختیار کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے مقام کے دائرہ میں محبت کی راہ سے الوہیت اور خدائی کے تصور کی کوئی رمق اور کوئی شائبہ داخل نہیں ہو سکا، حضور ﷺ نی زبانی ہدایت فرمائی:

لاتطرونی کما إطرت النصاری المسیح ابن مریم۔ میری تعریف میں اس قدر مبالغہ اور غلو نہ کیا جائے جتنا حضرت مسیح ابن مریم کے بارے میں کیا گیا۔

اس زبانی نصیحت کے ساتھ ہی آپ نے عملی طور پر اپنی زندگی کو عبدیت کا ایسا نمونہ بنا کر پیش کیا کہ مسلمانوں کے دلوں میں آپ کے بارے میں خدائی تصور پیدا ہونا ممکن نہیں رہا۔

حضور ﷺ کے اس وصف میں اگرچہ بنیادی رول قرآن کریم کی تعلیمات کا ہے، قرآن کریم نے ہر ہر قدم پر حضور ﷺ کی بشریت کا آپ کے پابندِ قانون ہونے کا، مواخذۂ آخرت سے خائف رہنے کا اعلان کیا ہے۔

(۱) ہر شخص کو نظر آرہا تھا کہ آپ بشر اور انسان ہیں اور بشری لوازمات اپنے ساتھ رکھتے ہیں، پھر بھی قرآن نے کہا اعلان و اظہار کرو۔

قل انما أنا بشر مثلکم (کہف ۱۱۰) اعلان کروائے محمد! کہ میں بشر ہوں۔

(۲) حضور ﷺ خدا کے عبادت گذار بندہ تھے، قرآن نے حکم دیا کہ اس بات کا اعلان کرو کہ میں خدا کے حکم سے اس کی عبادت کر رہا ہوں۔

قل ان صلاتی ونسکی الخ - وبذلك أمرت وانااول المسلمین (انعام ۱۶۲) اعلان کروائے نبی! کہ میری عبادات اور میرا مسلمان اول ہونا خدا کے حکم سے ہے نبیؐ

فطری طور پر اعلیٰ اخلاق سے متصف ہوتا ہے، مگر ایمان وعبادت کے باقاعدہ تفصیلی طریقوں کا علم نبی کو وحی الٰہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

وکذالك أوحینا الیك روحاً من امرنا، ماکنت تدری ماالکتاب ولاالایمان ولکن جعلناه نوراً نهدی به من نشاء من عبادنا (شوری ۵۲)

وحی الٰہی کی تعلیم نے آپ کو بتایا کہ ایمان واسلام کی تفصیلات کیا ہیں۔

(۳) حضور ﷺ ایک منصف مزاج اور عدالت پسند رہنماء تھے، قرآن نے کہا کہ اس بات کا اعلان کرو کہ مجھے خدا کی طرف سے عدل کرنے کا حکم ملا ہے، اسی کی تعمیل کر رہا ہوں۔

(۴) رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم راہ حق میں جہاد کرتے تھے، آپ کے اندر فطری طور پر اور قومی روایات کے اثر سے غیرت بھی تھی، جذبہ بھی تھا، اور قوت جسمانی بھی تھی، جس کا مظاہرہ میدان جہاد میں ہوتا تھا۔

حنین کے غزوہ میں حضور ﷺ نے اپنی قومی غیرت وقوت اور نبوت کی قوت وحمیت دونوں کا اظہار فرمایا۔

انا النبی لاکذب انا ابن عبد المطلب

ان دو مقفّٰی فقروں میں (شعروں میں نہیں) آپ نے پہلے فقرہ میں نبوت کی قوت کا اور پھر اپنی قومی غیرت وشجاعت کا اظہار فرمایا ہے۔ قرآن کریم نے حضور ﷺ کو قوت جہاد سے کام لینے کا حکم دیا اور یہ بات بتائی کہ حضورؐ حکم الٰہی کی تعمیل میں جہاد کرتے ہیں، حکم تھا!

یاایها النبی جاهد الکفار والمنافقین واغلظ علیهم (توبہ ۷۳)

اے نبی کفار ومنافقین کے ساتھ جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔

(۵) خدا سے ڈرنا ہر نیک سیرت انسان کے اندر ہوتا ہے مگر قرآن آپ کو حکم دیتا تھا کہ خدا سے ڈرو۔

یاایها النبی اتق الله ولاتطع الکافرین والمنافقین (احزاب ۱)

اے نبی اللہ سے ڈرو اور گمراہوں کی اطاعت سے دور رہو۔

اس حکم سے یہ بتانا مقصود تھا کہ نبی کے اندر خوف خدا اسی کے حکم کے مطابق ہے۔

(۶) نبی توحید کا داعی ہوتا ہے اور شرک سے دور رہنا اس کی فطرت ہوتی ہے، مگر قرآن ہدایت کرتا تھا۔

لئن اشرکت لیحبطن عملک (زمر ٦٥)
اے نبی! اگر آپ سے بالفرض شرک سرزد ہوا تو آپ کی نیکیاں برباد کردی جائیں گی۔
ایک ناممکن کے درجہ میں لاکر حضور ﷺ کو تنبیہ کی گئی تا کہ حکم الٰہی کی بالاتری کا اظہار ہو۔

نبیاء بنی اسرائیل اور علماء امت!

علماء حدیث و تفسیر نے حضور ﷺ کے افضل المرسلین ہونے کے دلائل میں حضورؐ کی ست (خیر امت) کے تمام امتوں پر افضل ہونے کی بھی شامل کیا ہے۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آخری امت کو فضیلت حاصل ہوئی افضل الانبیاء کی امت ونے کی وجہ سے اور پھر اس امت کی فضیلت دلیل بن گئی حضور ﷺ کے افضل واکمل ونے کی۔
اس امت کے افضل ہونے کی ایک وجہ یہ قرار دی گئی ہے: **کنتم خیر امة اخرجت ناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر** (آل عمران ١١٠)
یعنی یہ آخری امت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ دار بنائی گئی ہے اور نبوت کا شن اس کے حوالہ کیا گیا ہے۔
امر بالمعروف اس امت کی حسب حیثیت اور حسب حال واجب ذمہ داری ہے اور امت کے علماء خاص طور پر اس فریضۂ دعوت کو ادا کرنے پر مامور ہیں۔
اسی مشن و منصب کے لحاظ سے حضور ﷺ نے اپنی امت کے علماء کو انبیاء کا وارث قرار یا ہے۔ فرمایا:
إن العلماء ورثة الانبياء وإنّ الأنبياء لم يُوَرِّثُوا دِينارًا ولا درهماً وإنما وَرَّثُو علمَ۔ (مشکوٰۃ ٣٤ بحوالہ احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)
علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں اور انبیاء درہم و دینار کا ورثہ نہیں چھوڑتے، وہ علم کا ورثہ چھوڑتے ہیں۔
حضور ﷺ نے نبی (مفرد کا لفظ) استعمال نہیں کیا، بلکہ جمع کا لفظ استعمال کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس لفظ جمع میں حضور ﷺ کے ساتھ تمام انبیاء سابقین شامل ہیں۔

ستر امتوں کے قائم مقام!

رسول اکرم ﷺ خاتم الانبیاء ہیں، اور آپ کی امت خاتم الامم ہے، ایک حدیث کے مطابق دنیا میں ستر امتیں (مذہبی گروہ) ہوئے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ستر نبی صاحب امت (صاحب شریعت) ہوئے، ان امتوں کی تکمیل اس آخری امت کے ذریعہ ہوئی۔ فرمایا:

کنتم خیر امة　الخ .... انتم تتمون سبعین امةً انتم خیرها واکرمها علی الله تعالیٰ۔ (مشکوٰۃ ۵۸۳)

حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور کہا: اے مسلمانو! تم ستر امتوں کی تکمیل کرنے والے ہو، تم ان سے بہتر ہو اور اللہ کے نزدیک ان سے معزز ہو سبعین (ستر) کے لفظ کو مدمعین کے مفہوم میں لیا جائے یا اسے محاورۂ عرب کے مطابق کثرت کے مفہوم میں لیا جائے۔

بہر حال اس سے خیر امت اور امتِ مسلمہ کی فضیلت بیان کرنی مقصود ہے۔

اسلام کی افضلیت دوسرے مذاہب پر

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت مطلقہ کے اظہار سے اگر انبیاء سابقین کے ماننے والوں میں تعصب اور ہٹ دھرمی پیدا ہونے کا اندیشہ تسلیم کر لیا جائے اور اس سبب سے اس حقیقت کا اظہار نہ کیا جائے تو اسی اندیشہ کے پیش نظر کیا مذہبِ حق اسلام کی دوسرے ادیان پر برتری کا اظہار و عقیدہ بھی ترک کر دیا جائے۔

ان علماء کرام سے یہ سوال کیا جاسکتا ہے، جو علماء نبی آخر الزماں ﷺ کی افضلیت کے اظہار کو تبلیغ اسلام کی راہ میں رکاوٹ قرار دیتے ہیں۔

اسلام کے بارے میں قرآن کریم نے اعلان کیا:

إن الدین عند الله الاسلام (آل عمران ۱۹) اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیقی اور سچا دین مکمل طور پر اسلام ہی ہے۔

حجۃ الوداع کے موقعہ پر اعلان کیا: **الیوم اکملت لکم دینکم وأتممت علیکم**

نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (مائدۃ ۳۵)
آج میں نے تمہارا دین تم پر مکمل کر دیا اور تم پر دین کی نعمت مکمل کر دی اور میں نے تمہارے لئے اسلام کو بطور دین حق پسند کر لیا۔

محتاط اور غیر محتاط شعراء

در حقیقت حضور ﷺ کی افضلیت کے اظہار میں ان پڑھ شعراء جو انداز اختیار کرتے ہیں اور یہ طبقہ عامیانہ طریقہ پر حضرات انبیاء کے درمیان جو موازنہ کرتا ہے، اس سے شان انبیاء میں یقیناً سوءادب پیدا ہو جاتا ہے، اور بیان افضلیت کا یہ طریقہ ممنوع ہے۔
اس کی ایک مثال مولانا احمد رضا خاں صاحب کی یہ رباعی ہے:

ان کی نبوت، ان کی ابوت ہے سب کو عام
ام البشر عروس انہی کے پسر کی ہے
ظاہر میں میرے پھول باطن میں میرے نخل
اس گل کی یاد میں یہ صدا بوالبشر کی ہے

یہ اشعار مولانا بریلوی کے نعتیہ کلام کے ہیں۔ اس کے حاشیہ پر کسی بریلوی عالم صاحب نے ایک جھوٹی روایت حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے اپنے پیر و مرشد کے ان اشعار کی تائید ان الفاظ میں کی ہے۔
"آدم جب حضور ﷺ کو یاد کرتے تو یوں کہتے: **یا ابنی صورةً ویاأبی معنیً**۔ اے صورت و ظاہر میں میرے بیٹے اور باطن میں میرے باپ"
خانصاحب نے ایک معنوی اور روحانی مسئلہ کو مادی اور جسمانی تعبیر میں بیان کر کے سوء ادب اور گستاخی کا ارتکاب کیا ہے۔
ام البشر (حضرت حواء) کو حضور ﷺ کی بہو (عروس) قرار دینا مادی استعارہ ہے اور نہایت بدذوقی ہے۔
محتاط شعر حضور ﷺ کی افضلیت کا یہ ہے:

حسنِ یوسف دم عیسیٰ ید بیضا، داری　　آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

سر سید مرحوم کی نعتیہ رباعی ہے:

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم
مسیحا رشک ے دارد بہ درمانے کہ من دارم
خدا دارم دلِ بریاں زعشقِ مصطفے دارم
ندارد ہیچ کافر سازو سامانے کہ من دارم

مولانارومیؒ نے مثنوی میں کہا ہے:

فضل ہائے ناکشادہ ماندہ بود
از کف انا فتحنا برکشود
ختمہائے کانبیاء بگذاشتند
آں بدینِ احمدی برداشتند
بہر ایں خاتم شدہ است او کہ بجود
مثل او نے بود ونے خواہند بود
در کشاد ختمہا تو خاتمے
در جہانِ روح بخشاں خاتمے

ترجمہ: کمالات کے دروازے جو ابھی تک بند تھے، وہ صاحب انا فتحنا کے ہاتھ سے کھل گئے۔

انبیاء سابقین جو کمالات چھوڑ گئے تھے، وہ دین احمدی نے مکمل کئے۔

کمالات کے فیض پہنچانے اور دوسروں کو باکمال بنانے کی جو آخری شان آپ کے اندر تھی اس کی مثل نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ پیدا ہوگا۔

آپ کمالات کا دروازہ کھولنے میں بھی خاتم آخری ہیں، اور عروج اور روحانیت عطاء کرنے میں بھی آخری ہیں۔

اقبال مرحوم نے کہا ہے:

رُخِ مصطفے ہے وہ آئینہ کہ نہیں دوسرا آئینہ
نہ نگاہِ آئینہ ساز میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

مسٹر مائیکل ہارٹ کا تجزیہ!

یہ بات حضور اکرم ﷺ کے عظیم معجزہ سے کم نہیں ہے کہ موجودہ تعصب و تنگ نظری

کے دور میں ایک بڑا یورپین مؤرخ دنیا کے سو بڑے رہنماؤں میں رسول پاک ﷺ کو اول مقام و مرتبہ دے۔

مائیکل ایک عیسائی مؤرخ ہے، وہ حضور ﷺ کی صفت رسالت سے قطع نظر آپ کو ایک عظیم مدبر، ریفارمر، رہنما اور قائد کے طور پر پیش کرتا ہے اور اسلام اور قرآن کریم کو آپ کی ذاتی تعلیمات اور ذاتی علم و فکر کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

مائیکل کی یہ بنیادی گمراہی ہے لیکن وہ حضور ﷺ کو تمام رسولوں، سیاسی مفکروں اور حکمرانوں کے مقابلہ میں اولیت دینے کے بعد لکھتا ہے:

"شروع میں یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ عیسائیوں کی تعداد دنیا میں مسلمانوں سے دگنی ہے لیکن محمد ﷺ کو درجہ بندی میں عیسیٰ سے پہلے رکھا گیا ہے"

اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ محمد ﷺ نے اسلام کی نشو و نما و ترقی میں جو کردار ادا کیا وہ عیسیٰؑ کے اس کردار سے کہیں زیادہ اہم ہے جو انہوں نے نصرانیت کے لئے کیا۔ اگر چہ عیسیٰؑ نے نصرانیت کے اخلاقی قوانین وضع کئے جو یہودیت سے مختلف تھے لیکن یہ پولوس تھا جس نے نصرانی مذہب کی نشو و نما اور اس کی توسیع میں نمایاں کردار ادا کیا اور جو بائیبل کے بڑے حصے کا مصنف بھی ہے۔

خالص مذہبی سطح پر محمد ﷺ انسانی تاریخ میں اتنے ہی بااثر نظر آتے ہیں جتنے عیسیٰؑ لیکن محمدؐ عیسیٰؑ کے برعکس صرف دینی ہی نہیں بلکہ دنیوی رہنما بھی تھے۔

مختصر یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ساتویں صدی کی عرب فتوحات انسانی تاریخ میں عہد حاضر تک مسلسل اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

یہ مذہبی اور دنیوی اتحاد کے اثرات ہیں جن کی نظیر نہیں اور جو میرے خیال میں محمد کو انسانی تاریخ کی موثر ترین ہستی ہونے کا مستحق ثابت کرتی ہے۔

ایک طرف بعض مسلم مفکر (امین احسن اصلاحی و حیدالدین خاں) یہ اعلان کر رہے ہیں کہ رسول پاک ﷺ کو تمام رسولوں میں مطلق اور بہم وجوہ فضیلت اور برتری حاصل نہیں اور دوسری طرف یورپ کے اس مورخ کا یہ اعلان ہے جو اوپر گذرا۔

(۷) حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ حجب التوبة عن کل صاحب بدعة (مجمع الزوائد ج۱۰ص ۱۸۹)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ہر اہل بدعت پر توبہ کا دروازہ بند کردیا ہے

توبہ کا دروازہ کن پر بند ہوتا ہے؟ انہی لوگوں پر جو گناہ کو گناہ نہ سمجھے بلکہ گناہ کو نیکی اور ثواب جانے جو شخص گناہ کو گناہ سمجھے تو امید ہوتی ہے کہ وہ ایک دن اس گناہ سے توبہ کرلے گا مگر جو شخص گناہ کو گناہ ہی نہ جانے اس سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ اس سے توبہ کرے گا اس پر مستزاد یہ کہ کسی گناہ کو نیکی سمجھنے والے سے یہ امید رکھنی عبث ہے کہ وہ اپنے اس عمل سے توبہ کرے گا۔ بھلا نیکی سے بھی کوئی توبہ کیا کرتا ہے۔ علماء لکھتے ہیں کہ بدعت بڑا گناہ ہے اور گناہ پر اصرار کرنے والے کے لئے سوئے خاتمہ کا اندیشہ ہے جس کا معنی یہ ہے کہ جب موت کے وقت حقیقت کا پردہ اٹھے گا اور عالم آخرت کے سارے احوال اس کے سامنے آئیں گے تو شیطان کے لئے یہ بہت آسان ہوگا کہ اسے وسوسہ دیکر اس پر پوری طرح غلبہ حاصل کرلے اور اسے اس طرح اپنے قابو میں کرلے کہ وہ بے ایمان ہوکر دنیا سے جائے۔ عارف باللہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

بدعت از معصیت بالاتر است و کفر از بدعت بالاتر بدعت بکفر نزدیک است

(فوائد الفواد ص ۱۰۹)

بدعت کا درجہ معصیت سے بھی اوپر ہے اور کفر بدعت سے اوپر تاہم بدعت کفر کے بہت نزدیک ہے۔ جس طرح کافر اپنے کفر کو کفر نہیں سمجھتا بلکہ اسی کو حق سمجھتا ہے اسی طرح بدعت پر عمل کرنے والا بدعت کو معصیت نہیں جانتا بلکہ اسے نیکی اور ثواب سمجھ کر عمل کرتا ہے ظاہر ہے کہ جو شخص کسی بات اور عمل کو حق سمجھے یا اسے نیکی جانے وہ کب اس سے توبہ کرے گا اس لئے

عارفین فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کے سوئے خاتمہ کا خطرہ ہے۔ حضرت علامہ شاطبی لکھتے ہیں:

لان المبتدع مع كونه مصرا على مانهى عنه يزيدعلى المصرمعارض للشريعةبعقله غير مسلم لها فى تحصيل امره معتقدا فى المعصية انها طاعة حيث حسن ما قبحه الشارع وفى الطاعة انها لاتكون طاعة الا بضميمه نظره فهو قد قبح ما حسنه الشارع ومن كان هكذا فحقيق با لقرب من سوء الخاتمة الاماشاء الله (الاعتصام ج ا ص ۹۴)

بدعتی باجودیکہ اس بات پر مصر ہے جس سے اللہ نے روکا ہے اس شخص سے آگے ہے جو اپنے گناہوں پر عقل سے عمل پیرا ہے اور تحصیل امر میں اس کا قائل نہیں۔ لیکن وہ بدعتی گناہ کو نیکی اور طاعت سمجھ کر عمل میں لا رہا ہے جس چیز کو شارع علیہ السلام نے برا جانا اسے (یہ بدعتی) اچھا کہہ رہا ہے اور اپنی بات کو نیکی سمجھنے والا ہے اور اس چیز کو برا سمجھ رہا ہے جسے شارع نے اچھا کہا ہے اور جس کا یہ حال ہو تو وہ سوئے خاتمہ کے بہت ہی قریب ہے مگر جسے اللہ بچالے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو شخص گناہ کو نیکی سمجھ کر عمل میں لاتا ہے اور بدعت کو کار خیر اور ثواب جان کر اسے پھیلا رہا ہے وہ پوری طرح شیطان کے قابو میں آچکا ہے۔ شیطان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ ایک مسلمان اس جہاں سے بے ایمان اور بے توبہ جائے (معاذ اللہ) اسی لئے شیطان کو گناہ کی بہ نسبت بدعات زیادہ محبوب ہیں کہ اس میں توبہ کی توفیق نہیں ملتی۔

حضرت امام سفیان ثوریؒ (۱۶۱ھ) فرماتے ہیں:

البدعة احب الى ابليس من المعصية. المعصية يتاب منها والبدعة لايتاب منها (شرح السنہ للبغوی ج ۱ ص ۲۱۶)

ابلیس کو گناہ کی بہ نسبت بدعت زیادہ پسند ہے کیونکہ گناہ سے توبہ سمجھنے کی وجہ سے توبہ کی جاتی ہے مگر بدعت ایسی گمراہی ہے کہ اس سے توبہ ہی نہیں کی جاتی کیونکہ اس کو گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔

جب کوئی شخص دنیا سے اس طرح جائے کہ نہ اسے بدعات سے توبہ کی توفیق ملے اور وہ پوری طرح شیطان کے قابو میں آچکا ہو تو وہاں اس کے چہرے پر بدعات کے اندھیرے اور اسکی سیاہی عام دیکھی جاسکے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(۸) يوم تبيض وجوه وتسود وجوه (پ ۴ آل عمران)

ترجمہ: جس دن کہ سفید ہوں گے بعضے چہرے اور سیاہ ہونگے بعضے چہرے
ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں
تبيض وجوه اهل السنة والجماعة وتسود وجوه اهل البدع والض
(تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۱۴۰۹ تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۹۰ البدور السافرہ فی احوال الآخرہ للسیوطی ص ۲۰
ترجمہ: اس دن اہل سنت والجماعت کے چہرے روشن ہونگے اور اہل بدعت وضلال
چہرے سیاہ ہونگے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سنت اور آپ کا طریقہ نورا؛
سے معمور ہے آپ جو دین لے کر آئے اور آپ ہمیں جس دین پر گامزن فرماگئے اسکی را
بھی روشن ہیں وایم الله لقد تركتم على مثل البيضاء ليلها ونهارها سواء (سنن
ماجہ ص ۲) اب جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا پابند اور اس کا عامل ہوگا آخر
کے میدان میں اس کا چہرہ منور اور روشن ہوگا مگر جن لوگوں نے بدعت پیدا کی ہوگی اور ا
پھیلانے میں محنت کی ہوگی ان کے چہرے انتہائی سیاہ ہونگے اس لئے کہ بدعات میں۔
اور اندھیروں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اکابرین امت نے بدعات کی دنیا بہت ہی سیاہ بتلائی
اور ہمیشہ اپنے متوسلین کو اس سے بچانے کی سعی بلیغ فرمائی ہے۔ حضرت مجدد الف
(۱۰۳۵ھ) کے مکتوبات میں جابجا بدعات کو اندھیرے اور سیاہی کہا گیا ہے اور سنت کو ا
درخشاں ستارہ فرمایا ہے آپ سنت مطہرہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔
وسنت را در رنگ کوکب درخشاں می نمائد در شب دیجور ضلالت ہدایت می فرمائ
(دفتر دوم ۲۳ ص
سنت ایک درخشاں ستارے کے رنگ میں نظر آتی ہے جو گمراہی کی اندھیری رات
راستہ دکھاتی ہے۔ آپ بدعات کے بارے میں لکھتے ہیں:
یہ فقیر ان بدعات میں سے کسی بدعت میں حسن اور نورانیت نہیں دیکھتا ان میں ظلم
اور کدورت کے سوا کچھ محسوس نہیں کرتا۔ (مکتوبات دفتر اول ص ۲۱۰)
آپ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:
یہ فقیر اس مسئلہ میں ان سے اتفاق نہیں کرتا اور بدعت کے کسی فرد کو حسنہ نہیں جانتہ
سوائے ظلمت وکدورت کے اس میں کچھ محسوس نہیں کرتا (مکتوبات دفتر ۲ ص ۶۵)
آپ اکابرین کی کتابیں ان کے ملفوظات اور مکتوبات کا مطالعہ فرمائیں تو آپ دیکھیں

کہ ان بزرگوں نے ہمیشہ بدعات کو اندھیرے کہا اور اس سے مسلمانوں کو دور رہنے کی تاکید کی۔ تاکہ قیامت کے دن چہرے کی سیاہی سے حفاظت ہو۔ جو لوگ بدعات کے قمقمے اور اسکی روشنیاں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ سب اس کے ظاہر ہیں اصل یہ ہی ہے کہ اہل بدعت اپنے چہرے پر سیاہی کا داغ لئے میدان آخرت میں کھڑے ہونگے وہاں دنیا کے قمقمے اور اس کی یہ روشنیاں ہرگز کام آنے والی نہیں۔

(۹) قیامت کے دن جنکے چہرے سیاہ ہونگے اور بدعات کے اندھیرے ہر طرف سے لپک رہے ہوں گے انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب جانے سے بھی روک دیا جائے گا یہ لوگ آب کوثر پینے کے لئے آگے آئیں گے مگر انہیں دور ہی سے دھتکار دیا جائیگا۔ آنحضرت ﷺ ان سیاہ چہروں کو دیکھ کر فرمائیں گے سحقا سحقا میری نظروں سے دور ہو جاؤ مجھ سے دور ہو جاؤ (شرح صحیح مسلم ج۱ ص۱۲۶) تم نے میری روشن سنتوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی اور اسے مٹانے کی مذموم سعی کی تھی سو میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ کون ہونگے۔ وہی جنہوں نے دین میں بدعات پیدا کی ہونگی۔ آنحضرت ﷺ ان کی شفاعت نہیں فرمائیں گے۔ حدیث میں ہے:

ان النبی ﷺ قال حلت شفاعتی لامتی الاصاحب بدعة (البدع والنہی عنہا ص۳۶ الاعتصام ج۱ ص۸۹)

ترجمہ: آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شفاعت میری امت کے لئے ثابت ہوگی مگر اہل بدعت کے لئے نہیں۔

(۱۰) جو لوگ دین میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔ آنحضرت ﷺ پر تبلیغ رسالت کی ادائیگی میں خیانت کا الزام تک لگانے سے باز نہ آئے۔ جنہوں نے دین میں بدعات پیدا کر کے تکمیل دین کا انکار کیا اور پوری زندگی اس کوشش میں لگے رہے جس طرح بھی بن پڑے آنحضرت ﷺ کی سنتوں کو مٹادیا جائے۔ جو اس دنیا سے بے توبہ اور (بسا اوقات بے ایمان) گئے۔ میدان آخرت میں جنکے چہرے انتہائی سیاہ ہوں گے جنہیں آنحضرت ﷺ کی شفاعت سے محروم کر کے آپ سے دور ہو جانے کا حکم ہوگا وہ اہل بدعت ہی ہونگے اور آخر کار جس انجام کو وہ دیکھیں گے وہ بڑا ہی عبرتناک ہوگا۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

اصحاب البدع کلاب اهل النار (جامع صغیر ج ۱ ص ۷۰)

ترجمہ : اہل بدعت جہنمیوں کے کتے ہیں۔

جناب مولانا احمد رضاخان صاحب بریلوی نے فتاویٰ افریقہ میں یہ حدیث ابوامامہؓ باہلی سے نقل کی ہے اور اسے تسلیم کیا ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بدعت کا نقصان کس قدر بڑا اور عبرتناک ہے۔ ہم اس وقت بدعت اور اہل بدعت کی مذمت میں صحابہ کرامؓ اور اولیاء عظام کے ارشادات نقل نہیں کر رہے ان کے ارشادات کو دیکھنے والا اور ان سے محبت رکھنے والا کبھی بدعات کی دلدل میں گرنے کی کوشش نہیں کرے گا اور نہ کسی بدعتی کے قریب جائے گا۔ تاہم یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ آنحضرت ﷺ سے محبت کرنے والا اور آپ کی اتباع کرنے والا ایک ایک فرد بدعت کے خلاف دہائی دے رہا ہے اور اسے ایک عظیم فتنہ بتارہا ہے۔ اس سے صرف افراد نہیں مرتے بلکہ قومیں تباہی کے دہانے آکھڑی ہو جاتی ہیں۔ جس معاشرے سے سنت کی بنیاد اکھاڑنے کی راہیں ہموار ہوں آپ ہی سوچیں اس قوم کی نئی نسل کو یہ کیسے علم ہوگا کہ زندگی کے کس دائرے میں آنحضرت ﷺ کا اسوۂ حسنہ کیا تھا آپ کے صحابہ نے کون سی راہ اختیار کی تھی اور امت کس عمل کو سنت سمجھتی تھی۔ مسلمانوں کی نئی نسل بدعات ہی کو سنت سمجھے گی اور اسے دین کا اہم رکن قرار دے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حقیقی دین رخصت ہو جائے گا اور اسکی جگہ یہ مصنوعی دین ہوگا۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نئی نسل صحیح دین پر قائم رہے اور آنحضرت ﷺ کی سنت پر عمل کر کے دنیا اور آخرت کی کامیابی پائے تو ہمیں چاہیئے کہ سنت کے پیغام کو عام کریں۔ زندگی کے ہر موڑ پر اگر آپ سنت کا چراغ جلائیں گے تو بدعات کے یہ اندھیرے خود بخود چھٹ جائیں گے۔ بدعات سے نفرت دلانے کی راہ یہی ہے کہ سنت سے محبت کی تلقین ہو اور اس پر عمل کی تاکید ہو۔ اگر آپ کسی بدعت کو سنت اور دینی کام کہنے والے کی حوصلہ افزائی نہ کریں اور کسی اہل بدعت کو اہل سنت کا نام نہ دیں تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ بدعت اپنی موت مر جائیگی اور اہل بدعت کو کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ ملے گی لیکن اگر آپ نے ہی بدعت کو سنت کہنا شروع کر دیا اور ہر اہل بدعت کو اہل سنت سمجھنا اور سمجھانے کا مشغلہ اپنا لیا تو یاد رکھئے آپ بھی افتراء علی الرسول کے مجرم ٹھہریں گے اور آپ بھی دین کی عمارت منہدم کرنے والوں میں سے سمجھے جائیں گے اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ کیا یہ کچھ کم نقصان ہے؟
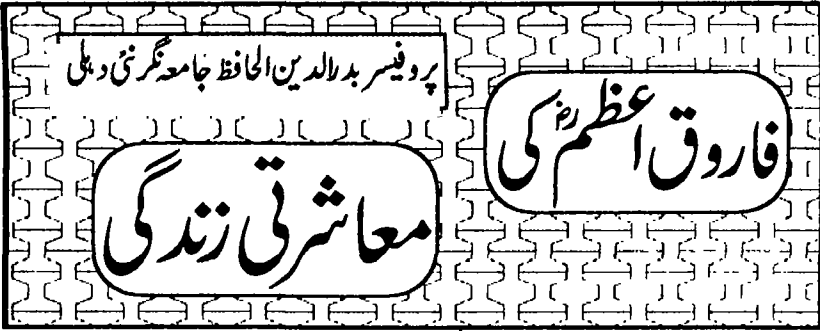
حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ ایسا شخص جس کے نام سے قیصر و کسریٰ لرزتے تھے، بڑے بڑے سلاطین کے ہوش گم ہو جاتے تھے، خود اس کی رہائش، لباس اور فقیرانہ غذا کا حال یہ تھا کہ وہ اگر کسی عورت کو نکاح کا پیغام دیتا تو وہ ان کے فقر اور تنگ دستی کی زندگی سے خوف کھا کر انکار کر دیتی، باوجودیکہ ان کی عظمت دینداری عدل و انصاف اور رعب و دبدبہ کا سب کو اعتراف تھا مگر ان کی فقیرانہ زندگی سے سب ششدر و حیران تھے۔ ایک خاتون اُم ابان بنت عتبہ کہتی ہیں کہ عمر ایسا انسان ہے جس کو آخرت کے معاملہ نے دنیاوی معاملات سے بالکل غافل اور مدہوش کر دیا ہے گویا کہ وہ اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہاں متنبی کا مبالغہ آمیز شعر بالکل صادق آتا ہے جیسا کہ اس نے کہا ہے ؎

تجاوزت مقدار الشجاعة والنهی الی قول قوم انت بالغیب عالم

تو نے بہادری اور عقلمندی کی تمام حدود کو پار کر لیا ہے، اس قوم کے قول کے مطابق کہ تو غیب کا جاننے والا ہے۔ یہاں مبالغہ کی تشبیہ اس معاملہ میں ہے کہ حضرت عمرؓ کا زہد و تقویٰ اس حد تک پہونچ چکا تھا گویا انھوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کر لیا ہو۔
ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی صاحبزادی ام کلثومؓ کو نکاح کا پیغام دیا۔ یہ حضرت عائشہؓ کی بہن تھیں لہذا انہی کی معرفت بات ہوئی حضرت عائشہؓ نے ان سے تو کہدیا جیسا آپ چاہیں، اسکے بعد بہن سے پوچھا اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر حضرت عائشہؓ کو غصہ آیا اور ڈانٹ کر کہا تو امیر المؤمنین کے عندیہ سے گریز کر رہی ہے، اس نے صاف کہدیا مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ عورتوں کے معاملہ میں انتہائی سخت کھردری زندگی والے ہیں۔ اس پر حضرت عائشہؓ کو تشویش ہوئی کہ فاروق اعظم کو انکار میں کیسے جواب دیں، چنانچہ انھوں نے مسئلہ کو نرمی سے ختم کرنے کے لئے حضرت عمرو بن العاصؓ کو واسطہ بنایا اور

کہا کہ حضرت عمرؓ کو نرمی سے سمجھا بجھا کر اُم کلثوم کے انکار سے مطلع کریں۔ حضرت عمرو بن العاصؓ ان کے پاس پہونچے اور کہا کہ مجھے ایسی خبر ملی ہے کہ میں تمہارے لئے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کیا؟ فرمایا کیا تم نے اُم کلثوم بنت ابو بکرؓ کا پیام دیا تھا وہ بولے ہاں کیا تم مجھے اس کے لئے مناسب نہیں سمجھتے یا اسے مناسب نہیں سمجھتے، انھوں نے کہا بات اصل یہ ہے کہ وہ ایک نوخیز دوشیزہ ہے اور امیرالمؤمنین حضرت ابو بکرؓ کے سایہ عاطفت میں پلی ہے اور آپ کے اندر شدید سختی ہے یہاں تک کہ ہم آپ سے خوف کھاتے ہیں تو اس لڑکی نے اگر آپ کے رشتہ کی مخالفت کی ہے تو کیا بعید ہے، اور پھر آپ تو ابو بکرؓ صدیق کے جانشین ہیں ان کی اولاد کے معاملہ میں بھی سرپرست کی حیثیت رکھتے ہیں اب فاروق اعظم سمجھ گئے کہ عمرو بن العاص کی وساطت کے پیچھے کوئی ضرور ہے اس لئے آپ نے فرمایا اچھا تو حضرت عائشہ کا کیا خیال ہے تم نے ان سے بات کی ہوگی، حضرت ابن العاص بولے ہاں میں ان کی طرف سے ہی آیا ہوں۔

اس موقع پر ذہن میں یہ سوال آسکتا ہے کہ ایک عورت نے فاروق اعظمؓ کے خشونت مزاج کے باعث ان کے ساتھ ازدواجی رشتہ قائم کرنے سے انکار کردیا۔ کیا یہ ایک طرح کا عیب نہیں ہے؟ مگر فلسفہ اخلاق کے طالب علم اس کی گہرائی پر نظر ڈالیں تو اس میں عیب جوئی کی گنجائش نہیں رہے گی، کیونکہ طبائع انسانی میں فطرتاً کچھ نہ کچھ تو فرق ہوتا ہے اس لئے خصلتیں مختلف ہوتی ہیں مگر خشونت کو صرف عیب سے نہیں جوڑا جاسکتا چاہے نرمی اور شائستگی سے قدرے دور کیا جائے مگر پھر بھی یہ نرمی اور نیک طبعی یا رحم وکرم کی ضد نہیں ہے چنانچہ جابجا فاروق اعظم کی زندگی آپ کے اقوال وخطبات میں اس کی مثالیں ملیں گی جن میں حضرت عمرؓ محض ایک رحیم وکریم لطیف وشفیق کسی کی بدحالی اور مصیبت پر آنسو بہانے والے ہی نظر آئیں گے۔ تو جب یہ امر محقق ہوگیا کہ خشونت یا سختی عطوفت اور رحمت کی مخالف نہیں تو یہ بات بھی طے ہے کہ فاروق اعظم ایسی منفرد اور یکتا شخصیت کے مالک تھے جن میں یہی حقیقت اپنی اعلیٰ شان کے ساتھ نمایاں اور واضح تھی یہاں تک کہ خود ان کے اہل وعیال اور خواتین کے معاملہ میں بھی یہی حال تھا۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ فاروق اعظم کا رحم وکرم یا نرمی وملاطفت ایک غلاف میں پوشیدہ تھے جس کو ہر نگاہ کے لئے دیکھنا ممکن نہ تھا سوائے اس شخص کے جس کو ان کی صحبت اور معاشرت کا موقعہ ملا ہو۔ اس کی مثال ہمیں ان کی ازواج میں عاصیہ نامی خاتون میں ملے گی، جس کا نام حضور نے بدل کر جمیلہ رکھدیا تھا، ان کا معمول یہ تھا کہ کبھی شوہر سے دوری گوارہ نہ کرتیں اور جب کبھی

فاروق اعظمؓ باہر تشریف لے جاتے تو انھیں چومتی پیار کرتیں اور واپسی تک بے چینی سے منتظر رہتیں۔ ان کی دوسری بیوی عاتکہ بنت زید نہایت حسین و جمیل دیندار اور بلیغ ادب سے اچھی واقفیت رکھنے والی خاتون تھیں، جب فاروق اعظمؓ شہید کردئے گئے تو دوسری خواتین کی طرح یہ بھی گریہ وزاری سے بے جان ہوگئی تھیں اور درد بھرے قصائد میں اپنے غمناک تاثرات بیان کئے۔

یالیلة حبست علی نجومها فسهرقها والشامتون هجود

قدكان يسهرفي حذارك مرة فاليوم حق لعيني التسهيد

ترجمہ: اے وہ شب کہ جس کے ستاروں کو مجھ پر مقید کردیا گیا ہے، اور میں اس میں جاگ رہی ہوں اس حال میں کہ طعنہ زنی کرنے والے گہری نیند میں محو خواب ہیں۔

ایک زمانہ وہ تھا جب تمہاری (داروگیر) کا خوف مجھے بیدار رکھتا تھا اور آج نہایت نرم بن جانا آنکھوں کا حق ہوگیا ہے۔

اس طرح کے اشعار صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کو فاروق اعظمؓ کی ظاہری خشونت کے پس پردہ رحم و کرم اور لطف و مہربانی کے اوصاف حمیدہ سے بہرہ ور ہونے کا موقعہ نصیب ہوا ہو۔

پھر یہاں ایک مسئلہ غیرت کا بھی ہے کہ حضرت عمرؓ عورتوں کے معاملہ میں ایک حد تک غیرت بھی رکھتے تھے جو خواتین میں ان کی شدت بن کر مشہور ہوئی۔ اور یہ کوئی عیب نہیں تھا، آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: إن الله غيور يحب الغيور۔ اللہ تعالیٰ غیور ہے اور غیور کو پسند فرماتا ہے، اسی کی روشنی میں فاروق اعظمؓ بھی غیور تھے۔ اس کے علاوہ فاروق اعظمؓ کو خواتین سے اس لئے بھی قدرے گریز تھا کہ ان کی چال ڈھال عام طور پر نگاہوں کے لئے فتنہ سامانی بن کر نمایاں ہوتی ہے اس لئے آپ نے نوخیز عورتوں کی فتنہ انگیزی سے بچنے اور ہوشیار رہنے کے لئے فرمایا، عليكم بالأبكار. اس کے علاوہ آپ نے فرمایا عليكم بهن لانهن اكثر حباً واقل خباً ۔ تم ان کی طرف سے بھی باخبر رہو کیونکہ ان میں محبت زیادہ اور مایوسی کم ہوتی ہے فاروق اعظمؓ کی نگاہ معمولی سے معمولی فتنہ کو بھی ابھرنے سے پہلے بھانپ لیتی تھی۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ عرب لوگ عجمی عورتوں سے شادیاں کرنے کی طرف راغب ہورہے ہیں تو آپ نے فرمایا عجمی عورتوں میں نرم گفتاری کا فتنہ ہوتا ہے، اگر تم نے ان کی طرف توجہ دی تو وہ تمہاری عورتوں پر غلبہ حاصل کرلیں گی اور اس فتنہ

سے بچنا ہی لازم ہے۔ فاروق اعظمؓ کے رحیمانہ مزاج کا حال یہ تھا کہ آپ ہمیشہ اپنے والد محترم کا تذکرہ کرتے رہتے حالانکہ بچپن میں ان کے والد کا برتاؤ اچھا نہ تھا مگر ان کے نام کی قسم بھی کھاتے مگر جب حضورؐ نے منع فرمایا تو گریز کرنے لگے۔

بچوں کے ساتھ برتاؤ

آپ کا اپنے بچوں کے ساتھ بھی ایسا ہی رحیمانہ برتاؤ تھا۔ ایک بار آپ ایک والی کے لئے خط لکھوا رہے تھے کہ ایک بچہ آپ کی گود میں آگیا اور آپ اس کو پیار کرنے لگے یہ دیکھ کر اس شخص نے تعجب سے کہا یا امیر المؤمنین! آپ اس کو پیار کرتے ہیں میرے تو دس بچے ہیں میں نے نہ کبھی کسی کو پیار کیا نہ کسی کو قریب بلایا۔ آپ نے اس سے فرمایا تو میں کیا کرسکتا ہوں جب اللہ نے تیرے دل سے رحم و کرم کا جذبہ اٹھالیا ہے اور صرف یہی نہیں کیا بلکہ اس خط کو پھاڑ دینے کا حکم دیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں رحم کرنے والوں پر ہی رحم کرتا ہے، اور یہ شخص جب اپنی اولاد پر ہی رحم نہیں کرتا تو رعایا پر کیا رحم کرے گا، ایک شخص کلاب بن امیہ کنانی غزوہ میں گیا ہوا تھا اور اس کا بوڑھا باپ بیٹے کی جدائی سے بہت مغموم تھا اس کی خبر حضرت عمرؓ کو پہونچی تو آپ نے اسلامی فوج کے کمانڈر کو خط لکھ کر کلاب کو بلوالیا اور اس سے معلوم کیا کہ تم اپنے والد کے ساتھ کس طرح پیش آتے ہو تمہارا ان کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ ہے، اس پر اس نے کہا میں ان کی فرمانبرداری کرتا ہوں اور ان کے دودھ کے لئے اونٹنی کو صحت مند رکھتا ہوں اس کی پوری دیکھ بھال کرتا ہوں پھر تھن دھو کر دودھ نکالتا ہوں اور والد صاحب کو پلاتا ہوں۔ حضرت عمر اس کو لے کر باپ کے پاس پہونچے اور خیر و عافیت معلوم کی مگر یہ نہیں بتایا کہ کلاب آگیا ہے، تھوڑی دیر میں بیٹا اپنے باپ کے لئے دودھ لایا اور دیا تو وہ کہنے لگے یا امیر المؤمنین اس برتن سے تو کلاب کی خوشبو آرہی ہے، امیر المؤمنین نے کہا ہاں لیجئے یہ آپ کا بیٹا کلاب موجود ہے بس دونوں لپٹ گئے باپ نے پیار کیا اور حضرت عمرؓ نے کلاب کو حکم دیا کہ تم اپنے باپ کی خدمت کرو جب تک یہ حیات ہیں اور تمہیں گھر میں رہتے ہوئے بھی مجاہد کا درجہ دیا جائیگا۔

بچوں پر آپ کس قدر مہربان اور مشفق تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے ایک مرتبہ کچھ بچے کھجور کے باغ میں کھیل رہے تھے اور زمین پر پڑی ہوئی کھجوریں اٹھا رہے تھے

اتنے میں کہیں سے حضرت عمرؓ آ نکلے بچوں نے دیکھا توسب مارے ڈر کے بھاگ گئے مگر سنان بن سلمہ نامی لڑکا بھاگا نہیں بلکہ وہیں رکا رہا اور اس کی گود میں کچھ کھجوریں تھیں، وہ جلدی سے فاروق اعظم کی طرف آیا اور کہنے لگا امیرالمؤمنین یہ کھجوریں ہوا سے نیچے گر گئی تھیں آپ نے فرمایا لاؤ مجھے دکھاؤ اس نے بغیر کسی ڈر خوف کے دکھایا تو آپ نے فرمایا ہاں تم نے سچ کہا اس کے بعد بچہ کی ہمت بڑھی اور کہنے لگا آپ مجھے گھر تک حفاظت سے پہنچادیں ورنہ یہ بھاگنے والے بچے میری کھجوریں چھین لیں گے، حضرت عمرؓ نے اسے گھر تک پہونچایا جاہلی دور میں بچیوں کو زندہ دفن کرنے کا رواج تھا اور یہ گناہ حضرت عمرؓ سے بھی سرزد ہوا۔ ایک مرتبہ آپ اپنے ساتھیوں میں بیٹھے تھے کہ اچانک آپ مسکرائے اور پھر رونے لگے اس پر حاضرین نے سوال کیا تو آپ نے فرمایا میں اس لئے ہنسا کہ جاہلی دور میں ہم لوگ عجوہ کھجور کا بُت بنایا کرتے تھے اسے پوجتے تھے اور پھر کھالیتے تھے۔ اس کے بعد میں رویا اس لئے کہ میری ایک بھولی سی لڑکی تھی میں اسے زندہ درگور کرنے کے ارادہ سے قبر کھود رہا تھا تو وہ میری داڑھی سے مٹی جھاڑ رہی تھی اور میں نے اسے دفن کردیا۔ ان واقعات سے حضرت عمرؓ کی رحم دلی کی مثالیں تو نظر آتی ہی ہیں مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی رسم عام تھی نہ ہی خطاب خاندان میں یہ رسم عام تھی ورنہ فاطمہ حضرت عمر کی بہن اور سب سے بڑی صاحبزادی حضرت حفصہ کیسے زندہ رہتیں جب کہ یہ تو بعثت اسلامی سے ۵/ سال قبل پیدا ہوئی تھیں، اور انھیں کے نام پر آپ ابوحفص کہلائے مگر بچی کو دفن کرنے کی روایت کیسے مشہور ہوئی یہ خلاف قیاس ہے کیونکہ اس کی تصدیق حضرت عمرؓ کی اولاد یا خاندان کے کسی فرد سے نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ حرکت حضرت عمرؓ کی فطری سیرت واخلاق سے میل کھاتی ہے، حضرت عمرؓ کو تو اپنی اولاد کے علاوہ اپنے بھائی زید سے بھی غایت درجہ محبت تھی اور آپ نے ان کی وفات پر بڑا دردناک مرثیہ کہا۔

پھر جو دوست احباب کا جہاں تک تعلق ہے آپ نے فرمایا: **لقاء الاخوان جلاء الاحزان** بھائیوں کی ملاقات غموں کا دور کرنا ہے، باہم محبت کے لئے آپ نے فرمایا: **إذا اصاب أحدكم وُدًا من أخيه فيلستمسك به فقلمايصيب ذلك**، جب تمہیں اپنے بھائی کی طرف سے محبت ملے تو اسے مضبوطی سے پکڑلو، کیونکہ وہ بہت کم نصیب ہوتی ہے۔

ان حقائق اور شواہد کی روشنی میں ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اس بارعب پرہیبت شخصیت

کی ظاہری علامتوں کے زیر سایہ الفت و محبت اور رحم و کرم کے کیسے چشمے پھوٹ رہے تھے جن کا ظاہر سے مشاہدہ مشکل تھا، مگر اندر وہ سب کچھ تھا جس کو ہم حلاوت و مروت محبت وشفقت کا بحر بے کنار کہہ سکتے ہیں۔

اپنی نگہبانی

اس عجیب و غریب شخصیت کو ہم کیا نام دیں جو خود اپنے نفس کا نگہبان بھی تھا اور دوسروں کو بیدار رکھنے والا بھی۔ وہ نفس کی طرف آنے والے بیرونی دراندازوں سے بھی بخوبی واقف تھا اور ان کا دفاع کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا تھا، اسے نہ عیش و عشرت کی تابانی چکا چوند کرسکتی تھی نہ زبان کی لذت رغبت کے جال میں مقید کرسکتی تھی نہ خوش لباسی کا بہلاوہ اسے مائل کرنے میں کامیابی حاصل کرسکتا تھا، وہ دنیا کی بے پناہ لذتوں سے باخبر ہوتے بھی بے خبر تھا اور ہر حال میں صراط مستقیم پر گامزن رہنے والا ایک مرد آہن، وہ اپنے اہل و عیال کی معاشی سہولیات کے ذرائع اور وسائل سے بھی چوکنا رہتا تھا کہ کس کو کہاں سے کیا حاصل ہو رہا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری اولاد کے اونٹوں کی فربہی اور تندرستی عوام کی نگاہوں میں کانٹا بن جائے یا ان کی بے چارگی کا بہانہ۔

فاروق اعظمؓ کی دربار میں خواتین کے لئے انصاف :۔

آپ جہاں خواتین کی خیر اور شر دونوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرتے تھے وہاں عورتوں کی نفسیات اور ضروریات، ان پر ظلم وستم یا بے چارگی کی بھی پوری نگہبانی فرماتے، ایک مرتبہ آپ نے ایک اعرابیہ کو مندرجہ ذیل اشعار پڑھتے ہوئے سنا۔

فمنهن من تسقى بعذب مبرد
نقاخ فتلكم عند ذلك قرت
ومنهن من تسقى بأخضر آجن
رجاج ولولا خشية الله فرت

ترجمہ : ان خواتین میں سے بعض وہ ہیں جو ٹھنڈے میٹھے خالص پانی سے سیرابی حاصل کرتی ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو میلا گندہ کڑوا پانی پیتی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر خدا کا خوف نہ

ہوتا تو راہ فرار اختیار کر لیتی۔

فاروق اعظمؓ نے سمجھ لیا کہ اس کے شوہر میں کچھ عیب ہے، آپ نے اس کو بلا بھیجا اور دیکھا تو واقعی اس کا چہرہ کچھ بگڑا ہوا تھا چنانچہ آپ نے اس کو پانچ سو درہم دے کر طلاق دلوادی۔

ایک عورت کو دروازہ کے پیچھے گاتے ہوئے سنا ۔

تطاول هذا الليل تسرى كواكبه وارقنى ألا خليل الاعبه

فوالله لولا الله لاشئی غيره لزلزل من هذا سرير جوانبه

ترجمہ: رات کس قدر طویل ہو چکی ہے اور اپنے ستاروں کو چلا رہی ہے۔ اور مجھے اس بات نے بیدار کر رکھا ہے کہ میرا کوئی دوست ہی نہیں ہے جس سے میں کھیلوں ۔

خدا کی قسم اگر خوفِ خدا نہ ہوتا اس کے علاوہ کسی اور کی فکر نہیں تو اس چارپائی کے کناروں میں حرکت ہوتی۔

یہ سن کر آپ نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ اس عورت کا شوہر عرصہ سے جنگ میں گیا ہوا ہے، آپ نے حکم دیا کہ شوہروں کو طویل مدت تک غزوہ میں نہ رکھا جائے۔

آپ خواتین کی شکایات پر پوری توجہ فرماتے اگر وہ اپنے شوہروں کے بارے میں بھی کچھ کہتیں تو اس کی تدبیر کرتے، بعض عورتیں مردوں کی صفائی ستھرائی کی شکایت کرتیں تو مردوں کو ہدایت فرماتے۔ آپ نے فرمایا: تحبين ان تتزينوا لهن كماتحبون ان يتزين لكم۔ خواتین بھی اس بات کو پسند کرتی ہیں کہ تم ان کے لئے زیب و زینت اختیار کرو جیسے تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے لئے مزین رہیں۔

ایک مرتبہ ایک عورت نے آپ سے شکایت کی اس کا شوہر خضاب لگاتا ہے اور عورت کو وہم میں ڈالتا ہے کہ وہ نوجوان ہے حالانکہ اس کے کھچڑی بال ہیں آپ نے اس شخص کو مارا اور کہا تو قوم کو دھوکہ میں ڈالتا ہے۔

آپ یہ بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ اگر کسی عورت سے کوئی غلطی ہوگئی ہے یا کسی بنا پر اسے حد لگائی گئی ہے یا کوئی شرعی سزا مل چکی ہے تو اس کے عیب کو عوام میں مشتہر کیا جائے۔ ایک عورت سے ایسا ہی جرم ہوا تھا کہ اس پر شرعی حد جاری کی گئی تھی، آپ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے سختی سے منع فرمایا کہ اب اس کے عیب کو ظاہر نہ کرو بلکہ پاکدامن عورتوں کی طرح اس کی شادی کرو۔

تحریک استشراق
ایک عہد بعہد جائزہ

مولوی محمد یوسف رامپوری رفیق شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

"تحریک استشراق" ایک مشہور و معروف تحریک ہے جس کی مقبولیت مشرق و مغرب دونوں جگہ یکساں ہے۔ عالم اسلام کے افراد "استشراق" اور "مستشرقین" جیسے الفاظ روز سنتا رہتا ہے کیونکہ اس تنظیم کا نشانہ خاص طور پر عالم اسلام ہی ہے۔ پھر تحریک اپنی عمر کے لحاظ سے بھی کافی قدیم ہے جو اپنے سفر کے دوران دنیائے اسلام کی فضاؤں میں حلول کرتی رہی ہے اور آج وہ ایک گونج بن گئی ہے مگر حیرت اس بات پر ہے کہ ایسی خطرناک، مشہور اور قدیم تحریک کے بارے میں صحیح علم خال خال ہی لوگوں کو ہے، حالانکہ عالم اسلام کے ہر فرد کو اس تحریک کے مقاصد، طریقۂ کار، اسکے منصوبوں اور ارادوں کی معلومات ہونی چاہئے تھیں نیز اسکی عمر، اس کے بدلتے ہوئے اسالیب اور طریقے، اسکے ارتقاء کے مختلف ادوار کا علم اشد ضروری ہے کیونکہ یہ تحریک بہر حال ایک خطرناک تحریک ہے جس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں، اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہے، اس نے ہر زمانہ میں اسلام کی بیخ کنی کے لئے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہے اور بدقسمتی سے ایسے ایک حصہ تک کامیابی بھی ملی ہے دراصل جس اسلوب سے وہ اپنا کام انجام دیتی ہے وہ اسلوب اتنا دلچسپ، حیرت انگیز اور متنوع ہوتا ہے کہ عام مسلمان اسکے پس پردہ مخفی مقاصد کو سمجھ ہی نہیں پاتے اور اس سے متأثر ہو جاتے ہیں اور آج تو استشراقی اسکالرس کا رعب و دبدبہ اسلامی محققین پر اتنا چھا گیا ہے کہ وہ اپنی ریسرچ و تحقیق کے دوران انہیں کی کتابوں کے طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب کہ انہیں ان کے خیال ورجحان اور انکی اسلام دشمنی سے کوئی خاص واقفیت نہیں ہوتی۔ ایسے حالات میں "تحریک استشراق" اسلام اور اہل اسلام کے لئے اور زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے۔ مگر افسوس اتنی خطرناک تنظیم کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔ زیر نظر مقالہ میں نہایت اختصار کے

ساتھ اسکے وجود اور اسکی تاریخ کے مختلف ادوار کا تذکرہ کیا جارہا ہے جس میں حتی الامکان یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ اس تحریک کا عہد بعہد جائزہ لیتے ہوئے وہ پہلو بھی اجاگر ہو جائیں جن کا جاننا ہمارے لئے ضروری ہے۔

استشراق لغت واصطلاح کے آئینہ میں

جس کے معنی بتکلف مشرقی بننے کے ہیں لہذا "مستشرق" اس شخص کو کہیں گے جو بتکلف مشرقی بننے والا ہو۔

"مستشرق" لفظ کی وضع زیادہ قدیم نہیں ہے بلکہ اس کا اسم مصدر "استشراق" بھی نیا ہے کیونکہ قدیم عربی لغات میں اس مادہ کا باب استفعال سرے سے مفقود ہے البتہ جدید عربی لغات میں اور جدید ایڈیشنوں میں یہ لفظ موجود ہے۔ مثال کے طور پر عربی کی ایک لغت "المنجد" ہے جو مشہور بھی ہے اور متداول بھی اس لغت کے قدیم ایڈیشنوں میں تو یہ لفظ موجود نہیں ہے تاہم جدید ایڈیشنوں میں یہ لفظ موجود ہے۔ "(المستشرق: العالم باللغات۔ والاداب والعلوم الشرقية) (یعنی مشرقی زبانوں، ادبیات اور علوم کا جاننے والا) لیکن یہ کہ کیا ہم مشرق سے وابستہ کسی ایسے عالم کو مستشرق کہہ سکتے ہیں؟ جو مشرقی علوم والسنہ سے واقفیت رکھتا ہو ظاہر ہے کہ مشرق کے غیر اسلامی علوم وفنون، غیر اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے عالم کو مستشرق نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ کوئی ہندومت، بدھ مت، جین دھرم، برج بھاشا، سنسکرت وغیرہ کے ان عیسائی یا یہودی اسکالروں کو جنکا تعلق مغرب سے ہے "مستشرق" نہیں کہتا، بلکہ "مستشرق" مغرب کے ان اسکالروں کو کہا جاتا ہے جو اسلام، اسلامی تہذیب، اسلامی معاشرت اور اسلامی زبانوں کے مطالعہ میں دلچسپی لینے والے ہوں یا لکھنے والے ہوں معلوم ہوا کہ مستشرق کا لفظ اصطلاحاً یا عرفاً مخصوص ہے۔ اس لحاظ سے مستشرق کی اصطلاحی یا عرفی تعریف یہ ہوگئی "مغرب سے وابستہ وہ یہودی اور عیسائی اسکالر جو "اسلامیات" کے مطالعہ یا لکھنے میں دلچسپی لیتے ہیں"۔

اس لفظ کو کس نے وضع کیا اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں کسی نے کہا کہ اس لفظ کے بانین خود مستشرقین ہیں اور کسی نے کہا کہ اس کے واضعین مسلمان ہیں۔ اس بحث

سے قطع نظر استشراق کی حقیقت اور اس کی تاریخ جن کی نظر میں ہے وہ تسلیم کریں گے
یہ نام ان کے لئے انتہائی موزوں ہے، خود یہ نام ان کا راز فاش کرتا ہے کہ ان کی اصلیت
ہے اور وہ کیا روپ دھارنا چاہتے ہیں۔

تحریکِ استشراق کا وجود

تحریکِ استشراق کب وجود پذیر ہوئی؟ اس کی عمر کیا ہے؟ کس رفتار سے یہ اپنا
جاری کیے ہوئے ہے؟ یہ اپنے ارتقائی سفر کے دوران کس طرح کے نشیب و فراز۔
گذرتی رہی ہے؟ اور اب کس انداز سے اسلام کے خلاف سرگرم عمل ہے؟ اگر ہم
تحریک کی عمر کے بارے میں تحقیق کریں گے، تو جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ
تحریک بہت پرانی ہے اور ہر دور میں اپنے مقصد کی تحت ہوشیاری اور تیزی سے کام کر
رہی ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ اسلام کے خلاف اس کی پالیسیوں میں تغیر ہوتا رہا ہے
یہ حالات کے تحت مختلف روپ دھارتی رہی ہے، البتہ یہ تحریک اپنے مقصد سے کبھی نہ
ہٹی یعنی اسلام کے خلاف سازش، پیغمبر اسلام کے ساتھ دشمنی اور قرآن کے خلاف
عمل۔ یہ تحریک کتنی قدیم ہے اس کی قدامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مقالہ نگار ڈ
شرف الدین اصلاحی نے لکھا ہے۔

''یہی نہیں، ذرا دور تک گہرائی میں جاکر دیکھیں تو تصادم، کشاکش اور آویزش کی داستا
اتنی ہی قدیم ہے کہ جتنا انسان، روزِ اول، آدم اور ابلیس کا قصہ، پھر آدم اور شیطان کا
ساتھ ہبوط، دنیاوی زندگی میں حق کے ساتھ باطل، اسلام کے ساتھ کفر، ایمان کے سا
الحاد کو بھی اپنا کاروبار جاری رکھنے کی کھلی چھوٹ کا مقصد کیا ہے؟ معرکۂ خیر و شر اس دنیا
کب برپا نہیں رہا؟ روزِ اول سے ہی معرکہ جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا، قصہ کو
کہ وہ روح جسے ''استشراق'' کا خوشنما نام دیا جاتا ہے بہت پرانی ہے اس کا بھیس بدلتا رہتا ہے
بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں = اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات
اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین ''دینِ اسلام'' ہے جب سے اسلام کا وجود ہوا اسی و
سے اسلام دشمنی کا بھی آغاز ہو گیا۔ کون نہیں جانتا کہ جب حضرت آدمؑ کے اندر ر
پھونکی گئی اور آدم مٹی کے پتلے سے انسان کی شکل میں نمودار ہوئے تو اس وقت شیط

بھی موجود تھا جو آدم کے وجود میں آتے ہی بوکھلا گیا تھا اور ان کا دشمن ہو گیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام خدا کے پیغمبر یعنی خدا کے دین کے رہبر و پیروکار۔ اور شیطان اس کا دشمن، لہذا یہ کشمکش روزِ اوّل سے ہی شروع ہو گئی۔

پھر آخر میں حضرت محمد ﷺ کی زبانی دین اسلام کی ابدیت کا فرمان جاری کر دیا گیا۔ فرمایا گیا: **الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الإسلام دیناً .(المائدہ ۳)**

پھر اسی کے ساتھ یہ فرمان بھی جاری ہوا کہ:

ومن یبتغ غیر الإسلام دیناً فلن یُقبلَ منه وھو فی الآخرة من الخٰسرین

(ال عمران ۸۵)

اور جو شخص اسلام کے علاوہ دین تلاش کرے گا تو اسے ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو گا۔

یوں تو اسلام کی یہ پالیسی ہمیشہ ہی یہود و نصاریٰ کے لئے نا قابل قبول رہی تھی مگر جب آخری منشور بھی اس پالیسی پر جاری ہوا تو انکی دشمنی کی انتہا نہ رہی اور وہ مزید بھڑک اٹھے۔ اور اسلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرنے میں مصروف ہو گئے چنانچہ کبھی انہوں نے اسلام کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے قتل کی سازش کی، کبھی انہوں نے اسلام کے زور کو ختم کرنے کے لئے آپ کے صحابہ کو تکالیف پہنچانے کی کوششیں کیں، کبھی اسلام کے خلاف میدانِ کارزار گرم کیا، کبھی دوغلی پالیسی چلی، انہوں نے ایسا بھی کیا کہ صبح کو اسلام میں داخل ہو جائیں اور شام کو اسلام سے نکل جائیں تاکہ وہ لوگ جو اسلام میں داخل ہونے والے ہیں، وہ باز آجائیں۔ کیونکہ وہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ آخر کوئی نہ کوئی کمی مذہب اسلام میں موجود ہے، جس کے پیش نظر وہ اسلام میں شمولیت کے باوجود کنارہ کش ہو گئے، قرآن نے انکی اس حرکت کو اس طرح بیان کیا ہے:

وقالت طائفةٌ من أھل الکتابِ آمنوا بالذی اُنزِل علی الذین امنُوا وجه النھار واکفروا اخره لعلھم یرجعون (آل عمران ۷۲)

اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو چیز نازل کی گئی ہے اسپر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس کا انکار کر دو تاکہ وہ بھی اس سے برگشتہ ہو جائیں۔

مگر جب ان کی یہ سازش دینِ اسلام کی بڑھتی ہوئی ترقی کو نہ روک سکی اور اس کی شان میں ذرہ برابر بھی کمی پیدا نہ کر سکی تو انہوں نے بیچ کی راہ نکالنے کی کوشش کی اور مصالحت کا ارادہ کیا تا کہ وہ دین جو خدا کے یہاں سے نازل ہو رہا ہے اسمیں قدرے ترمیم ہو جائے جس کے باعث یہ دین ملاوٹ کی وجہ سے آگے چل کر خود دم توڑ دے گا قرآن کریم نے اس کی وضاحت یوں کی ہے " ودُّو نو تُد هِنُ فيُد هنون" چاہتے ہو تم اپنے موقف سے ہٹو تو وہ بھی ہٹیں۔ (نون ۹) انہوں نے یہ پالیسی بھی اختیار کی کہ بعض کتاب پر ایمان لایا جائے اور بعض پر ایمان نہ لایا جائے یعنی جس کو ہم بہتر سمجھتے ہیں اس کو قبول کریں اور جس کو بہتر نہ سمجھیں اس کو رد کر دیں تا کہ یہ رواج عام ہو جائے اور دینِ اسلام اپنی موت آپ مر جائے مگر اسلام نے اس بات کو قطعاً پسند نہیں کیا اور تنبیہ فرمائی:

أفتؤ منون ببعض الكتاب وتكفرون ببعض (البقر ۸۵)

کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصہ سے انکار کرتے ہو ایک دوسری جگہ اور تنبیہ فرمائی گئی:

ويقولون نؤمن ببعضٍ ونكفرُ ببعض، ويريدون ان يتخذوا بين ذالك سبيلاً (النساء ۱۵۰)

اور وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ درمیان کی کوئی راہ نکالیں یہ لوگ در حقیقت پکے کافر ہیں۔

معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ اسلام کو مٹانے پر مصر تھے وہ اسلام کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے، اس لئے ایک لمحہ کے لئے بھی دینِ اسلام کو دیکھنا نہیں چاہتے تھے مگر جب طاقت کا زور نہیں چلتا تھا تو طرح طرح کی حکمتِ عملیوں سے کام لیتے تھے۔ آج کے یہود و نصاریٰ بھی اسی طرح کی سازشیں اور تدبیریں سوچتے رہتے ہیں اور اسلام پسندوں کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں اور یہی یہود و نصاریٰ آج کے مستشرقین ہیں۔ جو نہ کل اسلام کے دوست تھے اور نہ آج اسلام کے دوست ہیں، بلکہ کل کی طرح آج بھی وہ تعصب رکھتے ہیں اور اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں، وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ اسلام کو نقصان پہنچانے والا کوئی لمحہ ضائع نہو۔

مسلمانوں کو اپنے دین سے ہٹانے کے لئے وہ مال و دولت کو لٹا سکتے ہیں، اپنی نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں کو قربان کر سکتے ہیں۔ اگر تشدد و بربریت سے کام چل سکتا ہے تو وحشی اور

درندے بن سکتے ہیں اور اگر دوستی سے انکا مقصد حاصل ہو سکتا ہے تو وہ بظاہر دوستی بھی کر سکتے ہیں۔ مگر رہیں گے اسلام کے دشمن ہی۔ قرآن نے یہود و نصاریٰ کی اس دوغلی پالیسی سے اہل اسلام کو متنبہ کیا ہے اور ان کو دوست بنانے سے روکا ہے چنانچہ اللہ نے قرآن میں فرمایا:

یٰا ایھاالذین امنوا لاتتخذوا الیھودَ والنصاریٰ أولیاء بعضھم اولیاءُ بعضٍ ومن یتولھم منکم فإنه منھم إن الله لایھدالقوم الظالمین (مائدہ ۵۱)

اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو ان کو اپنا دوست بنائیگا تو وہ انہیں میں سے ہوگا یقناً اللہ تعالیٰ ظالموں کو راہ یاب نہیں کریگا۔

یہود و نصاریٰ اگر ایک وقت اسلام کے کھلے ہوئے دشمن دکھائی دیتے ہیں تو دوسرے وقت میں دوست بھی نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے عمل و قول سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اسلام کے دشمن نہیں، دوست ہیں۔ وہ اسلام سے راضی ہیں، خوش ہیں اور اسلام کی تعریف و توصیف میں لکھ دیتے ہیں کہ اہل اسلام ان کی دوستی کو مخلص سمجھیں مگر یہ سب کچھ خود کو غیر متعصب، روادار اور انصاف پسند ثابت کرنے کے لئے کرتے ہیں تاکہ اسلام کی بیخ کنی کیلئے راہیں ہموار ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس سازش سے چوکنا رہنے کی تاکید کی ہے۔ فرمایا:

ولن ترضیٰ عنك الیھودُ ولاالنصٰریٰ حتیٰ تتبع ملتھم قل إن ھدی الله ھو الھدٰی ولئن اتبعت أھوائھم بعد الذی جائك من العلم مالك من الله من ولی ولانصیر (البقرہ ۱۲۰)

یہود و عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہونگے جب تک تم ان کے طریقہ پر نہ چلنے لگو، صاف کہدو! کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتلایا ہے، ورنہ اگر اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آچکا ہے، تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لئے نہیں ہے۔

غرض آنحضرت ﷺ سے لے کر خلفاء راشدین کے دور تک ان کی اسلام دشمنی اظہر من الشمس رہی، قرآن و حدیث اور تاریخ کا ہر ایک طالب علم ان کی سازشوں سے واقف ہے۔ البتہ یہ لوگ اس دور میں یہود و نصاریٰ کے نام سے ہی یاد کئے جاتے تھے، ان کو اس

وقت مستشرقین کا نام نہیں دیا گیا تھا اور نہ ہی ان کی تحریک کو تحریک استشراق کہا گیا تھا۔ باقاعدہ استشراقی تحریک کا دور ۷/ویں صدی سے شروع ہوتا ہے جو آج تک جاری ہے۔

البتہ مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ "تحریک استشراق" اپنے موجودہ نام کے ساتھ اگرچہ اسوقت نہ تھی مگر تھی ضرور، کیونکہ تحریک استشراق کا جو مقصد آج ہے وہی مقصد اس وقت بھی تھا، جس میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا ہے، یہ ایک الگ بات ہے کہ مقصد کے حصول کے طریقے تبدیل ہوتے رہے۔ اور یہود و نصاریٰ مختلف لباسوں میں آتے رہے، ان کے نام میں بھی تبدیلی ہوئی یعنی جس تحریک کو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں یہود و نصاریٰ کی سازشوں کا نام دیا جاتا تھا انہیں سازشوں کو ۷/ویں صدی کے بعد تحریکِ استشراق کا خوبصورت نام دے دیا گیا۔ اقبال نے کیا ہی خوب کہا ہے ؂

بدل کر بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں - اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

باقاعدہ آغاز

لیکن باقاعدہ مستشرقین کا نسب نامہ بالفاظ دیگر جدید مستشرقین کا شجرۂ نسب ۷/ویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے، سب سے پہلا شخص جس نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف نفرت کا زہر اگلا وہ جان آف دمشق ہے۔ اس شخص نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے ایک تحریک چلائی۔ جس میں اس نے اسلام کے پیغمبر ﷺ پر کیچڑ اچھالی، آپ کی حیاتِ طیبہ پر حملہ کیا، اس نے آپ کی نبوت کا انکار کر کے آپ کو فقط توھمات کا پیکر ثابت کرنے کی کوشش کی، آپ کے بارے میں طرح طرح کی جھوٹی باتیں گھڑیں۔ اس شخص نے مذہبِ اسلام کو وقتی قرار دیا اور کعبہ کو صنم خانہ سے تعبیر کیا، علاوہ ازیں اس نے بہت سی غلط باتیں بہت ہوشیاری کے ساتھ دینِ اسلام پر چسپاں کرنے کی کوشش کی، تاکہ مذہبِ اسلام کی شان و رفعت ماند پڑ جائے اور نبی آخر الزماں کی سیرت و شخصیت ایک دیومالائی ہیرو سے زیادہ نہ دکھائی دے تاکہ لوگ آپ کو حقانیت وصداقت کا سرچشمہ نہ سمجھ بیٹھیں، اس نے پوری توجہ کے ساتھ ان تمام پہلوؤں پر غور کیا جن کی بدولت خاموشی کے ساتھ اسلام اور پیغمبر اسلام کا اثر کم ہو جائے، وہ سوچتا تھا کہ اگر اس کی پیش کی ہوئی مذکورہ باتیں عوام الناس تسلیم کر لیں تو اسلام کا ستون

خود بخود ٹوٹ جائے گا، اس کی نہ صرف عمارت متزلزل ہوگی بلکہ بنیادیں بھی ہل جائیں گی۔
جان آف دمشق کی یہ تمام گھڑی ہوئی خرافات مستقبل کے استشراقی اسکالروں کا ماخذ ومصدر بن گئیں، اور جان کے بعد تقریباً تمام استشراقی عالم انہیں ماخذ پر اپنے دعوں کی عمارتیں کھڑی کرنے لگے۔ پروفیسر سید حبیب الحق ندوی نے اس سلسلہ میں وضاحت کی ہے
''جان وہ پہلا مسیحی مشرقی مشنری تھا جس نے آنحضرت ﷺ کی مقدس شخصیت پر جنسی اتہامات کا تومار کھڑا کردیا جو بعد میں مغربی اسکالرز کی تحقیق وریسرچ کا دلچسپ موضوع بن گئے۔ اس نے زینب بنت جحش اور زید ابن حارثہؓ کی واقعہ کو ایک افسانہ بنادیا، یہی افسانے یورپ میں کلاسیکی موضوعات بن گئے اور آج تک مستشرقین کے محبوب عناوین ہیں۔ ساتھ ہی جان نے تعددِ ازواج، طلاق اور اس قسم کے دیگر مسائل کو اچھالا جو اس کی کتاب (Pe Heare ribas) کے آخر باب کے اہم موضوعات نہیں''۔
آگے چل کر جان آف دمشق کی یہ کوشش ہی استشراقی تحریک کی بنیاد ٹھری جس پر کہ تحریک استشراق کی لمبی چوڑی عمارت کا کام شروع ہوگیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں باضابطہ ''تحریک استشراق'' وجود میں آگئی۔

تحریک استشراق ۷/ویں صدی عیسوی سے ۱۳/ویں صدی تک

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ ۷/ویں صدی عیسوی میں جان آف دمشق نے اسلام کی خلاف لٹریچر تیار کیا اور ''تحریک استشراق'' کو ایک منظم شکل دی، جان ساتویں صدی پر چھایا رہا، آٹھویں صدی کے آخر میں تھیوسوفین نے کرانکل لکھی۔ اس تاریخ (The charanicies Of theosofhame, the comfessor) کو اناسٹیس (Anastasias) نے اپنی تاریخ چرچ کا حصہ بنالیا اور یہ دونوں کتابیں آنے والے مستشرقین کے لئے مراجع بن گئیں۔ نویں صدی عیسوی میں بھی ایک بزنطینی مؤلف نے آنحضرت ﷺ کے خلاف ایک کتاب (Refuta-tion Mohammad) لکھی۔ اس کتاب کے خلاصہ کو مقالہ نگار نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔
''اس میں آپ ﷺ کو نبی کاذب کی علاوہ العیاذ باللہ ابن ابلیس بھی قرار دیا ہے، قرآن کو کذب اور خرافتی داستانوں کا مجموعہ قرار دے کر غیر الہامی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور اسلام کے اساسی عقیدہ لم یلد ولم یولد کا شدید مذاق اڑایا ہے، مسلمانوں پر الزام لگایا کہ وہ

اصل خدا کی پرستش سے دور ہیں۔ اسلام چونکہ عیسیٰ ابن مریم کے عقیدہ کا حامی ہے اور عیسیٰ ابن اللہ کی شدت کے ساتھ تردید کرتا ہے اس لئے مؤلف کی نظر میں یہ مذہب اور اس کے پیامبر داعی سب کاذب ہیں" (از مقالہ "اسلام اور مستشرقین" پروفیسر سید حبیب الحق ندوی ڈربن یونیورسٹی، جنوبی افریقہ)

اس کے علاوہ اس کی دیگر کتابیں بھی ذہنی اختراعات کا مجموعہ ہیں، کرانکل میں مصنف نے محمد ﷺ کی تعلیم سے بحث کی ہے کہ محمد ﷺ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہیں، جن کو دیگر آسمانی کتابوں کا جیسے انجیل، بائبل وغیرہ اور بہت سی دینی کتابوں کا گہرا علم تھا۔ وہ حضور ﷺ کو عالم ثابت کرکے، آپکے امّی ہونے کا انکار کرنا چاہتا ہے، تاکہ یہ ثابت کرنے میں آسانی ہو جائے کہ قرآن محمد ﷺ نے لکھا ہے اور اسلام سابقہ ادیان کی مسخ شدہ ایک صورت ہے۔ اسی دور کے بعض استشراقی مصنفین نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آپ کو جنونی دورے پڑتے تھے، اس طرح کی خرافات استشراقی مصنفین کی جانب سے وجود میں آتی رہیں، وقت آہستہ آہستہ بڑھتا رہا اور "تحریک استشراق" میں شدت پیدا ہوتی گئی۔

مستشرقین کا اسلام کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ یہودی و عیسائی عوام کو جوش دلانے میں بڑا معاون ثابت ہوا، ان کے اشتعال انگیز مضامین پر یہودی و عیسائی میدان میں آگئے اور جنگوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ وہ جنکو صلیبی جنگوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ صلیبی جنگوں کا یہ سلسلہ تقریباً ۵ صدیوں تک جاری رہا۔ جن کے پس پردہ صلبیوں کی جماعت اپنا کام کرتی رہی، اسلام کے خلاف عیسائیوں کو تیار کرتی رہی علاوہ ازیں دوسری جانب گھناؤنا لٹریچر بھی تیار کرتی رہی، ان جنگوں کی دوران اسلام کے متعلق مستشرقین نے جن کتابوں کو تصنیف کیا ان میں ایک دو کتابوں کے علاوہ صاف صاف اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ ہیں، حیرت انگیز افسانے ہیں۔ جب کہ کسی میں آپ کے نام تک کو تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی اور آپ کے اصل نام محمد کی بجائے ماتھومس رکھنے کی جدوجہد کیگئی۔ کسی نے کہا کہ محمد خود پادری تھے اور پوپ کے مرتبہ کے خواہش مند تھے مگر جب وہاں تک رسائی نہ ہو سکی تو وہ روم سے بھاگ کر عربیہ گئے اور وہاں نبوت کا دعوی کر دیا۔ اس سے عجیب ایک اور داستان گھڑی گئی کہ الکونڈریا (Alexandria) کے پیٹریارک (PATRIARCH) کا الکشن ہونے والا تھا اس الکشن میں حصہ لنے والا پادری جب اپنی

کامیابی سے مایوس ہو گیا تو اس چرچ کے خلاف انتقامی منصوبہ تیار کیا، اس مقصد کے حصول کے لئے اس محمد کو تیار کیا، انہیں زبردست تعلیم و تربیت دی، اور ان کی شادی ایک مالدار عورت خدیجہ سے کرادی، پادری نے مسیحیت پر کاری ضرب لگانے کے لئے محمد کی نبوت کا اعلان کردیا اور اسطرح محمد نبی بن گئے۔

۱۲۷۱ء میں ولیم (WILLIAM OF TRIPOLI) ل سے آنحضرت ﷺ کی سوانح لکھی۔ اس میں مؤلف بجز اختراعی افسانوں اور خرافاتوں کے کچھ نہ لکھ سکا اس نے قرآن مجید کی بارے میں ایک اختراعی کہانی پیش کی کہ قرآن کی ترتیب و تالیف کا کام محمد (ﷺ) کے وصال کے پندرہ سال بعد ہوا، اس کی تدوین کا کام ایک کمیشن کے حوالہ کیا گیا۔ کمیشن نے قرآن میں کوئی نئی اور مفید بات نہ دیکھی تو خود ہی قرآن کی تدوین کرڈالی۔

اس دور کے مستشرقین کا عام رجحان یہ بھی رہا کہ آپ ﷺ کے پاس تین چیزیں تھیں جس کی بنیاد پر آپ اتنی جلدی اپنی تحریک کو ہمہ گیر بنانے میں کامیاب ہوگئے، ان میں سے ایک جادو تھا، جس کا اثر ہر ایک پر ہوتا تھا۔ دوسری چیز (العیاذ باللہ) آپ کی عیاری تھی جس سے کہ بڑے اچھے اچھے دھوکہ کھاجاتے تھے، تیسری چیز زور و طاقت تھی جس سے کہ لوگوں پر زبردستی کی جاتی تھی، تیرھویں صدی تک استشراقی تحریک انہیں چند مراجع ومصادر پر اپنا سفر طے کرتی رہی۔

تیرھویں صدی عیسوی تک صرف اک دو مستشرقین ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے مستشرقین کی عام ڈگر سے ہٹ کر کام کیا۔ ان میں سے ایک ولیم (WALLAIM OF NAL) مؤلف تھا، جس نے اسلام اور وثنیت میں فرق کیا اور لکھا کہ اسلام کیونکہ توحید کا دعویدار ہے اس لئے وثنی نہیں ہوسکتا۔ ۱۱۲۰ء میں اس نے یہ بھی لکھا کہ مسلمان نہ تو محمد کو خدا مانتے ہیں اور نہ ان کی پرستش کرتے ہیں۔ وہ تو محمد کو فقط خدا کا نبی تسلیم کرتے ہیں دوسرا مصنف جس نے عام مستشرقین کی متعین شدہ ڈگر سے ہٹ کر کام کیا وہ الفونسو (ALFONSO) تھا۔ اگرچہ الفونسو ابتداءً یہودی تھا مگر بعد میں اس نے مصلحتاً عیسائیت قبول کرلی تھی۔ الفونسو نے یہودیت وعیسائیت کے درمیان ایک الہامی ڈائیلاگ لکھا جس میں اسلام کے متعلق کچھ بہتر خیالات کا اظہار کیا گیا تھا، ان کے علاوہ سبھی استشراقی عالم فقط بغض وعناد کی راہ پر چلتے رہے اور اسلام کے خلاف مضحکہ خیز افسانے تراشتے رہے۔ (باقی)

از: مولانا عبدالحی فاروقی صدر شعبہ اسلامیات جامعہ ہمدرد نئی دہلی

سیاسی جدوجہد

مدح صحابہ کی دینی وشرعی حیثیت متعین ہو جانے کے بعد اس مسئلہ کو سیاسی سطح پر بھی لاکر رکھا گیا۔ مولانا لکھنویؒ اور ان کے رفقاء نے یوپی کے ممبران اسمبلی کے سامنے اس مسئلہ کو رکھا چنانچہ ۱۰/نومبر ۱۹۳۶ء کو یوپی اسمبلی میں اس پر بحث کی اجازت مانگی گئی اور نواب زادہ لیاقت علی خاں نے حکومت کے سامنے اس سلسلہ میں ۲۰ سوالات ایوان میں رکھے جس پر جم کر بحث ہوئی، اس مسئلہ کے علاوہ اور کوئی کارروائی ایوان میں نہیں ہو سکی تھی۔ سنی ممبران اسمبلی میں نواب زادہ لیاقت علی خاں، حاجی نثار اللہ، حافظ محمد ابراہیم، سید ظہور احمد ایڈوکیٹ، سید یوسف علی، کنور جمشید علی خاں، مولوی فصیح الدین، جناب افضال الدین، بھیا رشید الدین، شیخ امتیاز احمد، حافظ عبدالرحیم، شیخ حبیب اللہ، جناب شاکر داد خاں، جناب مقصود علی خاں، جناب زاہد علی سبز پوش، جناب ہادی یار خاں اور شیخ غضنفر اللہ وغیرہ نے مدح صحابہ کی حمایت میں مدلل تقریریں کیں۔ ان حضرات کے علاوہ کچھ ہندو ممبران اسمبلی نے بھی اس مسئلہ میں سنیوں کی تائید کی تھی جن میں جناب رام دیال، جناب ارجن سنگھ اور جناب دھرم سنگھ کے نام ریکارڈ میں پائے گئے ہیں۔(۱)

حکومت وقت کے اس ظالمانہ فیصلہ سے سارے ملک کے مسلمان بے چین ہو گئے تھے، انہیں دنوں میں مولانا علیہ الرحمۃ کے رفقاء نے مدح صحابہ کمیٹی، کے نام سے ایک آئینی کمیٹی بنائی اور گورنر یوپی سر ہنری ہیگ کے پاس ایک میمورنڈم لیکر پہونچے جس میں سنیوں کی طرف سے درج ذیل مطالبات پیش کئے گئے تھے۔

---

(۱) النجم لکھنؤ، ۲۵/ستمبر ۱۹۳۶ء

(۱) ۱۹۰۹ء کا وہ حکم واپس لیا جائے جس کے تحت سال میں تین دن مدح صحابہ پر پابندی عائد کی گئی تھی۔

(۲) مدح صحابہ تحریک میں جو لوگ گرفتار ہوئے ہیں انھیں فوراً رہا کیا جائے

(۳) جن لوگوں پر جرمانے کئے گئے ہیں یا ان کا سامان قرق کیا گیا ہے، وہ سب واپس کیا جائے۔

گورنر یوپی نے مذکورہ بالا مطالبات میں سے کچھ مان لئے اور تمام گرفتار شدگان کو فی الفور رہا کردیا گیا، ان کے تمام جرمانے وغیرہ بھی معاف کردئے گئے اور آئندہ اس مسئلہ میں نرمی اختیار کرنے کا وعدہ کیا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ دونوں فرقوں میں مصالحت کرانے کی بھی کوشش کی جائے گی۔(۱)

السپ کمیشن (ALLSOP COMMISSION)

مذکورہ بالا چند مطالبات مان لینے کے علاوہ حالات میں اور کوئی دوسری تبدیلی نہیں آئی، سال کے تین دنوں میں مدح صحابہ پر بندش بدستور عائد رہی لہٰذا اب کی مرتبہ سنیوں کی جدوجہد سے حکومت نے ایک دوسرا تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنے کا فیصلہ کیا جس کو السپ کمیشن (ALLSOP COMMISSION) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس کمیشن میں صرف دو ہی ممبر تھے ایک مسٹر جسٹس السپ جو اُس وقت الہ آباد ہائی کورٹ کے جج تھے اور دوسرے مسٹر ایچ۔ایس۔راس (MR. H.S. ROSS I.C.S.) جو اس وقت علیگڈھ کے ڈپٹی کمشنر تھے جسٹس السپ کو کمیشن کا صدر بنایا گیا۔

اس کمیشن کو دو باتوں کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا تھا:

(۱) گذشتہ واقعات کی روشنی میں ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ نے جو پالیسی اپنائی تھی اس میں اب کسی ترمیم یا تبدیلی کی ضرورت ہے کہ نہیں؟

(۲) اس سلسلہ میں لکھنؤ کے حکام ضلع نے جو رویہ اختیار کیا ہے، اس میں اب کسی ترمیم یا تبدیلی کی ضرورت ہے کہ نہیں؟

کمیشن میں شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے لوگوں کے بیانات قلمبند کئے گئے، سنیوں میں

---

(۱) النجم لکھنؤ ۲۳/اپریل ۱۹۳۷ء

سب سے پہلے بیرسٹر عبدالعزیز سابق وزیر صوبہ بہار اس کمیشن میں پیش ہوئے اور انہوں نے دعویٰ مدح صحابہؓ پر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تفصیلی بیان دیا۔ ان کے علاوہ دوسرے وکلاء بھی اس مسئلہ میں پیش پیش رہے، جن میں مولوی محمد احمد کاظمی ایڈوکیٹ، سید ظہور احمد ایڈوکیٹ، غلام حسین بٹ ایڈوکیٹ اور چودھری نعیم اللہ ایڈوکیٹ کے نام قابل ذکر ہیں۔

علماء کے بیانات

ایک سنی عالم دین ہونے کی حیثیت سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند بھی مدح صحابہ کی شرعی حیثیت واضح کرنے کے لئے کمیشن میں پیش ہوئے۔ شیعہ وکلاء نے ان سے بطور جرح بہت سے سوالات کئے، حضرت مدنیؒ کا بیان ایک گھنٹہ تک جاری رہا، دوسرے دن حضرت لکھنویؒ کو بیان دینے کیلئے بلایا گیا، آپ نے اپنے بیان میں اس مسئلہ پر خاص طور سے روشنی ڈالی کہ سنیوں کے یہاں مدح صحابہ مستحب ہے مگر تین حالتوں میں یہ واجب ہو جاتی ہے:

(۱) جب کہ اس کو جبراً روکا جائے۔

(۲) جب مسلمانوں کا کوئی ایسا جلسہ ہو جس میں مدح صحابہ نہ پڑھنے کی وجہ سے کسی دوسرے فرقہ سے مشابہت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔

(۳) اس مقام پر جہاں سنی آباد ہوں مگر وہاں خلفاء راشدینؓ اور دوسرے صحابہ کے متعلق بدظنی پھیلائی جارہی ہو۔

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ نے بھی اسی موضوع پر اپنا مدلل بیان کمیشن میں دیا تھا۔ آپ کے علاوہ مولانا ظفر الملک علویؒ سکریٹری مدح صحابہ کمیٹی بھی کمیشن میں پیش ہوئے تھے اور اس پورے مسئلہ کو سلسلہ وار بیان کرکے اس کے سارے نشیب و فراز سے کمیشن کو آگاہ کیا۔

شیعوں کی طرف سے مولوی نجم الحسن مجتہد ناظم مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کمیشن میں پیش ہوئے۔ ان کے بیانات عجیب و غریب تھے، سوالات کی روشنی میں ان کے جوابات میں بڑا تضاد تھا۔ موصوف کے علاوہ مولوی فضل علی ایڈوکیٹ مدیر الواعظ لکھنؤ، مولوی کلب حسین مجتہد، مرزا حیدر مہدی وکیل، نواب مولوی مہدی حسن، مولوی مرزا عابد حسین اور

ہردھیان چند وکیل کی بھی کمیشن میں پیشی ہوئی۔

تقریباً ایک ماہ تک کمیشن کی تحقیقات جاری رہیں چنانچہ ۱۵/جون ۱۹۳۷ء کو کمیشن نے اپنی رپورٹ مرتب کرکے حکومت یوپی کو پیش کردی، حکومت نے وقتی طور پر کسی مصلحت کی بناپر السپ کمیشن کی رپورٹ کو دبائے رکھا لیکن بڑی کوششوں اور جدوجہد کے بعد ۲۸/مارچ ۱۹۳۸ء کو اپنا فیصلہ شائع کردیا۔ اس فیصلہ میں حکومت نے سنیوں کا مدح صحابہ کا حق تو تسلیم کرلیا مگر باقی حالات بدستور جاری رکھے، لہذا علماء اہل سنت نے اس فیصلہ کو مسترد کردیا۔

سول نافرمانی کا دوبارہ آغاز

مولانا لکھنویؒ نے کمیشن میں تسلیم کئے گئے مدح صحابہ کے اس قانونی حق کو آزمانے کے لئے امین الدولہ پارک لکھنؤ میں یوم فاروقؓ منانے کے لئے ایک جلسہ کا اعلان کیا لیکن اس جلسہ کے منعقد ہونے سے پہلے ہی حکومت نے انھیں اور ان کے تمام رفقاء کار کو گرفتار کرلیا جس سے سارے شہر میں پھر بے چینی پھیل گئی اور مسلمانان لکھنؤ نے دوبارہ ملک گیر ایجی ٹیشن شروع کردیا جس میں غیر منقسم ہندوستان کے اطراف واکناف سے مسلمانوں نے لکھنؤ آکر اپنے کو گرفتار کرانا شروع کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں مسلمانوں نے اپنی گرفتاریاں پیش کردیں۔ اب اس تحریک میں مجلس احرار نے بھی جماعتی حیثیت سے شمولیت اختیار کی اور اس میں پُرجوش عملی حصہ لیا۔ جمعیۃ علماء ہند نے بھی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ مسلمانوں کی یہ گرفتاریاں مسجد ٹیلہ شاہ پیر محمدؒ سے دی جاتی تھیں جس میں انجمن تحفظ ناموس صحابہ اور مجلس احرار کے ارکان اپنی اپنی جماعتوں کی طرف سے گرفتاریاں پیش کررہے تھے۔ بالآخر حکومت نے ۳۰/مارچ ۱۹۳۹ء کو یہ اعلان کیا کہ سنیوں کو ہر حالت میں پبلک جلسے اور جلوس میں مدح صحابہ کرنے کا حق ہر سال ۱۲/ربیع الاول کے دن اس شرط پر دیا جائیگا کہ وقت، مقام اور راستے کا تعین ضلع حکام کرینگے، چنانچہ اس اعلان کی روشنی میں یہ سول نافرمانی کی تحریک واپس لے لی گئی۔(۱)

---

(۱) آفتاب، اخبار، لکھنؤ، ۲۳/نومبر ۱۹۳۹ء

جلوس مدح صحابہ

تیس سال کی مسلسل جد و جہد کے اور قانونی جنگ کے بعد حکومت کو سنیوں کے کم کم ایک مطالبہ کو منظور کرنا ہی پڑا اور وہ اس طرح کہ ۳/ مئی ۱۹۳۹ء کو جلوس (۱) مدح صحا نکالنے کی اجازت دے دی گئی چنانچہ یہ جلوس نہایت شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ بڑے پر امن طریقہ پر نکالا گیا۔ ایک محتاط انداز کے مطابق اس جلوس میں لگ بھگ ڈھائی لاکھ مسلمانوں نے حصہ لیا تھا۔ عید گاہ عیش باغ لکھنؤ سے یہ جلوس ڈیڑھ بجے دن کو روانہ ہوا اور شام کو چھ بجے چار باغ میں تقریباً چالیس ہزار چھوٹے اور چار ہزار بڑے پر لائے گئے تھے اور ہر پرچم پر کسی نہ کسی ایک صحابی کا نام لکھا ہوا تھا، جلوس میں حصہ لینے کے لئے یوپی کے ہر ضلع سے مسلمان بڑے ولولے اور جوش کے ساتھ آئے تھے، مسلمانو کے دوش بدوش ہزاروں کی تعداد میں ہندو اور سکھ حضرات بھی مدح صحابہؓ پڑھتے ہو۔ شامل ہوئے تھے، مجلس احرار کے پرچم کی کمانڈ مشہور قومی رہنما اور ممتاز عالم دین مولانا قاسم شاہجہانپوریؒ، مولانا ابو الوفاء شاہجہانپوری، مولوی مشتاق احمد لدھیانویؒ اور جنا وصی احمد لکھنویؒ کر رہے تھے، اور مجلس تحفظ ناموس صحابہ کے پرچم کی قیادت حکیم خوا جمیل الدینؒ کر رہے تھے۔

---

(۱) لکھنؤ کے خصوصی پس منظر میں جلوس مدح صحابہ کی بڑی اہمیت اور ضرورت تھی، شیعہ اپنے جلوس عزادا میں صحابہ کرام پر عموماً اور خلفاء راشدین پر خصوصاً تبرا کرتے تھے، اس طرح وہ سنیوں کو گمراہ کرنے اور صحابہ کرامؓ سے بد ظن کرنے کے لئے جلوس کی شکل میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے تھے اور لطف کی بات یہ ہے کہ کے اکثر یہ جلوس سنی محلوں کے اندر سے گذارے جاتے تھے اسی وجہ سے ہمیشہ لکھنؤ میں شیعہ سنی فسادات کرتے تھے لہذا ان جلوس عزاداری کے خراب اثرات کا ازالہ بھی جلوس مدح صحابہ کی شکل میں ہو سکتا تھا بھی حقیقت ہے کہ لکھنؤ میں ان جلوسوں سے حق کی تبلیغ جتنی ہوئی ہے اتنی کسی دوسری طرح سے نہیں ہو دوسری بات یہ ہے کہ شیعوں کی طرف سے ہمیشہ ان جلوسوں کی مزاحمت ہوتی رہی ہے اور اس پر قانونی پابن عائد کرانے کی مسلسل کوشش کی جاتی تھی اس لئے لکھنؤ کے سنیوں کی طرف سے اس پر اصرار کیا جاتا رہا ہے جلوس مدح صحابہ کی مزاحمت نہ کی جاتی تو اس پر سنیوں کی طرف سے اصرار بھی نہ کیا جاتا۔ لکھنؤ اور اس قرب و جوار میں جلوس مدح صحابہ کی بدولت سنیوں سے تعزیہ داری ختم ہوئی جس طرح دوسرے فرقوا مسلکوں کے ماننے والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے جلسہ و جلوس آزادی کے ساتھ نکال سکتے ہیں اس سنیوں کو بھی یہ حق ملنا چاہئے تھا کہ وہ جب چاہیں اپنے جلوس نکال سکتے ہیں۔ اگر حکومت کی طرف سے یہ پابندی ہٹائی جاتی تو جلوس مدح صحابہ نکالنے پر کوئی اصرار نہ کیا جاتا۔

اس موقع پر جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے مولانا لکھنویؒ نے فرمایا تھا کہ "آج خدا کے فضل سے ہم لوگوں کے لئے خوشی کا دن ہے، تقریباً تیس سال کے بعد مدح صحابہ کا جلوس نکالنے کا حق ملا ہے"، آخر میں آپ نے تمام شرکاء رضاکاروں اور منتظمین کا شکریہ ادا کیا اور انھیں مبارک باد پیش کی اور ساتھ ہی ساتھ لوگوں کو پر امن طریقہ سے منتشر ہو جانے کی ہدایت کی۔(۱)

اس طرح کانگریس گورنمنٹ تو ایک ہی بار جلوس نکلوا کر مستعفی ہو گئی مگر دوسرے سال یعنی ۱۹۴۰ء میں گورنر یوپی نے فریق مخالف کے انتہائی مخالفت کے باوجود جلوس مدح صحابہ دوبارہ نکلوایا، جو سال گذشتہ سے بھی زیادہ کامیاب اور عظیم الشان تھا۔

جلوس قدح صحابہ نکالنے کی کوشش

۱۹۴۱ء میں جب ۱۲/ ربیع الاول کو جلوس نکالنے کی درخواست ڈپٹی کمشنر کو دی گئی تو معلوم ہوا کہ مخالفین صحابہ کو بھی تنقیدی جلوس (قدح صحابہ) نکالنے کی اجازت دی جارہی ہے، اس خبر سے شہر میں ایک آگ سی لگ گئی، تمام بازار بند ہوگئے، سڑکیں سنسان ہوگئیں اور شہر کے تمام ادارے بند ہوگئے۔ احاطہ شیخ شوکت علی، رکاب گنج، لکھنؤ میں مجلس تحفظ ناموس صحابہ کا جلسہ طلب کیا گیا جس میں مولانا کلیم اللہ صاحب الہ آبادیؒ نے بڑی ولولہ انگیز تقریر کی، ایک اندازہ کے مطابق تقریباً بیس ہزار مسلمانوں نے اس مجمع میں موت کی بیعت کی اور عہد کیا کہ وہ اپنی جانیں قربان کردینگے، مگر جلوس قدح صحابہ کو نکلنے نہ دینگے۔ اس جرم کی پاداش میں مولانا کلیم اللہ الہ آبادیؒ اور دیگر احراری رہنماؤں کو اسی وقت گرفتار کرلیا گیا۔ اس اضطراب اور بے چینی کے عالم میں ڈپٹی کمشنر لکھنؤ نے ۳۶ گھنٹہ کا کرفیو نافذ کردیا جس سے جلوس قدح صحابہ تو رک گیا مگر ساتھ ہی ساتھ جلوس مدح صحابہ بھی دفعہ ۱۴۴ کی زد میں آگیا۔

سول نافرمانی کا تیسری بار آغاز

اس غم وغصہ میں اسی دن عیدگاہ عیش باغ میں مسلمانوں نے جمع ہو کر دفعہ ۱۴۴ کی

---

(۱) آفتاب، لکھنؤ، ۱۳ مارچ ۱۹۴۰ء و ماہنامہ الداعی لکھنؤ ذی قعدہ ۱۳۵۹ھ

خلاف ورزی کرکے مدح صحابہ پڑھتے ہوئے اپنی گرفتاریاں پیش کردیں۔ یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ دوسری طرف معززین شہر نے گنگا پرشاد میموریل ہال میں چودھری نعمت اللہ صاحب سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ کی صدارت میں ایک جلسہ کیا جس میں چودھری صاحب نے مدح صحابہ کی حمایت میں نہایت زبردست دلائل کے ساتھ احتجاجی تقریر کی اور حکومت سے سنیوں کے مطالبات مان لینے کی اپیل کی مگر جب اس پر بھی حکومت کوئی فیصلہ نہ کرسکی تو مولانا لکھنویؒ نے باوجود اپنی پیرانہ سالی کے ۲۴/اپریل ۱۹۴۱ء کو عظمت صحابہ پر دوسری بار اپنی گرفتاری پیش کردی، آپ کے ساتھ تقریباً ایک ہزار مسلمانوں نے بھی اپنی گرفتاریاں پیش کردیں۔ اس موقع پر ڈھائی مہینہ مولانا علیہ الرحمۃ جیل میں رہے۔ اب یہ احتجاج اور گرفتاریاں پورے ملک میں پھیل گئیں اور مجلس تحفظ ملت کے تو تمام ہی ذمہ دار حضرات گرفتار کرلئے گئے۔ انہی حالات میں تین مہینے بیت گئے اور جوش وخروش بڑھتا ہی رہا مگر نواب چھتاری اور خان بہادر غضنفر اللہ کے اصرار سے قائدین تحریک نے اپنے اس ایجی ٹیشن کو اس وعدہ پر ملتوی کردیا کہ نواب چھتاری صاحب حکومت سے بات چیت کرکے سنیوں کے اس غصب شدہ حق کو واپس دلائیں گے۔(۱)

(۱) آفتاب، لکھنؤ، یکم جولائی ۱۹۴۱ء

عورت اور اسلام

آج کل مسلم عورتوں کے بارے میں بعض حلقوں سے ہمدردی کی عیارانہ آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ سید عبدالرب صوفی کی یہ نظم انشاء اللہ تعالیٰ اس دجل وفریب سے پردہ اٹھانے کے لئے کافی ہوگی

افراط کے اونچے ٹیلے پر، تفریط کی گہری وادی میں   یا سر پھٹنے کے ساماں ہیں، یا مرنا ہے بربادی میں

یہ دنیا اور اس دنیا کی تہذیبیں خندق کھائی میں   قومیں ان قعروں میں گر کر پے در پے مرتی آئی ہیں

وہ واقف ہے اس فطرت سے جو فاطر ہو اس ہستی کا   ناواقف انساں کیا جانے یہ رازِ فراز و پستی کا

جب نوح کا طوفاں برپا ہو جب چار طرف طغیانی ہو   جب کوہ و دامن صحرا و چمن ہر سو پانی ہی پانی ہو

جودی کی اونچی چوٹی پر ڈوبے گا سفینہ کنعاں کا   لیکن کشتی پیغمبر کی ساحل ہے مردِ مسلماں کا

اے بیوی! اے بیٹی! اے ماں! مہلک ہے تمدن مغرب کا   او باعصمت! دامن نہ چھٹے زنہار رسولِ یثرب کا

پیرس، لندن، امریکہ میں بس پوچھو مت کیا ہوتا ہے   شیطان بدی کا ہنستا ہے نیکی کا فرشتہ روتا ہے

وہ عورت جس کو فطرت نے ماں بننے کی عزت دی ہے   وہ بیوی جس کو قدرت نے دلداری کی دولت دی ہے

تفریط کی وادی میں گر کر وہ عورت لونڈی ہوتی ہے   افراط کے ٹیلے پر چڑھ کر اپنا عورت پن کھوتی ہے

فطرت نے عزت رکھی ہے عورت کی عورت ہونے میں   لیکن یورپ عزت سمجھا یہ جو ہر عزت کھونے میں

تعمیر تمدن کے حق میں دونوں کی ضرورت یکساں ہے   جس منزل میں ہے مرد پدر اس منزل میں عورت ماں ہے

معکوس ترقی کرنے سے معدوم ترقی ہوتی ہے   در اصل تنزل ہوتا ہے معلوم ترقی ہوتی ہے

فطرت کے عدلِ مقدس کو جن قوموں نے ٹھکرایا ہے
خود اپنے قصرِ تمدن کو اپنے ہی ہاتھوں ڈھایا ہے

اک مدت تک یہ بحث رہی آیا عورت انساں بھی ہے؟   آیا آبادی کے قابل یہ صحرائے ویراں بھی ہے؟

عورت پر علمی دروازہ ہندومت میں مفتوح نہیں   ویدوں کے علموں کے قابل اس کے قالب میں روح نہیں

عورت سے تعلق رکھنے پر بدھ مذہب میں نروان نہیں   شوہر یا بیوی بننے کا بدھ مذہب میں امکان نہیں

عورت امثالِ نصاریٰ میں افعالِ گنہ کی بانی ہے
عورت دنیائے یہودی میں اک تخلیقِ شیطانی ہے

یونان کے حکمت خانے میں عورت شایانِ علم نہ تھی
فطرت کی طرف سے ہی گویا عورت میں شانِ علم نہ تھی

ایران کی عورت ساغر تھی مصری عورت پیمانہ تھی
روما کے محلوں کی دیوی میخواروں کا میخانہ تھی

صدیوں کے دورِ غلامی میں عورت احساس مٹا بیٹھی
اپنے ہم خلقت شوہر کو اپنا معبود بنا بیٹھی

سب میں پتی ورتا کہلائے عورت دکھیا کو ناز یہ تھا
شوہر کی پرستش کرتی تھی اس لعنت کا اعجاز یہ تھا

اپنے شوہر کی داسی ہو ہندی عورت کا دھرم یہ تھا
سو ظلم سہے منہ سے نہ کہے اس کا معیارِ شرم یہ تھا

جب بیٹی پیدا ہوتی تھی چہرہ کالا پڑجاتا تھا
اک باپ وفورِ ذلت سے بس دھرتی میں گڑ جاتا تھا

احساسِ رذالت سے لڑکی مٹی میں دبادی جاتی تھی
دنیا سے نشانی ذلت کی اس طرح مٹادی جاتی تھی

سسرالی رشتے ناطے سب سامانِ ننگ وعار ہوئے
لڑکی والے سسرے سالے اس درجہ ذلیل وخوار ہوئے

عورت کو جب اِس ذلت پر ان بیدردوں نے پہنچایا
تب غیب سے عورت کا حامی اسلام کا پیغمبرؐ آیا

وہ بیواؤں کا ناصر تھا وہ مسکینوں کا یاور تھا
وہ تھا عورت کا رکھوالا وہ مردوں کا پیغمبر تھا

اُس نے آکر سب مردوں کو ایسا پیغام سنایا تھا
جس نے عورت کے غاصب کو اس کا قوام بنایا تھا

تدریجاً سارے عالم کا اُس نے ماحول بدل ڈالا!
اُس نے الہامی یورش سے رسموں کا ملک کچل ڈالا

جو سوئے ہوئے تھے جاگ اٹھے جو غافل تھے ہوشیار ہوئے
عورت ہی نہیں حیوانوں کو حق دینے پر تیار ہوئے

اب سمجھے عورت انساں ہے "من نفس واحدۃ" پڑھ کر
خود بھی گرنے سے باز رہے عورت کو تھام لیا بڑھ کر

قوموں میں آج زباں زد ہیں الفاظ حقوقِ نسواں کے
یہ بھولے ہوئے افسانے ہیں اسلامی عہد وپیماں کے

"ممّا اکتسبوا" والے سمجھے رازِ "من ذکرٍ او اُنثیٰ"
ایمان وعمل میں یکساں ہے رتبہ ہر مرد وعورت کا

ہمدوش بنایا مردوں کا عورت کو اٹھا کر پستی سے
اب عورت بھی آگاہ ہوئی دنیا میں اپنی ہستی سے

عورت کو یوں آزاد کیا پھر دونوں کو پابند کیا
دونوں کو باہم حق دے کر پابندِ چون وچند کیا

پیدا پھر بھی ہونے نہ دیا وہ جذبہ خود سر ہونے کا
جس سے مفہوم بدل جائے دونوں کے برابر ہونے کا

جو شورِ تساوی برپا ہے شوریدہ سری ہے دونوں کی
ہر طرح مُساوی کہہ دینا اک بے خبری ہے دونوں کی

مردوں میں زور صلابت ہے عورت میں ضعف ونزاکت ہے
مردوں میں جوش وتشدد ہے عورت میں جذب ولطافت ہے

اعضاء کی ساخت جداگانہ کردار جدا اطوار جدا
آواز جدا انداز جدا رفتار جدا گفتار جدا

احوال جدا امراض جدا صحت کا طرز جداگانہ
اس سعی و عمل کی دنیا میں خدمت کا طرز جداگانہ

فطرت نے مرد و عورت کو جیسی شخصیت بخشی ہے
اس اہلیت کی تقاضے سے ویسی ہی خدمت بخشی ہے

عورت میں جذب ولطافت ہے یہ اُس کا حسنِ فطرت ہے
عورت کو مرد بنانے کی کوشش فطرت سے بغاوت ہے

عورت کو کھیل بناؤ نہیں مرد و تم کو غیرت کی قسم
غاصب نہ بنو بے چاری کے تمکو اپنی ہمت کی قسم

اللہ کی بندی بہر خدا تو بھی تھوڑا سا ہوش میں آ
کچھ سوچ سمجھ کر پاؤں اٹھا للہ نہ اتنا جوش میں آ

افراط سے بچ تفریط سے بچ فطرت کا عدل کھو جائے
تو اپنی اوج ترقی میں پستی کی گرد نہ ہو جائے

تو بزم طرب کی گردش میں پیمانۂ مُل ہو جائیگی
فانوسِ حیا کی شمع ہے تو جھونکوں میں گل ہو جائے گی

شمع ایوانِ سلیمانی تو نورِ حریم عزت بن
اے ملکۂ حیا کی سلطانہ بلقیسِ سبائے عفت بن

تو دیو صفت اے حور ہوئی سلطانہ تھی مزدور ہوئی
سامانِ سکونِ شوہر تھی اب خود ہی تھک کر چور ہوئی

تو اپنی ذات میں عورت تھی جب مرد بنی عورت نہ رہی
جب مرد بنی تب حق پایا پھر عورت کی عزت نہ رہی

در اصل تجھے کچھ بھی نہ ملا مردانہ حق مردانہ تو
شوہر نہ بنی بیوی نہ رہی کس درجہ ہوئی دیوانہ تو

کیا غیرت ہے؟ بازاروں میں مزدور بنا کر لاڈالا
اُس مرد نے جس کو فطرت نے ٹھہرایا تیرا رکھوالا

جب روپ بھرا اک عورت نے جب مرد بنی ایک نا عورت
تب وہ عزت دی مردوں نے جو اس کے حق میں ہے ذلت

قسامِ ازل کی قسمت میں یہ عیب نمائی خوب نہیں
اے عورت! نا عورت بننا کیا تیرے لئے معیوب نہیں

ہاں گر کے عروج عورت سے تو مردوں میں کھو جائیگی
تو مرد نہیں بن سکتی ہے ہاں خوار و زبوں ہو جائیگی

کیا عورت بننا ذلت ہے؟ اب ہوش میں آ مخمور نہ بن
تو بیوی بن حمال نہ بن تو مادر بن مزدور نہ بن

صوفی کیا کہنا عورت کا عورت ہے گھر کی سلطانہ
عورت فطرت کا جلوہ ہے مرد اس جلوے کا پروانہ

ماخوذ از کلامِ صوفی

دارالعلوم کو صدمہ

ملت اسلامیہ ہند بالخصوص حلقۂ دارالعلوم کے لئے یہ خبر یقیناً باعث رنج وملال ہوگی کہ
۔العلوم دیوبند کے شعبۂ عربی کے استاذ جناب مولانا شاہد حسن بن مولانا سید حسن دیوبندیؒ
،/ذی قعدہ — ۷/ مارچ سنیچر کی شب کو انتقال کر گئے۔ ''اناللہ وانا الیہ راجعون'' ڈاکٹروں کی
تجویز کے مطابق دماغ میں کینسر تھا اور ۲۸/ رمضان المبارک کو مرض کی شدت کی بناء پر
بے ہوشی طاری ہوگئی تھی تو فوراً دہلی لے جائے گئے جہاں دماغ کا آپریشن ہوا اور چند دنوں
کے بعد ہوش آگیا جس سے امید ہو چلی تھی کہ آپریشن کامیاب ہے، اور مولانا مرحوم صحت
یاب ہو جائیں گے لیکن ذی قعدہ کے اوائل میں پھر بیہوشی طاری ہوگئی چنانچہ دوبارہ دلی
لے جائے گئے مگر اس بار ڈاکٹروں نے مایوسی ظاہر کی اور گھر واپس لے جانے کا مشورہ دیا
چنانچہ اسی حالت میں واپس لائے گئے اور چند دن موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا
رہتے ہوئے بالآخر جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

مولانا موصوف دارالعلوم ہی کے ساختہ پرداختہ اور فارغ التحصیل تھے۔ فراغت کے
تقریباً دو سال بعد ہی شعبۂ دینیات میں فارسی کے استاذ منتخب ہوگئے تھے اور تدریجاً ترقی
کرتے کرتے ۱۳۹۸ھ میں شعبۂ عربی میں پہنچ گئے۔ فی الحال درجات چہارم وپنجم وغیرہ کی
کتابیں موصوف کے زیر درس تھیں۔ تفسیر، فقہ اور تاریخ سے مولانا کو خاص مناسبت تھی۔
مزاج کے اعتبار سے سنجیدہ، کم گو، بردبار، کم آمیز اور اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے۔

تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف سے بھی شغف رکھتے تھے آپ کی بعض تالیفات شائع
بھی ہو چکی ہیں، قارئین دارالعلوم سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ مولانا مرحوم کے لئے دعائے
مغفرت اور ترقی درجات کے لئے دعا فرمائیں۔
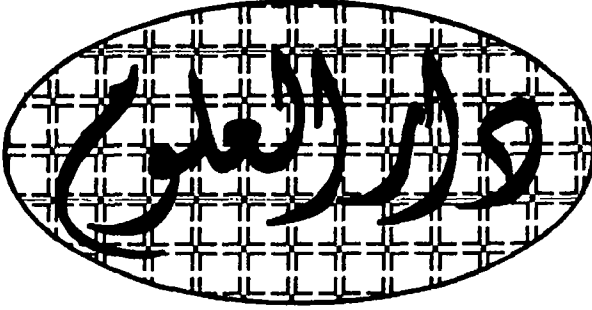
ماہ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۹۸ء

جلد ۸۲	شمارہ ۳	فی شمارہ ۔/۶	سالانہ ۔/۶۰

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ : دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانہ بدل اشتراک	سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۔/۱۰۰ روپے پاکستان سے ہندوستانی رقم ۔/۱۰۰ بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۔/۸۰ ہندوستان سے ۔/۶۰

Tel . 01336 - 22429
FAX : 01336 - 22768
Tel : 01336 - 24034 EDITOR

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے، اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دار العلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

دین ومذہب کی آزادی انسان کے ان بنیادی حقوق میں سے ایک ہے جنھیں انسانیت کا فطری خاصہ مانا جاتا ہے، اور ہر مہذب حکومت نے انسان کے اس فطری حق کا پاس ولحاظ رکھا ہے، خود ہمارے ملک میں جو مختلف افکار ومذاہب اور تہذیب وثقافت کا گہوارہ ہے شخصی عہد سلطنت میں مذہبی آزادی کی کس قدر پاسداری کی جاتی تھی اس کا اندازہ بھارت کے "انگریزی راج" کے مصنف پنڈت سندر لال الہ آبادی کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے:

وہ عہد مغلیہ میں مذہبی آزادی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اکبر جہانگیر، شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو مسلم یکساں رہتے تھے۔ دونوں مذاہب کی یکساں توقیر کی جاتی تھی، اور مذہب کے لئے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانب داری نہ کی جاتی تھی۔ (روشن مستقبل ص ۲۴)

مذاہب عالم کی تاریخ اور واقعات ومشاہدات سے پتہ چلتا ہے کہ آزادیٔ مذہب کا مسئلہ اس درجہ نازک اور جذباتی ہے کہ جب بھی کسی حاکم یا حکومت کی جانب سے اس پر قدغن لگانے کی غیر شریفانہ کوشش کی گئی ہے تو عوام نے اسے برداشت نہیں کیا ہے۔ بلکہ اکثر حالات میں حکومت کا یہی بیجا رویہ بغاوت اور انقلاب کا پیش خیمہ بن گیا ہے۔ آزادیٔ ہند کی تاریخ کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ برطانوی حکومت کے خلاف ۱۸۵۷ء کی تاریخی جدوجہد کا اہم ترین محرک مسلمانوں اور ہندوؤں کا یہ اندیشہ تھا کہ ان کے مذہب میں رخنہ اندازی اور اسے خراب کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جنگ آزادی کے نامور مجاہد اور عظیم رہنما مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک موقع پر حکومت برطانیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

"اسلام کے احکام کوئی راز نہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو وہ چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں اور مدرسوں کے اندر شب و روز اس کا درس دیتے ہیں۔ پس گورنمنٹ کو چاہئے کہ صرف اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام ایسے ہیں یا نہیں! اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر صرف دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئیں یا مسلمانوں کے لئے ان کے مذہب کو چھوڑ دے اور کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے ان کے مذہب میں مداخلت ہو یا پھر اعلان کر دے کہ حکومت کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ نہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ "ان کے مذہب میں مداخلت نہیں ہوگی" اس کے بعد مسلمانوں کے لئے نہایت آسانی ہو جائے گی کہ وہ اپنا وقت بے سود شور و فغاں میں ضائع نہ کریں اور برٹش گورنمنٹ اور اسلام ان دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لئے پسند کرلیں۔ (مسئلہ خلافت و جزیرۂ عرب ص ۲۰۴)

جہاد حریت کے ہراول حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے آج سے تقریباً اسی سال پہلے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر اظہار خیال فرماتے ہوئے مذہبی آزادی کے مسئلہ کی نزاکت کو دو ٹوک لفظوں میں واضح فرمادیا تھا، ملاحظہ کیجئے حضرت کی اختتامی تقریر کا اقتباس فرماتے ہیں:

"میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اجتماع کو بہت ہی مفید اور ضروری سمجھتا ہوں اور حالت کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حال اگر اس کے برخلاف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو آئندہ کے لئے ناممکن بنادے گی اس لئے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں عنصر بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو ان اقوام کی اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے شکست دے سکے گی۔

ہاں میں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت و آشتی کو اگر آپ خوشگوار اور پائدار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دل نشیں کر لیجئے۔ اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں کسی ادنی امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی

ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہوں۔

(جمعیۃ علماء کیا ہے ص ۱۳۲)

حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کے مقام و مرتبہ اور ان کی ہمہ گیر مقبولیت سے باخبر اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ حضرت شیخ الہند کی اپنی تنہا کی آواز نہیں تھی بلکہ یہ پورے ملت اسلامیہ ہند کی ترجمانی تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ کی اسی رائے کو جمعیۃ علمائے ہند نے اپنے لاہور کے عام اجلاس میں بشکل تجویز ان الفاظ میں پیش کیا:

(الف) ہمارا نصب العین آزادیٔ کامل ہے۔

(ب) وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہونگے۔ ان کا مذہب آزاد ہوگا۔ مسلم کلچر اور تہذیب آزادی ہوگی۔ وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

(ج) .... جمعیۃ علماء ہند کے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا سیاسی وفاق ضروری اور مفید ہے مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب وثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہ ہوگی یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصولوں پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔ (جمعیۃ علماء کیا ہے ص ۳۴۳)

پھر اپنی مجلس عاملہ منعقدہ ۱۷/۱۸/ اگست ۱۹۴۲ء کے اجلاس میں دین ومذہب کے متعلق مسلمانوں کے اسی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے واضح الفاظ میں یہ تجویز منظور کی۔

"اس موقعہ پر ہم یہ بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر جمعیۃ علماء کو اس امر کا ذرہ بھر بھی وہم ہوتا ہے کہ جدوجہد آزادی کا نتیجہ ہندوستان میں ہندوراج قائم ہو جاتا ہے تو وہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر اس کی شدید مخالفت کرتی"۔

"ہم آزاد ہندوستان سے وہ آزاد ہندوستان مراد لیتے ہیں جس میں مسلمانوں کا مذہب ان کی اسلامی تہذیب اور قومی خصوصیات آزاد ہوں.... مسلمان جو انگریز کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بیش بہا اور شاندار قربانیاں پیش کریں گے ان کی نسبت ہندو کی غلامی قبول کرنے کا تصور بھی ان کی سخت توہین ہے" (جمعیۃ علماء کیا ہے ص ۳۴۳-۳۴۴)

ان تفصیلات سے سمجھا جاسکتا ہے کہ دین ومذہب کا مسئلہ کس قدر نازک اور جذباتی ہے۔ بالخصوص مسلمان اس بارے میں کسدرجہ حساس ہیں مذہب کی اسی حیثیت واہمیت کا نتیجہ ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد جب آزاد ہندوستان کا دستور مرتب ہوا تو اس میں خصوصی طور پر مذہبی حقوق پر توجہ دی گئی اور آزادی مذہب کو بنیادی اصول میں شامل کیا گیا اور اس کے تحت حسب ذیل دفعات رکھی گئیں:

دفعہ ۲۵۔ (ا) تمام اشخاص کو آزادیٔ ضمیر، اور آزادی سے مذہب قبول کرنے، اس پیروی اور اس کی تبلیغ مساوی حق ہے بشرطیکہ امن عامہ، اخلاق عامہ، صحت عامہ اور اس حصہ کی دیگر توضیعات متأثر نہ ہوں۔

دفعہ ۲۶۔ اس شرط کے ساتھ کہ امن عامہ، اور صحت عامہ متأثر نہ ہوں ہر ایک مذہبی فرقے یا اس کے کسی طبقے کو حق گا۔

(الف) مذہبی اور خیراتی اغراض ادارے قائم کرنے اور چلانے کا

(ب) اپنے مذہبی امور کا انتظام خود کرنے کا الخ

دفعہ ۲۷۔ کسی شخص، کو ایسے ٹیکسوں کے ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جن کی آمدنی کسی خاص مذہب یا مذہبی فرقہ کی ترقی یا اس کو قائم رکھنے کے مصارف ادا کرنے کے لئے صراحتاً تصرف کی جائے۔

دفعہ ۲۸۔ (ا) کسی ایسے تعلیمی ادارے میں جو بالکلیہ مملکتی فنڈ سے چلایا جاتا ہو کوئی مذہبی تعلیم نہیں دی جائے گی۔

(۲) فقرہ (ا) کے کسی امر کا اطلاق ایسے تعلیمی ادارہ پر نہیں ہوگا جس کا انتظام مملکت کرتی ہو لیکن جو کسی ایسے وقف یا ٹرسٹ کے تحت قائم کیا گیا ہو جو ایسے ادارہ میں مذہبی تعلیم دینا لازم قرار دے۔

(۳) کسی ایسے شخص پر جو کسی ایسے تعلیمی ادارہ میں شریک ہو جو مملکت کا مسلمہ ہو یا جس کو مملکتی فنڈ سے امداد ملتی ہو لازم نہ ہوگا کہ کسی ایسی مذہبی تعلیم میں حصہ لے جو ایسے ادارے میں دی جائے یا ایسی مذہبی عبادت میں میں شریک ہو جو ایسے ادارہ میں یا اس ملحقہ عمارت واراضی میں کی جائے بجز اس کے کہ ایسے شخص نے یا اگر وہ نابالغ ہو تو اس کے ولی نے اس کے لئے اپنی رضامندی دی ہو۔

ثقافتی اور تعلیمی حقوق سے متعلق دفعات

دفعہ ۲۹۔ (۱) بھارت کے علاقہ میں یا اس کے کسی حصہ میں رہنے والے شہریوں کے کسی طبقہ کو جس کی اپنی الگ جداگانہ زبان، رسم الخط، یا ثقافت ہو اس کو محفوظ رکھنے کا حق ہوگا۔

(۲) کسی شہری کو ایسے تعلیمی ادارہ میں جس کو مملکت چلاتی ہو یا جس کو مملکتی فنڈ سے امداد ملتی ہو داخلہ دینے سے محض مذہب، نسل، ذات، زبان یا ان میں سے کسی بنا پر انکار نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ ۳۰۔ تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی بنا پر ہوں یا زبان کی اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق ہوگا۔ (بھارت کا آئین یکم جنوری ۱۹۸۵ء تک ترمیم شدہ شائع کردہ ترقی اردو بیورو وزارت تعلیم حصہ ۳ بنیادی حقوق ص ۴۶-۴۷) ان دستوری مستحکم ضمانتوں کے ساتھ دستور ساز اسمبلی میں اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو اطمنان دلاتے ہوئے سردار ولبھ بھائی پٹیل نے یقین دہانی کرائی تھی کہ ان کے مفادات کا ان کے اطمنان کی حد تک خیال رکھا جائے گا اور اسے اسٹیٹ ایک مشن یعنی کاز کی حیثیت دے گا۔

مگر راج گدی پر بیٹھتے ہی یہ سارے عہد و پیمان اور قول و قرار ہوس اقتدار کی نظر ہو گئے اور ایک خاموش تحریک شروع کردی گئی کہ نصاب تعلیم اور سرکاری اسکولوں کے ماحول کے ذریعہ ہندو تہذیب بلکہ صحیح لفظوں میں برہمن ازم کو یہاں کے بچہ بچہ کے دل و دماغ میں اتار دیا جائے۔ اور پہلے قدم کے طور پر گاندھی جی کی مشہور پرارتھنا اسکولوں میں جاری کی گئی جس میں مسلم بچوں کی شرکت بھی لازم کردی گئی۔ جس کے کے بند یہ ہیں:

رگھوپتی رادھے راجہ رام پتت پاون سیتارام
پتت پاون سیتارام ایشور، اللہ تیرے نام

چنانچہ ایک مسلم ماسٹر نے اس سلسلہ میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کو خط لکھکر یہ اطلاع دی کہ سرکاری اسکولوں میں یہ پرارتھنا لازم کردی گئی ہے جبکہ مسلم بچوں کو مذہبی بنیاد پر اس پر اعتراض ہے تو کیا واقعی اسلامی نقطہ نظر سے اس میں کوئی بات قابل اعتراض ہے۔ اس کے جواب میں حضرت مجاہد ملت نے تحریر فرمایا

"گاندھی جی کا یہ گیت اسلام کے عقیدۂ توحید کے بالکل خلاف ہے اس لئے کہ اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ ایشور، خدا اس ذات کا نام ہے جو نہ

کسی کا باپ ہے، اور نہ کسی کی اولاد نہ کسی کا شوہر نہ بیوی وہ ان تمام رشتوں سے پاک ہے، اس کا کوئی ہمسر اور برابر نہیں (سورۂ اخلاص)

جس گیت میں رام، ایشور اور اللہ کو ایک ہی بتایا جارہا ہے اور ساتھ رام کو ستیا جی کا پتی اور ستیا جی کو رام کا دھرم پتنی کہا جارہا ہے تو ظاہر ہے کہ اسلام اس کو قبول نہیں کرسکتا مسلمان بچوں کو اعتراض ہے تو بجا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کو اس گیت کے گانے پر مجبور کیا جائے اس لئے کہ ایک سیکولر اسٹیٹ میں یہ بھی جائز نہیں ہوسکتا"

اسی برہمنی تہذیب کو عام کرنے کی ہوس میں مختلف نام کی تصویروں اور مجسموں پر بطور عقیدت پھول مالائیں چھڑانے کا نہ صرف رواج دیا گیا بلکہ اسے ضروری قرار دیا جانے لگا چنانچہ اس سلسلے میں بھی مولانا موصوف کے پاس ایک مراسلہ آیا جس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

"آپ نے اپنے خط میں دو سوال کئے ہیں یہ یہ ہیں:

(۱) کیا یہ صحیح ہے کہ مذہب اسلام کی رو سے کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی بھی تصویر یا مجسمہ پر ہار پھول چڑھائے؟

(۲) کیا ملک کا سیکولر آئین یا کانگریس کا دستور کسی شخص کے لئے یہ لازم قرار دیتا ہے کہ وہ ملک و وطن کے کسی لیڈر کی تصویر یا مجسمہ پر ضرور ہار پھول چڑھائے اور جو شخص ایسا کرنے سے اپنے مذہب کی پابندی کرتے ہوئے انکار کردے تو اس کو مجرم سمجھا جائے؟

آپ نے جو سوالات تحریر فرمائے ہیں ان کا جواب درج ذیل ہے۔

(۱) مسٹر معین الدین وزیر آسام نے جو عمل کیا ہے وہ اسلامی بنیادی عقیدہ کے اعتبار سے قابل ستائش ہے میں ان کو جرأت حق کی داد دیتا ہوں، اسلام کے عقیدۂ توحید کا تقاضہ ہے کہ کوئی عمل مسلمان ایسا نہ کرے جس سے اس کے بنیادی عقیدہ پر بالواسطہ یا بلاواسطہ زد پڑتی ہو اسلام نے اسی وجہ سے نبی اور پیغمبروں کے ساتھ بھی اس طرح کے عمل کی اجازت نہیں دی ہے جس سے پرستش کا شائبہ یا واہمہ ہوتا ہو اسلام نے اسی بناء پر نبیوں اور پیغمبروں حتی کہ رسول پاک ﷺ کی تصویر بنانے کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اسلام اور حضورؐ کی توہین قرار دیا ہے۔

اس لئے گاندھی جی کی شخصیت کی عظمت اپنی جگہ قابل تسلیم رہتے ہوئے بھی کسی

مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ گاندھی جی کی تصویر یا مجسمہ یا کسی بھی مسلم یا غیر مسلم رہنما کی تصویر یا مجسمہ پر ہار پھول چڑھائے۔

(۲) ہماری قومی حکومت کسی خاص مذہبی عقیدہ کی حکومت نہیں ہے بلکہ ملک کے عوام کی ملی جلی جمہوری حکومت ہے جس کو ہم سب سیکولر کے نام سے موسوم کرتے ہیں، سیکولر اسٹیٹ کا جو دستور بنایا گیا ہے اس میں مذہب کی آزادی کو بنیادی حقوق میں اہم ترین حق تسلیم کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے عقیدہ کے مطابق مذہبی آزادی حاصل ہو یعنی کوئی شخصیت یا کوئی کمیونٹی دوسروں سے اپنے مذہبی عقائد اور اعمال زبردستی منوانے کی مجاز نہ ہوگی"۔

یہ ساری تفصیلات اس غرض سے پیش کی جارہی ہیں تاکہ ہوا کا رخ متعین کرنے میں کوئی دقت نہ ہو اور مسلمانوں بالخصوص قائدین ملت کو باور کرلینا چاہئے کہ جب نیتوں میں فتور آجائے تو جمہوریت اور سیکولرزم کے نام پر بھی وہ سب کچھ کیا جاسکتا ہے جو ایک ظالم وجابر شخصی حکومت کرسکتی ہے پھر مسئلہ صرف حکومت اور اسکی مشینری ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں عدلیہ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کیا یہ حیرت ناک بات نہیں ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب عدالتیں ذاتی آزادی، ماحولیاتی تحفظ اور بندھوا مزدوری کے خاتمہ جیسے معاملات میں انتہائی فعال نظر آتی ہے وہیں مذہبی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں سرد مہری دکھائی پڑتی ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ بابری مسجد کی شہادت کے زمانہ میں مسلمانوں کے خلاف واقع فرقہ وارانہ تشدد کے معاملات میں آدھے کو پولیس نے صحیح بتایا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ناقابل تفتیش بھی کہا اور ہماری عدالتیں اس پر خاموش تماشائی بنی رہیں اور بقیہ معاملات جن میں مسلمانوں کی حیثیت ملزمان کی رکھی گئی ہے عدالتوں کی زبردست دلچسپی دکھائی پڑتی ہے۔

اور اب رہی سہی کسر یوپی کی بھاجپائی حکومت پوری کررہی ہے جس کی وزارت تعلیم نے سرکاری اسکولوں میں بلا تفریق ملت ومذہب سب کے لئے بھارت ماتا کی مورتی پر پھول چڑھانا وندے ماترم کہنا، اور سنسکرت پڑھنا لازم کردیا ہے، جب کہ مورتیوں پر پھول چڑھانا، خالص ہندو مت کی عبادت ہے، جو اسلامی عقیدہ کے لحاظ سے کھلا ہوا شرک ہے، وندے ماترم بھی ایک شرکیہ کلمہ ہے، اسی بناپر گجرات ہائی کورٹ نے اسکولوں میں اس کے عمومی نفاذ پر عرصہ ہوا پابندی عائد کردی تھی، (بقیہ صفحہ ۵۱)

قرآن وسنت، آثار صحابہؓ، اجماع امت، تعامل اسلاف، اکابر دیوبند
عصر حاضر کے محققین اور مفتیانِ کرام کی آراء کی روشنی میں

مولانا حافظ نثار احمد الحسنی پاکستان

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے قرب کی دولت سے نوازنے اور گناہوں کی دلدل سے نکالنے کے لئے انبیاء (علیہم السلام) اور آخر میں اپنے محبوب حضرت سیدنا محمد ﷺ کے ذریعہ جو راستے بتائے اور طریقے سکھائے ان میں اللہ تعالیٰ کے پاک نام کا تکرار ذکر اور اس کی یاد ایک مہتم بالشان عبادت ہے قرآن پاک میں جابجا انبیاءؑ اور رسولوں سے لے کر عام مؤمنین تک ہر ایک کو مختلف انداز سے اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کا حکم اور اس کی ضرورت واہمیت کو بیان فرمایا۔

ایک جگہ فرمایا:

وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (عنکبوت ۴۵) اور اللہ تعالیٰ کا ذکر (مرتبہ میں تمام عبادات سے) بڑا ہے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس سرہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

"صاحب مجالس الابرار کہتے ہیں کہ اس حدیث میں اللہ کے ذکر کو صدقہ اور جہاد اور ساری عبادات سے اس لئے افضل فرمایا کہ اصل مقصود اللہ کا ذکر ہے اور ساری عبادتیں اس کا ذریعہ اور آلہ ہیں"۔ (فضائل ذکر ص ۳۰)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا

وَاذْکُرُوْا اللّٰہَ کَثِیْراً لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (الجمعۃ ۱۰) اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ اسی طرح مؤمنین اور مؤمنات کی صفات کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَالذّٰاکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْراً وَّالذّٰاکِرَاتِ (احزاب ۳۵) اور اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرانے والے مرد اور عورتیں خود رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کی ابتدائی آیات میں

ذکر کا حکم فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلاً (المزمل آیت ۸) اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرو اور ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

اس آیت میں اسم ربک فرما کر ایک نکتہ کی طرف اشارہ فرمادیا کہ ذکر سے مراد اللہ تعالیٰ کے نام کا تکرار ہے جو کہ صوم وصلوۃ دعوت و تبلیغ، وعظ وارشاد اور جہاد فی سبیل اللہ سے علیحدہ ایک مستقل عبادت ہے۔

اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ ذکر کے مفہوم سے دوسرے اعمال تبعاً مراد ہوں گے ذکر کے حقیقی مفہوم سے مراد صرف اللہ تعالیٰ کے نام مبارک کا تکرار ہے۔

ذکر کی اہمیت کے پیش نظر رحمتِ دوعالم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اس کی فضیلت اور اہمیت مختلف انداز سے سمجھائی حضرت عبداللہ بن بُسرؓ فرماتے ہیں کہ ایک صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا اسلام کے احکام تو بہت سے ہیں کوئی ایسی چیز بتادیں جسے میں اپنا مشغلہ بنالوں اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

لَايَزَالُ لِسَانُكَ رَطْباً مِنْ ذِكْرِ اللّٰه (احمد، ترمذی) تیری زبان ہر وقت اللہ کے ذکر سے تر رہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے جو میری آخری گفتگو ہوئی اس میں (بطور نعمت کے) فرمایا:

اَنْ تَمُوتَ وَلِسَانُكَ رَطْبٌ مِنْ ذِكْرِ اللّٰه (ابن ابی الدنیا)

اللہ تعالیٰ کا ذکر اتنا کرو کہ تجھے موت آئے تو بھی تیری زبان کے ذکر سے تر ہو۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس سرہ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اس لذت سے اللہ کا پاک نام لیا جائے کہ مزہ آجائے میں نے اپنے بعض بزرگوں کو بکثرت دیکھا ہے کہ ذکر بالجہر کرتے ہوئے ایسی طراوت آجاتی ہے کہ پاس بیٹھنے والا بھی اس کو محسوس کرتا ہے کہ اور ایسا منہ میں پانی بھر جاتا ہے کہ ہر شخص اس کو محسوس کرتا ہے مگر یہ جب حاصل ہوتا ہے کہ جب دِل میں چسک ہو، اور زبان کثرتِ ذکر کے ساتھ مانوس ہو چکی ہو۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ سے محبت کی علامت اس کے ذکر سے محبت ہے اور اللہ سے بغض کی علامت اس کے ذکر سے بغض ہے۔

حضرت ابودرداءؓ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کی زبان اللہ کے ذکر سے تروتازہ رہتی ہے وہ جنت میں ہنستے ہوئے داخل ہوں گے۔ (فضائل ذکر ص ۳۸)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اللہ کا ذکر کرتا ہے اور جو نہیں کرتا ان دونوں کی مثال زندہ اور مُردے کی سی ہے کہ ذکر کرنے والا زندہ ہے اور ذکر نہ کرنے والا مردہ ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنیؒ اس حدیث مبارکہ کی تشریح میں لکھتے ہیں:

بعض علماء نے فرمایا ہے یہ دل کی حالت کا بیان ہے کہ جو شخص اللہ کا ذکر کرتا ہے اس کا دل زندہ رہتا ہے، اور جو ذکر نہیں کرتا اس کا دل مر جاتا ہے اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ تشبیہ نفع اور نقصان کے اعتبار سے ہے کہ اللہ کا ذکر کرنے والے شخص کو جو ستائے وہ ایسا ہے جیسا کسی زندہ کو ستائے کہ اس سے انتقام لیا جائے گا۔ اور وہ اپنے کیئے کو بھگتے گا۔ اور غیر ذاکر کو ستانے والا ایسا ہے جیسا مُردہ کو ستانے والا کہ وہ خود انتقام نہیں لے سکتا صوفیاء کہتے ہیں کہ اس سے ہمیشہ کی زندگی مُراد ہے کہ اللہ کا ذکر کثرت سے اخلاص کیساتھ کرنے والے مرتے ہی نہیں۔ بلکہ وہ اس دنیا سے منتقل ہو جانے کے بعد بھی زندوں کے حکم میں رہتے ہیں جیسا کہ قرآن پاک میں شہید کے متعلق وارد ہوا ہے بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ اسی طرح ان کے لئے بھی ایک خاص قسم کی زندگی ہے۔ حکیم ترمذیؒ کہتے ہیں کہ اللہ کا ذکر دِل کو تر کرتا ہے اور نرمی پیدا کرتا ہے اور جب دل اللہ کے ذکر سے خالی ہوتا ہے تو نفس کی گرمی اور شہوت کی آگ سے خشک ہو کر سخت ہو جاتا ہے اور سارے اعضاء سخت ہو جاتے ہیں طاعت سے رک جاتے ہیں اگر ان اعضاء کو کھینچو تو ٹوٹ جائیں گے جیسے کہ خشک لکڑی کہ جھکانے سے نہیں جھکتی صرف کاٹ کر جلا دینے کے کام کی رہ جاتی ہے۔ (فضائل ذکر ص ۲۳)

احادیث کے مطالعہ سے ذکر اللہ کے اتنے فضائل سامنے آتے ہیں کہ ان کا احاطہ مشکل ہے آپ ﷺ نے ذکر اللہ کو صدقہ سے افضل، قیامت کے دن باقی اعمال کی نسبت سب سے زیادہ نجات دلانے والا، روز محشر عزت واکرام کا باعث وغیرہ فرمایا۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس سرہ فرماتے ہیں "علماء نے ذکر کے ظاہری باطنی منافع سو ۱۰۰ تک شمار فرمائے ہیں .... حافظ ابن قیم ایک مشہور محدث، ہیں

انہوں نے ایک مبسوط رسالہ عربی میں "الوابل الصیّب" کے نام سے ذکر کے فضائل میں تصنیف کیا جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ذکر میں سو سے بھی زیادہ فائدے ہیں۔ (فضائل ذکر ص ٦٩)

"مجالس ذکر"

ذکر اللہ کی فضیلت اور اہمیت کو سمجھانے، ذاکرین کے قلوب میں اس عظیم الشان عبادت کے ذوق و شوق کے پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ اجتماعی طور پر مل بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا بھی ہے اصطلاح شریعت میں اسے مجالس ذکر یا حلقہ ذکر سے موسوم کیا جاتا ہے قرآن پاک میں اس اجتماعی عبادت کے فضائل و برکات کو ایک لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کا ذوق حمد و ثناان کی شخصیت کا ایک حسین باب ہے یہاں تک کہ "لحنِ داؤدی" کا محاورہ ہمارے ادب میں ایک اہم عنوان سمجھا جاتا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام جب اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان فرماتے تو ان کا سوز لحن جن و انس، دشت و جبل، یہاں تک کہ کائنات کی ہر چیز کو ان کا ہمنوا کر دیتا تھا قرآن پاک نے اس ذوق و وجد کے حسین منظر کو یوں بیان کیا ہے۔

اِناسَخَّرْنَا الجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بالْعَشِيِّ وَالاِشْرَاق. وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَ ةً. كُلٌّ لَه اَوَّاب۔ (پارہ ۲۳ سورہ ص ۱۸، ۱۹)

اور ہم نے پہاڑوں کو ان کے زیر فرمان کر دیا تھا کہ صبح و شام ان کے ساتھ (اللہ تعالیٰ کا) ذکر کرتے تھے اور پرندوں کو بھی (جو ذکر کے لئے ان کے گرد) رہتے تھے سب ان کے فرمانبردار تھے۔

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ اس آیت سے مسائل سلوک کا استنباط کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يُؤخَذُ مِنْهُ امرَانِ الاِجتماعُ عَلى الذِّكْرِتَنْشِيطاً لِلنَّفسِ وَتَقْوِيَةً لِلْمُهِمَّةِ وَتَعَاكُسِ بَرِكَاتِ الجَمَاعَةِ مِنْ بَعضٍ عَلىٰ بَعْضٍ (بیان القرآن ج ۱ ص ۴)

اس کو تسبیح قالی پر محمول کرنے کی صورت میں جیسا کہ قرآن کا ظاہر اور نیز موید بالکشف ہے اس سے دو امر ماخوذ ہوتے ہیں اول اجتماع فی الذکر جس سے تنشیط نفس اور تقویت ہمت

اور برکاتِ ذکر کا باہمی تعاکس حاصل ہوتا ہے اور دوسرے بعض اشغال کی صحت جس میں تمام عالم کو ذاکر تصور کیا جاتا ہے اور اس شغل کی جمع ہمت اور قطع خطرات میں عجیب تاثیر ہے۔

مجالس چونکہ ذکر کے شوق کو بڑھانے اور طبع انسانی میں اس کی رغبت کو زیادہ کرنے کے لئے ایک اہم معاون ہیں اس لیے رحمتِ دوعالم ﷺ نے اجتماعی ذکر کے نہ صرف فضائل بیان فرمائے بلکہ اس کا حکم دیا اور خود ایسی مجالس میں شرکت فرمائی۔

ذخیرۂ احادیث میں بکثرت اس کے شواہد موجود ہیں اور کتبِ حدیث میں شاید ہی کوئی متن ایسا ہو جس میں مجالسِ ذکر یا حلقِ ذکر کے جلی عنوان کے ذیل میں محبوب رب العالمین ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے اس عظیم الشان عبادت کے دلائل فضائل و برکات کو ذکر نہ کیا گیا ہو۔

فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب مدظلہ مفتی خیر المدارس ملتان لکھتے ہیں "اور احادیث شریفہ سے محض استنباطی طور پر نہیں بلکہ حضور پاک ﷺ کے صریح ارشادات سے مجلس ذکر کا ثبوت ملتا ہے اور حضرات محدثین نے بھی ان احادیث پر مجالس الذکر، یا حلق الذکر کے ابواب منعقد کیے ہیں دیکھئے مسلم شریف ریاض الصالحین، حیاتِ صحابہؓ وغیرہ"۔
(خیر الفتاویٰ ج ۲ ص ۷۰۴)

ذخیرۂ احادیث میں سے چند معتبر کتبِ حدیث سے مجالسِ ذکر کے متعلق حضورِ انور ﷺ کے چند ارشادات نقل کیے جاتے ہیں جن سے ان مجالس کی اہمیت، فضائل و برکات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

عن مُعٰویۃؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم خَرَجَ عَلٰی حَلْقَۃٍ مِنْ اَصْحَابہ فَقَالَ مَا اَجْلَسَکُمْ قَالُوْا جَلَسْنا نَذْکُرُ واللّٰہَ وَنَحْمَدُہٗ عَلٰی مَاھَدٰنَا لِلْاِسْلَامَ وَمَنَّ بہ عَلَیْنَا قَالَ اللّٰہُ مَا اَجْلَسَکُمْ اِلاَّ ذٰلِکَ قَالُوا اللّٰہُ مَا اَجْلَسْنَا اِلاَّ ذٰلِکَ قَالَ مَا اِنِّی لَمْ اَسْتَحْلِفکُم تُھمَۃً لَکُمْ وَلٰکِنْ اِتَانِیْ جِبْرَئِیْلُ فَاَخْبَرَنِیْ اَنَّ اللّٰہَ یُبَاھِیْ بِکُمُ الْمَلاَئِکَۃَ. (اخرجہ ابن ابی شیبہ واحمد ومسلم والترمذی والنسائی المشکوۃ)

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ صحابہؓ کی ایک جماعت کے پاس تشریف لے گئے اور دریافت فرمایا کہ کس بات نے تم لوگوں کو یہاں بٹھایا ہے عرض کیا اللہ جل شانہ کا ذکر کر رہے ہیں اور اس بات پر اس کی حمد و ثنا کر رہے ہیں کہ اس نے ہم لوگوں کو اسلام کی دولت سے نوازا یہ اللہ کا بڑا ہی احسان ہم پر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا خدا کی قسم

صرف اسی وجہ سے بیٹھے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی بد گمانی کی وجہ سے میں نے تم سے لوگوں کو قسم نہیں دی بلکہ جبرئیل میرے پاس ابھی ابھی آئے تھے اور یہ خبر سنا گئے کہ اللہ جل شانہ تم لوگوں کی وجہ سے ملائکہ پر فخر فرما رہے ہیں۔

عن انسؓ عن رسُول اللہِ صلّی اللہ علیہ وسلم قالَ مِامنْ قَومِ اجتَمَعُوا یذکُرونَ اللّٰہَ لَایُریدونَ بذٰلك اِلاَّ وَجْھہ اِلاَّ ناداھُمْ مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ اَنْ قُوْمُوْا مَغفُورًا لکُم قَدْ بَدلَتُ سَیّاٰتِکم حَسنَاتٍ (اخرجہ احمد والبزار وابویعلی والطبرانی عن سھل بن الحنظلیۃ ایضاً واخرجہ البیھقی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو بھی لوگ اللہ کے ذکر کے لئے مجتمع ہوں اور ان کا مقصد صرف اللہ ہی کی رضا ہو تو آسمان سے ایک فرشتہ ندا کرتا ہے کہ تم لوگ بخش دیے گئے اور تمہاری بُرائیاں نیکیوں سے بدل دی گئیں۔

عن ابی الدَّرْداءؓ قالَ قالَ رسُوْل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَیَبْعَثَنَّ اللّٰہُ اَقواماً یومَ القِیٰمۃِ فِیْ وُجُوھِھِمُ النُّورُ علیٰ مَنَابرَ اللُّؤلؤِ یَغبطُھُمْ النَّاسُ لِیسُوا بانبیآءَ ولاَ شُھَدآءَ فَقالَ اَعرابیٌ حَلْھُمْ لَنا نعرفُھُمْ قَالَ ھُمْ المتحابُّونَ فِیْ اللہِ مِنْ قَبَائِلٍ شَتّٰی و بلاَدٍ شتّٰی یَجْتَمِعُوْنَ عَلیٰ ذِکْرِاللّٰہِ یَذْکُرُوْنَہ. (طبرانی باسنادٍ حسنٍ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن اللہ جل شانہ بعض قوموں کا حشر اس طرح فرمائیں گے کہ ان کے چہروں میں نُور چمکتا ہوا ہوگا وہ موتیوں کے منبروں پر ہوں گے لوگ ان پر رشک کرتے ہوں گے وہ انبیاء اور شہداء نہیں ہوں گے کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کا حال بیان کر دیجئے کہ ہم ان کو پہچان لیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی محبت میں مختلف جگہ جمع ہو گئے ہوں اور اللہ کے ذکر میں مشغول ہوں۔

عَنْ انَسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلّٰی اللّٰہِ عَلَیْہِ وسَلَّمْ قَالَ اِذَا مَرَرْتُمْ بِرِیَاضِ الجَنَّۃِ فَارتَعُوا قَالَ وَمَارِیاضُ الجَنَّۃِ قَالَ حَلِقُ الذِّکْرِ . (احمد ، ترمذی)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب جنت کے باغوں پر گزرو تو خوب چرو کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جنت کے باغ کیا ہیں ارشاد فرمایا: کہ ذکر کے حلقے۔

عن ابی ہریرۃؓ اَنَّ رسولَ اللّٰہِ صَلی اللّٰہِ عَلَیْہِ وسَلّم قالَ ما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللّٰہ تعالیٰ یتلون کتب اللہ ویتدارسونہ بلیھتم الا نزلت علیھم السکینۃ وغشیھم الرحمۃ وحفتھم الملائکۃ وذکرھم اللّٰہ فِیمَنْ عِندہ (ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نہیں مجتمع ہوا کوئی مجمع کسی گھر میں اللہ کے گھروں میں سے کہ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہوں اور باہم اس کو پڑھتے ہوں مگر نازل ہوتی ہے ان پر کیفیت تسکین قلبی کی اور ڈھانپ لیتی ہے ان کو رحمت اور گھیر لیتے ہیں ان کو ملائکہ اور ذکر فرماتے ہیں ان کا اللہ تعالیٰ اُن (ارواح ملائکہ) میں جو کہ اللہ کے پاس ہیں۔

اس حدیث کی شرح میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ مجالسِ ذکر کے فوائد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(۱) بہت سے ذاکرین کے ایک جگہ جمع ہوکر ذکر کرنے سے دلچسپی ذکر میں (پیدا ہوتی ہے)

(۲) تعاکس انوارِ قلوب (ایک جگہ اجتماع میں ایک دوسرے کے قلوب کے انوارات کا ایک دوسرے پر اثر)

(۳) نشاط (ذاکرین کی طبیعت میں رُوحانی خوشی)

(۴) ہمت کا بڑھنا (ایک دوسرے کو دیکھ کر ذکر کا شوق پیدا ہونا)

(۵) سستی کا رفع ہونا (اجتماع کی برکت سے انفرادی ذکر میں سستی کا دور ہونا)

(۶) مداوت میں سہولت (اجتماع کی برکت سے ذکر کے معمولات میں ہمیشگی کا پیدا ہونا)

(التکشفُ فی مھمّات التصّوف ص ۴۹۰)

عَنْ یَعْلی بْنِ شدَّادِ قالَ حَدَّثَنِی اَبی شَدَّاد ابْنِ اَوْسٍ وَعُبادۃُ ابنُ الصَّامِتِ حَاضِرٌ یُصَدِّقُ قَالَ کُنا عِنْدَ النَبیّ صَلّیٰ عَلَیْہِ وسلمَ فَقَالَ ھَلْ فِیکُمْ غَرِیْبٌ یعنیْ اَھْلَ الکِتٰبِ قُلناَ لاَ یارسُولَ اللہِ فَامَرَ بغَلَقِ الاَبْواب وَقَالَ ارفَعُوْا اَیْدِیْکُمْ وَ قُولُوْ لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ فَرَفَعْناَ اِیدِیناَ ساعَۃً ثُمَّ قَالَ اَلحَدُ لِلِہِ اِللّٰھمّ اِنَکَ بَعَثْتَنِیْ بھٰذِہِ الکلِمۃِ وَوَ عدتَّنِی عَلَیْھا الْجَنَّۃَ وَاَنتَ لاَتُخلِف الْمیْعَادَ ثُمَّ قَالَ اَبْشِرُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ قَدْ غَفَرَلَکُم (رواہ احمد)

حضرت شداد فرماتے ہیں اور حضرت عبادہؓ اس واقعہ کی تصدیق کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ

ہم لوگ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کوئی اجنبی (غیر مسلم) تو مجمع میں نہیں ہم نے عرض کیا کہ کوئی نہیں ارشاد فرمایا کہ کواڑ بند کر دو اُس کے بعد ارشاد فرمایا ہاتھ اٹھاؤ اور کہو لاالٰہَ اِلاَّ اللّٰہَ ۔ ہم نے تھوڑی دیر ہاتھ اٹھائے رکھے اور کلمہ طیبہ پڑھا پھر فرمایا الحمد اللہ اے اللہ تو نے مجھے یہ کلمہ دے کر بھیجا ہے اور اس کلمہ پر جنت کا وعدہ کیا ہے اور تو وعدہ خلاف نہیں ہے اس کے بعد حضور اقدس ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ خوش ہو جاؤ اللہ نے تمہاری مغفرت فرمادی۔

اس حدیث کی تشریح میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس سرہ فرماتے ہیں:

صوفیاء نے اس حدیث سے مشائخ کا اپنے مریدین کی جماعت کو ذکر تلقین کرنے پر استدلال کیا ہے چنانچہ جامع الاصول میں لکھا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہؓ کو جماعۃً اور منفرداً ذکر تلقین کرنا ثابت ہے جماعت کو تلقین کرنے میں اس حدیث کو پیش کیا ہے اس حدیث میں کواڑوں کا بند کرنا مستفیدین کی توجہ کے تام کرنے کی غرض سے ہوا اور اسی وجہ سے اجنبی کو دریافت فرمایا کہ غیر کا مجمع میں ہونا حضور ﷺ پر تشتت کا سبب اگرچہ نہ ہو لیکن مستفیدین کے تشتت کا احتمال تو تھا ہی۔ (فضائل ذکر ص ۱۰۳)

بعض مواقع پر مجالس ذکر میں بتیاں گل کر کے اندھیرا کرنے کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ ذاکرین ایک دوسرے کے بجائے اپنے اپنے ذکر پر توجہ دیں اور دھیان اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہٹائیں جیسا کہ امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ کے ہاں معمول تھا اور ان کے سلاسلِ مبارکہ میں اب بھی ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

”بزرگوں نے جو اشغال تجویز کیے ہیں ان سب سے مقصود اصلی یہ ہے کہ انتشار جو بوجہ تشویش افکار کے ہے دفع ہو کر جمعیت خاطر اور خیال کی یکسوئی حاصل ہو تاکہ اس کے خوگر ہونے سے توجہ تام الی اللہ جو کہ مبتدی کو بوجہ غیب ہونے مدرک کے اور مزاحم ہونے افکار مختلف وحسیات حاضرہ کے متعذر ہے“۔ (التکشف فی مہمات التصوف ص ۴۸۴)

الحمد لله وسلام علی عباده الذین اصطفیٰ خصوصاً علی سید الرسل وخاتم الانبیاء وعلی آله الأتقیاء واصحابه الاصفیاء امابعد!

ماہ ربیع الاول کی آمد آمد ہے، اور ہر طرف سے جلوس کی پکار شروع ہو چکی ہے، سال گذشتہ بھی اس قسم کی بدعات کے جواز پر مضامین تحریر کئے گئے اور لوگوں کو اس جانب متوجہ کیا گیا تھا۔ دوسری طرف اہل حق حضرات نے ان تمام مضامین کا علمی و تحقیقی جواب دیا۔ ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند میں ایک مضمون "مروجہ میلادالنبی پر دلائل کا جائزہ" کے نام سے شائع ہوا تھا، جس میں مروجہ میلاد کی حقیقت سے نقاب کشائی کی گئی تھی اور نہایت جلیل القدر اکابرین ملت کی تحریرات کی روشنی میں اس مسئلے کو بیان کر دیا گیا تھا، اور بتلا دیا گیا تھا کہ اگر مروجہ عید میلاد کا تعلق دین قیم سے ہوتا تو ضرور حضرات صحابہ کرامؓ، تابعین کرام، ائمہ مجتہدین اور اکابرین ملت اس مسئلے پر روشنی ڈالتے اور آنے والی امت کو اس کی ترغیب و تلقین کرتے، آخر میں ہم نے سیدنا مجدد الف ثانی الشیخ احمد السرہندی قدس سرہ السامی کی ایک فیصلہ کن تحریر بھی درج فرمائی تھی کہ آپ بھی اس مروجہ عید میلاد کے سخت مخالف اور ایسی باتوں پر سخت ناراضگی کا اظہار کر چکے ہیں۔

مگر نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ابھی پچھلے دنوں ہمیں ایک رسالہ "چالیس ارشادات امام ربانیؒ" مولفہ مولانا ابوالبرکات سید احمد خلیفہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کا موصول ہوا، جس میں موصوف نے امام ربانیؒ کی طرف یہ بات منسوب کی کہ حضرت امام ربانیؒ بھی میلاد کے قائل تھے۔ دیئے گئے حوالہ کے مطابق جب ہم نے مکتوبات امام ربانیؒ پر نظر کی تو ہمیں صراحۃً تحریف معلوم ہوئی، حضرت امام ربانی نے جس سوال کا جواب رقم فرمایا ہے وہ جواب

ندارد، بلکہ سوال ہی کو حضرت امام ربانیؒ کی طرف منسوب کردیا گیا۔ اور جہاں سے جواب شروع ہوتا ہے اس جواب کے شروع کے الفاظ بھی غائب اور درمیان میں چند الفاظ کا بھی اضافہ کردیا گیا۔

موصوف حضرت امام ربانیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

مجلس میلاد شریف میں اگر اچھی آواز کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کی جائے اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی نعت شریف اور صحابہ کرام واہل بیت عظام واولیاء اعلام رضی اللہ عنہم المعام کی منقبت کے قصیدے پڑھے جائیں تو اس میں کیا حرج ہے؟ ناجائز بات تو یہ ہے کہ قرآن عظیم کے حروف میں تغیر و تحریف کردی جائے اور قصیدے پڑھنے میں راگنی اور موسیقی کے قواعد کی رعایت وپابندی کی جائے اور تالیاں بجائی جائیں جس میلاد مبارک میں یہ ناجائز باتیں نہ ہوں اس کے ناجائز ہونے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے، ہاں جب تک راگنی اور تال سر کے ساتھ گانے اور تالیاں بجانے کا دروازہ بالکل بند نہ کیا جائے گا بوالہوس لوگ باز نہ آئیں گے، اگر ان نامشروع باتوں کی ذرا سی بھی اجازت دے دی جائے گی تو اس کا نتیجہ بہت خراب نکلے گا"

(مکتوب نمبر ۷۲ جلد سوم صفحہ ۱۱۶) (ارشادات مجدد الف ثانی صفحہ ۱۳۰، اشاعت پنجم)

سیدنا مجدد الف ثانیؒ کی اصل عبارت کیا ہے، اسے پڑھئے چوری پکڑی جائے گی۔ خواجہ حسام الدینؒ نے امام ربانیؒ کی طرف چند باتوں کے بارے میں استفسار کیا تھا جس میں انہوں نے مولود خوانی کے بارے میں بھی پوچھا تھا، امام ربانیؒ لکھتے ہیں:

دیگر درباب مولود خوانی اندراج یافتہ بود در نفس قرآن خواندن بصورت حسن در قصائد نعت ومنقبت خواندن چہ مضائقہ است؟ ممنوع تحریف و تغیر حروف قرآن است والتزام رعایت مقامات نغمہ وتردید صوت بآں طریق الحان با تصفیق مناسب آں کہ در شعر نیز غیر مباح است اگر بر نہج خوانند کہ تحریفے در کلمات قرآنی واقع نشود و در قصائد خواندن شرائط مذکورہ متحقق نگردد آں راہم بغرض صحیح تجویز نمایند چہ مانع است؟

خواجہ حسام الدینؒ کا سوال یہ تھا جسے آپ تحریر فرمارہے ہیں کہ:

دوسری بات مولود خوانی کے بارے میں لکھی تھی کہ قرآن کریم کو اچھی آواز سے پڑھنے اور نعت ومناقب کے قصیدے پڑھنے میں کیا حرج ہے؟

ممنوع تو وہ ہے کہ حروف قرآن میں تبدیلی و تحریف ہو جائے اور مقامات نغمہ کی رعایت اور اس طرز پر آواز نکالنا اور سر نکالنا و تالی بجانا وغیرہ جو کہ شعر میں بھی ناجائز ہیں۔ اگر اس طرح پڑھیں کہ کلمات قرآنی میں کوئی تحریف نہ ہونے پائے اور قصیدے پڑھنے میں بھی مذکورہ صورتیں نہ پائی جائیں اور اسے بھی کسی صحیح مقصد کے لئے پڑھا جائے تو اس میں کیا مانع ہے؟

اس سوال کا جو جواب امام ربانیؒ نے دیا ہے وہ یہ ہے کہ:

مخدوما بخاطر فقیرے رسد تا سد ایں باب مطلق نکنند بوالہوساں ممنوع نمی گردند اگر اندک تجویز کردند منجر بہ بسیار خواہد شد قلیلة تفضی الی کثیرة قول مشہور است۔ والسلام

میرے مخدوم! فقیر کی دل میں یہی بات آتی ہے کہ جب تک اس کا دروازہ مطلقاً بند نہ کیا جائے گا بوالہوس لوگ باز نہیں آئیں گے اگر اس کی کچھ بھی اجازت دے دی جائے تو اس سے بات بڑھ جائے گی۔ تھوڑی بات زیادہ تک پہنچاتی ہے۔ مشہور قول ہے۔ والسلام

غور فرمایئے حضرت امام ربانیؒ اس مولود خوانی کے بارے میں سوال کا جواب دے رہے ہیں جس میں کوئی خلاف شرع بات نہ ہو۔ سائل خود خلاف شرع چیزوں کو اپنے سوال میں بھی بیان کر رہا ہے، اور ان تمام چیزوں کے باوجود سیدنا مجدد الف ثانیؒ کا جواب آپ کے سامنے ہے مگر ان محرفوں نے سیدنا امام ربانیؒ کے اس مکتوب کا جو حشر کیا ہے اس سے واقعہ کی اصل نوعیت اور مسئلہ کی اصل حقیقت ہی بدل گئی۔

حضرت امام ربانیؒ کا جواب "مخدوما" سے شروع ہو رہا ہے مگر مولانا ابوالبرکات صاحب خلیفۂ اعلیٰ حضرت نے اپنے حق خلافت کی لاج رکھ کر یہ لفظ ہی گول کر دیا۔ پھر طرہ یہ کہ حضرت امام ربانیؒ کے الفاظ میں خط کشیدہ جملہ ہی نہ تھا مگر مولانا ابوالبرکات صاحب اسے امام ربانی کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار.**

حضرت امام ربانیؒ کا اس باب میں ایک اور ارشاد بھی سامنے رکھ لیں تو مسئلے کے سمجھ

میں بہت مدد ملے گی۔ جو پہلے نقل کیا گیا تھا۔ مرزا حسام الدین احمدؒ کے ایک خط کے جواب میں تفصیل سے اس مسئلے کو بیان کرتے ہوئے آخر میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

آپ نظر انصاف سے کام لیں اگر بالفرض حضرت ایشاں (حضرت خواجہ باقی باللہؒ) قدس سرہ اس وقت دنیا میں زندہ ہوتے اور یہ مجلس و اجتماع ان کی موجودگی میں منعقد ہوتا تو آیا حضرت قدس سرہ اس امر سے راضی ہوتے اور اس اجتماع کو پسند کرتے یا نہیں؟ فقیر کا یقین ہے کہ حضرت قدس سرہ ہرگز اس امر کو پسند نہ کرتے بلکہ انکار کرتے۔ فقیر کا مقصد آپ کو جتلا دینا ہے آپ قبول کریں یا نہ کریں، کچھ مضائقہ نہیں اور نہ ہی آپ سے کوئی مشاجرہ اور لڑائی جھگڑے کی گنجائش ہے، اگر مخدوم زادے اور وہاں کے یار اپنی اس وضع پر استقامت رکھیں اور اپنی حالت کو نہ بدلیں تو ہم فقیروں کو ان کی صحبت سے سوائے مایوسی کے اور کچھ چارہ نہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا تکلیف دی جائے۔ والسلام اولاً و آخراً

(ترجمہ: مکتوبات امام ربانی دفتر اول حصہ دوم صفحہ ۲۲۶/ ۲۲۷)

حضرت امام ربانی سیدنا مجدد الف ثانیؒ کے یہ ارشادات آپ کے سامنے ہیں اور مولانا ابوالبرکات کا تحریف کیا ہوا ارشاد بھی آپ نے پڑھا۔ مولانا ابوالبرکات صاحب خلیفۂ اعلیٰ حضرت سے صرف اتنی سی شکایت ہے کہ آپ نے اس ارشاد میں تحریف کیوں فرمائی؟ آپ کا اپنا جو بھی عقیدہ ہوتا اس کو درج کرتے، اس پر اصرار کرتے، جس طرح چاہتے تحریر فرماتے لیکن امام ربانیؒ جیسی متبع سنت و متنفر بدعت ہستی کی طرف ایسا جملہ منسوب کرنا انصاف اور دیانت کا خون کرنا نہیں تو پھر اور کیا ہے؟

مولانا ابوالبرکات صاحب تو خیر سے خلیفۂ اعلیٰ حضرت تھے ہی۔ جیسی اعلیٰ حضرت نے عبارات اکابر میں قطع و برید، تغیر و تبدل، کمی، بیشی فرمائی تھی خلیفہ صاحب نے بھی اسی طرز کو اپنا کر حق خلافت ادا کیا، ان کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے پر ان کے صاحبزادے مولوی محمود احمد رضوی نے حق فرزندی ادا کیا۔ جس طرح باپ نے تحریف شدہ ارشادات کی اشاعت کر کے اپنے مسلک کو تقویت پہنچانے کی سعی فرمائی صاحبزادے صاحب نے بھی بالکل باپ کے طرز عمل کو اپنایا۔

مولانا محمود احمد رضوی لکھتے ہیں کہ: حضرت امام مجدد الف ثانی مکتوبات میں میلاد کے

بارے میں فرماتے ہیں کہ:

نفس قرآں خواندن بصورت حسن ودر قصائد و منقبت خواندن چہ مضائقہ است۔

کہ اچھی آواز کے ساتھ قرآن قصیدے، نعت شریف اور فضائل بیان کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ (اسلامی تصریحات: ص ۲۳)

۔ خلیفہ اعلیٰ حضرت نے تو پوری عبارت لکھ کر اس میں تحریف فرمائی تھی۔ اب صاحبزادہ سوال کو بھی غائب کر گئے اور جواب بھی ہضم فرما گئے، سوال کے ایک جملے کو حضرت امام ربانیؒ کا قول بتلا کر اپنے عوام سے داد تحسین حاصل کرنا چاہتے ہیں، کیا اپنے عقائد و مسالک کی ترویج و اشاعت کے لئے اکابرین ملتؒ کے ارشادات میں تحریف کرنا جائز ہے؟

(مولوی محمد شفیع اوکاڑوی نے بھی اپنی کتاب برکاتِ میلاد شریف میں بعینہ یہی الفاظ درج کئے ہیں دیکھئے ص ۷)

مولانا ابوالبرکات کا یہ رسالہ بار بار چھپا اور اس میں عبارت جوں کی توں رہی۔ نہ کبھی اس طرف خیال گذرا کہ یہ صریح تحریف ہے نہ کبھی اس طرف دھیان کیا کہ مکتوبات کی اشاعت بھی ہوتی ہے اور اس میں یہ چیز نہ ملے گی تو دنیا کیا کہے گی؟ مگر جسے تحریف و تبدیلی کا چسکا پڑ چکا ہو وہ کب ان باتوں کی پروا کرتا ہے۔

بالآخر "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی" کے مصداق حضرت امام ربانی کے ایک معتقد جناب ماسٹر غلام نبی صاحب سابق ٹیچر کارپوریشن ہائی اسکول مزنگ لاہور نے جب دن دہاڑے یہ خیانت دیکھی تو آپ کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی۔ آپ نے اس رسالے میں امام ربانیؒ کی طرف منسوب شدہ دو عبارات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ان میں سے دوسری یہی تھی جو ہماری گذارشات کا محور ہے۔ آپ نے مولانا ابوالبرکات کی طرف ۲/فروری ۱۹۶۶ء کو ایک خط لکھا:

معظم و محترم جناب مولانا مدظلہ

السلام علیکم!

مؤدبانہ گذارش ہے کہ مجھے اتفاقاً آپ کے شائع کردہ ایک چھوٹے سے رسالے کے مطالعے کا موقع ملا، جس کا نام چالیس ارشادات امام ربانیؒ ہے۔ دو تین جگہ مجھے امام ربانیؒ کے اصل مکتوبات سے اختلاف ہوا ہے ان میں سے دو ہو بہو نقل

کرنے کی جرأت کرتا ہوں، امید ہے کہ آپ میرے ان شبہات کا ازالہ فرما کر عند اللہ ماجور ہونگے۔

ماسٹر غلام نبی صاحب نے دونوں عبارتیں اصل کتاب سے اور مولانا ابوالبرکات کے رسالہ سے نقل کیں اور مولانا ابوالبرکات کی طرف روانہ کردیا۔ مولانا ابوالبرکات نے جواب دینے کے بجائے یہ مسئلہ مولوی ابوالریان محمد رمضان نائب مفتی حزب الاحناف لاہور کے سپرد کردیا۔ نائب مفتی نے جواب میں جو دوراز کار تاویل کرکے اصل جواب سے پہلو تہی اختیار کی، وہ لائق عبرت ہے:

آپ کا یہ خط ۱۰/جولائی ۱۹۶۶ء کو ماسٹر صاحب کو موصول ہوا۔ چونکہ اس جواب سے وہ تحریف صحیح نہ ہوسکی جو مولانا ابوالبرکات مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں کرچکے تھے اس لئے ماسٹر صاحب نے دوبارہ ایک عریضہ ارسال کیا۔ جس میں آپ نے لکھا کہ:

حضرت میں نے ۲/فروری ۱۹۶۶ء کو ایک عریضہ آپ کی خدمت عالیہ میں ارسال کیا تھا، جس کا جواب آپ کے نائب مفتی صاحب کی معرفت ۱۰/جولائی ۱۹۶۶ء (پانچ مہینے اور آٹھ دن کے بعد) کو ملا۔ اس جواب میں صاحب موصوف نے اصل اعتراضات سے کلیۃً اعراض فرما کر اپنے مؤقف کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے دوماہ کا عرصہ ہوا ایک اور عریضہ آپ کی خدمت میں لکھا تھا کہ اپنی ان عبارات کی تصحیح فرمادیں تاکہ مجدد صاحبؒ کی عبارت میں تحریف کا سوال پیدا نہ ہو لیکن تادم تحریر کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ دوبارہ مکلف ہوں کہ مجدد صاحب علیہ الرحمۃ کی عبارت کو اپنے تراجم کے بالمقابل شائع کرکے غلط فہمی کو دور فرمانے کی کوشش فرماویں۔

میں نے گذشتہ عریضے میں تمام اعتراضات مفصل لکھ دیئے تھے اس عریضے میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، اگر وہ عریضہ آپ کے پاس نہیں پہنچا تو دوبارہ ارشاد پر پھر لکھ دوں گا، ورنہ اصل اعتراض کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

اگر بے اعتنائی کا یہی عالم رہا تو شاید کچھ عرصے بعد مجھے دونوں عبارتیں بالمقابل شائع کرنے پر مجبور ہونا پڑے۔ آپ کی ذات عالی کے متعلق ایسی بدگمانی نہایت بری ہے کہ اصل عبارت جلی حروف میں شائع کی جائے اور اسے اس طرح بدل دیا

جائے کہ اصل و نقل میں بالکل ہی مطابقت نہ ہو۔

خدا جانے اس دنیا میں اس طرح کی غلط فہمیاں کتنی ہو چکی ہوں گی جو امت مسلمہ کی گمراہی کا باعث بنی ہوں گی۔ اس وقت تو حسنِ اتفاق سے اصل مکتوب جس کا حوالہ آپ نے دیا ہے موجود ہے، آپ کی حیات میں یہ غلطی آپ درست کر سکتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ کے پیش کردہ حوالہ جات میں فرق موجود ہو تو غلطی چھپانے کی کتنی گنجائش ہے۔ آپ یہ مان کر کہ اصل عبارت میں اور اردو ترجمے میں زمین و آسمان کا فرق ہے درست کرانے کو تیار نہیں بلکہ مجدد صاحبؒ کی غلطیاں نکال رہے ہیں، دیگر فرقوں کے سربراہوں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

یہ تو آپ کی ذات والا صفات کو معلوم ہوگا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے دن دہاڑے لکھ دیا تھا کہ مجدد صاحب نے لکھا ہے کہ جس شخص کو کثرت سے مکالمہ اور مخاطبہ ہو وہ نبی ہوتا ہے، لیکن جب اس کی بددیانتی پکڑی گئی تو انہوں نے اسے جائز اور درست ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ آپ کی نسبت یہ گمان نہیں کیا جا سکتا یہ بالکل معمولی بات ہے۔ آئندہ اشاعت میں تبدیلی کردی جائے دین و دنیا میں سرخروئی نصیب ہوگی ورنہ تحریف کا جرم ثابت رہے گا۔ معذرت خواہ ہوں کہ آپ کی ذات گرامی کی فضیحت مقصود نہیں صرف اصلاح احوال منظور ہے۔

رسالہ کے سرورق پر اگر "مجدد الف ثانیؒ کے چالیس ارشادات" کے الفاظ نہ لکھتے تو کوئی اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ آپ کا مسلک بالکل واضح ہے۔ اعتراض صرف یہ ہے کہ امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ نقل کرنے میں آپ نے اصل الفاظ کی ترتیب کو بدلا۔ معانی بدل دیئے حتیٰ کہ الفاظ بھی بدل دیئے............الخ

ماسٹر صاحب کا مندرجہ بالا خط مولانا ابوالبرکات کو ملا، انہوں نے پھر جواب دینے سے گریز کیا۔ اور نائب مفتی کے حوالے کر دیا۔ نائب مفتی نے ان دونوں عبارتوں کے بارے میں تحریر فرمایا کہ:

السلام علیکم!

مجدد صاحب علیہ الرحمۃ کے اصل مکتوبات اور ان کے تراجم دیکھنے سے معلوم ہوا کہ واقعی جو آپ کہتے تھے وہی درست ہے۔ مجدد صاحب علیہ الرحمۃ اپنی

طریقت کی مخالفت کی بنا پر مولود خوانی کے بالکل قائل نہ تھے۔اس لئے آپ نے فرمایا اگر ان لوگوں کو ایسے مولود شریف کی بھی اجازت دی .... میں نے سید صاحب کو واضح کر دیا ہے کہ ارشادات امام ربانی میں مکتوبات کی عبارت غلط چھپی ہے، لہذا آئندہ اشاعت میں انشاء اللہ درست کر دی جائے گی یا شاید یہ عبارت شائع ہی نہ کی جائے۔ مورخہ ۲۸/ جنوری ۱۹۶۸ء

یہاں ہم صرف اتنی سی گذارش کرتے چلیں کہ جب حضرت مجدد الف ثانیؒ نقش بندی تھے اور اس سلسلے میں یہ منع ہے تو پھر ان کا نام لے کر یہ عبارت کیوں لکھی گئی؟ جب عبارت شائع ہو گئی اور ایک مرتبہ توجہ دلائی گئی تو پھر یہ بات بھی حیران کن ہے کہ نائب مفتی کا یہ ارشاد کہ شاید یہ عبارت شائع ہی نہ کی جائے۔اس کا کیا مطلب؟ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ عوام حضرت مجدد الف ثانیؒ کا مسلک نہ معلوم کرلیں اور نہ جان جائیں کہ سیدنا مجدد الف ثانیؒ کا مسلک اس معاملے میں کیا تھا۔ پھر مصوف کی یہ بات اگر تسلیم کریں کہ آئندہ اشاعت میں درستی کر دی جائے گی تو کیا آئندہ اشاعت میں درستی ہو گئی تھی؟.... جب ہم اس طرف نظر کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ماسٹر صاحب اس خط کی وصول یابی کے بعد ۱۳ سال مسلسل انتظار کرتے رہے کہ کب یہ لوگ اس رسالے کو درست کرتے ہیں، لیکن افسوس کہ وہ اپنی کی ہوئی تحریف سے رجوع نہ کرسکے۔ اس عرصے میں مولانا ابوالبرکات کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور "چالیس ارشادات" پر مبنی یہ رسالہ برابر انہی تحریفات سے شائع ہوتا رہا، جب ماسٹر صاحب انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو آپ نے ایک یاددہانی کا خط نائب مفتی کی طرف ارسال کیا، اور اس میں پھر سے اس طرف توجہ دلائی، اور اس ۲۸/ جنوری ۱۹۶۸ء والے خط کا حوالہ دے کر دریافت فرمایا کہ:

اب گذارش صرف یہ ہے کہ میں نے بہت کوشش کی ہے کہ درست شدہ کہیں مل جائے لیکن مجھے دستیاب نہیں ہوا، اگر آپ کے علم میں ہو تو مجھے اطلاع دیں تاکہ میں اسے حاصل کرسکوں اور اگر اب تک وہ شائع نہیں ہوا تو کرم فرما کر وعدہ فرمادیں کہ جلد یہ کام ہو جائے گا ۔ مرحوم سید (ابوالبرکات) صاحب تو اس جہان فانی سے رحلت فرماچکے ہیں۔ان کے نامہ اعمال سے یہ غلطی اگر دھل سکتی ہے تو آپ کی دم قدم سے دھل سکتی ہے۔ ورنہ وہ قیامت کے دن جناب مجدد صاحبؒ

پر افترا کے مجرم ہوں گے۔ امید ہے کہ آپ اپنے جواب باصواب سے جلد بندہ کو سرفراز فرمائیں گے۔ آپ کی ذات والا سے یہی توقع ہے کیوں کہ آپ نے پہلے صاف صاف اقرار فرمایا تھا کہ مجدد صاحب مولود کے قائل نہ تھے اور نیز دوسری حدیث قدسی غلط چھپی ہے، اسے بھی جلد درست کر دیا جائے گا۔

والسلام ۱۵-۸-۸۱

اس کے جواب میں نائب مفتی صاحب کا جواب ملاحظہ کیجئے:

السلام علیکم

چالیس ارشادات امام ربانی سید (ابوالبرکات) صاحب کے بیٹے محمود احمد رضوی نے شائع کئے تھے ان میں وہی غلطی موجود تھی، اب وہ ختم ہو گئے ہیں اب کسی اور مولوی نے چھاپے ہیں ان میں بھی وہی غلطی موجود ہے، محمود احمد صاحب سے کئی مرتبہ میں ملنے گیا مگر وہ ملے نہیں۔ داتا دربار کے خطیب مولوی محمد سعید صاحب نے "مسلک امام ربانی" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے اس میں بھی انہوں نے وہی غلطی شائع کی ہے۔ بلکہ مولانا نور احمد امرتسری نے لکھا کہ مولود شریف کے منع کی وجہ مجدد علیہ الرحمۃ کے نزدیک گانے کی طرز اور تالیاں وغیرہ ہے اگر یہ اشیاء نہ ہوں تو جائز ہے مجدد علیہ الرحمۃ کی مراد صرف یہی ہے کہ گانا وغیرہ نہ ہو۔ میں مولوی محمد سعید سے پہلے ملا تھا جس زمانے میں آپ سے اس کے متعلق خط و کتابت ہوئی تھی ان کو سمجھایا تھا لیکن وہ سمجھے نہیں۔ اب آپ مکتوب کی پوری عبارت سوال اور آپ کا جواب پوری نقل کر کے بھیج دیں تو میں ان لوگوں کو بتلاؤں۔

از طرف: مفتی ابوالریان محمد رمضان

میں نے مولوی سعید صاحب کو چٹھی لکھی ہے کہ آئندہ صحیح لکھیں سوال کو جواب نہ بنائیں، اس پتہ پر خط بھیجیں............الخ

نائب مفتی صاحب کے اس جواب سے کیا کیا باتیں ثابت ہو رہی ہیں وہ ملاحظہ فرمائیں۔ کہ اب ان کا شائع کیا ہوا رسالہ ختم ہو گیا۔ کسی اور مولوی نے شائع کیا۔ ان میں بھی وہی غلطی رہ گئی۔ کیا مفتی صاحب پر یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک اشتہار یا اخبار کے ذریعہ سے جب سے خط و کتابت جاری ہوئی تھی، یہ اعلان کر دیتے کہ اس رسالہ میں غلطیاں ہو گئی ہیں

ناشرین درست شائع کریں۔ پھر یہ امر بھی نہایت عجیب ہے کہ محمود احمد رضوی سے ملنے جاتے ہیں وہ نہیں ملتے۔ اتنا اہم مسئلہ کہ جس کی وجہ سے نہ صرف مسئلہ کی نوعیت بدل رہی ہے بلکہ امام ربانیؒ کی ذات گرامی بھی مجروح ہو رہی ہے، اس سے اتنا اعراض کہ چند دفعہ جائیں وہ نہ ملے تو خاموش ہو کر بیٹھ جائیں۔ افسوس! پھر مولوی محمد سعید کو جو آپ کے رسالے کو شائع کر رہا ہے جب وہ آپ کی بات نہیں مان رہا ہے تو ماسٹر صاحب کی بات کیا مانیں گے، یہ تو آپ پر فرض تھا کہ کہ مولوی محمد سعید کو ہر ممکن صورت میں اس سے روکتے بلکہ اظہار حق کا فریضہ انجام دیتے۔ آخر اتنے سالوں سے جب معاملہ چل رہا تھا اس وقت یہ تسلیم کرنے میں کیا عذر مانع تھا کہ تحریف ہوئی ہے۔

اگر اس وقت ہی یہ کار خیر انجام دے دیا جاتا تو بہت سے لوگوں کو غلط فہمی میں پڑنے کا اندیشہ نہ تھا اور بدعات کی ترویج ہرگز نہ ہوتی۔ افسوس ! کہ نائب مفتی صاحب تو ان تمام باتوں کو تسلیم کر چکے ہیں مگر یہ رسالہ برابر انہی تحریفات کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اور بدعات کی ترویج کی خدمت برابر انجام دی جا رہی ہے۔ اس زمانے میں بھی اس طرح کا رنگ دیکھ کر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی رگِ فاروقی پھڑک اٹھی تھی اور یوں گویا ہوئی تھی:

> دنیا بدعت کے دریا میں ڈوبی ہوئی ہے اور بدعت کی تاریکیوں میں مطمئن ہے۔ کس کی مجال ہے کہ کسی بدعت کے اٹھانے کے لئے آمادہ ہو، اور کسی سنت کے زندہ کرنے کے لئے لب کشائی کرے۔ اس زمانے کے اکثر علماء خود ہی بدعت کو رواج دینے والوں اور سنت کے مٹانے والوں میں ہیں۔ (مکتوبات امام ربانیؒ جلد ۲: ص ۵۵)

جب یہ حضرات ان اکابر گرامی قدر کی کتب میں بھی قطع و برید، تحریف، کمی بیشی سے نہیں رکے تو علماء دیوبندؒ کی عبارت پر حاشیہ آرائی اور قطع و برید سے کس طرح رک سکتے تھے بس اسی بات نے آج امت کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے، شہر شہر کی مساجد اختلافات کا شکار ہو کر رہ گئی ہیں۔ انا لله وإنا إليه راجعون .

دوسری قسط

تقلید شرعی اور علمائے امت

مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوری صاحب

مندرجہ بالا تحریر سے ثابت ہوگیا کہ ائمہ اربعہ کی تقلید اور فقہی مسائل کو بدعت نہیں کہا جاسکتا۔

اور یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ نفس تقلید اور تقلید شخصی کا ثبوت قرآن وحدیث اور تعامل صحابہ سے ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ قرآن مجید میں ہے:

(۱) يَآايُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اَطِيْعُوْا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ وَاُوْلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (قرآن مجید پ ۵ سورۂ نساء آیت ۵۹)

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اللہ ورسول کی اطاعت کے ساتھ اولوالامر کی اطاعت کا بھی حکم فرمایا ہے، اولوالامر سے مراد علماء، فقہاء، حاکم اور ذی اختیار ہیں، عوام پر علماء اور فقہاء کا اتباع واجب ہے اس لئے کہ علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں اور احکام شریعت کے خازن وامین ہیں (معارف القرآن ادریسی ص ۱۰۲ ج ۲) اس آیت کریمہ میں غور کیجئے! اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اولوالامر کی اطاعت کا حکم فرمایا ہے اور اولوالامر کے مصداق میں علماء اور فقہاء بھی شامل ہیں۔ لہٰذا اس آیت سے ثابت ہورہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علماء اور فقہاء کی اتباع کا حکم فرمایا ہے۔ یہ تقلید نہیں تو اور کیا ہے؟

(دوسری آیت) وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰى اُوْلِي الْاَمْرِ مِنهم لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَه مِنهُم (قرآن مجید سورۂ نساء آیت پ ۵ آیت ۸۳)

اگر یہ لوگ اس امر کو رسول کے اور اولوالامر کے حوالہ کرتے تو جو لوگ اہلِ فقہ اور اہل استنباط ہیں وہ سمجھ کر ان کو بتلادیتے کہ کونسی چیز قابل عمل ہے اور کونسی ناقبل عمل۔

اس آیت کریمہ میں بھی صراحۃً ائمہ مجتہدین کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ یہی تو تقلید ہے۔ مذکورہ آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے اندر استنباط کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں یعنی بات کی تہہ اور گہرائی تک نہ پہونچ سکتے ہوں ان کو چاہئے کہ وہ مستنبطین اور مجتہدین کی طرف رجوع کریں اور ان سے دریافت کئے بغیر دین کی کوئی خبر اور بات زبان سے نہ نکالیں۔

معارف القرآن ادریسی میں ہے:

استنباط کے لغوی معنی: زمین کھود کر اس کی تہہ میں سے پانی نکالنے کے ہیں۔ اور اصطلاح شریعت میں نصوص شریعت کی تہہ میں جو حقائق اور معارف مستور (پوشیدہ) ہیں ان کو خداداد فہم و فراست سے کھود کر نکالنے کا نام استنباط اور اجتہاد ہے۔ شریعت کے بہت سے احکام آیات اور احادیث کے ظاہر سے مفہوم نہیں ہوتے لیکن وہ بلاشبہ نصوص شریعت اور کتاب و سنت کی گہرائیوں میں مستور اور پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ شریعت نے کوئی امر چھوڑ دیا ہو اور اس کے متعلق کوئی حکم نہ دیا ہو۔ فقہاء کرام جن کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خاص خیر کا ارادہ فرمایا وہ اپنے دقیق اور عمیق نظر اور فکر کے ذریعہ سے زمین شریعت کو کھود کر اس کی تہہ اور گہرائیوں میں سے ان پوشیدہ احکام کو نکال کر لاتے ہیں کہ جو زمین شریعت کی ظاہری سطح پر نمایاں نہ تھے شریعت کی تہہ اور گہرائی میں سے کسی پوشیدہ حکم کو نکالنے کا نام استنباط اور اجتہاد اور قیاس ہے۔

اسی بنیاد پر حضرات فقہاء لکھتے ہیں کہ قیاس مظہر حکم ہے نہ کہ مثبتِ حکم۔ یعنی قیاس سے کوئی حکم شرعی ثابت نہیں ہوتا بلکہ جو حکم قرآن و حدیث میں پہلے موجود تھا مگر مخفی تھا قیاس نے اس کو ظاہر کر دیا۔ حکم درحقیقت کتاب وسنت ہی کا ہے قیاس خدا اور رسول کے پوشیدہ حکم کا مُظہر و محض ظاہر کرنے والا ہے۔ قیاس مُثبتِ حکم نہیں یعنی قیاس اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں دیتا عرف عام میں چونکہ قیاس کے معنی خیال اور گمان اور وہم کے ہیں اس لئے بہت سے نادانوں نے یہ گمان کر لیا کہ قیاس شرعی کی حقیقت بھی یہی ہے، حالانکہ اصطلاحِ شریعت قیاس شرعی کی حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ شریعت میں قیاس شرعی کی حقیقت ہے کہ غیر منصوص الحکم کو۔ منصوص الحکم کے مشابہ اور مماثل دیکھ کر بوجہ مماثلت اور مشابہت کے منصوص الحکم کے حکم کو غیر منصوص کے لئے ثابت کر دینا۔ اور یہ کام مجتہد کا ہے۔ یعنی جس چیز کا حکم کتاب وسنت اور اجماع امت میں منصوص اور مصرح نہیں ہے اس میں یہ غور و فکر کرنا کہ جس چیز کا

حکم شریعت میں موجود ہے یہ غیر منصوص کس کے ساتھ زیادہ مشابہ اور مماثل ہے اس مشابہت کی بنا پر غیر منصوص کے لئے اس حکم کے ثابت کرنے کا نام قیاس شرعی ہے جیسے ہائی کورٹ کا کوئی فاضل جج جس مقدمہ کا حکم صراحۃً قانون میں موجود نہ ہو وہاں نظائر کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ صادر کرتا ہے، یہ بھی تو ایک قسم کا قیاس ہی ہوا۔ عدالتوں میں ہزار ہا مقدمات کا فیصلہ نظائر ہی پر ہوتا ہے نظیر کے موافق حکم دینا ہی قیاس ہے معلوم ہوا کہ ہر قانون میں قیاس موجود ہے بلا قیاس کے عدالتوں کا فیصلہ ناممکن ہے۔ امام بخاریؒ نے بھی قیاس کی یہی حقیقت قرار دی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

باب من شبّه اصلاً معلوماً باصل مبین قد بیّن الله حکمها لیفهم السائل

(بخاری شریف ص ۱۰۸۸ ج ۲ کتاب الاعتصام) جس سے اشارہ اس طرف ہے کہ قیاس کی حقیقت تشبیہ اور تمثیل ہے اور اس بارہ میں امام بخاری نے متعدد تراجم قائم فرمائے ہیں سب کا حاصل یہ ہے کہ قیاس اور رائے کی دو قسمیں ہیں ایک محمود اور ایک مذموم۔ مذموم وہ ہے کہ جس کی کتاب و سنت و اجماع میں کوئی اصل موجود نہ ہو اور محمود وہ ہے کہ کتاب، و سنت اور اجماع امت سے ماخوذ ہو حضرات اہل علم فتح الباری جلد سیزدہم (۱۳) باب الاعتصام کی طرف مراجعت فرمائیں۔ (معارف القرآن ادریسی ص ۱۲۴، ۱۲۵ ج ۲)

خلاصہ یہ کہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے **لَعَلِمه الّذین یستنبطونهُ منهم** فرما کر اہل استنباط کی اتباع کا حکم فرمایا جس سے تقلید کا ثبوت ہوتا ہے، اور ساتھ ساتھ استنباط (اجتہاد، قیاس شرعی) کا بھی ثبوت ہو گیا اگر استنباط خلاف شریعت ہوتا تو اللہ تعالیٰ اہل استنباط کی طرف معاملہ پیش کرنے اور ان کی اتباع کا حکم کیوں فرماتے؟

احادیث سے بھی قیاس شرعی اور اجتہاد و استنباط کا ثبوت ہوتا ہے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجنے کی روایت آئندہ صفحات میں آرہی ہے اس روایت کو بغور ملاحظہ فرمائیں اُس روایت سے اجتہاد کا ثبوت صراحۃً ہو رہا ہے، نیز مندرجہ ذیل حدیث بھی ملاحظہ فرمادیں۔

صحیح بخاری شریف **باب غزوة الخندق وهی الاحزاب** میں ہے کہ احزاب کے دن حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عن ابن عمرؓ قال قال النبی صلی الله علیه وسلم یومَ الاحزاب لایُصلیَنّ احدٌ العصر الا فی بنی قُریظة۔ کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ پہونچ کر۔

حضرات صحابہ روانہ ہوئے راستہ میں عصر کا وقت آگیا تو نماز پڑھنے نہ پڑھنے میں صحابہ کی دو جماعتیں ہوگئیں۔ ایک جماعت نے ظاہری الفاظ پر عمل کرتے ہوئے کہا۔ **فقال بعضهم لانصلی حتی ناتیها**۔ ہم بنو قریظہ ہی پہونچکر نماز ادا کرینگے۔ اس کے بالمقابل دوسری جماعت نے کہا۔ **وقال بعضهم بل نصلی لم یُرِدْ مِنّا**۔ اس جماعت نے دیگر نصوص جن میں نماز کو اپنے وقت میں ادا کرنے کی تاکید ہے مثلاً **انّ الصلوٰة کانَتْ علی المؤمِنِیْنَ کتاباً موقُوتاً** وغیرہ کے پیش نظر حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد عالی میں اجتہاد کیا کہ آپ کا منشا اور آپ کی مراد بنو قریظہ پہونچنے میں تعجیل ہے یعنی جلدی پہونچنے میں اتنی کوشش کرو کہ ہو سکے تو عصر وہاں پہونچکر ادا کرو، آپ کا یہ مقصود نہیں کہ اگر راستہ میں عصر کا وقت ہو جائے تب بھی تم نماز نہ پڑھنا اور قضا کر دینا۔ یہ قیاس کیا اور راستہ ہی میں عصر کی نماز پڑھ لی۔ بعد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس واقعہ کو بیان کیا گیا۔ روایت کے الفاظ ہیں **فذکر ذلك للنبی صلی الله فلم یُعَنِّفْ واحدًا منهم**۔ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کسی پر ملامت نہیں فرمائی۔ (بخاری شریف ج ۲ص ۵۹۱ ج۱ ص۱۲۹)

اس حدیث میں غور کیجئے، ایک جماعت نے آپ ﷺ کے ارشاد مبارک کے ظاہری الفاظ کو چھوڑ کر آپ کی مراد اور منشا تک پہونچنے کے لئے اجتہاد اور استنباط کر کے اپنی رائے اور قیاس پر عمل کیا۔ اہل علم وفہم سمجھ سکتے ہیں یہ رائے اور اجتہاد نص کے مقابلہ میں نہیں تھی بلکہ نص کے مطلب و مراد کو واضح کرنے کے لئے تھی یعنی یہ رائے بمقابلۂ نص نہیں بلکہ اجتہاد فی مرادالنص کے ہے اور نبی اکرم ﷺ نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔ لہٰذا اس حدیث سے ثابت ہوا کہ شریعت میں اجتہاد واستنباط، قیاس شرعی مذموم اور غلط نہیں ہے۔ ہاں وہ رائے اور قیاس جو نص کے مقابلہ میں ہو وہ مذموم اور غلط ہے۔ جیسے کہ ابلیس کی رائے تھی **قال انا خیر منه خلقتنی من نار وخلقته من طین** ۔ میں آدم علیہ السلام سے بہتر ہوں آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور ان کو مٹی سے، آگ افضل ہے کہ اس کا اٹھاؤ طبعاً علو اور بلندی کی طرف ہے اور مٹی مفضول ہے اور اس کا جھکاؤ طبعًا بجانب سفل (نیچے) ہے تو افضل وعالی مفضول وسافل کو کیوں سجدہ کرے؟ یہ ابلیس کی رائے تھی جو اللہ عزوجل کے حکم کے مقابلہ میں تھی لہٰذا یہ رائے مذموم اور غلط ٹھیری اور ابلیس مردود ومطرود وملعون ہوا۔

(تیسری آیت) **فَاسئَلُوْا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنتُم لَاتَعْلَمُوْنَ** (قرآن مجید سورۂ نحل پ ۱۴)

اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرلو۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ایک بنیادی مسئلہ کی تعلیم دی ہے کہ جو لوگ قرآن وحدیث کو خود نہ سمجھ سکتے ہوں اور احکام الٰہی معلوم کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو وہ اہل علم سے احکام الٰہیہ دریافت کریں۔ آیت میں اہل الذکر سے اہل علم مراد ہے جن کا بہترین مصداق ائمہ مجتہدین اور فقہاء عظام ہیں۔ تو اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ جو شخص احکام الٰہی نہ جانتا ہو اور اس کو علم نہ ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ جاننے والے سے پوچھ کر عمل کرے۔ یہی تو تقلید ہے۔

(چوتھی آیت) فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (قرآن مجید سورۂ توبہ آیت ۱۲۲ پ ۱۱)

کیوں نہ نکلے ہر فرقہ میں سے ایک جماعت تاکہ فقہ فی الدین حاصل کرے اور جب واپس آئے تو اپنی قوم کو ڈرائے تاکہ وہ دین کی باتوں کو سن کر اللہ کی نافرمانی سے بچیں۔

اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ سب لوگ طلبِ علم کے لئے اپنے گھروں سے نہ نکل جاویں بلکہ تھوڑے سے لوگ جایا کریں کیونکہ مکمل علم دین کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے اگر کوئی بھی حاصل نہ کرے تو سب گنہگار ہونگے، اور جو لوگ گئے ہیں وہ علم دین اور فقہ فی الدین حاصل کرکے اپنی قوم کو فائدہ پہونچائیں ان کو تعلیم دیں اور وعظ وتلقین کریں اور عذاب الٰہی سے ڈرائیں۔ (معارف القرآن آدریسی ص ۴۲۳ ج ۵)

لہٰذا اس آیت سے ایک تفسیر کے مطابق ثابت ہوا کہ عالموں پر بے علموں کو احکام سے واقف کرنا اور عذاب الٰہی سے ڈرانا ضروری ہے اور بے علموں پر عالموں کی بات ماننا اور اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔ یہ تقلید نہیں تو کیا ہے لہٰذا اس آیت سے واضح طور پر تقلید کا ثبوت ہوتا ہے۔ بلکہ تقلید شخصی کا بھی ثبوت ہوسکتا ہے اس لئے کہ آیت کریمہ میں لفظ "طائفۃ" ہے اور طائفہ کا اطلاق عربی زبان میں ایک آدمی پر بھی ہوتا ہے اور ایک سے زیادہ آدمیوں پر بھی ہوتا ہے۔

علامہ ابن عبد البر تحریر فرماتے ہیں: **والطائفة فى لسان العرب الواحد فمافوقه** (جامع بيان العلم وفضله ص ۱۱ باب قوله صلى الله عليه وسلم طلب العلم فريضة على كل مسلم)

لہٰذا ممکن ہے کہ گا ہے علم حاصل کر کے آنے والا ایک ہی شخص ہو تو قوم پر اس کی اتباع بھی ضروری ہوگی۔ اور ایک شخص کی اتباع تقلید شخصی ہے۔

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدين کے سلسلہ میں حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عمدہ بات تحریر فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"جاننا چاہئے کہ فقاہت فی الدین کا درجہ مطلق علم سے بالاتر ہے علم کے معنیٰ جاننے کی ہیں اور فقاہت کے معنیٰ لغت میں فہم اور سمجھ کے ہیں فقیہ لغت اور شریعت کے اعتبار سے اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو شریعت کے حقائق اور دقائق کو اور اس کے ظہر اور بطن کو سمجھا ہوا ہو محض الفاظ یاد کر لینے کا نام فقاہت نہیں۔ جن لوگوں نے خداداد حافظہ سے کتاب و سنت کے الفاظ یاد کئے اور امت تک ان کو بلا کم و کاست پہنچایا وہ حفاظِ قرآن اور حفاظِ حدیث کا گروہ ہے **جزاهم الله عن الاسلام والمسلمين خيرا** آمین۔

اور جن لوگوں نے خداداد عقل سلیم اور فہم مستقیم سے کتاب و سنت کے معانی اور شریعت کے حقائق و دقائق اور اس کے اصول و فروع امت کو سمجھائے تاکہ امت ان احکام پر عمل کر سکے ان کو فقہاء کہتے ہیں خواہ فقہاء ظاہر کے ہوں یا باطن کے اصل مقصود اطاعت خدا و رسول ہے۔ اور اطاعت کا اصل دار و مدار معانی پر ہے محض الفاظ یاد کر لینے سے فریضہ اطاعت ادا نہیں ہو سکتا۔ اصل عالم وہ ہے جو شریعت کے معانی اور مقاصد سمجھتا ہو **کما قال تعالی : وتلك الامثال نَضرِبُها للناس وما يعقلها الا العالمون ـ**

شریعت کی حفاظت امت پر فرض ہے۔ حضرات محدثین نے الفاظ شریعت کی حفاظت کی اور حضرات فقہاء نے معانیٔ شریعت کی حفاظت کی دونوں ہی اللہ کے مقبول گروہ ہیں۔ جس طرح انبیاء کرام میں درجات اور مراتب کا فرق ہے **کما قال تعالیٰ : تلك الرُسلُ فضلنا بعضهم على بعض منهم من كلم الله ورفع بعضهم درجات** ـ اسی طرح وارثین انبیاء یعنی علماء میں بھی درجات اور مراتب کا فرق ہے۔

حضرات محدثین اور حضرات فقہاء میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ لفظ اور معنیٰ میں درجہ اور مرتبہ کا فرق ہے۔ حافظ قرآن الفاظ قرآن کا حافظ ہے اور ایک مفسر قرآن معانیٔ قرآن کا عالم اور قاسم ہے۔ (معارف القرآن ادریسی ص ۴۲۳، ۴۲۴ ج ۳۔ سورۂ توبہ)

اب احادیث ملاحظہ فرمائیں:

(۱) عن حذیفة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم انی لاادری مابقائی فیکم فاقتدوا باللذین من بعدی ابی بکر و عمر (مشکوٰۃ شریف ص ۳۰)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجھے معلوم نہیں میں کب تک تم لوگوں میں رہوں گا پس میرے بعد ان دو شخصوں کا اتباع کرنا ایک ابوبکر اور دوسرے عمر رضی اللہ عنہما کا۔

"من بعدی" کی تشریح کرتے ہوئے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: ف من بعدی سے مراد ان صاحبوں کی حالتِ خلافت ہے... پس مطلب یہ ہوا کہ ان کے خلیفہ ہونے کی حالت میں ان کا اتباع کیجیو اور ظاہر ہے کہ خلیفہ ایک ایک ہوں گے۔ پس حاصل یہ ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں تو ان کا اتباع کیجیو اور حضرت عمرؓ کی خلافت میں ان کا اتباع کیجیو۔ پس ایک زمانۂ خاص تک ایک شخص کے اتباع کا حکم فرمایا اور یہ کہیں نہیں فرمایا کہ ان سے احکام کی دلیل بھی دریافت کرلیا کرنا اور نہ یہ عادت مستمرہ تھی کہ دلیل کی تحقیق ہر مسئلہ میں کی جاتی ہو اور یہی حقیقت تقلید شخصی کی ہے کیونکہ حقیقت تقلید شخصی کی یہ ہے کہ ایک شخص کو جو مسئلہ پیش آوے کسی مرجح کی وجہ سے ایک ہی عالم سے رجوع کیا کرے اور اس سے تحقیق کر کے عمل کیا کرے اور اس مقام میں اس کے وجوب سے بحث نہیں وہ آگے مذکور ہے۔ صرف اس کا جواز اور مشروعیت اور موافقت سنت سے ثابت کرنا مقصود ہے سو وہ حدیث قولی ہے جو ابھی مذکور ہوئی بفضلہ تعالیٰ ثابت ہے۔ الخ (الاقتصاد فی بحث التقلید والاجتہاد ص ۳۱، ۳۲)

(۲) علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین (مشکوٰۃ شریف ص ۳۰)

تم میری سنت کو اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدہؓ کی سنت کو مضبوطی سے پکڑے رہو۔

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے طریقہ کو سنت فرما کر اس پر عمل کو ضروری قرار دیا۔ یہ تقلید نہیں تو کیا ہے؟

(۳) عن معاذ بن جبل رضی الله عنه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم لَمَّا بَعَثَه الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لك قضاء قال اَقضی بکتاب الله قال فان لم تجد فی کتاب الله قال بسنة رسول الله صلی الله علیه وسلم قال فان لم تجد فی سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم قال اجتهد برأیی وَلاآلو فضرب رسول الله صلی الله علیه وسلم علی صَدْره وقال الحمد لِلّٰهِ الذی وَفق

رسولَ رسول اللّٰہ (صلی اللّٰہ علیہ وسلم) لِمَا یَرْضیٰ بہ رسولَ اللّٰہِ (مشکوٰۃ شریف ص۳۲۴ ۳۲۴ ابوداؤد شریف ص۱۴۹)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کا قاضی بناکر روانہ کیا تو دریافت فرمایا تمہارے سامنے کوئی قضیہ پیش آجائے تو تم کس طرح فیصلہ کروگے؟ عرض کیا کتاب اللہ سے فیصلہ کرونگا۔ فرمایا اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ملے تو؟ عرض کیا رسول اللہ ﷺ کی سنت سے فیصلہ کرونگا۔ آپ نے فرمایا اگر اس میں بھی نہ ملے تو؟ عرض کیا پھر اجتہاد کرونگا اور اس قضیہ (مسئلہ) کا حکم معلوم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑونگا۔ حضرت معاذؓ فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اس جواب پر (فرط مسرت سے) اپنا دست مبارک میرے سینے پر مالا اور فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی اور خوش ہے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱) بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ قرآن وحدیث میں ان کا حکم منصوص نہیں ہے یعنی صراحۃً مذکور نہیں۔

(۲) غیر منصوص مسائل میں اپنی رائے اور اجتہاد سے فیصلہ کرنا مستحسن ہے اور یہ اللہ اور اس کے رسول کی عین مرضی کے مطابق ہے۔

(۳) رائے اور اجتہاد حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جس پر آنحضرت ﷺ نے الحمد للہ فرمایا اور فرطِ مسرت سے حضرت معاذؓ کے سینہ پر ہاتھ مارا۔ اس سے اس طرف اشارہ تھا کہ علوم نبوت کے فیوض وبرکات فقیہ اور مجتہد کے ساتھ ہیں۔

(۴) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بناکر بھیجا جارہا ہے۔ مسائل حل کرنے اور معاملات سلجھانے کی تعلیم دی جارہی ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ حضور اقدس ﷺ جانتے ہیں کہ اہلِ یمن اپنے پیش آمدہ مسائل ومعاملات حضرت معاذؓ کے سامنے پیش کریں گے اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ قرآن وحدیث اور اپنے اجتہاد کی روشنی میں جو حکم بیان فرمائیں گے وہ لوگ اس میں آپ کی اتباع کریں گے۔ یہ تقلید نہیں تو اور کیا ہے؟ گویا حضور اقدس ﷺ نے اہلِ یمن کو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی تقلید شخصی پر مامور فرمایا۔ الغرض اگر اس حدیث میں صحیح طور پر غور کیا جائے تو مذکورہ حدیث سے تقلید کا ثبوت اور جواز واضح اور بین طور پر ثابت ہوتا ہے۔

(۵)العُلَماءُ وَرَثَۃُ الاَ نبیاء . رواہ احمدوابو داؤد والترمذی۔
(مشکوۃ شریف ص۳۴)

علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ پس جس طرح انبیاء کی اتباع فرض اور لازم ہے اسی طرح وارثین انبیاء یعنی علماء کی اتباع بھی لازم اور ضروری ہے۔

انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی میراث علم ہے۔ علماء کی اتباع واقتداء اسی لئے فرض ہے کہ وہ علمِ شریعت کے وارث اور حامل ہیں اس حدیث سے بھی تقلید کا ثبوت ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات واحادیث سے تقلید مطلق کا واضح طور پر ثبوت ہوتا ہے۔

پھر اس تقلید کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ تقلید کے لئے کسی خاص امام و مجتہد کو متعین نہ کیا جائے کبھی ایک امام کے مسلک کو اختیار کرلیا تو کبھی دوسرے امام کے قول پر عمل کرلیا اسے تقلید مطلق کہا جاتا ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ تقلید کے لئے کسی ایک مجتہد کو متعین کرلیا جائے۔ ہر مسئلہ میں اسی کی اتباع کی جائے اسے تقلید شخصی کہا جاتا ہے..... عہد صحابہ وتابعین میں تقلید کی ان دونوں صورتوں پر عمل ہوتا رہا ہے اور اس کا ثبوت ملتا ہے۔

چنانچہ اُس عہد مبارک میں یہ بات بالکل عام تھی کہ جو حضرات فقیہہ نہ تھے وہ فقہاءِ صحابہ وتابعین سے پوچھ پوچھ کر عمل کیا کرتے تھے اور سائل کے جواب میں مُجیب جو حکم بتلاتا مع دلیل یا بلا دلیل سائل اس پر عمل پیرا ہوتا۔ اور دلیل نہ ہونے کی صورت میں سائل دلیل کا مطالبہ نہ کرتا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لِاَنَّ الناس لم یزالوا من زمن الصحابة الیٰ ان ظهرتِ المذاهب الاربعةُ یقلّدون مَنِ اتفق مِنَ العلماء من غیر نکیرِ من احدِ یعتبر انکاره ولو کان ذلك باطلاً لَاَ نکره۔ (عقد الجید مع سلک مروارید ص ۲۹)

کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے وقت سے مذاہبِ اربعہ کے ظہور تک لوگوں کا یہی دستور رہا کہ جو عالم مجتہد مل جاتا اسکی تقلید کرلیتے اس پر کسی بھی معتمد علیہ شخصیت نے نکیر نہیں فرمائی اور اگر یہ تقلید باطل ہوتی تو وہ حضرات (صحابہ وتابعین) ضرور نکیر فرماتے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اس فرمان سے عہد صحابہ وتابعین میں تقلید مطلق کا ثبوت واضح طور پر ملتا ہے۔ جس طرح ان حضرات کے یہاں تقلید مطلق کا رواج تھا اسی طرح بعض حضرات تقلید شخصی پر بھی عمل پیرا تھے۔ چنانچہ اہلِ مکہ مسائل خلافیہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ

عنہما کے قول کو ترجیح دیتے تھے اور ابن عباسؓ کے قول پر عمل کرتے تھے۔ اور اہل کوفہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے فتوے کو ترجیح دیتے اور اسی کا اتباع کرتے تھے۔

(۱) چنانچہ بخاری، مسلم اور ابوداؤد میں ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا پھر وہی مسئلہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا۔ ابن مسعودؓ کا جواب ابو موسیٰ اشعریؓ کے جواب کے خلاف تھا بعد میں ابو موسیٰ اشعریؓ کو اس کا علم ہوا تو سمجھ گئے کہ ابن مسعود ہی کا جواب صحیح ہے اس کے بعد ارشاد فرمایا "لاتسئالونی مادام هذا الحبر فیکم "جب تک یہ تبحر عالم (یعنی ابن مسعودؓ) تم میں موجود ہیں تمام مسائل انہیں سے دریافت کیا کرو اور وہ جو فتویٰ دیں اسی پر عمل کرو مجھ سے دریافت نہ کرو۔ اسی کا نام تقلید شخصی تو ہے۔ اس حدیث سے تقلید شخصی کا ثبوت واضح انداز میں ہو رہا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۲۶۴)

(۲) صحیح بخاری میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ان اهل المدينة سئالو ا ابن عباسؓ عن امرأةٍ طافتْ ثم حاضتْ قال لهم تنفر قالوا لا ناخذ بقولك و ندع قول زيدٍ (صحیح بخاری شریف ص ۲۳۷ ج ۱ کتاب الحج)

اہل مدینہ نے حضرت ابن عباسؓ سے اس عورت کے متعلق سوال کیا جو طواف فرض (یعنی طوافِ زیارت) کے بعد حائضہ ہو گئی۔ ابن عباسؓ نے فرمایا وہ طواف وداع کئے بغیر جا سکتی ہے۔ اہل مدینہ نے کہا ہم آپ کے قول (فتوی) پر عمل کر کے زید بن ثابت کے قول (فتوی) کو ترک نہیں کریں گے۔

اس حوالہ سے ثابت ہوا کہ اہل مدینہ حضرت زید بن ثابتؓ کی تقلید شخصی کرتے تھے۔ اس روایت کے اس جملہ "لانأخذ بقولك و ندع قول زیدٌ" پر غور کیجئے کہ جب اہل مدینہ نے ابن عباسؓ سے یہ بات کہی تو ابن عباسؓ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی کہ تم اتباع واقتداء کے لئے (یعنی تقلید کے لئے) ایک معین شخص کو لازم کر کے شرک، بدعت اور گناہ کے مرتکب ہو رہے ہو۔ اگر تقلید شخصی ناجائز اور حرام ہوتی تو ابن عباس رضی اللہ عنہما اس پر ضرور نکیر فرماتے۔

خواتین کے لئے گھریلو پابندیاں

حضرت فاروق اعظمؓ کے نزدیک نسوانی شرافت کی حفاظت کے لئے خواتین کو گھر کے اندر رکھنا ضروری تھا مگر قریبی رشتہ داروں سے ملنے کی پوری طرح اجازت تھی۔ بعض مسائل میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب آپ کے پاس میاں بیوی کے ازدواجی جھگڑے لائے جاتے جن میں گھر بنانے کا معاملہ بھی ہوتا تو آپ بڑے جچے تلے انداز میں فیصلے فرماتے۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک آدمی اپنی بیوی کو صرف اس لئے طلاق دے رہا تھا کہ اُسے پسند نہ تھی۔ آپ نے فرمایا کیا تمام گھر محبت کی بنیاد پر قائم ہیں؟ پھر ننگ و عار یا رعایت کے کیا معنی ہیں؟۔ فاروق اعظمؓ کی بیشتر ہمدردیاں خواتین کے ساتھ ہوتی تھیں آپ نے زمانہ کی ڈینگیں مارنے والوں کا ساتھ نہیں دیا جو محبت اور ازدواجی رشتوں میں مغالطہ پیدا کرتے ہیں اور اس بات کو نظر انداز کرتے ہیں کہ مروت اور رعایت بھی کوئی چیز ہے (مطلب یہ کہ اگر محبت نہیں بھی ہے تو نبھانے کا لحاظ کر کے ازدواجی رشتہ کو قائم رکھا جائے) آپ فرماتے رعایت کرنا اور شرم محسوس کرنا تو ایسی انسانی کیفیات ہیں جو ہمیشہ باقی رہتی ہیں، اور محبت ازدواجی رشتہ سے پروان چڑھتی ہے، پھر یہ کہ محبت کا تعلق جذباتی شعور سے ہے اسمیں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے لیکن اخلاقی رعایت و مروت میں بہت کم تبدیلی ہوتی ہے۔ آپ عورتوں کے مفادات اور معاملات میں ان سے بھی مشورہ کرتے جس طرح مردوں کے مسائل میں اُن سے مشورہ فرماتے، اور پھر اپنی بات سے رجوع کرنے میں بھی آپ کو تکلف نہ ہوتا تھا۔ اگر کوئی عورت

انھیں معقول اور مدلل انداز سے قائل کرتی تو آپ مان لیتے جیسے ایک مرتبہ آپ نے اپنے خطبہ میں جب یہ فرمایا کہ دین مہر کی رقم چالیس اوقیہ سے زیادہ نہ کی جائے تو بعض عورتوں نے اس پر احتجاج کیا اور دلیل میں یہ آیت پیش کی۔ وآتیتم احداھن قنطارا فلاتاخذوا منه شیئاًاتاخذونه بهتاناًوإثمامبینا ۔ ترجمہ ۔ "اور تم دے چکے ہو عورتوں میں سے کسی ایک کو بہت سامال تو اس میں سے کچھ بھی واپس مت لو، کیا تم اس کو صریح گناہ اور ناحق سے لینا چاہتے ہو" اس دلیل پر فاروق اعظمؓ نے غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی بات سے رجوع فرمالیا۔

فاروق اعظمؓ کے بارے میں خواتین کی رائے۔

مرد عورت کے تعلقات پر کوئی مرد اگر مرد کے حق میں رائے زنی کرے تو زیادہ وزنی نہیں مانی جاتی ہاں اگر خود عورت حسنِ ظن کا اظہار کرے تو زیادہ وقیع ہوگا، اس سلسلے میں اپنے زمانہ کی سیدۃ العصر حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں "ھو نسیج وحدہ" (وہ صفاتِ محمودہ میں بے نظیر ولاثانی ہیں) ایک خاتون الشفاء بنت عبداللہ نے آپ کے اوصاف کو اس طرح ادا کیا "جب وہ بولتے ہیں تو زیادہ متوجہ ہوتے ہیں، جب چلتے ہیں تو تیز چلتے ہیں، جب مارتے ہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں اور وہ تو ایک عابدزاہد انسان ہیں" حضور ﷺ کی دودھ پلائی ماں حضرت امّ ایمن نے جب آپ کی شہادت کی خبر سنی تو زور سے کہا وَھَی الاسلام اسلام کی دیوار شق ہو گئی۔ گرنے کے قریب ہو گئی۔

فاروق اعظمؓ کی ازواج مطہرات

آپ کی ازواج کیسی تھیں اور آپ نے ان کے انتخاب میں کن صفات اور خوبیوں کا خیال رکھا تھا اس معاملہ میں تاریخی تفصیلات بہت کم ملتی ہیں سوائے ان کے ناموں کے۔ خود حضرت عمرؓ نے بھی ان کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں کہی ہے۔ ہاں فاروق اعظمؓ کے جملہ حالات اور خود ان کے اخلاق وعادات کی روشنی میں ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ تمام خواتین حضرت عمرؓ کے معیار کے مطابق ہوں گی۔ اس سلسلہ میں آپ کی پہلی شرط تو یہ ہو سکتی ہے کہ عورت زیادہ بچے پیدا کرنے والی ہو اور اس پر کم عقلی کا عیب نہ لگایا گیا ہو کیونکہ

ایک عورت جو نو ماہ بچے کو پیٹ میں رکھتی ہے اس پر ماں کے خون کا اثر تو ضرور ہو گا اور ماں کی صفات بھی اسمیں آئیں گی۔ اسکے علاوہ آپ کا ذوق جمال بھی آپ کی دوسری عادتوں کی طرح اعلیٰ پیمانہ کا تھا اس لئے یقیناً اس کا خیال بھی رکھا گیا ہو گا ویسے حسن کے معاملہ میں آپ عام عربوں کی طرح ملاحت پسند تھے کیونکہ عربوں میں حسن کا معیار یہی رہا ہے، اس سلسلہ میں آپ کا ایک قول یہ بھی نقل کیا جاتا ہے۔ " تزوجها سمراء ، ذلفاء ، عيناء ، فان فركتها فعلي صداقها " گندم گوں رنگ والی چھوٹی ہموار ناک والی، خوبصورت آنکھ والی اور ان میں اگر کچھ زیادتی کرنی ہو تو دین مہر میں کی جائے، اس کے علاوہ آپ نے فرمایا اگر عورت کے بال حسین ہیں تو اس کا حسن کمال درجہ کا ہے اور حسن کی یہی دو صفات قدیم دور سے آج تک چلی آرہی ہیں جیسا کہ بعض روایات سے ثابت ہے کہ آپ کی ازواج حسن وجمال میں ضرب المثل کی حد تک مشہور تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے آنحضرت ﷺ کی مجلس میں کہا کہ ہم نے قریش کی خواتین کے حسن وجمال کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا تو آپ نے فرمایا کیا تم نے بنوامیہ بن مغیرہ کی عورتوں کو نہیں دیکھا کیا تم نے قریبہ کو نہیں دیکھا یہ حضرت عمرؓ کی اہلیہ تھیں۔ اسی طرح جمیلہ بنت ثابت کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اسم بامسمّٰی تھیں ان کا پرانا نام عاصیہ تھا جس کو حضور ﷺ نے بدل کر جمیلہ رکھا تھا۔ اسی طرح عاتکہ بنت زید بھی نہایت حسین وجمیل خاتون ہونے کے ساتھ تقویٰ پرہیزگاری اور فصاحت وبلاغت میں یکتائے روزگار تھیں، اسی طرح دوسری ازواج کے بارے میں بھی مشہور ہے۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے اپنی بیویوں کو کسی بنا پر طلاق دیدی تھی یہ دونوں قریبہ اور جمیلہ تھیں مگر اس کا سبب معلوم نہیں۔ آپ کی ازواج میں اُمّ کلثوم بنت علی بھی مشہور ہیں یہ کم عمر اور حسین وجمیل تھیں۔ ان سے آپ کا ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آپ نے اپنے بھائی کے نام پر زید رکھا تھا۔ فاروق اعظمؓ کے دل میں ان کی طرف سے ہمیشہ عزت واحترام رہا کیونکہ خاندان نبوی سے خصوصی ربط تھا۔ زندگی بھر ان دونوں میں بہت اچھے تعلقات رہے سوائے ایک واقعہ کے جو آخر میں پیش آیا جب ملکہ روم نے ایک تحفہ حضرت عمرؓ کی اہلیہ کو بھیجا اور فاروق اعظمؓ نے اسے بیت المال میں جمع کرا دیا۔ سوائے اس معمولی واقعہ کے اور کوئی خاص بات نہیں ملتی۔

فاروق اعظمؓ کی اولاد

حضرت عمرؓ کثیر الاولاد تھے اور اپنے مزاج کے مطابق سب کو عدل وانصاف کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سب کا یکساں خیال فرماتے آپ نے اپنے بچوں سے فرمایا۔ **ان الناس ینظرون الیکم نظرالطیر الی اللحم**۔ لوگ تمہاری طرف اس طرح دیکھتے ہیں جیسے پرندہ گوشت کو دیکھتا ہے۔ آپ کا معمول تھا کہ جب عام لوگوں کو ہدایت دیتے تو اپنے بچوں کو بھی جمع فرمالیتے اور ان کے فرائض یاد دلاتے۔ برائیوں سے روکتے بلکہ یہ بھی تاکید کے ساتھ قسم دلاتے کہ اگر کسی کے خلاف بے قاعدگی کی شکایت آئی یاغلط کام کیا تو اس کی سزا زیادہ ہوگی۔
ایک مرتبہ آپ کے دو صاحبزادے عبداللہ اور عبیداللہ عراق کی لڑائی میں گئے وہاں اس وقت ابوموسیٰ اشعریؓ امارت کے فرائض انجام دے رہے تھے یہ دونوں ان کے پاس گئے تو انھوں نے فرمایا کاش میں تمھیں کچھ فائدہ پہونچانے کی قدرت رکھتا۔ پھر بیت المال کا کچھ روپیہ انھیں دیا اور کہا اس سے تم عراق سے تجارتی سامان خرید لو اور مدینہ جاکر فروخت کردینا اور اصل رقم اپنے والد کو دیدینا منافع تم رکھ لینا۔ جب فاروق اعظمؓ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کیا باقی فوجیوں کو بھی یہ سہولت حاصل ہے؟ پھر انھیں حکم دیا کہ سارا مال مع منافع کے بیت المال میں جمع کرادیں۔ اس پر عبداللہ تو خاموش رہے عبیداللہ بولے یا امیر المومنین کچھ مناسب نہیں ہے اگر یہ مال کم ہو جاتا یا ضائع ہو جاتا تو ہم ذمہ دار ہوتے اور ایک شخص نے مجلس میں سے کہا یا امیر المومنین اگر آپ اس کو قرض قرار دیدیں۔ پھر آپ نے اصل مال اور نصف منافع بیت المال کے لئے لے لیا اور نصف صاحبزادوں کو دے دیا۔ فاروق اعظم کو یہ پسند نہیں تھا کہ امراء اور والی حضرات ان کی اولاد کے ساتھ خصوصی ہمدردی کا برتاؤ کریں۔
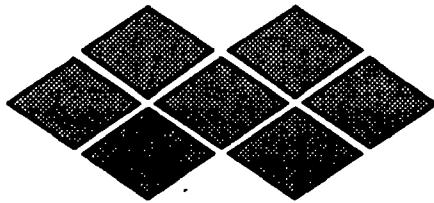
دوسری قسط

تحریک استشراق - ایک جائزہ

مولوی محمد یوسف رام پوری رفیق شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

تحریک استشراق تیرھویں صدی سے سترھویں صدی تک

تیرھویں، چودھویں صدی عیسوی میں "تحریک استشراق" میں ایک نئی حرارت پیدا ہوئی کیونکہ انہیں اپنی ناکامی پر افسوس سے زیادہ غصہ تھا، اس لئے وہ اسلام کے خلاف زہر اگلنے لگے، پرانے مصادر پر نئے اضافے ہوتے گئے۔ دانتے (۱۲۶۵ء سے ۱۳۲۱) ایک استشراقی شاعر تھا جو ازمنۂ وسطی اور نشأۃ ثانیہ کے درمیان میں پل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے اسلامیات کا مطالعہ کیا۔ احادیث کی متعدد کتابوں کو دیکھا اور پھر ایک معروف نظم (THE DEVINE COMEDY) لکھی، اگرچہ اس نے یہ نظم اسلام کے کافی گہرے مطالعہ کے بعد قلم بند کی تاہم اسلام اور پیغمبر اسلام کے ساتھ اس کا رویہ معاندانہ ہی رہا بلکہ سابقہ مستشرقین سے بھی کئی ہاتھ آگے بڑھ گیا، اس نے اس نظم میں پیغمبر اسلام کو مبتلائے عذاب دکھانے کی کوشش کی ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ آپ ﷺ نے عیسائیت میں پھوٹ ڈالی۔ دراصل دانتے پر صلیبی جنگوں میں عیسائیت کی ناکامی کا اثر تھا اسے بڑا دکھ تھا کہ صلیبی جنگیں عیسائیت کی شکست کیوں بن گئیں۔ اسلام فتح سے ہمکنار کیوں ہوا؟ اس غصہ میں اس نے اپنی نظم سے سارے یورپ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا انتقاماً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہا۔ اس نے فاتح بیت المقدس صلاح الدین ایوبی کو بھی الزامات دیے، اسے مبتلائے عذاب دکھایا جب کہ صلاح الدین ایوبی کے مقابلہ میں ہلاک ہونے والے مسیحی افراد کو شہادت کا مرتبہ

دیااوران کو جنت کا مستحق قرار دیا۔ دانتے کی یہ نظم اشتعال اور جذبات سے بھری ہوئی تھی جس نے زخم پر نمک چھڑکنے کا کام کیا، پوری مسیحیت جذبات میں آگئی اور دفعتاً بھڑ گئی۔ اس لئے دشمنی کے سلسلہ میں انہوں نے صرف یہ کہ پرانی روش کو برقرار رکھا بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا۔ اس زمانہ میں استشراقی اسکالرس کی جانب سے اسلام کے متعلق کئی کتابیں تحریر کی گئیں لیکن سب میں وہی افسانے گھڑے گئے جن کا حقیقت سے کوئی رشتہ نہیں تھا، سابق کی طرح اس پورے عہد میں نبی آخرالزماں کیلئے بے ہودہ الفاظ استعمال کئے گئے۔ جیسے کہ یہ الفاظ " CUNNINO, IMPOSTAR, LYING, DECEIVER, BLAS-PHEMSUS" تیرھویں، چودھویں صدیوں کے مانند پندرھویں اور سولھویں صدیاں بھی رہیں۔ ان میں بھی وہی خرافات سامنے آئیں جو سابقہ صدیوں میں گھڑ چکی تھیں۔ البتہ "تحریک استشراق" جمود کا شکار نہیں ہوئی بلکہ استشراقی عالموں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ سترھویں صدی کا آغاز ہوگیا۔

تحریک استشراق سترھویں صدی میں

۱۷/ویں صدی عیسوی استشراقی تحریک کے لئے گذشتہ صدیوں کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ثابت ہوئی، اس صدی میں پہلی صدیوں کی بنسبت اسے زیادہ کام کرنے کا موقع ملا، کچھ نئی راہیں کھلیں، اسلامی علوم وفنون سیکھنے کے طرف ان کے میلان میں اضافہ ہوا۔ درحقیقت یہ صدی مغرب کی ترقی کی صدی تھی اس صدی میں مغرب تیزی کے ساتھ دنیا کی وسعتوں کی پیائش کرسکتے تھے، ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ سکتے تھے۔ ان حالات میں جب کچھ اسلامی سلطنتیں اہل مغرب کے زیر اقتدار آگئیں تو انہیں ان سلطنتوں سے بہت سی چیزیں اپنی دلچسپی کی مل گئیں، دولت کے علاوہ اسلامی علوم وفنون کا خزانہ بھی ان کے ہاتھ آگیا بڑے بڑے کتب خانوں اور لائبریریوں پر انکا تسلط ہوگیا جن کو بعد میں انہوں نے اپنے اہل وطن کے طرف منتقل کرلیا۔ اسلامی علوم وفنون کی دست وگہرائی کا اندازہ کرکے ان کے قلوب میں اسلامی علوم وفنون سیکھنے کی مزید لگن پیدا ہوگئی۔ اب وہ عربی زبان سیکھنے پر بھی وقت صرف کرنے لگے تھے مزید برآں قرآن وحدیث کی جانب بھی مائل ہونے لگے تھے۔ ۱۷/ویں صدی سابقہ صدیوں سے اس معنی میں ممتاز رہی کہ اس میں پہلے کی بنسبت زیادہ تبدیلیاں

نما ہوئیں۔ خاص خاص تبدیلیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک مسلم مقالہ نگار نے لکھا ہے:

"مستشرقین اب نئے مصادر اسلامی سے دوچار ہوئے، عربی زبان پڑھنے اور پڑھانے کی یک چلی، کیونکہ اس کے بغیر ان مصادر تک رسائی ممکن نہ تھی، اسکا نتیجہ تھا، کہ کیمرج، سفورڈ، پیرس اور لندن میں عربی کے شعبے کھلے ۱۶۴۹ء میں قرآن کریم کا انگریزی اور نیسی ترجمہ شائع ہوا۔ سترھویں صدی کی سب سے طاقتور تحریک روشن خیالی کی تحریک ں جس میں غیر مذہبی عیسائی مذاہب و مقاصد کے منصفانہ مطالعہ پر زور دیا گیا۔ ان تحریکات دعوت دی اور اسلام کو سمجھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اب مستشرقین کے سامنے تین مصادر تھے)از منہ وسطی کا روایتی مواد (تاریخی و سوانح وغیرہ) نیز لاطینی مصادر (کرائنکل) (۲) اسلامی عربی مصادر جو استعمار کے ذریعہ حاصل ہوئے۔ (۳) مغربی سیاحوں کے سفر نامے، جو انہوں نے مسلم ممالک کے دورے اور سیاحت کے بعد مرتب کیے۔"

ظاہر ہے کہ تبدیلی حیرت انگیز انقلاب سے کم نہ تھی کیونکہ اس سے قبل فقط ایک جنون جس کے جراثیم قرطاس وقلم کے ذریعے پھیلائے جارہے تھے لیکن اسلامی علوم وفنون کو منے رکھا جانے لگا جس کی وجہ سے یورپ میں ایسے بہت سے یہودی وعیسائی عالم پیدا گئے جن کو اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلامی علوم وفنون سے یک گونہ لگاؤ تھا مگر حیرت ں وقت ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی اسلام دشمنی میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا، لانکہ امید یہ کی جارہی تھی کہ شاید اب 'تحریک استشراق" اپنا موقف تبدیل کردیگی اور تشرقین اسلام اور پیغمبر اسلام کو انصاف اور حقائق کی نظر سے دیکھیں گے مگر ایسا کچھ بھی ہوا، سابقہ حالت اب بھی برقرار رہی۔ اسکا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جدید رپ میں اصطلاحات کا مفکر اعظم مارٹن لیوتھ جیسا شخص بھی اسلام کے بارے میں نرم رویہ انہ کرسکا بلکہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گاگ اور میگاگ کا خطاب دیا۔ اسی صدی میں رل (BEDWELL) (متوفی ۱۶۳۱ء) نے اپنی کتاب "MOHAMMAD IS IMPATURE (محمد کاذب) میں آنحضرت ﷺ کی شان مین گستاخی کی۔ علاوہ ازیں تھولک نے الزام لگایا کہ محمد نے قرآن کی تالیف کسی مہذب زبان میں نہیں کی بلکہ ایک وحشی ان میں کی۔ چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (العیاذ باللہ) جانور (BEAST) تھے، اسلئے قرآن ی جانوروں کی زبان میں تحریر کیا۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ صدی بھی مستشرقین کی

کھوکھلی خرافات کے شکنجہ میں گرفتار رہی۔

ہاں بعض روشن خیال مستشرقین نے کبھی کبھی روایتی ڈگر سے ہٹنے کی ناکام کوشش کی ان میں سے کچھ خاص نام اس طرح ہیں آکسفورڈ یونیورسٹی کا پروفیسر پیکاک (ALEXAN-DEX, PEACOKE) (متوفی ۱۶۱۹ء جس نے حقیقت اور افسانہ میں کچھ فرق کرنے کی کوشش کی دوسرا نام الیکزنڈر رواس (ALEXANDER ROSS) کا ہے جس نے ۱۶۵۳ء میں "تقابل ادیان پر ایک کتاب لکھی، اس نے لاطینی خرافات سے ایک راہ نکالی اور اسلام کے بارے میں پہلی بار کچھ اچھے کلمات کہے۔ علاوہ ازیں ایک دو نام اور اس طرح کے آپ کو مل سکتے ہیں جنہوں نے قدرے انصاف کی کوشش کی۔ البتہ زیادہ تر مستشرقین اسلامی علوم وفنون سے کسی حد تک واقفیت کے باوجود پرانی ڈگر پر ہی چلتے رہے اور اس صدی میں بھی ولن ترضیٰ عنك اليهود ولاالنصارىٰ کا مصداق بنے رہے۔

تحریک استشراق اٹھارھویں صدی میں

اٹھارویں صدی میں گذشتہ صدیوں کے مقابلہ میں اس معنی میں ممتاز رہی کہ اس صدی میں سابقہ تمام صدیوں کی نسبت زیادہ لٹریچر تیار ہوا، بہت سی کتابیں اس صدی میں تصنیف ہوئیں لیکن مجموعی اعتبار سے اس صدی میں بھی استشراقی اسکالروں کی ذہنی وفکری پستی بدستور رہی جس میں وہ ایک طویل عرصہ سے گرفتار تھے۔ بلا کسی پس وپیش کے انہیں مصادر کو اب بھی استعمال کیا گیا، اسلام کے خلاف تعصب کو اب بھی روا رکھا گیا اور اب بھی جھوٹ کو سچ بتانے کے لئے زمین آسمان کے قلابے ملانے کی کوشش کی گئی۔ اگر وقتاً فوقتاً کسی نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے ساتھ انصاف اور رواداری کا مطالبہ بھی کیا اور اپنے تئیں انصاف کرنے کی کوشش کی یا عام مستشرقین کے عام رجحان سے ہٹکر انہوں نے ایک نیا رجحان بتایا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں چند اچھے کلمات کہے تو پوری استشراقی تحریک غصہ سے آگ بگولہ ہو گئی جس سے سراسیمہ ہوکر ان اسکالروں نے چپ سادھ لی اور اگر کسی نے ہمت وجرأت کر کے رواداری کا معاملہ کیا بھی تو دیگر بہت سے مستشرقین کے ہجوم میں اس کی آواز دب گئی مثلاً ایچ ریلان (H.RELAN) نے عام رجحان سے ہٹکر کام کیا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق رویہ میں تبدیلی کی، اپنی کتاب "مذہب محمد" میں اس

نے خرافات سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی اور اسلام کے ساتھ منصفانہ سلوک کا مطالبہ کیا۔ غالباً یہ پہلا شخص ہے جس نے آنحضرت ﷺ اور اسلام کے بارے میں رواداری کی تحریک چلائی اور واضح الفاظ میں اس نے کہا کہ "اہل مغرب کی بجائے یہ حق خود مسلمانوں کا ہے کہ وہ اپنے مذہب و کلچر کی تفسیر و تشریح کریں" مگر اس کی صدا وقت کے شور میں گم ہوگئی اور اپنا کوئی خاص اثر قائم نہ کرپائی۔ ہاں ایک دو مصنفین پر اس کا قدرے اثر ضرور ہوا انہیں سے کانٹ نامی مؤلف بھی ہے جس نے اپنی کتاب (VIE DE MOHAMET) ۱۷۳۰ء میں اسلام کے متعلق نرم رویہ اختیار کیا۔ نقادوں کی نظر میں یہ کتاب اسلام کی جانب پہلا روادارنہ قدم ہے ۔اس پوری صدی میں غالباً ایک دو مستشرق اور ایسے بھی آئیں گے جو اسلام کے تئیں نرم رویہ رکھتے ہوں ورنہ تو اٹھارھویں صدی میں بھی استشراقی تحریک خود کو تعصب، بغض اور عناد کے حصار سے نہ نکال سکی، بلکہ بعض مستشرقین نے انتہائی شدت سے کام لیا۔

چنانچہ جارج سیل (GEORGE SALE) اور راوڈول (J.WRODWELL) نے حیرت انگیز سخت لب و لہجہ اختیار کرلیا اور اتیح ریلان اور کانٹ کے زور کو دبانے کیلئے صاف الفاظ میں اسلام کو فاسد مذہب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو (العیاذ باللہ) نبی کاذب قرار دیا۔ جین گگنیر (JEAN GAGNIER) بھی ان کے نقش قدم پر چلا اور دو کتابیں لکھیں جس میں اس نے وہ سب کچھ تو کہا ہی جو دیگر مستشرقین نے کہا مگر اس نے یہ بھی لکھا کہ محمد نہ صرف انسانیت کے بدترین دشمن بلکہ خدا کے بھی دشمن تھے۔ ایک اور انگریزی مؤرخ جس نے زوال روما پر چھ جلدیں لکھیں اور ایک ربع صدی ان پر خرچ کی وہ بھی اپنے آپ کو تعصب کے پنجوں سے آزاد نہ کرسکا اور رواداری کے دعوے کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی کاذب قرار دینے پر مصر رہا مزید برآں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو داغدار کرنے کے لئے اس نے بھی کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری عمر میں شہوت، لالچ اور منصب کے پجاری ہوگئے تھے۔ اس سے بھی زیادہ سخت جملے اس نے یہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ظلم ،فرار اور ناانصافی کا مجسمہ تھے (العیاذ باللہ) اٹھارھویں صدی میں ایک عظیم شخصیت نظر آتی ہے وہ والٹیر (VALTAIRE) (۱۶۹۴ء سے ۱۷۷۸ء) تھا والٹیر فکر و بصیرت کا ستارہ سمجھا جاتا تھا، اسے لوگ ایک عظیم مصلح کی حیثیت سے بھی جانتے تھے اور ایک ذی علم اور پروقار شخصیت کے نام سے بھی والٹیر تقریباً اٹھارھویں صدی پر محیط ہے۔ مگر والٹیر جیسا مفکر اعظم اسلام

کے خلاف اپنے مخفی تعصب و جلن کو چاہنے کے باوجود پوشیدہ نہ رکھ سکا اور اپنے ایک ڈرامہ میں اسلام کے سلسلہ میں بالآخر نفرت و حقارت کا اظہار کر بیٹھا اس نے بھی سابقہ مستشرقین کے مانند نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی کاذب اور دین اسلام کو مذہب فاسد کہا۔ چونکہ والٹیر مغرب کی نظر میں ایک بڑا صاحب فکر و بصیرت تھا اس لئے مغربی اسکالروں پر اس کا اثر ہونا ایک فطری امر تھا چنانچہ دوسرے مستشرقین اس سے متأثر ہوکر اسلام اور ہادی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہنے میں بے باک ہو گئے۔

غرض اٹھارھویں صدی عیسوی میں بھی استشراقی تحریک اپنی اسی پرانی راہ پر چلتی رہی جس پر وہ صدیوں سے محوسفر تھی، دو چار اسکالرں کے علاوہ کسی نے بھی اسلام کے تئیں نرم رویہ اختیار نہ کیا اور اپنے معاندانہ انداز وسلوک میں تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ کی اور روشن خیال کا لحاظ نہ کرنے میں انہوں نے کوئی عار کی بات نہ سمجھی بلکہ گذشتہ کی طرح جاہلانہ انداز سے اسلام کو برا بھلا کہتے رہے اسلئے ان حالات پر نظر رکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ صدی اپنے اندر کوئی خاص انفرادیت نہیں رکھتی ہے بجز اس کے کہ استشراقی تحریک نے گذشتہ تمام صدیوں کے مقابلہ میں زیادہ لٹریچر فراہم کیا۔ پھر بھی کوئی خاص بات نہ ہوتے ہوئے بھی اسے ترقی ضرور ملی، اس کے افراد میں اضافہ ہوا اور اسلام کی دشمنی کے لئے کچھ شیطانی راہیں دستیاب ہوئیں۔ اس طرح سے استشراقی تحریک منزل بہ منزل، لحہ بہ لحہ اپنا ارتقائی سفر طے کرتی رہی یہاں تک کہ انیسویں صدی کی آمد آمد ہو گئی۔

تبرا ایجی ٹیشن

حکومت یوپی نے جس سال جلوس مدح صحابہ نکالنے کی اجازت دی تو مخالفین کی طرف سے اسی سال سے اسے رکوانے کی برابر کوشش کی جارہی تھی چنانچہ اسی طرح کی ایک کوشش تبرا ایجی ٹیشن شروع کراکے بھی کی گئی تھی۔ لکھنؤ میں مخالفین صحابہ کی دو جماعتیں نمایاں طور پر کام کررہی تھیں، ان میں سے ایک شیعہ پولٹیکل کانفرنس اور دوسری انتہا پسند جماعت "تنظیم المومنین" تھی، یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے پر سبقت لیجانا چاہتی تھیں۔ اگرچہ یہ دونوں ایک دوسرے کی حریف تھیں مگر مسلمانوں کے مقابلہ میں متحد و متفق تھیں۔ مدح صحابہ کے جلوس نکلنے کی مخالفت میں سب سے پہلے شیعہ پولٹیکل کانفرنس نے نوٹس لیا اور اسکی ورکنگ کمیٹی نے سید علی ظہیر کی صدارت میں یہ فیصلہ کیا کہ قبل اسکے کہ مدح صحابہ کا جلوس نکلے ہمیں تبرا ایجی ٹیشن شروع کردینا چاہیئے اس سے حکومت اور مسلمانوں دونوں ہی کی توجہ بٹ جائیگی۔ چنانچہ ۳۰/مارچ ۱۹۳۹ء کو نواب سلطان علی خاں کی سربراہی میں سولہ رضاکاروں نے امام باڑۂ غفراں مآب لکھنؤ سے "تلاوت تبرا" کرتے ہوئے اپنے گالی ایجی ٹیشن کا آغاز کردیا جس پر ان سب لوگوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ "تنظیم المومنین" والوں نے جب دیکھا کہ حریف پہل کرگیا تو انہوں نے بھی ۳۱/مارچ ۱۹۳۹ء کو آصف الدولہ کے امام باڑہ سے روزانہ گرفتاریاں دینا شروع کردیں۔ اس غیر مہذب اور غیر اخلاقی تحریک میں علماء شیعہ کی طرف سے نصیر الملت مولانا سید محمد نصیر مجتہد نے یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو تبرا کرتے ہوئے اپنی گرفتاری دی۔ تبرا ایجی ٹیشن میں پنجاب کے شیعہ خاص طور سے آگے آگے

تھے۔ حکومت یوپی نے بھی ابتداءً سنجیدگی سے اس معاملہ میں کوئی طریقہ کار نہیں اپنایا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس تحریک کو انگریزوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ کچھ دنوں تک تو یہ تحریک چلتی رہی مگر جب شیعہ عوام پر اسکا کوئی خاص ردعمل نہیں دیکھا گیا تو انھیں بڑی مایوسی ہوئی اور وہ اس تک میں رہنے لگے کہ کسی بڑے آدمی کے کندھے پر بات رکھ کر اس تحریک کو ملتوی کردیں دوسری طرف یہ بھی ہوا کہ تبرائی قیدی جیلوں سے معافیاں مانگ مانگ کر واپس آنے لگے تو اس نے اور بھی حوصلوں کو پست کردیا لہذا شیعوں کا ایک وفد راجکوٹ جاکر مہاتما گاندھی سے ملا اور انھیں مداخلت کیلئے آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر گاندھی جی نے کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی اور یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ میں مولانا آزاد سے کہونگا وہ لکھنؤ جاکر بات کرینگے۔ اسکے بعد سعید الملت مولانا سید محمد سعید مجتہد نے ایک وفد کے ساتھ کلکتہ جاکر مولانا آزاد سے بات چیت کی، مولانا نے کہا کہ پہلے شیعہ اپنا تبرا ایجی ٹیشن واپس لیں تب ہی کوئی بات کی جائیگی۔ اس گفت وشنید میں پانچ مہینے گذر گئے اور یہ ایجی ٹیشن سسک سسک کر چلتا رہا۔ ۲۴ جون ۱۹۳۹ء کو بمبئی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں لکھنؤ کے تبرا ایجی ٹیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے بیان دیا تھا کہ سنیوں نے اپنا ایک مذہبی حق مانگا گورنمنٹ یوپی نے ان کو عطا کردیا اب کچھ تھوڑے سے شیعہ گالی بکنے کا حق مانگتے ہیں بھلا کون سی ایسی مہذب گورنمنٹ ہے جو اس حق کو تسلیم کرسکتی ہے (۱)

یوپی اسمبلی کے سامنے احتجاج

تبرا ایجی ٹیشن سے مسلمانوں میں شدید بے چینی تھی لہذا ۲۳ / اپریل ۱۹۳۹ء کو بعد نماز ظہر مسلمانوں کا ایک جلسہ احاطۂ شیخ شوکت علی میں منعقد ہوا اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ فوراً اس ایجی ٹیشن کو بند کرائے، اسکے ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ اس سلسلہ میں یوپی اسمبلی کے سامنے احتجاجی مظاہرہ بھی کیا جائیگا۔ مظاہرہ کے دن لوگوں میں جوش وخروش بہت زیادہ تھا اور مجمع بے قابو ہو رہا تھا جس نے یوپی اسمبلی کے اندر کچھ توڑ پھوڑ بھی کی جس پر حکومت نے جھنجھلا کر بعض پرجوش اور نوجوان مسلم علماء اور رہنماؤں کو گرفتار کرلیا جن میں مولانا عبدالعزیز فاروقیؒ، مولانا عبدالحلیم فاروقیؒ، مولانا کلیم اللہ الہ آبادیؒ، مولانا مطلوب

---

(۱) شیعوں کی بیداری، مصنفہ نواب مرزا سجاد علیخاں، ص ۵۵، قیصل پریس وکٹوریا اسٹریٹ لکھنؤ، سنہ ندارد

الرحمٰن ندویؒ، مولانا یونس خالدیؒ، مولوی مجید الحسن ایڈوکیٹؒ، حاجی محمد کاملؒ، اور حافظ محمد اسحاقؒ سکریٹری انجمن تحفظ ملت لکھنؤ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ماہرین قانون کا اظہار ناراضگی

جون ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ کے قانون داں اور حکومت کے اعلیٰ مسلم افسران نے بھی ایک جلسہ گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں منعقد کیا جس میں متفقہ طور پر یہ مانگ کی گئی کہ تبرا ایجی ٹیشن فوراً بند کیا جائے۔ اس جلسہ میں اس وقت کے سب ہی مسلم دانشور، وکلاء، افسروں اور بیرسٹروں نے شرکت کی تھی۔ شہر کی سنجیدہ اور متین شخصیت چودھری نعمت اللہ صاحب سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ نے بڑی پرجوش تقریر فرمائی، اسی طرح جناب ہمایوں مرزا ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ وسیشن جج نے بھی سنیوں کی حمایت میں اپنا بیان دیا اور تبرا ایجی ٹیشن پر اپنے غم وغصہ کا اظہار کیا۔ جلسہ کی صدارت منشی اظہر علی صاحب کاکوروی ایم ایل اے نے کی تھی۔ بہر کیف بعد از خرابی بسیار شیعوں نے اپنا تبرا ایجی ٹیشن ۲۸/اگست ۱۹۳۹ء کو مولانا آزاد کے کندھوں پر بات رکھ کر بند کرنے کا اعلان کر دیا(۱)

ایک خوشگوار نتیجہ

۱۹۰۹ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک تحریک مدح صحابہ، احتجاجوں گرفتاریوں، اپیلوں اور یادداشتوں کے سہارے چلتی رہی مگر کوئی خاص پیش رفت نہ ہوسکی یہانتک کہ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم اور پھر اسکے نتیجہ میں برصغیر میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہوگیا جسکی وجہ سے شیعہ و سنی دونوں فرقوں کے پڑھے لکھے نوجوان اور خوشحال افراد پاکستان ہجرت کرنے لگے اور یہاں کے باقی ماندہ مسلمانوں کا مستقبل بھی غیر یقینی ہوگیا اس صورت حال میں ہندوستانی مسلمانوں کی تمام تحریکیں وقتی طور پر ہی سہی ماند پڑ گئیں تھیں ۱۹۵۰ء کے بعد جب حالات کچھ معمول پر آنے لگے اور ملکی سیاست میں ٹھہراؤ کے آثار پیدا ہونے لگے تو پھر اس مسئلہ کی طرف توجہ دینے کی کوشش کی گئی مگر یہ وہ وقت تھا جبکہ حضرت لکھنؤیؒ اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے تقریباً گوشہ نشین ہو چکے تھے اور تصنیف و تالیف اور تبلیغی اسفار کا سلسلہ بڑی حد تک ختم ہو چکا تھا اس لئے اب یہ تحریک آپ کی تیار کردہ اس ٹیم کے

---

(۱) آفتاب، لکھنؤ، ستمبر ۱۹۳۹ء

سپرد ہو گئی جس میں اس وقت کے نوجوان علماء، دانشور اور قانون داں حضرات شامل تھے، اس طرح سے اب مدح صحابہ تحریک کا وہ قدیم دور اختتام پذیر ہو گیا جس کی قیادت ابتک حضرت لکھنوی بذات خود کر رہے تھے چنانچہ ہم نے اپنے اس مضمون کو صرف اسی دور تک محدود رکھا ہے۔ ۱۹۴۲ء کے بعد کا دور فی الحال ہمارے موضوع سے باہر ہے کیونکہ اب اس کا تعلق براہ راست حضرت لکھنوی سے نہیں رہا تھا۔

اس عرصہ میں اس تحریک کے پلیٹ فارم سے شیعہ سنی اختلافات پر جتنا کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوپاک اور بنگلا دیش کا بچہ بچہ یہ جان گیا کہ ان اختلافات کی بنیاد اور اس کے اصل اسباب کیا ہیں۔ اب کوئی ذی ہوش وذی شعور اور دینی معلومات رکھنے والا شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے اور ان کے درمیان چند فروعی اختلافات ہیں یا یہ کہ دونوں فرقے اسلام ہی کی دو شاخیں ہیں۔ اسلام کی کوئی دو شاخیں نہیں ہیں، اسلام بس وہی ایک مذہب ہے جس کو نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ اس دنیا میں لیکر تشریف لائے اور پھر اسی کو آپؐ نے اور آپؐ کے صحابہ نے تمام عالم میں پھیلایا اور پھر اس کے بعد تابعین و تبع تابعین، علماء، محدثین، مفسرین، فقہاء، صوفیاء اور مشائخ عظام کے ذریعہ یہ دین آج بھی الحمدللہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے اور اب کوئی بھی پیروں، فقیروں قاضیوں اور مفتیوں کے بھیس میں آکر آسانی کیساتھ انکے عقائد کو خراب نہیں کر سکتا۔

بقیہ: حرف آغاز رہی سنسکرت زبان کی تعلیم تو کون نہیں جانتا کہ یہ ہندوؤں کی خالص مذہبی زبان ہے اسی بناء پر منوسمرتی کی روسے اسے صرف برہمن پڑھ سکتا ہے، دیگر ہندوؤں کو بھی اس کے پڑھنے کی اجازت نہیں۔ اس لئے بلاشبہ یوپی وزارت تعلیم کا یہ فیصلہ نہ صرف یہ کہ دستور ہند کے خلاف ہے بلکہ مسلمانوں کے دین ومذہب اور تہذیب وثقافت پر دن دھاڑے ڈاکہ ہے، سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان اپنے مذہب پر اس کھلے اور راست حملے کو برداشت کر سکتے ہیں؟ مسلمانوں کی اب تک کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ عملی اعتبار سے خواہ کتنے کمزور کیوں نہ ہوں مگر اپنے عقیدہ اور دین ومذہب کے معاملہ میں انتہائی حساس ہیں۔ وہ سب کچھ قربان کر سکتے ہیں لیکن اپنے عقیدہ اور دین ومذہب سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونین منظر سے
اس حال میں جینا لازم ہے، جس حال میں جینا مشکل ہے

السلام علی من اتبع الھدی

مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی ماننے والے اپنی آخرت کی فکر کریں ایمان اور کفر کے درمیان فرق سمجھیں یہ تو پہلے ہی سے جانتے ہیں کہ ایمان والے جنت میں اور کفر والے دوزخ میں جائیں گے جس میں ہمیشہ رہنا ہوگا اور یہ بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ مسلم اور مؤمن ہونے میں قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے قرآن کی ایک آیت کا انکار کرنا بھی کفر ہے اور اسکی تحریف بھی کفر ہے اور اسکی تکذیب بھی کفر ہے، جن لوگوں کی دنیا ہی قادیانیت ہے جو قصداً دوزخ میں جانے کا ارادہ کر چکے ہیں ان سے تو ایمان پر واپس آنے کی امید نہیں، مرزا طاہر کو ایک جماعت کی امارت ملی ہوئی ہے بہت بڑا مالدار بنا ہوا ہے اسکا ساتھ دینے والے اور اسکے دادا کے دعوئ نبوت کو پھیلانے والے اپنی دنیا کے لالچ میں بظاہر ایمان پر واپس آنے والے نہیں ہیں لیکن جو لوگ اپنی سادگی اور بھولے پن میں ان کفر کے داعیوں کی بات مان کر ایمان کھو بیٹھے ہیں اور دوزخ کے مستحق بن چکے ہیں ہمارا اُن سے خیر خواہانہ خطاب ہے اور مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ کفر سے توبہ کریں اور دوزخ سے بچ جائیں۔

قرآن مجید میں سیدنا محمد ﷺ کو خاتم النبیین بتایا ہے (دیکھو! سورۃ الاحزاب آیۃ ۲۰) اور اس آیت کی وجہ سے اور رسول اللہ ﷺ کے کثیر ارشادات کی وجہ سے جن میں آپ نے فرمایا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے لیکر آج تک سارے مسلمان یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت اور رسالت ختم ہوگئی اور جو بھی شخص آپ کے بعد نبوت یا رسالت کا دعویٰ کریگا وہ جھوٹا ہوگا وہ اور اس کے ماننے والے کافر ہوں گے اور دوزخی ہوں گے، اس کے ساتھ ہی سورۂ نساء کی آیت کریمہ اور اسکا ترجمہ پڑھئے

وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّه

مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهِ جَهَنَّم وَسَاءَ ت مَصِيراً (سورة النساء ۱۱۵)

(اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس کے لئے ہدایت ظاہر ہوچکی اور مسلمانوں کے راستے کے خلاف کسی دوسرے کا اتباع کرے تو ہم اس کو کام کرنے دیں گے جو وہ کرتا ہے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے)

اس آیت میں واضح طریقہ پر بتادیا ہے کہ جو شخص مومنین کے راستہ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے گا وہ دوزخ میں داخل ہوگا، جو لوگ قادیانی مبلغوں کی باتوں میں آکر دھوکہ کھاگئے ہیں اور نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی مان کر قرآن کے اعلان ختم نبوت کو جھٹلا بیٹھے ہیں اور چودہ سو سال سے جو مسلمانوں کا ختم نبوت کا عقیدہ تھا اس کے خلاف دوسرا عقیدہ اختیار کر کے کفر اختیار کرچکے ہیں ایسے لوگوں پر لازم ہے کہ واپس ہوکر اسلام قبول کریں اور کفر سے توبہ کریں اپنی جان کو جو دوزخ میں دھکیل چکے ہیں اس پر اصرار نہ کریں۔

ہر قادیانی یہ غور کرے کہ مرزا غلام احمد نے اپنے کو انگریزوں کا خود کاشتہ پودا بتایا ہے اور ان کو خوش کرنے کیلئے جہاد کے منسوخ ہونے کا اعلان کیا ہے اور آج تک اسکے ماننے والوں کا کافروں ہی سے جوڑ ہے اور ان ہی کی خدمات انجام دیتے ہیں آخر کیا وجہ ہے کہ منکرین رسالت محمدیہؐ سے اور مکذبین قرآن ہی سے قادیانیوں کا جوڑ ہے، اور کافران کی پشت پناہی کیوں کرتے ہیں؟ دیکھو ہندوستانی حکومت نے نئی دہلی میں ان کو بہت بڑی زمین دی ہے اسرائیل میں ان کا بہت بڑا دفتر ہے مرزا طاہر نے ربوہ سے راہ فرار اختیار کی تو انگریزوں نے لپک کر اسے پناہ دی مرزا قادیانی کے ماننے والوں کا کافروں سے جوڑ ہے، اہل ایمان سے توڑ ہے۔

ہر قادیانی اس کو غور کرے اور یہ بات بھی فکر کرنے کی ہے کہ مرزا قادیانی کے ماننے والے مسلمانوں ہی میں اپنی دعوت کا کام کیوں کرتے ہیں ہنود، یہود، بدھسٹ اور نصاریٰ میں اپنا کام کیوں نہیں کرتے، کیا یہ بات نہیں ہے کہ انہوں نے اہل ایمان کے دلوں سے ایمان کھرچنے کا بیڑہ اٹھار کھا ہے، جو اہل کفر ہیں ان سے دوستی ہے خود بھی کافر وہ بھی کافر ان کو اپنے دین کی دعوت دینے کا کچھ فائدہ نہیں، یہ جو علماء اسلام سورۃ الاحزاب کی آیت سناتے ہیں اس کا مضمون سمجھاتے ہیں قادیانی مبلغین اپنے عوام کو بہکانے کے لئے خاتم النبیین کا ترجمہ افضل النبیین کردیتے ہیں یہ کفر بالائے کفر ہے۔

کیونکہ اول تو محمد ﷺ پر نبوت ختم ہونے کے منکر ہیں پھر آیت کریمہ کی تحریف کردی اگر قادیانی یوں کہدیں کہ ہم قرآن کو نہیں مانتے تو جاہل سے جاہل مسلمان ان کے قریب نہیں جائے گا لہٰذا قرآن کو ماننے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں پھر اس کی تصریحات کو بھی نہیں مانتے قادیانی مبلغوں کے سامنے جب یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ خاتم الأنبیاء والمرسلین تھے تو آپؐ کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کو کیسے نبی مانتے ہو تو اس سوال کے جواب میں جو انہوں نے بہت سی کفریہ تاویلیں بنا رکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مرزا قادیانی کا ظہور محمد رسول اللہ ﷺ ہی کا دوبارہ تشریف لانا ہے اس بات کو ظلی اور بُروزی نبی سے تعبیر کرتے ہیں سوال یہ ہے کہ اگر تمہارا دین علیحدہ کوئی دین نہیں ہے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے دین پر ہو اور اسی دین کی اشاعت کے لئے مرزا قادیانی کا ظہور ہوا تو مرزا نے جہاد کو کیوں منسوخ قرار دیا اور کافروں سے کیوں موالاۃ کی جو اَب تک ہے، اور یہ بتاؤ کہ قرآن حکیم کی تعلیم ناظرہ وحفظ اور تجوید اور قرآت اور تفسیر پڑھانے کے تمہارے مدرسے کہاں ہیں، تم جہاں پڑھتے ہوں اور اولاد کو بھیجتے ہو؟ اور احکام و مسائل کی وہ کونسی کتابیں ہیں جن پر عمل کرتے ہو؟

حضرات صحابہ کرامؓ، محدثین و مفسرین و فقہاء جو مرزا غلام احمد سے پہلے گزرے ہیں اُن کے مسلمان ہونے میں تو تمہیں کوئی شک نہیں ہے صحاح ستہ کے مؤلفین تو مسلمان تھے بتاؤ! انؑ تفسیر واحادیث کی کتابوں کو تمہارے چھوٹے بڑے کہاں پڑھتے ہیں؟ اگر محمد رسول اللہ ﷺ سے کسی درجہ میں بھی تمہارا تعلق ہوتا تو قرآن مجید کو اور اُس کی تفاسیر کو اور احادیث کی کتابوں کو اور ان کی شروح کو پڑھتے اور پڑھاتے، اللہ تعالیٰ شانہ نے قرآن مجید میں محمد رسول اللہ ﷺ کے اتباع کا حکم دیا ہے یہ اتباع آپ کے اقوال واعمال و تقریرات کو معلوم کئے بغیر، معلوم نہیں ہو سکتا اپنے بچوں کو اور جوانوں کو رسول اللہ ﷺ کے اعمال واقوال کی کہاں تعلیم دیتے ہو؟ اصل بات یہ ہے کہ تمہارا اسلام کا صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے کسی طرح تمہارا اسلام ثابت نہیں ہوتا اسی لئے پاکستان اسمبلی کے تمام ارکان نے (جن میں ہر مسلک کے ممبران تھے) بالاتفاق تمہیں کافر قرار دے دیا۔ جو لوگ قرآن وحدیث کے ماہر ہیں وہ تو کہتے ہیں کہ تم کافر ہو اور تم کہتے ہو کہ ہم مسلمان ہیں کیا یہ زبردستی کا دعویٰ تمہیں دوزخ سے بچانے کا ذریعہ بن جائیگا؟

سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی احادیث تم لوگ اسی لئے نہیں پڑھتے پڑھاتے ہو کہ اُن میں جگہ جگہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں اگر حدیثیں پڑھو اور پڑھاؤ گے رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کروگے تو مرزا قادیانی کے دعوائے نبوت کو جھٹلانا پڑیگا لہذا تم لوگوں نے یہ راستہ نکالا ہے کہ آیت قرآنی کی تحریف کردی احادیث کو پڑھنا چھوڑدیا اپنے دل سے پوچھو کیا اس طرح ایمان اور قرآن سے کوئی تعلق باقی رہ جاتا ہے؟ مرنے کے بعد کیا ہوگا اس کو خوب غور کرلو۔

ہر قادیانی کو فکر کرنا لازم ہے کیونکہ یہ مسئلہ دنیاوی نہیں ہے آخرت میں نجات کا مسئلہ ہے دین اسلام قبول کرنا دوزخ سے بچنے ہی کے لئے ہے دنیا تو کسی نہ کسی طرح گذر ہی جاتی ہے اسلام قبول کرنے کی ضرورت اسی لئے ہے کہ دوزخ سے بچ سکیں اور جنت میں داخل ہو سکیں اگر تم اپنے کو مسلمان سمجھتے رہے لیکن قرآن کے منکر رہے اور قرآن کے حاملین عاملین اور عاملین کے اعلان کے مطابق کافر ہی رہے تو اس جھوٹے دعوائے اسلام سے آخرت میں کوئی فائدہ نہیں ہوگا ہم سچے دل سے ہر قادیانی کو فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ اپنی جان اور اہل وعیال کو دوزخ سے بچائیں اور مرزا طاہر اور اس کے چھوڑے ہوئے مبلغین کے دھوکہ میں نہ آئیں، یہ دعوت فکر بالکل خیر خواہی پر مبنی ہے، خوب سمجھ لیں۔

شیطان اس پر خوش ہوتا ہے کہ مسلمان ہونے کا مدعی بھی ہو اور مسلمان بھی نہ ہو اور اس کے ساتھ دوزخ میں چلا جائے قرآن مجید کے اعلان پر غور کریں:

یَاأَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ واخشَو ایوماً لَا یَجزیْ وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَولُودٌ هُو جَازٍ عَن وَالِدِهِ شَیئاً . اِنَّ وَعدَ اللّٰه حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الحیٰوةُ الدُّنیا وَلَا یَغُرَّنَّکُمْ بِا للّٰهِ الغَرُورُ .

(اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اس دن سے ڈرو جس دن باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کی طرف سے کچھ بھی بدلہ دینے والا ہوگا، بلا شبہ اللہ کا وعدہ حق ہے سو تمہیں دنیا والی زندگی ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے، اور ہرگز تمہیں اللہ کا نام لیکر بڑا دھوکہ باز دھوکہ میں نہ ڈالے)

مرزا طاہر نے آجکل اپنے ماننے والوں کو کفر پر جمائے رکھنے کا ایک اور حیلہ تراشا ہے کہ دیکھو مسلمانوں میں سے فلاں صاحب اقتدار اور فلاں عالم کو قتل کردیا گیا اور فلاں شخص فلاں

مرض میں راہی ملک بقاہوا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مرزا قادیانی نبی تھا (العیاذ باللہ) یہ وہی مثال ہے کہ مار و گھٹنا پھوٹے آنکھ دنیا سے مؤمن بھی رخصت ہوتے ہیں اور کافر بھی مرتے ہیں، موت کے ظاہری اسباب مختلف ہوتے ہیں۔کسی کے کسی حالت میں دنیا سے چلے جانے کو اس بات کی دلیل بنالینا کہ وہ مرزا قادیانی کو نبی نہیں مانتا عجیب بے جوڑ مہمل دلیل ہے، مرزا طاہر مناسب جانے تو دنیا میں جتنے لوگ حوادث میں یا وبائی امراض میں مرے ہیں، اُن سب کی فہرست بنالے سیکڑوں افراد کی فہرست بن جائے گی اور ساتھ ہی اپنے دادا جھوٹے مدعی نبوت کا نام اس میں لکھ لے کیونکہ اس کی موت ہیضہ میں ہوئی تھی اور ان سب کو مرزا کی نبوت کی دلیل میں پیش کردے، یاد رہے کہ اس میں سابق صدر امریکہ کینیڈی اور چارلس کی سابقہ بیوی ڈیانا کا نام بھی لکھ دے اور مصر اور ترکی کے وزیروں کے قتل کو بھی اپنے دادا کی نبوت کی دلیل بنالے کیونکہ یہ سب لوگ مرزا قادیانی کو نبی نہیں مانتے تھے، مرزا طاہر سے تو کیا خطاب کیا جائے وہ تو اپنی امارت کو باقی رکھنے کیلئے دوزخ میں جانے کو تیار ہے، جو لوگ مرزائیوں کے جال میں پھنسکر دوزخ کے مستحق بن چکے ہیں، ان سے درخواست ہے اور مکرر درخواست ہے کہ دوزخ سے بچنے کے لئے فکر مند ہوں اور اللہ تعالیٰ سے رو رو کر دعا کریں کہ کفر سے نکلنا آسان فرمادے اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لمن کان له قلب أو ألقی السمع وھو شھید

العبد

محمد عاشق الٰہی بلند شہری عفا اللہ عنہ

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان
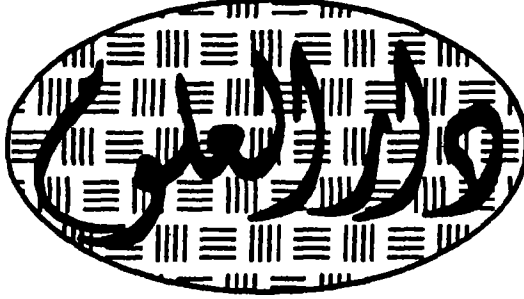
ماہنامہ

ماہ محرم ۱۴۱۹ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۹۸ء

جلد ۸۲	شمارہ ۵	فی شمارہ ۔/۶	سالانہ ۔/۶۰

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانہ بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۔/۴۰۰ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۔/۱۰۰، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۔/۸۰
ہندوستان سے ۔/۶۰

Tel. : 01336 - 22429
FAX : 01336 - 22768
Tel. : 01336 -24034 EDITER

فہرست مضامین

ختم خریداری اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے، اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرت مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

سلطنت مغلیہ جو اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود ہندوستان کی سیاسی وحدت کی ضامن تھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے اپنے وجود کو محفوظ نہ رکھ سکی جس کے نتیجہ میں اس کے ملبہ پر جدید حکومت کا قصر امارت تعمیر ہو گیا۔ اقتدار کی اس منتقلی کو چشم ظاہر بین نے اگرچہ ایک سیاسی کھیل کی حیثیت سے دیکھا جو سیاسی بازیگر زندگی کی فیلڈ میں کھیلتے رہتے ہیں۔ لیکن ارباب بصیرت اور سیاسی عروج وزوال کے وسیع تر اثرات سے واقفیت رکھنے والے اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ یہ محض سیاسی انقلاب اور اقتدار کا تبادلہ نہیں ہے بلکہ اسکے عوامل نہایت عمیق اور اس کے اثرات بہت دور رس ہیں، یہ انقلاب زندگی کے محور کو بدل کر رکھ دے گا اس کی خود سر موجیں معیشت و معاشرت، تہذیب و ثقافت، افکار و نظریات اور اعمال واخلاق کی قدیم موروثی قدروں کو بہالے جائیں گی۔ سیاسی انقلاب کی اس شکست و ریخت کو قرآن حکیم نے اپنے بلیغ اور معجزانہ اسلوب میں ملکہ سبا کی زبانی یوں بیان کیا ہے:

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلَّةً.

ملکہ نے کہا بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اسے خراب کر دیتے ہیں اور بنا دیتے ہیں اس کے سرداروں کو ذلیل۔

اس انقلاب کے بعد مسلم مفکرین کے سامنے دو راستے تھے ایک یہ کہ وہ حالات کے آگے سپر انداز ہو کر اس سے سمجھوتہ کرلیں اور اسی ڈگر پر چل پڑیں جس پر اس وقت کے حالات انہیں لے جانا چاہتے ہیں چنانچہ ایک مصلحت پسند حالات سے متأثر مفکر قوم کو اسی کی تلقین کرتا ہے

سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی ☆ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

دوسرا راستہ یہ تھا کہ "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز" کے جرأت مندانہ فیصلہ پر عمل کرتے ہوئے حالات کا رخ بدلنے کے لیے جہد و عمل کے میدان میں کود پڑیں۔ تاریخ بتا رہی

ہے کہ ہمارے اسلاف نے اسی دوسرے راستہ کا انتخاب فرمایا۔ سراج الہند شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کا فتویٰ "اکنون ہندوستان دار الحرب گشت" پیش آمدہ حالات سے مقابلہ کا ایک اعلان عام ہی تو تھا، "دار الحرب" نوں تو بظاہر چند لفظوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا فقرہ ہے لیکن جو لوگ اس کی اصطلاحی حقیقت اور اسی کے ساتھ ہندوستان کی علمی، دینی، سماجی اور سیاسی بساط پر خاندان ولی اللہی کے اثرات سے واقف ہیں وہ اس فقرہ کی معنوی وسعت اور گہرائی وگیرائی کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں مجاہد کبیر سید احمد شہید بریلویؒ کی تحریک دعوت وعزیمت کی بنیاد درحقیقت حضرت شاہ عبد العزیز قدس سرہ کا یہی فتویٰ تھا۔ شاہ احمد اللہ مدراسی اور ان کے رفقاء کے جوش جہاد کے پیچھے یہی فتویٰ کام کر رہا تھا۔ سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور ان کے اصحاب حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ اور قطب ارشاد مولانا گنگوہیؒ وغیرہ کو اسی فتویٰ نے آمادہ کیا تھا کہ وہ شمشیر بکف شاملی کے میدان میں نکل پڑیں۔ یہی وہ فتویٰ ہے جس کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لیے دیوبند میں ایک مرکز قائم کیا گیا جسے آج دنیا "دار العلوم دیوبند" کے نام سے جانتی پہچانتی ہے۔ یہی وہ فتویٰ ہے جس کے زیر اثر حضرت شیخ الہند نے "ریشمی رومال تحریک" کی تشکیل وتنظیم فرمائی اور ضعفِ پیری وکثرت امراض کے باوجود اسارتِ مالٹا کی جانگسل اذیتوں کو مردانہ وار جھیل گئے۔ اسی فتویٰ کی کارفرمائی تھی کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ نے مدرسہ وخانقاہ کے گوشہائے عافیت سے نکل کر خارزار جنگ حریت کی بادیہ پیمائی کو زندگی کا محبوب مشغلہ بنالیا۔

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

سامراجی طاقت جو ملک عزیز پر اپنا جابرانہ تسلط قائم کر لینے کے بعد یہ منصوبہ بنارہی تھی کہ یہاں کے باشندوں کے دین ومذہب اور تہذیب وکلچر کو بدل کر سب کو اپنے مزاج ومذاق کے سانچے میں ڈھال لے چنانچہ لارڈ میکالے نے ۷/مارچ ۱۸۳۵ء کو تعلیمی کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے جو رپورٹ پیش کی تھی اس میں وہ صاف لفظوں میں لکھتا ہے:

"ہمیں ایک ایسی جماعت چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان ترجمانی کا کام کرے اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون ورنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر مذاق، رائے، الفاظ اور فکر کے اعتبار سے انگریز ہو" (علماء حق ج ۱ ص ۳۹)

زمانہ گواہ اور تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے (اللہ کی ان پر

ہزار رحمتیں ہوں) اپنی پامردی صبر واستقامت جوش عمل اور جہد مسلسل سے نہ صرف یہ کہ حکومتِ وقت کے منصوبوں کے سارے تار و پود بکھیر کر رکھدئے بلکہ چشم فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ ہندوستانیوں کے دین ومذہب کے مٹادینے کا خواب دیکھنے والی ظالم وجارح حکومت اپنی تمام تر طاقت و قوت کے باوجود سرزمین ہند سے حرف غلط کی طرح مٹ گئی۔ اسطرح اسلاف کے پیہم قربانیوں کی بدولت اس عظیم فتنہ سے جس میں ملت اسلامیہ ہند گھر گئی تھی اور یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اس فتنۂ بکراں سے اپنے دینی ومذہبی امتیازات و تشخصات کو محفوظ نہ رکھ پائے گی نجات ملی (شکر اللّٰہ سعیھم وجزاھم عن المسلمین وعن الاسلام جزاءً حسنا)

آج کل کے حالات بھی کچھ اسی طرح کے ہیں بھارتیہ جنتاپارٹی جس کی بنیاد ہی ہندو احیاء پرستی اور اسلام دشمنی ومسلم بیزاری پر قائم ہے جس کی تمام جہد وسعی اور دوڑ دھوپ "ہندی، ہندو، ہندوستان" کے بنیادی فکر وفلسفہ کے گرد گھوم رہی ہے۔ بدقسمتی سے ملک کے اقتدار پر قابض ہو گئی ہے۔ اس نے تعلیم کے عنوان سے ایک ایسے انقلاب کی راہ ہموار کرنے کا سلسلہ شروع کردیا ہے جو مسلمانوں کے نظریات وعقائد کے لیے انتہائی خطرناک ومہلک اور ان کی نوجوان نسل کے ذہنی ارتداد و گمراہی کا باعث ہو سکتا ہے۔

پرائمری اسکولوں میں جن میں مسلمان بچوں کی کثیر تعداد زیر تعلیم رہتی ہے سرکاری طور پر جو ٹائم ٹیبل بھیجا جارہا ہے اس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ بچے تعلیم شروع کرنے سے پہلے "بھارت ماتا" کی تصویر پر پھول چڑھائیں گے اور "وندے ماترم" کا گیت گائیں گے اسی کے ساتھ رامائن، مہابھارت اور اپنشد کی تعلیم دی جائے گی۔

بھارت ماتا یعنی ہندوستان کی جو فرضی تصویر بنائی گئی ہے وہ دراصل ہندو مذہب "درگا دیوی" کی تصویر ہے اس طرح سرزمین ہند کو درگادیوی تصور کر کے اس کی عظمت وتعریف کے آگے اسکول کے سارے بچوں کو ــــــــ جھکنے اور اظہار عقیدت ومحبت کے طور پر پھول چڑھانے کا حکم دیا جارہا ہے، جو مسلمانوں کے عقیدہ توحید کے لحاظ سے کھلا ہوا شرک ہے۔

اسی طرح وندے ماترم کا گیت بھی اسلامی عقائد کے لحاظ سے خالص مشرکانہ گیت ہے اس کے چند بندوں کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے۔ ہندوستان کو مخاطب کر کے کہا جارہا ہے:

"وندے ماترم" میں تری وندنا کرتا ہوں اے میری ماں یہ اس گیت کا مرکزی مصرعہ ہے اس کے چوتھے بند میں کہا گیا ہے: تو ہی مرا علم ہے، تو ہی مرا دھرم ہے، تو ہی میرا باطن

ہے، تو ہی میرا مقصد ہے، تو ہی جسم کے اندر کی جان ہے، تو ہی بازوؤں کی قوت ہے، دلوں کے اندر تیری ہی حقیقت ہے ایک ایک مندر میں تیری ہی محبوب مورتی ہے، تو ہی دُرگا دس مسلح ہاتھوں والی، تو ہی کملا ہے کنول کے پھولوں کی بہار، تو ہی پانی ہے علم سے بہرہ ور کرنے والی، میں تیرا غلام ہوں، غلام کا غلام ہوں، غلام کے غلام کا غلام ہوں، اچھے پانی، اچھے پھلوں والی میری ماں میں تیرا بندہ ہوں"۔

چھٹے بند میں یہ کہا گیا ہے:

لہلہاتے کھیتوں والی مقدس موہنی آراستہ پیراستہ، قدرت والی قائم ودائم ماں میں تیرا بندہ ہوں۔ اپنے وطن سے ہزار محبت کے باوجود ایک سچا پکا مسلمان اسے معبود اور خدا مان کر اس کی بندگی اور پوجا کبھی نہیں کرسکتا، لیکن موجودہ حکومت ہندو احیاء پرستی کے نشہ میں اس قدر سرمست ہے کہ اسے نہ دستور ہند کا پاس ولحاظ ہے، نہ قانون وانصاف کی پرواہ اور نہ ہی ملک کے سیکولر روایات کا خیال وہ تو بس اس دھن میں ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو ہندویت میں جذب کرلے اور اپنی تعلیمی پالیسی کے تحت سرکاری طاقت کے ساتھ اس کا آغاز کردیا ہے۔

ان حالات میں ہمارے سامنے بھی وہی دو راستے ہیں ایک یہ کہ ہم حالات کے سامنے سر تسلیم خم کردیں اور حکومتِ وقت جس سمت ہمیں لے جانا چاہتی ہے بغیر کسی مزاحمت کیے ہم اسی رخ پر چل پڑیں بالفاظ دیگر اپنے دین وعقیدہ تہذیب وکلچر کو ترک کرکے ہندویت میں جذب ہوجائیں۔ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان اپنا سب کچھ قربان کرسکتا ہے۔ لیکن اپنے دین ومذہب کو قربان کردے یہ نہ کبھی ہوا ہے۔ اور نہ آج ہوسکتا ہے۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ اپنے دین، اپنی تہذیب اور اپنی ملی ایک ایک روایات کی حفاظت وبقاء کے لیے اپنے اکابر واسلاف کے اسوہ کے مطابق استقامت وپامردی اور ہمت وجرأت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کریں۔

بطور خاص حضرات علماء اور ملک کے دانشوروں کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ ملت کی کشتی کس سمت لے جائیں گے۔ کیونکہ خود رائی وخود پسندی کے اس دور میں بھی ملت کی زمام قیادت انھیں کے ہاتھوں میں ہے اور انھیں کے سامنے حضرات اکابر کے جہد وعمل کی مکمل تاریخ ہے اس لیے شدید ضرورت ہے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور وقت کے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ایثار وقربانی کی تاریخ کو پھر سے زندہ کریں۔

یہ مصرع کاش نقش ہر در ودیوار ہوجائے جسے جینا ہو مرنے کے لیے تیار ہوجائے۔

ایک اور صدمہ

ابھی مولانا محمد شاہد مرحوم کی جدائی کا غم تازہ ہی تھا کہ ایک اور صدمہ سے دارالعلوم دیوبند اور اس کے خدام کو دوچار ہونا پڑا یعنی ۱۸/ذی الحجہ کو حضرت مولانا زبیر احمد دیوبندی داغ مفارقت دیکر راہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون"

حادثۂ وفات اس قدر اچانک پیش آیا کہ لوگ ششدر ہو کر رہ گئے۔ اچھے خاصے بازار سے گھر گرستی کا سامان لیکر واپس آرہے تھے کہ مدنی مسجد کے متصل اچانک گر پڑے وہاں موجود لوگ اٹھا کر گھر لے گئے۔ اور فوراً ڈاکٹر بلایا تو معلوم ہوا کہ روح قفس عنصری سے آزاد ہو کر دوسرے عالم میں جاچکی ہے۔

حضرت مولانا مرحوم دارالعلوم دیوبند ہی کے فارغ التحصیل اور ایک ہونہار فرزند تھے اور تقریباً ۳۰-۳۵ سال سے دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے انتہائی مقبول مدرس تھے آپ کے درس سے طلبہ اور انتظامیہ ہمیشہ مطمئن رہے۔ مزاج کے اعتبار سے بالکل یک سو اور اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے اور تواضع وانکساری میں اسلاف کا نمونہ تھے۔ بالعموم اپنا کام اپنے ہاتھوں انجام دیا کرتے تھے۔ بالخصوص بازار سے سودا سلف تو بغیر کسی تخلف اور تکلف کے خود ہی لایا کرتے تھے۔ معاشی حالت بہت اچھی نہیں تھی مگر اپنی وضع، رہن سہن اور طرز زندگی سے کبھی اپنی اس حالت کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

مولانا مرحوم ادھر چند برسوں سے مختلف امراض میں مبتلا رہے جن میں بلڈ پریشر خاص طور پر پریشان کن تھا چند سال پہلے لقوہ کا عارضہ بھی پیش آگیا تھا۔ مگر اس حالت میں بھی اپنی طاقت وہمت کے مطابق پابندی کے ساتھ گھر سے مدرسہ آتے اور متعلقہ کتابوں کا درس دیتے۔

مولانا مرحوم کی وفات سے دارالعلوم ایک اچھے اور کامیاب مدرس سے محروم ہوگیا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے۔ اور صلحاء وصالحین کے درجات سے نوازے۔
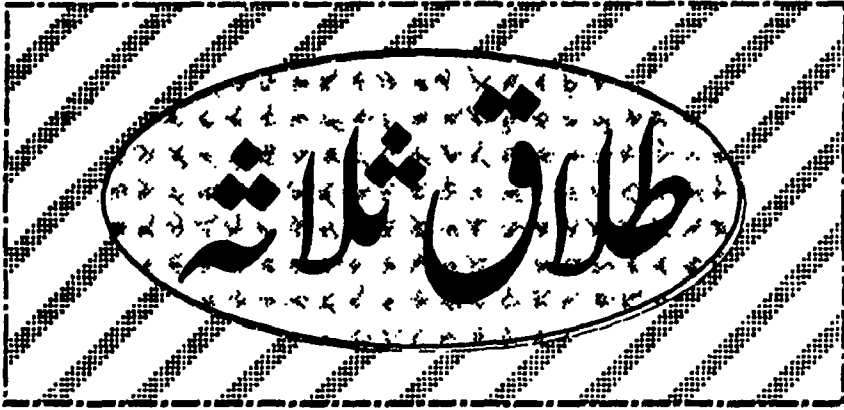
ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی شعبۂ دینیات سنی مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ

طلاق کے معنی شوہر کا اپنی بیوی کو پابندی نکاح سے آزاد کرنا ہے - یہ اسلام کے عائلی قانون کا ایک اہم حصہ ہے - اسلام سے قبل عربوں کے یہاں یہ دستور تھا کہ وہ عورت کو جتنی بار چاہتے طلاق دیتے مگر عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے اس سے رجعت کر لیتے تھے۔ ان میں بعض لوگ عورتوں کو یہاں تک تنگ کرتے تھے کہ اسے نہ تو طلاق دے کر پورے طور پر آزاد کرتے تھے اور نہ ہی اسے پوری طرح سے اپنی زوجیت میں رکھتے تھے بلکہ درمیانی حالت معلق رکھتے تھے، ایسے ہی حالات کی ستائی ہوئی ایک عورت ام المومنین حضرت عائشہؓ کے پاس آئی اس نے بیان کیا کہ میرا شوہر نہ تو مجھے طلاق دے کر آزاد کرتا ہے اور نہ ہی اپنی زوجیت میں رکھتا ہے۔ یعنی بار بار طلاق دیتا ہے اور عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے رجعت کر لیتا ہے۔ پھر طلاق دیتا ہے اور پھر عدت میں رجعت کر لیتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ نبی ﷺ سے بیان کیا۔ نبی ﷺ سن کر خاموش رہے۔ اس کے بعد قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔ الطلاق مَرّتٰنِ فَاِمساكٌ بِمَعرُوفٍ اَو تَسريحٌ باحسان(۱) (طلاق دو بار تک ہے اس کے بعد رکھ لینا ہے دستور کے موافق یا چھوڑ دینا ہے بھلی طرح سے)۔

یعنی ایسی طلاق جس میں رجعت ہو سکے دو ہیں اگر شوہر تیسری بار طلاق دے گا تو پھر ان میں کبھی نکاح جائز نہیں ہو گا یہاں تک وہ عورت دوسرے خاوند سے نکاح کر لے اور دوسرا خاوند اس سے صحبت کر کے اپنی مرضی سے طلاق دیدے یا وفات پا جائے - ارشاد باری تعالیٰ

ہے "فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلاَ تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَّتَرَاجَعَا اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَاللّٰهِ(۲) (پھر اگر اس عورت کو طلاق دی (یعنی تیسری بار) تو اب وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں جب تک کہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے پھر اگر زوج ثانی اس کو طلاق دے تو کچھ گناہ نہیں ان دونوں پر کہ باہم مل جائیں اگر خیال کرتے ہیں کہ اللہ کا حکم قائم رکھ سکیں گے)۔

عربوں میں جو پہلے دستور چلا آرہا تھا کہ عورت کو تنگ کرنے کی غرض سے بار بار طلاق دیتے اور بار بار اس سے رجعت کر لیتے تھے قرآن نے اسے ممنوع قرار دیا اور تعداد طلاق کو جو غیر محدود تھی گھٹا کر تین میں محدود کر دیا۔ اسی کے ساتھ جو لوگ عورتوں کو ستانے کی غرض سے رجعت کرتے تھے انھیں اس پر بھی تنبیہ کی گئی۔ ارشاد فرمایا وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّلاَ تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا(۳) (اور جب تم طلاق دو عورتوں کو پھر وہ پہونچنے کے قریب ہو جائیں اپنی عدت کو تو رکھ لو دستور کے موافق یا چھوڑ دو بھلی طرح سے اور نہ روکو ان کو ستانے کی غرض سے تا کہ تم ان پر زیادتی کرو)۔

طلاق کا حق اصلاً اگرچہ شوہر کو حاصل ہے لیکن وہ ایسا آزاد نہیں کہ جب چاہے اور جتنی چاہے بلا عذر عورت کو طلاق دیدے۔ بلکہ طلاق سے پہلے کئی مراحل بیان کئے گئے ہیں جن سے گذرنے کے بعد طلاق کی اجازت دی گئی ہے۔ ان میں سب سے پہلے مردوں کو یہ تاکید کی گئی کہ وہ عورتوں کے ساتھ بھلے طریقہ سے پیش آئیں۔ صرف ان کی برائیوں پر نظر نہ رکھیں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ان میں دوسری بہت سی خوبیاں ہوں، ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا" (۴) (اور پیش آؤ عورتوں کے ساتھ اچھی طرح، اگر وہ تم کو نہ بھاویں تو شاید تم کو پسند نہ آئے ایک چیز اور اللہ نے رکھی ہو اس میں بہت خوبیاں) یعنی عورتوں کے ساتھ گفتگو اور معاملات میں اخلاق اور حسنِ سلوک سے پیش آؤ، جاہلیت جیسا ذلت آمیز اور سختی کا برتاؤ مت کرو اگر تم کو عورت کی کوئی عادت اچھی نہ لگے تو صبر کرو شاید اس میں کوئی خوبی بھی ہو اور ممکن ہے کہ تم کو کوئی چیز ناپسند لگے مگر اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اس میں کوئی بڑی منفعت دینی اور دنیاوی رکھ دے سو تم کو تحمل سے کام لینا چاہئے اور عورتوں کے ساتھ بدخوئی نہیں کرنی چاہئے۔

اسی طرح احادیث میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے ایک حدیث میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا "تم میں بہتر شخص وہ ہے جو اپنے اہل کے لئے اچھا ہو" (۵)

لیکن اگر عورت میں واقعی کوئی ایسی اخلاقی خرابی پائی جائے جو بہرصورت ناقابل برداشت ہو تو حکم دیا گیا کہ فوراً طلاق دینے کے بجائے پہلے اسے سمجھائیں۔ اگر سمجھانا ناکافی ثابت ہو تو اظہار ناراضگی کے طور پر اپنا بستر ان سے الگ کرلیں۔ یہ بھی اگر ناکافی ہو تو اس کے بعد تادیب کی اجازت دی گئی ہے ارشاد ہے۔ وَالّٰتِی تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهجُرُوهُنَّ فِی المَضَاجِعِ وَاضرِبُوهُنَّ فَاِن اَطَعنَکُم فَلَا تَبغُوا عَلَیهِنَّ سَبِیلاً (۶) (اور جن عورتوں کی بدخوئی کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ اور جدا کرو انھیں سونے میں اور مارو۔ پھر اگر وہ کہا مان لیں تو مت تلاش کرو ان پر راہ الزام)۔

یعنی اگر کوئی عوت خاوند سے بدخوئی کرے تو پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مرد اس کو سمجھائے اگر نہ مانے تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ اپنا بستر الگ کرلے۔ لیکن اسی گھر میں رہے۔ اس پھر بھی نہ مانے تو آخری درجہ یہ ہے کہ اس کو مارے۔ لیکن اس طرح نہیں جس کا نشان پڑ جائے یا ہڈی وغیرہ ٹوٹ جائے بلکہ ہر تقصیر کا ایک درجہ ہوتا ہے اسی کے موافق تادیب اور تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے اس میں مارنا پیٹنا آخری درجہ ہے۔ اس بعد بھی اگر موافقت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو تو ہدایت کی گئی کہ ایک ثالث مرد کی طرف سے اور ایک عورت کی طرف سے بھیجا جائے اور دونوں ملکر تنازع ختم کرانے کی کوشش کریں اور اس بات کی پوری پوری جدوجہد کریں کہ دونوں میں مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَاِن خِفتُم شِقَاقَ بَینِهِمَا فَابعَثُوا حَکَماً مِن اَهلِهِ وَحَکَماً مِن اَهلِهَا اِن یُرِیدَا اِصلَاحاً یُوَفِّقِ اللّٰهُ بَینَهُمَا (۷) (اور اگر ڈرو تم ان دونوں کی باہمی مخالفت اور ضد سے تو کھڑا کرو ایک منصف مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورتوں میں سے اگر یہ دونوں چاہینگے کہ صلح کرادیں تو اللہ موافقت کرادے گا ان دونوں کے درمیان)۔

اگر یہ تمام کوششیں ناکام ہو جائیں تو طلاق کی اجازت یہ کہکر دی گئی کہ وہ حلال چیزوں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے۔ (۸) قرآن میں اسی کا مناسب طریقہ بھی بیان گیا فرمایا اللہ رب العزت نے۔ طَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (۹) (عورتوں کو طلاق ان کی عدت کے وقت دو) یعنی طلاق ایسے طہر میں دو جس میں صحبت نہ کی گئی ہو۔ تاکہ عدت شمار کرنے میں

مشکلات پیش نہ آئیں اور حالت حیض میں نہ دو کہ کہیں وہ محض وقتی منافرت کا نتیجہ نہ ہو۔ عہد نبوی میں ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنھما نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ "رجعت کرلو اور پھر (حالت طہر میں) طلاق دو"۔ (۱۰)

طلاق شریعت کی نگاہ میں مرد کے لئے کوئی ایسا ہتھیار نہیں جسے جب چاہا استعمال کرلیا بلکہ مرد کو اس بات کا مکلف بنایا گیا کہ وہ اس کے لئے شرعی وقت کا انتظار کرے اور پھر طلاق دے۔ اس میں مصلحت یہ ہے کہ بہت ممکن ہے کہ اس انتظار کے وقفہ میں طرفین کا غصہ فرو ہو جائے اور حالات روبہ اصلاح ہونے لگیں اور طلاق کی نوبت ہی نہ آئے۔

لیکن اگر طلاق ناگزیر ہو جائے تو صرف ایک طلاق پر اکتفاء کرنا چاہئے۔ ایسی صورت میں طرفین کیلئے مصالحت کے راہیں بھی کھلی رہینگی۔ یہ طلاق کا طریقہ تمام صحابہ اور فقہاء کے نزدیک تمام طریقوں میں سب سے بہتر ہے۔

طلاق دینے کا یہ طریقہ بھی درست ہے کہ تین طہروں میں ایک ایک کرکے تینوں طلاقیں دیجائیں۔ اس صورت میں بھی دونوں کو سوچنے سمجھنے کا کافی وقت مل جائیگا جس میں وہ کوئی فیصلہ کرسکتے ہیں۔ لیکن دوسرے کے مقابلہ میں پہلا طریقہ زیادہ بہتر ہے کہ عورت کو ایک طلاق کے بعد چھوڑ دیا جائے۔ طلاق کے تین درجات (یعنی تین طلاقیں) رکھے گئے ہیں اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ طلاق دینے کے لئے ان تینوں درجوں کو عبور کرنا ضروری یا بہتر ہے۔

طلاق دینے کے یہ دونوں طریقے شرعی ہیں۔ لیکن اگر کسی نے طلاق دینے کے یہ تمام اصول و قواعد اور طلاق سے پہلے کے تمام مراحل، جن سے گذرنے کا قرآن نے حکم دیا ہے، نظرانداز کرکے بیک وقت تینوں طلاقیں تین ہی کی نیت سے دیدیں تو وہ خلاف قاعدہ ہونے کے باوجود تینوں ہی واقع ہو جائینگی۔ یہ مسئلہ اگرچہ قرآن میں صراحۃً مذکور نہیں تاہم عہد نبوی میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت عامرالشعبی نے فرمایا کہ "حضرت فاطمہ بنت قیسؓ سے ان کی طلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا انھوں نے فرمایا کہ میرے خاوند نے مجھے تین طلاقیں دیں اسوقت وہ یمن میں تھے تو رسول اللہ ﷺ نے اسے جائز قرار دیا۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں۔ اس عورت نے دوسرے مرد سے شادی کرلی۔ دوسرے مرد نے بھی اسے طلاق دیدی۔ عورت نے اللہ کے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں زوج اول کے پاس جانا چاہتی ہوں تو کیا اب اس کے لئے حلال ہو گئی ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، یہانتک کہ تم اس کا اور وہ تمھارا شہد نہ چکھ لے (۱۲) (یعنی مباشرت نہ کرلے)

اسی طرح حضرت عویمر العجلانی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جائز قرار دیا۔(۱۱)

ان احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کسی نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں اور تین ہی کی نیت سے دی ہوں تو وہ تینوں ہی واقع ہو جائینگی۔

لیکن اگر کسی نے تین طلاقوں سے ایک ہی مراد لی ہو اور الفاظ طلاق محض تاکیداً استعمال کئے تو درج ذیل روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں عہد نبوی میں طلاق دینے والے کی بات کا اعتبار کر کے ایک ہی طلاق مانی جاتی تھی۔ حضرت عبد اللہ بن یزید اپنے والد حضرت رکانہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں (حضرت رکانہؓ) نے اپنی بیوی حضرت سہیمہ کو "طلاق البتۃ" دی اس پر انھیں بہت افسوس ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور واقعہ بیان کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے اس سے کیا ارادہ کیا تھا انھوں نے کہا میں نے ایک طلاق کی نیت کی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کی قسم تم نے صرف ایک ہی کی نیت کی تھی؟ حضرت رکانہؓ نے کہا خدا کی قسم میں نے صرف ایک ہی کی نیت کی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیوی کو ان کی طرف لوٹا دیا۔(۱۴)

یہ روایت امام ترمذی نے **هناد عن قبیصه عن جریر بن حازم عن الزبیر بن سعد عن عبد الله بن یزید بن رکانة عن ابیه عن جدّه** سے نقل کی۔ روایت نقل کرنے کے بعد امام ترمذی نے فرمایا۔ **هذا حدیث لانعرفه الا من هذا الوجه**(۱۵) (ہم اس حدیث کو اس سند کے سوا کسی دوسری سند سے نہیں جانتے)

امام ترمذی کے علاوہ اس روایت کو امام ابن ماجہ نے بھی نقل کیا۔(۱۶) اس کی سند اور اس کے تمام رجال وہی ہیں جن سے امام ترمذی نے نقل کی۔

امام ابوداؤد نے اس روایت کو (باختلاف الفاظ) دوسری سند سے نقل کیا ہے۔ امام ابوداؤد نے فرمایا: "**حدثنا احمد بن صالح نا عبد الرزاق نا ابن جریج اخبرنی بعض بنی**

ابی رافع مولی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن عکرمہ مولی ابن عباس عن ابن عباس........ " (۱۷) اس سند میں ایک راوی کا نام مجہول ہے۔ امام ابوداؤد نے اس سند سے منقول روایت کے مقابلہ میں امام ترمذی کی روایت اور سند کو "اصح" کہا ہے۔ (۱۸) لیکن جو روایت امام ترمذی نے نقل کی ہے اس کے بارے میں خود امام ترمذی نے فرمایا کہ "اس کی ایک ہی سند ہمیں معلوم ہو سکی" بالفاظ دیگر، یہ روایت خود ان کی نگاہ میں ضعیف ہے۔

دوسرے یہ کہ اسکی سند میں اضطراب ہے امام ذہبی نے حافظ عقیلی کے حوالہ سے فرمایا کہ اس روایت کے اسناد مضطرب ہیں۔ (۱۹) اور صاحب تحفۃ الاحوذی عبدالرحمٰن مبارکپوری نے فرمایا کہ اس کی سند اور متن دونوں میں اضطراب ہے۔ (۲۰)

تیسرے یہ کہ اسی روایت کے مرکزی راوی عبداللہ بن علی بن یزید بن رکانہ محدثین کی نگاہ میں ضعیف ہیں حافظ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا کہ وہ "لیّن الحدیث" (۲۱) ہیں اور امام بخاریؒ نے فرمایا کہ عبداللہ سے روایت کرنا درست نہیں۔ (۲۲)

اسی روایت کے دوسرے راوی زبیر بن سعد الہاشمی (سنن ابوداؤد " ابن ماجہ میزان الاعتدال اور تقریب التہذیب وغیرہ میں ان کا نام سعد کے بجائے سعید آیا ہے وہ) بھی ضعیف ہیں محدث یحیٰ بن معین نے ایک جگہ انھیں "ثقۃ" اور دوسری جگہ " لیس بشیء" (۲۳) کہا ہے۔ امام نسائی نے فرمایا کہ وہ "ضعیف" ہیں۔ (۲۴) حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ وہ "لین الحدیث" ہیں۔ (۲۵)

مذکورہ روایت کے سلسلے میں، نقد سند سے ہٹ کر، ائمہ کے درمیان اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی تھیں یا لفظ "البتۃ" استعمال کیا تھا روایات کے بموجب یہ بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے لفظ "البتۃ" سے طلاق دی تھی امام ابوداؤد نے فرمایا کہ لفظ "البتۃ" والی بات زیادہ صحیح ہے اس لئے کہ وہ خود حضرت رکانہؓ کی ذرّیت سے منقول ہے اور ظاہر ہے کہ ان کے گھر والے واقعہ سے جس قدر واقف تھے اتنے دوسرے نہیں ہو سکتے۔ (۲۶)

"البتۃ" کے لغوی معنی کاٹ دینے کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں اس سے ایک اور تین (دونوں) کا عدد مراد ہوتا ہے۔ شارح مسلم امام نوویؒ نے فرمایا: **انہ طلقھا البتۃ ولفظ البتۃ محتمل للواحد وللثلاث** (۲۷) (حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو لفظ "البتۃ" کے ذریعہ

طلاق دی تھی اور "البتۃ" کا لفظ ایک اور تین دونوں عدد کا احتمال رکھتا ہے۔) امام ترمذی نے فرمایا کہ صحابہ میں حضرت عمرؓ اس لفظ سے ایک اور حضرت علی تین طلاق مراد لیتے تھے۔ ائمہ میں سفیان ثوری اہل کوفہ اور امام شافعی نے فرمایا کہ یہ نیت پر موقوف ہے۔ یعنی اگر ایک طلاق کی نیت کی تو ایک اور اگر تین کی نیت کی تو تین طلاقیں واقع ہونگی۔ امام مالک کے نزدیک طلاق البتۃ میں عورت اگر ایسی ہے جس سے صحبت ہو چکی ہے تو تین ورنہ ایک ہی واقع ہو گی" (۲۸)

امام مالک نے ابن شہابؒ سے روایت نقل کی کہ "مروان طلاق البتۃ میں تین طلاق کا حکم کرتا تھا۔ مروان کا یہ حکم مدینہ منورہ کے علماء کے سامنے ہوتا تھا اس واسطے یہ حجت ہے" (۲۹)

حضرت عمر بن عبد العزیز نے فرمایا کہ اگر طلاق ایک ہزار تک درست ہوتی تو "البتۃ" میں سے کچھ بھی باقی نہ رہتا جس نے "البتۃ" کہا وہ انتہا کو پہونچ گیا۔ (۳۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "البتۃ" تین اور ایک دونوں کیلئے استعمال ہوتا تھا۔ حضرتؓ رکانہؓ نے طلاق البتۃ کہکر ایک ہی طلاق مراد لی تھی لیکن چونکہ احتمال اس میں تین کا بھی تھا اس لئے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے دریافت کرنے کی ضرورت پیش آئی اور پھر مزید اطمینان لئے ان کو قسم دلا کر بھی پوچھا کہ اس سے تمہاری نیت کیا تھی۔ جب انھوں نے کہا کہ میں نے ایک ہی کی نیت کی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیوی کو ان کی طرف لوٹا دیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت رکانہؓ نے تین طلاقیں دی ہوں یا طلاق البتۃ۔ اس بات کا شبہ بہر حال موجود تھا کہ انھوں نے تین طلاقیں مراد لی ہوں اسی لئے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات دریافت کرنے اور حلف لینے کی ضرورت پیش آئی۔

دوسرے یہ کہ روایت اگر چہ سنداً ضعیف ہے جیسا کہ اوپر اس کی بحث گذر چکی لیکن متناً اس کی تائید صحیح مسلم کی روایت سے ہوتی ہے حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانے میں نیز حضرت عمرؓ کے ابتدائی دو برسوں تک تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لوگ اس معاملہ میں جلد بازی کرنے لگے جس میں انھیں مہلت ملی تھی سو اگر ہم اس کو جاری کر دیں تو مناسب ہو گا چنانچہ انھوں نے اسے نافذ کر دیا" (۳۱)

شارح مسلم، امام نووی نے اس روایت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "صحیح بات یہ ہے کہ ابتداء میں جب شوہر الگ الگ طلاق دیتا یعنی کہتا۔ "انت طالق، انتِ طالق. انت

طلاق" "اور اس زمانہ میں شوہر نہ تاکید کا ارادہ کرتا اور نہ استیناف کا تو چونکہ استیناف کی نیت نہیں ہوتی اور غالب حالات تاکید کی ہوتی تھی اس لئے غالب حالات پر محمول کر کے ایک طلاق کا حکم لگایا جاتا تھا۔ جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا اور لوگ اس طرح کثرت سے طلاق دینے لگے اور استیناف کی نیت غالب ہو گئی تو تین طلاقوں کا حکم لگایا گیا"۔ (۳۲)

حضرت ابن عباس کی روایت کا اگر یہ مطلب لیا جائے کہ مطلق تین طلاقوں سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے تو ایسی صورت میں خود حضرت ابن عباسؓ کا عمل اس سے مطابقت نہیں کرتا۔ مختلف روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ تین طلاقوں کو تین ہی مانتے تھے۔ امام مالک نے نقل کیا کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ کے پاس آکر کہا کہ میں نے اپنی عورت کو سو طلاقیں دے دیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا وہ تین طلاقوں میں تجھ سے بائن ہو گئی اور ۹۷ طلاقوں سے تو نے اللہ کی آیتوں سے مذاق کیا۔ (۳۳)

اسی طرح ایک روایت امام ابو داؤد نے بھی نقل کی کہ حضرت مجاہد نے فرمایا میں حضرت ابن عباسؓ کے پاس تھا اتنے میں ان کے پاس ایک شخص آیا اور کہا میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں۔ حضرت ابن عباسؓ خاموش رہے یہاں تک میں سمجھا کہ وہ اس عورت کو اس کے ساتھ لوٹا دینگے پھر فرمایا تم لوگوں کو جب حماقت سوار ہوتی ہے تو دوڑے چلے آتے ہو اور آکر اے ابن عباس اے ابن عباس کرتے ہو۔ (یعنی کہتے ہو کہ اس مصیبت سے نجات دلاؤ) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لئے کوئی راہ نکالتا ہے تم اللہ سے نہیں ڈرتے تو اب مجھے تمھارے لئے کوئی راہ نظر نہیں آتی تم نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور تمھاری بیوی تم سے جدا ہو گئی۔ (۳۴)

یہی مسلک تمام صحابہ کا تھا۔ امام مالک نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت نقل کی کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہا میں نے اپنی بیوی کو دو سو طلاقیں دیدیں۔ ابن مسعود نے فرمایا کہ لوگوں نے تجھ سے کیا کہا۔ وہ بولا کہ مجھ سے یہ کہا کہ تیری عورت تجھ سے بائن ہو گئی۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا سچ کہا۔ (۳۵)

دیگر صحابہ میں اسی طرح کے اقوال حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت علی اور حضرت عائشہؓ، حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ وغیرہ سے بھی منقول ہیں اور مدینہ میں اسی پر عمل ہوتا تھا۔

اسی طرح ائمہ میں امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، اور سلف وخلف کے جمہور علماء کا بھی مذہب یہی ہے سوائے امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم اور شیعہ حضرات کے۔ ان کا مسلک جمہور علماء امت کے خلاف ہے یہ دونوں بزرگ اور علماء شیعہ اس مسئلہ میں منفرد ہیں۔ بقیہ امت کے تمام مجتہدین ان کے خلاف ہیں۔

احادیث کے مجموعہ سے قدر مشترک جو بات نکلتی ہے وہ یہ کہ اگر تین طلاقیں تین ہی کی نیت سے دیجائیں تو اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور تمام صحابہ کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ وہ تینوں ہی واقع ہوجائینگی۔ البتہ اگر تین طلاقوں سے کسی نے ایک ہی مراد لی ہو تو عہد نبوی، خلافت حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت کے ابتدائی دو سالوں تک ایک ہی قرار دیجاتی تھی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے جب یہ دیکھا کہ لوگوں میں دیانت کا معیار گھٹ رہا ہے اور اس طرح لوگ بہت طلاق دینے لگے ہیں اور اندیشہ ہے کہ لوگ اس قسم کا جھوٹا بیان دے کر حرام کا ارتکاب کرنے لگیں گے تو انہوں نے صحابہ کے مشورہ سے یہ حکم جاری کر دیا کہ آئندہ جو شخص بھی تین مرتبہ الفاظ طلاق استعمال کرے گا اسے ہر صورت میں تین طلاق قرار دیا جائیگا صحابہ میں سے کسی نے بھی حضرت عمر کے اس فیصلہ سے اختلاف نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق تھا اگر وہ اس کے خلاف ہوتا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر جان چھڑکنے والے تمام صحابہ خاموش نہیں رہتے بلکہ وہ اس کے خلاف احتجاج کرتے، لیکن چونکہ یہ بات قرآن وسنت کے مطابق تھی اس لئے تمام صحابہ نے اسے باجماع قبول کر لیا اور کسی نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا اس لئے صحابہ کا اجماع ہمارے لئے حجت ہے اس سے اختلاف جائز نہیں۔ اس کے علاوہ روایات سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی کہ عہد نبوی، خلافت حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت کے ابتدائی دو برسوں تک مطلق تین طلاقوں کو ایک شمار کیا گیا ہو۔

مراجع / حواشی

(۱) ترمذی، ابواب الطلاق، باب ما جاء فی طلاق المعتوہ
(۲) البقرہ - ۲۳۰
(۳) البقرہ - ۲۳۰

(۴) النساء - ۱۹
(۵) ابن ماجہ، ابواب النکاح ، باب حسن معاشرة النساء
(۶) النساء - ۳۴
(۷) النساء - ۳۵
(۸) ابن ماجہ،ابواب الطلاق
(۹) النساء - ۱۹
(۱۰) مسلم، کتاب الطلاق، باب تحریم طلاق الحائض
(۱۱) ابن ماجہ،ابواب الطلاق،باب من طلق ثلاثا في مجلس واحد
(۱۲) بخاری، کتاب الطلاق، باب من اجاز طلاق الثلاث
(۱۳) بخاری،کتاب الطلاق ،باب من اجاز طلاق الثلاث
(۱۴) ترمذی،ابواب ماجاء فی الرجل طلق امراته البتّه
(۱۵) ترمذی، ابواب ما جاء فی الرجل طلق امراته البتّه
(۱۶) ابن ماجہ، ابواب الطلاق ، باب طلاق البتّه
(۱۷)ابوداؤد، کتاب الطلاق،باب بقية نسخ المراجعة بعد التطليقات الثلث
(۸) ابوداؤد، کتاب الطلاق ، باب فی البتّه
(۱۹) ذہبی، میزان الاعتدال ۲/ ۵۷، مطبوعہ مصر ۱۳۲۵ھ
(۲۰) عبد الرحمٰن مبارکپوری، تحفۃ الاحوذی، (شرح ترمذی) فی ذیل ابواب الطلاق،باب ما جاء فی الرجل طلق امراته البتّه
(۲۱)ابن حجرعسقلانی، تقریب التہذیب /۷ ۱۲، مطبوعہ نولکشور، لکھنؤ۔ الفاظ جروح میں "لین الحدیث" سب سے کم ضعف رکھنے والے راوی کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ایسے راوی کو ساقط الاعتبار نہیں کہا جاتا۔ لیکن ایک حد تک مجروح اور ضعیف ضرور سمجھا جاتا ہے محدثین ایسے راویوں کی روایات کو دوسری روایات کی تائید میں قبول کرتے تھے۔(دیکھئے مقدمہ ابن صلاح ص ۲۳۹، تدریب الراوی ۱/۳۴۶)
(۲۲) تحفۃ الاحوذی، ابواب الطلاق، باب ما جاء فی الرجل طلق امراته البتّه

بقیہ صفحہ ۲۹

تیسری قسط

مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوری صاحب

ان روایات کو ملحوظ رکھ کر اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ عہد صحابہ و تابعین میں تقلید مطلق و تقلید شخصی دونوں کا رواج تھا مگر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ وہ خیر القرون کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں خیر کا غلبہ تھا، نفسانی خواہشات کا عام طور پر دین میں دخل نہیں تھا، اس لئے جو شخص اپنے کسی بڑے سے کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو نیک نیتی سے کرتا اس کے پیچھے اپنی خواہش پوری کرنے کا جذبہ کار فرمانہ ہوتا لہذا جو جواب ملتا نفس کے موافق ہوتا یا خلاف اسے قبول کر کے اس پر عمل پیرا ہو جاتا۔ لہٰذا ان کا متعدد حضرات سے پوچھنا یا تو اتفاقی طور پر ہوتا یا یہ نیت ہوتی کہ جس کے قول میں زیادہ احتیاط ہو گی اس پر عمل کرینگے اس لئے اس زمانہ میں تقلید مطلق اور تقلید شخصی دونوں پر عمل ہوتا تھا پھر جوں جوں حضور اقدس ﷺ کے مبارک زمانہ سے بُعد ہوتا گیا لوگوں کی دینی حالت بدلنے لگی، خوف خدا اور احکام شریعت کی عظمت دلوں سے کم ہونے لگی اور اغراض پرستی غالب آنے لگی اور حالت یہ ہونے لگی کہ اب متعدد حضرات سے اس لئے پوچھا جاتا کہ جس میں سہولت ہو گی اسے اختیار کرینگے تو امت کے نباض علماء نے دکھتی رگ پکڑ کر تقلید کو "تقلید شخصی" میں منحصر کر دیا اور بتدریج علماء کا میلان اس طرف ہونے لگا اور ہوتے ہوتے تقلید شخصی کے وجوب پر امت کا اجماع ہو گیا اگر ایسا نہ کیا جاتا تو احکام شریعت کھلونا بنجاتے اور لوگ اپنے اپنے مطلب اور خواہش پر عمل کرتے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

وبعد المأتين ظهر فيهم التمذهبُ للمجتهدين اعيانهم وقلّ من كان لايعتمد علىٰ مذهب مجتهد بعينه وكان هو الواجب فى ذلك الزمان.

(انصاف ص ۲۴)

دوسری صدی ہجری کے بعد لوگوں میں متعین مجتہد کی پیروی کارواج ہوگیااور بہت کم لوگ ایسے تھے جوکسی خاص مجتہد کے مذہب پراعتماد نہ کرتے ہوں اوراس زمانہ میں یہی ضروری تھا۔

علامہ ابن تیمیہؒ بھی تقلید شخصی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

فی وقتٍ یقلّدون من یفسد النکاح وفی وقتٍ یقلّد ون من یصححه بحسب الغرض والھویٰ ومثل ھذا لایجوز (فتاوی ابن تیمیه ص ۲۴۰ ج ۲)

یعنی یہ لوگ کبھی اس امام کی تقلید کرتے ہیں جو نکاح کو فاسد قرار دیتا ہے اورکبھی اس امام کی جواسے درست قرار دیتا ہے اپنی غرض اور خواہش کے مطابق اوراس طرح عمل کرنا بالاتفاق ناجائز ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تقلید کے ضروری ہونے کو مختلف انداز سے تحریر فرماتے ہیں:

باب تاکید الاخذ بمذاهب الاربعة والتشدید فی ترکها والخروج عنها . اعلم ان فی الاخذ بهذه المذاهب الاربعة مصلحة عظیمةً وفی الاعراض عنها کلها مفسدة کبیرةً . (عِقد الجید مع سلك المروارید ص ۳۱)

باب سوم ان چار مذہبوں کے اختیار کرنے کی تاکیداوران کے چھوڑنے اوران سے باہر نکلنے کی ممانعت شدیدہ کے بیان میں۔ اِعْلَمْ .. جاننا چاہئے کہ ان چار مذہبوں کے اختیار کرنے میں ایک بڑی مصلحت ہے اوران سے اعراض وروگردانی کرنے میں بڑامفسدہ ہے۔

اسی کتاب میں دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

وثانیاً قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اتّبِعوا السواد الاعظم ولمّا اندرست المذاهب الحقة الاهذه الاربعة کان اتباعها اتباعاً للسواد الاعظم . (عقد الجید مع سلك مروارید ص ۳۳)

اور مذہب کی پابندی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایاہے کہ سواداعظم یعنی بڑے معظم جتھے کی پیروی کرو اور چونکہ مذاہب حقہ سوائے ان چار مذہب کے باقی نہیں رہے توان کی پیروی کرنا بڑے گروہ کی پیروی کرنا ہے اور ان سے باہر نکلنا بڑی معظم جماعت سے باہر نکلنا ہے۔

آپ امام بغوی رحمہ اللہ کا قول نقل فرماتے ہیں:

ویجب علی من لم یجمع هذه الشرائط تقلید ہ فیما یعن له من الحوادث
(عقد الجید ص ۹)

اور اس شخص پر جو ان شرائط (یعنی اجتہاد کی شرائط) کا جامع نہیں اس پر کسی مجتہد کی تقلید کرنا واجب ہے ان حوادث (مسائل) میں جو اس کو پیش آویں۔

نیز تحریر فرماتے ہیں:

وفی ذلك (التقلید) من المصالح مالایخفی لاسیماً فی هذه الایام الّتی قُصرتْ فیها الهمم واُشرِبتِ النفوسُ الهَوٰی واعجب کل ذی رأی برأیه....
(حجة اللّٰه البالغه مترجم ص ۳۶۱ ج ۲)

اور اس میں (یعنی مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید کرنے میں) بہت سی مصلحتیں ہیں جو مخفی نہیں ہیں خاص کر اس زمانہ میں جب کہ ہمتیں بہت پست ہو گئی ہیں اور نفوس میں خواہشاتِ نفسانی سرایت کر گئی ہیں اور ہر رائے والا اپنی رائے پر ناز کرنے لگا ہے۔

اور فرماتے ہیں:

وهذه المذاهب الاربعة المُدَوَّنَةُ المُحَرَّرَةُ قد اجتمعت الأمةُ او من یعتدّ بها منها علیٰ جواز تقلید ها الیٰ یومناهٰذا (حجة الله البالغه ص ۳۶۱ ج ۱)

اور یہ مذاہب اربعہ جو مدون اور مرتب ہو گئے ہیں پوری امت نے یا امت کے معتمد حضرات نے ان مذاہب اربعہ (مشہورہ) کے تقلید کے جواز پر اجماع کر لیا ہے (اور یہ اجماع) آج تک باقی ہے۔

اور فرماتے ہیں:

انسانٌ جاهلٌ فی بلاد الهند وبلاد ماوراء النهرْ ولیس هناك عالم شافعی ولا مالکی ولاحنبلیٌ ولا کتاب من کتب هذه المذاهب وَجَبَ علیه ان یقلدلمذهب ابی حنیفة ویحرم علیه ان یخرج من مذهبه لانه حینئذ یخلع من عنقه ربقة الشریعة ویبقی سدیً مهملاً

(انصاف عربی ص ۵۳ مع ترجمه کشاف ۷۰)

کوئی جاہل عامی انسان ہندوستان اور ماوراء النہر کے شہروں میں ہو (کہ جہاں مذہب حنفی پر ہی زیادہ تر عمل ہے) اور وہاں کوئی شافعی مالکی اور حنبلی عالم نہ ہو اور نہ ان مذاہب کی کوئی کتاب

۔۔ تو اس وقت اس پر واجب ہے کہ امام ابو حنیفہؒ ہی کے مذہب کی تقلید کرے اور اس پر حرام ہے کہ حنفی مذہب کو ترک کردے اس لئے کہ اس صورت میں شریعت کی رسی اپنی گردن سے نکال پھینکنا ہے اور مہمل اور بے کار بنجاتا ہے۔

اور فرماتے ہیں:

وبالجملة فالتّمذهب للمجتهدين سراً اَلْهَمَهُ اللهُ تعالىٰ العلماءَ وجمعهم عليه من حيث يشعرون اَوْ لايشعرون ....

(انصاف عربی ص ۴۷ مع ترجمه کشاف ص ۶۳)

الحاصل ان مجتہدین (ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے) مذہب کی پابندی (یعنی تقلید شخصی) ایک راز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے علماء کے دلوں میں الہام کیا ہے اور اس پر ان کو متفق کیا ہے وہ تقلید کی مصلحت اور راز کو جانیں یا نہ جانیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے مذکورہ فرامین سے ثابت ہوتا ہے

(۱) مذاہب اربعہ (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کا اتباع سواد اعظم کا اتباع ہے (جوازروئے حدیث واجب ہے) اور مذاہبِ اربعہ کے دائرہ سے خروج سواد اعظم سے خروج ہے (جو گمراہ کن ہے)۔

(۲) مذاہب اربعہ کے دائرہ کے اندر رہنے میں دینی مصالح ہیں اور ان سے اعراض میں مفسدہ ہے۔

(۳) غیر مجتہد پر تقلید واجب ہے۔

(۴) مذاہب اربعہ کی تقلید پر امت کا اجماع ہے۔

(۵) مذاہب اربعہ میں سے ایک مذہب کی تقلید یعنی تقلید شخصی منجانب اللہ ایک الہامی راز ہے۔

(۶) کوئی شخص (غیر مجتہد) ایسی جگہ ہو جہاں صرف مذہب حنفی پر عمل ہوتا ہو اور وہاں دوسرے مسلک کا کوئی عالم نہ ہو اور نہ کتاب ہو تو ایسی جگہ اس پر واجب ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی تقلید کرے، اور اس صورت میں آپ کے مذہب سے خروج حرام ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ کے مندرجہ فرامین سے تقلید کی اہمیت، اس کی ضرورت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ کے علاوہ دیگر علماء کبار نے بھی تقلید کی ضرورت اور اس کے

واجب ہونے کو تحریر فرمایا ہے، بطور نمونہ چند علماء کی عبارتیں پیش کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

حافظ حدیث علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ متوفی ۸۶۱ھ نے "التحریر فی اصول الفقہ" میں تحریر فرمایا ہے:

وعلیٰ هذا ماذكر بعض المتأخرين منع تقليد غير الاربعة لانضباط مذاهبهم وتقليد مسائلهم وتخصيص عمومها ولم يُدرَ مثله في غيرهم الآن لانقراض اتباعهم وهوَ صحيحٌ (التحرير ص ۵۵۲)

اور اسی بنیاد پر بعض متاخرین نے ذکر کیا ہے کہ ائمہ اربعہ ہی کی تقلید متعین ہے نہ کہ دوسرے ائمہ کی۔ اس لئے کہ ائمہ اربعہ کے مذاہب مکمل منضبط ہو گئے ہیں اور ان مذاہب میں مسائل تحریر میں آچکے ہیں اور دوسرے ائمہ کے مذاہب میں یہ چیز نہیں ہے اور ان کے متبعین بھی ختم ہو چکے ہیں اور تقلید کا ان ہی چار اماموں میں منحصر ہو جانا صحیح ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری متوفی ۹۷۰ھ "الاشباہ والنظائر" میں تحریر فرماتے ہیں:

وماخالف الائمة الاربعة فهو مخالف للاجماع. (الاشباه والنظائر ص ۱۳۱)

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے استاذ جامع المعقول والمنقول شیخ احمد المعروف بہ مُلّا جیون صدیقی متوفی ۱۱۳۰ھ "تفسیرات احمدیہ" میں تحریر فرماتے ہیں:

والانصاف ان انحصار المذاهب في الاربعة واتباعهم فضلٌ الٰهيٌّ وقبولية من الله لامَجَال فيه للتوجيهات والادلة (تفسيرات احمديه ص ۳۴۶)

انصاف کی بات یہ ہے کہ مذاہب کا چار میں منحصر ہو جانا اور انہی چار کی اتباع کرنا فضل الٰہی ہے اور منجانب اللہ قبولیت ہے اس میں دلائل اور توجیہات کی حاجت نہیں۔

علامہ جلال الدین محلی "شرح جمع الجوامع" میں تحریر فرماتے ہیں:

يجب على العامي وغيره ممن لم يبلغ مرتبة الاجتهاد التزام مذهبٍ معين من مذاهب المجتهدين (بحواله نور الهدايه ترجمه شرح الوقايه ص ۱۰)

واجب ہے عامی اور غیر عامی پر جو کہ درجۂ اجتہاد کو نہ پہنچا ہو مجتہدین کے مذاہب میں سے ایک مذہب معین کو عمل کے لئے اپنے اوپر لازم کر لینا۔

امام عبدالوہاب شعرانیؒ "میزان الشریعۃ الکبریٰ" میں تحریر فرماتے ہیں:

وكان سيدى الخوّاص رحمه الله تعالىٰ اذا سأله انسانٌ عن التقليد بمذهب معين الاٰن هل هو واجبٌ اَمْ لا يقول له يجب عليك التقليد بمذهب ما دامت لم تصل الیٰ شهود عين الشريعة الاولىٰ من الوقوع فى الضلال وعليه عمل الناس اليوم (ميزان كبرىٰ)

میرے سردار علی خواص رحمہ اللہ سے جب پوچھا جاتا کہ اس وقت مذہب معین کی تقلید واجب ہے یا نہیں؟ تو فرماتے تجھے کمالِ ولایت و نظر کشف و شہود سے مرتبۂ اجتہاد حاصل نہ ہو اس وقت تک معین امام کی دائرۂ تقلید سے قدم باہر نہ نکالنا اور اسی پر آج لوگوں کا عمل ہے۔

علامہ سید طحطاوی رحمہ اللہ متوفی ۱۲۳۳ھ فرماتے ہیں:

فعليكم يا معشر المؤمنين باتباع الفرقة الناجية المسماة باهل السنة والجماعة فان نصرة الله فى موافقتهم وخذ لانه وسخطه ومقته فى مخالفتهم وهذه الطائفة الناجية قد اجتمعت اليوم فى المذاهب الاربعة هُم الحنفيون والمالكيون والشافعيون والحنبليون ومن كان خارجاً من هذه المذاهب الاربعة فى ذلك الزمان فهو من اهل البدعة . والنار .

(طحطاوى على الدر المختار ج ٤ ص ١٥٣ كتاب االذبائح)

اے گروہ مسلمان! تم پر نجات پانے والے فرقہ کی جو اہل سنت والجماعت کے نام سے موسوم ہے پیروی کرنا واجب ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اہل سنت والجماعت کے ساتھ موافقت کرنے میں ہے اور اہل سنت والجماعت کی مخالفت کرنے میں اپنی ذات کو خدا تعالیٰ کے غضب اور ناراضگی کا مورد بناتا ہے (اللہ اپنی پناہ میں رکھے) اور یہ نجات پانے والا گروہ یعنی اہل سنت والجماعت) آج مجتمع ہو گیا ہے چار مذاہب میں اور وہ حنفی، مالکی، شافعی، اور حنبلی ہیں اور جو شخص اس زمانہ میں ان چار مذاہب سے خارج ہے وہ اہل بدعت اور اہل نار سے ہے (اہل سنت میں داخل نہیں)

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی رحمہ اللہ کتاب "راحۃ القلوب" میں تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت خواجہ سید العابدین، زبدۃ العارفین، فرید الحق والشرع شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ ۱۱/ ماہ ذی الحجہ ۶۵۵ھ میں فرمایا کہ ہر چار مذہب برحق ہیں۔ لیکن بالیقین جاننا چاہئے کہ

مذہب امام اعظم کا سب سے فاضل تر ہے اور دوسرے مذہب ان کے پس رو ہیں اور امام ابو حنیفہؒ افضل المتقدمین ہیں اور الحمدللہ کہ ہم ان کے مذہب میں ہیں۔ (بحوالہ حدائق حنفیہ ص ۱۰۴)

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

بے شائبۂ تکلف و تعصب گفتہ، میشود کہ نورانیت ایں مذہب حنفی، بنظر کشفی در رنگ دریائے عظیم می نماید و سائر مذہب در رنگ حیاض۔ وجدال بنظر می آیند و بظاہرہم کہ ملاحظہ نمودہ می آید سواد۔ اعظم از اہل اسلام متابعان ابی حنیفہ اند علیھم الرضوان۔ وایں مذہب باوجود کثرت متابعان در اصول و فروع از سائر مذاہب متمیز است و در استنباط طریق علٰحدہ دارد وایں معنی مبنی از حقیقت است۔ عجب معاملہ است امام ابو حنیفہؒ در تقلید سنت از ہمہ پیش قدم است واحادیث مرسل را در رنگ احادیث مسند شایان متابعت میداند و بر رائے خود مقدم میدارد وہمچنیں قول صحابہ را بواسطہ شرف صحبت خیر البشر علیہ وعلیھم الصلوٰۃ والسلام بر رائے خود مقدم میدارد ودیگراں نہ چنیں اند مع ذلک مخالفان اور اصحابِ رائے میدانند والفاظ کہ مبنی از سوئے ادب اند باو منتسب می سازند باوجود آنکہ ہمہ کمال علم وفور ورع و تقویٰ او معترف اند حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ ایشاں را توفیق (ہاد کہ از رأس دیں ورئیس اسلام انکار نہ نمایند وسواد اعظم اسلام را ایذانہ کند۔ یریدون ان یطفؤ نور اللّٰہ بافواھھم جماعتہ کہ ایں اکابر دین را اصحابِ رائے میدانند اگر ایں اعتقاد دارند کہ ایشاں تاں برائے خود حکم می کردند و متابعت کتاب و سنت نمی نمودند پس سواد اعظم از اہل اسلام بزعم فاسد ایشاں ضال و مبتدع باشند بلکہ از جرگہ اہلِ اسلام بیروں بودند ایں اعتقاد نکند مگر جاہلی کہ از جہل خود بے خبر است باز ندیقی کہ مقصودش ابطال شطر دین است ناقصی چند احادیثِ چند را باد گرفتہ اند واحکام شریعت را منحصر دراں ساختہ ماورائے معلوم خود را نفی می نمایند و آنچہ نزد ایشاں ثابت نہ شدہ منتفی می سازند۔ ؎

چوں آں کرمے کہ درسنگے نہاں است
زمین و آسمانِ او ہماں است
وای ہزار وای از تعصبہائے بارد
ایشاں واز نظرہائے فاسد ایشاں

(مکتوب امام ربانی۔ ص ۱۰۷ ص ۱۰۸ ج ۲ مکتوب نمبر ۵۵ فارسی)

بلا تکلف و تعصب کہا جاسکتا ہے کہ اس مذہب حنفی کی نورانیت کشفی نظر میں دریائے عظیم کی

طرح دکھائی دیتی ہے اور دوسرے تمام مذاہب حوضوں اور نہروں کی طرح دکھائی دیتے ہیں اور ظاہر میں بھی جب ملاحظہ کیا جاتا ہے تو اہل اسلام کا سواد اعظم یعنی بہت سے لوگ امام ابو حنیفہؒ کے تابعدار ہیں۔ یہ مذہب باوجود بہت سے تابعداروں کے اصول و فروع میں تمام مذہبوں سے الگ ہے اور استنباط میں اس کا طریقہ علیحدہ ہے اور یہ معنی حقیقت کا پتہ بتاتے ہیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ امام ابو حنیفہؒ سنت کی پیروی میں سب سے آگے ہیں۔ حتی کہ احادیث مرسل کو احادیث مسند کی طرح متابعت کے لائق جانتے ہیں اور اپنی رائے پر مقدم سمجھتے ہیں۔ اور ایسے ہی صحابہؓ کے قول کو حضرت خیرالبشر علیہ الصلوۃ والتسلیمات کے شرف صحبت کے باعث اپنی رائے پر مقدم جانتے ہیں۔ دوسروں کا ایسا حال نہیں۔ پھر بھی مخالف ان کو صاحب رائے کہتے ہیں اور بہت بے ادبی کے الفاظ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ سب لوگ ان کے کمال علم و ورع و تقویٰ کا اقرار کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ ان کو توفیق دے کہ دین کے سردار اور اسلام کے رئیس سے انکار نہ کریں اور اسلام کے سواد اعظم کو ایذاء نہ دیں یریدون ان یطفئوا نور الله بافواههم یہ لوگ اللہ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ (غیر مقلدین) جو دین کے ان بزرگوں (امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ) کو صاحب رائے جانتے ہیں اگر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ بزرگوار صرف اپنی رائے پر ہی عمل کرتے تھے اور کتاب و سنت کی متابعت چھوڑ دیتے تھے تو ان کے فاسد خیال کے مطابق اسلام کا ایک سواد اعظم گمراہ اور بدعتی بلکہ گروہ اسلام سے باہر ہے اس قسم کا اعتقاد وہ بے وقوف جاہل کرتا ہے جو اپنی جہالت سے بے خبر ہے۔ یا وہ زندیق جس کا مقصود یہ ہے کہ اسلام کا نصف حصہ باطل ہو جائے ان چند ناقصوں نے احکام کو انہی پر موقوف رکھا ہے اور اپنی معلومات کے سوا سب کی نفی کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ان کے نزدیک ثابت نہیں ہوا (یعنی ان کے علم سے باہر ہے) اس کا انکار کرتے ہیں۔

بیت : وہ کیڑا جو پتھر میں پنہاں ہے وہی اس کا زمین و آسمان ہے۔
اسی قسم کے لوگ بیہودہ تعصب اور فاسد خیالوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

(ترجمہ مکتوبات امام ربانی ص ۱۷۸ ج ۲ مکتوب ۵۵)

شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سوال:۔ مقلد ایشاں را بدعتی گویند یا نہ؟

سوال:۔ مذاہب اربعہ کے مقلدین کو بدعتی کہیں گے یا نہیں؟

جواب:۔ ہرگز مقلد ایشاں را بدعتی نخواہند گفت زیرا کہ تقلید ایشاں تقلید حدیث شریف است باعتبار الظاہر والباطن پس متبع حدیث را بدعتی گفتن ضلال و موجب نکال است۔

(مأۃ مسائل ص ۹۳)

جواب:۔ مذاہب اربعہ کے مقلد کو بدعتی نہیں کہیں گے اس لئے کہ مذاہب اربعہ کی تقلید بعینہ حدیث کے ظاہر و باطن کی تقلید ہے اور متبع حدیث کو بدعتی کہنا گمراہی اور بدبختی ہے۔

(امداد المسائل ترجمہ مأۃ مسائل ص ۱۰۲)

حضرت شاہ محمد ہدایت علی نقشبندی مجددی حنفی جیپوری رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

" تقلید ائمہ شریعت اس پر واجب نہیں جو علم تفسیر فقہ و حدیث میں کامل ہو اور مرتبۂ اجتہاد و استنباط مسائل پر قادر ہو ناسخ و منسوخ و محاورۂ عرب سے واقف ہو اگر اس قدر استعداد نہیں رکھتا ہے تو تقلید ائمہ اس پر واجب ہے اور یہ سب علوم اس میں موجود ہوں اور پھر بھی ائمہ کی تقلید کرے تو احسن ہے لیکن اس وقت میں دیکھا جاتا ہے کہ علم تفسیر حدیث فقہ اصول تو کیا قرآن شریف یا حدیث شریف بلا اعراب کے صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ استنباط مسائل کی عقل اور سمجھ تو بہت بلند ہے لیکن ائمۂ شریعت کی تقلید نہیں کرتے اور تقلید کو شرک کہتے ہیں ان کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ ہندوستان میں علم تفسیر، حدیث، فقہ واصول فقہ کے پیشرو شاہ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ صاحبؒ، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، وغیرہ باوجود مخزن علوم کے سب حنفی ہیں، تو کیا زمانۂ موجودہ کے علماء علم و فہمید واقعی میں زیادہ ہیں؟ ہرگز نہیں جو ائمہ کے مقلد کو مشرک کہتے ہیں لیکن جاہلوں کو اپنا مقلد بنا لیتے ہیں اکثر لوگ جو ار دو بھی نہیں جانتے وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم اہل حدیث ہیں۔ یعنی غیر مقلد۔ ان سے اگر یہ سوال کیا جائے تم جو اپنے کو عامل بالحدیث کہتے ہو تم نے یہ مسائل قرآن و حدیث سے اخذ کئے ہیں یا کسی مولوی صاحب سے سنکر عمل کیا ہے؟ تو وہ یہی کہیں گے کہ فلاں مولوی صاحب سے سنکر عمل کیا ہے تو پھر یہ تقلید نہ ہوئی تو اور کیا ہے؟

(درلاثانی ص ۶۱ ص ۶۲ ج ۲، احسن التقویم ص ۷ ۱۳ ص ۱۳۸)

ناظرین غور کریں! مذکورہ آخری عبارت میں جن محدثین اور بزرگوں کا نام پیش کیا گیا

ہے کیا غیر مقلدوں میں ان کے ہم پلہ کوئی عالم ہے؟ حدیث کے ساتھ ان کا جو شغل تھا اور حدیث پر جس قدر گہری نظر ان کی تھی کیا غیر مقلدوں کی اتنی گہری نظر ہے؟ اس کے باوجود ان محدثین اور بزرگوں نے تقلید کی اور مذہب حنفی کو اختیار کیا۔ اب فیصلہ کیا جائے کہ لائق اتباع ان بزرگوں کا قول و عمل ہے یا غیر مقلدوں کا ؟؟

اسی طرح مندرجہ بالا صفحات میں جن علماء محققین کی عبارتیں پیش کی گئی ہیں ان پر بھی غور فرمائیں۔ اللہ پاک نے ان بزرگوں کو قرآن و حدیث کا عمیق علم عطا فرمایا تھا اور رات دن ان کا یہی مشغلہ تھا اس کے باوجود ان حضرات نے خود بھی تقلید کی اور امت کو بھی تقلید کی دعوت دی۔ یہ وہ بزرگ حضرات ہیں جو اپنے اپنے زمانہ میں علم و عمل، تقویٰ و طہارت، خوف و خشیت، احسان و اخلاص میں امام تھے، اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے اور دین متین کی خدمت کا جذبہ ان کی اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، فکر آخرت میں مستغرق تھے اور قرآن و سنت پر پوری طرح عامل، حرام کا تو کیا تصور ہو مشتبہات سے بھی بچنے کی کوشش کرتے تھے کیا ان بزرگوں کے متعلق یہ سوچا جا سکتا ہے کہ تقلید (جو بقول غیر مقلدین حرام اور کفر و شرک ہے) کر کے خود بھی زندگی بھر (معاذ اللہ) حرام اور کفر و شرک میں مبتلا رہے اور امت کو بھی پوری زندگی اس کی دعوت دیتے رہے! معاذ اللہ ثم معاذ اللہ جس کے دل میں قرآن و حدیث کی عظمت - اسلاف عظام کا احترام - اور علماء ربانی اور مشائخ کرام کی محبت ہے وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ان بزرگوں کے علاوہ مثال اور نمونہ کے طور پر محدثین عظام، علماء کبار اولیاء کرام اور مشائخ طریقت کی ایک فہرست ملاحظہ فرمائیں۔ یہ سب کے سب مقلد تھے۔ ملاحظہ فرمائیں!

امام نقدِ رجال محدث جلیل یحیی بن سعید القطانؒ (جو امام بخاریؒ کے استاذ کے استاذ ہیں) امیر المؤمنین فی الحدیث حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ (جو فن حدیث کے رکن اعظم ہیں امام بخاریؒ کے استاذ کے استاذ ہیں، اور یحییٰ بن معینؒ، امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ محدثین عظام کے استاذ ہیں) امام حدیث وکیع بن جراحؒ (جو امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور اصحاب ستہ کے کبار شیوخ میں سے ہیں۔) امام حدیث سید الحفاظ یحییٰ بن معینؒ (جو امام بخاریؒ کے استاذ ہیں) امام حدیث امام ابو یوسفؒ (جو علم حدیث میں امام احمدؒ، علی بن مدینیؒ، یحییٰ بن معینؒ وغیرہ اکابر محدثین کے استاذ ہیں اور یہ حضرات امام بخاریؒ وغیرہ محدثین کے شیوخ میں سے ہیں) یہ

اجلہ محدثین حدیث میں جلالتِ شان کے باوجود تقلید کرتے تھے اور حنفی المسلک تھے۔

امام بخاری رحمہ اللہ باوجود مجتہد ہونے کے صحیح قول کے مطابق مقلد تھے اور شافعی تھے۔ خود غیرمقلدوں کے پیشوا جناب نواب صدیق حسن خانصاحبؒ بھوپالی نے اپنی کتاب "الحطة فی ذکر صحاح الستة" میں تحریر کیا ہے کہ امام بخاریؒ کو امام ابوعاصمؒ نے جماعتِ شافعیہ میں ذکر کیا ہے۔ وقد ذکره ابوعاصمؒ فی طبقات اصحابنا الشافعية نقلاً عن السبكیؒ.

اور اسی کتاب کے ص ۱۲۷ فصل ۶ میں امام نسائی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

کان احد اعلام الدین وارکان الحدیث امام اهل عصره ومقدمهم بین اصحاب الحدیث وجرحه وتعدیله معتبر بین العلماء وکان شافعی المذهب .

امام نسائیؒ دین کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ، حدیث کے ارکانوں میں سے ایک رکن، اپنے زمانہ کے امام اور محدثین کے پیشوا تھے، ان کی جرح و تعدیل علماء کے یہاں معتبر ہے اور آپ شافعی المذہب تھے۔

امام ابوداؤد کے متعلق تحریر فرماتے ہیں: فقیل حنبلی وقیل شافعی۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ آپ حنبلی تھے اور کچھ حضرات فرماتے ہیں کہ آپ شافعی تھے۔ (الحطہ ص ۱۳۵)

ان کے علاوہ امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام بیہقیؒ، امام دارقطنیؒ، امام ابن ماجہؒ یہ سب بھی مقلد تھے اور صحیح قول کے مطابق شافعی ہیں۔

علامہ ذہبیؒ، علامہ حافظ ابن تیمیہؒ، علامہ ابن قیمؒ، علامہ ابن جوزیؒ یہ سب حضرات مقلد تھے اور حنبلی تھے۔

غور فرمائیں! بڑے بڑے ائمہ حدیث اور صحاح ستہ کے مصنفین امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ، امام ابن ماجہؒ، امام ابوداؤدؒ، جن کو خود غیرمقلدین بھی جلیل القدر محدث تسلیم کرتے ہیں۔ یہ محدثین۔ سینکڑوں اور ہزاروں نہیں لاکھوں حدیث کے حافظ تھے۔ حدیث میں اسقدر مہارت کے باوجود ائمہ کی تقلید کررہے ہیں۔ تو غیر مقلدوں کے لئے کونسی گنجائش ہے کہ وہ دائرہ تقلید سے آزاد رہیں اور تقلید کو حرام اور کفر و شرک کہیں۔

اسی طرح ہندوستان میں جس قدر مشہور محدثین، علماء محققین اور مشائخ طریقت اور اولیاء اللہ گذرے ہیں وہ سب کے سب مقلد اور تقریباً سب ہی امام ابوحنیفہؒ کے مقلد تھے، ان کی فہرست تو بہت طویل ہے ان میں سے چند مشہور علماء و مشائخ کے اسماء گرامی ملاحظہ فرمائیں!

امام ربانی شیخ سید احمد مجدد الف ثانیؒ نقشبندیؒ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، اور آپ کا پورا خاندان جنکے ذریعہ ہندوستان میں علم حدیث کا خوب پھیلاؤ اور ترویج وترقی ہوئی۔ اولیاء ہند کے سر تاج خواجہ معین الدین چشتیؒ، مرزا مظہر جان جاناںؒ، بیہقی وقت حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ صاحب تفسیر مظہری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، خواجہ باقی باللہؒ، خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ خواجہ علاء الدین صابری کلیریؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، وغیرہ وغیرہ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں فتاویٰ رحیمیہ جلد ۴ ص ۱۴۰ و ۱۴۱۔

غرض امت کے جمہور محدثین، علماء محققین، اولیاء اللہ اور عارفین تقلید پر متفق ہیں۔

بقیہ طلاق ثلاثہ

(۲۳) لیس بشیء" (کچھ نہیں) ایسے راوی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو ضعف میں دوسرے درجہ کا ہو۔ یعنی کم ضعف رکھنے والے (جیسے "لین الحدیث" سے زیادہ اس میں ضعف پایا جائے۔
(مقدمہ ابن صلاح ص ۲۴۰، مطبع دار الکتاب مصر، ۱۹۷۴ء)

(۲۴) میزان الاعتدال ۱/۳۴۶

(۲۵) تقریب التہذیب ۱۲۷/

(۲۶) ابوداؤد، باب فی الطلاق علی الھزل

(۲۷) مسلم، شرح نووی، ابواب الطلاق، باب طلاق الثلث

(۲۸) ترمذی، ابواب الطلاق، باب ماجاء في الرجل طلق امراته البتّة

(۲۹) موطاامام مالک، کتاب الطلاق ، باب ما جاء فی البتّة

(۳۰) موطاامام مالک، کتاب الطلاق، باب ما جاء فی البتّة

(۳۱) مسلم، کتاب الطلاق ، باب طلاق الثلاث

(۳۲) شرح نووی، کتاب الطلاق، باب طلاق الثلث

(۳۳) موطاامام مالک، کتاب الطلاق ، باب ما جاء في البتّة

(۳۴) ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب بقية نسخ المراجعة بعد التطليقات الثلث

(۳۵) موطاامام مالک، باب ما جاء فی البتّة

(۳۶) ابن حجر عسقلانی، فتح الباری ۹/۳۶۵ - مطبوعہ بیروت (ب س)

مصر کے ایوانوں میں شور برپا ہے میرے اسلام قبول کرلینے سے

قبول اسلام کے بعد "حلمی محمد فہمی عبدہ" کا مسیحیت پر بے لاگ تبصرہ

ترجمہ و تلخیص: مولانا محمد شہاب الدین قاسمی

العالم الاسلامی مکہ مکرمہ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۴ء

"موجودہ توریت اور انجیل محرف ہیں" یہ اس مسیحی نوجوان کا موضوع ہے جس نے اسلام اور عیسائیت کے تقابلی مطالعہ کے بعد اسلام قبول کیا ہے اور جس کی وجہ سے مصر کے عیسائی ایوان میں شور برپا ہے۔ اللہ نے اس کے قلب کو منور کیا اور فطرت سلیمہ کے راستہ پر گامزن کردیا، اسلام قبول کرنے کے بعد اس مسیحی نوجوان نے "العالم الاسلامی" مکۃ المکرمہ کو اپنے ایمانی سفر کی طویل، سنسنی خیز اور عیسائیوں کو چیلنج کرنے والی داستان پر مشتمل جو انٹرویو دیا ہے کوشش کی گئی ہے کہ اس کا اردو ترجمہ اسی کی زبان میں پیش کردیا جائے۔

سب سے پہلے مسیحی نوجوان نے اپنی بصیرت افروز گفتگو میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس وقت یہودی اور نصرانی جس توریت اور انجیل کی بات کرتے ہیں وہ محرف اور ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس کے علاوہ اسلام کی حقانیت، توریت اور انجیل میں جناب نبی کریم ﷺ کی رسالت کی بشارت، عالم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں اور یہودیوں کی مکروہ سرگرمیوں کا علمی، تحقیقی اور تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

یہ اہم موضوعات ہیں جن کو اس جرأت مند نوجوان نے اپنی گفتگو کا مرکز بنایا ہے، اگرچہ ان موضوعات پر آج سے پہلے علماء اسلام نے بہت کچھ لکھا ہے اور مخالفین کی تردید کی ہے، لیکن آج آپ اس مسیحی نوجوان سے اسلام کی حقانیت سنیں گے، جس کی نشوونما مسیحی خاندان میں ہوئی تا آں کہ اس پر اللہ نے اپنا فضل فرمایا اور اسلام کی روشنی عطا فرمائی۔

واللہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ عبادت کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں وہی زندگی عطا کرتا ہے اور اسی کے قبضے میں موت ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے، اسی کے پاس سب کو لوٹ کر جانا ہے، بے شک سب سے زیادہ سچا کلام اللہ کا کلام ہے اور بہترین طریقہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔

میں اللہ کے اس قول پر ایمان لاتا ہوں جس نے اپنے کلام پاک میں ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی معتبر ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے برحق اور آخری رسول مانتے ہوئے ان کے فرمان کی صداقت پر ایمان لاتا ہوں جس نے فرمایا کہ ہر انسان کی پیدائش فطرت اسلام پر ہوتی ہے یہودی، نصرانی اور مجوسی اس کے والدین بنادیتے ہیں۔

سیدنا ابو القاسم، میرے قلب کی روشنی، آنکھوں کی ٹھنڈک اے اللہ کے رسول میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک آپ نے اللہ کے پیغام کو امت تک پہونچادیا، امانت کو ادا کردیا اور تاریکی کو مٹادیا اور امت سے مصیبتوں کو دور کردیا اور اللہ کے راستے میں قربانیاں پیش کیں ہزاروں صلوۃ وسلام ہو آقاء مکی مدنی پر، آپ کی پاک بیویوں اور آپ کے جاں نثار ساتھیوں پر۔

پیدائش:

"حلمی محمد فہمی عبدہ" عیسائیت کی ظلمات اور تاریکیوں سے اسلام کی روشنی کی طرف کی خوبصورت اور ولولہ انگیز داستان سفر کا آغاز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ۱۹۶۰ء میں صوبہ سوہاج کے ایک دیہات "کوم" میں میری پیدائش ہوئی میرا خاندان روایتی طور پر عیسائی رسم ورواج کا پابند تھا، ۱۹۶۶ء تک میں اپنے گاؤں کے ایک عیسائی مدرسہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرتا رہا، مدرسہ اور گھر کے درمیان ایک گرجا گھر بھی تھا جس میں تمام بچے روزانہ پابندی سے جایا کرتے مگر میں ان کے ساتھ اور اکیلے کبھی گرجا گھر میں داخل نہیں ہوا چوں کہ میں نے اپنے والدین اور بہنوں کو بھی کبھی کسی گرجا گھر میں جاتے نہیں دیکھا بس روایتی طور پر ہمارا خاندان مسیحی چلا آرہا تھا۔

ابتدائی تعلیم کے دوران میں نے دیکھا کہ ہر اتوار کو چھٹی ہوتی ہے اور مدرسہ کے تمام بچے گرجا گھر جاتے ہیں اور ان لڑکوں سے ہی میں نے "بسملہ ثلاثہ" یعنی بسم الاب والابن والروح القدس سنا اور سیکھ بھی لیا جس کو ہر عیسائی کسی بھی کام کو شروع کرنے سے پہلے پڑھتا

ہے، اسکول میں ہمیں بتایا جاتا کہ ایک اللہ میں یہ تینوں داخل ہیں اور تینوں مل کر ہی ہمارا معبود ہے، اور اس نظریہ اور فلسفہ کو سمجھانے کی لیے پادری آگ اور سورج کی مثالیں دیتے کہ آگ کی طرف دیکھو اس میں (۱) آگ کے شعلے (۲) روشنی (۳) گرمی تین چیزیں موجود ہیں اور یہ تینوں ملکر آگ ہے اسی طرح سورج کی طرف دیکھو اس میں (۱) سورج ٹکیہ (۲) شعاع (۳) گرمی اور تمازت یہ تینوں ملکر ایک سورج ہے، اسی طرح اب، ابن اور روح القدس تینوں مل کر ایک اللہ ہے اور وہی ہم لوگوں کا معبود ہے۔ اعاذنا اللہ عنہ

"حلمی محمد فہمی عبدہ" کہتے ہیں کہ محض اللہ کے فضل و کرم اور اس کی مدد سے ہی اس عمر میں ان پادریوں سے سوال اور ان پر جرح کرتا کہ آگ کے اندر دھواں اور راکھ دو مزید چیزیں ہیں یہ سوال سن کر پادری میری طرف حیرت اور استعجاب کی نظروں سے دیکھتے مگر مجھے اس سلسلہ میں کبھی بھی تشفی بخش جواب نہ دے سکے۔ میں نے پادریوں کو یہ بھی تعلیم دیتے دیکھا کہ کھاتے، پیتے، سوتے جاگتے، تجارت، زراعت شادی بیاہ ہر کام کے شروع میں صلیب کا نام لیتے ہیں اور اس کو ضرور پوجتے ہیں، میں نے عیسائیوں کو ان کے نزدیک دین کی اہمیت کو اس سے زیادہ محسوس نہیں کیا جس قدر ایک کسان کو زمین اور جانوروں کی ضرورت پڑتی ہے او حقیقت یہ ہے کہ میں نے عیسائیوں کو شدید جاہلی تعصب میں مبتلا پایا۔

میں ایک متوسط عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا، اکثر میں گھر کے افراد سے سوال کرتا کہ آخر اب، ابن اور روح القدس تینوں مل کر ایک کیسے ہیں؟ آج تک مجھے اس کا تشفی بخش جواب نہیں مل سکا۔ اور میری حیرت کی انتہاء اس وقت نہ رہی جب عیسائیوں کے بنیادی عقیدے کا علم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور وہ سولی پر چڑھائے گئے ہیں اور ان کا خون صلیب پر موجود ہے جو دراصل حضرت آدم علیہ السلام کی خطا کا کفارہ ہے۔

فطری سوالات کے گھیرے میں:

"حلمی محمد فہمی عبدہ" کہتے ہیں کہ ابتدائی مدرسے میں میرے ہم سبق چند مسلمان دوست تھے، ان کو میں نے درسگاہ اور درسگاہ سے باہر مختلف اسلامی آداب میں پایا جو عیسائیوں کے یہاں میں نے کبھی نہیں دیکھا ایک روز ان ہی مسلم احباب کے ساتھ میں نے قرآن کریم کی سورۂ اخلاص سنی اور پڑھی جس نے میرے قلب و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھدیا اور قلب میں پھیل

گمراہیوں کو محسوس کیا، جب مجھے معلوم ہوا کہ معبود صرف ایک ہے اور وہ بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا بیٹا ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے تو مجھے تسلی اور تشفی ہوگئی، اس صاف وشفاف عقیدۂ توحید کو پاکر اسلام کے تئیں مزید معلومات کے لئے میں مضطرب ہو اٹھا۔

یہاں تک کہ میں نے ابتدائی درجات مکمل کرلیے اور درجۂ اعدادیہ کے لیے سوہاج کے ایک قدیم ادارے میں درخواست ڈالی دی چنانچہ ۱۹۷۳ء میں میرا داخلہ اعدادیہ میں ہوگیا، گھر سے ۱۳/ کلومیٹر دور واقع اس مدرسہ میں ہاسٹل کا انتظام تھا اور اس میں مسلمان طالب علم بھی قیام پذیر تھے، اس موقعہ کو غنیمت جانتے ہوئے میں ہاسٹل میں مقیم ہوگیا۔

یہاں آکر میں قدرے مطمئن ہوگیا تھا، اب روزانہ مسلم دوستوں سے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرتا اور عیسائیوں کے عقیدے کے بارے میں میں نے منظم مطالعہ شروع کردیا اور سب سے پہلے اپنے عیسائی ساتھیوں سے موجودہ اناجیل کے بارے میں بحث شروع کردی۔

مطالعہ کے دوران اناجیل اربعہ (انجیل متی، انجیل مرقس، انجیل لوقا، انجیل یوحنا) میں سے سب سے پہلے زیادہ حقیقت کے قریب انجیل یوحنا کو پایا مگر تحریف سے وہ بھی پاک نہیں ہے، جیسا کہ انجیل یوحنا کے مزمور ۵۶ عدد ۴ میں ہے:

"میرے ساتھ جو کچھ ہورہا ہے، وہ تمام غلط اور باطل نظریات کے ذریعہ بدل دیا گیا ہے"

انجیل یوحنا اصحاح ۲۰ عدد ۳۰ میں ہے:

"اور بہت سی نشانیاں جو حضرت عیسیٰ مسیح نے اپنے تلامذہ کے سامنے ظاہر کئے وہ اس کتاب (موجودہ انجیل) میں نہیں لکھی گئی ہیں"

اس پس منظر میں بار بار میرے ذہن ودماغ میں میں سوال ابھرتا کہ آخر کار ان حقائق کو موجودہ اناجیل کے صفحات میں کیوں نہیں لکھا گیا اس لئے موجودہ اناجیل یقیناً محرف ہیں اور اس کی نشاندہی خود انجیل اعمال الرسل اصحاح اعدد ۱۱ میں کی گئی ہے:

"اور کہا گیا اے لوگو تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ آسمان کی طرف دیکھ رہے ہو، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو آسمان کی طرف اٹھالیے گئے ہیں اسی طرح آسمان سے ایک روز تشریف لائیں گے"

یہ اسلامی نظریہ اور عقیدہ کی واضح تصدیق ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ ہی آسمان کی طرف اٹھالیا گیا ہے ان کو سولی نہیں دی گئی ہے جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔

"حلمی محمد فہمی عبدہ" کہتے ہیں کہ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۶ء تک میں درجہ اعدادیہ کا

طالب علم رہا اور اس دوران میرا قیام صوبہ سوہاج ہی میں رہا، سوہاج کے شہروں میں واقع گرجا گھروں میں کبھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا بلکہ میں نے قصداً اُدھر کا رخ نہیں کیا، البتہ اس دوران بار بار میرے ذہن میں نماز اور روزے کے بارے میں طرح طرح کے سوالات ابھرتے اور یہ اس وجہ سے تھا کہ نماز اور روزہ کی پابندی کرتے ہوئے میں نے بارہا اپنے مسلم دوستوں کو دیکھا تھا۔

عیسائیوں کے عقیدے میں دن رات میں سات نمازیں ہیں اگر چہ اکثر عیسائی صرف اتوار کے دن اور عید کے دن کی نماز پڑھتے ہیں اور اکثر تو نماز سے واقف ہی نہیں۔ نمازوں کے اوقات اس طرح ہیں (۱) صبح کی نماز (۲) تیسرے گھنٹہ کی نماز (اس میں یہ وضاحت نہیں ملتی کہ اس سے کیا مراد ہے دن یا رات؟) (۳) دن میں چھٹے گھنٹے کی نماز (۴) نویں گھنٹہ کی نماز (۵) غروب کے وقت کی نماز (۶) گیارہویں گھنٹے کی نماز، (۷) آدھی رات کی نماز، ان مذکورہ ساتوں نمازوں میں موجودہ اناجیل اور مزامیر کے الگ الگ مخصوص حصے ہیں جو نماز میں پڑھتے جاتے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر نماز کی کیفیت دوسری نماز سے مختلف ہے۔

پادریوں سے چند سوالات:

عیسائی پادریوں سے میں بار بار سوال کرتا کہ آخر کس نے ان نمازوں کو مشروع کیا ہے اور ان کی تفصیلات کس نے بتائی ہیں؟ ان کے اوقات کس نے متعین کیے؟ اور نمازوں کے مکلف۔ صرف وہی کیوں ہیں جو اناجیل اربعہ کو اچھی طرح قرأت کر سکے اور جو ناواقف ہو ان پر نماز فرض کیوں نہیں ہے؟

اور جب میں نے پوچھا کہ جو شخص نماز پڑھتا ہے اور جو نہیں پڑھتا ہے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے؟ پڑھنے والوں کے لئے ثواب اور نہ پڑھنے والوں پر عذاب ہے؟ اور کتاب مقدس میں وہ کونسی آیات ہیں جن سے ان نمازوں کا ثبوت ملتا ہو، یہ سن کر پادری حیران ہو گئے اور مجھے آج تک مطمئن نہ کر سکے۔

اسی وقت میں نے پادریوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اس کے برخلاف اسلامی نماز میں تمام تفصیلات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ہیں، سورۂ فاتحہ اور قرآن کریم کی سورتوں میں آیات کی قرأت، اللہ تعالیٰ کی تکبیر، تسبیح اور تہلیل اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پر مشتمل نماز کی پوری صفت اللہ کے آخری نبی ﷺ نے بتائی ہے۔ اس میں کسی طرح کی تحریف کی گنجائش نہیں۔

نیز اسلامی عقیدے میں نماز کی پابندی کرنے والوں کے لئے آخرت کی کامیابی، ثواب، جنت کی بشارت اور نماز ترک کرنے والوں پر اللہ کے غضب اور جہنم کی وعید سنائی گئی ہے، اسی وجہ سے اسلامی ارکان خمسہ میں دوسرا رکن نماز ہے، اسلام میں نمازی اور غیر نمازی کے درمیان واضح فرق موجود ہے، جب کہ تمہارے لئے اس کا تصور تک نہیں، تمہارے لئے صلیب کی پوجا ہی اصل عبادت ہے تو در اصل تمہارا دین وہ ہے جس پر تمہارا نفس راضی ہو۔

میری زندگی کا فیصلہ کن مرحلہ:

"حلمی محمد فہمی عبدہ" کہتے ہیں کہ ۱۹۷۷ء میرا آخری سال تھا، اور اسی سال طویل بحث و مباحثہ اور جستجو کے بعد اللہ نے میرا سینہ کھول دیا، میں اس لحہ کو یاد کرتا ہوں تو سر سجدۂ شکر کے لیے بارگاہِ رب العزت میں جھک جاتا ہے اور اللہ کے اس فرمان کو بار بار زبان دہراتی ہے:

"سو جس کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت کرے تو کھول دیتا ہے اس کے سینے کو واسطے قبول کرنے اسلام کے اور جس کو چاہتا ہے کہ گمراہ کرے کر دیتا ہے اس کے سینہ کو تنگ بے نہایت تنگ گویا وہ زور سے چڑھتا ہے آسمان پر، اسی طرح ڈالے گا اللہ عذاب کو ایمان نہ لانے والوں پر۔ (سورۃ انعام آیت ۱۲۵)

اور میں یہ نہیں بتا سکتا کہ جب میں نے اسلام کے پہلے "**اشهد ان لااله الا الله واشهد ان محمد رسول الله**" کا زبان سے اقرار کیا تو مجھے کتنی خوشی ہوئی اور کس قدر اطمینان و سکون ملا اس کلمہ کے اقرار کے بعد، کاش میں پہلے اس حقیقت سے آشنا ہو چکا ہوتا۔

مجھے اسلام میں اپنے آپ کو ڈھالنے میں دیر نہیں لگی اور میں پابندی سے فرائض کو ادا کرنے لگا مگر ابھی اسلام قبول کیے ہوئے چند ہی ماہ گذرے تھے کہ مجھ پر مصائب کا سلسلہ شروع ہو گیا، ہوا یوں کہ ایک دن ایک عیسائی طالب علم نے مجھے سوہاج شہر کی جامع مسجد القطب میں نماز ادا کرتے ہوئے دیکھ لیا اور اس کو اپنی طرف سے مزید نمک مرچ لگا کر میرے والدین اور بہنوں کو بتا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے والدین نے مسلم دوستوں سے ملاقات اور ان کے ساتھ رہنے پر پابندی لگا دی اور مجھے اپنی ایک خالہ کے یہاں سخت نگرانی میں منتقل کر دیا جو میرے لئے ایک قید خانہ سے کم نہیں تھا۔

"حلمی محمد فہمی عبدہ" کہتے ہیں کہ شدہ شدہ یہ خبر سوہاج کے بڑے پادری تک پہونچ گئی اور ایک روز زبردستی مجھے اس بڑے پادری کے پاس میرے والدین لے گئے، جب میں پادری

کے پاس پہونچا، تو مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھادیا اور سلام کیا، وہاں موجود بہت سارے عیسائی اور پادری کے خلاف توقع یہ میرا طرز تھا، اس لئے کہ عیسائیوں میں طریقہ ہے کہ جب کوئی پادری کا سامنا کرتا ہے تو اس کے سامنے فوراً جھک جاتا ہے، اس کے ہاتھوں اور چہرہ کو چومتا ہے اور کہتا ہے "نهارك سعيد يا ابونا وسيدنا المطران" اے بڑے باپ آپ کا دن مبارک گذرے، لیکن میں نے اس طرح کی کوئی غیر اسلامی حرکت نہیں کی اس لئے وہاں موجود تمام عیسائی حیران ہوگئے اور مجھے نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگے۔

بڑے پادری نے مجھ سے کیا کہا:

مجھے اپنے والدین، بہنوں اور دیگر متعصب عیسائیوں کی موجودگی میں بڑے پادری نے مخاطب کرتے ہوئے کہا اے نوجوان سچ سچ بتا تمہیں مال ودولت یا کسی اور چیز کی ضرورت ہے جن کو تمہارے والدین نے اب تک پورا نہ کیا ہو آخر تم کس چیز کے لالچ میں بددین ہوگئے؟ اور سنو! اگر آئندہ میں نے سن لیا کہ تم مسجد میں نماز پڑھنے جاتے ہو تو میں تمہیں ذبح کردونگا اور ایسی جگہ دفن کروں گا کہ کالے کوے تک کو اس کی خبر نہ مل سکے گی اور یاد رکھو بقیہ تعلیمی ایام ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۰ء تک اب تم مسلمان لڑکوں کے ساتھ نہیں گذاروگے بلکہ تم عیسائی اسٹوڈینس یونین کے تحت رہوگے، یہ کہہ کر بڑی حقارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور میری طرف سے کسی جواب کا انتظار کئے بغیر مجھے پادری روم سے جانے کی اجازت دے دی میں نے پادری کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردیا۔

"حلمی محمد فہمی عبدہ" کہتے ہیں کہ آخر پادریوں نے مجھے عیسائیوں کے ہاسٹل میں رہنے سے کیوں روکا؟ صرف اس لئے کہ میں ان کی سخت ترین نگرانی میں رہوں اور آئندہ میں نماز کے لئے باہر نہ جاسکوں، حتی کہ میرے اساتذہ (عیسائی) نے مجھ پر سخت اور کڑی نگرانی شروع کردی اور مجھے پابند کردیا کہ میں ہاسٹل میں تمام عیسائی لڑکوں کے ساتھ نویں گھنٹے کی نماز میں شریک رہوں ورنہ سخت اذیتوں کے لئے تیار ہو جاؤں شروع میں عیسائی طالب علم اگرچہ میرے احوال سے ناواقف تھے لیکن اساتذہ پر میری حقیقت حال واضح تھی یہی وجہ ہے کہ بعض اساتذہ میرے پاس تنہائی میں آتے اور کہتے اے میرے بھائی حلمی تم ہم لوگوں کے ساتھ خوش ہو، کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے؟ تمہیں روپے یا کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوئی اور تم نے ہم سے نہیں بتایا تو ہم لوگ تم سے ناراض ہو جائیں

گے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ میں نے ان لوگوں کے ساتھ اخلاق و کردار اور حسن معاملات کے ساتھ وقت گذارا اور کیوں نہیں جب کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں بہتر وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔

"حلمی محمد فہمی عبدہ" بڑے فخر اور مسرت سے کہتے ہیں کہ خدا کا فضل ہے کہ ابھی ہاسٹل میں مجھے ایک سال بھی نہیں گذرے تھے کہ میں دوبارہ سوہاج شہر کی جامع مسجد میں بغیر کسی پرواہ اور خوف کے نماز ادا کرنے چلا گیا، لیکن اتنا افسوس ہے کہ پانچوں نمازوں کے لئے مسجد نہیں جاپاتا۔ اور آخر کار وہ دن آگیا جب میں نے اپنا تعلیمی سفر پورا کرلیا اور ۱۹۸۰ء ۱۹۸۱ء میں ڈپلوما کی سند حاصل کرلی اور اس کے فوراً بعد میں نے اپنا ایڈ میشن فوج میں کروالیا، یہ کوئی دو سال کا کورس تھا، اس دوران میں الحمد اللہ نماز کی پابندی کرتا رہا اگرچہ میرے تعاقب میں فوج میں بھی دشمن موجود تھے۔

"حلمی محمد فہمی عبدہ" دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب میرے والدین اور گھر والوں نے محسوس کرلیا کہ دن بدن اسلام کے لئے میرے پاؤں جمتے جارہے ہیں تو نہایت غصہ میں ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگے۔ کاش تم ایک لڑکی ہوتے اور تمہارے ساتھ زنا کا عمل کیا جاتا یہ ہمیں قبول تھا مگر تم نے ہمارے سر کو شرم سے جھکادیا فضیحت اور عار میں مبتلا کردیا اور دنیا کے سامنے ہماری ناک کٹادی صرف اس لئے کہ تم نے اپنے آباء واجداد کے مسیحی دین کو چھوڑ کر اسلام کو قبول کرلیا۔

کاش میرے والدین اس طرح کہنے کے بجائے وہ میرے سینے میں پتھر کی چٹان رکھدیتے اور میں حضرت بلال حبشیؓ کی طرح احد احد پکارتا، اس وقت بے اختیار میرے منھ سے یہ اشعار نکل پڑے ۔

اے اللہ تیری محبت میرے خون اور ہستی میں سمائی ہے
دنیا کی بے پناہ گمراہیوں میں پڑا ہوں اور تو ہی میرا مددگار ہے
خدایا تو ہی میرا خالق ہے تو ہی میرا وکیل ہے
اے اللہ تو ہی میرے تمام امور کے لئے کافی ہے

نئی زندگی کا آغاز

یکم جنوری ۱۹۸۴ء کو میں فوج سے واپس گھر لوٹ آیا تاکہ بقیہ زندگی اسلام کے مطابق

گذاروں اور اس سفر کی تکمیل کروں جس کا میں نے آغاز کیا تھا اور فطرت کی آواز پر لبیک کہوں جو مجھے ہوش سنبھالنے کے بعد سننے کو ملی تھی، چونکہ سوہاج میں رہ کر مجھے آزادی حاصل نہیں تھی اس لئے میں نے عراق کا سفر کیا اور وہاں معمار کی حیثیت سے ایک کمپنی میں کام کرنے لگا۔ عراق میں مجھے اچھے مسلم دوست مل گئے اور مطمئن نہج پر میری زندگی گذر رہی تھی کہ اچانک میری ایک بہن کا تار آگیا کہ میں فوراً اپنے وطن سوہاج واپس لوٹ آؤں اور اپنے فوری کا تقرری نامہ حاصل کرلوں چنانچہ میں فوراً گھر آگیا اور وطن واپس آنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ صرف مجھے گھر بلانے کا بہانہ تھا۔

"حلمی محمد فہمی عبدہ" کہتے ہیں کہ میرے گھر والوں کو اب تک یقین نہیں تھا کہ میں پورے طور پر اسلام میں داخل ہو گیا ہوں، اس لئے ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ فوراً چچازاد بہن سے میری شادی کردی جائے تاکہ وہ لوگ مطمئن ہو جائیں اور میری مسیحیت پر مہر لگ جائے، لیکن افسوس صد افسوس ان کی تدبیر پر، کیا ممکن ہے کہ جس قلب نے اپنے اندر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو سمولیا ہو اور جس نے ایمان کی مٹھاس چکھ لی ہو کیا دوبارہ ضلالت کی طرف لوٹ جائے گا اگر چہ اس کو لوہے کی زنجیروں سے جکڑ دیا جائے، ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا ہرگز نہیں۔ اے اللہ تمہارے ہی لئے تعریف اور شکر ہے، میں نے اللہ کو رب مان اور اسلام کو اپنے لئے دین اور محمد رسول اللہ کو اللہ کا پیغمبر۔

مگر وہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہو گئے اور نہ معلوم یہ سب کیسے ہو گیا کہ ۱۹۸۶ء میں میری شادی چچازاد عیسائی بہن سے کردی گئی، یہ شادی صرف چار سالوں تک کے لئے برقرار رہ سکی، چار سال کی ازدواجی زندگی میں میرے دو لڑکے ہوئے اور فوراً مجھے کہا گیا دونوں لڑکوں کو لیکر گرجا گھر جاؤں اور وہاں پادریوں کے درمیان عمل تعطیس "عیسائی بنانے والا عمل" کرواؤں اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو مولود مسلمان ہو جاتا ہے۔

مجھے اس وقت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی صداقت کا احساس ہوا کہ "ہر مولود فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے، عیسائی، یہودی اور مجوسی اسکے والدین بنادیتے ہیں تو میں اس عظیم گناہ کا ارتکاب کیوں کر کرتا، مجھے معلوم تھا کہ تعطیس کا عمل سراسر کفر و شرک ہے، میں اللہ کا شکر بجالاتا ہوں کہ اب تک میں تعطیس سے محفوظ رہا ہوں کہ میری والدہ نے مجھے بتایا کہ ولادت کے بعد بھی میں اس لعنت سے محفوظ رہا و ذالك من فضل الله

"حلمی محمد فہمی عبدہ" کہتے ہیں کہ ایک عیسائی لڑکی سے شادی پر میں راضی اس لئے ہو گیا کہ اس وقت میرا شعور پختہ نہیں ہوا تھا، والدین اور کنبہ کا خوف دامنگیر تھا لیکن اب تو میں ایک آزاد اور عاقل بالغ انسان ہوں، مجھے پورا حق ہے کہ حق کا بانگِ دہل اعلان کردوں اور دل کی گہرائیوں میں موجزن جذبات کا اظہار کردوں اور لوگوں کے سامنے اقرار و اعلان کردوں کہ میں اس دین و مذہب سے بری ہوں جو اسلام کے خلاف ہے۔

میں نے پادری سے چیلنج کیا کہ تم تو کہتے ہو کہ جس نے عمل تغطیس نہیں کیا وہ جنت میں نہیں جائے گا تو تم حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، یعقوب اور موسیٰ علیہم السلام اور تمام انبیاء کرامؑ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ کیا جنت میں ہیں یا جہنم میں؟ اور یقیناً تمہارا عقیدہ ہے کہ وہ جنت میں ہیں تو آخر بغیر عمل تغطیس کے جنت میں کیسے داخل ہو گئے؟ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟

اسلام کا باضابطہ اعلان:

۲۰/۹/۱۹۹۰ء کو شہر ناصر سوہاج کے مکتبۃ التوثیق میں میں نے اسلام کے تئیں دیرینہ جذبات کا اظہار ایک مجمع عام میں کر دیا، اس وقت میں نے نہ کوئی خوف محسوس کیا اور نہ تردد، وقتی مصلحت یا کسی دنیوی غرض اور کسی کے دباؤ میں آکر میں نے اسلام قبول نہیں کیا بلکہ میں اپنی فطرت و ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اللہ کی رضا اور اپنی آخرت کو سنوارنے اور اہل و عیال اور خاندانی کی ہدایت کے لئے دعا کرتے ہوئے زمرۂ اسلام میں داخل ہوا اور اس کے لئے میں نے ہر اپنی محبوب چیز کو چھوڑ دیا۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ کو بندے سے یہی مطلوب ہے اور اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہو گی تو یقیناً اس کو اللہ اور اس کے رسول ملیں گے۔ اور اگر کسی نے کسی دنیوی غرض یا کسی عورت سے نکاح کے ارادے سے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہو گی۔

"حلمی محمد فہمی عبدہ" کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والدین، بیوی اور بچوں کو چھوڑ دیا اگرچہ میری خواہش اور تمنا تھی کہ بیوی اور بچے میرے ساتھ رہیں تا کہ اللہ انہیں بھی ہدایت نصیب فرمائے مگر میری بیوی نے خود مجھ سے جدائی اختیار کر لی اس لئے کہ عیسائیوں نے میرے بارے میں اخباروں کے ذریعہ یہ خبر پھیلا دی تھی کہ میں نے اسلام دس ہزار پونڈ اور ایک مکان کے بدلے قبول کیا ہے۔

میں ان لوگوں سے سوال کرتا ہوں کہ میرے اسلام قبول کر لینے سے اسلام کو کیا فائدہ

ملا؟ اور کیا اس کی وجہ سے اسلام میں فرد کی زیادتی ہوگئی، کیا میں دنیا میں پہلا فرد ہوں جس نے اسلام قبول کیا ہو یہی نہیں میرے اسلام قبول کرنے کی خبر پورے شہر میں پھیلنے کے دس دن بعد ہی میرے پاس میرے والدین اور بہن، بیوی اور بڑا لڑکا آیا اور سب نے بیک زبان یہ کہا کہ تم اپنی مرضی سے یہ لکھ کر ہمیں دو کہ میں پاگل ہو گیا ہوں اور اس کی ایک سند بنالوں، العیاذ باللہ، آخر یہ کیوں نہیں سوچتے کہ روشنی کے بعد کسی کو ضلالت پسند ہے؟ اللہ سے دعا ہے کہ حالت ایمانی ہی میں دنیا سے لے جائے اور آخرت میں صالحین اور مومنین کی زمرے میں جگہ نصیب فرمائے، آمین۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ بچوں سے جدائیگی کے چھ ماہ بعد ۱۰/۳/۱۹۹۱ء کو میں نے عدالت سے درخواست کی کہ کم از کم میرے بچے ہمارے حوالہ کردئے جائیں اس سے پہلے کہ عیسائیت کی مسموم فضاؤں میں ان کی نشو و نما اور ان کے عقیدے کے اندر فساد آئے میرے پاس آجائیں، چنانچہ عدالت نے میری درخواست منظور کر لی اور بچوں کو میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔

اس وقت میرے بڑے لڑکے کی عمر ۳/ سال اور چھوٹے لڑکے کی عمر چودہ ماہ ہے، مجھے یقین تھا کہ بچوں کے ساتھ بیوی بھی ضرور میرے ساتھ آجائے گی اور ایک نہ ایک دن اسلام کی لئے نرم بھی ہو جائے گی لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان دونوں بچوں کے لئے بھی اس کی ممتا نہ جاگی اور کسی حال میں بھی میرے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہوئی، یہ درحقیقت اسلام کے خلاف عیسائیت کی دشمنی کی ایک بدترین مثال ہے کہ اس نے ممتا کے مقابلے میں اسلام دشمنی کو ترجیح دی جب کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔

"حلمی محمد فہمی عبدہ" کہتے ہیں کہ ابھی میں بچوں کی پرورش اور تربیت کے بارے میں فکر مند ہی تھا کہ اللہ نے میری زندگی میں ایک مسلمان دیندار عورت کو شریک حیات بنا کر داخل کر دیا اور زندگی کے مصائب کے سامنا کے لئے ایک بہترین ساتھی دیدیا۔ وہ بچوں کو الفت و محبت اور ممتا کے علاوہ اسلامی اخلاق و کردار سے مزین کر رہی ہے، بے شک اللہ نے میری سابقہ بیوی سے بہتر بیوی، رضاعی بہنوں سے بہتر بہنیں اور جس ماں نے مجھے دودھ پلایا ہے ان سے مشفق ماں اور والدین کے گھر سے زیادہ پرسکون اور اچھا گھر مجھے عطا فرمایا اسکے لیے پروردگار کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ **فللہ الحمد والشکر**

تیسری قسط

مولوی محمد یوسف رامپوری رفیق شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

تحریک استشراق انیسویں صدی میں

انیسویں صدی میں جو نئی بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ اس صدی میں اسلام کے ساتھ رواداری کا معاملہ پہلی صدیوں کی بنسبت زیادہ کیا گیا۔ اس صدی میں بعض مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام کو انصاف کی نظر سے دیکھنے کا مطالبہ کیا تاہم اس طرح کا رجحان نصف صدی کے بعد ہی سامنے آیا ورنہ تو اس صدی کے نصف اول پر اٹھارہویں صدی کا ہی اثر رہا۔ اسلام دشمنی کے تمام سابقہ طریقوں کو اس صدی کے شروط میں زیر عمل لایا جاتا رہا۔ جیسا کہ ایڈوارڈ نے ایک کتاب ترکی کی تاریخ پر لکھی جو ۱۸۲۹ء میں شائع ہوئی مؤلف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حسب سابق نبی کاذب کہا اس نصف صدی میں اسلام دشمنی کیلئے نثری ادب کے طرح نظم کو بھی استعمال کیا گیا۔ نظم کی صف میں جرمن کے شہرۂ آفاق شاعر "گیٹے" کا نام منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ اس نے ۱۷۷۳ء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ترانہ لکھا جسمیں چند اچھے کلمات آپ ﷺ کے بارے میں کہے مگر چونکہ اس کے دل میں کھوٹ تھی اس لئے اس نے بعد میں نقد کرتے ہوئے کہا کہ محمد ابتداء میں مخلص تھے بعد میں مادیت اور بوالہوس کا شکار ہوگئے۔ گویا کہ یہ اسلام اور پیغمبر اسلام پر نقد کا ایک نیا طریقہ تھا کہ پہلے کچھ اچھے کلمات کا اظہار کردیا جائے تاکہ مصنف کی رواداری، حق پرستی ثابت ہوجائے اور قارئین اسے غیر متعصب مصنف تسلیم کرلیں اس کے بعد محتاط الفاظ میں اپنے گھناؤنے مقصد کے مطابق تنقید کردی جائے کہنا چاہئے کہ استشراقی اسکالروں کو اسلام دشمنی کا

ایک نیا انداز ہاتھ آگیا جو گذشتہ تقریباً تمام طریقوں اور تدبیروں سے زیادہ مؤثر ثابت ہوا یہی وجہ ہے کہ آج تک مستشرقین اسی طریقہ کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ غرض انیسویں صدی کے نصف تک اسلام کے تئیں مستشرقین کے رویہ میں کوئی خاص تبدیلی رونما ہوئی البتہ آخری نصف صدی میں کچھ مستشرقین نے اسلام کے ساتھ رواداری کا مطالبہ کیا اور کسی حدتک اس پر عمل کرنے کی کوشش بھی کی۔ رواداری کا سب سے زیادہ کوشاں "کارلائل" ہے جو ایک قابل مستشرق ہے اسکی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پوری ایک صدی اس کے وجود میں تحلیل ہوتے دکھائی دیتی ہے۔ کارلائل (۱۷۹۵ سے ۱۸۸۱ تک) نے انصاف پسندی کی تحریک چلائی مگر اسکی یہ تحریک اسلام کیلئے اچھے جذبات کے پیشِ نظر نہیں تھی۔ چونکہ وہ اسلام کے سلسلہ میں مخلص نہیں تھا۔ وہ تو انصاف کا مطالبہ فقط اس لئے کررہا تھا کہ اب زمانہ بدل چکا تھا، پرانی باتیں اور اصول اسکے نزدیک فرسودہ ہوگئے تھے اس لئے سابقہ تمام اصولی اور پرکھنے یا نقد کے تمام انداز بھی اس کے یہاں بوسیدہ ہوگئے تھے۔ اس کا یہ خیال تھا کہ یہ زمانہ روشن زمانہ ہے اس لئے کسی بھی شے پر نگاہ دوڑانے کے لئے روشن نگاہ کی ضرورت ہے اور ہر شے کو حقیقت وانصاف کی نظر سے دیکھنا ہی روشن نگاہی ہے اور اگر انیسویں صدی میں بھی (جو ترقی اور روشنی کی صدی ہے) یہی سابقہ اصولوں اور جاہلانہ طرزوں پر ہی ہر شے کو دیکھا جائیگا تو پھر اس صدی کو روشن صدی کا نام کیسے دیا جاسکتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اب تک اسلام کیساتھ یہودیوں اور عیسائیوں کا رویہ معاندانہ وجاہلانہ ہی رہا ہے بلکہ کبھی کبھی تو مضحکانہ ہو جاتا ہے جو عقل وقیاس کے برعکس ہے اور عقل وقیاس سے ماوراء ہوکر وہ تمام باتیں جنکی بنیاد ذاتی عناد، خرافات اور تراشے ہوئے افسانوں پر ہو وہ عصر حاضر میں قطعاً مناسب نہیں اس لئے اس نے زمانہ کی تبدیلی کا لحاظ کرتے ہوئے "انصاف پسندی" کی تحریک چلائی دوسری بات یہ بھی تھی کہ کارلائل سوچ رہا تھا کہ یہودیت اور عیسائیت کو اب اسلام سے کوئی خطرہ نہیں ہے، اب یہودی وعیسائی ایمان نہیں لائیں گے اس لئے کیا ضروری ہے کہ اسلام کو برا بھلا کہہ کر اپنا شمار متعصبین میں کرایا جائے کارلائل نے اسلام کی تعریف کی ہے۔ اس نے کہا ہے:

"اسلام اور محمد کے خلاف افتراء اور کذب کا جو پلندہ یورپ میں جمع کیا گیا ہے۔ وہ ہم عیسائیوں کیلئے باعثِ شرم ہے۔ یہ باتیں کہ محمد کاذب تھے یا مذہب اسلام مجموعۂ خرافات ہے اس روشن دور میں قابلِ قبول نہیں ہیں۔ محمد ﷺ کی تعلیم ۱۸۰ ملین انسانوں کی زندگی کا

مشعل ہے بارہ صدیوں سے اسلام کی انسانی ارواح اسلام کی گرفت میں ہیں کیا یہ سب کذب اور جھوٹ ہے؟ یہ نظریات خرافات کا مجموعہ ہیں"

لیکن اس کے یہ تحسینی کلمات فقط روشن زمانہ کے لحاظ کیلئے ہیں ورنہ تو اس کے خیالات مذہبِ اسلام کے متعلق اتنے روشن نہیں ہیں ایک مسلم مقالہ نگار نے اس کے خیالات کا تجزیہ کیا ہے اور نچوڑ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "ان خوبصورت تعریفی کلمات کے باوجود کارلائل نے آنحضرت ﷺ کی شخصیت کو ایک نبی برحق کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اس نے آپ کو ایک تاریخ کی عظیم شخصیت کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ مگر پھر اس کارلائل کے دیگر کلمات پڑھ کر قاری ششدر رہ جاتا ہے جب وہ آنحضرت ﷺ کو جنگلی اور بادیہ نشین کہتا ہے، غیر مہذب، حیوانی اور وحشیانہ آغوشِ فطرت کا پروردہ قرار دیتا ہے"

(اسلام اور مستشرقین از پروفیسر سید حبیب الحق ندوی ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ)

کارلائل کے اس روادارانہ قدم کی اگرچہ عمومی طور پر مخالفت ہوئی تاہم دیگر کئی مستشرقین نے اس کی موافقت بھی کی۔

علاوہ ازیں انیسویں صدی میں "تحریکِ استشراق" کے تحت کچھ دیگر کام بھی ہوئے عربی مصادر جیسے ابن ہشام کی سیرت، واقدی، ابن سعد اور طبری وغیرہ کی تالیفات کو یورپ میں رائج کیا گیا صدیوں سے جو کتابیں دھول میں اٹی پڑی تھیں انکو صاف کیا گیا، کتب خانوں کی چھان بین کی گئی اور اہم اہم کتابوں اور خطوط کو نکالا گیا، اور انکو شائع کیا گیا یہاں تک کہ یہ مخطوطات یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی منتقل کیے گئے، اس طرح تاریخ اسلام کے ان ماخذوں سے استفادہ کی صورت بہم پہنچائی گئی اور انہیں بنیادوں پر نئی نئی کتابیں ظہور میں آنے لگیں، مستشرقین کی رسائی عربی کے اصل مصادر تک ہو گئی یہ انیسویں صدی کا امتیاز ہے۔ ورنہ تو اس سے پہلے استشراقی اسکالرز دھول میں لٹھ مار رہے تھے اور فقط ذہنی خرافات کا اظہار کر رہے تھے، انیسویں صدی میں اصل مصادر تک رسائی، پرانی پرانی کتابوں سے استفادہ، دوسری زبانوں میں ترجمہ اور کسی حد تک ذہنی وسعت، دراصل "تحریک استشراق" کی ترقی ہے۔ گویا کہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ تحریک جو ابتدائے اسلام سے ہی بتدریج ترقی کر رہی تھی اور ہر نئی صدی میں اس کی بنیاد مضبوط ہوتی جارہی تھی، اس نے انیسویں صدی میں بھی ترقی کی اور اپنے آپ کو مضبوط کیا۔

مجموعی اعتبار سے یہ صدی بھی اسلام دشمنی کی صدی تھی اس صدی میں بھی استشراقی تحریک نے اپنے مقصد (اسلام دشمنی) میں کوئی تبدیلی نہیں کی، ہاں اس صدی میں اسلام اور پیغمبر اسلام پر تنقید کے کچھ اصول تبدیل ہوگئے۔ اب تعریف کے بعد برا بھلا کہا جانے لگا۔ اوصاف گناتے ہوئے خود تراشیدہ برائیوں کو بھی منظر عام پر لایا گیا۔ یہ رویہ وانداز بھی کچھ مستشرقین نے اختیار کیا ورنہ تو بیشتر استشراقی اسکالرز اب بھی ایسے تھے جنہوں نے اسلام دشمنی کے لئے کھلے الفاظ کا استعمال کیا۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ جو مستشرقین اپنے آپ کو روادار کہتے تھے وہ بھی قدیم مکتبِ فکر سے خلاصی نہ پا سکے مثلاً گستاو ویل (GUSTAW.WEIL) نے آنحضرت ﷺ کی زندگی اور تعلیم پر ایک کتاب (MOHAMMAD DER PROPHET SIEN LEBN AND SCINELEHRE) تصنیف کی۔ اس نے اس میں اگر چہ پیغمبر اسلام کے ساتھ رواداری وہمدردی کا معاملہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے پرانے موقف سے آزاد نہ ہوسکا اور اس نے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ "اسلام عیسائی الاصل یا یہودی الاصل ہے"۔ اس طرح کے اور بہت سے واقعات بھی انیسویں صدی میں رونما ہوئے بلکہ مستشرقین اس صدی میں تحقیق وریسرچ کے بعد پھر اپنے اس قدیم اور اصل موقف پر پہنچ گئے جہاں سے وہ شروع ہوئے تھے یعنی انہوں نے بالآخر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اسلام اور محمد ﷺ کی دعوت یہودیت اور عیسائیت کی مسخ شدہ ایک صورت ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے یہ خیالات پرانے تھے ان میں کوئی نیا پن نہ تھا۔ غرض اس صدی کی لکھی ہوئی بہت سی کتابیں ازمنۂ وسطی یا لاطینی خرافات سے کم نہیں تھیں۔

"تحریک استشراق" بیسویں صدی میں

بیسویں صدی عیسوی دراصل ترقی کی ایک صدی تھی اس میں پرانے اصول تیزی سے بدلنے لگے تھے، سوچنے کے انداز میں تبدیلی آگئی تھی، پرانی قدروں اور روایتوں کو فرسودہ خیال کیا جانے لگا تھا، ہر اہم شے کے سلسلہ میں نئی نئی تحقیقات ہونے لگی تھیں، اس صدی کے لوگ ترقی کی فصیلوں پر کمندیں پھینکنے کی کوشش میں مصروف تھے، پوری دنیا کو نئی حالت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر چہ ان کی یہ کوششیں انیسویں صدی کے آخر میں ہی شروع ہوگئی تھیں۔ تاہم وہ تمام کوششیں برق رفتاری کے ساتھ اب بیسویں صدی میں پوری ہو رہی

تھیں۔ لیکن اس تبدیلی کا زیادہ اثر مغرب میں ہی تھا، بیشتر مشرقی علاقے اب بھی جمود کا شکار تھے۔ جیسے جیسے یورپ کے حالات میں تغیر آتا گیا ویسے ویسے یورپ کے محققین ومفکرین کی تحقیق وفکر میں بھی نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی۔ یورپ کے وہ اسکالر جو اسلام کے بارے میں لکھتے اور مطالبہ کرتے تھے، وہ بھی اس تبدیلی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ پہلے ان کی تمام کاوشوں اور تحقیقوں کا موضوع براہ راست ذاتِ نبویؐ تھی۔ وہ ہر ممکن طور پر نبی کو نبی کاذب ٹھہرانے پر مصر تھے، سیدھے آپ کی نبوت ورسالت میں شکوک وشبہات کے دروازے کھولنے کے لئے کوشاں تھے اسی لئے پیغمبر اسلام پر طرح طرح کے الزامات لگائے اور نئے نئے افسانے تراشتے، کبھی آپ کو مجنون، کبھی دیوانہ، کبھی حریص، کبھی پادری، کبھی مرگی کا مریض، کبھی عیسائیت میں تفریق کے مرتکب، کبھی جھوٹا اور کبھی جادوگر کہتے تھے۔ مگر اب بیسویں صدی میں انہوں نے تھوڑی سی کروٹ بدلی اور برائے نام ترمیم کے ساتھ اپنی توجہ قرآن وحدیث کو بے حقیقت ثابت کرنے پر مرکوز کردی، اب براہ راست ذاتِ محمد ﷺ پر افسانے کے بجائے قرآن کے سلسلہ میں افسانے گھڑے جانے لگے، اور احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت میں شبہات پیدا کرنے لگے۔ اس لئے کہ اب وہ یہ راز جان گئے تھے کہ قرآن اسلام کی بنیادی کتاب ہے۔ اسلام کی بقاء اسی کتاب پر منحصر ہے۔ اگر اس کتاب کے اندر ترمیم ہوجائے تو اسلام ہی تبدیل ہوجائیگا، اگر اس کتاب کو کلامِ ربانی کے بجائے کلامِ انسانی ثابت کردیا جائے تو مذہبِ اسلام کی ساری عمارت دفعتاً پارہ پارہ ہوجائیگی۔ اور جب تک یہ کتاب محفوظ رہیگی۔ اس وقت تک اسلام کے خاتمہ کا تصور ناممکن ہے۔ قرآن کے بعد دوسری اہم چیز اسلام میں ذخیرۂ حدیث ہے جو درحقیقت قرآن کریم کی تفسیر ہے۔ جس کے بغیر نہ قرآن کا سمجھنا آسان ہے۔ نہ اسلام پر چلنا آسان ہے۔ جب وہ یہ اچھی طرح سے جان گئے تو انہوں نے اپنا سارا نزلہ قرآن اور احادیثِ نبوی ﷺ پر اتارنا شروع کردیا۔ تاکہ بالواسطہ یہ حملہ پیغمبر اسلام پر ہو۔ گویا کہ اس صدی میں قدیم مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے نئے اسالیب کو اختیار کیا گیا اور یہ خصوصیت فقط بیسویں صدی کے ساتھ خاص ہے۔

تالدیکے نقدِ حدیث کے اسکول کا سرخیل ہے، مگر انکارِ حدیث کی بنیاد گولڈ زیہر (GOLD ZIHER) نے ڈالی۔ اس نے یہ سوال قائم کیا کہ کیا سیرت نگاری کے لئے احادیث پر بھروسہ

کیا جاسکتا ہے ؟۔ یہ سوال اٹھا کر بالفاظِ دیگر اس سوال کو بنیاد بنا کر گولڈ زیہر نے احادیث پر شکوک وشبہات کے انبار لگادیئے اور احادیث کے غیر ثقہ ہونے پر سارا زور صرف کردیا۔ مذکورہ مستشرق نے بہت سی حدیثوں کا سرے سے ہی انکار کردیا اور بہت ساری احادیث پر تنقید کرکے انہیں غیر معتبر ٹھہرا لیا۔ اس نے اسناد کو بھی غیر معتبر قرار دیا اور پھر سلسلۂ اسناد پر اعتبار نہ کرتے ہوئے کہ دیا کہ یہ مصادر ثقاہت کی ضمانت نہیں دیتے۔ دوسرا استشرق جس نے گولڈ زیہر کی پیروی کی ہنری لامینس (HENRILAMMENNS) تھا جس نے ہجرت سے قبل کی تمام تاریخِ محمدؐ کو بے بنیاد اور غیر معتبر قرار دیا۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہجرت سے قبل کی جو تاریخ حضور کے بارے میں ملتی ہے۔ وہ فقط گھڑے ہوئے دلچسپ افسانے ہیں، ان کا حقیقت سے کوئی رشتہ نہیں۔ ہنری لامینس کے علاوہ بھی تحریک استشراق کے دیگر اسکالرز نے اس طرح کی بحثیں چھیڑیں۔ اس سے انہیں یہ فائدہ ہوا کہ ان کی باتوں پر زیادہ توجہ دی جانے لگی اور انہیں اسلام یا پیغمبر اسلام کا کھلا ہوا دشمن خیال نہیں کیا جانے لگا۔ کیونکہ دیکھنے میں ایسا لگتا تھا جیسے کہ وہ اسلام یا پیغمبر اسلام سے تو کوئی ذاتی بغض نہ رکھتے ہوں البتہ روشن زمانہ میں تاریخی حقائق کی وضاحت یا تحقیقی و تاریخی اصولوں سے کام لے رہے ہوں ۔ حالانکہ ان کا اصلی نشانہ اب بھی اسلام اور پیغمبر اسلام کی ذات تھی۔

چونکہ یورپ میں زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ اسکالرشپ میں دو مکتبِ فکر ہوگئے تھے ایک تو وہ جو اوپر بیان کیا گیا دوسرا کمیونسٹ مکتبِ فکر تھا۔ جس کے سایہ میں مارکسی کی معاشی تحریک نے جو طوفان مچایا اس نے دور تک اپنا اثر قائم کیا۔ یہاں تک کہ یورپ کی اسکالرشپ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ لہٰذا اس اسکالرشپ نے پوری دنیا کو معاشیات و سماجیات کے آئینہ میں دیکھنا شروع کردیا۔ معاشی و سماجی تحریک کے ایک سرگرم کارکن مارگولیوتھ (۱۸۵۸ء سے ۱۹۴۰ء) کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس نے آنحضرت ﷺ کی دینی و مذہبی حیثیت کو ختم کرکے ایک سیاسی قائد ثابت کیا۔ اس نے آپ کے اس کمال کی خوب تعریف کی کہ آپ نے ایک ادنیٰ سے ادنیٰ فرد ہونے کے باوجود فقط ۲۳/سال میں ایک سلطنت قائم کرلی مذکورہ مستشرق نے ان تحسینی کلمات کے ساتھ آنحضرت کو قزاق اور ڈاکو بھی کہا (العیاذ باللہ)۔ عقل کا دشمن آنحضرت ﷺ کو ایک قانون داں، جج یا ڈپلومیٹ سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہیں۔ اٹلی کا مشہور مستشرق سیلون کیتانی (۱۸۷۷ تا ۱۹۳۴) بھی اسی خیال

کا ہمنوا تھا اور اس نے بھی آپ کو سیاسی قائد ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کے زور لگادیے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کو معاشیات و سماجیات کی کسوٹی پر پرکھنا اس صدی کی خاص چیز ہے۔

علاوہ ازیں اسلام کو علم النفس کے آئینہ میں بھی اسی صدی میں دیکھا گیا۔ کیونکہ اس صدی میں علم النفس پر زور دیا گیا۔ خاص کر یورپ میں نفسیات سیکھنے کا شوق بڑھا اسی علم کو ہر شے کی کسوٹی قرار دیا۔ اسی کے مطابق مختلف امور کی انجام دہی ہونے لگی۔ ظاہر ہے کہ جو علم یورپ میں تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا اس سے یورپ کی اسکالرشپ کس طرح بے خبر رہ سکتی تھی اس لئے فطری طور پر وہ اس سے متاثر ہوگئے۔ انہوں نے بھی اس علم میں کمال حاصل کیا اور اپنی تحقیق و جستجو میں اسے مرکزی اہمیت دی۔ اسی کے آئینہ میں انہوں نے تمام تحریکات و مذاہب کو دیکھنا شروع کیا اس لئے انہوں نے دینیات کا خالص نفسیاتی مطالعہ کیا۔ دینی تحریکات و عوامل کا امتحان اب خالصتاً نفسیاتی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے لیا جانے لگا۔ چنانچہ انہوں نے نفسیاتی اصول کے مطابق اسلام کے ظہور کا جائزہ لیا، تحریکِ اسلام کو دیکھنا اور رسول اللہ کی شخصیت کو انہیں اصول کے تحت سمجھنے کی یا تنقید کرنے کی کوشش کی۔ اس تحریک کے بانی فرانز بھل (DANE FRANZ BUHL) اور طور اینڈرے (TOOR AND RAE) تھے۔ بھل نے اپنے نفسیاتی مطالعہ کی روشنی میں جو تحقیق پیش کی وہ اس طرح تھی۔

"غیر معمولی اعصابی سسٹم کی وجہ سے محمد اپنے آپ کو دھوکہ دینے یا مغالطہ میں پڑجانے کے عادی ہوگئے تھے۔ اسی دھوکہ کی وجہ سے محمد نے یقین کرلیا کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، محمد ایک نہایت مشکوک و مبہم کردار کے آدمی تھے جس کا سمجھنا مشکل ہے۔ وہ حقیقی فکر ہرگز نہیں رکھتے تھے"۔ طور اینڈرے نے بھی اپنے گہرے نفسیاتی علم کا استعمال کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ "محمدؐ نے تمام سابقہ ادیان و مذاہب کا معجونِ مرکب پیش کیا ہے" یعنی محمدؐ نے اسلام کی بنیاد یہودیوں اور عیسائیوں کے زیر اثر ڈالی۔ اگرچہ نفسیاتی علوم سے بحث کرکے نتیجہ اخذ کرنے والوں کے مقاصد بھی وہی تھے جو کہ ابتداً سے ہی یہود و نصاریٰ بالفاظ دیگر مستشرقین اول کے تھے تاہم انہوں نے اتنی ہوشیاری سے کام لیا کہ اپنی بحث کے نتائج علم النفس سے اخذ کیے اور کھینچ تان کر اسے اپنے مقصد میں ڈھالا تاکہ جدید دنیا علم النفس کے نام سے ہی سراسیمہ ہوجائے اور ان کی الٹی سیدھی تحقیقات کی قائل ہوجائے۔ یہ خصوصیت بھی بیسویں صدی کے حصہ میں آئی۔

حیرت اس بات پر ہے کہ موجودہ صدی میں جس کے اندر پرانے اصول، پرانے نظریات، پرانی فکر کوئی معنیٰ نہیں رکھتے) مستشرقین کی وہی پرانی سوچ رہی، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ آج بھی اسلام اور پیغمبر اسلام کو اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جس طرح کہ گذشتہ ادوار میں دیکھا جاتا تھا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اب بھی تازہ ترین افسانے تراشے جاتے ہیں۔ نئی نئی تحقیقات اور نئے نئے اصول وضع کرکے اسلام کو آج بھی برا بھلا کہا جاتا ہے۔ اس روشن صدی میں خاص طور سے بحثوں کے نتائج کو کھینچ تان کر اسلام دشمنی تک لے جایا جاتا ہے۔ حالانکہ موجودہ دور میں مستشرقین کو اپنی عزت اور دعووں کا پاس کرتے ہوئے نرمی اور رواداری سے کام لینا چاہئے تھا، انصاف کرنا چاہئے تھا مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ جوں جوں زمانہ بڑھتا گیا ان کی دشمنی وعصبیت میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ وہ چودہ سو سال گذرنے کے بعد بھی اسلام اور پیغمبر اسلام کے دشمن ہی رہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک حیرت انگیز بات یہ پیش آئی کہ اب یورپ میں باضابطہ اسلامی اسکالرس وجود میں آگئے جنہوں نے دیگر موضوعات سے قطع نظر صرف اسلام کو اپنا موضوع منتخب کیا اور اسی پر اپنی تمام تر توجہات مبذول کرنے لگے۔ اس نصف صدی میں تصنیفات وتالیفات کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہوگیا، اسلام کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھی جانے لگیں۔ اسلام کی تہذیب، اسلام کی تمدنی حالت، اسکے نظامِ زندگی، اسکی سماجی ومعاشرتی حالت وغیرہ کو زیرِ قلم لایا جانے لگا۔ تصنیفی سلسلہ اتنا طویل ہوگیا کہ یکے بعد دیگرے کتابیں مستشرقین کے قلم سے منظرِ عام پر آنے لگیں۔ جس کو ایک مقالہ نگار نے یوں بیان کیا ہے۔ ''اب بڑے بڑے مطابع اور اشاعتی ادارے ہر چھ ماہ کے بعد مستشرقین کے دروازوں پر دستک دینے لگے کہ آیا اسلام کے متعلق (کے خلاف) کوئی تازہ ترین تالیف برائے اشاعت تیار ہے؟'' پبلشروں کی مستشرقین کے دروازوں پر دستک اور ہر چھ ماہ کے بعد ایک نئی تالیف کا مطالبہ یہ باور کراتا ہے کہ استشراقی تحریک جو ۱۴/سو سال سے سرگرم تھی اب کامیابی اس کے قدم چوم رہی ہے کیونکہ اب اس کی مقبولیت میں حیرت انگیز اضافہ ہو رہا تھا۔ مغرب کے عوام اب اسلام کے متعلق استشراقی اسکالروں کے لٹریچر کو دلچسپ اور قابلِ اعتماد سمجھنے لگے تھے اسی وجہ سے منظرِ عام پر آتے ہی کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتی تھی عوام میں بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اداروں (مطبعوں) کی جانب سے ملتی ہوئی

سہولیات کے باعث مستشرقین کی ہمت افزائی ہوئی، ان کا حوصلہ بڑھا جس کے نتیجہ میں انہوں نے اسلام کے متعلق لٹریچر کا انبار لگادیا۔ ان میں سے کچھ کتابیں ایسی بھی مستشرقین کے قلم سے نکلیں جو انفرادی اہمیت کی حامل ہیں لیکن ایسے مصنفین کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے، ورنہ تو زیادہ تر مصنفین اور استشراقی لٹریچر اسلام کی مخالفت ہی میں ہیں اور ایسے بہت سے مستشرقین جو رواداری خیال کئے جاتے ہیں وہ بھی بجز چند کے اپنے دلوں میں کھوٹ رکھتے ہیں۔ چنانچہ مولانا ابوالحسن علی صاحب لکھتے ہیں:

دراصل مستشرقین کا عمومی رجحان اسلام دشمنی کی طرف رہاہے اور آج بھی ہے اس لئے وہ روادار اور انصاف پسند ہونے کا دعوی کرنے کے باوجود غیر انصاف پسندی، حسد اور رقابت کو اپنے سینوں سے نہیں نکال پاتے جس کے باعث ان کا رویہ اسلام کے تئیں معاندانہ ہی رہتا ہے مثلاً بیسویں صدی عیسوی کا عظیم ترین مستشرق سرہملٹن گب ہے جس کا نام مشرق و مغرب کے علمی حلقوں میں احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے سب اس کو اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور حقیقت میں وہ ایک لائق اور قابل شخص تھا اس کے اخلاق بھی اچھے تھے مگر اسلام کے بارے میں ایسے ذہین و باخلاق محقق کا رویہ معاندانہ ہی تھا وہ اپنی کتاب "اسلام میں جدید رجحانات" (۱۹۴۷ء) (MODERN RENDS IN ISLAM) میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ "اسلام درحقیقت محمد کے جذباتی مغلوبیت کا ایک ہیجانی دین (EMOTIONALCULT) تھا پروفیسر گب نے علامہ اقبال کو بھی مجموعہ تضاد قرار دیا ہے۔ ایک اور مستشرق جس کو روادار اور انصاف پسند کہا جاتا ہے اس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ محمد مکہ میں کچھ اور تھے اور مدینہ میں کچھ اور ہوگئے۔ حالانکہ وہ اس سے پہلے یہ تسلیم کرچکا ہے کہ آنحضرت ﷺ مخلص تھے۔ گویا کہ اس نے اس پالیسی کو اختیار کیا کہ پہلے اسلام اور پیغمبر اسلام کی بابت کچھ تحسینی کلمات کہہ دیئے جائیں تاکہ اس کی رواداری و انصاف پسندی مسلم ہوجائے اور بعد میں خاموشی کے ساتھ نشتر زنی کردی جائے۔

غرض بیسویں صدی میں بھی استشراقی تحریک اپنے پرانے موقف پر ڈٹی رہی اور اسلام کے ساتھ ناانصافی کے ساتھ پیش آتی رہی، اتنی تبدیلی ضرور ہوئی کہ اب اسلام پر نقد اور نبی کو غیر معتبر کہنے کے طریقے تبدیل ہوگئے اور اسلوب میں ایک نمایاں فرق ہوگیا۔ استشراقی اسکالروں نے اسلام پر نقد کے لئے جن جن علوم کو سامنے رکھتے ہوئے بحثیں چھیڑیں وہ بھی

نئی تھیں۔ اس لئے انہیں مزید دلچسپی محسوس ہوئی جس کی وجہ سے یہ تحریک یہودیوں اور عیسائیوں کے حلقہ سے نکل کر عالم اسلام تک پھیل گئی۔ اب اہل اسلام تاریخ اور اسلامیات کے متعلق ان سے رجوع کرنے لگے۔ ان کی کتابوں کو ماخذ تصور کرنے لگے اور ان کی تحریر کردہ کتابوں کو مسلمانوں کے قلم سے لکھی ہوئی تصنیفات کے مقابلہ میں ترجیح دینے لگے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کچھ کتابوں کے سلسلہ میں علی میاں ندوی نے لکھا ہے۔ "ان سب کتابوں کے بارے میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اپنے موضوع پر یہ منفرد کتابیں ہیں، اسلامی مشرق کی یونیورسٹیوں کے عربی زبان وادب اور اسلامیات کے شعبوں میں ان کو اہم علمی ماخذ گردانا جاتا ہے اور تالیف وتصنیف کا کام کرنے والے زیادہ تر انہیں پر اعتماد کرتے ہیں"

ایک اور مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ:

"آج مسلمانوں نے انہی یہود ونصاری کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے رسم وراہ رکھنا تو ایک طرف ان کو استاد کا درجہ دے کر اپنے دل ودماغ کی زمام کار ان کے ہاتھوں میں دے رکھی ہے، اور نوبت بایں جارسید کہ آج طبعی اور سائنسی علوم میں ہی نہیں عربی اور اسلامیات میں بھی سندِ فضیلت لینی ہوتی ہے تو وہ یورپ اور امریکہ کی ان جامعات کا رخ کرتا ہے جہاں یہ نام نہاد اسکالرز دانہ ڈال کر شکار کی گھات لگائے بیٹھے ہیں"۔

کیا اس سے بڑھ کر کامیابی کا تصور کیا جاسکتا ہے؟ استشراقی تحریک آج کامیابی کی منزل پر قابض ہے کیا اس کا کوئی انکار کرسکتا ہے؟ اس لئے مذکورہ تفصیل کی روشنی میں بغیر کسی تذبذب کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ استشراقی تحریک کے لئے موجودہ صدی دوسری سابقہ صدیوں کے بالمقابل نہ صرف زیادہ مفید ثابت ہوئی بلکہ اس صدی میں تحریکِ استشراق کو اپنی محنت کا ثمرہ بھی ملا۔

اکیسویں صدی میں استشراقی تحریک کن حالات سے گذرے گی یہ تو آنے والا وقت ہی بتائیگا تاہم مشاہدات کی روشنی میں یہ خدشہ ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ آئندہ صدی میں بھی اس کی کامیابی کے امکانات روشن ہیں کیونکہ بیسویں صدی کی کامیابی آنے والی صدی میں استشراقی تحریک کی کامیابی کی ایک تمہید ہے۔

بیسویں صدی کے اختتام پر اور اکیسویں صدی کی دہلیز پر تحریک استشراق ایک نئے موڑ

پر پہنچ چکی ہے۔ وہ کام جو بھی مغرب کے یہودی، عیسائی اسکالرز کیا کرتے تھے اب اس کام کو خود مسلمان کرنے لگے۔ ڈاکٹر شرف الدین نے ان الفاظ میں نشاندہی کی ہے۔

"استشراقی تحریک ایک نیا موڑ اختیار کر چکی ہے۔ وہ کام جو ایک صدی قبل مستشرقین کر رہے تھے اب اس کام کے لئے انہوں نے مسلمانوں میں آدمی تیار کر لیے ہیں"

ان حالات کی روشنی میں "تحریک استشراق" کی کامیابی صاف نظر آ رہی ہے۔ اور اس کے آئندہ کامیابی کے امکانات بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ کیونکہ اس کی جڑیں بہت مضبوط ہو چکی ہیں جو آسانی سے نہیں اکھاڑی جا سکتیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ اس کا نام تبدیل ہو جائے۔ لیکن اس کا مقصد وہی رہیگا جو ہر زمانہ میں رہا ہے۔

بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں ☆ اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

. . . .

کتابیات

(۱) اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

(۲) مستشرقین، استشراق اور اسلام (مقالہ) ۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی

(۳) "پروفیسر اجناس گولڈزیہر" (مقالہ) ۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی

(۴) مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی

(۵) "مستشرقین کے تصورِ اسلام کا تاریخی پس منظر" (مقالہ)۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

(٦) اسلام اور مستشرقین۔ پروفیسر سید حبیب الحق ندوی

ماہنامہ علم الفقہ کا اجراء

مولانا لکھنویؒ نے ۱۸۹۹ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد فوراً تدریسی مشاغل کے ساتھ ساتھ ایک ماہوار فقہی رسالہ "علم الفقہ" کے نام سے جاری کیا تھا جو پورے چھ سال تک پابندی کے ساتھ نکلتا رہا۔ یہ رسالہ خالص فقہی مضامین پر مشتمل تھا، روزمرہ کے مسائل فقہیہ کو ایک خاص نظام اور ترتیب کے ساتھ اردو میں مرتب کرنے کی یہ ایک پہلی کوشش تھی۔ اس سے پہلے اردو زبان میں کوئی اتنی مفصل اور مکمل فقہی کتاب موجود نہ تھی حتی کہ "بہشتی زیور" جیسی مشہور کتاب کے بعض حصے بھی اسکے بعد لکھے گئے ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے "بہشتی گوہر" کے دیباچہ میں جہاں اپنے مآخذ کا تذکرہ کیا ہے وہیں انہوں نے "علم الفقہ" کو بھی شامل کیا ہے۔ اس لحاظ سے "علم الفقہ" اردو زبان میں فقہی مسائل کی سب سے پہلی مکمل کتاب کہی جاسکتی ہے۔

ماہنامہ "علم الفقہ" میں ہر ماہ دینی مسائل کو مخصوص ترتیب کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا، جب ایک سلسلہ کے مسائل مکمل ہو جاتے تو انہیں ایک جلد قرار دیکر دوسری جلد شروع کردی جاتی تھی اس طرح آج اس کی مکمل چھ جلدیں مدون ہو کر عوام و خواص میں یکساں طور پر مقبول ہو چکی ہیں۔ جلد اول طہارت کے بیان میں ہے، جلد دوم نماز، جلد سوم روزہ، جلد چہارم زکوٰۃ، جلد پنجم حج و زیارت اور جلد ششم نکاح کے مسائل سے متعلق ہے۔ اس کے بعد آپ کا ارادہ طلاق کے مسائل پر بھی لکھنے کا تھا بلکہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے یہ

جلد بھی لکھ کر مکمل کرلی تھی مگر وہ زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی اور پھر عرصہ کے بعد اسکا مسودہ بھی نایاب ہوگیا۔

ہفت روزہ "النجم" کا آغاز

۱۳۲۲ھ میں مخالفین صحابہ کی طرف سے لکھنؤ میں فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا اور مولوی مقبول احمد شیعی (م ۱۹۲۱ء) کی شعلہ فشاں تقریریں بھی شروع ہوچکی تھیں اس کے علاوہ تقریباً پچیس شیعی اخبارات اور رسائل برصغیر کے مختلف شہروں سے نکل رہے تھے اور سب ہی کا وتیرہ تھا کہ اہل سنت کے مذہبی عقائد پر تنقید کی جائے اور صحابہ کرامؓ کی شان اقدس میں گستاخیاں کی جائیں۔ ان حالات میں حضرت لکھنویؒ نے لکھنؤ سے ۲۶/اکتوبر ۱۹۰۴ء کو "النجم" کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار کا اجراء کیا جو ضخامت کے لحاظ سے ۱۲ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ بنیادی طور پر "النجم" کا مقصد تردید شیعیت نہیں تھا مگر اہل سنت کے عقائد اور ان کے بزرگوں پر ناروا حملوں کا جواب دینا بھی اس نے ضروری سمجھا، اسطرح اس نے ایک دفاعی جنگ لڑی۔ وہ اپنی انہی خصوصیات کے ساتھ کم وبیش ۳۳ سال تک شائع ہوتا رہا مگر اس مدت میں اسکے سائز و صفحات اور وقفۂ اشاعت میں ضرور تغیر و تبدل ہوتا رہا۔ ابتداءً "النجم" ہفت روزہ تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد ماہنامہ کی حیثیت سے شائع ہونے لگا۔ ۱۹۱۱ء میں یہ ماہنامہ کے بجائے پندرہ روزہ رسالہ کی شکل میں نکلنے لگا، کچھ دنوں کے بعد پھر ماہنامہ ہوگیا۔ جنوری ۳۴ء سے ہفت روزہ اخبار کی حیثیت سے نکالا گیا۔ کثرت کار اور بعض نامساعد حالات کی بنا پر اسکی اشاعت میں تعطل بھی ہوتا رہا اسی لئے ایک زمانے میں "النجم دور جدید" کے عنوان سے بھی شائع ہوا ہے۔

۱۹۳۲ء تک النجم براہ راست حضرت لکھنویؒ کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اس مدت میں زیادہ تر انہی کی تصنیفات، تراجم کتب اور علمی مضامین شائع ہوتے تھے اور اسکا حلقۂ اشاعت بھی خواص واہل علم ہی تک محدود تھا لیکن ۱۹۳۲ء کے بعد النجم کی دیکھ بھال اور اسکی ترتیب وتسوید کی اکثر ذمہ داری آپ کے صاحبزادہ مولانا عبدالمومن صاحب فاروقیؒ (م ۱۹۶۶ء) کے سپرد ہوئی جنھوں نے اپنے جوش اور ولولے سے اسکو عوام کے ہاتھوں تک پہونچادیا۔ اور جو تحریک ابتک اہل دانش و بینش ہی کے حلقہ تک محدود تھی اس نے اب ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کرلی چنانچہ ۱۹۳۴ء سے النجم ماہوار رسالہ کے بجائے ہفت روزہ اخبار کی شکل

میں نکلنے لگا۔ اب اسمیں دوسروں کے مضامین بھی شائع ہونے لگے اور منتخب شعراء کا نعتیہ ومدحیہ کلام بھی شریکِ اشاعت ہونے لگا۔ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد تقریباً دو درجن کے قریب اسکے خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے جن میں خلافت نمبر، رسالت نمبر، عاشوراء نمبر، خاتون نمبر، شہداء نمبر، ہجرت نمبر، صحابہ نمبر، ناموس اسلام نمبر، احتجاج نمبر اور کمیشن نمبر وغیرہ بہت زیادہ مقبول ہوئے۔

حضرت لکھنویؒ کی زیادہ تر تصنیفات اور تالیفات پہلے النجم ہی کے صفحات پر شائع ہوا کرتی تھیں اور پھر اُس کے بعد اُن کو کتابی شکل میں علیحدہ سے طبع کر دیا جاتا تھا۔ النجم کا ایک خاص امتیاز یہ بھی تھا کہ مناظرانہ مضامین اور شدید اعتراضی حملوں کا جواب دیتے وقت بھی اسکاب و لہجہ اور طرز تحریر نہایت مہذب، شائستہ اور سنجیدہ ہوتا تھا اسی لئے یہ مسلمانوں کے ہر حلقہ و طبقہ میں پڑھا جاتا تھا۔

۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک النجم اسی خصوصیت کے ساتھ نکلتا رہا، اس وقت اسکی اشاعت بھی بہت بڑھ چکی تھی۔ اس زمانے کے ملکی مسائل پر بھی النجم میں اظہار رائے کیا جاتا تھا۔ النجم کی اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کو باطل کے قلوب برداشت نہیں کر سکتے تھے اسلئے ہر طرف سے اسکے چراغ ہستی کو گُل کر دینے کی تدبیریں کی جانے لگیں۔ رفض، قادیانیت، عیسائیت، رضاخانیت، آریہ سماجی تحریکات اور علامہ مشرقی کی بیلچہ بردار جماعت خاکسار سب ہی النجم کے مقابلہ میں صف آرا تھیں۔ انگریز حکومت بھی نہیں چاہتی تھی کہ مسلمان متحد ہوسکیں اور ان میں دینی بیداری پیدا ہو اسلئے وہ بھی در پردہ اِن مخالف طاقتوں کو شہ دیا کرتی تھی چنانچہ وقتاً فوقتاً النجم پر نقد ضمانت جمع کرنے کی سزا حکومت کی طرف سے عائد کر دی جاتی تھی۔ جہاں تک ہو سکا اسکو برداشت کیا گیا۔ آخر کار جولائی ۱۹۳۷ء میں حکومت کی طرف سے مبلغ پندرہ سو روپیہ کی نقد ضمانت النجم سے طلب کی گئی جسکو وقت پر جمع نہ کر سکنے کی صورت میں اسکی اشاعت ہمیشہ کیلئے بند ہو گئی۔

دار المبلغین کا قیام

ہندوستان کی سرزمین شروع ہی سے مختلف ادیان اور مذاہب کے ماننے والوں کا مامن ومسکن رہی ہے اور ہر ایک کو یہاں بڑھنے اور پھیلنے کے مواقع ملے ہیں اسی طرح اسلام کی

روشن تعلیمات بھی یہاں پہونچیں اور مسلمانوں نے انھیں یہاں کے گوشہ گوشہ میں پھیلانے میں کوئی کمی نہ چھوڑی مگراس کے ساتھ ہی ساتھ اسلام ہی کا نام لینے والے کچھ دوسرے عقائد اور نظریات رکھنے والے فرقوں نے بھی یہاں نشو ونما پائی جن میں کچھ تو باہر سے آئے تھے اور کچھ یہیں کے مقامی اثرات کی آمیزش سے پیدا ہوئے تھے۔اس قسم کے فرقے باہم مختلف ہوتے ہوئے بھی اسلام سے اپنا رشتہ جوڑے رکھنے کے لئے مجبور تھے لہذا یہ ضروری تھا کہ صحیح اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ اُن فرقوں کے عقائد وخیالات کا بھی مطالعہ اپنے نوجوانوں کو کرایا جائے تاکہ وہ ان کے غیر اسلامی نظریات سے واقف ہو کر صحیح اسلامی تعلیمات کی تبلیغ وترویج کرسکیں،اسکے علاوہ ہندوستان میں ہمارے مدارس کا نصابِ تعلیم بھی کچھ اسطرح کارائج رہاہے کہ اسمیں دوسرے علوم وفنون جنھیں صرف کتاب وسنت کے سمجھنے اور سیکھنے کے لئے رکھا گیا تھا وہی اصل قرار پاگئے اور کتاب وسنت کی تعلیمات ایک طرح سے ثانوی درجہ میں آگئیں چنانچہ مدارس کے طلباء کی اکثریت چاہے وہ سب کچھ جانتی ہو لیکن کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے کماحقہ واقف نہیں ہوتی تھی۔

انہی مذکورہ بالا دونوں باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت لکھنویؒ نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ لکھنؤ میں ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں مدارس عربیہ کے فارغ التحصیل طلباء کو قرآن وحدیث کا براہ راست مطالعہ کرایا جائے اور شریعت کے اسرار وحکم پر مبنی کتابیں پڑھائی جائیں اور اسی کے ساتھ مختلف اسلامی وغیراسلامی فرقوں کے عقائد و نظریات سے بھی انھیں واقف کرایا جائے تاکہ وہ اسلام کی صحیح وسچی تعلیمات کی روشنی میں مخالف طاقتوں کا بھرپور مقابلہ کرسکیں۔اسی مقصد کو لیکر آپ نے ۲/ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء کو لکھنؤ میں معززین شہر کے ایک اجتماع میں ایسے ہی ایک ادارہ کی بنیاد ڈالی اور اسکا نام بھی خود ہی تجویز کرکے ”دارالمبلغین“ رکھا۔اس افتتاحی جلسہ میں آپ ہی نے سب سے پہلے سورۂ فاتحہ کی پندرہ منٹ تک تفسیر بیان فرمائی اور اسکے بعد ادارے کے اغراض ومقاصد اور اسکے ضروری قواعد وضوابط کا ایک خاکہ بھی حاضرین کے سامنے پیش کیا اور پھر دوسرے ہی دن سے باقاعدہ کام شروع کردیا گیا۔اسطرح باضابطہ تسلسل کے ساتھ ترجمہ قرآن مجید کے درس کا آغاز آپ نے لکھنؤ میں کردیا جس میں عوام اور اہل علم دونوں پابندی اور ذوق وشوق سے آکر شریک ہوتے تھے۔اس صورت میں کم ازکم تین دور قرآن مجید کے مکمل

ہونے کی تحریری اطلاع ہے اگر اس سے زیادہ بھی یہ سلسلہ چلا ہو کوئی تعجب نہیں۔

دارالمبلغین کا اپنا ایک مخصوص دو سالہ نصاب تعلیم تھا اور اسمیں صرف مدارس کے فارغ التحصیل طلباء کو ہی داخلہ کیلئے منتخب کیا جاتا تھا۔ ان طلباء کو مدرسہ کی جانب سے معقول ماہوار وظیفہ اور رہائش کی مفت سہولت دی جاتی تھی۔ طلباء کے مطالعہ کیلئے مولاناؒ نے اپنا ذاتی کتب خانہ بھی مدرسہ کو دیدیا تھا جو آج بھی وہاں موجود ہے۔ ان طلباء کو مختلف فرقوں سے مناظرہ کرنے کی بھرپور تربیت دی جاتی تھی۔ حضرتؒ کی حیات میں تو یہ نظام اسی طرح چلتا رہا مگر آپ کے بعد تدریب مناظرہ کے ساتھ ساتھ درس نظامی کی تعلیم کا بھی بندوبست کردیا گیا اور اس کے ساتھ ہی حفظ و ناظرہ کے درجات بھی کھول دیئے آپ کا یہ صدقہ جاریہ آج بھی تشنگانِ علوم دینیہ کو سیراب کررہا ہے۔

شہدائے اسلام کے پندرہ روزہ جلسے

آپ کی ایک دوسری یادگار جو آج بھی اسی آب و تاب سے قایم ہے وہ ہر سال محرم کے مہینے میں "شہدائے اسلام" کے عنوان سے پندرہ روزہ جلسے ہیں، انکا آغاز بھی غالباً ۱۹۳۲ء ہی سے ہوا تھا۔ سب سے پہلے یہ جلسے شیخ امیر حسن صاحب مرحوم کی کوٹھی واقع محلہ رکاب گنج لکھنؤ میں ہوتے تھے مگر جب مجمع کی کثرت ہونے لگی اور یہ جگہ تنگ پڑنے لگی تو قریب ہی میں واقع "احاطہ شیخ شوکت علی" کا انتخاب کیا گیا جہاں آج تک ہر سال یہ جلسے پابندی کے ساتھ ہوتے چلے آرہے ہیں یہ احاطہ بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ پوری تحریک مدح صحابہ کی کارروائی اور عوامی اجتماعات کیلئے یہی احاطہ ہمیشہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اب یہی احاطہ دارالمبلغین نے خرید لیا ہے اور اسمیں نہایت کشادہ اور ضروری لوازمات سے مزین ہال تعمیر کیا گیا ہے جس کا نام "امام اہلسنت مولانا عبد الشکور ہال" رکھا گیا ہے اور اسکے اطراف میں دارالمبلغین کی درسگاہیں بنوائی گئی ہیں۔

اب مدرسہ کے طلباء کی رہائش اور انکی تعلیم کا بھی یہیں بندوبست ہے۔ شہدائے اسلام کے ان جلسوں کے آخر میں ۱۶/ محرم کو ہر سال اسی جگہ مدح صحابہ مشاعرہ بھی منعقد کیا جاتا ہے جس میں ملک کے مشہور شعراء شرکت کرتے ہیں۔ شہدائے اسلام کے ان جلسوں کی تاریخی خصوصیت ایک یہ بھی ہے کہ یہاں حضرت لکھنویؒ کے علاوہ برصغیر کے تقریباً تمام ہی مشہور و معروف علماء کرام اسمیں شریک ہوتے اور اپنے مواعظ سے سرفراز فرماتے رہے ہیں۔
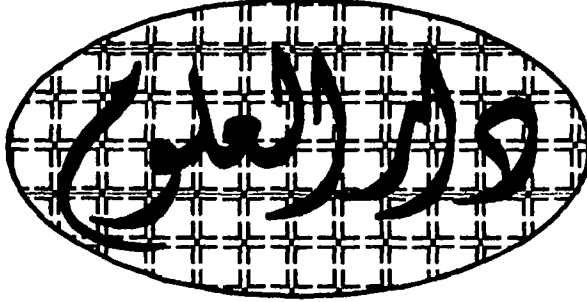
ماہ صفر ۱۴۱۹ھ مطابق ماہ جون ۱۹۹۸ء

جلد ۸۲	شمارہ ۶	فی شمارہ ۔/۶	سالانہ ۔/۶۰

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ : دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانہ بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۔/۴۰۰ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۔/۱۰۰، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۔/۸۰
ہندوستان سے ۔/۶۰

Tel. : 01336 - 22429
FAX : 01336 - 22768
Tel. : 01336 -24034 EDITER

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے، اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبد الستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرت مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دار العلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

ہندوستان کی علمی تاریخ سے جو لوگ واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے دور اقتدار میں تعلیم و تدریس کا تمام تر انحصار مسلم حکمرانوں، امراء اور نوابین کی علم پروری، علماء نوازی اور داد و دہش پر تھا، ہر شہر اور قصبات میں سلاطین اور امراء کی جانب سے مدرسے قائم تھے، جن کے مصارف کی مکمل ذمہ داری شاہی خزانے پر ہوتی تھی، چنانچہ اجمیر، دہلی، پنجاب، آگرہ، اودھ، بنگال، بہار، دکن، مالوہ، ملتان، کشمیر گجرات وغیرہ میں اس قسم کی ہزاروں درسگاہیں قائم تھیں، ان باقاعدہ درسگاہوں کے علاوہ علماء شخصی طور پر بھی اپنے اپنے مستقر پر تعلیم و تعلم کی خدمات انجام دیا کرتے تھے، اور ان علماء کو معاش کی جانب سے بے فکر رکھنے کے لیے دربار شاہی سے مدد معاش کے عنوان سے جاگیریں اور وظائف مقرر تھے۔

مسلمانوں کا یہ نظام تعلیم ۱۸۵۷ء تک قائم رہا، اس نظام تعلیم میں عام طور پر صَرف، نحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام تصوف، تفسیر، حدیث وغیرہ کے علوم وفنون پڑھے پڑھانے جاتے تھے، البتہ حدیث و تفسیر کا فن برائے نام تھا، زیادہ توجہ فقہ واصول فقہ اور پھر منطق وفلسفہ پر دی جاتی تھی۔

۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کا چراغ گل ہوگیا، اور مسلمانوں کی بجائے سیاسی اقتدار پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو یہاں کے عام باشندے اور بطور خاص مسلمان " ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة " (۱) کے فطری اصول کا تختہ مشق بن گئے۔

اس سیاسی انقلاب نے مسلمانوں کے اقتصادی، تمدنی اور علمی ودینی نظام کو کس طرح پامال کیا اس کی تفصیل سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب "آور انڈین مسلمانز" ہمارے ہندوستانی

(۱) جب بادشاہ کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو برباد اور اس کے باشندوں کو ذلیل کر ڈالتے ہیں۔

مسلمان میں کسی قدر بیان کی ہے، انھوں نے ایک جگہ مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی اور مشکلات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

حکومت نے ان کے لئے تمام اہم عہدوں کا دروازہ بند کردیا ہے، دوسرے ایسا طریقۂ تعلیم جاری کردیا ہے، جس میں ان کی قوم کے لیے کوئی انتظام نہیں ہے تیسرے قاضیوں کی موقوفی نے ہزاروں خاندانوں کو جو فقہ اور اسلامی علوم کے پاسبان تھے بیکار اور محتاج کردیا ہے، چوتھے ان کے اوقاف کی آمدنی جو ان کی تعلیم پر خرچ ہونی چاہئے تھی غلط مصرفوں پر خرچ ہورہی ہے۔(۱)

تعلیم کے سلسلہ میں اس نئی حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ اس طرح کا تعلیمی نظام رائج کیا جائے جسے پڑھ کر ہندوستانی ذہنی وفکری طور پر بالکل انگریز بن جائیں یا کم از کم ایماندار ومحنتی رعایا بن جائیں۔ چنانچہ مسٹر انفنسٹن اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں:

میں علانیہ نہیں تو درپردہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا۔ اگرچہ مجھے گورنر صاحب سے اس بارہ میں اتفاق ہے کہ مذہبی امور میں امداد کرنے سے احتراز کیا جائے تاہم جب تک ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی شکایت نہ کریں، تب تک ان کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا شبہ نہیں، اگر تعلیم سے ان کی رایوں میں ایسی تبدیلی پیدا نہ ہوسکے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں تاہم وہ اس سے زیادہ ایماندار محنتی رعایا تو ضرور بن جائیں گے۔(۲)

اس سلسلے کی تفصیلات کے لیے اسباب بغاوت ہند از سرسید مرحوم، روشن مستقبل از مولوی سید طفیل احمد مرحوم اور نقشِ حیات (ج ۲) از شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ ملاحظہ کی جائیں۔

ان حالات میں مسلم مفکرین ومدبرین کا یہ متفقہ فیصلہ ہوا کہ گورنمنٹ کا قائم کیا ہوا نظام تعلیم مسلمانوں کی ضرورت کو پورا نہیں کرسکتا، بلکہ یہ اسلامی تہذیب اور کلچر کے لیے تباہ کن اور ان کے عقائد واخلاق کے واسطے مہلک ہے، مگر اس نظام کی اصلاح کے سلسلے میں ان کی رائیں مختلف ہوگئیں، ایک جماعت نے مسلمانوں کی اس زبوں حالی کا علاج انگریزی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن میں تجویز کیا۔ بالفاظ دیگر اس جماعت کا اصل مقصد مسلمانوں

---

(۱) موج کوثر ص ۴۷ (۲) روشن مستقبل ص ۹۵

کی اقتصادی اصلاح اور دنیوی پستی کا دور کرنا تھا، اس جماعت کے سر براہ اور قائد سر سید احمد مرحوم تھے، اور اس نظریہ کا اولین مظہر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے، سر سید مرحوم بھی اگرچہ مذہب کی ضرورت کو تسلیم کرتے تھے مگر دنیوی ترقی کو وہ اولیت دیتے تھے، ان کا خیال یہ تھا کہ دنیوی ترقی کی راہ سے دینی مقاصد تک پہنچا جائے، مرحوم اپنے اس نظریہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے تھے۔

"فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہو گا نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔"

مگر وہ اپنے اس منصوبہ میں کامیاب نہیں ہو سکے، چنانچہ تحریک علی گڈھ کے معقول وکیل اور سر سید مرحوم کے زبردست حامی شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں "وہ مغربی علوم کے ساتھ ایمان کامل اور صحیح مذہبی تربیت کو ضروری سمجھتے تھے، لیکن اس میں انہیں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔"(۱)

اس ناکامی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے یہ شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

"جن لوگوں نے مسجدوں کی چٹائیوں پر بیٹھ کر تعلیم پائی، ان میں تو سر سید محسن الملک اور وقار الملک جیسے مدبر اور منتظم پیدا ہوئے، جو لوگ انگریزی سے قریب ناواقف تھے اور جن کیلئے مغربی ادب ایک گنج سر بستہ تھا انہوں نے نیچرل شاعری اور ایک جدید ادب کی بنیاد ڈالی، اور آب حیات، سخندانِ فارس، شعر و شاعری، مسدس حالی جیسی کتابیں تصنیف کر لیں، لیکن جن روشن خیالوں نے کالج کی عالیشان عمارتوں میں تعلیم حاصل کی اور جن کی رسائی مغرب کے بہترین اساتذہ اور دنیا بھر کے علم و ادب تک تھی وہ مطمح نظر کی پستی اور کیرکٹر کی کمزوری سے فقط اس قابل ہوئے کہ کسی معمولی دفتر کے کل پرزے بن جائیں" (۱)

مزید لکھتے ہیں۔

کسی طرف سے اسلام یا مسلمانوں یا علی گڈھ کے خلاف آواز اٹھے اس پر لبیک کہنے والے سب سے پہلے علی گڈھ سے نکلیں گے۔ (۲)

"لیکن آپ ان بزرگوں کا معاملہ ان کے ضمیر اور احساس فرض پر چھوڑ دیں اور

---

(۱) موج کوثر ص ۱۴۸ (۲) ایضاً ص ۱۵۰

ارکانِ اسلام کی ظاہری پابندی کو بھی ایک لمحے کیلئے نظر انداز کردیں تب بھی علیگڈھ کی فضا میں اندر اندر ایک عام ایمانی کمزروی اور روحانی کم ہمتی کا سراغ ملیگا آپ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر وہاں کے قابل اور ذہین اساتذہ اور تیز اور ہونہار طلبہ کی باتیں سنیں اور ان کے ذہنی رجحانات کا تجزیہ کریں تو آپ کو احساس ہوگا (کہ اگر وہ قومی نوحہ خوانی کا پرانا اور رسمی لبادہ نہ پہن لیں) تو ان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ آپ انہیں کسی طرح دقیانوسی قدامت پسند مسلمان نہ سمجھ لیں، یعنی علی گڑھ کالج ہے، امام باڑہ تو نہیں ہے"(۱)

مفکرین اسلام کی دوسری جماعت کا نقطہ نظریہ تھا کہ اب ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی بقاء کا واحد ذریعہ اسلامی تعلیمات ہیں، لہذا برٹش گورنمنٹ کی تعلیمی امداد واعانت سے صرفِ نظر کرکے دینی درسگاہیں اور اسلامی ادارے قائم کئے جائیں اس جماعت کے سامنے بھی مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی تھی مگر اس نے اولیت ایمانیات وروحانیات کو دی اس جماعت کے سرخیل اور میر کارواں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے اور نقطہ نظر کا مظہر اولین دارالعلوم دیوبند ہے، شیخ اکرام ان دونوں نظریوں کے اختلاف کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"سرسید کا مقصد مسلمانوں کے دنیوی تنزل کو روکنا تھا اور ارباب دیوبند کی نظر دینی ضرورت پر تھی پھر سرسید طبقۂ امراء کے رکن تھے اور مولانا قاسم جمہور کے نمائندے"(۲)

اس نظریہ اور طریقۂ کار پر پیام ندوہ میں ان الفاظ سے تبصرہ کیا گیا ہے۔

"اس حقیقت سے کوئی ہوشمند اور منصف انسان انکار نہیں کرسکتا کہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے، اور اس کو بدعت تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام وبقا واستحکام میں بیش بہا مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلا شبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے۔

آج کل ہندوستان میں مسلمانوں کے جو دینی و دنیاوی ادارے اور تعلیم گاہیں قائم اور اپنے

---

(۱) ایضاً ص ۱۵۱ (۲) ایضاً ص ۲۰۱

طور پر خدمات انجام دے رہی ہیں وہ سب در حقیقت انہیں دونوں نقطہ نظر کی ترجمان ہیں اور اپنے نظریے کے مطابق مسلمانوں کی علمی، دینی اور دنیاوی تعمیر و ترقی میں مصروف عمل ہیں، اب اگر کسی ایک نظریہ کو دوسرے پر بزور تھوپنے کی کوشش کی جائے گی تو یہ اتحاد و اتفاق کے بجائے انتشار اور پراگندگی کا سبب ہوگی، آج کل ایک خاص حلقے کی طرف سے اسلامی درسگاہوں کے نصاب تعلیم کی اصلاح کی آواز بڑی شد و مد کیساتھ بلند کی جارہی ہے اور اس سلسلے میں جابجا سمینار اور مذاکرے کا اہتمام کیا جارہا ہے، یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے مدارس کے نصاب تعلیم میں ترمیم کی ضرورت ہے اور اہل مدارس اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں اور اپنے طور پر اس سلسلے میں کوششیں بھی کررہے ہیں، اگر اس کوشش کو بروئے کار لانے میں کوئی تعاون پیش کرتا ہے تو اہل مدارس اسے شکریہ کے ساتھ قبول کریں گے لیکن نصاب تعلیم میں وقت اور تقاضا کا نام لیکر ایسی ترمیم جو ان کے مقصد قیام کے خلاف ہو جمہور مسلمین اسے کسی قیمت پر قبول نہیں کرسکتے، اس لئے بہی خواہان ملت مدارس اسلامیہ کے نصاب کے متعلق جو تجویز بھی پیش کریں وہ مدارس کے قیام کے پس منظر اور ان کے بنیادی مقاصد کو سامنے رکھ کر پیش کریں، ورنہ اندیشہ ہے کہ ملت ایک نئے انتشار کا شکار نہ ہو جائے۔

از : مولانا عاشق الٰہی بلند شہری مدنی

آج کل مباہلہ کا رواج عام سا ہو گیا ہے خالص بے دین گمراہ لوگ بھی اکابر علماءِ حق کو مباہلہ کی دعوت دینے میں دریغ نہیں کرتے اور اس قسم کے لوگوں نے یہ ایک ہتھیار بنا رکھا ہے کہ جس کو دعوتِ مباہلہ دین گے اگر اس نے قبول نہ کیا تو اپنے مریدین متعلقین میں ایک ساکھ قائم ہو جائے گی اور وہ لوگ سمجھیں گے ہمارے حضرت کے عقائد اور دعوے حق ہیں جب ہی تو فلاں عالم اور فلاں شیخ مقابلہ میں نہ آیا۔ اور اگر چیلنج قبول کر لیا گیا (جیسا کہ اہلِ حق کی طرف سے ہمیشہ ہو تا رہا ہے) (تو داعیانِ مباہلہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے اپنی اپنی دعا الگ الگ کرنے کیلئے کہا تھا دو سال قبل قادیانی یہ پینترا بدل چکے ہیں)۔

خیال آیا کہ مباہلہ کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کی جائیں اور بتایا جائے کہ مباہلہ کیا چیز ہے اور وہ اب مشروع ہے یا نہیں اور اس کا حکم شرعی کیا ہے۔ اسی لئے یہ سطریں سپرد قلم کی جا رہی ہیں۔

بخران کے نصاریٰ آنحضرت سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے انہوا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو مشرکانہ باتیں کیں۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ آلِ عمران کی یہ آیت نازل فرمائی:

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ

(سورہ آل عمران)

سو جو شخص آپ سے حجت کرے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آ چکا ہے تو آپ فرما دیجئے کہ آجاؤ ہم بلا لیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور خود اپنے تنوں کو اور تمہارے تنوں کو پھر

خوب دل سے دعا کریں اس طور پر کہ اللہ کی لعنت بھیجیں ان پر جو ناحق پر ہوں۔

آنحضرت ﷺ باہر تشریف لائے آپ کے ساتھ حضرت علیؓ حضرات حسنین ،حضرت فاطمہ رضی اللہ عن اجمعین تھے (یہ آپؐ نے نَدعُوا أبنآءَ نَا وَ أبنآء کُم وَنِسَاءَ نَا وَ نسائکُم وَ أنفُسنَا وَ أنفسکُم پر عمل فرمایا۔)

نصاریٰ کو جس چیز کی دعوت دی تھی پہلے آپ نے اس کا مظاہرہ فرمایا اور مباہلہ کے لئے ان سے پہلے باہر تشریف لے آئے آپ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ میں دعا کرتا ہوں تم آمین کہنا اور دعا یہ کرنا تھا کہ جو لوگ جھوٹے ہوں ان پر اللہ کی لعنت ہو، نصاریٰ نجران دعوت مباہلہ کے بعد آپ کے باہر تشریف لانے سے پہلے یہود مدینہ منورہ سے مشورہ کر چکے تھے اور خود آپس میں بھی مشورہ کر کر کے یہ طے کر لیا تھا کہ مباہلہ نہیں کرنا ہے کیونکہ یہ اللہ کے سچے نبی ہیں ان سے ہمیں صلح کر لینی چاہئیے، لہذا انہوں نے سالانہ دو ہزار کپڑوں کے جوڑے اور ۳۳/زرہیں اور ۳۳/اونٹ اور ۳۴/گھوڑے دینے پر صلح کر لی، مفسرین نے لکھا ہے کہ نجران کے پادری نے جب آنحضرت سرورعالم ﷺ کو دیکھا کہ آپ اپنے اہل خانہ افراد کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں تو اس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اے نصرانیو! میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں اگر وہ اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کریں کہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا دے تو ضرور ہٹا دے گا۔ لہٰذا تم مباہلہ نہ کرو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

حضرت شعبی (تابعی) سے مروی ہے کہ آنحضرت سرورعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے پاس اللہ کی طرف سے یہ خوشخبری آچکی تھی کہ اگر یہ لوگ مباہلہ کر لیتے تو اہلِ نجران ہلاک ہو جاتے حتیٰ کہ درختوں پر ایک پرندہ بھی نہ رہتا۔

آنحضرت سرورعالم ﷺ نے جو نصاریٰ کو دعوتِ مباہلہ دی یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھی اس لئے آپ نے ان سے فرمایا:

إن اللہ تعالیٰ قد أمرنی إن لم تقبلوا هذا ان أباهلكم۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ مجھے فرمایا کہ میری یہ دعوت توحید کو قبول نہ کرو تو تم سے مباہلہ کروں۔

اس کے بعد انہوں نے سوچنے کا موقعہ لیا اور پھر مباہلہ سے منحرف ہو گئے اور آپ کی بددعا سے ڈر گئے (جیسا کہ پہلے گذرا) لفظ "مباہلہ" کا مادہ بھل ہے صاحب روح المعانی لکھتے ہیں، نبتہل بمعنی نتباھل ہے اور یہاں افتعال مفاعلہ کے معنی میں ہے، نیز لکھتے ہیں

کہ افتعل اور تفاعل بہت سے مواقع میں ایک دوسرے کی جگہ آتے ہیں پھر لکھتے ہیں "بہلہ" اصل میں لعنت اور دعا کے معنی میں ہے پھر مطلق دعا کے معنیٰ میں بھی آنے لگا کما یقال فلان یبتهل الی الله تعالیٰ فی حاجته صاحبِ قاموس نے بہل کے متعدد معانی لکھے ہیں جن میں ایک معنی لعنت کرنے کا بھی ہے انہوں نے لکھا ہے۔

البَهلَةُ ویضَمُّ اللعنة وبَهَل بَعضُهم بَعضاً وَتَبهَّلُوا وَتَبَاهَلُوا ای تلا عنوا والا بتهال الا جتهاد فی الدعاء.

حضور اقدس ﷺ کے زمانہ میں مباہلہ اور ابتہال کی دعوت کا یہی ایک واقعہ پیش آیا جس کا سورۂ آلِ عمران میں ذکر ہے اور اس پر بھی عمل نہ ہو سکا اس لئے کہ فریقِ ثانی آمادہ نہ ہوا اس واقعہ کے علاوہ اور کوئی واقعہ کتبِ حدیث یا کتبِ سیر میں اس طرح احقر کے ناقص علم میں منقول نہیں ہے۔

چونکہ آنحضرت سرورِ عالم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مباہلہ کی دعوت دینے کا حکم دیا گیا تھا اس لئے آپ ﷺ نے نصاریٰ کو اس کی دعوت دی اب سوال یہ ہے کہ آپ کے بعد بھی اس کا جواز باقی ہے یا نہیں؟ صاحب روح المعانی (ج ۳ ص ۱۹۰) میں لکھا ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک شخص سے کچھ اختلاف تھا انہوں نے اسے مباہلہ کی دعوت دی اور آیت بالا پڑھی اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔

البحر الرائق نے ج ۴ ص ۱۲۷ پر باب اللعان میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ اب کسی معین جھوٹے شخص پر لعن کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے بعد غایۃ البیان کے باب العدۃ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ:

من شاء باهلته ان سورة النساء القصریٰ نزلت بعد فی سورة البقرء، ای من شاء المباهلة ای الملاعنة باهلته وکانو ایقولون اذا اختلو ا فی شئ بهلة علی الکاذب منا، قالوا هی مشروعیة فی زماننا ایضاً.

حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عمل اور قول سے معلوم ہوا کہ مباہلہ آنحضرت ﷺ کے بعد بھی مشروع ہے صاحب بحر نے بھی اس کی مشروعیت کو تسلیم فرمایا ہے لہذا اس کے جواز میں تو کلام نہیں، اب آگے سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مباہلہ کی دعوت دے تو فریق مخالف پر مباہلہ کرنا واجب ہو جاتا ہے

نہیں؟ کسی دلیل سے اس کا وجود معلوم نہیں ہوتا۔

لوگوں نے آج کل مباہلہ کو کھیل بنالیا ہے جاہل آدمی بھی پیری مریدی کرتے ہیں جھوٹے مکاشفات بیان کر کے اپنے مریدوں میں اپنا مقام بناتے ہیں، اہلِ باطن ہونے کے مدعی بن جاتے ہیں اور بدعات اور خرافات اور خلافِ شرع امور میں مشغول رہتے ہیں۔ مریدوں کو بھی ایسے ہی کاموں میں مشغول رکھتے ہیں، علماء شریعت کی طرف سے جب انکولوگوں پر نکیر کی جاتی ہے تو اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لئے مباہلہ کا چیلنج دیتے ہیں گویا حضرات علماء حق کا اور کچھ کام ہی نہ رہا بس جاہل لوگ کتابیں لکھا کریں اور جب ان کی اغلاط کی نشاندہی کی جائے تو یہ جاہل مباہلہ کا چیلنج کر دیا کریں جھوٹے دنیادار پیر باطل دعوے کیا کریں اور علماء ان کا تعاقب کریں تو جھٹ مباہلہ کی دعوت دیدیں اور علماء اپنے علمی مشاغل چھوڑ کر مباہلہ کے لئے سامنے آیا کریں۔

پھر یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ مقصد کے اعتبار سے مباہلہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

مباہلہ کا مطلب (جیسا کہ اوپر معلوم ہوا) یہ ہے کہ ہر فریق اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرے کہ جو سچا نہ ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو، مباہلہ ایک دعا ہے دعا کا قبول ہونا یا فوری قبول ہونا ضروری نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کا اثر دنیا ہی میں ظاہر ہو، لہذا مباہلہ کے ذریعے حق وباطل کا فیصلہ ہو جانا ضروری نہیں۔

مباہلہ کی دعوت دینے والے کہتے ہیں کہ دونوں فریق اونچی عمارت سے کود پڑیں جو زندہ بچ جائے وہ حق پر ہے اور جو فریق حق پر نہ ہو وہ آگ میں جل جائے۔ اس پر بجلی گر جائے اور اس طرح کی باتیں کرتے ہیں، اگر اس طرح کا مباہلہ کر بھی لیا جائے (جو مباہلہ قرآنیہ سے مختلف ہے) تو ضروری نہیں کہ اہلِ باطل پر عذاب آجائے اور جو دعا مانگی ہے وہ قبول ہو جائے۔ اس لئے حضرت حکیم الامت تھانوی قدس رہ نے سورۂ آلِ عمران کی آیت بالا کے ذیل میں تحریر فرمایا ہے۔

"کہ لحوق ضرر میں توقف ہونا یا ظہور نہ ہونا موجب اشتباہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ تعین حق وباطل کے لئے دلائل شرعیہ بس ہیں، مباہلہ پر موقوف نہیں، زیادہ غرض اس سے نزاعِ لفظی کا ختم کرنا ہے"

لعان کی حقیقت بھی تو اسی قدر ہے کہ لعان کے بعد مرد حدِ قذف سے اور عورت حد

زنا سے بچ جاتی ہے. آنحضرت سرورِ عالم ﷺ کے سامنے لعان ہوا نہ مرد پر لعنت کے
اثرات ظاہر ہوئے نہ عورت پر غضب الٰہی کا ظہور ہوا، بس دونوں کا باہمی نزاع ختم ہو
لہذا مباہلہ کی صورت میں اگر کسی قسم کا ظاہری ضرر کسی کو نہ پہونچے تو اس سے کسی فریق
حق پر ہونا ثابت نہیں ہوتا، حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے حکیمانہ بات فرمائی کہ مباہلہ
صرف نزاعِ لسانی کو ختم کرنے کے لئے ہے، احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے دلائل
شرعیہ کافی اور وافی ہیں اور دلائل شریعت کے ہوتے ہوئے مباہلہ کی دعوت دینا
دلائل حقہ سے عاجز ہونے کی دلیل ہے۔ اہلِ باطل نے یہ طریقہ بنالیا ہے کہ قرآن
وحدیث کے دلائل کو سامنے رکھ کر بات کرنے سے عاجز ہوتے ہیں
تو مباہلہ کی دہائی دیتے ہیں۔ اظہار حق کے لئے قرآن وحدیث کے دلائل کافی ہیں
اگر علماء حق میں سے کوئی صاحب کسی اہلِ باطل کی دعوتِ مباہلہ قبول نہ کرے تو اس کا
معنیٰ نہیں کہ اہلِ باطل حق پر ہوگئے (اگرچہ علماء حق کو انجام تک پہونچانے کیلئے اہل
باطل کی دعوتِ مباہلہ قبول کرلینی چاہئے جیسا کہ اب تک قبول کرتے رہے ہیں)
شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ جو حضرات اللہ کے نزدیک اہلِ حق ہیں ان کا حق پر ہونا ظاہر
فرمانے کے لئے اللہ تعالیٰ مباہلہ کرنے والوں کی دعا فوری طور پر کیوں قبول نہ فرمائیں گے
اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے پابند نہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا کوئی وعدہ
نہیں کہ جو لوگ دلائلِ شرعیہ کو چھوڑ کر مباہلوں کے ذریعے حق ناحق کا فیصلہ کرنے کے
لئے ایک دوسرے کو دعوت دینگے تو اُن میں سے جو شخص باطل پر ہوگا اس پر عذاب نازل
دیں گے، اللہ تعالیٰ نے اثباتِ حق کے لئے دلائل بھیجے ہیں وہ کافی ہیں اہل مکہ نے بڑی
لعنت اور عناد اسی طرح کی دعا کی تھی جو سورۂ انفال میں موجود ہے۔

وَإِذ قَالُوا اللهم ان كان هٰذا هُو الحق مِن عِند ك فَامطِر عَلَينا حجارَةً
السماء أو ئتنا بعذابِ اليم.

اور جب انہوں نے کہا کہ اے محمد (ﷺ) آپ جو دعوت دے رہے ہیں) اگر وہ حق ہے
تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دیجئے یا ہم پر دردناک عذاب لے آیئے۔
دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے امتیوں نے بھی اسی طرح کی باتیں کیں وہ حضرات
انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام سے کہتے تھے کہ اگر تم سچے ہو تو عذاب لاکر دکھاؤ حضرت

علیہ السلام کی قوم نے کہا:۔

فَائتِنَا بِمَا تَعِدُ نَآ اِن کُنتَ مِنَ الصّادِقِین

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی یہ ہی بات کہی حضرت شعیب علیہ السلام کی امت نے کہا:

فَاَسقِط عَلَینَا کِسفاً منَ السمآء اِن کُنتَ مِنَ الصّادِقِین

اللہ تعالیٰ شانہ کو کوئی مجبور کرنے والا نہیں اس کے دین کو کوئی قبول نہ کرے تو اس میں اس کا کچھ ضرر نہیں وہ اس کا پابند نہیں کہ جو دعا کی جائے اُس کو قبول کرے اور اسی وقت قبول کرے اور بعینہ اسی طرح قبول کرے جس طرح دعا کرنے والے نے دعا کی ہو۔ اثباتِ حق کے لئے اس نے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو معجزہ دیدیئے اور آخر الامم کو قرآن مجید عطا فرمادیا، جو ہمیشہ کے لئے زندہ معجزہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کو اسوہ بنادیا۔ آپ ﷺ کی سیرت اور افعال و اقوال صحیح اسانید سے ثابت ہیں ثبوت حق کے لئے قرآن وحدیث کافی ہے اس کو خوب سمجھ لیا جائے۔

دور حاضر میں شعبدہ بازی بھی ہے، مسمریزم بھی ہے، جادوگری بھی ہے، نفسیاتی تصرفات بھی ہیں اگر کوئی صاحبِ حق اہل باطل سے مباہلہ کرے تو اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اہلِ باطل مذکورہ امور میں کسی چیز کو استعمال کریں یا کسی کو پستول دے کر یا اور کوئی آتشی ہتھیار دے کر بٹھادیں جو صاحب حق کو ہلاک کردے اور اسی طرح سے اپنی حقانیت ظاہر کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح کا ایک واقعہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے ایک مناظرہ میں پیش آچکا ہے جس کا تذکرہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی رحمہ اللہ علیہ نے تذکرۃ الخلیل ص ۱۴۰ پر تحریر فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

مجلس مناظرہ میں آریوں کی طرف سے ایک جوان خوبصورت گیروے کپڑے پہنے ہوئے سادھو تھا جو آرام کرسی پر لیٹا رہتا اور جب مسلمانوں کے مقرر تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تو گردن جھکا کر بیٹھ جاتا تھا مقررین اسلام کی تقریریں نہایت پراگندہ اور خراب ہورہی تھیں۔ حتیٰ کہ مولانا عبدالحق حقانی سے دور وتسلسل کی تقریر بھی نہ ہوسکی۔ صدر جلسہ کو اس طرف متوجہ کیا گیا تو اس نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کو مطلع کردیا حضرت نے گردن جھکالی اور حق وباطل میں تصرف قلب کی جنگ ہونے لگی دو منٹ بھی نہ گزرے تھے

کہ وہ ساھو بے قرار ہو کر آرام کرسی سے اُٹھا اور میدانِ جلسہ سے چلا گیا اور مسلمانوں کی تقریریں ہونے لگیں کہ گویا دریا کا بند کھل گیا اور گیارہ آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ موجود تھے جنہوں نے سادھو کے تصرف کی کاٹ کردی لیکن اس سے یہ پتہ چل گیا کہ اہل باطل دلائل کے بجائے ایسے ہتھیار بھی استعمال کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مباہلہ مشروع تو ہے جو قطع نزاع لسانی کے لئے ہے اثبات حق کیلئے نہیں، اثبات حق کے لئے دلائل قرآن وحدیث ہی کافی ہیں اگر کبھی مباہلہ ہو اور اس کا ظہور بصورتِ عذاب نہ ہو تو اس سے یہ ثابت نہ ہوگا کہ جو اہل حق دلائل وبراہین سے اپنا دعویٰ ثابت کرتے ہیں العیاذ باللہ وہ باطل پر ہو جائیں یا اگر کوئی صورت خدانخواستہ ایسی پیش آجائے کہ اہلِ حق کو کوئی نقصان پہونچ جائے تو اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ اہل باطِل حق پر ہو گئے۔

نصاریٰ نجران کے بارے میں جو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر یہ مباہلہ کر لیتے تو ہلاک ہو جاتے۔ یہ چونکہ آپ کو وحی سے معلوم ہو گیا تھا اس لئے اس پر اس دور کے مباہلوں کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

آیت مباہلہ کی یہ تفسیر ابن کثیر، روح المعانی، در منثور، بیان القرآن سے ماخوذ ہے۔

وباللہ التوفیق وبیدہٖ ازمة التحقق
وھو خیر عون وخیر رفیق
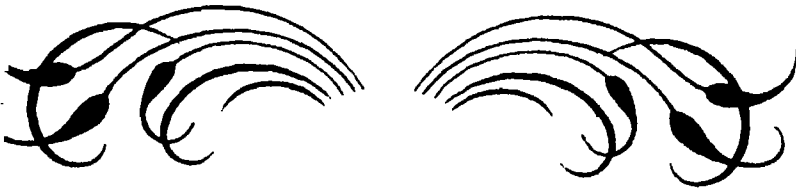
محمد بدیع الزماں ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ہارون نگر فرسٹ سیکٹر
پھلواری شریف پٹنہ ۸۰۱۵۰۵.

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہ آسمانِ فضائل کا مہر عالمتاب ہیں،ان کے اوصاف و محاسن و کمالات میں سے ہر ایک تاج افتخار کا گوہر شاہوار کہے جانے کا مستحق، آپ اُن خوش نصیب لوگوں میں ہیں جنہیں سیّد المرسلین ﷺ نے دنیا اور دین میں اپنا بھائی قرار دیا اور جن کی اپنے ساتھ نسبت کو اُس نسبت سے تشبیہ دی جو حضرت موسیٰ کلیم اللہ کو حضرت ہارونؑ سے تھی غزوۂ تبوک کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ مدینہ منورہ میں اپنا ایک قابلِ اعتماد جانشیں چھوڑ جائیں، جو مجاہدین کے گھر کی دیکھ بھال کرے اور منافقین کی شرارتوں کا بھی سدِّباب کرپائے تو اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کی نظر انتخاب حضرت علی رضی اللہ عنہ پر پڑی، اس انتخاب پر منافقین نے طعنہ دینا شروع کیا کہ چونکہ حضرت علیؓ صعوبتِ سفر اور جہاد فی سبیل اللہ سے گریز کر رہے ہیں اس لئے اُنہیں جنگ میں جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ جب یہ بات حضرت علیؓ نے حضور تک پہنچائی تو آپ نے شفقت بھری نظر آپ پر ڈالی اور صحیح بخاری میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تمہیں میرے ساتھ وہی نسبت ہو جو ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھی سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ کے دورِ خلافت (۶۵۶ء تا ۶۶۱ء مطابق ۳۵ھ ۴۰ھ) کے چند واقعات سے ہم آپ کے زُہد فی الدُّنیا کے معاملے میں آپ کی سیرت و کردار کی چند جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔

ایک بار حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی حضرت عقیلؓ کو کچھ روپیوں کی ضرورت تھی تو انہوں

نے حضرت علیؓ کی طرف رجوع کیا۔ مگر حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ میرے پاس روپے نہیں ہیں تب حضرت عقیل نے یہ رقم بیت المال سے بطور قرض دلوائے جانے کی تجویز پیش کی اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا:۔

"میں اللہ کے سامنے چور بننا نہیں چاہتا، اس معاملہ میں تم حسنؓ اور عام آدمی میرے لئے برابر ہیں"

ایک دفعہ عبداللہ بن زریر نامی ایک صاحب حضرت علیؓ کے سامنے شریک طعام ہو۔ کھانا بہت سادہ تھا انہوں نے عرض کیا: "یا امیر المومنین آپ کو پرندوں کا گوشت پسند نہیں؟ حضرت علیؓ نے جواباً عرض کیا:۔

"ابن زبیر! خلیفہ وقت کو مسلمانوں کے مال میں صرف دو پیالوں کا حق ہے، ایک کھائے اور کھلائے اور دوسرا عامۃ الناس کے سامنے پیش کرے"

حضرت علیؓ ایک مرتبہ اپنے غلام قنبر کو ساتھ لے کر کپڑا خرید نے تشریف لے گئے اپنے لئے موٹا کپڑا اور قنبر کے لئے اچھا ملائم کپڑا انتخاب کیا۔ قنبر نے تامل کیا تو فرمایا:۔

"تم جوان ہو، تمہارے لئے اچھا کپڑا مناسب ہے، میرا کیا ہے بوڑھا آدمی ہوں"۔

ایک مرتبہ عید کے موقع پر لوگوں نے فرمایا:

"امیر المومنین آپ کے لباس میں پیوند لگے ہیں۔ اگر آپ دو درہم میں کپڑوں کا جوڑا خرید لیں اور عید کے دن اسے پہن لیں تو کیا اچھا ہو" آپ نے فرمایا:۔

"مجھے شرم آتی ہے کہ میں نئے کپڑے پہنوں اور کوفہ میں ہزاروں اشخاص بو لباس میں ہوں"

ایک دفعہ بیت المال میں جو کچھ تھا امیرالمومنین نے اُس کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا او میں جھاڑو دے کر دو رکعت نماز پڑھی، نماز کے بعد فرمایا:۔

"اے زمین تو گواہ رہ کہ میں نے مسلمانوں کی امانت ادا کر دی" ایام خلافت میں حضرت علیؓ چھوٹی آستین، اونچے دامن کا کرتہ اور معمولی تہ بند باندھے بازار میں گشت کرتے پھر اگر کوئی تعظیماً پیچھے ہو لیتا تو اُس کو ہٹا دیتے اور فرماتے:۔

"اس میں حاکم کے لئے فتنہ اور مومن کے لئے ذلت ہے"۔

ایک مرتبہ حضرت علیؓ کا تہ بند پیوند لگتے لگتے بالکل بیکار ہو گیا تو منبر پر خطبہ دیتے

فرمایا:

"کون میری یہ تلوار خرید تا ہے، خدا کی قسم اگر میرے پاس ایک تہ بند کی قیمت ہوتی تو اس کو فروخت نہ کرتا"

ایک شخص نے کھڑے ہوکر عرض کیا: "امیر المومنین میں تہ بند کی قیمت قرض دیتا ہوں"

حضرت علیؓ کا قاعدہ تھا کہ جب کہیں سے مال آتا تو سارا مال وہ مسلمانوں میں تقسیم کر دیتے حتیٰ کہ ایک موقع پر روٹی آئی تو اس کے سات ٹکڑے کئے اور ہر حصہ پر ایک ایک ٹکڑا تقسیم کیا، پھر قرعہ ڈال کر تمام حصے کئے۔ ایسے مواقع پر نہ وہ اپنے لئے کوئی خاص چیز منتخب کرتے اور نہ تقسیم میں اپنے اعزا و اقربا کو ترجیح دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کہیں سے نارنگیاں آئیں۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ نے ایک ایک نارنگی اٹھالی، امیر المومنین نے اُن سے نارنگیاں چھین لیں اور لوگوں میں تقسیم کر دی۔

جب امیر المومنین حضرت علیؓ نے دار الخلافہ مدینہ منورہ سے کوفہ منتقل کیا تو دار الامارت کے بجائے ایک میدان میں خیمہ لگا کر اس میں قیام کیا اور فرمایا:

"عمر بن الخطاب نے ہمیشہ ہی اِن عالیشان محلوں کو نظرِ حقارت سے دیکھا۔ مجھے اس کی حاجت نہیں" بعد میں ایک معمولی مکان کو اپنا مسکن بنایا اور دروازے پر نہ کوئی حاجب تھا اور نہ کوئی دربان۔

ابن ابی رافع سے روایت ہے کہ میں امیر المومنین حضرت علیؓ کے بیت المال کا نگراں تھا۔ ایک مرتبہ بصرہ سے موتیوں کا ایک ہار آیا، امیر المؤمنین کی نظر اس ہار پر پڑی تو اُنہوں نے بیٹی سے پوچھا: یہ کہاں سے آیا ہے؟ اُنہوں نے واقعہ بیان کیا تو امیر المومنین نے مجھ سے فرمایا: ابن ابی رافع، تم خیانت کرنے لگے میں نے کہا: "معاذ اللہ"۔

امیر المومنین نے فرمایا:

"تم نے میری بیٹی کو بیت المال کا ہار عاریتاً کیسے دے دیا؟ نہ مجھ سے اجازت لی اور نہ مسلمانوں سے"۔

میں نے عرض کیا: "وہ آپ کی صاحبزادی ہیں۔ اُنہوں ایک چیز مانگی اور میں نے تین دن بعد صحیح و سالم واپسی کی شرط پر اُنہیں دے دی"۔ ارشاد ہوا: "ابھی واپس لو اگر تم نے ایسی حرکت کی تو سزا سے نہیں بچ سکو گے، اگر میری بیٹی نے یہ ہار عاریتاً نہ منگایا ہوتا تو یہ پہلی ہاشمی

لڑکی ہوتی جس کے ہاتھ میں چوری کے الزام میں قطع کراتا"۔

امیر المومنین کی صاحبزادی نے عرض کیا: "امیر المومنین، میں آپ کی بیٹی ہوں، سے زیادہ اس ہار کا مستحق کون ہو سکتا ہے؟" فرمایا: "اے ابن ابی طالب کی بیٹی، کیا مہاجر اور انصار کی تمام لڑکیاں عید پر ایسا ہار پہنیں گی؟" وہ خاموش ہو گئیں اور میں نے اُن ہار لے کر بیت المال میں رکھ دیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ کی ذات بابرکات فقر وزہد سے عبارت تھی۔ تمام عمر فقر و سے گزاری، عہدِ رسالت میں آپ کی زوجہ حضرت فاطمہ الزہرا اپنے ہاتھوں سے چکی پیٖ اور آٹا گوندھتی تھیں اور حضرت علیؓ خود مشک میں پانی بھر بھر کر لاتے تھے آپ مزدور بھی عار نہیں سمجھتے کئی دفعہ کھجوروں کی اُجرت پر مزدوری کی۔

صحیح بخاری میں ایک واقعہ درج ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے مزدوری پر شخص کے باغ کو رات بھر سینچا صبح کو اس کی مزدوری تھوڑا سا جو ملا۔ جسے لے کر وہ گھر آ حضرت فاطمہ نے اُن میں سے ایک تہائی روٹی پکایا ہی تھا کہ ایک مسکین نے صا حضرت علیؓ نے پکی ہوئی روٹی اسے دے دی حضرت فاطمہؓ نے دوسری روٹی پکائی اتـ ایک یتیم نے آکر سوال کیا، حضرت علیؓ نے یہ روٹی اُسے دے دی، حضرت فاطمہؓ۔ جو پکائی تو ایک قیدی سائل بن کر آ گیا، حضرت علیؓ نے یہ بھی اُس کو دے دیا اور اس طر گھر اُس روز فاقہ سے گزرا۔

اس واقعہ پر احمد الواحدی نے اپنی تفسیر "البسیط" میں اور اسی سے زمخشری، راز نیشاپوری وغیرہم نے نقل کیا ہے کہ متذکرہ بالا واقعہ کے فوراً بعد سورۃ الدھر کی درجہ آیت نازل ہوئی:۔

وَيَطعَمُونَ الطَّعَامَ علی حُبِّه مِسكِيناً وَّ يَتِيماً وَّ اَسِيراً (اور اللہ کی محـ مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)

حضرت ت علیؓ کی ذات بابرکات میں الفقر فخری کے اس سماں کی وجہ صرف کرامت تھی۔ حضرت ابو طالب کی کثیر العیالی اور تنگدستی کو دیکھ کر حضور ﷺ اُ ہلکا کرنے کے لئے حضرت علیؓ کو چار پانچ برس کی عمر ہی سے اپنے دامن اقدس۔ کر لیا اس طرح حضرت علیؓ نے آغوش نبوت میں پرورش وتربیت پائی۔

ایک صاحب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ مجھے آپ سے محبت ہے "حضور ﷺ نے فرمایا: دیکھ کیا کہتا ہے" اُنہوں نے پھر یہی عرض کیا کہ: "مجھے آپ سے محبت ہے" حضور ﷺ نے پھر یہی ارشاد فرمایا جب تین مرتبہ سوال وجواب ہوا تو حضور ﷺ نے فرمایا:

"اگر اتم اپنی بات میں سچے ہو تو فقر کو اوڑھنے بچھانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس لئے کہ مجھ سے محبت رکھنے والوں کی طرف فقر ایسے زور سے دوڑتا ہے جیسا کہ پانی اونچان سے دوڑتا ہے۔ (حکایتِ صحابہ)

ظاہر ہے کہ جب مکتب فقر کا رہا ہو تو حضرت علیؓ کی سیرت و کردار میں اس کی انمٹ چھاپ پڑنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حضرت علیؓ کی شانِ فقر پر اقبال نے "بالِ جبریل" کی غزل ۳۴ کے درج ذیل شعر میں یہ خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

اقبال حضرت علیؓ کی اس شانِ فقر کو ہر مسلمان کی زندگی میں دیکھنا چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی ہر تصنیف میں حضرت علیؓ کو بطور آئیڈیل (نصب العین پیش کیا ہے اس فقر پر چند اشعار یہ ہیں: حیدری فقر ہے،

حیدری فقر ہے نے، دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے

(بانگِ درا جواب شکوہ بیسواں بند)

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنانہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدری

(بانگِ درا "میں اور تو" بعد از نظم "شیکسپیئر")

خدا نے اُس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی ۔
کہ اُس کے فقر میں ہے حیدری و کراری

(ضرب کلیم "محراب گل افغان کے افکار" ۱۰)

اقبال کے یہاں فقیری ایک علم ہے جس حقیقت کا شاہد ہر شخص کا ضمیر ہے "ضرب کلیم

کی نظم "محراب گل افغان کے افکار کے پندرہویں بند میں کہتے ہیں ۔

آدم کا ضمیر اس کی حقیت پہ ہے شاہد
مشکل نہیں اے سالکِ رہ علم فقیری

اس کا جواز اقبال نیدرج ذیل آیات سے فراہم کیا ہے:۔

لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفساً اِلا وُسعَھَا لَا نُکَلِّفُ نفساً اِلا وُسعھا (اللہ کسی تنفس پر اُس مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا) (البقر ۲۸۶) ہم ہر شخص پر ذمہ داری اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اُس کے امکان میں ہے) (الانعام، ۱۵۲)

(اور ہم کسی شخص کو اس کو مقدرت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) (المومنون، ۶۲)

اقبال نے اپنے "مردِ فقیر" میں بوئے اسد اللّٰہی کا پایا جانا ضروری قرار دیا ہے "اسد اللہ کے معنیٰ اللہ کے شیر کے ہیں جو حضرت علیؓ کا لقب تھا "بوئے اسد اللّٰہی" رمز ہے اُس جذ کا جو صفات عالیہ سے اپنے آپ کو متصف کرنے کے لئے دل میں پایا جاتا ہے۔ یہی انـ سعی کا منتہائے مقصود ہے اس پر تزکیۂ نفس سے متعلق تمام اعمال مرتکز ہیں یا ہونے چاہئیں اسد اللّٰہی کی اصطلاح میں ایک طرح کی منقلب شبیہ کی طرف اشارہ پوشیدہ ہے۔

"اسد اللّٰہی" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں باقی دو اشعار یہ ہیں

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی، وہی مرحبی وہی عنتری

("بانگ درا" میں اور تو" بعد از نظم "شیکسپیڑا")

نہ خدا رہا نہ صنم رہے، نہ رقیبِ دیر و حرم رہے
نہ رہی کہیں اسد اللّٰہی، نہ کہیں ابو لہبی رہی

("بانگ درا" غزلیات حصہ سوئم ساتویں غزل)

نوٹ: خیبر (۷ھ) میں مرحب یہودیوں کے قلعہ کا سردار تھا جسے حضرت علیؓ اس جنگ میں قتل کر دیا اور اس طرح مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ عنتر مرحب کا تھائی اور وہ بھی قتل کیا گیا۔

چوتھی قسط حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ تحریر فرماتے ہیں

ائمہ کی تقلید پر امت کا متفق ہو جانا خداداد مقبولیت ہے

از: مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوری

امت محمدیہ کے علماء اور صلحاء مفسرین اور محدثین کا ائمہ اربعہ کی تقلید پر متفق ہو جانا کوئی امر عقلی نہیں اور نہ کوئی امر کسبی ہے کہ جس کو کسی سعی اور جد جہد کا نتیجہ کہا جائے بلکہ محض فضل خداوندی اور مشیت ربانی ہے اسی نے اپنی قدرت اور حکمت سے فقہاء اور مجتہدین کو پیدا کیا ہے اور اسی کو مشیت سے ان کے مذاہب پھیلے اور لوگوں نے ان کی تقلید کی پھر اسی کی مشیت اور حکمت اس کی مقتضی ہوئی کہ ائمہ کو اپنے فضل اور قبول سے سرفراز فرمائے اور تمام امت انہی حضرات کی رہنمائی سے خدا تک پہنچے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ تمام مذاہب دنیا سے معدوم ہو گئے اور صرف ائمہ اربعہ کے مذاہب باقی رہ گئے۔ حق جل و علیٰ نے تکوینی طور پر محدثین اور مفسرین اور اولیاء اور عارفین کے قلوب میں یہ القاء فرمایا کہ تم ہمارے ان چار مقبول بندوں میں سے کسی کا اتباع کرو یہ القاء ہونا تھا کہ امت کے عوام اور خواص کے قلوب سمٹ کر ائمہ اربعہ پر جمع ہو گئے اور دن بدن ان کا شیوع (پھیلاؤ) اور قبول ہوتا رہا یہاں تک کہ ان کے اصول و فروع منضبط ہو گئے اور روئے زمین کے تمام اہل سنت والجماعت انہی ائمہ اربعہ کے تقلید کے دائرہ میں منحصر ہو گئے اور اہل علم نے یہ اعلان کر دیا کہ جو شخص ائمہ اربعہ کی تقلید سے خروج کرے وہ اہل بدعت سے ہے اہل سنت سے نہیں۔ جس طرح تمام امت کا صحاح ستہ پر متفق ہو جانا کسی سعی اور جد و جہد کا نتیجہ نہیں بلکہ خداداد مقبولیت کا نتیجہ ہے اسی طرح تمام امت کا ائمہ اربعہ کی تقلید پر متفق ہو جانا خداداد مقبولیت کا ثمرہ ہے۔

لہٰذا یہ سوال کرنا کہ تقلید انہی چار میں کیوں منحصر ہوئی ایسا ہی ہے کہ خلافت راشدہ خلفاء

اربعہ میں کیوں منحصر ہوئی۔ اور ملائکہ مقربین چار ہی میں کیوں منحصر ہیں؟ جواب یہ ہے کہ یہ محض فضل ربانی اور قبول یزدانی ہے اس میں کسی توجیہ اور دلیل کی گنجائش نہیں۔ ماشاء الله كان وما لا يشاء لا يكون (ص ١٠٤ ١٠٥)

محبوب سبحانی قطب ربانی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے نام نامی سے سب واقف ہیں علم اور ولایت کے انتہائی اعلیٰ مقام پر فائز تھے مگر اس کے باوجود مقلد اور حنبلی تھے۔ اور ا احمد رحمہ اللہ کے مذہب پر موت آنے اور حشر میں ان کے ساتھ ہونے کی تمنا اور فرماتے ہیں۔ آپ کی مشہور کتاب "غنیۃ الطالبین" میں ہے۔ قال الامام ابو عبد ا احمد بن محمد بن حنبل الشيبانیؒ واما تنا علىٰ مذهبه اصلاً وفرعاً وحشرنا زمرته(غنية الطالبين ص ٦٠٥ باب في الصلوٰة الخمس، فصل وينبغي للماموم)

حضرت غوث پاک رحمہ اللہ تو تقلید پر قائم رہنے کی دعا فرمادیں اور غیر مقلدین تقلیہ حرام اور کفر و شرک کہیں۔ ؎

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اور اس کے باوجود خود کو "سلفی" کہیں۔ جب کہ سلفِ صالحین سے کوئی تعلق نہیں۔ کی شان میں ناروا الفاظ کہیں تقلید کرنے کی وجہ سے ان کی تغلیط اور ان کی توہین کریں قراء خلف الامام نہ کرنے کی وجہ سے ان کی نماز کو باطل سمجھیں اور پھر بھی سلفی کہلائیں۔ یہ ن برعکس نام نہند زنگی کافور۔ کا مصداق ہے۔

یہی حال ان کا خود کو "اہل حدیث" کہنے کا ہے۔ جس طرح "منکرین حدیث" حدیث کا انکار کر کے اپنا نام "اہل قرآن" رکھنا صحیح نہیں، اسی طرح تقلید شرعی کا انکار کر خود کو "اہل حدیث" کہنا بھی صحیح نہیں۔

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ جن کا علمی مقام اور حدیث مد کا جو درجہ ہے اس کا اعتراف خود غیر مقلدین کو بھی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ مقلد اور حنفی ہیں۔ اپنے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

واسفدت منه صلى الله عليه وسلم ثلثة امور خلاف ما كان ی۔ وماكانت طبعي تميل اليه اشدّ ميل فصارت هذه الاستفاد براہين الحق تعالىٰ علىّ الى قوله وثانيهما الوصاة با لتقليد

المذہب الاربعة لا اخرج منہا الخ

ترجمہ: مجھے حضور ﷺ کی جانب سے ایسی تین باتیں حاصل ہوئیں جن کی طرف میری طبیعت مائل نہ تھی اور اس طرف بالکل قلبی میلان نہ تھا یہ استفادہ میرے اوپر برہان حق ہوگیا ان تین باتوں میں دوسری بات یہ تھی حضور اقدس ﷺ نے مجھے وصیت فرمائی کہ میں مذاہب اربعہ کی تقلید کروں اور ان سے باہر نہ نکلوں۔ (فیوض الحرمین ص ۶۴ ص ۶۵ مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند)

مذکورہ عبارت میں غور فرمائیں اور غیر مقلدوں کو چاہئے کہ اس سے عبرت حاصل کریں۔ اس عبارت سے دو باتیں ثابت ہوری ہیں (۱) نفس تقلید کی وصیت (۲) اور تقلید کا مذاہب اربعہ میں منحصر اور محدود ہونا۔ اس عبارت میں ائمہ اربعہ کے مقلدین کے لئے بشارت عظمیٰ اور غیر مقلدوں کے لئے عبرت ہے۔

نیز تحریر فرماتے ہیں:

وعرّفنی رسول الله ﷺ لم ان فی المذهب الحنفی طريقة انيقة هی اوفق الطريق بالسنة المعروف التی جُمعت ونُقحت فی زمان البخاری واصحابه.

ترجمہ: حضور اقدس ﷺ نے مجھے بتایا کہ مذہب حنفی میں ایک ایسا عمدہ طریقہ ہے جو دوسرے طریقوں کی بہ نسبت اس سنت مشہورہ کے زیادہ موافق ہے جس کی تدوین اور تنقیح امام بخاریؒ اور ان کے اصحاب کے زمانہ میں ہوئی۔ (فیوض الحرمین ۴۸ کتب خانہ رحیمہ دیوبند)

ان دونوں عبارتوں کو بغور ملاحظہ فرمائیں! اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے شاہ ولی اللہؒ جیسے محدث جلیل کو تقلید پر مامور کیا جارہا ہے اور بتلایا جارہا ہے کہ مذہب حنفی سنت کے زیادہ موافق ہے۔ حضور ﷺ کی طرف سے حضرت شاہ صاحب کو تقلید پر مامور کیا گیا اور آپ نے محدث اور مجتہد ہونے کے باوجود اس پر عمل فرمایا اور مذہب حنفی کو اختیار فرمایا اور آخر تک حنفی رہے۔

فتاوی محمودیہ میں ہے (حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی) ۱۱۷۶ھ میں وفات ہے اسی ۱۱۷۶ھ میں اخیر مرتبہ بخاری شریف پڑھائی ہے اور مولوی چراغ صاحب کیلئے سند اپنے قلم سے لکھی ہے جو کہ بخاری شریف کے ساتھ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے اس میں اپنے نام کے ساتھ حنفی لکھا ہے۔ رفیع الدین صاحبؒ کی تصدیق ہے کہ یہ میرے والد کی تحریر فرمودہ ہے نیز شاہ عالم کی مہر بھی اس تصدیق پر موجو ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر تک حنفی رہے۔ الخ

(فتاوی محمودیہ ص ۳۸۸ ج اول)

غیرمقلدین اشکال کرتے ہیں کہ یہ توخواب ہے اورخواب حجۃ شرعیہ نہیں ہے اس کا سید
جواب یہ ہے کہ تقلید کے ثبوت کادارومدار صرف اس خواب پرنہیں ہے بلکہ تقلید کا ثبوت مستند
دلائل سے ہے جن میں سے کچھ دلائل آپ گذشتہ صفحات میں ملاحظہ فرماچکے ہیں۔ مگر
بھی ملحوظ رہے کہ مذکورہ خواب کوئی معمولی چیز نہیں ہے خواب دیکھنے والے عالم ربانی محدر
کبیر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جیسی عظیم شخصیت ہے اور جس ذات اقدس کی خوار
میں زیارت کی ہے اور جن کی طرف سے تقلید اختیار کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے وہ س
المرسلین محبوب ربِ العٰلمین حضور اقدس ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ اور حدیث میں ہے:

(۱) عن ابی هریرة رضی الله عنه قال من رانی فی المنام فقد رانی. ف
الشیطان لا یتمثل فی صورتی . متفق علیه.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔
روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا تحقیق کہ ا
نے مجھے ہی دیکھا پس بے شک شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا۔
(مشکوٰۃ شریف ص ۳۹۴ کتاب الرؤیا) بخاری شریف ص ۱۰۳۵ ج ۲)

(۲) عن ابی قتادة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من رانی فا
رأی الحق . متفق علیه .

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ۔
ارشاد فرمایا جس نے مجھے خواب میں دیکھا پس تحقیق کہ اس نے حق دیکھا (یعنی بالکل سچا اور صحیح دیکھ
(مشکوٰۃ شریف ص ۳۹۴ بخاری ص ۱۰۳۶ ج ۲)

ان دو حدیثوں کے پیش نظر اس خواب کے سچا ہونے میں کیا شک ہے لہذا خواب
کر لوگوں کو شبہ میں نہیں ڈالا جا سکتا ہے۔

غیرمقلدین شیخ عبدالوہاب نجدی کے ہم مسلک وہم عقیدہ سمجھے جاتے ہیں لیکن شیخ ع
الوہاب مقلد ہیں اپنے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

فنحن و لله الحمد متبعون لا مبتدعون علی مذهب الامام احمد
حنبل (محمدبن عبدالوهاب للعلامه احمد عبد الغفورعطار، ط
بیروت ص ۴۷ اص ۱۷۵)

ہم لوگ الحمدللہ ائمہ سلف کے متبع ہیں، کوئی نیا طریقہ اور بدعت ایجاد کرنے والے نہیں ہیں اور ہم امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب پر ہیں۔

ایک دوسرے مکتوب مین تحریر فرماتے ہیں: انی ولله الحمدمتبع ولست بمبتدع عقیدتی ودینی الذی ادین لله به الخ: میں الحمدللہ (ائمہ سلف کا) متبع ہوں مبتدع نہیں ہوں میرا عقیدہ اور میرا دین جو میں اللہ کے دین کی حیثیت سے اختیار کئے ہوئے ہوں وہ اہل سنت والجماعت کا وہی مسلک اور طریقہ ہے جوامت کے ائمہ اربعہ اوران کے متبعین کامسلک اور طریقہ ہے۔ (محمد بن عبدالوہاب ص۱۷۵)

ان کے صاحبزادے شیخ عبداللہ اپنے ایک رسالہ میں اپنے اور اپنے والد کے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اصول دین (ایمانیات واعتقادات) میں ہمارا مسلک اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے اور ہمارا طریقہ ائمہ سلف کا طریقہ ہے۔ اور فروع میں یعنی فقہی مسائل میں ہم امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مذہب پر ہیں اور جو کوئی ائمہ اربعہ میں سے کسی کی بھی تقلید کرے ہم اس پر نکیر نہیں کرتے" (الهديه السنية ص ۳۸ ص ۳۹ عربی)

مندرجہ بالا حوالجات حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ کی ایک تصنیف بنام "شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ سے اخذ کئے گئے ہیں:

حاصل کلام! مندرجہ بالا گذارشات سے ثابت ہو رہا ہے کہ امت کے محدثین مفسرین، علماء، صلحاء، اولیا، اورمشائخ تقلید ائمہ پر متفق ہیں۔ اوران سب کا تقلید ائمہ پر متفق اور مجتمع ہو جانا تقلید کے برحق ہونے کی نہایت مضبوط سند اور دلیل ہے۔ حدیث میں ہے۔

عن ابن عمر قال قال رسول اللهﷺ انّ الله لا يجمع امتی اوقال امة محمد على ضلالة ويد الله على الجماعة ومن شذ شُذ في النار (رواہ الترمذی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ میری امت کو۔ یا یہ ارشاد فرمایا محمد ﷺ کی امت کو ضلالت (گمراہی) پر اکٹھا نہیں کریگا۔ اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے (یعنی اس کی مدد شامل حال ہوتی ہے) اور جو جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم میں تنہا ڈالا جائے گا۔ (مشکوۃ شریف ص ۳۰ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

(۲) لن تجتمع امتیّ على الضلالة مشهور المتن ذواسانيد كثير ة وشوا

هذ متعدد فى المرفوع وغيره (المقاصد الحسنة ص ٤٦٠)

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ میری امت (کے علماء وصلحاء) کبھی بھی گمراہی متفق نہیں ہونگے۔

(۳) عن ابی ذر قال قال رسول ﷺ من فارق الجماعة شبراً فقد خا رِبقَةَ الاسلام من عُنقِهِ (روہ احمد وابو داؤد)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فر جس نے ایک بالشت کے برابر بھی جماعت سے علحدگی اختیار کی تو تحقیق کہ اس نے ا گردن سے اسلام کی رسی نکال ڈالی (مشکوۃ شریف ص۳۱)

مفسر قرآن حضرت علامہ ابو محمد عبدالحق حقانی دہلویؒ اپنی مشہور کتاب "عقائد الاسلا میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"جس مسئلہ میں امت متفق ہو وہ حق ہے اور ان کا مخالف مردود ہے:

ترمذی نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے لا تجتمع امة محمدٍ اللهِ على الضلا کہ محمد ﷺ کی امت گمراہی پر متفق نہ ہوگی۔ ويَد الله على الجماعة ومن شذ شُذ ا النار (رواه الترمذى) کہ اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور جو شخص جماعت سے نکلا اکیلا ج میں گیا۔ واتّبعوا السّواد الاعظم (رواہ ابن ماجہ) کہ تابعداری کرو بڑے گروہ کی۔ یہ میری امت میں جس مسئلہ میں بہت سے لوگ ایک طرف ہوں اس کی پیروی کرو کیو جماعت کثیر گمراہ نہ ہوگی کیونکہ للاکثر حکم الکل پس اگر گمراہ ہوں تو غالباً سب گمراہ کہلاو اور سب کا گمراہ ہونا باطل ہے کیونکہ اگر تمام امت گمراہ ہو تو قرآن کی تکذیب لازم آو۔ اور امت وسط اور خیر ہونا غلط ہو جاوے پس یہ محال ہے تو امت کا گمراہ ہونا بھی محال۔ اور بہت سی احادیث صحیحہ اس باب میں وارد ہیں۔ (عقائد الاسلام ص۸۵ باب افصل۵)

ان معروضات کے بعد "الدين النصيحة" (دین خیر خواہی کا نام ہے) کے پیش ن تمام اہل ایمان خاص کر غیر مقلدین سے یہی عرض ہے کہ تمام لوگ اسی راہ کو اختیار کر جس کو امت کے جمہور محدثین، مفسرین، علماء، صلحاء، عارفین اور مشائخ طریقت۔ اختیار کیا ہے۔ اور جمہور امت اور سواد اعظم سے خود کو وابستہ رکھیں، صحابہ کرام رضو اللہ علیہم اجمعین اور اسلاف عظام رحمہم اللہ سے حسن ظن رکھیں اسی میں انشاء اللہ ایمان اور ا

کی سلامتی ہے اور ضلالت و گمراہی سے حفاظت ہے ورنہ غیر مقلدیت اور لامذہبیت سراسر گمراہی اور ضلالت ہے۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ "غیر مقلدیت گمراہی کا پہلا زینہ ہے" اور خود غیر مقلدوں کے پیشوا مولانا محمد حسین بٹالوی نے برسوں کے تجربہ کے بعد تحریر کیا ہے:

"پچیس برس کے تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ بالآخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں۔ ان میں سے بعض عیسائی ہو جاتے ہیں اور بعض لامذہب، جو کسی دین و مذہب کے پابند نہیں رہتے اور احکام شریعت سے فسق و خروج تو اس آزادی (غیر مقلدیت) کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ان فاسقوں میں بعض تو کھلم کھلا جمعہ، جماعت اور نماز روزہ چھوڑ بیٹھتے ہیں، سود، شراب سے پرہیز نہیں کرتے، اور بعض جو کسی مصلحت دنیاوی کے باعث فسق ظاہری سے بچتے ہیں اور فسق خفی میں سرگرم رہتے ہیں ناجائز طور پر عورتوں کو نکاح میں پھنسا لیتے ہیں۔ کفر و ارتداد اور فسق کے بہت اسباب دنیا میں اور بھی بکثرت موجود ہیں مگر دینداروں کے بے دین ہو جانے کا بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ وہ کم علمی کے باوجود تقلید چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

(اشاعۃ السنۃ ص ۵۳ جلد ۱۱ عدد ۲ بحوالہ سبیل الرشاد ۱۲ تقلید ائمہ ص ۱۶ ص ۱۷)

اللہ پاک ہر ایک کو حق قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، ایمان اور اعمال پر استقامت اور اسی پر حسن خاتمہ نصیب فرمائیں اللھم آمین بحرمۃ النبی الامی ﷺ والہ وصحبہ وسلم۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

نوٹ: اس جواب میں حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کے ایک رسالے سے بھی (جس کا نام ابتدائی صفحات پھٹ جانے کی وجہ سے معلوم نہ ہو سکا) استفادہ کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو جزائے خیر عطاء فرمائیں اور ان کی تمام تصانیف کو مفید و نافع بنائیں آمین۔

از : حافظ شفیع الرحمٰن قاسمی

جب ہم خالق کائنات کی اس کائنات پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے ذہن کے دریچوں میں چند سولات انگڑائیاں لیتے ہیں کیونکہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہر صبح آفتاب مشرق سے طلوع ہوتاہے اور پورے عالم کو اپنی ضیاپاش کرنوں سے منور کرتا ہوا دن بھر کا طویل سفر کر کے شام کو مغرب کی وادیوں میں غروب ہو جاتا ہے کسی روز پچھم سے کیوں نہیں نکلتا؟

سورج کے ڈوبنے کے چند لمحے کے بعد چاند نکلتا ہے اور دار فانی کی ہر شے کو اپنی چاندنی میں نہلا کر اسکے حسن کو دوبالا کرتا ہے کبھی یہ چاند دن میں کیوں نہیں نکلتا؟

جب ہماری نظر آسمان کی جانب اٹھتی ہے تو حیرت واستعجاب کے ساتھ یہ سوال پید ہوتا ہے کہ جب کوئی چھت بغیر ستون کے برقرار نہیں رہ سکتی تو پھر اتنی وسیع و عریض چھت بغیر عماد وستون کے کیسے اور کس نے بنائی؟

جب انسان ایک ننھا سا پودا زمین کے حوالے کرتا ہے تو وہ بتدریج ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے آخر اس پودے میں نمو کی صلاحیت کون پیدا کرتا ہے؟

یہ زمین و آسمان، یہ چاند و سورج، یہ چمکتے ہوئے ستارے، یہ بہتے ہوئے سمندر، بھاری بھر کم پہاڑ، یہ اشجار واحجار، یہ حیوانات ونباتات، یہ عالم فانی اور اس میں انسان، او انسان کے آرام وراحت کی تمام چیزیں یہ سب آخر کس نے بنائی ہے؟

اس کا کوئی ضرور موجد ہوگا کیونکہ جس طرح شجر کے بغیر ثمر، معمار کے بغیر تعمیر وجود ناممکن ہے اسی طرح خالق کے بغیر مخلوق، صانع کے بغیر مصنوع کا وجود ناممکن ہے یقیہ کوئی ذات ہے جس نے اسے وجود بخشا وہ کون ہے اس تلاش و جستجو میں سرگرداں رہ کر جب ہم نے تاریخ کے بحر عمیق میں غواصی کی تو ہمیں محمد عربی ﷺ کی شکل میں خاتم الانبیاء

اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے توسط سے افضل الانبیاء پر نازل شدہ قرآن کریم ملا جو خالق کائنات کا پیغام نیز اقوام عالم کے لئے راہ ہدایت اور ضابطہ حیات ہے جب ہم نے قرآن کریم سے استفسار کیا کہ وہ ذات جس نے دنیا کی تخلیق کی وہ کون ہے؟ تو قرآن کریم کے ساتویں پارہ سورۂ انعام کی پہلی آیت اس طرح گویا ہوئی۔ الحمد لله الذی خلق السمٰوٰت والأرض وجعل الظلمٰت والنور ثم الذين كفروا بربهم يعدلون

ترجمہ۔ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے پیدا کئے آسمان اور زمین اور بنایا اندھیرا اور اجالا پھر بھی یہ کافر اپنے رب کے ساتھ اوروں کو برابر کئے دیتے ہیں۔

جب قطعی طور پر اس بات کا علم ہو گیا کہ دنیا و مافیہا کا خالق و مالک اللہ ہے تو پھر ذہن نے پوچھا کہ اللہ کیسا ہے تو قرآن کریم کی سورۂ نور کی آیت نمبر ۳۵ نے ہمیں بتایا:

الله نورالسّمٰوٰت والأرض مثل نوره كمشكٰوةٍ فيها مصباح المصبَاح فى زُجاجةِ الزُّجاجةُ كَأنّها كَوكب دُرّيٌّ يُو قد من شجرة مُباركةٍ زيتونة لاّشرقيّةٍ وّلاَغربيّةِ يكادزيتها يضئ ولو لم تمسسه نار نور على يهدى الله لنوره من يشاء ويضرب الله الأمثال للناس والله بكل شئ عليهم

ترجمہ: اللہ روشنی ہے آسمانوں کی اور زمین کی مثال اسکی روشنی کی جیسے ایک چراغ دان اس میں ہو ایک چراغ وہ چراغ دھرا ہوا ہو ایک شیشہ میں اور وہ شیشہ جیسے ایک تارہ چمکتا ہوا تیل جلتا ہے اس میں ایک برکت کے درخت کا وہ زیتون ہے نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف قریب ہے اس کا تیل روشن ہو جائے اگرچہ نہ لگی ہو اس میں آگ روشنی پر روشنی اللہ راہ دکھلاتا ہے اپنی روشنی کی جس کو چاہے اور بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ آسمان و زمین میں پھیلا ہوا ایک نور ہے وہ مجسم سے منزہ ہے اور وہی نظام عالم چلا رہا ہے پھر ذہن میں خلفشار پیدا ہوا کہ جب کسی بھی نظام مملکت کو چلانے کے لئے بادشاہ، وزراء اور اراکین کا وجود لازم ہے تو اتنی بڑی بادشاہت کا نظام صرف ایک ذات کیسے چلا سکتی ہے؟

یقیناً ایک پارلیمنٹ ہوگی جہاں قانون سازی ہوتی ہے ایک بادشاہ ہوگا جو سپر پاور ہوگا اور اس کے وزراء و اراکین بھی ہوں گے کوئی محکمہ برسات کا وزیر ہوگا کہ کہاں پر کس

وقت کتنی بارش ہونی چاہئے، کوئی موسم گرما کا وزیر ہوگا کہ کہاں پر کتنی گرمی پڑنی چاہئے کوئی موسم سرما کا وزیر ہوگا کہ کہاں پر کتنی ٹھنڈک ہونی چاہئے، کوئی وزیر خزانہ ہوگا کہ کس کو کتنی روزی ملنی چاہئے مگر اس سلسلے میں جب ہم نے قرآن کریم سے رابطہ قائم کیا تو ہمیں مایوسی ہوئی کیونکہ ان سب کی نفی کرتے ہوئے سورۂ اخلاص کی پہلی آیت نے کہا قل هوالله أحد کہ جب لوگ آپ سے اللہ کی نسبت سوال کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ایک ہے پھر ذہن نے پوچھا آخر کیوں؟

تو اس سلسلے میں قرآن کریم کی سورۂ انبیا آیت نمبر ۲۲ نے کہا **لو كان فيهما آلهة الاالله لفسدتا فسبحٰن الله رب العرش عما يصفون**

ترجمہ: اگر ہوتے ان دونوں میں اور معبود سوائے اللہ کے تو دونوں خراب ہو جا۔ اس آیت کریمہ نے ہمیں سمجھایا کہ اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا چند معبود ہوتے نظام عالم درہم برہم ہو جاتا کیونکہ جب دو خدا ہوتے تو طاقت وقدرت کے اعتبار۔ دونوں برابر ہوتے پھر کبھی دونوں میں اختلاف بھی ہو جاتا ایک خدا کہتا کہ ستارے را، میں نکلیں گے دوسرا خدا کہتا کہ نہیں بلکہ ستارے دن میں نکلیں گے، ایک خدا کہتا اس وق بارش ہوگی تو دوسرا خدا کہتا ہرگز نہیں بلکہ اس وقت دھوپ نکلے گی تو دونوں میں تصا ہوتا نتیجتاً عالم کا پورا نظام بحران کا شکار ہو جاتا اس لئے ہمیں قرآن کریم کے اس پیغا قبول ہی کرنا پڑا کہ اللہ ایک ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے اور اس نے دنیا اور اس کی ت چیزوں کو وجود دے کر ایک معین مدت تک کیلئے ایک اصول کے تحت مسخر کر رکھا ہے انسان کو اپنی اس روئے زمین پر حکمرانی کرنے کے لئے اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا تا کہ انسان کے قوانین و ضوابط کو روئے زمین پر بود و باش رکھنے والے تمام افراد پر نافذ کرے تا کہ کے بندے راحت و آرام، چین و سکون کے ساتھ اپنی معین مدت حیات اللہ کی عبادت اس کے مخلوق کی خدمت کرتے ہوئے بسر کر سکیں۔

اسلام کا معاشی نظام

از: اعجاز ارشد مدھوبنی

بلاشبہ اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری دین، ہر زمانے کی ضروریات کو پورا کرنے والا، اس کے تغیرات وانقلابات کے مقابلے کی صلاحیت رکھنے والا، ہر بدلے ہوئے زمانہ میں نہ صرف امت مسلمہ بلکہ نسل انسانی کی رہنمائی کی نہ صرف قابلیت رکھنے والا، بلکہ نئے نئے مسائل و مشکلات اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے والا، اور امت کو اپنے دائمی اصولوں اور ہدایات ربانی پر قائم رکھنے کی طاقت عطا کرنے والا ایک مکمل نظام حیات ہے جس کا ایک اہم شعبہ معیشت واقتصاد بھی ہے لیکن پورے اسلام کو ایک معاشی نظام کی حیثیت میں متعارف کرانا یا کیپٹیل ازم اور سوشلزم کی طرح ایک معاشی نظام سمجھنا درست نہیں، کیونکہ اسلام اپنی ذات اور اصل میں معاشی نظام نہیں بلکہ ایک مکمل نظام زندگی ہے جس کا ایک چھوٹا سا شعبہ معیشت بھی ہے اس پر اسلام نے اہمیت ضرور دی ہے لیکن مقصد زندگی قرار نہیں دیا ہے جیسا کہ سیکولر معیشتوں میں معیشت کو انسان کی زندگی کا سب سے بڑا بنیادی مسئلہ قرار دیا گیا ہے اور اس بنیاد پر تمام نظام کی تعمیر کی گئی ہے۔

درحقیقت یہ دنیا اسلام کی نظر میں آخری منزل تک پہونچانے کا ایک مرحلہ ہے جو یقیناً اچھی حالت میں گذارنا چاہئے یہی وجہ ہے کہ قرآن میں دنیاوی منافع کو "خیر" اور "فضل" سے تعبیر کیا گیا ہے اور حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

" طلب کسب الحلال فريضه بعد الفريضة " (ضعيف الاسناد) لیکن اپنی جملہ کوششوں، تمام توانائیوں اور پوری جدوجہد کا محور دنیاوی زندگی کی معیشت کو بنانا اسلام کے بنیادی مزاج کے خلاف ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ معیشت فضول چیز ہے بلکہ معیشت بڑی کار آمد چیز ہے بشرطیکہ اس کو اس کی حدود میں استعمال کیا جائے، اور اس کو اپنا بنیادی

مطمحِ نظر اور آخری مقصدِ زندگی قرار نہ دیا جائے۔

اکنامکس (Economics) جس کا ترجمہ عربی میں "اقتصاد" سے کیا جاتا ہے
اکنامکس اور اقتصاد دونوں کے اندر کفایت کا تصور موجود ہے۔ "اکنامکس" کا سب سے
بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی ضروریات اور خواہشات بے شمار ہیں اور اس کی تکمیل کے
وسائل کم اور محدود ہیں اب دونوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنیکی ضرورت پیش آ
جو در حقیقت علم معاشیات کا موضوع ہے اس نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر معیشت کے چا
بنیادی مسائل نکلتے ہیں۔

پہلا مسئلہ "ترجیحات کا تعین ہے" یعنی انسان کے پاس وسائل محدود ہیں اور ضروریات
وخواہشات بے شمار! اب ان تمام اختیارات میں سے کس کو ترجیح دے اس کا نام "ترجیحات
تعین" ہے۔

دوسرا مسئلہ "وسائل کی تخصیص" ہے یعنی ہمارے پاس جو وسائل موجود ہیں ان میں
سے کون سے وسیلے کو کس کام کے لئے کتنی مقدار میں مخصوص کیا جائے۔

تیسرا مسئلہ "آمدنی کی تقسیم" ہے یعنی جب آمدنی شروع ہو تو اس کو معاشرے ا
سوسائٹی میں کس طرح تقسیم کیا جائے۔

چوتھا مسئلہ "ترقی" ہے یعنی معاشی سرگرمیوں میں ترقی کس طرح ہو تا کہ آمدنی
مقدار میں زیادتی ہو اور صنعتی ترقی ہو تا کہ نت نئی ایجادات لوگوں کے لئے سہولت پیدا
کر سکیں۔

یہ چار بنیادی اسباب ہیں جن کا ہر معیشت کو سامنا کرنا پڑتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ آج
کے اس ترقی یافتہ دور میں معاشی نظاموں نے ان اسباب کا حل کس طرح پیش کیا ہے ا
اسلام ان مسائل کو کس طرح حل کرتا ہے۔

ہم اولاً دنیا میں رائج سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کا تذکرہ کرتے ہیں ان دونو
سے مقابلہ کے بعد اسلام کا معاشی نظریہ نکھر کر سامنے آجائے گا۔

سرمایہ دارانہ نظام نے ان چاروں مسائل کو حل کرنے کے لئے جو فلسفہ پیش کیا ہے
یہ ہے کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ کمانے کے لئے آزادانہ چھوڑ دیا جائے جب ہر کسی کو ا
معیشت کی فکر ہو گی اور وہ اپنی جہد و سعی میں آزاد ہو گا تو خود بخود یہ مسئلہ حل ہو جائے گا

وہ اس طرح کہ کائنات کا قدرتی قانون "رسد و طلب" درحقیقت اس بات کا تعین کرتا ہے کہ کیا چیز کس مقدار میں پیدا کی جائے اور وسائل کی تخصیص کس طرح کی جائے اور جب ہر کوئی اپنی منفعت کو بڑھانے میں آزاد ہوگا تو اپنے منافع کی خاطر انتھک کوششیں بھی انہیں چیزوں کو پیدا کرنے میں کریگا جس کی مانگ بازار میں زیادہ ہوگی جس سے ترجیحات کا تعین خود بخود ہو جائے گا کہ کون سی اشیاء کتنی مقدار میں تیار کی جائیں اور وسائل کی تخصیص بھی اس بنیاد پر ہو جائے گی کہ انسان اپنی زمین اور کارخانے کو اس چیز کے پیدا کرنے میں زیادہ استعمال کریگا جس کی مارکیٹ میں طلب زیادہ ہوگی تاکہ زیادہ منافع کما سکے اسی طرح رسد وطلب کے قوانین ہی کے تحت آمدنی کی تقسیم کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور وہ اس طرح کہ مزدور کی طلب جتنی زیادہ ہوگی اس کی اجرت بھی اتنی زیادہ ہوگی اور جتنی اس کی طلب کم ہوگی اس کی اجرت بھی کم ہو جائے گی اسی اصول پر آمدنی کی تقسیم ہوگی۔

ترقی کا مسئلہ بھی اسی بنیاد پر حل ہوگا کہ جب ہر شخص زیادہ سے زیادہ منافع کی فکر کریگا تو وہ منافع کے حصول کے لئے جدید ٹکنالوجی کو بروئے کار لا کر نئی نئی ایجادات سامنے لانے کی جہد مسلسل کرے گا اور اچھی سے اچھی چیزیں پیدا کر کے لوگوں کو اپنی طرف راغب و مائل کرنے کی سعی پیہم کرے گا۔ لہٰذا اگر لوگوں کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لئے آزادانہ چھوڑ دیا جائے تو معیشت کے چاروں بنیادی مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

اشتراکیت نے ان مسائل کو حل کرنے کے لئے اپنا یہ نظریہ پیش کیا کہ پیداوار کے جملہ وسائل کو اجتماعی ملکیت میں لایا جائے جس کی صورت یہ ہو کہ سارے وسائل پیداوار حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں پھر حکومت ان وسائل کی تخصیص اور منصوبہ بندی کریگی کہ کون سی اشیا، کتنی مقدار میں پیدا کی جائیں اور زمین و کارخانوں کو کن چیزوں میں کتنا استعمال کیا جائے اور مزدوروں کو کتنی اجرت دی جائے، گویا چاروں مسائل کا حل حکومت کی منصوبہ بندی اور پلاننگ کے تحت کی جائیگی مذکورہ تفصیل کی روشنی میں دونوں نظریوں کے بنیادی اصولوں میں سرمایادارانہ نظام کا بنیادی اصول انفرادی ملکیت، حکومت کی عدم مداخلت ذاتی منافع کا محرک ہے، اور اشتراکیت کا بنیادی اصول اجتماعی ملکیت و منصوبہ بندی ہے۔

اشتراکیت کی نظام تو طبعی طور پر ایک غیر فطری نظام تھا جس کا طبعی تقاضہ و لازمہ تباہ

کاریوں کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی بہتر نتائج کی اس سے کوئی امید کی جاسکتی ہے چنا
۷۴ سال کے تجربہ کے بعد اس کی زبوں حالی اور تباہ کاری کا دنیا مشاہدہ کر چکی ہے یہی و
ہے کہ اس کا نام لینے والا بھی اب اس کا نام لینے سے شرم محسوس کرتا ہے۔

دراصل تمدن و معیشت میں انسان کو جو چیز اپنی قوت کے ساتھ سعی و عمل کو ابھار
ہے وہ اس کا ذاتی مفاد ہے اور نظام اشتراکیت معاشی کاروبار اور نظام تمدن سے اس کی رو
رواں اور اصلی قوت محرکہ کو نکال دیتی ہے جو نہ صرف معیشت کے لئے تباہ کن بلکہ وسیع
نے پر انسان کی پوری تمدنی زندگی کے لئے مہلک ہے۔ پیداوار کو بڑھانے کے لئے طاقت
استعمال کیا جانا استعداد عمل کو گھٹاتا ہے درجہ کمال کرنے کے لئے جس سعی و جد جہد کی
طور پر ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے مناسب محرک قوت اس نظام میں نہیں پائی ج
اشتراکی نظام زیادہ بڑے جبر کی مثال ہے جو صرف شدید ترین ڈکٹیٹر شپ کے ہاتھوں محف
رہتا ہے کیونکہ عوام کی فطرت اس نظام کے خلاف ہر وقت آمادۂ بغاوت رہتی ہے، روس
اخلاقی پستی، معاشی بد حالی اور ستر بہتر برس میں شکست و ریخت سے بکھر جانا اس بات
گواہی دیتا ہے کہ اشتراکی نظام ایک غیر اخلاقی نظام معیشت ہے۔

جہاں تک سرمایہ دارانہ نظام کا جو بنیادی اصول ہے وہ قرینہ عقل و قیاس ہے اور وہ
''آزاد بازار کا وجود۔'' لیکن مارکیٹ کی آزادگی اس وقت کار آمد ہوتی ہے جب بازار
مسابقت کی فضا ہو، آزاد مقابلہ ہو اور اجارہ داری نہ ہو لیکن جہاں کوئی سامان صرف ایک
دوکان میں ملتا ہو اور یک طرفہ قیمت کا تعین ہو تو رسد و طلب کی قوتیں ختم ہو جاتی
کیونکہ اجارہ داری کے وقت یہ قوتیں کام نہیں دیتیں۔

اور انسان کو جب زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا تو اس سے سر
داری والے نظام اسے سود و قمار سٹے بازی اور ان تمام طریقوں سے نفع کمانا جائز ہو گیا
سے اجتماعی نظام معیشت کی تباہی لازم ہے کیونکہ بسا اوقات اس کھلی چھوٹ کی وجہ
اجارہ داریاں قائم ہو جاتی ہیں جس سے رسد و طلب کا مفلوج ہو کر رہ جانا اور سرمایہ د
نظام کے عملی وجود کا معدوم ہو جانا بالکل ظاہر ہے۔

آج کمپنیاں لاکھوں روپے میں اداکاروں کو خرید کر اڈورٹائز کراتی ہیں ظاہر ہے
ہزاروں ملین روپے کہاں سے حاصل کرے گی؟ غریب عوام سے وصول کریگی جب

کمپنی کا سامان بازار میں آئیگا تو اشتہارات واڈورٹائز میں صرف ہونے والے روپیوں کو قیمت اور لاگت میں شامل کر کے عوام کی جیب سے من مانی طور پر وصول کریگی۔

یہی وجہ ہے کہ نفع کمانے کا کون سا طریقہ معاشرے کے لئے مفید وسود مند اور کون سا طریقہ مضر و مہلک ہوگا اس بات کا کوئی اخلاقی پیمانہ نہیں ہے جس کے نتیجے میں بدعنوانیاں، ناانصافیاں اور نت نئے مظالم آئے دن وجود میں آرہے ہیں۔ اس کے بالمقابل اسلام کی معاشی تعلیمات میں اخلاقی قدو پیمانہ، دینی قانونی اور اخلاقی پابندیوں کی شکل میں موجود ہے۔

یہ ایک مسلم اصول ہے کہ ہر عمل اور نظام کی پشت پر ایک خاص ذہنیت کار فرما ہوتی ہے اس اصول کے پیش نظر جب ہم معاشی نظام پر گہری نظر ڈالتے ہیں اور فکر عمیق سے کام لیکر جانچتے ہیں تو اس کے محرکات ومنشاء یا اس سے متعلق ذہنیت کو صرف دو صورتوں میں محدود پاتے ہیں ایک یہ کہ "معاشی نظام" کو اس لئے قائم کیا جائے کہ اس کے ذریعہ سے زیادہ نفع کمایا جائے اور اس کو لین دین اور سودے کی اسپرٹ میں رکھا جائے "عمل من مزید" کا نعرہ نفع بازی اور فائدہ طلبی کسی حد پر بھی جاکر ختم نہ ہوسکے۔

یہ نظریہ سرمایہ دارانہ نظام کا بانی اور موسس ہے جس کے زیر اثر یہ نظام پھلتا پھولتا ہے یہ صرف ارباب دولت وثروت ہی کو زیادہ بلند کرتا ہے اور باقی تمام انسانی آبادی کو افلاس واحتیاج سے دو چار بناتا ہے یہاں رفع حاجات و تکمیل ضروریات کے محرکات کام نہیں کرتے جو عام رفاہیت کا پیغام لائیں اور خوش حالی کو بحال کریں۔

دوسرے یہ کہ "معاشی نظام" کا محرک اور منشاء نفع بازی نہو بلکہ ضروریات زندگی کی تکمیل اور رفع حاجات ہو اور اس کے منصۂ شہود پر لانے کے لیے صرف یہ ذہنیت کام کر رہی ہو کہ انفرادی واجتماعی احتیاجات کو پورا کیا جائے نہ کہ زیادہ سے زیادہ نفع کو پیش نظر رکھا جائے۔

"معاشی نظام" کی ان دونوں ذہنیتوں میں اسلام ایک ایسے "معاشی نظام" کا بانی اور موسس ہے جس کی بنیاد صرف کائنات انسانی کی رفع حاجات وضروریات اور انفرادی واجتماعی احتیاجات کی تکمیل پر قائم ہے وہ معاشیات کو دولت مندوں کے درمیان رفع حاجات و تکمیل ضروریات کے لئے ایک مفید نفع بخش ذریعہ بنا کر اس کی افادیت کو عام کرنا چاہتا ہے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ارقام فرماتے ہیں۔

"جس معاشی نظام کے کل پرزے اس طرح ڈھالے گئے ہوں اور اس کا نشو و نما اور اسکی ترقی ایسے تربیتی اجزاء پر قائم ہو جو صرف طبیعات ہی تک آکر نہ ٹھہر جائیں بلکہ اخلاقی اور مذہبی محاسن کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے مذہب اور دستور الٰہی کے زیر فرمان عالم وجود میں آئیں اور اس کے محرک فلاح دارین اور سعادت کائنات کے وہ اصول ہوں جن میں معاشیات رفع حاجات اور تکمیل ضروریات کے لئے ہو نہ کہ زیادہ سے زیادہ سودہ بازی اور نفع طلبی کے لئے تو ایسے صالح اور صحیح نظام معاشی کا وجود بلاشبہ دنیا کے لئے پیام رحمت اور دعوت امن و سلامتی ہے۔ (اسلام کا اقتصادی نظام)

اسلامی نظریہ سرمایہ دارانہ نظام کے اس فلسفہ کو تو قبول کرتا ہے کہ معاشی مسائل کا تصفیہ مارکیٹ کی قوتوں کے تحت ہونا چاہئے چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

نحن قسمنا بينهم معيشتهم فی الحيٰوة الدنيا (الآية) مطلب یہ ہے کہ ہم نے فطرت کے ایسے قانون وضع کر دیئے ہیں جس کی روشنی میں انسانوں کے درمیان معیشت کی تقسیم کا عمل خود بخود ہو جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی بہت جامع اور انوکھے انداز میں معیشت کا اصول بیان فرمایا۔ دعو الناس يرزق الله بعضهم من بعض (مسلم شریف) یعنی لوگوں پر بلاوجہ پابندیاں نہ لگاؤ بلکہ آزاد چھوڑ دو کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے رزق عطا فرماتے ہیں۔

بہر حال سرمایہ دارانہ نظام کے اس بنیادی اصول و امتیاز کہ معیشت کو بازار کے رسد و طلب کی قوت پر چھوڑ دیا جاء اسلام تو قبول کرتا ہے لیکن بالکل آزاد چھوڑ دے کہ ایک کی آزادی کو ختم کر دے اور اجارہ دار بن جائے اسے تسلیم نہیں کرتا، لہٰذا اسلام نے اس آزادی پر دینی، اخلاقی اور قانونی تین قسم کی پابندیاں عائد کی ہیں۔

دینی پابندی اسلام میں بہت اہمیت کی حامل ہے یہ اسلامی احکامات کو دوسرے معاشی نظریات سے ممتاز کرتی ہے اور اس کے جملہ نظاموں کے لئے صحیح سمت مقرر کرتی ہے گرچہ اب کیپیٹل ازم (Capitalism) نے اپنے بنیادی نقطہ نظر سے کافی نیچے اتر کر مداخلت شروع کر دی ہے مگر یہ ذاتی عقل اور سیکولر تصورات و نظریات کی بناء پر ہوتی ہے اور اسلام پابندی عائد کرتا ہے کہ تم کماؤ آزادانہ طور پر خوب منافع کماؤ لیکن شریعت میں جواز کا جو دائرہ ہے اس سے تجاوز مت کرو شریعت نے سود، قمار، احتکار، اور سٹہ بازی وغیرہ

کو ممنوع قرار دیا ہے اس لئے تم اسکو ذریعۂ معاش نہ بناؤ ورنہ عنداللہ شدید مواخذہ ہوگا اور دنیا میں بھی ان ممنوعات کے ذریعہ بے شمار معاشی نقصانات اور تباہ کاریاں پیدا ہونگی ۔ جوا وغیرہ تو بہت سی جگہوں پر قانونی طور پر ممنوع ہے لیکن اسے بعض جگہ مہذب شکل دیکر قانونی جواز بھی پیدا کر دیا گیا ہے مگر شریعت مطہرہ نے جوا، سٹہ اور اس قسم کے جملہ ہفوات وخرافات جس سے معیشت میں ناانصافی وناہمواری کا پیدا ہونا لازمی ہے بالکلیہ قرار دیا ہے۔

شریعت میں دولت اور سرمایہ داری کے وہ اصول قطعاً نا قابل تسلیم ہیں جن میں احتکار اور اکتناز کی کوئی صورت بھی نہ بن سکے اور ان سے دولت وکنز پھیلنے اور تقسیم ہونے کی بجائے سمٹ کر خاص حلقوں میں اور مخصوص طبقوں میں محدود ہو جائے اور اس طرح عام انسانی زندگی کو مفلوک الحال بنادے۔

خرید فروخت اور لین دین کے معاملات میں کوئی ایسا معاملہ جائز نہیں ہے جس سے فاسد نظام معیشت بروئے کار آئے یا اس کو کسی قسم کی بھی اعانت پہنچے یا محنت ومعشیت کے لئے جائز جدوجہد بے حقیقت ہو کر رہ جائے اور اس طرح محنت وسرمایہ کے درمیان اعتدال اور توازن باقی نہ رہے اسی لئے اس نے سود کے ہر قسم کے تجارتی کاروبار، قمار کی تمام ظاہری اور خفی اقسام واصناف، احتکار واکتناز کی تمام اشکال اور اسی طرح کے عقود فاسدہ کی دوسری تمام صورتوں کو ناجائز اور مردود قرار دیا ہے اور معاملات کے کسی شعبہ میں بھی فاسد معاشیات کو دخیل اور بروئے کار نہیں آنے دیا اور دوسرے شعبوں کی طرح معاملات کے اس شعبوں میں بھی عدل وانصاف ہی کو اساس وبنیاد قرار دیا۔

اقتصادی نظام کو برباد کرے اور اس کو کھوکھلا بنانے میں بدعنوانیوں کی جس قدر بھی تفصیلات وجزئیات ہو سکتی ہیں۔ وہ صرف دو بنیادوں پر قائم ہیں اسلام نے اپنی اصطلاح میں ان کو دو خصوصی نام سے موسوم کیا ہے (۱) احتکار (۲) اکتناز

احتکار سے مراد یہ ہے کہ دولت سمٹ کر کسی ایک ہی طبقہ محدود ومحصور ہو جائے اور اکتناز کے معنی یہ ہیں کہ دولت کے عظیم الشان خزانے افراد کے پاس جمع نہ ہو جائیں اور ان کے پھیلاؤ اور تقسیم کی کوئی راہ باقی نہ رہے اسلام ان دونوں کی تردید کرتا ہے اس لئے وہ ہر معاشی واقتصادی شعبہ میں ان دونوں کے خلاف قانون سازی کے ذریعہ جہاد کرتا ہے اور ان دونوں ملعون راہوں کو بند کرتا ہے۔

احتکار کا دوسرا جزء "قمار" ہے اس سے مراد وہ عام شکل نہیں ہے جو نقد کے ذریعے کھیلا جائے بلکہ تمام صورتیں اس میں شامل ہیں جو تجارت کے نام سے کی جاتی ہیں لیکن حقیقت میں قمار ہی کی قسمیں کہلاتی ہیں مثلاً "سٹہ" یہ ایک ایسا تجارتی جوا ہے جو ملک کے اقتصادی نظام کو تباہ اور پراگندہ کرتا اور بغیر محنت نفع حاصل کرنے کے لالچ میں کس طرح ہزاروں گھروں کو برباد کرکے چھوڑتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں اس کی بہت سی شکلیں رائج تھیں مثلاً ملامسہ، منابذہ، بیع حصارۃ، وغیرہ اور موجودہ دور ترقی کے مہذب جوئے "لاٹری" اور "ریس" سب اسی قسم کے معاملات میں داخل ہیں، اسلام ان کو میسر، قمار اور جوا قرار دیتا ہے اور اس قسم کے تمام معاملات کو بااصول تجارت کے لئے تباہ کن سمجھتا اور معاشرتی تباہی کا پیش خیمہ یقین کرتا ہے اور ان باتوں کے علاوہ سوسائٹی کے اخلاق اور کیریکٹر کیلئے باعثِ ذلت و رسوائی جانتا ہے کیونکہ یہ معاملات اکثر جنگ و جدل کا باعث بنتے ہیں اور دوسرے کی تباہی میں اپنا فائدہ سمجھنے کی ترغیب دیکر انسانی جوہر کو برباد کرتے ہیں۔

احتکار کی سب سے ملعون قسم "سودی لین دین" ہے جس اقتصادی نظام میں اس کا عمل دخل ہے وہ یکسر تباہ اور برباد ہے یہ کڑوروں انسان کو مفلس اور محتاج بنا کر ایک مخصوص طبقہ میں دولت کو سمیٹتا اور اس کو ان کا واحد اجارہ دار بنا دیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ہی سود پر ہے جس کا لازمی نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے تازہ ترین اطلاعات کے مطابق نظام معیشت کے سب سے بڑے علمبردار امریکا تک کو سودی نظام نے ایسے شدید معاشی مسائل میں مبتلا کر دیا ہے کہ اسکی تمام سائنٹفک اور معاشی ایجادات ان مسائل کے سامنے ناکام ہو رہی ہیں امریکی ماہرین اقتصادیات اور قومی بینکوں کے اہم ذمہ داران امریکا کو سودی نظام معیشت کے بھنور سے نکالنے کیلئے متبادل نظام پر غور کر رہے ہیں۔

(روزنامہ قومی آواز یکم مئی ص۶)

شریعت نے آزاد معیشت پر جو دوسری پابندی عائد کی ہے اسے "اخلاقی پابندی" کہتے ہیں اس لئے کہ بہت سی چیزیں شرعاً حرام تو نہیں ہیں اور نہ ان کا حکم دیا گیا ہے البتہ ان کی ترغیب ضروردی ہے چونکہ انسان کا بنیادی مقصد آخرت کی فلاح و بہبود ہونی چاہئے اسلئے اسلام یہ ترغیب دیتا ہے کہ اگر تم فلاں کام کرو گے تو تمہیں دنیا کے علاوہ آخرت میں بھی

بڑا اجر ملیگا۔
مفتی تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں۔

"اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس سرمایہ کاری کیلئے دوراستے ہیں ایک یہ کہ وہ اپنا سرمایہ کسی جائز تفریحی مگر تجارتی منصوبے میں لگائے جس میں اسے زیادہ آمدنی کی توقع ہے اور دوسرا یہ کہ وہ یہ سرمایہ بے گھر لوگوں کے لئے سستے مکان تعمیر کر کے فروخت کرنے پر صرف کرے جس میں اسے نسبتاً کم منافع کی توقع ہے۔ تو ایک سیکولر ذہنیت کا حامل شخص یقیناً پہلے راستے کو اختیار کرے گا کیونکہ اس میں منافع زیادہ ہے لیکن جس شخص کے دل میں آخرت کی فکر بسی ہوئی ہے وہ اس کے برعکس یہ سوچے گا کہ اگرچہ رہائشی منصوبہ میں مال نفع نسبتاً کم ہے لیکن میں غریب لوگوں کیلئے رہائشی مکان فراہم کر کے اپنے لئے آخرت میں اجر وثواب زیادہ حاصل کر سکتا ہوں اسلئے مجھے تفریحی منصوبے کے بجائے رہائشی منصوبے کو اختیار کرنا چاہیئے۔ (اسلام اور جدید معیشت و تجارت ص ۴۳)

آگے لکھتے ہیں:

یہاں اگرچہ دونوں راستے شرعی اعتبار سے جائز تھے اور ان میں سے کسی پر کوئی ریاستی پابندی بھی عائد نہیں تھی لیکن عقیدۂ آخرت پر مبنی اخلاقی پابندی نے لوگون کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس شخص کے دل میں ایک اندرونی رکاوٹ پیدا کردی جس سے ترجیحات کا بہتر تعین اور وسائل کی بہتر تخصیص عمل میں آئی یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے لیکن اگر واقعتاً اسلام کا عقیدۂ آخرت دل میں پوری طرح جاگزیں اور مستحضر ہو تو وہ فیصلوں کی بہتری میں زبردست کردار ادا کرتا ہے۔

(اسلام اور جدید معیشت و تجارت ص ۴۴)

اسلامی نظام معیشت میں تیسری پابندی "قانونی پابندی" ہے یعنی اگر اسلامی حکومت کسی ضرورت کے پیش نظر کوئی حکم جاری کرے تو وہ تمام انسانوں کے لئے قابلِ احترام ہے اس لئے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر حاکم وقت کسی حلال چیز کے کھانے کو منع کردے تو وہ حلال غذا تمام رعایا کیلئے حرام ہو جائیگی بشرطیکہ یہ احکام مصالح کے پیش نظر جاری ہوں اسی طرح اگر حکومت منصوبہ بندی کے تحت حدود شرعیہ میں رہ کر کسی سرمایہ کاری

سے لوگوں کو منع کر دے تو ایسا اس کو کرنے کا حق حاصل ہے۔

جہاں تک سرمایہ دارانہ نظام میں قانونی پابندی کا تعلق ہے تو یہ پابندیاں انسانی ذہنوں کی کاشت اور پیداوار ہیں اسلام میں اصل امتیاز دینی پابندیوں کا ہے جو "وحی" کے ذریعہ مستفاد ہوتی ہیں اور اب قدیر سے زیادہ انسانوں کے نفع وضرر کو کون سمجھ سکتا ہے۔ در اصل یہی ایک ایسی چیز ہے جس کو اگر انسان سمجھ لے تو ہر قسم کی افراط و تفریط سے محفوظ رہ کر جملہ مظالموں اور ناانصافیوں سے خود بچا سکے گا اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان اپنے دل میں قانونِ الٰہی کی عظمت کو بٹھا کر اس کا پابند بنا لے۔

مراجع

(۱) اسلام کا اقتصادی نظام — مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

(۲) اسلام کے معاشی نظریے — محمد یوسف الدین استاذ جامعہ عثمانیہ

(۳) اسلام اور جدید معیشت و تجارت — مولانا مفتی تقی عثمانی مد ظلہ العالی

(۴) اصلاحی خطبات (ج ۳) — مولانا مفتی تقی عثمانی مد ظلہ العالی

(۵) روزنامہ قومی آواز یکم مئی

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ چیچنیا جغرافیائی، نسلی، تہذیبی اور دینی غرض کسی اعتبار سے بھی روس کا کوئی حصہ نہیں، اسی طرح قوقاز کے دوسرے علاقے جنھیں روس نے بزور طاقت اپنے روسی فیڈریشن میں شامل کر رکھا ہے کسی اعتبار سے بھی اس کا کوئی جزو نہیں، قف قازیا قوقاز جس کو عربی میں قفقاس کہا جاتا ہے اور ایک عام آدمی اسے کوہ قاف کے نام سے جانتا ہے، ایشیا کا حصہ ہے جس میں زمانہ قدیم سے جو اقوام آباد ہیں ان کا روس سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔

مشہور لبنانی مورخ امیر شکیب ارسلان کے قول کے مطابق روسی انقلاب سے پہلے شمالی اور جنوبی قوقاز کا وسیع و عریض علاقہ کرجستھان (جورجیا) داغستان (عربی طاغستان) اور ملک چرکس (عربی شرکس) کے نام سے مسمی تھا لیکن روس نے جس طرح ترکستان (قدیم ماوراء النہر) میں وسطی ایشیا کے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے وہاں ازبکستان، ترکمانستان تاجکستان وغیرہ پانچ ریاستوں کو جنم دیا اسی طرح روسی طاغوت نے قوقاز میں بھی امت مسلمہ کی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے (۱) جارجیا (۲) داغستان (۳) چیچنیا (انگوشیا) (۴) کباردیا (بلکاریا) (۵) کراچای (۶) ادیگا (۷) اوستینیا الشمالیہ اور (۸) اوستینیا جنوبیہ (۹) آذربائیجان (۱۰) ابخازیا (۱۱) ارمینیا کے گیارہ خود مختار اور نیم خود مختار ریاستیں قائم کیں جن میں سے جارجیا اور ارمینیا کے علاوہ باقی تمام ریاستوں میں مسلمان غالب اکثریت میں ہیں اور قدیم زمانہ سے اسلامی تہذیب کے حامل ہیں اس لئے امریکہ کا یہ دعوی کہ چیچنیا اٹھارویں صدی کے وسط سے روس کا ایک حصہ ہے سراسر جھوٹ اور تاریخی حقائق کے ساتھ کھلا مذاق ہے۔ اسلامی تاریخ کے حوالہ سے چیچنیا سے متصل قوقاز کا جنوبی علاقہ (موجودہ جارجیا اور آرمینا) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور

خلافت میں یعنی ۱۸ھ سے ۲۴ھ تک مسلمانوں کے زیر تسلط آچکا تھا صرف یہی نہیں بلکہ چیچنیا سے مشرق میں متصل شمالی قوقاز کا وہ علاقہ جو تقریباً دو سو سال سے داغستان کے نام سے موسوم ہے اس کا مشہور شہر دربند یعنی باب الابواب (عربی) بھی دو جلیل القدر صحابہ حضرت سراقہ بن عمراور حضرت سلمان بن ربیعہ الباہلی رضی اللہ عنہما کی مشترکہ جد جہد سے اسلام کے زیر نگیں آچکا تھا، اسی علاقے میں چیچن بوڑھے، عورتیں اور بچے روسی ظالمانہ حملہ کے بعد پناہ لے رہے ہیں، ابھی تک روسی ظالم حکمراں اس کی حدود بند کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے اور ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی ذلیل وخوار اور خائب وخاسر ہونگے، علاوہ ازیں قوقاز کی فتح میں بعض دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مثلاً عبد الرحمٰن بن ربیعہ بکیر بن عبد اللہ اللیثی حبیب بن مسلمہ، حذیفہ بن اسید کا ذکر بھی عربی تاریخ میں آتا ہے ان میں سے بہت سارے صحابہ رضی اللہ عنہم باب الابوب میں مدفون ہیں یہ قدیم شہر داغستان کے مشرقی حصہ میں بحر خزر (بحر قزوین) کے کنارے آج بھی آباد ہے، اسی وقت سے یہ علاقہ خلافت راشدہ اور پھر اموی خاندان کی خلافت عباسیہ کے زیر تسلط رہا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دور اموی میں ہشام بن عبد الملک کے بھائی مسلمہ بن عبد الملک کے ہاتھوں ۱۰۵ھ میں یہاں مزید فتوحات ہوئیں، ہزاروں عرب خاندان اس علاقے میں آباد ہوئے چنانچہ روسی انقلاب تک وہاں عربی زبان کے آثار نمایاں تھے۔

۷۷۲ھ تک قوقاز کا یہ علاقہ خلافت عباسیہ کے تابع تھا اس کے بعد ۳۲۹ھ تک مشرقی قوقاز میں ایک مسلمان خاندان بنو ساج کی حکومت قائم رہی پھر بزنطینی حکومت کے تعاون سے عیسائیوں نے جارجیا (کرجستھان) پر ۴۱۴ھ میں قبضہ کر لیا لیکن اس صدی کے سلجوقی سلطان الپ ارسلان نے ۴۶۵ھ میں دوبارہ جارجیا کو اسلامی حکومت کے تابع کر اس کے بعد چودھویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ تیمور لنگ کے زیر تسلط آیا جس کا ماسکو حملہ مشہور ہے بعد ازیں یہ علاقہ ترکمان سلطنت کے بانی اوزون حسن کے زیر اثر رہا جس۔ تیمور لنگ کی وفات کے بعد مغربی وسطی ایشیا میں اپنی ایک طاقتور حکومت قائم کی مشرقی قوقاز میں کمیونسٹ بربریت سے پہلے عربی وفارسی بولی جاتی تھی جبکہ مغربی قوقاز میں ترکی زبان دوسری ملکی زبان سمجھی جاتی تھی۔ سولہویں صدی کے اواخر میں روسی طاغوت نے اپنی ظالمانہ طاقت سے بحر خزر (بحر قزوین) کے شمال میں استراخان کی اسلا

حکومت پر قبضہ کے بعد شمالی قوقاز میں مداخلت شروع کردی، سترہویں صدی کا نصف اول اس علاقہ میں روسی پیش قدمی کا زمانہ ہے لیکن روس کو اس پیش قدمی میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی بلکہ بار بار پسپائی کا منہ دیکھنا پڑا اس کے بعد روسیوں نے ۱۶۸۹ء سے لے کر ۱۷۲۵ء تک کے زمانہ میں ایک لاکھ فوج اس شمالی قوقاز پر بڑا حملہ کیا یہی زمانہ ایران اور ترکی کی عثمانی حکومت کے انحطاط کا زمانہ تھا۔ زبردست اور بڑے حملہ سے روس نے ۱۷۲۲ء میں داغستان کے مرکزی شہر دربند پر اور اس کے بعد باکو پر قبضہ کرلیا لیکن زیادہ عرصہ گذرے بغیر ہی نادر شاہ درانی کی دھمکی پر ۱۷۳۵ء میں اسے ان مقبوضہ علاقوں سے دستبردار ہونا پڑا اور روس نے ۱۷۳۹ء میں معاہدہ بلغراد کے تحت شمالی قوقاز کی آزادی تسلیم کرلی۔

بہر حال اس نئی سامراجی بربریت اور عسکری قوت کے مظاہرے نے جہاں قوقاز کے باشندوں میں بحر خزر سے لے کر بحر اسود تک بے چینی پھیلادی وہاں ان میں روسیوں کے مقابلہ کے لئے ایک نئی تحریک جہاد کا آغاز بھی ہوا، اس تحریک جہاد کی تنظیم اور اولین قیادت چیچنیا کے دینی رہنما اور نقشبندی سلسلہ تصوف کے ایک مرشد کامل شیخ منصور رحمہ اللہ کو سونپی گئی چنانچہ ۱۷۸۵ء میں شیخ منصور رحمہ اللہ اس تحریک کے پہلے امام مقرر ہوئے اور ان کی یہ تحریک جہاد تحریک مریدین کے نام سے مشہور ہے، بعد میں یہ تحریک داغستان کے علماء و شیوخ کے حصہ میں آئی۔

قوقاز میں تحریک جہاد یا تحریک مریدین کے پہلے امام شیخ منصورؒ نے ابتدا میں بڑی کامیابیاں حاصل کیں انہوں نے شمالی قوقاز کے وسطی علاقہ (جس میں چیچنیا بھی آتا ہے) میں ولادی قوقاز کے شہر سے لے کر موزوک تک کے سارے روسی قلعے اپنے چھاپوں سے تباہ و برباد کئے پھر جب روس نے ۱۷۸۷ء میں ترکی کے خلاف اعلان جنگ کیا تو انہوں نے ترکوں کے ساتھ روس کے خلاف جنگ میں حصہ لیا لیکن ترکوں کو جب شکست کا سامنا ہو تو روسیوں نے شیخ منصورؒ کو گرفتار کرکے سینٹ پیٹرزبرگ بھیج دیا اور اس مرد مجاہد کا وہیں انتقال ہوا۔

شیخ منصور رحمہ اللہ کے انتقال کے بعد جہادی تحریک ختم نہیں ہوئی بلکہ روز بروز اس میں تیزی آتی رہی اور اسکے بعد مختلف شجاع اور نڈر سپہ سالاروں نے اس تحریک کی قیادت کی چنانچہ شیخ کے انتقال کے بعد عالم دین غازی محمد کو امام و قائد مقرر کیا گیا، ایک عرصہ تک وہ شمالی قوقاز کے دفاع میں روسی درندوں کے ساتھ برسرپیکار رہے ۱۸۳۲ء میں غازی محمد

ایک گوریلا جنگ میں شہید ہوگئے ان کے بعد حمزہ بیگ کی امارت میں مجاہدین روسی طاغوت سے لڑتے رہے بالآخر دو سال کے بعد وہ بھی شہید ہوگئے ان کے بعد تحریک جہاد کی قیادت قوقاز بلکہ پورے عالم اسلام کے ایک عظیم و مشہور مجاہد شیخ شامل کو سونپی گئی شیخ شامل کا طویل جہاد اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

آج بھی امام شاملؒ کا نام شمالی قوقاز میں زندہ ہے اور چیچنیا میں روس کے خلاف حالیہ تحریک جہاد بھی انہیں کی رہین منت ہے۔ شیخ شاملؒ نے فرانس کے خلاف الجزائر میں دس سال تک جہاد کیا روس کے خلاف امام شامل ۳۵ سال تک برسر پیکار رہے اور بیسیوں معرکوں میں روس کو عبرت ناک شکست دی، دس سال مسلسل جہاد کے بعد ۱۸۴۴ء میں ان کو سب سے بڑی فتح حاصل ہوئی جب انہوں نے روسیوں کو شکست سے دوچار کر کے ہزاروں روسیوں کو قید کرلیا، ۳۵ توپیں اور دیگر بے شمار روسی اسلحہ ان کے ہاتھ لگا، اس ذلت آمیز شکست کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے روسی شیطان نے اپنی سینکڑوں گنا بڑی طاقت کا سارا زور شمالی قوقاز پر لگادیا چنانچہ اس وقت شیخ کو اپنے ساتھیوں سمیت مغربی پہاڑی علاقوں کی طرف پسپا ہونا پڑا اور دس سال تک وہ انہیں پہاڑی علاقوں میں لڑتے رہے بالآخر اسلحہ کی کمیابی اور ہزاروں مجاہدین کی شہادت کے بعد ۱۸۵۹ء میں وقتی طور پر ہتھیار ڈالنے پڑے اس کے بعد ۱۸۷۰ء میں شیخ کو اللہ تعالیٰ نے حج کی سعادت عطا فرمائی اور ایک سال بعد ہی مدینے منورہ میں شیخ نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا اس کے بعد یہ تحریک شیخ شامل کے نیک و صالح فرزند شیخ کامل کی امارت میں ۱۸۹۵ء تک جاری رہی اور اس کے بعد بھی کافی عرصہ تک مختلف حالات آتے رہے یہاں تک کہ انور پاشا کے بھائی نوری پاشا کی قیادت میں ایک فوج "قفقاز اسلام اوردہ" یعنی قوقاز کی اسلامی فوج کے نام سے تیار کی گئی اس فوج نے ستمبر ۱۹۱۸ء میں باکو اور دوسرے ماہ دربند کو فتح کرلیا اور روسیوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کردیا ان جنگوں میں مجاہدین روسیوں کے اسلحہ پر قبضہ کرتے تھے یا پھر دست بدست تلواروں اور بندوقوں سے لڑتے تھے اور عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ جہاد کرتی تھیں، اس جنگ آزادی میں داغستان کے مفتی نجم الدین غوتسو اور چیچن قبیلہ کے حاجی اوزون کے نام نمایاں ہیں، چیچن انگش قبائل نے ان معرکوں میں بہادری کے بڑے جوہر دکھائے، ان علماء و مشائخ اور فوجی قائدین میں محمد البلوکانی، سید امین اور درویش محمد

کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۹۲۰ء میں کمیونسٹوں کے ساتھ خون ریز جنگیں ہوئیں جن میں مجاہدین کو ابتدا میں بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں لیکن روس نے لاکھوں کی تعداد میں یہاں فوج جھونک دی اور ۱۹۲۱ء میں ارمینیا، جارجیا اور آذربائجان پر دوبارہ قبضہ کر لیا اب شمالی قوقاز ہر طرف سے محاصرہ میں آگیا، مجاہدین کے ہزاروں افراد شہید ہوگئے، ہتھیار ختم ہوگئے تو مجبوراً اسی سال کے وسط میں ان کی مسلح مدافعت ختم ہو گئی ہزاروں قوقازی اولاً ترکی اور پھر وہاں سے مصر و حجاز ہجرت کر گئے، روسیوں نے شمالی قوقاز کے ممتاز رہنماؤں اور کمانڈروں کو مختلف طریقوں سے قتل کر لیا اس طرح شمالی قوقاز پر کمیونسٹ روس کا تسلط قائم ہو گیا لیکن روس کو معلوم تھا کہ وہ متحدہ قوقاز کو کبھی بھی اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکتا اس لئے اس نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کیا چنانچہ سن ۱۹۲۴ء میں شمالی قوقاز کو چھوٹی چھوٹی نیم خود مختار ریاستوں میں تقسیم کر دیا جن کا ذکر پہلے ہو چکا اس طرح چیچنیا کا بھی ظہور ہوا جہاں آج پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد اپنے وقت کے چنگیز اور ہلاکو خاں یعنی اسٹالن نے چیچنیا کے لاکھوں مسلمانوں کو سائبیریا اور کازاخستان کے برفانی اور صحرائی علاقوں کی طرف جلاوطن کر دیا جہاں وہ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۷ء تک رہے اسٹالن کی موت کے بعد سوویت پریسیڈیم نے اس فیصلہ کو غلط قرار دیتے ہوئے اہل چیچنیا کو وطن واپس آنیکی اجازت دی۔

پیرس میں قیام پذیر ایک روسی پروفیسر الیگزینڈر اپنی کتاب "روس کے مسلمان" میں لکھتا ہے کہ چیچنیا قوقاز میں اسلام کا مضبوط ترین قلعہ ہے یہی وجہ ہے کہ اسٹالن نے وہاں کے باشندگان کو سائبیریا وغیرہ برفانی دور دراز علاقوں میں جلاوطن کرتے ہوئے ان پر بد ترین مظالم ڈھائے، مساجد کو مسمار کر دیا لیکن اس جلاوطنی میں صوفی سلسلوں کے ذریعہ اسلام سے ان کی وابستگی اور زیادہ پختہ ہو گئی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۸ء میں ایک اندازے کے مطابق چیچنیا کے آدھے مسلمان نقشبندی طریقہ تصوف کے حامل پائے گئے صرف یہی نہیں بلکہ ان چیچن مجاہدین مسلمانوں کے اثر سے کازاخستان او کرغیزیا کے مسلمان بھی قادری سلسلہ تصوف سے منسلک ہونے لگے یہ چیچن مسلمانوں کے ایمان کی پختگی کی واضح دلیل ہے، حقیقت یہ ہے کہ خود چیچنیا میں اسلام سترہویں اور

اٹھارویں صدی عیسوی میں نقشبندی اور قادری طریقہ تصوف کے ترکی مسلمانوں کے ذریعہ پھیلا تھا چیچن مجاہدین کی اپنے وطن واپسی کے بعد انہیں چیچنیا کے دار الخلافہ گروزنی میں صرف ایک مسجد کھولنے کی ازت ملی بعد میں قریب کے گاؤں میں مزید پانچ مساجد تعمیر کرنے کی اجازت ملی، شمالی قوقاز کے ان صحیح العقیدہ، بہادر نڈر اور عالی ہمت مجاہدین کی تاریخ پر علامہ اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

روسیوں نے جتنا اس علاقے میں اسلام کو دبانے کی کوشش کی اتنی شدت سے ان کے یہاں اسلام ابھرا اس کا تازہ ترین مظہر ۱۹۹۱ء کے بعد کے واقعات ہیں روس کی شکست کے بعد بلا تاخیر چیچن مسلمانوں نے اپنی آزادی کا اعلان کیا اور ۱۹۹۲ء میں چیچن صدر دوداسیف نے پارلیمنٹ کے تمام وزراء اور اعلیٰ عہدیداروں کے لئے ضروری قرار دیا کہ وہ حکومت کی ذمہ داری سنبھالتے وقت قرآن کریم اٹھا کر حلف لیں گے اور حلف لیتے ہوئے یہ کہیں گے کہ اگر میں نے اس حلف کی خلاف ورزی کی تو مجھ پر اللہ تعالیٰ اور عوام کی لعنت ہو۔

اس کے بعد صدر دودائیف نے بتدریج اپنی اس آزاد اسلامی سلطنت کو سیاسی اور انتظامی لحاظ سے مستحکم کیا، افغانستان میں رسوا کن شکست کے بعد چونکہ روسی طاغوت میں یہ ہمت نہ تھی کہ وہ ایک ایسی بلند ہمت اور شجاع قوم سے ٹکر لے جس نے امام شامل رحمہ اللہ کی قیادت میں روس کے خلاف ۳۵ سال تک گوریلا جنگ لڑی تھی جس میں تقریباً ایک لاکھ روسی واصل جہنم ہوئے اس لئے تین سال تک اس اعلان آزادی کو برداشت کرنا پڑ لیکن جیسے ہی ماسکو حکومت اپنے سے بڑھ کر اسلام دشمن طاغوت امریکہ کی مالی امداد سے کسی قدر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی اور اقتصادی حالت کچھ بہتر ہوئی تو اس نے کچھ دیر کئے بغیر چیچنیا میں فوجی کاروائی سے پہلے داخلی انتشار و بغاوت اور رشوت کا طریقہ اختیار کیا حزب اختلاف کے لیڈر اختر خانوف کو ایک بڑی رقم دے کر چیچن حکومت کو غیر مستحکم اور کمزور کرنے کے لئے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا گیا بورس یلسن نے چیچنیا کی آزاد مملکت کے خلاف مختلف اقتصادی پابندیاں بھی عائد کیں مثلاً انجینیروں کو واپس بلا کر تیل کی صنعت کو شدید نقصان پہنچایا، ماہرین کو ماسکو واپس بلا لینے کی وجہ سے کارخانے اور فیکٹریاں بند ہو گئیں، اسپتالوں

سے دوائیں اور آلات جراحی ناپید کر دیئے گئے وغیرہ ان سب شیطانی ہتھکنڈوں کا مقصد بغیر
ی فوجی کارروائی کے اس آزاد اسلامی حکومت کو دوبارہ روس کا غلام بنانا تھا مگر بحمد اللہ تعالیٰ
سکو اپنے ان تمام تر شیطانی حربوں میں ناکام رہا، ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کرنے کی حزب اختلاف
، کوشش بری طرح ناکام ہوئی اور حزب اختلاف کی مسلح فوج کو جسے ماسکو اسلحہ فراہم کرتا تھا نہ
ہرف شکست سے دوچار ہونا پڑا بلکہ مختلف علاقوں سے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئی ان
پے در پے ناکامیوں نے صدر یلسن کو بوکھلا دیا بالآخر ۱۹۹۴ء کے آخر میں اس نے چیچنیا پر
یک انتہائی سفاکانہ فوجی کارروائی کی جو پورے عالم بالخصوص عالم اسلام کی غیرت کیلئے کھلا چیلنج
ہے اور جس کی امریکہ کے سوا سب نے مذمت کی لیکن حسب سابق اس دفعہ بھی روسیوں کو
ئی بڑی کامیابی سوائے چیچن بے گناہ عوام کو شہید کرنے کے حاصل نہیں ہوئی۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ چیچنیا ہی وہ اسلامی ریاست ہے جس نے نومبر ۱۹۹۱ء میں
سب سے پہلے اپنی آزادی کا برملا اعلان کر کے سابق سوویت یونین توڑنے کی ابتدء کی اس
کے بعد پھر ان ریاستوں نے بھی اپنی آزادی کے اعلان پر جرأت کی جو پہلے اس اقدام پر
جھجک محسوس کر رہی تھیں مگر افسوس کہ غیر تو غیر ہی رہے ان سے کسی خیر کی توقع ہی کیا؟
پنی مسلم اقوام نے بھی آج تک چیچنیا کی آزادی کو تسلیم کیا نہ اس اسلامی کانفرنس کا رکن بنایا
لکہ بطور مبصر بھی اس کی حیثیت کو قبول نہیں کیا جبکہ عالم اسلام کے ان غیور مسلمانوں کو
س وقت سیاسی سفارتی، اخلاقی، مالی غرض ہر قسم کی مدد کی شدید ضرورت ہے۔

یہ بات انتہائی اہم اور قابل ذکر ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ روس نے نہ صرف ۱۹۹۱ء میں
چیچنیا کی آزادی کو تسلیم نہیں کیا بلکہ تقریباً تین سال بعد باقی تمام آزاد ریاستوں سے قطع
نظر کر کے صرف چیچنیا پر تباہ کن لڑاکا بمبار طیارے، جدید دیو ہیکل ٹینک اور دیگر ہر قسم
ابیشار اسلحہ استعمال کیا اور چیچنیا کے نہتے اور بے گناہ ہزاروں عوام کو بڑی بے دردی سے
شہید کیا۔ چیچنیا محل وقوع کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے اس میں مختلف وادیاں
ور شاہراہیں ہیں، ریل کا ایک ایسا بہترین نظام قائم ہے جو ایک طرف روس کو آذربائیجان
کے راستہ سے ایشیا کی مرکزی ریاستوں سے ملاتا ہے تو دوسری طرف اس کا سلسلہ قوقاز کی
دوسری ریاستوں کے ذریعہ مشرقی یورپ سے قائم کرتا ہے چیچنیا کا علاقہ پہاڑوں اور وادیوں
پر مشتمل ہے جس کے جنگلات سے ڈھکے ہوئے فلک بوس برف پوش پہاڑ انتہائی خوبصورت

منظر پیش کرتے ہیں، ۲۵فیصد علاقہ میں زرخیز وادیاں ہیں جن میں چیچن قوم آباد ہے، دریاؤں اور برساتی نالوں کا سلسلہ بھی لامتناہی ہے، آبی ذخائر کی فروانی ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں بجلی کی پیداوار ضرورت سے زائد ہے چنانچہ چیچنیا دنیا کی واحد ریاست ہے جس میں عوام کو بجلی مفت فراہم کی جاتی ہے۔

میوہ جات میں سیب، انگور اور دیگر بے شمار اقسام ہیں، بطور علاج استعمال ہونے والی سینکڑوں جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں۔ گندم، مکئی، سورج مکھی اور تمباکو کی پیداوار وافر مقدار میں ہوتی ہے یہاں عمدہ نسل کے قفقازی گھوڑے پائے جاتے ہیں بھیڑ بکریوں کی افزائش نسل کو مستقل پیشہ کی حیثیت حاصل ہے اسی وجہ سے دودھ اور گوشت کثیر مقدار میں اور سستے داموں مل جاتا ہے علاوہ ازیں قدرت نے اس علاقہ کو لامحدود معدنی وسائل سے بھی نوازا ہے جن میں تیل اور عمارتی لکڑی شامل ہے۔ تیل کے ذخائر وسیع پیمانے پر ہیں، دنیا کا بہترین ایوی ایشن آئل یہاں موجود ہے، سوویت یونین کی ایوی ایشن آئل کی ۸۰ فیصد ضرورت چیچنیا سے نکالے جانے والے تیل سے ہی پوری ہوتی تھیں، تیل کی کئی انواع واقسام یہاں ہی پائی جاتی ہیں مثلاً ڈیزل، بلیک آئل، مٹی کا تیل پیٹرول وغیرہ کثیر مقدار میں اور بہت ہی سستی مل جاتی ہے۔ چیچنیا کے ان معدنی وسائل کو سوویت یونین نے دوسری ریاستوں کی طرف بے تحاشا منتقل کیا لیکن چیچنیا پر صرف دو فیصد خرچ کیا گیا اسی طرح اس ریاست میں قائم ہونے والی پیٹرولیم کی یونیورسٹی اور اس سے وابستہ کئی صنعتوں سے بھی چیچن عوام کو بہت کم فائدہ پہنچا۔ الغرض چیچنیا کے اعلان آزادی سے روس ان تمام انمول قدرتی وسائل اور معدنی ذخائر سے محروم ہو گیا ہے اور اب ہر قیمت پر دوبارہ اس دولت کو حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے یہی وہ وجوہ واسباب اور اغراض ومقاصد ہیں جن کے حصول کے لئے روس ہر شیطانی حربہ استعمال کر رہا ہے۔

چھٹی قسط

امام اہل سنت

مولانا عبدالشکور لکھنوی کی تصنیفی خدمات

از: مولانا عبداللہ فاروقی

حضرت لکھنویؒ کی تصنیفات و تالیفات مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ آپ نے سیرت مقدسہ پر کتابیں لکھیں، تاریخ و سیر، فضائل و مناقب، فقہی مسائل، ترجمہ قرآن مجید، احادیث و تفاسیر، شیعیت، بدعت اور قادیانیت جیسے فرقوں کی تردید میں بھی آپ نے قلم اٹھایا اور پھر اس کا حق ادا کر دیا۔ فی الحال ہم آپ کی تمام تصانیف کا احاطہ ان محدود صفحات میں نہیں کر سکتے مگر اجمالی طور پر ہم نے ان سے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضرور ہے کہ رد شیعیت یا رد بدعت کو آپ نے کبھی اپنا نصب العین نہیں بنایا بلکہ یہ کام آپ کے دوسرے کاموں کے مقابلہ میں بہت کم ہے حالانکہ آپ کی شہرت ان ہی کاموں سے زیادہ ہوئی ہے ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ ابتداء آپ نے درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور اصلاح معاشرہ پر ہی کام کرنے کے لئے اپنے آپ کو محدود رکھا تھا چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر آپ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تدریس کا منصب قبول فرمایا تھا اور پھر ماہنامہ "علم الفقہ" کا اجراء بھی عمل میں آیا تھا۔ "علم الفقہ" کو آپ کی جملہ تصانیف میں اولیت حاصل رہی ہے۔ ماہنامہ "علم الفقہ" میں ہر ماہ خالص فقہی مسائل مرتب کر کے شائع کئے جاتے تھے۔ جب ایک سلسلہ کے مسائل مکمل ہو جاتے تھے تو انہیں ایک جلد قرار دیکر علیحدہ کر دیا جاتا تھا اس طرح "علم الفقہ" کی چھ جلدیں مکمل شائع ہو چکی ہیں اور اب تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ "علم الفقہ" کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فقہی مسائل عام فہم زبان میں مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف فیہ مسائل میں فقہاء کے اختلافات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ہر ایک کی رائے لکھ کر آخر میں کسی ایک کی تائید کر کے اپنی وجہ ترجیح بھی بیان کر دی گئی ہے جس

سے کتاب میں ایک خاص علمی شان پیدا ہوگئی ہے اس طرح پہلی جلد طہارت، دوسری جلد نماز، تیسری جلد روزہ، چوتھی جلد زکوٰۃ، پانچویں جلد حج وزیارت اور چھٹی جلد نکاح سے متعلق ہے۔

فقہی کتابوں کے تراجم میں فقیہ اعظم حضرت امام ابو حنیفہ (م ۷۶۷ء) کی طرف منسوب کتاب "فقہ اکبر" کا بھی آپ نے اردو میں ترجمہ اور حواشی تحریر کرکے شائع کیا تھا۔ یہ کتاب فقہ اور علم کلام کی قدیم ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، اس کی افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بڑے بڑے نامور علماء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں، اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م ۱۷۶۲ء) کی کتاب "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" کا بھی آپ نے "اوصاف" کے نام سے اردو ترجمہ مع حواشی مفیدہ شائع کیا تھا۔ شاہ صاحب نے اس کتاب میں مسلمانوں کے فقہی اختلافات کے اسباب اور ان کی تاریخ بیان کی ہے اور پھر ان کی جو تطبیق کی ہے وہ حقیقتاً انہی کی جامعیت اور فقہی بصیرت کا کارنامہ ہے۔ حضرت لکھنویؒ کا اس کا ترجمہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے فقہی نظریات کے مؤید تھے اور انہی کو حق سمجھتے تھے۔

اسلامی تاریخ کی کتابوں میں آپ نے تاریخ طبری جلد اول کا بھی اردو میں ترجمہ کرکے شائع کیا تھا، ترجمہ کے ساتھ ایک نہایت مفید مقدمہ بھی اس کتاب کی اہمیت، افادیت اور اس کے ترجمہ کی ضرورت پر لکھ کر شامل کیا تھا اور اس پر حواشی بھی تحریر کئے تھے۔ صحابہ کرامؓ کے حالات میں لکھی گئی کتاب "أُسْد الغابة فی معرفة الصحابة" تالیف علامہ ابن اثیری جزریؒ (م ۱۲۳۲ء) کو اردو میں ترجمہ کرکے سب سے پہلے آپ ہی نے شائع کیا، اس سے پہلے صحابہ کرامؓ کے حالات میں اتنی مفصل و معتبر کتاب اردو میں نہیں آئی تھی۔ اس ترجمہ پر مشہور ادیب و انشاء پرداز مولانا عبدالحلیم شررؔ نے بھی اپنے جریدہ میں خراج عقیدت پیش کیا تھا، اسی طرح امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ کی کتاب "الشمائل" امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کی مرتبہ "چہل حدیث" و ازالۃ الخفا" اور علامہ ابن حجر ہیثمیؒ (م ۱۵۶۷ء) کی کتاب "تطهير الجنان واللسان من الخطور والتفوة بثلب معاوية بن ابی سفيان" کے تراجم اور حواشی بھی آپ کے شاندار علمی کارناموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

بچوں، عورتوں اور کم خواندہ لوگوں کیلئے سیرت مقدسہ پر "نفحۂ عنبریہ" اور

"مختصر سیرت نبویہ" آپ کی نہایت آسان اردو زبان میں مرتب
کردہ کتابیں ہیں جو اپنی افادیت اور مقبولیت کی وجہ سے آج تک مسلسل شائع ہو رہی ہیں
اور اکثر مدارس عربیہ و مکاتب اسلامیہ کی نصابی کتابوں میں شامل ہیں۔ آپ کی ایک اہم اور
قابل ذکر کتاب "سیرت الحبیب الشفیع من الکتاب العزیز الرفیع" بھی ہے جس
میں صرف آیات قرآنیہ کی روشنی میں سیرت مقدسہ کو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر
اردو زبان میں سب سے پہلی بار آپ ہی نے یہ کتاب مرتب کی تھی جس پر ملک کے مشہور
ادیب اور صحافی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بڑی تحسین کی تھی اسی طرح خلفاء راشدین
کی سوانح اور فضائل میں "سیرت خلفاء راشدین نام کی بہت مقبول اور مروج کتاب بھی
آپ نے مرتب کر کے شائع کی تھی جس کے آج تک درجنوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
ردشیعیت میں کتابوں سے زیادہ آپ کے وہ مضامین ہیں جو النجم میں شائع ہو چکے ہیں۔
آپ سے پہلے جن علماء نے ردشیعیت میں کام کیا ہے وہ زیادہ تر ان عقائد کی تردید میں ہیں جو
کسی نہ کسی طرح ان کے علم میں آچکے تھے کیونکہ مطابع کی ترویج سے پہلے تک علماء شیعہ
اپنی مذہبی کتابوں کو ہمیشہ مخفی رکھنے کا بڑا اہتمام کیا کرتے تھے۔ مگر حضرت لکھنویؒ نے انکی
قدیم ترین بنیادی کتابوں کو حاصل کر کے ان کے پورے مذہب کی چھان بین کی اور پھر ان
کے بارے میں قطعی اور آخری فیصلہ صادر کر دیا جواب ان کے تفردات میں سے ہے۔
انھوں نے شیعوں کے دو بنیادی عقیدوں کو خاص طور سے بنیاد بنا کر انکی گرفت کی ہے اول ان
کے عقیدۂ تحریف قرآن اور دوم ان کے عقیدۂ امامت کو جس پر ان کے پورے مذہب کا دارو
مدار ہے۔ مولانا علیہ الرحمہ نے ثابت کیا کہ انکی بنیادی مذہبی کتابوں میں موجودہ قرآن کو
نعوذ باللہ محرف اور ناقص بتایا گیا ہے اور اسمیں ہر طرح کی کمی و بیشی و تغیر و تبدل کا دعویٰ کیا
گیا ہے، ان کے یہاں دو ہزار سے زائد روایات تحریف قرآن کی پائی جاتی ہیں جو ان کے علماء
کے نزدیک حد تواتر کو پہونچ چکی ہیں، مذہب شیعہ کی پوری تاریخ میں گنتی کے چار علماء منکر
تحریف قرآن ہوئے ہیں جن میں ۱۔ شریف مرتضیٰ، ۲۔ شیخ صدوق، ۳۔ ابو جعفر طوسی۔
۴ شیخ ابو علی طبرسی کے نام ثبت ہیں مگر ان حضرات کا منکر تحریف ہونا بھی بلا دلیل کے اور بربنائے
تقیہ ہے جبکہ ہم مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ پورا قرآن مجید اول سے آخر تک حرفاً حرفاً وہی ہے
جو آنحضرت ﷺ پر ۲۳ سال تک تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت نازل ہوتا رہا تھا اور پھر

آپ ﷺ ہی کے ارشاد کے مطابق سورتوں اور آیات کی ترتیب بھی رکھی گئی تھی اسطرح موجودہ قرآن مجید میں جو کوئی ادنیٰ سا بھی شک کرے وہ خارج از اسلام ہو جاتا ہے لہذا اب ان دو ہزار سے زائد شیعی روایات تحریف کا کیا نتیجہ نکلے گا اسکا ناظرین خود فیصلہ کر لیں۔

اب رہا عقیدۂ امامت تو اس کے تحت علماء شیعہ نے خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کے بعد آپ ﷺ ہی جیسی خصوصیات کے حامل بلکہ ان سے بھی بدرجہا افضل بارہ امام مقرر کر لیئے جو عقیدۂ ختم نبوت کے سراسر منافی ہے۔ ان بارہ اماموں کو معصوم عن الخطاء، مفترض الطاعہ اور صاحبِ وحی والہام مان لینے کے بعد ختم نبوت کا عقیدہ تو حتمی طور پر کلعدم ہو جاتا ہے، اس طرح ان دو باتوں کی روشنی میں حضرت لکھنویؒ کا قطعی فیصلہ تھا کہ مذہب شیعہ کو ایک علیحدہ مذہب تو کہا جاسکتا ہے مگر اُسے اسلامی فرقہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔

آپ نے تیسری بات جس پر بہت زیادہ توجہ مبذول کی تھی وہ ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فضائل و مناقب کی تبلیغ و تشہیر اور ان کا دفاع جس پر مخالفین صحابہ نے سب سے زیادہ زبان طعن دراز کی ہے۔ وصول الی اللہ کے لئے سیدھا اور سچا راستہ وہی ہے جو آنحضرت ﷺ نے امت کو بتایا اور جس پر صحابہ کرام اور خلفاء راشدین چلے اور پھر اسی کی پیروی ہمیشہ سلف صالحین اور اولیائے امت نے کی۔ اس ایک راستہ کے علاوہ باقی تمام راستے شیطان کے ایجاد کردہ ہیں۔ صحابہ کرام ہی نبوت محمدیہ کے اولین چشم دید گواہ ہیں۔ انہی کی مساعی جمیلہ سے قرآن مجید، احادیث نبویہ اور تفسیر وفقہ کے بنیادی مآخذ آج ہم تک پہونچے ہیں لہذا اگر خدانخواستہ ان کی ذوات مقدسہ کی دیانت وامانت، تقویٰ وپرہیزگاری اور صداقت وروایت کسی طرح بھی مجروح ہوتی ہے تو دین کے یہ سارے منابع ومصادر مشکوک ہو جائیں گے اور اساسِ دین ہی منہدم ہو جائیگی اس لئے علماء اہل سنت کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ تمام صحابہ عدول ہیں اور صادق ومصدق ہیں، اگرچہ وہ خطاء ونسیان سے معصوم تو نہیں مگر من جانب اللہ محفوظ، مامون اور مصؤن ضرور ہیں، وہ ہمارے لئے واجب الاتباع ہیں اور انکا ہر دینی فعل وعمل ہمارے لئے حجت قطعیہ اور انہی کا راستہ امت مسلمہ کے لئے صراط مستقیم ہے۔

اسی لئے حضرت لکھنویؒ نے صحابہ کرامؓ کے فضائل ومناقب کو اپنی ہر تحریر کا سرنامہ اور ہر تقریر کا حرف آغاز بنایا ہے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول کے بعد بادۂ حبِ صحابہ سے سرشار تھے، انہوں نے تردید شیعیت کے سلسلہ میں جتنا بھی کام کیا ہے اس کا ساٹھ ستر فیصد

حصہ صحابہ کرامؓ کے فضائل ومناقب اور اعداء دین کے ناپاک حملوں سے دفاع پر مشتمل ہے، یہی وجہ ہے کہ آج ہندوپاک وبنگلہ دیش میں اردو یا دوسری مقامی زبانوں میں جتنا کچھ اس موضوع پر لکھا جاتا رہا ہے اس کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ آپ ہی کی تحریروں اور تقریروں سے تحریک ملنے کا نتیجہ ہیں تو اس میں کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔

مذکورہ بالا ان اسباب کے نتیجہ میں آپ نے ہندوستان کے تمام مشہور ومستند علماء اہل سنت سے تکفیر شیعہ کے بارے میں استفتاء کیا اور ان سے فتوے حاصل کرکے شائع کردیئے جس کی تردید آج تک کہیں نہیں ہوئی تحریف قرآن اور بعض دوسرے مسائل پر علماء شیعہ سے آپ کے کئی مناظرے بھی ہوئے تھے جس میں فریق مخالف کو سوائے ناکامی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ان مخصوص موضوعات پر آپ کی تالیف "تنبیه الحائرین" روداد مناظرہ امروہہ، روداد مناظرہ بمبئی اور مذہب شیعہ کے دوسو منتخبہ عقائد پر لکھے گئے رسائل کے کچھ ابتدائی حصے قابل دید ہیں اور یہ چھپ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں تردید شیعیت میں آپ نے ایک ضخیم کتاب "مناظرہ اور اظہار حق" کے نام سے نو جلدوں میں مرتب کرکے شائع کی تھی جس میں تمام اختلافی مسائل پر دلائل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ جن علماء شیعہ سے آپ کے مناظرہ ہوئے تھے ان میں مولوی سید علی حائری مجتہد لاہور، مولوی سید سبط حسن مجتہد لکھنؤ، مولوی مرزا احمد علی فاضل امرتسری ثم لاہوری مولوی محمد باقر جلال پوری فیض آبادی اور مولوی علی اظہر ایڈیٹر اصلاح، کھجوہ ضلع سیوان (بہار) وغیرہ لائق ذکر ہیں۔ ان تمام کاموں کے علاوہ آپ کے وہ تفسیری رسائل بھی بڑے اہم ہیں جو آپ نے مسئلہ خلافت کی حقیقت اور عقیدۂ امامت کی تردید میں مرتب کرکے شائع کئے تھے، یہ رسائل تعداد میں چوبیس ہیں جو آج یکجا اور الگ الگ دونوں صورتوں میں دستیاب ہیں۔ پچیس سال تک النجم میں آپ نے خود کچھ لکھا ہے وہ ان کتابوں اور رودادوں کے علاوہ ہے جو ایک اندازہ کے مطابق تقریباً پچاس ہزار صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

شیعوں کے نقش قدم پر بریلوی علماء بھی اکثر مقابلہ پر آئے جن میں مولوی نثار احمد کانپوری، مولوی سید محمد فاخر الہ آبادی، مولوی سید محمد محدث کچھوچھوی اور مولوی حشمت علی پیلی بھیتی سے ہوئے مناظروں کی رودادیں چھپ چکی ہیں جس میں مسلک حق کی فتح ہوئی تھی۔ ان رودادوں میں "تحفۂ لاثانی" "صواعق آسمانی" اور "نصرت آسمانی"

وغیرہ لائق مطالعہ ہیں۔

رد قادیانیت بھی آپ کا موضوع رہا ہے، النجم میں مستقل آپ کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ اس موضوع پر آپ کی کوئی مستقل تصنیف تو نظر سے نہیں گذری مگر ان سے جو مناظرے ہوئے تھے ان کی کچھ روددادیں ضرور ملتی ہیں جیسے مناظرہ رنگون، مناظرہ پورینی ضلع بھاگلپور، مناظرہ کوکن، مناظرہ رادولی، اور مشہور مناظرہ بہاولپور پنجاب وغیرہ۔ جن قادیانی مبلغین سے آپ کے زبانی یا تحریری مناظرے ہوئے تھے ان میں خواجہ کمال الدین، بی، اے، ایل، ایل، بی، مولوی عبد الماجد بھاگلپوری، حافظ روشن علی، مولوی سرور شاہ، مفتی محمد صادق اور میر قاسم علی دہلوی وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

آپ نے اپنی کتابوں اور ترجموں کی بدولت اردو زبان کے نثری ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے بعض موضوعات میں تو آپ کو اولیت حاصل رہی ہے جس کا اعتراف اردو کے محققین نے بھی کیا ہے مثلاً عام مسلمانوں کیلئے فقہی مسائل پر "علم الفقہ" کی تالیف اردو زبان میں سب سے پہلے آپ ہی نے کی تھی چنانچہ بہشتی زیور کے ایک حصہ کے مقدمہ میں حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ نے اپنے مآخذ میں "علم الفقہ" کو بھی تحریر کیا ہے، خلفاء راشدین اور صحابہ کرامؓ کے حالات میں "اسد الغابہ" جیسی کتاب کو اردو میں سب سے پہلے آپ ہی نے منتقل کیا۔ کم خواندہ لوگوں کے لئے سیرت مقدسہ پر رسائل اردو میں پہلے آپ ہی نے مرتب کئے تھے۔ اردو کی مذہبی صحافت کے میدان میں بھی آپ کا منفرد مقام رہا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ شعری ادب میں صحابہ کرامؓ کی مدح وثنا میں آپ ہی کی تحریرات وتحریکات سے ایک نئی صنف اور منقبت کے ایک حسین امتزاج اور عمومی رواج نے ادب لطیف میں جگہ پائی انہیں اسباب سے لکھنؤ میں کئی بار خالص مدح صحابہ کے مشاعرے نہایت کامیابی کے ساتھ منعقد ہوئے اور اس کا سلسلہ آج بدستور جاری ہے۔

بیعت وخلافت

زندگی کے آخری دور میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے خاندان کی ایک عظیم شخصیت اور سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا شاہ ابو احمد صاحب بھوپالیؒ (م ۱۹۲۳ء) سے آپ بیعت ہوئے اور پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد شیخ طریقت نے آپ کو خلافت سے بھی سرفراز کر دیا۔ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے اپنی ساری زندگی

میں صرف پانچ چھ اصحاب کو خلافت سے نوازا تھا جن میں سے ایک خوش نصیب آپ بھی تھے۔

آپ نے بھی اپنی حیات میں کسی خلافت یا جانشینی نہیں عطا کی اور آپ کے بعد تو گویا یہ سلسلہ ہی لکھنؤ سے منتقل ہو گیا۔ لکھنؤ اور ہندوستان کے بہت سے دوسرے شہروں میں آپ کے مریدین و متوسلین بے شمار تھے اور اب بھی ان میں سے کچھ حضرات بقید حیات ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بے شمار عنایتیں آپ پر تھیں، سات مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی، ساری زندگی اتباع سنت اور ریاضت و مجاہدہ میں گذاری۔ اپنی کوئی جائیداد نہیں چھوڑی سوائے ایک آبائی مکان اور اُن چند بیگھے زمین کے جو کاکوری ضلع لکھنؤ میں ہے۔ آپ کے متروکات میں ایک ٹوٹا ہوا بے تالے کا بکس، چار جوڑے کپڑے، دو عمامے، دو صدریاں، ایک جوڑا نیا جوتا اور تھوڑا سا لکھنے پڑھنے کے سامان کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلا۔

وفات

رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ مطابق فروری ۱۹۶۲ء مرض الموت کا آغاز ہوا جو روز بروز بڑھتا ہی گیا بالآخر ۲۳/اپریل ۱۹۶۲ء یوم دوشنبہ کو بعد نماز عصر آپ کی وفات ہو گئی، اُسی شب کے آخری حصہ میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ، تمام صاحبزادگان اور مخصوص قریبی تعلق رکھنے والے حضرات نے غسل دے کر جنازہ تیار کیا اور پھر اگلے روز صبح ساڑھے آٹھ بجے دارالمبلغین سے جنازہ کو لاکھوں افراد نے اپنے کاندھوں پر لیجا کر امین الدولہ پارک امین آباد میں پہونچایا جہاں آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا عبد السلام صاحب فاروقیؒ نے نماز جنازہ پڑھائی اور دس بجے دن میں محلہ چکمنڈی (مولوی گنج) میں مزار میاں چپ شاہؒ کے احاطہ میں تدفین عمل میں آئی۔

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہ ربیع الاول - ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ مطابق ماہ جولائی - اگست ۱۹۹۸ء

سالانہ ۔/۶۰	فی شمارہ ۔/۱۲	شمارہ ۷-۸	جلد ۸۲

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانہ بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۔/۴۰۰ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۔/۱۰۰، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۔/۸۰
ہندوستان سے ۔/۶۰

Tel. : 01336 - 22429
FAX : 01336 - 22768
Tel. : 01336 -24034 EDITER

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔

● ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔

● چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے، اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔

● پاکستانی حضرات مولانا نور الحسن ولد عبد الستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

● ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

● بنگلہ دیشی حضرت مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دار العلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی

مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

حبیب الرحمن قاسمی

اسلامی تاریخ میں ربیع الاول وہ مبارک ترین مہینہ ہے جس میں دعائے خلیل اور نوید مسیحا کا ظہور ہوا یعنی محسن انسانیت پیغمبر اعظم ﷺ کو خالق کائنات نے رحمت مجسم بنا کر اس خاکدان عالم میں بھیجا۔ آپ کی بعثت کے وقت دنیا کا کیا حال تھا؟ ان مختصر صفحات میں اس کا اجمال بھی پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ دین و مذہب، تہذیب و تمدن، معاشرت و معیشت، اور اخلاق و کردار غرضیکہ زندگی کے تمام شعبوں میں جہالت و ضلالت کا دور دورہ تھا اور انسانیت کی گاڑی اپنی پٹری کو یکسر چھوڑ چکی تھی اور قریب تھا کہ وہ ظلمت و تاریکی کے ایسے مہیب اور خطرناک غار میں گر جائے جس سے پھر ابھرنا ممکن نہ ہو "كُنتُم عَلىٰ شَفَا حُفرَةٍ مِنَ النَّار" سے قرآن اسی عالمگیر ابدی تباہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

عین اس تباہی و بربادی کے عالم میں آپؐ نے گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑا اور اپنی روشن تعلیمات اور تابناک اخلاق کے ذریعہ دنیا سے نہ صرف کفر و شرک اور ظلم و جہل کی تاریکیوں کو دور کر دیا بلکہ لہو و لعب بدعات و رسومات اور بے سرو پا خرافات سے مسخ شدہ انسانیت کو اخلاق و شرافت، و قار و تمکنت اور سنت و شریعت کے خوشنما دیدہ زیب زیور سے آراستہ و پیراستہ کر دیا، اور آج دنیا میں جہاں کہیں بھی شرافت و مروت، عدل و انصاف علم و حکمت، عبادت و اطاعت اور ایمان و ایقان کی روشنی نظر آتی ہے درحقیقت عطیہ ہے اسی آفتاب رسالت اور محسن انسانیت کا۔

اس رحمت مجسم اور محسن اعظم کا حق تو یہ تھا کہ ہمارے قلوب ہمہ وقت اس کی عظمت و احترام سے معمور ہوتے اور ہمارے دلوں کی ہر دھڑکن اس کی تعظیم و توقیر کی ترجمان ہوتی، ہمارا ہر عمل اس کے اسوۂ حسنہ کا نمونہ، اور ہماری ہر حرکت و سکون اس کی سنت مطہرہ کے تابع ہوتی گویا ہماری مکمل زندگی سیرت رسول کی تذکار اور اخلاق نبوی (ﷺ) کی جیتی جاگتی تصویر ہونی چاہئے تھی۔ نہ یہ کہ دیگر اہل ادیان و مذاہب کی دیکھا دیکھی ہم بھی اس نبی برحق اور محسن اعظم ﷺ کی یاد و تذکرہ کے لئے چند دن مخصوص کرلیں اور پھر پورے سال بھولے

سے بھی اس کی سیرت واخلاق کا ذکر تک زبان پر نہ لائیں۔ لاریب کہ آپ کا تذکرہ، آپ کی یاد، اور آپ کے فکر میں حیات کے جتنے لمحے بھی گذر جائیں وہ ہمارے لئے سرمایۂ سعادت اور ذریعہ نجاتِ آخرت ہیں۔

لیکن افسوس وصد افسوس! کہ آج رسول عربی فداہ روحی، ابی وامی کے نام لیوا، اور اس کے عشق و محبت کے دعویدار "ماہ ربیع الاول" میں "عید میلاد النبی" کے دلنشیں نام پر جو وقتی اور بے روح محفلیں منعقد کرتے ہیں اس کے تصور ہی سے روح کانپ اٹھتی ہے اور کلیجہ منھ کو آنے لگتا ہے۔ آہ! ملت اسلامیہ کی یہ کیسی بد بختی و بد نصیبی ہے کہ محسن اعظم کے مقدس نام اور سیرت پاک کے بابرکت عنوان پر اس ہڑ بونگ، غل غپاڑہ، شور و شغب اور طوفان بے تمیزی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ کچھ دیر کے لئے شیطان کی پیشانی بھی احساس ندامت سے عرق آلود ہو جاتی ہے دل کی دنیا تاریک تر ہوتی جارہی ہے مگر اس کی فکر سے بے پرواہ بازاروں اور گلی کوچوں کو برقی قمقموں سے منور کیا جاتا ہے۔ دل کی بستی ویران اور اجاڑ ہو رہی ہے مگر اس کے غم سے غافل راستوں اور چوراہوں کو حسین و خوش منظر جھنڈیوں سے سجایا جاتا ہے۔ چھ چھ آٹھ آٹھ گھنٹے حضور ﷺ کے نام پر جلسوں اور جلوسوں میں گذار دیا جاتا ہے ۔ مگر آں حضرت ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور اسلام کے رکن اولیں نماز کے تصور تک کو ذہن ودماغ کے دریچے تک آنے نہیں دیا جاتا۔

سیرت کے ان جلسوں اور جلوسوں میں فکرِ ننگ وناموس سے بے نیاز ہو کر مردوں اور عورتوں کا جس طرح اجتماع اور اختلاط ہوتا ہے عہد جاہلیت کا جشن نوروز بھی اس کے آگے ماند پڑ جاتا ہے ۔ قوم وملت کا اس قدر سرمایہ ان سطحی اور غیر شرعی مجلسوں کی آرائش و زیبائش میں ہر سال صرف ہوتا ہے کہ اگر اس کا عشر عشیر بھی بیواؤں کی نگہداشت اور بے سہارا بچیوں کے نکاح پر خرچ کر دیا جائے تو ملت کی ہزاروں ماؤں اور بہنوں کو اطمینان و سکون اور عزت وآبرو کی زندگی میسر ہو جائے۔

محسنِ کائنات کی محبت کے مدعیو! خدارا غور و فکر اور عقل و ہوش سے کام لو وہ دعویٔ محبت یکسر فریب اور نرا دھوکہ ہے جو اطاعت و تسلیم، جاں سپاری وخود سپردگی کی عاشقانہ اداؤں سے خالی ہو۔ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

تعصی الاله انت و تظهر حبه　　　هذا محال و فی القياس بديع

لو كان حبك صادقاً لأطعته لأن المحب لمن يحب يطيع

تم زبان سے اللہ کا اظہار کرتے ہو اور عمل سے اس کی نافرمانی اور مخالفت۔ محبت اور مخالفت کا یکجا ہونا از روئے عقل نہایت عجیب بلکہ محال ہے۔ اگر تمہاری محبت سچی ہوتی تو تم یقینی طور پر اس کی اطاعت کرتے۔ کیونکہ محبّ و عاشق اپنے محبوب کا اطاعت گذار اور فرماں بردار ہوتا ہے۔

تم زبان سے عشق رسول کا دم بھرتے ہو مگر تمہارے طور طریقے، اخلاق و اعمال اور عادات و خصائل تعلیمات رسول اللہ ہدایات محبوب کے سراسر خلاف ہیں۔ ہادیٔ اعظم اور محسنِ انسانیت نے بالکل آخری وقت میں جبکہ نبض ڈوب رہی تھی اور نزع کا عالم طاری تھا۔ نماز کی وصیت فرمائی تھی۔ غیر محرم عورتوں سے اختلاط تو بڑی دور کی بات ہے ان کی جانب نظر اٹھانے کو بھی آپؐ نے دین و ایمان کی ہلاکت اور تباہی قرار دیا تھا۔ بیجا اسراف اور فضول خرچی سے تمہیں باز رہنے کی مؤکد ہدایت فرمائی تھی لیکن آج انہیں کے نام پر ان جلسوں اور جلوسوں میں تم وہ سب کچھ کرتے ہو جس سے تمہارے محسن نے تمہیں روکا تھا۔ خدارا ہوش میں آؤ اور دیکھو دینا کہاں سے کہاں پہنچ گئی تم ہو کہ ان سطحی اجتماعات اور غیر شرعی رسومات میں اپنی طاقت اپنی دولت، اور اپنے وقت کو برباد کر رہے ہو اور اس طرح اپنی دنیا کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی بھی خرید رہے ہو۔

ترسم کہ بہ کعبہ نہ رسی اے اعرابی

کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستانست

ایک اہم مکتوب

عصر حاضر میں اسلام مخالف قوتیں مسلمانوں بالخصوص ان کے بچوں کو اسلامی عقائد و احکام اور تہذیب و روایات سے بیگانہ بنا دینے کے لئے سرگرم عمل ہیں اور تہذیب و کلچر اور تعلیم و تربیت کے خوبصورت ناموں سے انہیں دین اسلام سے برگشتہ کر دینے کی ایک تحریک چل رہی ہے اس ماحول میں حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب خلف رشید و خلیفہ مجاز حضرت الشیخ الحدیث صاحب کا یہ مکتوب ہر مسلمان کے لئے لائق توجہ ہے جسے حضرت مہتمم صاحب کے حکم پر شائع کیا جا رہا ہے۔

مخدوم معظم جناب الحاج حضرت مہتمم مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ پاک کا شکر ہے بندہ بعافیت ہے امید ہے آپ بعافیت ہوں گے آپ کا گرامی نامہ مع جوابی لفافہ کے موصول ہوا آپ نے جو تفصیل لکھی اس سے مسرت ہوئی اللہ تعالیٰ آپ کے مدرسہ کو ترقیات سے مالامال فرمائیں شر ور وفتن سے محفوظ فرمائیں اور آپ نے جو مکاتب قائم کئے ان کو بھی ترقیات سے مالامال فرمائیں ان میں اور ترقی و کثرت عطا فرمائیں عرصہ سے اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ بڑے مدرسہ والے مختلف علاقوں میں دیہاتوں اور شہروں میں جگہ جگہ مکاتب قائم کر کے بچوں کو اپنائیں تاکہ بچے واہی تباہی پھرنے اور اسکولوں کی وبا سے اور خاص طور سے مشن کے اسکولوں سے محفوظ رہیں۔ کم عمری میں بچوں کو اپنا کر گھر کے قرب وجوار میں ان کا قاعدہ اور سپارہ شروع کرا کر ان کو اپنایا جائے اور پھر ذرا بڑے ہونے پر اس سے آگے اس سے بڑے مدرسہ میں منتقل کیا جائے اس سے بچہ مشرکین کے اسکولوں سے بھی محفوظ رہے گا اور مشن کے اسکولوں سے بھی محفوظ رہے گا اور خود غلط کھیلوں اور غلط ماحول سے محفوظ رہے گا۔ مجھے سفروں میں اور خود سہارنپور میں بعض بچوں سے معلوم ہوا وہ مشرکین کے اسکولوں میں جاتے ہیں ان سے مسلمان ہونے کے باوجود "وندے ماترم" کرایا جاتا ہے اور بعض مشن کے اسکولوں میں ان کو مذہبی طور سے خراب کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کی مکاتب قائم کرنے کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائیں اور اس میں ترقی عطا فرمائیں آپ حضرات اس سلسلہ کو اور وسیع فرمائیں اور اپنے مدات چندہ میں مکاتب کے قائم کرنے کی مد قائم کر کے اس نسبت پر چندہ لیں۔ ہمارے اکابر کے زمانہ میں ایک چندہ کی مد یہ ہوتی تھی کہ گھروں میں مٹکیاں مدرسہ کی طرف سے رکھی جاتی تھیں اور عورتوں کو تاکید کی جاتی تھی کہ جب وہ آٹا پکائیں ایک چٹکی یا ایک مٹھی اس مٹکی میں ڈالدیں اور ہفتہ عشرہ میں مدرسہ والے اپنا قاصد بھیج کر اکٹھا کرالیں یہ اس زمانہ میں چٹکی فنڈ کہلاتا تھا اور اچھی خاصی یافت اس سے ہو جاتی ہے اور دینے والیوں کے حوصلہ کے اعتبار سے کسی مٹکی میں زیادہ ملتا اور کسی مٹکی میں کم جتنا ہی آئے گا مدرسہ کو اتنا ہی سہارا ملیگا جب آپ اس کو شروع کریں گے تو اس کا نفع آپ لوگوں کے سامنے آئیگا۔ زیادہ اچھا یہ ہے کہ ممبران مدرسہ اور ذمہ دارا

درسہ اس کا سلسلہ شروع کریں پھر انشاء اللہ عوام بھی اس کی طرف توجہ کریں گے اور انشاء للہ اس سے آپ لوگوں کو بہت یافت ہو گی خاص طور سے ان علاقوں میں جہاں آپ نے مکاتب قائم کئے ہیں وہاں یہ سلسلہ شروع کریں اس پر زور نہ دیں (یعنی چنگی حاصل کرنے پر) بلکہ ور ان کے بچے حاصل کرنے پر دیں یہ بھی سلسلہ ہو کہ جتنا وہ خوشی سے دیدیں اسی کو حاصل کر یا جائے اور اصل زور ان کے بچے کے حاصل کرنے پر ہو تا کہ ان کو دین کی رغبت اور قرآن پڑھنے کا شوق ہو، بچوں پر مکتب میں لانے کی محنت کریں اور بڑوں پر جماعت میں جانے کی کوشش ریں تاکہ ان کو دین کی رغبت پیدا ہو کر بچوں کو پڑھنے کے لئے فارغ کرنا آسان ہو جائے!

مشن کے اسکولوں مین بچوں کے مذہبی عقائد کو کس طرح خراب کیا جاتا ہے اس کو واضح رنے کے لئے ایک واقعہ نقل کراتا ہوں مجھے بعض حضرات سے یہ خبر ملی کہ مشن کے ایک سکول میں مسلمان بچوں کو ایک بڑے ہال میں جمع کر کے ان سے کہا گیا کہ تم لوگ اپنے اللہ سے کھانے کی چیزیں مثلاً ٹافی، بسکٹ، وغیرہ مانگو دیکھیں تمہارا خدا تمہیں یہ چیزیں دیتا بھی ہے یا نہیں؟ چنانچہ ان کم سن بچوں نے اللہ تعالیٰ سے ان چیزوں کا سوال شروع کر دیا نتیجہ لا حاصل نکلا پھر انہوں نے ان کم سن بچوں سے کہا کہ اچھا اب اپنے نبی حضور علیہ ﷺ سے سوال کرو اسی طرح سے انہوں نے ان دیگر اولیاء کرام کا نام لیکر ان سے سوال کرنے کو کہا بہر لیف ان کو کچھ نہ ملا۔ اخیر میں انہوں نے کہا کہ اچھا تم لوگ اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان چیزوں کے متعلق سوال کرو، بچوں کے ہاتھ اٹھوا کر دعا میں مشغول کر کے ان میں سے ایک نے ایک (سوئچ) بٹن دبا دیا اور چھت سے ٹافی و بسکٹ، چاکلیٹ اور اسی طرح کی یگر اشیاء جو بچوں کو زیادہ مرغوب ہوتی ہیں گرنے لگیں۔

اب ہمیں سوچنا ہے کہ اس طرح سے کیا ہمارے بچے مذہب اسلام پر قائم و دائم رہ سکتے ہیں۔ سوچ یئے اور غور کیجئے اگر اب بھی غفلت کی نیند سے بیدار نہ ہوئے تو کب ہوش آئے گا۔ للہ تعالیٰ ہم سب کی باطل عقائد سے حفاظت فرمائیں اور ہم سب کو صحیح سمجھ نصیب فرمائیں۔

واللہ یهدی من یشاء إلی صراط مستقیم

فقط والسلام

بندہ محمد طلحہ کاندھلوی

بقلم ناصر علی سیتاپوری

متعلم دارالافتاء مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور
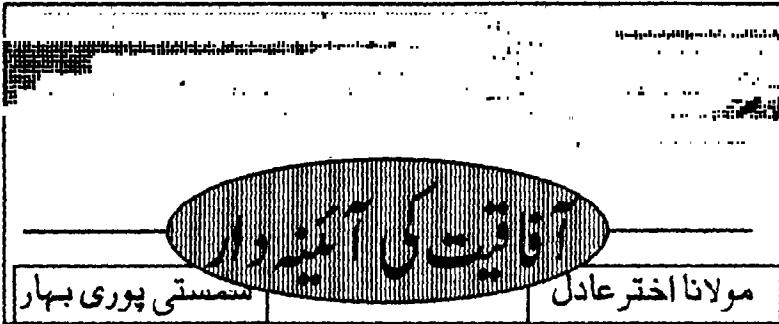
حضورؐ کی پاک تعلیمات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں کہیں رنگ و نسل، ذات پات قوم وملک اور اپنے وغیر کا امتیاز نہیں ملے گا۔ آپؐ نے آفاقی اصول و تعلیمات دنیا کے سامنے پیش کیے، جن سے کوئی ایک قوم نہیں بلکہ ساری دنیا کے انسان فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

رحمت و محبت کی نہ سلسبیل آپؐ نے پوری انسانیت کے لئے جاری فرمائی، ہر پیاسا اس سے سیراب ہو سکتا ہے۔

ہم مثال کے طور پر حضور کی چند تعلیمات کا ذکر کرتے ہیں جو آفاقیت، عالمیت اور رحمۃ عامہ کے شاندار نمونے ہیں۔

(۱) تمام دنیا کے ساتھ حسن سلوک:

آپؐ نے تمام دنیا کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کی تعلیم دی اور اس میں کسی قسم کے امتیاز کا لحاظ نہیں فرمایا۔

لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقا تلو کم فی الدین ولم یخرجو کم من دیار کم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین (الممتحنہ ۸)

خدا تم کو لوگوں کے ساتھ نیکی اور اچھا سلوک کرنے سے نہیں روکتا بلکہ خدا تو ایسے کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، لیکن یہ لوگ ایسے ہوں کہ انہوں نے دین کیلئے تم سے جنگ کی ہو اور دین کیلئے تم کو وطن سے نہ نکالا ہو۔

(۲) برائی کا بدلہ بھلائی سے دو:

حضور نے دشمنوں کے ساتھ نیک برتاؤ کا حکم دیا، اور برائی کا بدلہ بھلائی سے دے:

تلقین فرمائی، قرآن کی زبان میں اعلان فرمایا۔

ادفع بالتی هی احسن فاذاالذی بینك و بینه عداوة کأنه ولی حمیم (حم سجدة ۳۴)

برائی کا بدلہ نیکی سے دو پھر جس شخص کے ساتھ تمہاری عداوت ہے وہ تمہارا گرم جوش دوست بن جائیگا۔

(۳) انصاف کی میزان:

آپؐ نے انصاف کے معاملہ میں غیرجانبدارانہ اور حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کی تاکید فرمائی، اور اس میں عداوت و نفرت، یا اقرباپروری کے جذبات سے بالاتر رہنے کا حکم دیا۔

ولایجرمنکم شنأن قوم علی ان لاتعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقوی واتقواالله ان الله خبیر بماتعملون (مائدہ ۸)

کسی قوم کی عداوت تم کو نقطۂ انصاف سے ہٹانہ دے، انصاف کرو یہی خدا شناسی سے قریب تر ہے، اور تقویٰ اختیار کرو تم جو کچھ کرتے ہو خدا خوب جانتا ہے۔

قرآن میں ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

ولایجرمنکم شنأن قوم ان صدورکم عن المسجدالحرام ان تعتدوا وتعادنوا علی البر والتقوی ولاتعاونوا علی الاثم والعدوان واتقواالله (مائدہ ۲)

قوم کی یہ مخالفت کہ انہوں نے تم کو مسجد حرام سے روک دیا تم کو ادھر نہ لے جائے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو تم تو نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ان کی مدد کرو اور گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ان کا ساتھ نہ دو اور خدا سے ڈرتے رہو۔

(۴) شہادت کی بنیاد:

حضورؐ نے شہادت کی بنیاد واقعیت پسندی پر رکھی، اور اس میں عداوت و محبت کے سفلی جذبات سے علحدہ رہنے کا حکم فرمایا، اس لئے کہ انصاف کی بنیاد شہادت پر ہے، اگر شہادت ہی درست نہ ہو تو درست انصاف بھی وجود میں نہیں آسکتا۔

یایها الذین آمنوا کونوا قوامین لله شهداء بالقسط (مائدہ ۸)

اے ایمان والو اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور انصاف کے ساتھ شہادت دو۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے:

یاایھاالذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولوعلی انفسکم اوالو الدین ان یکن غنیااوفقیرا فاللہ اولی بھما فلاتتبعوا الھوی ان تعدلوا وان تلووا او تعرضوا فان اللہ کان بماتعملون خبیرا (نساء ۱۳۵)

اے ایمان والو! انصاف کو قائم کرنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بن جاؤ ، خواہ تمہاری گواہی خود تمہارے والدین کے خلاف یا اقرباء کے خلاف ہو، اگر کوئی مالدار ہے یا محتاج تو اللہ تم سے زیادہ دونوں کا خیر خواہ ہے پس تم خواہش کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر تم کجی کروگے یا پہلو تہی کروگے تو جو کچھ تم کررہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

(۵) معاہدات میں توازن کا لحاظ :

بین الاقوامی معاہدات میں بھی حضورؐ نے بہتر توازن کی تعلیم فرمائی، اور اس سلسلے میں اپنی قوت کے بیجا استعمال سے منع فرمایا، حضورؐ نے یہود جیسی ذلیل وخوار قوم اور عیسائی جیسی معزز قوم دونوں سے اپنے دور میں معاہدات فرمائے ، اور دونوں میں توازن ، انصاف اور مساوات کا مکمل لحاظ فرمایا۔

مدینہ آنے کے بعد یہود سے جو معاہدہ ہوا تھا اسکے چند دفعات یہ ہیں :

۱۔ یہود بھی مسلمانوں کی طرح ایک قوم سمجھی جائے گی۔

۲۔ جو کوئی ان سے لڑے مسلمان ان کو مدد دیں گے

۳۔ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات خیراندیشی نفع رسانی اور نیکی کے ہونگے ، برائی کے نہیں۔

۴۔ یہودیوں کے حلیف بھی اس معاہدہ میں ان کے ساتھ شامل ہیں۔

۵۔ مظلوم کی ہمیشہ مدد کی جائے گی۔ (سیرت ابن ھشام ج۱ص ۱۷۸)

خراج گذار اور مفتوح عیسائیوں کے ساتھ ان الفاظ میں معاہدہ فرمایا۔

۱۔ اہل نجران کو خدا کی حفاظت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری حاصل ہوگی ان کی جان، مذہب ملک ، مال، ان سے متعلق تمام موجود اور غیر موجود اشخاص، اور ان کی قوم اور ان کے پیرو اس ذمہ داری میں شامل ہوں گے۔

۲۔ ان کی موجودہ حالت تبدیل نہیں کی جائے گی۔

۳۔ ان کے حقوق میں سے کوئی حق بدلا نہ جائے گا۔

۴۔ اور جو کچھ تھوڑا بہت ان کے قبضہ میں ہے اس میں کوئی تغیر نہیں کیا جائے گا۔

(فتوح البلدان للبلاذری بحوالہ رحمۃ للعالمین ج ۲ ص ۳۱۹)

ان معاہدات سے حضور کی کرم گستری، انسانیت نوازی اور رحم پرور جذبات پر بھرپور روشنی پڑتی ہے، ورنہ مفتوح و محکوم قوم کے ساتھ کسی طرح کا بھی معاہدہ کیا جاسکتا اور ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ مگر نہیں حضورؐ نے ایسا نہیں کیا، آپؐ تو آئے ہی تھے کمزوروں اور ناتوانوں کے والی بنکر، پھر آپؐ ان کا خیال نہ رکھتے تو کون رکھتا۔

(۶) انسانی جان کی قدر و قیمت کی بحالی:

حضورؐ نے انسانی جان کی قدر و قیمت بحال فرمائی، ورنہ حضورؐ سے قبل پوری دنیا انسانی قتل گاہ بنی ہوئی تھی، عرب کا ہر قبیلہ ایک دوسرے سے برسرپیکار تھا، صدیوں سے بھڑکی ہوئی آتش انتقام سرد نہیں ہوئی تھی، نوزائیدہ بچیوں کو زندہ درگور کیا جارہا تھا، مادرگیتی اپنی پوری نسل کو زندہ دفن کردینا چاہتی تھی، عیسائی فرقے باہم نظریاتی اختلاف کے بعد میدان جنگ میں کود پڑے تھے، اور ان کے درمیان سخت خونریزی جاری تھی، ایران پر مشرکیہ اصولوں کی حکومت تھی کسی عورت کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہ تھا جب تک کہ وہ اپنے آپ کو قوم کی مشترکہ جائداد نہ بنادے۔ پوران دخت وایران دخت جیسی صاحب تخت و تاج حکمراں خواتین نے اس اصول کی تعمیل نہ کرنی چاہی تو فوراً ان کو تخت کی جگہ تختۂ موت دیکھنا پڑا۔

ہندوستان میں گوشائیں، بیراگی، چپرانکت (آچاری) ویشنو آوک، دام مارگی چوبی، مارگ ہندو فرقے باہم جنگ و جدال میں مصروف تھے۔ ہندوستان میں داخل ہونے والی ہندو قوموں نے یہاں کے مفتوحین کو اچھوت قرار دیا تھا، بدھ ازم اور جین مت نے ہندوؤں کی نسل کشی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، شنکراچارج کا قائم کیا ہوا بدھ مت لوگوں کا دشمن تھا۔

غرض ساری دنیا میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، ان حالات میں رحمۃ للعالمین مبعوث ہوئے اور انسانی جان کی عظمت و حرمت بحال فرمائی، آپؐ نے ایک انسان کے قتل کو سارے انسانوں کا قتل قرار دیا، کیوں کہ قاتل اس قانون حرمت کو توڑ دیتا ہے جس سے تمام انسانوں کو زندگیاں بندھی ہوئی ہیں۔

من قتل نفساً بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً ومن احیاها فکانما احیا الناس جمیعاً (مائدہ ۳۲)

اگر کسی شخص نے ایک انسان کو بھی قتل کیا، بغیر اس کے اس نے کسی کو قتل کیا ہو، یا زمین میں فساد برپا کیا، تو گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کرڈالا۔ اور جس نے ایک شخص کی جان بچائی گویا اس نے سارے انسانوں کی جان بچائی۔

اسلامی جہاد رحمت کے خلاف نہیں:

رہا اسلام میں جنگ وجہاد کا معاملہ تو یہ اس اصول کے خلاف نہیں ہے، اس لئے کہ حضور نے جنگ کی اجازت ملک گیری یا خونریزی کے لئے نہیں دی، اور نہ اپنے مذہب کو ساری دنیا پر مسلط کرنے کے لئے، بلکہ آپؐ نے اس کو مظلوموں کی امداد کا آخری ذریعہ، عاجزوں، مجبوروں عورتوں اور بچوں کو ظالموں کے پنجے سے چھڑانے کا ایک ناگزیز وسیلہ، اور تمام مذاہب وادیان میں عدل وتوازن قائم کرنے کا آخری حیلہ قرار دیا، جو ظالم غریبوں کا خون چوستے ہیں، عورتوں، بچوں اور کمزوروں کو جبر واستبداد کی بھٹی میں پیستے ہیں، اور جو محبت کی زبان نہیں سمجھتے ان کے لئے تلوار ہی آخری تدبیر رہ جاتی ہے۔

دنیا کا کوئی رحمدل سے رحمدل انسان بھی ایسے حالات میں جنگ کی ضرورت کا انکار نہیں کر سکتا، اور ایسی جنگیں زحمت نہیں بلکہ دنیا کے لئے رحمت ثابت ہوتی ہیں۔ اسلام جہاد کے ذریعہ کمزوروں اور پسماندہ لوگوں کے حقوق کی بازیابی کرنا چاہتا ہے۔

عدل وتوازن کا قیام:

جنگ کا مقصد مذاہب کے درمیان عدل وتوازن قائم کرنا اور تمام مذہبی عبادتگاہوں کا تقدس واحترام بحال کرنا ہے، خواہ وہ کسی بھی مذہب کی عبادت گاہ کیوں نہ ہو، اگر کسی حالت مین جنگ کی اجازت نہ دی جائے تو کسی بھی مذہب کے مقامات مقدسہ کی حفاظت ناممکن ہو جائے گی، ظلم کا حوصلہ بڑھتا رہے گا۔ اور اس کا ہاتھ بڑھتے مذہبی عبادت گاہوں تک پہونچ جائے گا۔

قرآن اسلامی جہاد کا مقصد بتاتا ہے:

ومالكم لاتقاتلون فى سبيل الله والمستضعفين من الرجال والنساء والولدان الذين يقولون ربنا اخرجنامن هذه القرية الظالم اهلها (نساء ۷۵)

تم خدا کی راہ میں اور ضعیف مردوں اور عورتوں اور بچوں کے بچاؤ کے لئے کیوں جنگ نہیں کرتے؟ حالانکہ وہ دعائیں کررہے ہیں کہ خدایا! ہم کو اس بستی سے نکال جہاں کے

باشندے بڑے ظالم ہیں۔

ولو لا دفع اللہ الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیها اسم اللہ کثیراً (حج ۴۵)

اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعہ نہ روکے تو عیسائیوں کے گرجے یہودیوں کے عبادت خانے، پارسیوں کے مندر اور مسلمانوں کی مسجدیں گرادی جائیں جن میں خدا کا بہت نام لیا جاتا ہے۔

رحمت عالم ﷺ کی اعلیٰ ظرفی:

دنیا کا کوئی پیغمبر نہیں جس نے سارے عالم کے مذہبی مقامات کی حفاظت کا ذمہ لیا ہو، جس نے کھلے دل کے ساتھ ہر طبقہ و قوم کے مقامات مقدسہ کا احترام کیا ہو، تاریخ میں کوئی قوم ایسی تیار نہ ہوئی جس نے تمام اقوام عالم کے ساتھ وسیع النظری اور وسیع المشربی کا ایسا مظاہرہ کیا ہو جو رحمت عالم کی تیار کردہ قوم نے کیا، کیا کسی دوسری قوم یا پیشوائے قوم نے بھی اپنی جنگوں میں اس اصول کا لحاظ رکھا تھا؟

دوسری قوموں کی تنگ نظری:

ہم تو دیکھتے ہیں کہ ایرانیوں نے پرویز کے عہدِ حکومت میں ایشائے کوچک پر قابض ہونے کے بعد عیسائیوں کے گرجاؤں کو گرادیا تھا، پھر دس سال بعد جب عیسائیوں نے دوبارہ اس پر قبضہ کیا تو انہوں نے پارسیوں کی پرستش گاہوں کو فنا کردیا۔

روما کے بادشاہوں نے جب یہودیوں کے علاقے پر قبضہ کیا تو یہود کے تمام عباد خانے زمین بوس کردیئے گئے حتیٰ کہ یروشلم کی زمین کو بھی جس کی عمارت ۸۰ء میں نیرو شاہ روما نے گرادی تھی اور قسطنطین (اولین عیسائی بادشاہ) کی والدہ کے حکم سے اس مقدس کوڑا کرٹ پھینکنے کی جگہ بنادیا گیا۔

اس لئے اسلامی جنگوں کے بارے میں یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اسلام تشدد اور خونریزی کے راستہ سے توسیع مملکت یا اشاعت اسلام چاہتا ہے، اسلام اپنی اشاعت کے لئے ملکوں کو نہیں دلوں کو فتح کرتا ہے اور اس کیلئے وہ تلوار کا نہیں بلکہ اخلاق اور پاکیزہ تعلیمات کا ہتھیار استعمال کرتا ہے۔

جنگی اصولوں میں بھی رحمت کا لحاظ:

بلکہ اسلامی جنگوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہو گا کہ رحمۃ لعالمین نے جنگی اصولوں میں بھی رحمت و کرم کا کتنا لحاظ فرمایا ہے، مثلاً حضور نے فرمایا کہ جنگ شروع کرنے سے کافی قبل اپنے مقابل کو الٹی میٹم دے دی جائے تاکہ اس عرصہ میں باہمی سمجھوتے کی کوئی ایسی صورت نکل آئے جس سے جنگ ٹل جائے۔

قرآن مجید میں ہے:

فسیحوا فی الارض اربعة اشهر (توبہ ۲) یعنی تم کو چار ماہ کی مہلت ہے۔

جنگ کے لئے اتنی مہلت کا دیا جانا بذات خود رحمت ہے۔ لیکن اگر باوجود کوشش کے جنگ ٹالی نہ جاسکے اور جنگ شروع ہو جائے تو بھی آپ نے بہت سی ایسی صورتوں کا استثناء فرمایا ہے جن میں جنگ کرنے کی اجازت نہیں ہے، مثلاً کہا گیا۔

۱۔ **الاالذین یصلون الی قوم بینکم وبینهم میثاق** (نساء) جو لوگ ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں جن سے تمہارا معاہدہ ہے۔

۲۔ **اوجائوکم حصرت صدورهم ان یقاتلوکم اویقاتلوا قومهم** (نساء) یا وہ جو حاضر ہو کر کہہ دیں کہ وہ تم سے یا اپنی قوم سے جنگ کا ارادہ ختم کر چکے ہیں، تو ایسے لوگ جنگ سے مستثنیٰ ہوں گے۔

ایک جگہ صاف لفظوں میں کہا گیا:

۳۔ **فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل الله لک علیهم سبیلاً** پھر اگر یہ لوگ علیٰحدہ ہو جائیں اور تم سے جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کی درخواست کریں تب خدا نے تم کو ان پر کوئی راہ نہیں دی۔ (نساء۹)

۴۔ ان کے علاوہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں، اور معذوروں پر بھی تلوار اٹھانے سے منع کیا گیا ہے۔

جنگ کے یہ اصول بلا شبہ لطف و کرم پر مبنی ہیں، دنیا کے کس فاتح نے جنگ کے ایسے رحمدلانہ اور عادلانہ اصول بنائے ہوں گے۔

یہ صرف رحمۃ للعالمین کا ظرف ہے جو عین میدان جنگ میں بھی اپنے دشمنوں کے ساتھ رحیمانہ اور کریمانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ بیشک آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں۔

(۷) والدین کے ساتھ حسن سلوک:

حضور نے ماں باپ کی خدمت واطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی اور ماں باپ کے ساتھ ناقدری برتنے والوں کی سخت ملامت فرمائی، ارشاد ربانی ہے:

وقضی ربك الا تعبدو االا اياه و بالوالدين احساناً اما يبلغن عند ك الكبر احدهما او كلا هما فلا تقل لهما افٍ ولا تنهر هما وقل لهما قولاً كريما . واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربيني صغيراً
(بنی اسرائیل-۲۳-۲۴)

اور تیرے رب نے فیصلہ کردیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں ان میں سے ایک یا دونوں تو ان کو "اف" نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور ان کے سامنے نرمی سے عجز کے بازو جھکادو اور کہو کہ اے رب ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا۔

ایک شخص نے حضور ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ میں جہاد میں شامل ہونا چاہتا ہوں، حضورؐ نے پوچھا کیا تیرے ماں باپ زندہ ہیں؟ وہ بولا، ہاں، فرمایا: "انہی میں جہاد کرو" یعنی ان کی ہر ممکن خدمت کرو (بخاری شریف، کتاب الادب ج۲ ص ۸۸۳)

(۸) عفوودرگذر کی تعلیم:

رحمۃ للعالمین ﷺ نے عفوودرگذر کی تعلیم دی اور یہ ذہن بنایا کہ اگر یہ چاہتے ہو کہ خدا تمہاری غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف کرے تو تم کو بھی اس کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ تم بھی دوسروں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف کرو، اس لئے کہ جو چیز اپنے حق میں پسند کرتے ہو وہ دوسروں کے حق میں بھی پسند کرنا چاہئے، قرآن میں ہے:

وليعفوا وليصفحوا الا تحبون ان يغفر الله لكم (نور ۲۲)

چاہئے کہ تم معاف کرو اور درگذر کرو، کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تم کو معاف کردے

(۹) نفرت کا خاتمہ:

خودکشی پر آمادہ انسانیت کو آپؐ نے حیاتِ نو بخشی، اختلاف وانتشار کے ہنگاموں کو فروکیا، نفرت وعداوت کی دنیا میں آپ ﷺ نے محبت ویکجہتی کا درس دیا، جس کے انقلاب آفریں اثرات پڑے، خود خالق کائنات اس کی شہادت دیتا ہے۔

واذکر و انعمة الله علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا و کنتم علی شفاحفرة من النار فانقذکم منها (آل عمران ۱۵۳)

اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے کرم سے بھائی بھائی ہوگئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہونچ چکے تھے تو خدا نے تم کو اس سے بچالیا۔

(۱۰) انسانیت کو نقطۂ عروج پر پہونچایا:

حضور ﷺ نے انسانیت پر جو بے شمار احسانات کئے ہیں ان کے لئے طویل دفتر بھی ناکافی ہے، یہاں چند صرف ان احسانات کا ذکر کرنا مقصود ہے، جو حضور ﷺ نے سلگتی اور جھلستی انسانیت پر ترس کھاکر رحمت عالم کی حیثیت سے کئے ہیں، آپ نے اپنی بے لوث اور رحمت و حقیقت پر مبنی تعلیمات سے انسانیت کی تقدیر بدل کر رکھ دی، ورنہ ایک وقت تھا کہ دنیا میں پالتو جانوروں اور مقدس درختوں کی تو کچھ قیمت تھی مگر قیمت نہیں تھی تو انسانیت کی معمولی جانوروں اور درختوں کے آگے بھی انسان اپنا سر جھکا دیتا تھا بعض مقدس روایات کی خاطر انسان کی قیمتی جانیں لی جاسکتی تھیں، انسانوں کے خون اور گوشت کے چڑھاوے چڑھائے جاسکتے تھے، آج بھی بعض بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک میں اس کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں ۔اس بے قدر انسانیت کی قیمت محمد ﷺ نے بڑھائی آپؐ نے دل و دماغ میں یہ نقش بٹھایا کہ انسان اس کائنات کی سب سے زیادہ قیمتی، قابل احترام، لائق محبت اور مستحق حفاظت چیز ہے، انسان سے اوپر کوئی ہستی ہے تو صرف خدائے پاک کی، قرآن نے انسان کو اللہ کا خلیفہ قرار دیا:

انی جاعل فی الارض خلیفةً (بقرہ ۳۰) میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں (یعنی انسان)

اور یہ اعلان کیا کہ یہ دنیا اور یہ سارا کارخانۂ عالم اسی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

هو الذی خلق لکم مافی الارض جمیعاً (بقرہ ۲۹)

وہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو اس زمین پر ہے۔ قرآن نے انسان کو "اشراف المخلوقات" اور اس بزم عالم کا صدر نشین قرار دیا، **ولقد کرمنا بنی آدم وحملنا هم فی البر والبحر ورزقنٰهم من الطیبات وفضلنٰهم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلاً** (الاسراء ۷۰) اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری اور پاکیزہ روزی عطا کی، اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی اس سے بڑھ کر اعزاز کیا ہو

سکتا ہے کہ انسان کو خدا کا کنبہ قرار دیا گیا الخلق عیال الله فا حب الخلق الی الله من احسن الی عیاله (مشکوۃ بروایت بیہقی ص ۴۲۵) ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، پس خدا کو اپنے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ بندہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

ایک حدیث قدسی میں تو انسانی عظمت کو نقطۂ عروج پر پہونچا دیا گیا، حدیث یہ ہے:

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا کہ اے فرزند آدم میں بیمار ہوا تو مجھے دیکھنے نہیں آیا، بندہ کہے گا پروردگار! میں تیری عیادت کیا کر سکتا ہوں تو تو رب العالمین ہے، ارشاد ہوگا کیا تجھے معلوم نہیں ہوا میرا فلاں بندہ بیمار پڑ گیا تھا تو اس کی عیادت کو نہیں گیا، تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا پھر ارشاد ہوگا اے فرزند آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا، تو نے مجھے کھانا نہیں دیا، بندہ عرض کرے گا پروردگار! میں تجھے کیسے کھانا کھلا سکتا ہوں تو تو رب العالمین ہے، ارشاد ہوگا کیا تجھے اس کا علم نہیں ہوا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے اسے نہیں کھلایا کیا تجھے اس کی خبر نہ تھی کہ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو تو اس کو میرے پاس پاتا۔ اے فرزند آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا، بندہ عرض کرے گا اے رب! میں تجھے کیسے پانی پلا سکتا ہوں تو تو رب العالمین ہے، ارشاد ہوگا تجھ سے میرے فلاں بندہ نے پانی طلب کیا تھا تو نے اسے پانی نہیں دیا، تجھے پتہ نہیں کہ اگر تو اس کو پانی پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا۔ (مشکوۃ شریف)

انسانیت کی بلندی اور انسان کی رفعت و محبوبیت کا اس سے بڑھکر اعتراف و اعلان کیا ہو سکتا ہے، اور کیا دنیا کے کسی مذہب و فلسفہ میں انسان کو یہ مقام دیا گیا ہے؟

حضور ﷺ نے انسانوں کے ساتھ رحمت و شفقت کی تاکید فرمائی اور اس کو خدا کی رحمت و کرم کیلئے شرط قرار دیا، آپؐ نے ارشاد فرمایا: الراحمون یرحمهم الرحمن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء (مشکوۃ ص ۴۲۳) رحم کرنے والے پر رحمٰن کی رحمت ہوتی ہے، اگر تم اہل زمین پر رحم کھاؤ گے تو آسمان والا تم پر رحم فرمائیگا۔

علامہ حالؔی نے اسی مفہوم کو اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

انسانیت کی اس سے بڑی معراج کیا ہو سکتی ہے اور یہ معراج نصیب ہوئی سرکار دو عالم

رحمۃ العالمین حضرت محمد مصطفی ﷺ کے طفیل۔

وحدتِ انسانی کی تعلیم:

انسانیت پر حضور ﷺ کا ایک عظیم احسان یہ ہے کہ آپؐ نے اس کی مختلف وحدتوں کو یکجا کر کے ایک وحدت میں تبدیل کیا، آپؐ نے وحدت انسانی کا تصور ایسے وقت پیش کیا جب انسان قوموں، برادریوں، ذات پات اور اعلیٰ وادنیٰ طبقوں میں بٹا ہوا تھا، ان کے درمیان انسانوں اور جانوروں، آقاؤں اور غلاموں اور عبد و معبود کا سا فرق تھا، آج اسلام کے فیض سے وحدت انسانی کا تصور خواہ کتنا ہی مانوس ہو چکا ہو، لیکن ایک زمانہ وہ تھا جب یہ دنیا کا سب سے عجیب تصور سمجھا جاتا تھا، جو شخص یہ نظریہ پیش کرتا تھا اس کو لوگ بڑی حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ سارے انسان انسانیت کے ناطے یکساں کیسے ہو سکتے ہیں؟ اور ان کے درمیان وحدت و مساوات کیسے قائم ہو سکتی ہے؟

دوسری قوموں کی فکری ناہمواری:

یہ وہ وقت تھا جب مختلف قوموں اور خاندانوں کے مافوق البشر ہونے کا عقیدہ قائم تھا، اور بہت سی نسلوں اور خاندانوں کا نسب نامہ خدا سے اور سورج چاند سے ملایا جارہا تھا، یہود و نصاریٰ کا قول خود قرآن نے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم خدا کی لاڈلی اور چہیتی اولاد ہیں:

وقالت الیهود والنصاریٰ نحن ابناء الله واحباءه (مائدہ ۱۸)

مصر کے فراعنہ اپنے کو سورج دیوتا کا اوتار کہتے تھے، ہندوستان میں سورج بنسی اور چندر بنسی خاندان موجود تھے، شاہان ایران جن کا لقب کسریٰ (خسرو) ہوتا تھا اس کا دعویٰ تھا کہ ان کی رگوں میں خدائی خون ہے، اہل ایران انہیں اسی نظر سے دیکھتے تھے ان کا اعتقاد تھا کہ ان پیدائشی بادشاہوں کے خمیر میں کوئی مقدس آسمانی چیز شامل ہے، کیانی سلسلہ کے آخری ایرانی شہنشاہ یزدگرد کا نام بتاتا ہے کہ ایرانی اس کو خدا کا کس درجہ مقرب اور ہم نشیں سمجھتے تھے۔

چینی اپنے شہنشاہ کو آسمان کا بیٹا تصور کرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ آسمان نر اور زمین مادہ ہے ان دونوں کے اتصال سے کائنات کی تخلیق عمل میں آئی ہے، اور شہنشاہ (خنااول) اس جوڑے کا پہلوٹھا بیٹا ہے (تاریخ چین از جمیس کارکرن) عرب اپنے سوا ساری دنیا کو گونگا اور بے زبان (عجم) کہتے تھے، ان کا سب سے ممتاز قبیلہ قریش عام عربوں سے بھی اپنے کو بالا

وبرتر سمجھتا تھا، اور اسی احساس برتری میں حج کے ایسے عمومی اجتماع میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھتا تھا (نبی رحمت ۲۱۹-۱۲۰)

ان حالات میں سوچئے کہ قرآن کا یہ اعلان کتنا اجنبی رہا ہوگا:-

یایها الناس انا خلقنا کم من ذکر وانثیٰ وجعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفو ا ان اکرمکم عند الله اتقاکم (الحجرات ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو، خدا کے نزدیک تم میں عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔

قرآن نے تمام پرانے تصورات کی بنیاد ہلا کر رکھدی، اس نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ جب سارے انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں تو ان میں امتیاز من و تو کیسا؟ رہا قومی اور قبائلی رنگا رنگی تو یہ محض شناخت کیلئے ہے، انسانیت کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہیں۔

حضور ﷺ نے قدسیوں اور اللہ والوں کے سب سے بڑے مجمع میں (کہ اولیاء اللہ اور مقربین بارگاہ کا اس سے بڑا مجمع چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھا) رحمۃ للعالمین ﷺ نے اعلان فرمایا:

ایهاالناس ان ربکم واحدوان اباکم واحد کلکم لآدم وآدم من تراب ان اکرمکم عندالله اتقاکم ولیس لعربی علی عجمی فضل الا بالتقویٰ (کنز العمال)

اے لوگو تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے، تم سب اولاد آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پاکباز ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کی بناء پر۔

وحدت انسانی کے دو پہلو:

دنیا کے سب سے بڑے پیغمبر ﷺ نے انسانیت کے عظیم الشان اجتماع میں دو طرح کی وحدتوں کا اعلان کیا۔ ایک انسانیت کی وحدت، دوسرے انسانیت کے بانی اور مورث کی وحدت، اور یہی وہ دو فطری مستحکم اور دائمی بنیادیں ہیں جن پر نسل انسانی کی حقیقی وحدت کا قصر تعمیر کیا جاسکتا ہے، اس طرح ہر انسان دوسرے انسان سے دوہرا رشتہ رکھتا ہے ایک روحانی و حقیقی طور پر وہ یہ کہ سب انسانوں اور جہانوں کا رب ایک ہے، دوسرے جسمانی اور ثانوی طور پر وہ یہ کہ سب انسان ایک باپ کی اولاد ہیں۔

توحید کی نعمت:

عہد جاہلیت میں یہ دونوں وحدتیں پارہ پارہ ہو چکی تھیں، جس طرح انسان انسان میں فرق تھا اسی طرح رب کا تصور بھی حد سے سے زیادہ انتشار کا شکار ہو چکا تھا، فخر و غرور سے اپنا سر اونچا کرنے والا، خدائی تک کا دعویٰ کرنے والا، اور دینا پر اپنی حکومت کا سکہ جمانے والا انسان بھی اتنا پست ہو چکا تھا کہ وہ درختوں، پہاڑوں، دریاؤں، جانوروں، ارواح وشیطان ہی کے سامنے نہیں بلکہ کیڑوں مکوڑوں تک کے سامنے سجدہ ریز ہو تا تھا لاکھوں کروڑوں معبود ان باطل گھر گھر موجود تھے۔ حضور نے انسانیت کو انتشار کے اس بدترین عذاب سے نجات دلائی، اور "رب واحد" کا تصور پیش فرمایا" آپؐ نے دلائل وواقعات سے ثابت کیا کہ خدا تو صرف ایک ہے، باقی جو ہیں سب اس کی قدرت کے مظاہر ہیں، مظاہر جلوہ گاہ ہیں معبود نہیں۔

حضور ﷺ کی اس تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ جن مذاہب واقوام میں کئی خداؤں کا عقیدہ تھا۔ وہ بھی توحید کی طرف مائل ہونے لگے، اور اپنا عقیدہ ان کو مضحکہ خیز نظر آنے لگا انہوں نے اگر چہ اپنے مذہب اور اپنی روایات کو ترک نہیں کیا، لیکن اپنی جھینپ مٹانے کے لئے اس کی طرح طرح کی تاویلیں کرنے لگے، تاکہ ان کا عقیدہ توحید سے قریب تر ہو سکے، اس طرح یہ بالکل درست ہے کہ ساری دنیا کو عمومیت کے ساتھ توحید کی نعمت ہمارے حضور ﷺ نے دی۔

(۱۲) مایوسی و بدگمانی کا خاتمہ:

حضور ﷺ سے قبل انسان خود اپنی فطرت سے بدگمان تھا، اور اپنے آپ پر بھی اسے کوئی اعتماد نہ تھا، اور یہ ذہن بعض ان مذاہب نے بنایا تھا جن میں ایک کے جرم کی پاداش دوسرے سے لی جاتی تھی، یا جن میں تناسخ (آواگون) کا عقیدہ پایا جاتا ہے، جس میں انسان کے ارادہ واختیار کو مطلق دخل نہیں، اور جس کی رو سے ہر انسان کو اپنے پہلے جنم کے اعمال اور غلطیوں کو سزا بھگتنی ضروری ہے، اسی طرح تبدیل شدہ عیسائیت نے انسان کو پیدائشی گنہگار قرار دیا، پھر اس کے بعد حضرت مسیح کے کفارۂ گناہ والے عقیدے کو ضرورت پڑی۔

اس طرح انسان نے جب دیکھا کہ یہاں کرتا کوئی ہے اور بھگتتا کوئی ہے، اسی طرح جزاء وسزاء کا کوئی اختیاری معیار نہیں ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ یہاں ہر ایک پیدائشی گنہگار ہے، تو پھر کیا ضرورت ہے اعمال صالحہ کی، اور کیا حاجت ہے خدا کے لئے ریاضت وعبادت کی

،اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان خود اپنے آپؑ سے بدگمان ہو گیا، اور اس مایوسی نے اسے بد اعمالیوں پر جری بنادیا۔

توبہ کی ترغیب:

حضور نے اس مایوسی کی فضا کو ختم کیا، انسان کا اپنے اوپر اعتماد بحال کیا۔ حضور نے دنیا کو بتایا انسان فطرۃً پاکباز پیدا ہوا ہے اور ہر انسان اپنی اصل کے لحاظ سے خدا کا مقرب ہے، اور یہ گناہ و خطا انسان کی عارضی کیفیت ہے، اس کی وجہ سے انسان کو گھبرانا نہیں چاہئے، یہ کیفیت سچی توبہ سے دور ہو سکتی ہے، حضور ﷺ نے یہ بھی بتایا اللہ اس سے خوش ہوتا ہے کہ انسان گناہ کر کے اس سے معافی مانگے، اس لئے کہ اللہ کی ایک صفت غفار بھی ہے، حضورؐ نے خدا کی طرف سے دل شکستہ انسانوں کو یہ پیار بھرا پیغام تسلی سنایا:

قل یٰعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمة الله ان الله یغفر الذنوب جمیعاً انه هو الغفور الرحیم (الزمر ۵۳)

کہہ دیجئے کہ اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بیشک اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔ بیشک وہ بڑا بخشنے والا اور بڑا رحم کرنیوالا ہے۔

حضور نے گناہ سے توبہ کرنے والوں کو تسلی دی کہ التائب من الذنب کمن لا ذنب له (مشکوٰۃ)

گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے جیسے کہ اس کا کوئی گناہ ہی نہ ہو قرآن نے واضح لفظوں میں اعلان کیا کہ انسان اپنی زندگی کا آغاز خود کرتا ہے اور خود ہی اپنے اچھے یا برے عمل کا ذمہ دار ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے کے عمل کا ذمہ دار اور جواب دہ نہیں ہے۔

الا تزروا زرة وزراخریٰ وان لیس للا نسان الاماسعی وان سعیه سوف یری ثم یجزئه الجزاء الاوفیٰ (النجم ۴۱۳۸)

یہ کہ شخص دوسرے (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسانوں کو وہی ملتا ہے جس کوی وہ کوشش کرتاہے، اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائیگی پھر اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

قرآن نے انسانوں کی مایوسی ختم کرنے کے لئے کہا کہ مایوس مت ہو، مایوسی اچھی چیز نہیں ہے، مایوسی تو کفر و ضلالت کے بطن سے جنم لیتی ہے تم اگر مومن ہو تو پھر تمہیں مایوسی کیسی؟ حضرت یعقوبؑ کی زبانی کہلوایا گیا:

انه لا یایئس من روح الله الا القوم الکافرون (یوسف ۸۷)
اللہ کی رحمت سے وہی لوگ مایوس ہو سکتے ہیں جو خدا کے منکر اور اس کی ذات وصفات سے نا آشنا ہیں۔

ایک دوسری جگہ حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے اعلان کرلیا گیا کہ:
ومن یقنط من رحمة ربه الا الضالون (الحجر ۵۶)
اپنے رب کی رحمت سے گمراہوں کے سوا کون مایوس ہو سکتا ہے۔

اگرچہ حضور ﷺ سے قبل بھی بہت سے مذاہب میں توبہ کا اصول موجود تھا، لیکن ایک تو وہ مذاہب اپنے دائرہ کار کے لحاظ سے محدود تھے۔ دوسرے توبہ کا وہ جامع تصور موجود نہیں تھا جو ہمارے حضور ﷺ نے پیش فرمایا، تیسرے ساری دنیا میں بھرے ہوئے طوفانوں کے مقابلے کی ان میں تاب نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری دنیا کفر وضلالت وجہالت وکم فہمی، اور یاس وقنوط کے اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی، تاریخ میں سب سے پہلے جس شخص نے پوری قوت وطاقت کے ساتھ یاس وقنوط کے دبیز پردوں کو چاک کیا اور توبہ استغفار کا زریں اصول شکستہ دل انسانیت کے سامنے پیش کیا وہ ہمارے حضور ﷺ کی ذات گرامی تھی، اسی بناء پر آپ کے ناموں میں سے ایک نام نبی التوبۃ بھی ہے یعنی توبہ وانابت کا پیغامبر۔

یہ حضور کا جذبۂ رحمت ہی تھا جس نے تمام شکستہ دل انسانوں کو جوڑنے کی کوشش فرمائی اور زخم زدہ انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھا۔ کسی ایک طبقہ وخطہ کے لوگوں کیلئے نہیں بلکہ سارے عالم کے انسانوں کیلئے بیشک حضور ﷺ رحمۃ للعالمین تھے۔

از: محمد فرقان قاسمی علیگ سلطان پوری

غلامی کا مسلہ اُن ذلیل ہتھکنڈوں کی بدترین مثال ہے جو مسلم نوجوانوں کو اپنے دین سے بیزار اور منحرف کرنے کے لئے مغربیت زدہ طبقہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اسلام زندگی کے تمام ادوار کے لئے موزوں اور ان کی ضروریات سے ہم آہنگ ہوتا تو وہ انسانوں کو غلام بنانے کی اجازت نہ دیتا اور نہ غلامی برداشت کرتا۔ چنانچہ غلامی کے مسئلے کا پایا جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دین تاریخ کے ایک خاص دور کیلئے تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ اپنے مشن کی تکمیل کر چکا ہے اور اب یہ فرسودہ ہو چکا ہے کیونکہ یہ تمام زمانوں اور ادوار کیلئے نہیں تھا۔

شبہات کے گرداب میں:

سچے پکے اور مخلص مسلم نوجوان بھی شکوک و شبہات کی اس فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کے دلوں میں بھی مختلف شکوک و شبہات اُبھرنے لگتے ہیں، وہ سوچنے لگتے ہیں کہ آخر اسلام نے غلامی کی اجازت کیوں دی ہے؟ بے شک اسلام خدا کا نازل کردہ دین ہے اور اس کا مقصد ہر زمان و مکان کے افرادِ انسانی کی فلاح ہے مگر غلامی کو اُس نے کیوں برداشت کرلیا؟ اسلام کی بنیاد ہی کامل مساواتِ انسانی کے اصول پر ہے اور جو تمام بنی آدم کو ایک ہی ماں باپ کی اولاد قرار دیتا ہے اور جس نے۔ معاشرتی زندگی کی تشکیلِ نو مساوات کے اس کامل تصور پر عملاً بھی کرکے دکھادی ہے۔ اس نے غلامی کو اپنے معاشرتی نظام میں کیوں جگہ دی اور اس کے لئے مختلف ضابطے اور قوانین کیوں مرتب کر ڈالے؟ کیا اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ نوع انسانی دائمی طور پر آقاؤں اور غلاموں کے دو مستقل طبقوں میں بٹی رہے؟ کیا اس کی مشیت یہی ہے کہ انسانوں میں ایک طبقہ حیوانوں اور بے زبان جانوروں کے مانند منڈیوں میں بیچا اور خریدا جاتا رہے جب کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب قرآن مجید میں ارشاد فرمادیا ہے کہ:

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِی آدَمَ۔اور بے شک ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی۔
اور اگر منشائے الٰہی یہ نہیں تھا تو اس نے اپنی کتاب میں اس کی صریح ممانعت کا اعلان کیوں نہیں کیا؟ جیسا کہ شراب، جوئے، اور سود کے بارے میں صراحتاً اعلان کیا گیا ہے۔
الغرض آج کا مسلم نوجوان یہ تو جانتا ہے کہ اسلام سچا دین ہے مگر حضرت ابراہیم کی مانند وہ اضطراب اور تحیر کی اس کیفیت سے دوچار ہے جس کا نقشہ قرآن پاک کی اس آیت میں کھینچا گیا ہے۔
وَ إِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى. قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي
ترجمہ :۔ جب ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ میرے مالک! مجھے دکھادے تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے فرمایا! کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ ابراہیمؑ نے کہا کہ ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا ایمان درکار ہے۔"
اس کے برعکس استعماری طاقتوں کی شرارتوں اور سازشوں کی جن کی عقلیں ماری گئی ہیں اور جن کے عقائد و نظریات پر پریشان خیالی اور پراگندہ فکری کا غلبہ ہے وہ حقیقت تک پہونچنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ ان میں وہ ہمت و حوصلہ ہی نہیں جو کسی صداقت تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے جذبات اور خواہشات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے یہ نتیجہ نکال بیٹھتے ہیں کہ اسلام قصہ ماضی بن چکا ہے۔ اب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔

اشتراکی فریب کی حقیقت :

اشتراکی پرچارک لوگوں کو یہ کہہ کر دھوکا دیتے ہیں کہ وہ سائنٹفک نظریات کے حامل ہیں مگر اُن کے اس نظریات کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کے اپنے ذہنوں کی پیداوار نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنے غیر ملکی آقاؤں سے اِن نظریات کو مستعار لیا ہے۔ اس کے باوجود یہ اپنے ان مستعار خیالات کو کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ گویا وہ کوئی بہت بڑی ابدی اور ناآشنا صداقت ہے جو انہوں نے بہت کوششوں کے بعد دریافت کی ہے۔ جس کے بارے میں دورائیں ہو ہی نہیں سکتی ہیں۔ جس صداقت کی دریافت کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں وہ جذلی مادیت (DIALECTICAL MATERIALISM) کا نظریہ ہے۔ اس نظریئے کے مطابق انسانی زندگی چند مخصوص اور ناگزیر معاشی مراحل سے گذرتی ہے۔

اس کا پہلا مرحلہ اشتراکیت ہے۔ دوسرا مرحلہ غلامی، جاگیرداری اور سرمایہ داری پر مشتمل ہے۔ تیسرا اور آخری مرحلہ جو اس نظریے کے مطابق تاریخ انسانی کا آخری باب ہے وہ اشتراکیت ثانیہ کا مرحلہ ہے۔ اس نظریئے کے مطابق تاریخ انسانی کا آخری باب ہے وہ اشتراکیتِ ثانیہ کا مرحلہ ہے اس نظریئے کے رُو سے وہ تمام عقائد و نظریات اور نظام ہائے فکر و عمل، جن سے نسل انسانی کو تاریخ میں واسطہ رہا ہے دراصل وہ اپنے اپنے ادوار کے مخصوص معاشی نظام یا معاشرتی حالات و واقعات کا عکس محض تھے اس سے زیادہ ان کی اور کوئی حقیقت نہیں۔ ماضی میں پیدا ہونے والے عقائد و نظریات اور نظام ہائے فلسفہ اپنے اپنے دور کے لئے بہت خوب تھے کیونکہ وہ اُس زمانے کے معاشی ڈھانچے اور اقتصادی حالات سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ مگر وہ بعد کے زیادہ ترقی یافتہ ادوار کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتے، کیونکہ ہر دور کے اپنے مخصوص اقتصادی حالات ہوتے ہیں جن پر اس کے نظام ہائے افکار کی بنیاد ہوتی ہے ہر نئے دور کا نظام فکر پچھلے ادوار سے بہتر اور زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ انسانی زندگی کے لئے کوئی ایسا منفرد اور دائمی نظام حیات وضع نہیں کیا جا سکتا جو آنے والے ہر زمانے کے لئے موزوں و مناسب ہو۔ اسلام ایک ایسے دور میں آیا تھا جب غلامی کا دور خاتمے کے قریب آلگا تھا اور دورِ جاگیرداری کا آغاز ہو رہا تھا اس لئے اُس نے ایسے قوانین، عقائد اور نظامِ زندگی پیش کیئے جن میں اس دور کے مخصوص اقتصادی پس منظر کی واضح جھلک موجود ہے۔ مروجہ غلامی کو سند تصدیق عطا کرنے اور ساتھ ہی ساتھ جاگیردارانہ نظام کو بھی برقرار رکھنے کی علت یہی ہے کیونکہ "کارل مارکس کے" کہنے کے مطابق یہ ممکن ہی نہ تھا کہ آئندہ قیامت تک جو زیادہ ترقی یافتہ معاشی حالات پیش آنے والے ہیں، اسلام ان کی ضروریات سے ہم آہنگ قوانین اور دستورحیات قبل از وقت مرتب کر سکے۔

اشتراکیت کے اس دعوے کی حقیقت کیا ہے؟ اُسے معلوم کرنے کے لئے آیئے غلامی کے مسئلے کا اس کے صحیح تاریخی، معاشرتی اور نفسیاتی پس منظر میں جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس کھوکھلے دعوے کی اصل حقیقت کیا ہے؟

غلامی کی بھیانک تصویر:

آج کا انسان اپنی بیسویں صدی کے ذہنی پس منظر میں جب غلامی کے مسئلے پر نظر ڈالتا

ہے اور اسکی تاریخ کو انسانوں کی تجارت اور عہدِ روما کے گھناؤنے جرائم سے داغدار پاتا ہے تو غلامی کی ایک نہایت مکروہ اور بھیانک تصویر اس کے سامنے آتی ہے۔ اس کے لئے یہ یقین کرنا آسان نہیں رہتا کہ کوئی مذہب یا نظامِ زندگی غلامی کو جائز قرار دے سکتا ہے یا اسلام جس کے بیشتر اصول اور قوانین انسان کے لئے غلامی کی ہر نوع سے آزادی پر مبنی ہیں وہ اس کے جواز کا فتویٰ دے سکتا ہے۔ مگر یہ اندازِ فکر اسلام سے عدمِ واقفیت کا نتیجہ ہے کیونکہ غلامی کی اس مکروہ تصویر کا اسلام سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلام کا کارنامہ:

اس سلسلے میں آیئے ذرا تاریخ کی شہادت بھی لیتے چلیں۔ حقیقت یہ کہ رومی دور کے حیوان نما بھیانک جرائم سے اسلامی تاریخ قطعاً نا آشنا ہے۔ روما کی سلطنت میں غلام جس طرح زندگی بسر کرتے تھے اس کے بارے میں ہمارے پاس شواہد و کوائف کا خاصا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ اس کی روشنی میں ہمیں اس انقلابِ عظیم کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے جو اسلام کی بدولت غلاموں کی دنیا میں رونماء ہوا۔ یہ اتنا بڑا کارنامہ تھا کہ اس کے بعد کسی دیگر چیز کی ضرورت نہیں تھی مگر اسلام نے صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا۔ بلکہ انسانی آزادی کا صحیح تصور پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل کر کے بھی دکھادیا۔

عہدِ روما میں غلامی:

رومیوں کے عہد حکومت مین غلاموں کو انسان سمجھا ہی نہیں جاتا تھا بلکہ محض جنسِ تجارت خیال کیا جاتا تھا۔ انہیں کسی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے مگر مشکل فرائض اور دشوار کن ذمہ داریوں سے وہ گرانبار ضرور تھے۔ یہ غلام کہاں سے آتے تھے؟ اِن کا سب سے بڑا ذریعۂ آمد جنگیں تھیں جو کسی بڑے نصب العین یا اصولوں کے خاطر نہیں لڑی جاتی تھیں بلکہ دوسروں کو غلام بنانے اور انہیں اپنے خود غرضانہ مقاصد کے لئے آلہ کار کے طور پر استعمال کرنے کے لئے برپا کی جاتی تھیں۔ چنانچہ ان جنگوں میں جو لوگ پکڑے جاتے تھے وہ سب کے سب غلام بنالیے جاتے تھے۔ ان جنگوں کا مقصد اہل رُوما کے لئے عیش و عشرت کے سامان، ٹھنڈے اور گرم حمام، ملبوسات فاخرہ، لذیذ کھانے اور دوسری سہولیاتِ زندگی فراہم کرنا تھا۔ چنانچہ قحبہ گری، مے خواری، رقص و سرور کی محفلیں، ثقافتی مجالس اور میلے ٹھیلے اُن میں عام تھے۔ مادی آسائش اور عیاشی کے اس سر و سامان کو مہیا کر

نے کے لئے اہل روما دوسری قوموں پر چڑھ دوڑتے تھے اور انہیں غلام بنا کر بے دردی سے اپنی بوالہوسی اور ہوسناکی کا شکار بناتے تھے۔ مصر کو اسلام نے آکر رومیوں کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرایا۔ مصر، رومی عہد میں اس قسم کے مظالم کا بری طرح سے تختۂ مشق بنارہا ہے رومی سلطنت کے لئے یہ ملک محض گندم کی منڈی تھی یا مادی سازوسامان کی فراہمی کا ایک ذریعہ۔

غلاموں کی حالتِ زار:

رومی استعمار کی حرص و ہوس کے لئے سامانِ عیش و عشرت فراہم کرنے کی خاطر غلاموں کے ریوڑ دن بھر کھیتوں میں جتے رہتے تھے مگر اسکے باوجود انہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نصیب نہ ہوتا تھا بلکہ صرف اتنا دیا جاتا تھا کہ جس سے ان کا رشتہ جسم وروح برقرار رہے اور وہ اپنے آقاؤں کے لئے کام کرتے رہیں۔ بے جان درختوں اور وحشی درندوں سے بھی گئی گذری ان کی حالت تھی دن کو کام کے اوقات میں غلاموں کو بیڑیاں پہنادی جاتی تھیں تاکہ وہ اپنے نگہبانوں کی آنکھ بچا کر نکل بھاگ نہ سکیں معمولی سی حکم عدولی پر ان کی پیٹھوں پر بے تحاشا کوڑے برسائے جاتے تھے۔ کیونکہ اُن کا آقایا اس کا مقامی کارکن انہیں ستانے اور اذیت دینے میں لذت محسوس کرتا تھا۔ شام کو جب کام ختم ہوجاتا تو غلاموں کو دس دس ، بیس بیس اور بچاس بچاس کی مختلف ٹکڑیوں میں بانٹ کر مویشیوں کی طرح انہیں غلیظ بدبو دار اور چوہوں، کیڑے مکوڑوں سے پٹے ہوئے باڑوں میں بند کردیا جاتا تھا ان کے ہاتھ پاؤں اس حالت میں بھی بیڑیوں سے آزاد نہیں ہوتے تھے مویشیوں کو تو کھلے اور وسیع باڑوں میں رکھا جاتا تھا مگر یہ لوگ زندگی کی اس سہولت سے بھی محروم تھے۔

رُومی زندگی کا گھناؤنا پہلو:

مگر غلاموں کے بارے میں اہل روما کے رویہ کی مکروہ ترین اور انتہائی گھناؤنی تصویر ہمیں ان کی محبوب اور دل پسند تفریح میں نظر آتی ہے۔ اس سے اُس وحشت و بربریت اور درندگی کا بخوبی اظہار ہوتا ہے جو رومی تہذیب کے مزاج میں رچی بسی تھی اور جو دورِ جدید میں یورپ اور امریکہ نے اپنے جملہ استعماری ذرائع ووسائل کے ساتھ ورثے میں پائی ہے۔

ایک وحشیانہ کھیل:

آقاؤں کی ضیافتِ طبع کے لئے کچھ غلاموں کو تلواریں اور نیزے دے کر ایک اکھاڑے

میں ڈھکیل دیا جاتا تھا۔ اکھاڑے کے چاروں طرف تماشائیوں کیلئے نشستیں بنی ہوئی تھیں۔ جن پر اُن غلاموں کے آقا اور بسا اوقات شہنشاہِ روم رونق افروز ہوتا تھا کھیل شروع ہوتا تو غلام تلوار اور نیزوں سے ایک دوسرے پر پل پڑتے تھے یہاں تک کہ اُن کا قیمہ بن جاتا۔ جو خوش قسمت موت کے اس کھیل سے زندہ بچ جاتے وہ فاتح سمجھے جاتے تھے۔ انہیں دل کھول کر داد اور شاباشیاں دی جاتیں۔ زور شور سے تالیاں پیٹ کر خوشی کے نعروں اور قہقہوں سے اُن کا استقبال کیا جاتا تھا۔

عہدِ روما میں غلام کی حیثیت:

رومی دنیا میں غلام کی بس یہی معاشرتی حیثیت تھی اس موقع پر رومی قانون کی نگاہ میں غلام کی حیثیت کے متعلق ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے اور نہ آقاؤں کے اُن جابرانہ اختیارات کے تذکرے کی کوئی حاجت سمجھتے ہیں۔ جن کی رو سے غلام کی زندگی اور موت ان کی زندگی پر منحصر تھی۔ وہ پوری بے دردی اور بے خوفی سے غلاموں کو اپنے مذموم مقاصد کا آلہ کار بنا سکتے تھے کیونکہ غلاموں کو معاشرے کے کسی طبقے کی اخلاقی حمایت حاصل نہیں تھی۔

عام دنیا میں غلاموں کی حالت زار:

ایران، ہندوستان اور دنیا کے دوسرے ممالک کے غلام بھی مظلومی اور بے بسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ رومی غلاموں کے مقابلے میں ان کی حالت بھی کسی لحاظ سے بہتر نہ تھی۔ جزوی اختلاف کے باوجود دنیا کے مختلف ملکوں میں غلام کی حیثیت اور اس کے معاشرتی مقام کے بارے میں کوئی خاص فرق نہ تھا اس کی جان کی کوئی قیمت نہ تھی۔ نہ اس کا قتل کوئی ایسا جرم تھا جس پر لازم آتا ہو۔ غلاموں پر فرائض اور ذمہ داریوں کا کمر شکن بوجھ تھا مگر اس کے مقابلے میں ان کے حقوق بمنزلہ، صفر تھے۔ دنیا کے ان تمام ممالک میں غلاموں کے متعلق نہ نظرئے کا اختلاف تھا اور نہ ان کے معاشرتی حقوق میں کچھ فرق۔ بلکہ جو کچھ تھا وہ غلام کے بارے میں ان کے طرز عمل کی برائی اور ظلم کی سنگینی کے درجے میں فرق تھا۔ کہیں وہ ظلم و ستم کے زیادہ گھناؤنے مظاہرے سے دو چار تھے اور کہیں ذرا ہلکے اور نسبتاً کم گھناؤنے ہتھکنڈوں کا شکار تھے۔

اسلام کا انقلاب آفریں اعلان:

یہ تھے غلاموں کے وہ حالات جن میں اسلام کا ظہور ہوا۔ اُس نے غلاموں کو ان کی

کھوئی ہوئی انسانی عظمت دوبارہ عطا کی اُس نے آقاؤں اور غلاموں دونوں کو مخاطب کر کے صاف صاف کہا: بعضکم من بعض۔ج تم میں کا بعض، بعض سے ہے یعنی تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو۔ اسلام نے اعلان کیا کہ "جو ہمارے کسی غلام کو قتل کرے گا وہ اس کے بدلے میں قتل کیا جائے گا جو اس کی ناک کاٹے گا اس کی ناک کاٹی جائے گی۔ جو اس کو خصی کرے گا اس کے بدلے میں وہ بھی خصی کرادیا جائے گا۔ اسلام نے غلاموں اور آقاؤں، بالفاظ دیگر تمام انسانوں کے مشترک نقطہء آغاز، مشترک جائے قرار اور مشترک انجام کو واضح کیا اور بتایا کہ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے تھے۔ چنانچہ اُس نے آقا کو غلام پر محض آقائی کے بل بوتے پر کوئی فضیلت عطا نہیں کی بلکہ فضیلت کے لئے محض تقویٰ اور نیکی کو بنیاد قرار دیا۔ کسی عرب کو غیر عرب پر کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت سوائے تقویٰ کے حاصل نہیں ہے۔

عادلانہ برتاؤ کی تعلیم:

اس نے آقاؤں کو اپنے غلاموں سے اچھے اور عادلانہ برتاؤ کی تعلیم دی چنانچہ سورۂ نساء کی ۳۶ویں آیت میں ارشاد خداوندی ہے۔

ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو قرابت داروں یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ رشتہ دار پڑوسی سے اجنبی پڑوسی سے پہلو کے ساتھی مسافر اور اُن غلام باندیوں سے جو تمہارے قبضے میں ہوں احسان کا معاملہ کرو یقین جانو اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو غرور کرنے والا اور اپنی بڑائی پر فخر کرنے والا ہو۔

باہمی تعلق کی اصل بنیاد:

اسلام نے یہ حقیقت بھی انسان کے ذہن نشین کی کہ آقا اور غلام کے مابین اصل رشتہ آقائی اور غلامی کا یا حاکم اور محکوم کا نہیں ہے بلکہ بھائی چارے اور قرابت داری کا ہے چنانچہ آقاؤں کو اپنی مملوکہ باندیوں سے یہ کہہ کر شادی کرنے کی اجازت دی گئی کہ "جو شخص تم میں سے اتنی قدرت نہ رکھتا ہو کہ وہ خاندانی عورتوں سے نکاح کر سکے اُسے چاہئے کہ تمہاری اُن باندیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرلے جو تمہارے قبضے میں ہوں اور مؤمنہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے۔ تم سب ایک ہی گروہ کے

لوگ ہو لہٰذا اُن کے سرپرستوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کرلو اور دستور کے مطابق ان کے مہر ادا کرو"

غلام کا انسانی تصور:

اسلام نے آقاؤں کو سمجھایا کہ ان کے غلام ان کے بھائی ہیں۔ چنانچہ حضرت محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا "تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں لہٰذا تم میں سے جس کے قبضے میں اسکا کوئی بھائی ہو اس کو چاہیے کہ وہ اس کو ویسا ہی کھلائے اور پہنائے جیسا کہ وہ خود کھاتا اور پہنتا ہے۔ اس کو کوئی ایسا کام کرنے کو نہ کہے جس کو کرنے کی وہ استطاعت نہ رکھتا ہو اور اگر کبھی اُسے ایسا کام کرنے کو کہے تو وہ خود بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹائے" یہی نہیں بلکہ اسلام نے غلاموں کے جذبات و احساسات تک کا احترام کیا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ "تم میں سے کوئی اپنے غلام کے بارے میں یہ نہ کہے کہ یہ میرا غلام اور یہ میری باندی ہے اس کے بجائے اس کو یوں کہنا چاہیئے کہ یہ میرا خادم اور یہ میری خادمہ ہے" یہ اسی تعلیم کا اعجاز تھا کہ جب حضرت ابو ہریرہؓ نے جب آدمی کو گھوڑے پر سوار اور اس کے غلام کو اس کے پیچھے پیدل جاتے دیکھا تو انہوں نے گھوڑ سوار سے کہا کہ اس کو گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھالو کیونکہ وہ تمہارا بھائی ہے اور وہ بھی ویسی ہی روح رکھتا ہے جیسی کہ تم رکھتے ہو"

غلاموں کی فلاح کے لئے اسلام کے کارناموں کی داستان بس یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ بہت طویل ہے مگر آگے بڑھنے سے پیشتر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس عظیم انقلاب کے معمولی خد و خال بھی مختصر طور پر واضح کرتے چلیں جو اسلام کی بدولت اس پہلے مرحلے میں غلام کے معاشرتی مقام و مرتبہ میں نمایاں ہوا۔

اسلامی انقلاب کے بعد:

اسلام کی آمد کے بعد غلاموں کی حالت میں جو تبدیلی آئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ محض جنس تجارت نہ رہے بلکہ پہلی بار پورے انسانیت کے حقوق و احترام سے بہرہ ور ہوا۔ اسلام سے پہلے غلاموں کو انسان سمجھا ہی نہیں جاتا تھا، بلکہ انہیں ایک بالکل مختلف اور ادنیٰ درجے کی مخلوق خیال کیا جاتا تھا۔ جس کا مقصد وجود صرف یہ تھا کہ وہ دوسروں کی خدمت کرنے اور ان کے ہاتھوں ہر طرح کی ذلت و تحقیر صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرتا

اور سہتا رہے غلام کے بارے میں اس نظریہ کا نتیجہ تھا کہ غلاموں کو بے دریغ ہلاک کیا جاتا، انہیں وحشیانہ سزاؤں کا تختۂ مشق بنایا جاتا اور انتہائی غلیظ و مشکل کام کرنے پر انہیں مجبور کیا جاتا تھا مگر ان سب کے باوجود کسی ضمیر میں کوئی چبھن محسوس نہ ہوتی تھی۔ اسلام نے غلاموں کو اس پست سطح سے اٹھا کر آزاد انسانوں کی برادری میں شامل کیا۔ اسلام کے یہ کارنامے محض خوش آئندہ اعلانات نہیں ہیں بلکہ یہ تاریخ کے ٹھوس حقائق ہیں جن پر خود تاریخ کے صفحات و اوراق علی الاعلان گواہ ہیں۔

یورپ کی شہادت:

یورپ کے متعصب مصنفین بھی یہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام کے دور اول میں غلاموں کو ایک ایسا بلند معاشرتی مقام حاصل تھا جس کی نظیر دنیا کی کسی اور قوم یا خطے میں نہیں ملتی۔ مسلم معاشرے نے انہیں ایک ایسا باعزت مقام بخشا تھا کہ بندِ غلامی سے رہائی کے بعد بھی کوئی غلام اپنے سابقہ آقاؤں کے خلاف غداری کا تصور نہیں کرسکتا تھا بلکہ اُسے مکروہ اور قابل نفرت فعل خیال کرتا تھا اگرچہ آزادی کے بعد سابق آقا سے اس کو نہ کسی قسم کا کوئی خوف تھا اور نہ وہ پہلے کی طرح اب اس کا محتاج اور دستِ نگر تھا بلکہ غلام اُسی طرح کا ایک آزاد انسان تھا جس طرح کا آقا انسان تھا۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ آزادی کے بعد غلاموں کے اس رویہ کی وجہ خوف یا احتیاج نہیں تھی بلکہ آزادی کے بعد بھی غلام اپنے آپ کو سابق آقا کے گھرانے کا ایک فرد سمجھتا تھا اسلام نے آقا و غلام کو ولایت کے ایک ایسے رشتے سے باہم جوڑ رکھا تھا جو رشتہ سے کسی طرح بھی کم مضبوط نہ تھا۔

غلام کی جان اور انسانیت کا احترام:

مزید بر آں ایک غلام کی جان بھی اب ویسے ہی محترم قرار پائی جیسے کہ کسی آزاد انسان کی۔ اور خود قانون نے اس کی جان کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ چنانچہ غلام کے خلاف قول یا عمل کی ہر زیادتی ممنوع قرار پائی۔ جہاں تک قول کا تعلق ہے۔ آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو انہیں غلام کہہ کر پکارنے سے منع کر دیا اور مسلمانوں کو تعلیم دی کہ وہ غلاموں کو ایسے طریقے سے مخاطب کریں جس سے اُن کا ذہنی بعد ختم ہو اور وہ اپنے آپ کو آقا کے کنبے کا فرد سمجھنے لگیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا بے شک خدا نے تمہیں اُن کا آقا بنایا ہے اگر وہ

چاہتا تو وہ تم کو بھی غلام بنا کر اُن کے قبضۂ قدرت میں دے سکتا تھا" گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُن کا غلام بننا بعض خاص حالات اور واقعات کا نتیجہ تھا ورنہ ان میں اور ان کے آقاؤں میں بحیثیت انسان کے کوئی فرق نہیں تھا۔ یوں اسلام نے ایک طرف آقاؤں کے بے جا فخر کو کم کیا اور دوسری طرف غلاموں کے لئے معاشرتی رتبہ کو بڑھا کر اُنہیں خالص انسانی رشتوں میں اپنے آقاؤں سے جوڑ دیا۔ اس سے آقا اور غلام ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ ان میں باہمی محبت بڑھی اور یہی محبت آگے چل کر تمام انسانی رشتوں کی اساس ٹھہری۔ جسمانی تکلیف یا نقصان پہونچانے پر آقا اور غلام دونوں کے لئے ایک سی تعزیرات بنائی گئی اور اس لحاظ سے ان میں کسی قسم کا کوئی فرق و امتیاز روا نہ رکھا گیا۔ اسلام کا یہ اصول کہ "جو ہمارے غلام کو قتل کرے گا وہ قتل کیا جائے گا" اپنے وسیع دائرہ اثر کے لحاظ سے بہت واضح ہے یہ خالص انسانی سطح پر آقا اور غلام کے درمیان مکمل مساوات قائم کرنا چاہتا ہے اور اسلام یہ چاہتا ہے کہ انہیں زندگی میں برابر کے مواقع حاصل ہوں۔

غلاموں کے انسانی حقوق:

اسلام نے اپنے تعلیم کے ذریعہ یہ حقیقت بھی واشگاف کر دی کہ اپنی موجودہ حالتِ غلامی کی وجہ سے غلام اپنے کسی انسانی حقوق سے محروم نہیں ہوگئے ہیں۔ اسلامی شریعت کے یہ تحفظات نہ صرف غلام کی جان کی حفاظت کے لئے کافی تھے بلکہ یہ اتنے فراخدلانہ اور شریفانہ ہیں کہ اسلام سے قبل اور بعد کی ساری تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس سلسلے میں اسلام اس حد تک جا پہونچا کہ اس نے آقا کو غلام کے چہرے پر چانٹا مارنے سے بھی روک دیا اس کی اجازت صرف ایسی استثنائی حالتوں میں دی کہ جب کسی غلام کی تادیب مقصود ہو۔ مگر تادیب کی اس سزا کے لئے بھی بعض خاص حدود اور ضوابط مقرر کر دیئے تاکہ کوئی آقا سزا دیتے وقت جائز حدود سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ اس طرح کی سزا کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو بچوں کی شرارتوں پر بڑوں کی طرف سےکی جانے والی تادیبی کاروائی کی ہوتی ہے مگر یہ سزا اسلام کے لائے انقلاب کے بعد کے لئے آزادی کے حصول کی ایک قانونی وجہ جواز بن گئی اور وہ اس کی بنیاد پر آزادی کے مستحق بھی قرار پائے۔ یہ تھا غلاموں کی آزادی کا پہلا مرحلہ۔ اب آیئے ان کی آزادی کے اگلے مرحلے یعنی حقیقی آزادی پر بھی نظر ڈالتے چلیں۔

آزادی کا پہلا مرحلہ :

اپنی اصلاحی مہم کے پہلے مرحلے میں اسلام نے غلاموں کو ذہنی اور روحانی آزادی سے بہرہ ور کیا۔ اُن کا کھویا ہوا مقام انسانیت بحال کیا اور انہیں بتایا کہ ایک ہی مشترک اصل، انسانیت سے تعلق رکھنے کی بدولت وہ لوگ ویسی ہی قدر و قیمت کے حامل ہیں جیسے کہ اُن کے آقا ہیں۔ اسلام نے غلاموں کو یہ بتایا کہ آزادی کی نعمت سے محروم ہو کر وہ اپنی انسانیت نہیں کھو بیٹھے ہیں۔ اور نہ اس میں ان کی کوئی فطری یا پیدائشی کمزوری کارفرما تھی۔ بلکہ اس کا اصل سبب وہ خارجی احوال و کوائف تھے جن کی وجہ سے ان کی آزادی چھن گئی اور معاشرتی حالات میں براہ راست حصہ لینے کے قابل نہ رہے۔ چنانچہ اس خارجی کیفیت یعنی غلامی کے علاوہ باقی ہر لحاظ سے وہ دوسرے انسانوں کی طرح ہیں اور اس حیثیت سے اُن کو وہ تمام انسانی حقوق حاصل ہیں جو ان کے آقاؤں کو حاصل ہیں۔

حقیقی آزادی کی جانب :

لیکن ایک اسلام نے صرف اسی پر بس نہیں کیا کیونکہ اس کا بنیادی اصول کامل انسانی مساوات ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ تمام انسان برابر ہوں اور اپنی اس آزاد حیثیت میں انسانی حقوق میں برابر کے شریک ہوں اس لئے اسلام نے غلاموں کی واقعی آزادی کی طرف قدم بڑھایا اور اس مقصد کے حصول کے لئے دو طریقے اختیار کیئے۔

(۱) العتق۔ یعنی مالکوں کی طرف سے غلامی کی رضاکارانہ آزادی (۲) مکاتبت۔ یعنی آقا اور غلام میں آزادی کا تحریری معاہدہ

العتق:

جہاں تک پہلے العتق کا سوال ہے۔ شریعت اسلامی میں وہ کسی مالک کے اس رضاکارانہ فعل کا نام ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی خوشی سے اپنے کسی غلام کو آزادی بخش دیتا ہے۔ اس طریقہ کو اسلام نے بہت فروغ دیا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے تمام غلاموں کو آزاد کر دیا۔ آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے بھی آپؐ کی پیروی میں اپنے اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے اپنی دولت کا کثیر حصہ غلاموں کو اُن کے مشرک مالکوں سے خرید کر آزاد کرنے میں صرف کیا۔ بیت المال میں بھی اس غرض کے لئے کچھ رقم رکھی جاتی تھی جس سے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جاتا تھا۔ چنانچہ یحییٰ بن سعید

کہتے ہیں کہ ایک بار حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مجھے صدقات وصول کرنے کے لئے افریقہ بھیجا۔ میں نے صدقات جمع کیئے اور مستحقین کی تلاش شروع کر دی تاکہ ان میں یہ صدقات تقسیم کیئے جائیں لیکن مجھے کوئی مستحق نہ ملا جو صدقات کے اس روپے کو قبول کر لیتا۔ کیونکہ حضرت عمر عبدالعزیزؒ نے لوگوں کو خوشحال بنادیا تھا چنانچہ میں نے اس رقم سے ایک غلام خریدا اور اس کو آزاد کر دیا۔

گناہوں کا کفارہ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ اگر کوئی غلام دس مسلمانوں کو لکھنا سکھاتا یا مسلم معاشرے کی ایسے ہی کوئی اور خدمت انجام دیتا تو آپؐ اس کو آزاد فرمادیا کرتے تھے۔ اسی طرح قرآن نے بعض گناہوں کا کفارہ ہی غلاموں کو آزادی عطا کرنا قرار دیا خود حضور ﷺ نے مسلمانوں کو بتایا کہ بعض گناہوں کا کفارہ غلاموں کو آزاد کرنا ہے چنانچہ آپؐ کی اس ہدایت کے بدولت غلاموں کی کثیر تعداد کو آزادی کی نعمت حاصل ہوئی کیونکہ ظاہر ہے کہ کوئی انسان گناہوں سے پاک نہیں بلکہ ہر انسان سے اس کا صدور ممکن ہے جیسا کہ حضورؐ کا ارشاد ہے۔ "آدم کی اولاد میں سے کوئی گناہوں سے پاک نہیں" اس موقعہ پر توضیح مدعا کے لئے ہم کسی مومن کو غلطی سے مار ڈالنے کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اسی مثال سے غلامی کے متعلق اسلام کا نقطہ نظر بھی وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ اسلام میں کسی مومن کو غلطی سے مار ڈالنے کی مثال پیش کرتے ہیں اس مثال سے غلامی کے متعلق اسلام کا نقطہ نظر بھی وضاحت کے ساتھ سامنے آتا جاہے۔ اسلام میں کسی مومن کو غلطی سے ہلاک کرنے کا کفارہ، کسی مومن غلام کو آزاد کرنا اور مقتول کے ورثاء کو خون بہا ادا کرنا مقرر کیا گیا ہے چنانچہ سورۂ نساء کی ۹۲ویں آیت میں ارشاد خداوندی ہے:

وَمَن قَتَلَ مُؤمِناً خطأً فَتحريرُ رَقَبَةٍ مُؤمِنَةٍ ودِيةٌ مُسلَّمَةٌ الىٰ اَهلِه. (سورہ نسا)

ترجمہ: اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن غلام کو آزاد کرے اور مقتول کے ورثا کو خون بہا دے"

قتل مومن کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر:

مطلب یہ ہے کہ اسلام کی نگاہ میں مومن کو غلطی سے بھی قتل کر کے قاتل بغیر کسی

قانونی جواز کے معاشرے کو اپنے ایک کارکن کی خدمات سے محروم کردیتا ہے لہذا اسلام حکم دیتا ہے کہ قاتل، مقتول کے ورثاء کے قتل پر غلام کو آزاد کرنا ایک اور فرد انسانی کو زندگی بخشنے کے مترادف ہے۔ قاتل نے ایک انسانی کو ہلاک کر کے معاشرے کو اسکی خدمات سے محروم کردیا تھا مگر جب اُس نے کفارہ میں غلام آزاد کیا تو معاشرے کو ایک اور خادم مل گیا اور یوں اس کے نقصان کی تلافی ہوگئی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام کے نزدیک ان تمام تحفظات کے باوجود جو اُس نے غلاموں کو دیئے ہیں، غلامی موت یا اس سے ملتی جلتی کیفیت کا دوسرا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہر اس موقع سے فائدہ اٹھایا جس کے ذریعہ وہ انسانوں کے اس دبے اور پسے ہوئے طبقے کو آزادی کے حیات آفرین جذبہ سے بہرہ ور کر کے زندوں میں جگہ دلا سکتا تھا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ العتق کے اس طریقے کے ذریعہ غلاموں کی اتنی کثیر تعداد کو آزادی نصیب ہوئی کہ اس کی مثال کسی قوم کی قدیم یا جدید تاریخ میں نہیں ملتی۔ پھر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ مسلمانوں نے غلاموں کی اس کثیر تعداد کو کسی مادی فائدے کے خاطر آزاد نہیں کیا بلکہ ان کے عمل کا محرک محض رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ تھا۔

مکاتبت:

دوسرا طریقہ جس کے ذریعہ اسلام نے غلاموں کو آزادی سے بہرہ ور کیا، وہ مکاتب یعنی لکھا پڑھی کا طریقہ تھا اگر کوئی غلام اپنے مالک سے آزادی کا مطالبہ کرتا تو مکاتبت کے اس طریقہ کے مطابق مالک کے لئے ضروری تھا کہ غلام سے ایک متعین رقم لے کر اُسے آزاد کردے۔ رقم کا تعین مالک اور غلام کے باہمی مشورے طے کیا جاتا تھا۔ اس ح کے تحریری معاہدے (مکاتبت) کے بعد اگر غلام مطلوبہ مالک کے حوالے کردیتا تھا تو مالک کے لئے اس کی آزاد کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہتا تھا۔ بصورت انکار غلام کو عدالت سے رجوع کا مکمل حق حاصل تھا اور عدالت کو پورا اختیار تھا کہ طے شدہ رقم وصول کر کے پروانہ آزادی غلام کے حوالے کردے۔

مکاتبت کے اس طریقے کے ذریعہ اسلام نے اُن تمام غلاموں کے لئے آزادی کی راہ ہموار کردی جو آزادی کے طالب تھے اور اپنے مالکوں کی فیاضی، نیکی اور تقویٰ پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہنے کے روادار نہیں تھے کہ مالک جب مناسب سمجھے تو اپنی مرضی سے انہیں بندِ غلامی سے آزاد کرے۔

اسلامی حکومت کی دلچسپی:

جب کوئی غلام مکاتبت کے ذریعہ اپنی آزادی کا مطالبہ کرتا تھا تو نہ صرف یہ کہ مالک اس کی اس پیش کو رد نہیں کر سکتا تھا بلکہ غلام کو اس کی طرف سے کسی قسم کی انتقامی کاروائی کا خدشہ بھی نہیں ہوتا تھا کیونکہ خود اسلامی حکومت اس کی پشت پر تھی اور اس بات کی ذمہ دار تھی کہ مکاتبت کے معاہدے کے بعد مالک خدمت کے عوض اپنے اس غلام کو ایک متعین رقم بطور اجرت ادا کرے اور اگر مالک اس پر آمادہ نہ ہو تو وہ غلام کے لئے کہیں اور روزگار کا انتظام کرے تاکہ وہ اپنی حصولِ آزادی کے لئے مطلوبہ رقم کا انتظام کر سکے اور اُسے اپنے مالک کے حوالے کر کے آزاد ہو جائے۔ ٹھیک یہی صورتِ حال چودھویں صدی عیسوی میں یعنی چند صدی بعد یورپ میں پیش آئی۔ اس وقت اسلام اپنی مملکت میں غلامی کی بیخ کنی پوری طرح کر چکا تھا۔

سرکاری خزانے سے اعانت:

اس معاملے میں اسلامی مملکت کو ایک اور امتیاز بھی حاصل ہے جس کی مثال کہیں اور تلاش کرنا عبث ہے۔ وہ ہے سرکاری خزانہ سے آزادی کے طالب غلاموں کی مالی اعانت جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلاموں کو آزادی دلانے میں اسلام کو کس قدر گہری دلچسپی رہی ہے اور وہ بھی کسی مادی غرض یا فائدے کے لئے نہیں بلکہ محض پروردگار کائنات اور مالکِ حقیقی کی حصول خوشنودی کیلئے تاکہ انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ اور غلام ہونے کا پورا پورا حق ادا کر سکتے اور اس میں کسی انسان کی غلامی شریک نہ ہو زکوٰۃ کے مصارف بیان کرتے ہوئے قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّماالصَّدقٰت للفقراء المسلمین والمساکین والعاملین علیھا. وَفی الرقاب (سورہ ۹ آیت ۶۰)

صدقات تو صرف غریبوں، محتاجوں اور اُن کارکنوں کا حق ہے جو اس کی وصولی پر مقرر ہیں اور غلاموں کے چھڑانے میں" اس آیت میں یہ واضح ہدایت الٰہی موجود ہے کہ زکوٰۃ وصدقات سے اُن غلاموں کی مالی اعانت کی جائے جو اپنی ذاتی کمائی سے آزادی حاصل نہیں کر سکتے:

دو انقلابی ادارے:

اسلامی نظام معاشرت کے یہ دو ادارے العتق اور مکاتبت۔ غلامی کی بھیانک تاریخ میں عظیم عملی انقلاب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ باقی دینا کو ترقی کے اس مرحلہ تک پہونچنے

میں کم از کم سات صدی کا عرصہ لگا۔ یہی نہیں بلکہ اسلام نے غلام کو مملکت کی جانب سے تحفظات عطا کر کے دینا کو ترقی کے ایک ایسے مفہوم سے آشنا کیا جس کے تصور سے عہد قدیم تو در کنار، عہد جدید کی تاریخ بھی خالی نظر آتی ہے۔ اسلام نے انسانوں کو غلاموں کے ساتھ جو شریفانہ اور فیاضانہ، برتاؤ کرنے کا سبق سکھایا اور جس طرح اُس نے کسی سیاسی یا معاشی نوعیت کے خارجی دباؤ یا تحریص طمع کے بغیر مسلمانوں میں اپنی مرضی سے غلاموں کے آزاد کرنے کا جذبہ بیدار کیا۔ اس کی نظیر پیش کرنے سے انسانی تاریخ آج بھی قاصر ہے یورپ میں غلاموں کو بہت بعد میں جو آزادی نصیب ہوئی وہ بھی اس معاشرتی مرتبے کی ہم سر نہیں جو اسلام نے صدیوں پیشتر غلاموں کو عطا کر دیا تھا:

اشتراکی جھوٹ کی حقیقت:

یہ حقائق کمیونسٹوں کے اس غلط نظریئے کے ابطال کیلئے کافی ہیں کہ اسلام انسانی تاریخ کے ایک مخصوص دور کے اقتصادی احوال و کوائف کی پیداوار تھا اور جدلی مادّیت کے نظریئے کے مطابق اپنے دور کے معاشی اور مادّی حالات کا آئینہ دار تھا۔ اسی لئے اسلام کسی اگلے ترقی یافتہ معاشی دور کی ضروریات کا ساتھ دینے سے قاصر ہے لیکن ان کے اس جھوٹ کی قلعی اسلام نے پوری طرح کھول کر رکھ دی ہے بلکہ خود اسلام کا وجود ہی اس اشتراکی فریب کی ٹھوس عملی تردید ہے۔ اسلام نے جزیرہ نمائے عرب کے اندر اور اس کے باہر جس طرح قوت و شوکت حاصل کی ہے اس سے "کارل مارکس" کے نظریئے کا غلط ہونا پوری ثابت ہو جاتا ہے۔ سوویت یونین کا ٹکڑے ہونا اور روس کا دیوالیہ ہونا اسلام کی حقانیت کیلئے مزید ثبوت فراہم کرتا ہے۔ غلاموں کیساتھ اسلام کا سلوک ہو یا زندگی کے دوسرے مسائل کے بارے میں اس کا روّیہ۔ تقسیم دولت کا مسئلہ ہو یا حاکم و محکوم اور خادم و مخدوم کے تعلقات کے تعین کا سوال۔ اسلام کی انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ اسلام نے اپنے پورے معاشرتی اور معاشی نظام کی عمارت ایک ایسی خوش دلانہ اطاعت کی اساس پر استوار کی ہے کہ معاشرتی نظاموں کی تاریخ میں اس کو اب بھی منفرد اور بلند ترین مقام حاصل ہے۔

ایک سوال:

ممکن ہے کہ اس موقع پر بعض حضرات کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ اسلام جو غلاموں کی آزادی کا علمبردار ہے اور جس نے انکی آزادی کیلئے کسی سیاسی یا معاشی دباؤ کے بغیر اتنے انقلابی اقدامات محض اپنی اندرونی تحریک سے کرڈالے۔ اس نے غلامی کے خلاف آخری اور حتمی اقدام کر کے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اسکا قلع قمع کیوں نہیں کیا تاکہ نوع انسانی اسلام کی بے حد و حساب برکات سے متمتع ہوتی اور یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی کہ اسلام واقعی دین کامل ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنی اشرف المخلوق بنی نوع آدم کی راہنمائی کیلئے اتارا ہے۔

اور جواب:

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کیلئے ہمیں غلامی سے پیدا ہونے والے مختلف معاشرتی، نفسیاتی اور سیاسی مسائل پر ایک نظر ڈال لینی چاہئے کیونکہ یہی وہ اسباب تھے جنکے پیش نظر اسلام نے غلامی پر آخری ضرب نہیں لگائی بلکہ کچھ عرصہ بعد تک کیلئے اس کو مؤخر کردیا مسئلے کے اس پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ غلامی کے قطعی سدّباب میں جو غیر معمولی تاخیر ہوئی وہ اسلام کے نزدیک نہ تو پسندیدہ تھی اور نہ اسلام کی اپنی فطری پاکیزگی اور اجنبی عناصر کی آمیزش سے پاک صورت میں ممکن تھی تاخیر کی اصل ذمہ دار اسلامی تعلیمات سے انحراف اور گمراہی کے وہ رجحانات تھے جنہوں نے اسلام کے چشمۂ صافی کو مکدّر اور گدلا کردیا۔

اصلاح خلق کا الٰہی نظام

مولانا مفتی محمد اسماعیل پاکستانی

حق تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو خلافت ارضی کے لئے پیدا فرمایا، علمی برتری عطا فرما کر مسجود ملائکہ بنایا، شیطان نے اس تعظیمی سجدہ سے انکار کیا تو مردود ٹھہرا حضرت آدمؑ کی انسیت اور دل بستگی کے لئے۔ حضرت حواؑ کو پیدا فرمادیا۔ آدمؑ و حواؑ دونوں کو آزادی سے جنت میں رہنے اور سوائے ایک درخت کے باقی تمام نعمتوں سے جی بھر کر لطف اندوز ہونے کا موقع دیا بالآخر شیطان کے وسوسہ ڈالنے، بہکانے سے شجرۂ ممنوعہ کا استعمال کرلیا جس پر بطور تنبیہ وسرزنش حضرت آدمؑ و حواؑ، دونوں کو جنت سے نکلنے اور زمین پر اترنے کا حکم ہوا کما قال إهبطُوا مِنهَا الایہ (البقرہ پ۱) یہاں زمین پر توالد و تناسل کا سلسلہ شروع ہوا جو اولاد ہوتی گئی حضرت آدمؑ اسے حسبِ ارشاد خداوندی فَإمَّا يَأتِيَنَّكُم مِنِّى هُدىً فَمَن تَبِعَ هُدَاىَ . الایۃ (البقرہ پ۱) آسمانی ہدایات اور دین حق کی تعلیم فرماتے رہے۔

ایک مدت تک اولاد آدم اعتقاد صحیح اور راہ حق کی وحدت پر قائم رہی کما قال كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً الایۃ (البقرہ پ۲) پھر مذاق و مزاج اور طبائع کے اختلاف سے اغراض و مطالب میں اختلاف ہونا شروع ہوا تو بتدریج افکار و نظریات میں بھی اختلاف رونما ہونے لگا کماقال وَمَا كَانَ النَّاسُ إلاَّ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَادختَلَفُوا الایۃ (یونس پ۱۱) بوجہ اختلاف جب حق و ناحق میں التباس ہونے لگا تو اس اختلاف کو مٹانے اور لوگوں کو دوبارہ اسی ملۃ واحدہ اور دین حق پر قائم کرنے کے لئے انبیاء ورسل اور صحائف و کتب کا سلسلہ جاری فرمایا کماقال فَبَعَثَ الله النَّبِيينَ مُبَشِّرِينَ وَ مُنذِرِينَ وَ أنزَلَ مَعَهُمُ الكِتَابَ با الحَقِّ لِيَحكُمَ بَينَ النَّاسِ فِيمَا اختَلَفُوا فِيهِ الایۃ (البقرہ پ۲) مگر بایں ہمہ جب بھی کسی نبی یا رسول کو حق تعالیٰ نے کسی قوم کے پاس ہدایت کے لئے بھیجا تو حسب سابق لوگ دو گروہوں میں بٹے ہی رہے۔ اکثر تو انکار و انحراف پر اڑ کر کافر ہی رہے اور کچھ حق کو مان کر مسلمان ہوگئے کماقال هُوَ الَّذِى خَلَقَكُم فَمِنكُم كَافِرٌ وَّ مِنكُم مُؤ مِنٌ . الایۃ (التغابن پ۲۸)

انبیاء و کتب کا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا کہ جہاں کہیں لوگ راہ حق سے منحرف ہوتے ان کی ہدایت کے لئے کوئی نبی اور کتاب آجاتی۔

اس کی مثال ایسے سمجھئے کہ تندرستی ایک ہے اور بیماریاں بیشمار، سو جب بھی کوئی روحانی مرض پیدا ہوا تو اس کے علاج کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی اور کتاب بھیج دی جب دوسری قسم کا مرض ہوا تو دوسرا نبی اور دوسری کتاب بھیج دی۔ یہاں تک کہ آخر میں امام الانبیاء و المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مبعوث فرمایا اور امام الکتب والصحائف یعنی قرآن کریم نازل فرمایا تاکہ کتاب ہدایت اور نبی رحمت ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں تاقیامت آنے والے لوگوں کی روحانی بیماریوں کا شافی علاج ہوتا رہے چونکہ دینِ حق مثل تندرستی کے ازاول تا آخر ایک ہی چلا آرہا ہے کماقال شَرَعَ لَكُم مِنَ الدِّينِ مَاوَصّىٰ بِه نُوحاً اَوحَينَا اِلَيكَ وَمَا وَصَّينَا بِه اِبرَاهِيمَ وَمُوسىٰ وعِيسىٰ الاية (الشوریٰ پ۲۵) اس لئے دین کو صراط مستقیم سیدھی (شاہراہ) سے تعبیر فرمایا اور دعائے ہدایت بھی " اهدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِيمَ" سکھلائی کہ صراط مستقیم کی طلب اور اس پر چلنے کی دعاء مانگا کرو پھر دعا کا مطلب و مفہوم "صِرَاطَ الَّذِينَ اَنعَمتَ عَلَيهِم الاية" خود فرمایا اور ہدایت یافتگان منعم علیہم کا مصداق تمام انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین کو ٹھہرایا کماقال اُولٰئِكَ الَّذِينَ اَنعَمَ اللّٰهُ عَلَيهِم مِنَ النَّبِيينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَ الشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ الاية (النساء پ۵) اسی بناء پر حضرت یوسفؑ نے اپنی قید کے ساتھیوں سے فرمایا وَاتَّبَعتُ مِلَّةَ آبَائِي اِبرَاهِيمَ وَ اِسحَاقَ وَيَعقُوبَ الاية (یوسف پ۱۳) کہ میں نے بے دین اور گم کردہ راہ لوگوں کا طرز طریق چھوڑ کر انبیاء سابقین کا راستہ اختیار کیا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کو بھی یہ حکم ہوا فَبِهُدَاهُم اقتَدِه الآیہ (الانعام پ) کہ آپ ﷺ بھی انبیاء سابقین کی روشن (اصول دین) پر چلئے غرض اللہ رب العزۃ نے اولین و آخرین تمام انسانوں کو ایک ہی راہ حق پر چلنے کا پابند فرمایا کماقال اِنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُستَقِيماً فَاتَّبِعُوه الاية (الانعام پ۸) اور مختلف راہوں اور متفرق راستوں پر بھٹکتے رہنے سے منع فرمایا کماقال وَلَاتَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُم عَن سَبِيلِه الاية (الانعام پ۸) البتہ اصول دین میں وحدت کے باوجود ہر نبی کی شریعت (یعنی فروعی احکام و مسائل) بنابر حکم و مصالح، دوسرے نبی کی شریعت سے

مختلف رہی کماقال ولِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنکُم شرعَةً وَّ مَنهَاجاً الایة (المائدہ پ۶) کہ ہر قوم کا مزاج اور روحانی بیماری، دوسری قوم کے مزاج اور بیماری سے عموماً مختلف رہی اس لئے ہر طبیب روحانی (پیغمبر) کا طریق علاج (شریعت) بھی دوسرے طبیب (پیغمبر) سے مختلف رہا سو ہر شریعت اپنے دور میں واجب العمل رہی یعنی بعد میں آنے والی شریعت، اس پہلی کے لئے ناسخ بنتی رہی (جیسے نئے کرنسی نوٹ جاری ہونے سے سابقہ نوٹ منسوخ ہو جاتے ہیں) یہی وجہ ہے کہ ایک موقع پر جب حضرت فاروق اعظمؓ تورات کے چند ورق ہاتھ میں لے کر پڑھنے لگے تو سرکارِ دوعالم ﷺ کا چہرۂ انور، ناگواری، وناپسندیدگی سے سرخ ہو گیا اور اس موقع پر ارشاد فرمایا لو کَانَ موسیٰ حیاً لمَاَ وَسَعه اِلاَّ اتباعی (الحدیث)

نوٹ: اس واقعہ سے وہ لوگ عبرت حاصل کریں جو قرآن، حدیث کے کھرے علوم چھوڑ کر تورات، انجیل وغیرہ تحریف شدہ کتابوں کو پڑھتے رہتے ہیں اور اسے وسعت ظرفی کا نام دیتے ہیں۔ مندرجہ بالا خدائی نظام ہدایت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ابوالبشر سیدنا آدم سے لے کر خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد مصطفی ﷺ تک انسانیت کی صلاح و فلاح کے دو سلسلے جاری فرمائے ایک سلسلہ انبیاء ورسل کا اور دوسرا سلسلہ آسمانی صحائف وکتب کا سو معلوم ہوا کہ انسان کی صحیح تعلیم وتربیت کے لئے نہ صرف عمدہ تعلیمات کافی ہیں اور نہ ہی صرف کوئی عاقل وذہین شخصیت بلکہ جس طرح دنیوی کسی بھی فن کو سیکھنے کے لئے کتاب اور ماہر کتاب ہر دو کی ضرورت ہوتی ہے اس طرح دینی تعلیم وتربیت کے لئے بھی ہر دو کی ضرورت یقینی اور لازمی ہے۔

پھر معلوم ہو کہ ہر نبی ورسولؑ کی تعلیم وتربیت حق تعالیٰ خود کرتا ہے اس لئے کسی نبی ورسول کو کسی اور معلم ومربی کی ضرورت نہیں ہوتی جب کہ امت کی اصلاح کے لئے ہر دو کام (تعلیم وتربیت) ہر نبی کو خود کرنے پڑتے ہیں بفضلہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کے لئے یہ ہر دو کام بدرجہ کمال سر انجام دئے۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا ربنا وابعث فیهم رسولاً منهم یتلوا علیهم ایاتک و یعلمهم الکتاب و الحکمة و یزکیهم ۔الایۃ (البقرہ پ۱) کے مطابق حق تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ انہیں صفات کے ساتھ مبعوث فرمایا اور حسبِ دعائے ابراہیمی آپؐ کے فرائض منصبیہ یہی چار تلاوۃ قرآن تعلیم قرآن، تعلیم حکمت، تزکیۂ نفس مقرر فرائے پہلے دو فرائض

(تلاوت قرآن، تعلیم قرآن) کا تعلق دینی تعلیم سے ہے اور دوسرے دو فرائض (تعلیم حکمت، تزکیۂ نفس) کا تعلق دینی تربیت سے۔

دینی تعلیم:

اس سلسلے میں پہلا فریضہ تلاوت آیات قرآنیہ ہے، تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہوتا ہے اور سب سے پہلی وحی " اِقرأ بِاسمِ ربّكَ الّذِی خَلَقَ۔ ہے جس میں اولیں حکم ہی قرأت و تلاوت کا ہے اور دوسری جگہ قرآن پاک کی تلاوت کا طریقہ بتلایا کہ وَرَتِّلِ القُرآنَ تَرتِیلاً یعنی حروف کو صحیح مخارج سے ادا کر کے الفاظ قرآن کو تجوید و ترتیل کے ساتھ پڑھا جائے آپؐ اس کائنات میں سب سے پہلے قاریٔ قرآن ہوئے کہ آپؐ کی زبانِ نبوت نے سب سے پہلے آیات قرآنیہ پڑھیں اور اس طرح الحمد سے لے کر والناس تک پورا قرآن کریم بھی سب سے پہلے آپ ہی کی زبانِ مقدس پر جاری ہوا پھر حضرات صحابہؓ تابعین اور مابعد کی امت نے پڑھا اور تا قیامت انشاءاللہ پڑھا جاتا رہے گا آپؐ نے اپنے اس فریضۂ قرآت و تلاوت کو کما حقہ ادا فرمایا کہ آپؐ کی محنت کی برکت سے امت مسلمہ میں لاکھوں کروڑوں قاریٔ القرآن پیدا ہوئے اور تا قیامت پیدا ہوتے رہیں گے اللھم زدفزد۔

دینی تعلیم کے سلسلے میں دوسرا فریضہ تعلیم کتاب ہے تعلیم کا تعلق معنی و مطلب سے ہوتا ہے کہ آپؐ آیات قرآنیہ کے معانی و مطالب بتلاتے اور سمجھاتے تھے کما قال وَاَنزَلنَاَ اِلَیکَ الذِّکرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیھِم الایۃ (النحل پ ۱۴) یعنی یہ بیان فرمانا آپؐ کا فرض منصبی تھا کہ آیات قرآنیہ اور احکاماتِ ربانیہ کی مراد کیا ہے؟

اور خداوند کریم ان احکامات کی بجا آوری اور ان پر عملدرآمد کیوں کر چاہتے ہیں؟ سو آپؐ معلم و مفسر قرآن تھے کہ آیات قرآنیہ کی تفسیر و تبیین فرماتے تھے۔ سبحان اللہ! تعلیم و تفسیر قرآن کا آپ نے کیا خوب حق ادا فرمایا کہ آپؐ کی اس محنت کی برکت سے امت مسلمہ میں لاکھوں معلم و مفسر قرآن پیدا ہوئے۔

چونکہ قرآت و تلاوت اور تعلیم و تفسیر کے لحاظ سے آپؐ کی اولیں حیثیت معلم (سکھلانے والے) ہی کی ٹھہرتی ہے اس لئے آپؐ نے واضح الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا، اِنَّما بُعِثتُ مُعَلِّماً (رواہ الدارمی) کہ میں تو معلم دین بنا کر بھیجا گیا ہوں جب آپؐ کا مقصدِ بعثت "معلم ہونا" ہوا تو آپؐ کی امت کا مقصد وجود "متعلم ہونا" ٹھہرا اس لئے ہر امتی

مرد، عورت کو بحیثیت مسلمان ہونے کے، دین کا علم حاصل کرنا ضروری ہوا کہ اولاً الفاظ قرآن صحیح پڑھنا سیکھے، پھر اس کے معانی و مطالب معلوم کر کے مراد خدا سمجھے اور اس پر عمل کرے تاکہ نزولِ قرآن کا مقصد پورا ہو اس لئے ارشاد فرمایا۔

خَیرُکُم مَن تَعَلَّمَ القرآن وَ عَلَّمَہ (رواہ البخاری) کہ تم میں سب سے بہتر اور افضل وہ لوگ ہیں جو خود قرآن سیکھیں اور دوسروں کو سکھائیں۔

تُعلمو االعلم و علموہ الناس (رواہ البیہقی و الدار قطنی) دینی علم خود سیکھو اور دوسروں کو سکھلاؤ۔

العلُم حیاۃُ الاسلام وعماد الایمانِ (رواہ ابوالشیخ) کہ علم دین اسلام کی حیات او رایمان کا ستون ہے۔لکل شيءِ طریق الجنۃ العلم (رواہ الدیلمی) کہ ہر چیز (کے حصول) کا ایک راستہ ہے اور جنت کا راستہ علم ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ دین کا ایک باب سیکھنا ایک ہزار رکعات پڑھنے سے افضل ہے (ابن حبان، ابن ماجہ)

ایک حدیث میں ہے جس نے علم کا ایک باب سیکھ کر اسے آگے پھیلایا اسے ستر صدیقین کا ثواب ملے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ علم کا طالب، تحصیل علم کی حالت میں مرا تو شہید مرا (ابن عبدالبر)

من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللہ حتیٰ یرجع (رواہ الترمذی) کہ جو شخص طلب علم کیلئے نکلا وہ خدا کے راستے میں ہے یہانتک کہ واپس لوٹے۔

من جاء ہ الموت وھو یطلب العلم لیحیی بہ الاسلام فبینہ وبین النبیین درجۃ واحدۃ فی الجنۃ (رواہ الدارمی) کہ جس شخص کو اس حال میں موت آئی کہ وہ اسلام اور اس کی تعلیمات کو زندہ رکھنے کے لئے علم دین سیکھ رہا تھا تو جنت میں اس کے اور نبیوں کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا۔

فضلُ العالم علی العابد کفضلی علیٰ ادناکم (رواہ الترمذی) کہ عالم دین کی فضیلت عبادت گزار پر ایسی ہے جیسے کہ محمدؐ کی فضیلت تم میں کے ادنیٰ آدمی پر

نوٹ:۔ علم دین کے تفصیلی فضائل کتب تفسیر و حدیث میں دیکھے جا سکتے ہیں، یہاں زیادہ کی گنجائش نہیں۔

چونکہ ایمان کے بعد سب سے پہلا فریضہ، حصول علم دین ہے کہ اس کے بغیر نہ تو کوئی حکم قرآنی وحدیثی معلوم ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس پر عمل ہو سکتا ہے اسی لئے ارشاد فرمایا: طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم کہ علم دین کا حصول ہر مسلمان (مرد، عورت) پر فرض ہے یعنی اس قدر علم دین حاصل کرنا ہر کسی پر فرض عین ہے جس کے ذریعے وہ دینی فرائض ادا کر سکے اور محرمات سے بچ سکے اس لئے کہ جو کام شرع نے فرض واجب اور ضروری قرار دیے ہیں مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، کسب حلال، ترکِ حرام وغیرہ، ان کا علم حاصل کرنا بھی ضروری اور لازمی ٹھہرایا ہے لہٰذا عامۃ المسلمین پر یہ فرض و لازم ہے کہ وہ دینی احکام و مسائل اور شرعی اوامر و نواہی، اہل علم کے پاس جاکر معلوم کریں کماقال فَاسئَلُوا اَهلَ الذِکرِ اِن کُنتُم لاَ تَعلَمُونَ (النمل پ ۱۴) اور بے علم کی شفا پوچھ ہی لینے میں ہے کماقال انّمَا شفاءُ العیِ السئوال (رواہ ابوداؤد) جیسا کہ حضرات صحابہؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسائل دینیہ پوچھا کرتے تھے اور امت مسلمہ کے عوام الناس آج تک اس طرح علماء دین سے مسائل پوچھتے اور ان پر عمل کرتے چلے آرہے ہیں۔

اور اہل علم کو بھی حکم ہے کہ علمی طلب سے آنے والوں کو سیراب کرنے میں کوئی کمی کوتاہی یا گریز نہ کریں کما قال اَنَّ رجالاً یأتونکُم مِن اَقطار الارض فاِذا أتوکُم فاَستوصوابهم خیراً الحدیث کہ دنیا بھر سے لوگ (دین کی نسبت سے) تمہارے پاس آئیں گے پس وہ تمہارے پاس آئیں تو ان سے بھلائی اور خیر خواہی کرنا، یعنی تحصیل علم کی غرض سے آنے والوں کی تعلیم، تربیت، ان کی ضروریات وغیرہ کا خیال و اہتمام رکھنا۔

پھر طلب سے آنے والوں کو بے طلبوں اور غافلوں پر مقدم رکھنا شرعاً و عقلاً ضروری ہے جیسا کہ سورۂ عبس کی تفسیر اور شان نزول سے واضح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے طلب سے آنے والے نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ سے کسی قدر اعراض فرماتے ہوئے۔ بے طلب کفار و مشرکین کے طرف زیادہ توجہ فرمائی تو حق تعالیٰ کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس پر تنبیہ فرمادی کہ ایسا کیوں کیا؟ وہ علماء کرام اور طلبہ عظام، جو اسلام اور اہل اسلام کی تعلیم و تعلم جیسی اہم اور بنیادی دینی خدمت سرانجام دینے کی کماحقہ صلاحیت رکھتے ہوں، ان کا اپنی حیثیت کے مطابق اس اہم دینی خدمت سے بے اعتنائی و لاپروائی کر کے ثانوی درجے کے عام دینی کاموں میں مشغول ہونا (جنہیں عام لوگ کر سکتے ہوں) اسلام اور

اہل اسلام سے سے بے رُخی اوران کی اصل خدمت سے اعراض کر کے، انہیں اضطراب و پریشانی میں مبتلا کرنا ہے ہاں۔ وہ فضلاء اور طلبہ جن کی علمی استعداد اور صلاحیت متوسط درجے کی بھی نہ ہو، ان کا مدارس میں پڑ کر یونہی بوجھ بنارہا مناسب نہیں۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ اہل علم پر شرعاً یہ ذمہ داری نہیں کہ وہ ہر غافل و جاہل کے پاس خود جاکر اسے احکام و مسائل بتلاتے پھریں کہ یہ تو قلب موضوع ہوگا کہ طالب مطلوب بن جائے اور مطلوب، طالب بنا پھرے۔ یہ توایسے ہوگا کہ جیسے پیاسے کہیں کہ سمندر دریا، ندی نالے، کنویں، تالاب وغیرہ، ہمارے پاس خود آکر ہمیں سیر اب کر جایا کریں یہ توالٹی منطق ہے، اس طرح تو علم دین کی قدر منزلت بھی نہ رہے گی کہ قیمتی سے قیمتی چیز بھی اگر یونہی انسان کو مفت میں ہاتھ لگ جائے تووہ عموماً اس کی قدر نہیں کرتا اور دینی احکام و مسائل توانتہائی قدر و منزلت والی چیز ہے، اسے بے توجہی و بے طلبی کے باوجود لُٹاتے پھرنا، بجائے خود غلط ہے۔ پھر تحصیل علم کے فضائل و مناقب اور اس کے لئے محنت، مشقت، اسفار وغیرہ کے مناقب کیا ہوں گے؟ اور ان کا محمل و مصداق کیاباقی رہے گا؟

باقی عالم کی مثال جو غیثِ کثیر (بہت بارش) سے بیان فرمائی گئی ہے تو یہ تشبیہ و تمثیل عموم نفع اور اتمام نفع میں ہے کہ طلبِ علم کے لئے آنے والوں کو، عالم دین علم سے سیر اب کر دیتا ہے، نہ وہ اس میں کوئی امتیاز روا رکھتا ہے اور نہ ہی حتیٰ الوسع کوئی کمی کرتا ہے، یہ تشبیہ من کل الوجوہ نہیں اس لئے کہ بارش تو سمندروں، دریاؤں، نہروں، ندی نالوں، کنووں، تالابوں، گندگی کے جوہڑوں، غلاظت کے ڈھیروں اور گندی وناپاک جگہوں وغیرہ پر بھی ہوتی ہے جب کہ علم دین ایسی معمولی شیء نہیں کہ اسے بے طلبوں اور نہ چاہنے والوں کے سر تھوپ کر اس کی توہین و تحقیر کرائی جائے۔

پھر کسی شخص کے مسلمان ہونیکا مطلب ہی یہ ہے کہ اس نے دین اسلام کی حکومت کو تسلیم کر لیا ہے اور اب وہ کوئی بھی عمل، قوانین و احکام کے خلاف نہ کریگا اب یہ جاننا کہ اسلامی قوانین و احکام اور اوامر و نواہی کیا کیا ہیں؟ ان کی خلاف ورزی پر دنیوی و اُخروی کیا کیا سزائیں ہیں؟ یہ اس کی اپنی ذمہ داری ہے نہ کہ کسی اور کی لہٰذا وہ اگر کسی اسلامی قانون اور حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے، تو وہ یہ کہہ کر اس جرم کی سزا سے شرعاً بچ نہ سکے گا کہ مجھے یہ قانون اور اس کی خلاف ورزی کی سزا کا علم نہ تھا جیسا کہ دنیوی حکومتوں کے قوانین کی خلاف

ورزی پر بھی کوئی شخص یہی عذر پیش کر کے سزا اور گرفت سے نہیں چھوٹ سکتا۔
غرض جس طرح دنیا کی کوئی حکومت قانون سے لاعلمی کا عذر تسلیم نہیں کرتی اور ایک دفعہ قانون کا اعلان کر دینے کے بعد بار بار اس اعلان کا اعادہ ضروری نہیں سمجھتی، اس طرح خدا، رسول کی حکومت الٰہیہ کا قانون (قرآن حدیث) صاف، واضح اور اظہر من الشمس ہو چکا ہے۔ اہل علم پر خدا رسول نے یہ فرض عائد نہیں کیا کہ وہ غافل اور بے طلب لوگوں کے پاس جا جا کر، باوجود ان کی بے توجہی کے، قرآن، حدیث کے احکامات و تشریحات، زبردستی ان پر ٹھونسے رہیں۔ ہاں عوام الناس کی طلب پر اہل علم عمومی مجالس و عظ و بیان کی مجلسوں میں تلقین و تذکیر کرتے رہتے ہیں اور اس کے ضمن میں مسائل دینیہ اور احکاماتِ شرعیہ کا عمومی بیان بھی ہوتا رہتا ہے۔ و ھٰذالقدر کافٍ۔

تیسرا فریضہ:

تعلیم حکمت ہے۔ حکمت سے مراد پیغمبرانہ بصیرت و فراست، تفقہ و دانائی، تفہیم دین کے اصول اور آداب ترتیب وغیرہ گویا اس سے مراد سنتِ نبویؐ اور دینی اصلاح کا طریقِ محمدیؐ ہوا کماقال اُدع اِلی سَبیلِ رَبِّکَ بِالحِکمَۃِ وَ المَوعِظَۃِ الحَسَنَۃِ وَ جَادِلھُم بالتّی ھِی اَحسَن الایۃ (النمل پ ۱۱) ایک جگہ فرمایا قُل ھٰذِہ سَبِیلِی اُدعُوا اِلیٰ بَصِیرَۃٍ الایۃ (یوسف پ ۱۳) ایک اور جگہ فرمایا وَ من یوت الحکمۃ فقد اُوتی خیراً کثیراً (البقرہ پ ۳) مخاطب کی حالت و کیفیت اور ذہنی سطح کے مطابق بات کرنا متکلم کی حکمت و بصیرت پر دال ہے تعلیم ہو یا تذکیر تلقین ہو یا نصیحت وعظ ہو یا بیان مخاطب جتنی دیر اور جتنی بات کا متحمل ہو، اتنا ہی اسے سمجھایا جائے۔ حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ہفتہ کے بعض ایام میں، ہمیں وعظ فرماتے تھے تاکہ ہم اکتا نہ جائیں (بخاری) یعنی اس بات کا لحاظ فرماتے کہ لوگ وعظ و بیان سے رج نہ جائیں طبائع پر بار نہ ہو، ضروریات اور کام کاج میں زیادہ حرج نہ ہونے لگے (ہنگامی ضرورت اور جہاد کیلئے نفیر عام کے مواقع اس سے مستثنیٰ ہیں) حتیٰ کہ بعض روایات میں ہے کہ آپؐ بحالت نماز اگر کسی بچے کے رونے کی آواز سن پاتے تو اس خیال سے کہ شاید اس بچے کی ماں شریک نماز ہو، آپؐ نماز کو مختصر فرما دیتے۔
یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کو جب لوگوں نے کہا کہ آپ کا وعظ بہت عمدہ ہوتا ہے، روزانہ کیا کریں تو فرمایا کہ میں تمہیں بور کرنا نہیں چاہتا مخاطبین کے حالات و ضروریات

اوران کی خواہش ورغبت کی رعایت کے بغیر اہل علم کاوقت بے وقت دعوت الی اللہ کا وعظ تعلیم دین، تبلیغ احکام و مسائل وغیرہ یا عوام الناس کا باہم ایک دوسرے کو دینی تلقین و نصیحت کئے جانا، بسااوقات دین سے بیزاری کا سبب بن جاتا ہے اور کبھی بار بار کہنے سمجھانے سے مخاطب گرانی اور تنگی محسوس کرنے لگتا ہے جو نہایت مضر ہے انداز بیان میں نرمی اور ہمدردی واضح ہو، اپنی نیکی، پارسائی یا جذبہ دینی کا احساس یا اظہار اشارۃً و کنایۃً بھی نہ ہو، کسی میں کوئی کمی یا کوتاہی دیکھی جائے تو اصلاح عمومی الفاظ سے کی جائے جیسا کہ آنحضرت ﷺ کا طریقہ مبارک تھا کہ ایسے موقع پر "مابال اقوام یفعلون کذا" جیسے عمومی استعمال فرما کر تنبیہ فرماتے جس سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ سمجھ جاتا اور کسی کو شرمندگی بھی نہ اٹھانی پڑتی۔ پھر اگر مخاطب کو اس خاص دینی بات کا علم نہ ہو یا اس خاص انداز گفتگو سے کبھی سابقہ نہ پڑا ہو تو وہ توجہ سے سنتا ہے اور بقول حضرت تھانویؒ اکثر یہی ہوتا ہے کہ جہاں علم نہ ہو وہاں تو توقع ہوتی ہے قبول کی اور اگر علم ہو تو اکثر ناگواری کا سبب ہوتا ہے (افاضات یومیہ)

غرض فساد عقائد، اعمال سیئہ اور کثرت حرام کی وجہ سے قبول حق کی استعداد کم ہوتی جارہی ہے اس لئے دعوت الی اللہ، دین، تبلیغ احکام و مسائل اور عمومی تذکیر و نصیحت وغیرہ ہر ایک میں خاص حکمت و بصیرت چاہیئے۔ پھر یہ دینی کام ایک دن یا ایک ہفتے کا، ایک ماہ یا ایک سال کا نہیں، بلکہ ساری زندگی کرتے رہنے کا ہے اسلئے کسی بھی موقع پر جادۂ اعتدال کو چھوڑ کر اور ہاتھ ہی دھو کر کسی کے پیچھے نہ پڑا جائے کہ یہ بات خصوصیت اعتدال و اقتصاد کے خلاف ہے جو اس امت کا خصوصی امتیاز ہے کما قال وَكَذَالِكَ جَعَلْنَاكُم اُمَّةً وَّسَطاً الاية (البقرة پ ۲) اور خیر الامور اوسطہا کا ارشاد بھی ہمہ قسم کے غلو اور انتہاء پسندی سے منع کرتا ہے بہر حال حکمت و بصیرت کا جامع لفظ ان تمام پہلوؤں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے جو کسی کی تعلیم و تربیت، وعظ و نصیحت، دعوت الی اللہ، تعلیم و تبلیغ احکام وغیرہ کے لئے ضروری ہیں اور آنحضرت ﷺ نے عملاً ان تمام اُصول و آداب کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے بطور نمونہ یہ سب کچھ کر کے دکھلایا، اسی لئے ارشاد ربانی ہے " لَقَد كَانَ لَكُم فِي رَسُولِ اللهِ اُسوَةٌ حَسَنَةٌ الاية "

چوتھا فریضہ :

تزکیۂ نفوس ہے یعنی قلوب انسانی میں جو کفر، شرک، کبر، ریا، سُمعۃ وغیرہ رذائل کی

آلائشیں ہوتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ اپنی صحبتِ اکسیر کی برکت سے دھوڈالتے تھے گویاجو سینہ صدق دل کے ساتھ مہتاب ہدایت کے سامنے آگیاوہ چمک اٹھا کوئی صدیق و عتیق بنا تو کوئی عادل و فاروق، کوئی صاحبِ حیاءوذی النورین بناتو کوئی شجاعت کا پیکر، کوئی وزیر و مشیر بناتو کوئی حواری اور امین الامۃ...... غرض آپ کی صحبت و معیت میں قلوب انسانی یوں مزکیٰ و مصفیٰ ہوتے تھے جیسے زنگ آلودلوہے پر ریگ مال سے صیقل کیا جائے تو وہ چمک اٹھتا ہے کفروشرک کی جگہ ایمان و یقین جاگزیں ہو جاتا کبر و غرور کی جگہ فروتنی و انکساری پیدا ہو جاتی، حسد کی جگہ جانثاری کا جذبہ لے لیتا بغض و عداوت کی جگہ الفت و محبت کے چشمے پھوٹنے لگتے۔

سو آپؐ قاریٔ قرآن بھی تھے، معلم و مفسر قرآن بھی، حکمت و بصیرت سے بھرے اقوال آپؐ نے فرمائے اور قلوبِ انسانی کا تزکیہ اور تصفیہ بھی آپؐ نے فرمایا۔

آپؐ کی ذات بابرکات جامع محاسن و کمالات تھی اور حق تعالیٰ کی خصوصی مدد و نصرت بھی آپؐ کے شاملِ حال تھی اس لئے چاروں فرائضِ منصبیہ کو آپؐ بڑے حسن و خوبی کے ساتھ علیٰ وجہ الکمال سر انجام دیا آپ کے وصال کے بعد آپؐ کے تربیت یافتہ حضرات صحابہؓ نے اس فریضۂ تعلیم و تربیت کو آگے چلایا، ان کے تلامذہ حضرات تابعینؒ نے اس ذمہ داری کو سنبھالا ۔ تا آنکہ امت مسلمہ میں تکوینی طور پر اہلِ علم و تربیت کے چار طبقے وجود میں آگئے جنہوں نے سرکار مدینہؐ کے ایک ایک فرضِ منصبی کو بطور خاص اپنے اپنے ذمہ لیا اور اسے آگے امت تک پہنچایا۔

فریضۂ قرآت و تلاوتِ قرآن کو مستقل طور پر طبقۂ قرّاء نے سنبھالا۔
فریضۂ تعلیم و تفسیر قرآن کو مستقل طور پر طبقۂ مفسرینؒ نے سنبھالا
فریضۂ حکمت و حدیث کو مستقل طور پر طبقۂ فقہاءؒ و محدثین نے سنبھالا
فریضۂ تزکیۂ نفوس کو مستقل طور پر طبقۂ صوفیاء و مشائخ نے سنبھالا

القصہ اصل فریضۂ تعلیم و تربیت، قرآن پڑھانا، قرآن کے معانی و مفہوم لوگوں کو سمجھانا، حدیث نبویؐ و حکمت دینی سمجھانا اور لوگوں کے دلوں کو اخلاق رذیلہ ریا، تکبر، بخل، کینہ، وغیرہ سے پاک صاف کرنا ہے جسے چودہ سو سال سے امت مسلمہ کے اہل علم حضرات سرانجام دیتے چلے آرہے ہیں۔ ابتداءً حضور ﷺ اور حضرات صحابہؓ کے دور میں تعلیم و تربیت کا سلسلہ زیادہ تر صدری (زبانی) رہا اور تحریری و کتابی کم پھر رفتہ رفتہ تحریری و کتابی

سلسلہ بھی، صدری وزبانی سلسلے کے طرح برابر چل پڑا پھر شدہ شدہ اس سلسلے میں دینی و علمی مراکز بننے لگے، جہاں مستقل طور پر تعلیم وتربیت کا باقاعدہ نظام جاری ہوگیا، حضراتِ قُرّاء نے قرآنی مکاتب قائم فرمائے۔ تفسیر حدیث اور فقہ اسلامی کی تعلیم کے لئے علماء اسلام نے مدارس وجامعات کی بنیاد ڈال دی تزکیۂ نفوس (اصلاح قلوب) کے لئے مشائخ و صوفیاء نے خانقاہی نظام جاری کردیا مصنفین ومؤلفین نے قرآن وحدیث کے علوم و مسائل، کتابی شکل میں مرتب کرنے شروع کیئے۔ واعظین ومقررین عمومی وعظ ونصیحت اور تقریر وبیان میں مشغول رہے۔ غرض ان معلمین ومبلغین علماء اسلام نے اپنی زندگیاں ان فرائض نبویہ کی ادائیگی میں کھپادیں اور عامۃ المسلمین ان دینی پیشواؤں کی تعلیم وتربیت اور وعظ وبیان سے دینی علوم حاصل کرتے رہے۔ ان حضرات کی تعلیمی محنت اور تبلیغی مجاہدات ہی کا یہ ثمرہ ہے کہ یہ دینِ نبویؐ نسلاً بعد نسلٍ، نقل در نقل ہوت آج ہم تک پہنچا ہے "جزاهم الله تعالىٰ احسن الجزاء" بہر حال تعلیم وتربیت، دعوت الی اللہ، و تبلیغ دین اورامر بالمعروف و نهى عن المنكر کا جو حکم، کتاب وسنت میں موجود ہے، امت مسلمہ کسی بھی دور میں، اس سے غافل نہیں رہی، ہر زمانے میں دینی تعلیم، دینی تربیت، تبلیغِ احکام ومسائل وعظ ونصیحت، عمومی امر بالمعروف ونہی عن المنکر وغیرہ ہوتا رہا البتہ ہر دور کے حالات کے اعتبار سے مختلف اور مناسب طریقے، اس کے لئے اختیار کئے جاتے رہے۔

اصلاح خلق واضح ہو کہ اصلاحِ خلق کے دو درجے ہیں، ذاتی وانفرادی اصلاح، عمومی و اجتماعی اصلاح، ہر ایک کا مختصر بیان درج ذیل ہے۔

ذاتی اصلاح حضرات گرامی! ہر شخص کو اپنے ایمان و عمل اور اصلاح کے لئے اولاً بقدر ضروری، علم دین حاصل کرنا لازم ہے، جس کے ذریعے وہ دینی فرائض بجالا سکے اور محرمات سے بچ سکے، خواہ وہ شخص یہ علم کسی بھی ذریعے سے حاصل کرے، مدارس میں پڑھ کر، علماء ومشائخ کے مواعظ وبیانات سن کر، ان کی لکھی ہوئی دینی کتابیں پڑھ کر، ان سے خط وکتابت اور مراسلت کرکے یا ان سے بالمشافہ پوچھ پاچھ کر، پھر اس علم پر عمل پیرا ہونے کے لئے کسی صاحبِ نسبت شیخ سے تعلق رکھے، اس لئے کہ علم پر عمل، رذائل نفس کی اصلاح اور دینی تربیت عموماً کسی شیخ کی صحبت اور راہنمائی کے بغیر نہیں ہوتی اور حکم قرآنی " الرَّحمٰنُ فَاسئلَ بِهِ خَبِيرا" (فرقان پ ۱۹) کہ رحمٰن کے متعلق کسی باخبر سے پوچھو اور کُونُوا مَعَ

الصّٰدِقِینَ (التوبہ پ ۱۱) کہ سچے اور کھرے لوگوں کی معیت میں رہو، کا منطوق بھی اہل اللہ سے اسی تعلق کو چاہتا ہے، غرض اصلاحِ نفس مقدم ہے کہ پہلے اپنی ذات کی اصلاح کی فکر اور کوشش ہو پھر دوسروں کی۔ "الذِیْنَ اٰمَنُوا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے بیشمار قرآنی صیغوں میں اسی ذاتی اصلاح کا بیان ہے کہ ان آیات میں اس ایمان اور عمل صالح کا ذکر ہے جو انسان کی خود اپنی ذات سے متعلق ہے، سو اپنی اصلاح کی اہمیت اور بنسبت دوسروں کی اصلاح کے اس کا مقدم ہونا، واضح اور ظاہر ہے البتہ یہ تقدم رُتبی ہے زمانی نہیں یعنی یہ مطلب نہیں کہ جب تک کوئی خود اعلیٰ درجے کا صالحنہ بن لے، دوسروں کو نیکی اور صلاح کی کوئی بات ہی نہ کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جتنی فکر دوسروں کی اصلاح کی ہو اپنے لئے یہ فکر نسبتاً زیادہ ہو، اگرچہ یہ دونوں ایک وقت میں ہوں، قرآن کریم نے علماء یہود کی مذمت "اَتَامُرُونَ النَّاسَ بِالبِرِّ وَ تَنسَونَ اَنفُسَکُم الآیۃ" (البقر پ ۱) اسی بات پر فرمائی کہ وہ اپنی ایمانی اصلاح سے بے پرواہو کر دوسروں کو ایمان واصلاح کی باتیں کہتے اور بتلاتے:

عمومی (دوسروں) کی اصلاح: قرآن وحدیث میں یہ بات متعدد مقامات پر فرمائی گئی ہے کہ دینی احکام پر خود عمل کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں دوسروں تک پہنچانا اور انہیں تذکیر و تلقین عمل کرنا بھی ضروری اور لازمی ہے دین کی بقا اور اشاعت اور دینی نظام برقرار رکھنے کے لئے دعوت الی اللہ تعلیم وتبلیغ احکام اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہایت ضروری ہے۔ غیر مسلموں کو اصول دین (توحید، رسالت، قیامت، صداقت قرآن وغیرہ) کی دعوت، اہل اسلام کو عقائد صحیحہ، احکاماتِ شرعیہ کی تعلیم وتبلیغ اور دینی ماحول بنانے اور اسے برقرار رکھنے کیلئے تمام اسلامیوں کا اپنی حیثیت واستطاعت کے بقدر باہم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا یعنی ایک دوسرے کو معروفات (بھلائیوں) کی تلقین و ترغیب اور منکرات (برائیوں) سے ترہیب وتنبیہ وغیرہ اہم دینی فرائض ہیں، دعوت کا لفظ عموماً اصول دین کے لئے، تعلیم و تبلیغ کا لفظ احکام و مسائل بتلانے اور پہنچانے کیلئے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا صیغہ ان اصول و احکام کی پابندی کرانے یعنی اعمال صالحہ اور معروفات کی ترغیب دینے اور منکرات ومعاصی سے روکنے اور ڈانٹنے کے لئے استعمال ہوا ہے یہ دین کا ایسا زبردست رکن ہے کہ اس سے دین کے تمام حدود واحکام کی حیات وبقا وابستہ ہے گویا تمام اعمال صالحہ اور زندگی کے تمام گوشوں کی صلاح و فلاح کے لئے یہ عمل مثل آبِ حیات کے ہے

بر حسب فرمان نبویؐ مَن رَاٰی مِنکم فَلیُغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہٖ فان لم یستطع فبقلبہٖ و ذالك اضعف الایمان (رواہ مسلم) اس کے تین درجے ہیں۔
یعنی جو شخص صاحبِ قوت اور با اختیار ہے تو قوتِ اقتدار کے ذریعے وہ امر و نہی کرنے کا مکلف ہے (یہ درجہ امراء و حکام کا ہے) جو صاحب اختیار و اقتدار نہیں، وہ زبان و قلم سے امر نہی کرنے کی ہمت و استطاعت بھی نہیں رکھتا تو وہ کم از کم دل میں برائی کو مٹانے اور بھلائی کو پھیلانے کا جذبہ ضرور رکھے (یہ درجہ عوام الناس کا ہے جو نہایت کمزور ایمان ہے)
غرض "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" (جسے تغییر منکر کہا جاتا ہے) ہر مسلمان پر بقدر و علم و استطاعت ضروری اور لازم ہے کما قال اللہ "کنتم خیر امّۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف --- الآیہ
ہاں دعوت الی اللہ ہو یا دعوت الی الخیر، تعلیم دین ہو یا تبلیغ احکام و مسائل، یہ اہم دینی کام بلاشبہ ایک مخصوص جماعت علم کا ہے جس کے وجود کا مطالبہ حق تعالیٰ نے "ولتکن منکم امّۃ یدعون الی الخیر --- الآیہ)" میں فرمایا ہے کہ تمام عالم اسلام پر یہ بات فرض ولازم ہے کہ وہ ایسی ایک جماعت تا قیامت ہر دور میں قائم رکھنے کا اہتمام کرے، جسکا مقصد حیات اور نصب العین ہی دعوت الی اللہ اور دعوت الی الخیر ہو، دینی خدمت یعنی تعلیم دین اور تبلیغ احکام و مسائل ہو، دوسرے کام کاج اور دھندوں سے الگ، محض اسی کام کے واسطے مقرر ہو۔ "الخیر" کی تفسیر آنحضرت ﷺ نے "اتّباع القرآن و سنّتی" سے فرمائی ہے کما فی ابن کثیر "یعنی وہ جماعت لوگوں کو اتباع قرآن و سنّت کی دعوت دیا کرے، اسکا ہر فرد قرآن و سنّت کے علوم اور حقائق و معارف سے آگاہ ہو، حکمت و موعظت اور علمی بحث مباحثہ کے ذریعے احقاق حق اور ابطال باطل کر کے، دعوت الی اللہ کا کام کر سکتا ہو کما قال "ادع الی سبیل ربك بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن الآیہ" (النحل پ ۱۴) دینی فہم و بصیرت اور نور فراست سے بہرہ ور ہو کما قال قُل ھٰذہٖ سَبِیلِی اَدعُوا الیٰ اللہ علیٰ بصیرۃ اَنا وَمَن اتبعنی الایۃ (یوسف پ ۱۳) حسب ارشاد ربانی وَمَن یُوتَ الحکم فقد اُوتیَ خیراً کثیراً اور حسب ارشاد نبویؐ من یُرد اللہ بہ خیراً یفقّہُ فی الدین (رواہ البخاری و مسلم) دانشمندی اور تفقہ فی الدین کا ملکہ اسے حاصل ہوا اور اس جماعت کا ایک ایک فرد حسب فرمان نبویؐ فقیہ واحد اشدّ علی الشیطان من

الف عابدٍ (رواہ الترمذی) شیطان کے حق میں ہزار ہزار عبادت گزار سے زیادہ بھاری ہو۔
اہلِ علم کی ایسی ایک جماعت کا پتہ قرآن کریم نے ابتداء اسلام ہی سے دیا ہے کما قال فَلَو لَانفر مِن کُلِ فِرقَةٍ مِنهُم طَائفَةٌ یتَفقّهو ا فی الدین الایة (التوبة پ ۱۰) کہ کیوں نہ نکلا ہر بڑے گروہ میں سے ایک حصہ کہ (باقیماندہ) دین میں سمجھ بوجھ حاصل کرتے،
اور حدیث پاک میں بھی ہے کہ آپؐ نے آیت ولتَکُن مِنکُم اُمّة یدعون الیٰ الخیرِ الایة تلاوت فرمائی اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ مخصوص صحابہ کرامؓ کی جماعت ہے کما فی معارف القرآن جن کے بارے میں آپؐ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا " لِیکُنی مِنکُم اُولُو الاَحلامِ وَالنهیٰ الحدیث " (رواہ مسلم والترمیزی) کہ تم میں سے دانشمند اور فہم و فراست والے حضرات بالخصوص میرے قریب رہا کریں۔

بارگاہِ ایزدی میں "زدنی عِلما" کی دعا مانگنے والے سر تاجِ انبیاء نے "انما بُعثت معلما الحدیث" فرما کر جب نبوت و رسالت کے علمی پہلو کی مزیتہ شان کو اجاگر فرمادیا تو اپنی جانشینی کا حق و استحقاق بھی انہیں وارثانِ علوم نبوت کے لئے ثابت و مقرر فرمایا کہ "انّما العُلماءُ وَرَثَةُ الانبیاء الحدیث" انہیں اربابِ علم و فضل کے فرائض منصبیہ کا تذکرہ اپنی ایک پیشین گوئی میں یوں فرمایا" یحمل هٰذا العلم من کلِ خلفٍ عدول الحدیث" اور ایسے ہی اہلِ علم و ذکر حضرات کے طرف حق تعالیٰ نے اپنی عام مخلوق کو، تا قیامت پیش آمدہ مسائل میں رجوع کرتے رہنے کا پابند فرمادیا کما قال فَاَ سئَلُوا اهلَ الذِکرِ اِن کُنتُم لا تَعلمُون (النحل پ ۱۴)

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلویؒ اپنی تفسیر موضح القرآن میں فرماتے ہیں کہ آیت " و لتکن منکم امة یدعون الی الخیر الایة" سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں فرض ہے کہ ایک جماعت قائم رہے جہاد کرنے کو اور دین کی باتوں کا تقید رکھنے کو تاکہ دین کے خلاف کوئی نہ کرے اور جو اسی کام پر قائم رہے بس وہی کامیاب ہیں اور یہ بات کہ کوئی کسی سے تعرض نہ کرے موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود (نہ اپنا عقیدہ چھوڑو، نہ کسی کو چھیڑو) یہ راہ مسلمانی کی نہیں۔ سو حسبِ ارشاد قرآنی ہر شہر یا قصبے میں ایک عالم دین، جو دینی علوم و مسائل کا ماہر ہو، موجود ہونا ضروری ہے وگرنہ شہر والوں پر فرض ہے کہ اپنے میں سے کسی کو عالم بنائیں یا باہر سے کسی عالم کو بلا کر اپنے شہر میں رکھیں تاکہ ضرورت پیش آنے پر ہر قسم کے

موٹے باریک مسائل اس سے پوچھ سکیں اور ان پرعمل کر سکیں غرض دینِ اسلام کی نمائندگی واشاعت، دعوت الی اللہ کی صورت میں ہو، یا اہل اسلام کی دینی ضرورت کا پورا کرنا، تعلیم دین اور تبلیغ احکام کی صورت میں ہو، یہ ہر سہ وظائف توامت کے علماء کرام اور مشائخِ عظام ہی کا فریضہ اور منصب ہیں کہ در حقیقت یہی حضرات ذی وقار تفسیر، تشریح احادیث، استدلال واستنباط اور امر ونواہی کا مدلل بیان، دینی کتب اور رسائل کی تصنیف و تالیف، مسائل و فضائل پر مشتمل علمی و عظ وبیان، مُلحدوں غیر مسلموں سے بحث تمحیص اور مناظرہ ومجادلہ وغیرہ مہمات دینیہ کی اہلیت وصلاحیت رکھتے ہیں۔

رہا امر بالمعروف ونہی عن المنکر، تو اس کی مکلّف پوری امت ہے کما قال کُنتُم خَیر اُمة اُخرجتِ للناس الایة (آل عمران پ) کہ امت کا ہر فرد خواہ تاجر ہو یا ملازم، دکاندار ہو یا کاشتکار، حکیم ہو یا طبیب، انجنیئر ہو یا ڈاکٹر شہری ہو یا دیہاتی، بقدر علم واستطاعت اس امر و نہی کا مکلّف ہے۔ دعوت الی اللہ، تعلیم دین اور تبلیغ دین کا مرکزی اور خصوصی کام کرنے والے حضرات علماء ومشائخ بھی، عمومی جلسات، اجتماعات، بیانات وغیرہ میں بقدر استطاعت اس امر و نہی اور تذکیر و نصیحت کرنے کے مکلّف ہیں اس لئے وَلتکُن مِنکم اُمةٌ یدعون الی الخیر کے آگے یامرون بالمعروف وینہون عن المنکر کا صراحۃً ذکر فرمایا حتیٰ کہ یہود و نصاریٰ کے بگاڑ اور فساد پر، اللہ رب العزۃ نے یہودی علماء و مشائخ کو اس فریضہ امر و نہی میں غفلت و کوتاہی کرنے پر بالخصوص ڈانٹا کہ لوَ لا ینہاھُم الربانیونَ و الاحبار الایۃ (المائدہ پ٦) بلاشبہ دعوت الی اللہ تعلیم دین اور تبلیغ احکام ومسائل کا نازک اور اہم کام علماء و مشائخ ہی کا فریضہ اور منصب ہے مگر آج کل لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہیکہ امر با لمعروف و نہی عن المنکر، یعنی اپنی استطاعت واختیار کے مطابق ایک دوسرے کو اچھے کاموں کا حکم کرنا اور برے کاموں سے روک ٹوک کرنا اور باہم دینی تذکر و نصیحت، یہ بھی صرف علماء ہی کے ذمہ ہے سو یہ غلط ہے بلکہ حسبِ ارشاد کُنتمُ خیر امة اُخرجت للناس الایۃ، ہر شخص ہر جگہ حسبِ موقع امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے کا ذمہ دار ہے، اس میں علماء کی تخصیص نہیں، عمومی خطاب یا بیان بطور وعظ یہ یقیناً علماء کا منصب ہے اور انہیں کے ساتھ خاص ہے کہ عمومی وعظ اور علمی بیان کرنے کے اہل، صرف یہی حضرات ہیں، انہیں کے خطاب عوام میں اثر ہوتا ہے کہ لوگ انہیں مقتدا و پیشوا سمجھتے ہیں اور عامی شخص

کے وعظ عام میں اثر نہیں ہوتا کہ لوگ اسے مقتدا نہیں سمجھتے البتہ انفرادی طور پر ایک دوسرے کو نیکی اور دینی کاموں کی ترغیب اور منکرات اور برے کاموں سے بچنے کی تنبیہ و تاکید، یہ ہر جگہ ہر شخص کے ذمہ ہے، کسی فرد بشر سے ساقط نہیں مثلاً نماز روزہ فرض ہے تو ہر شخص پر واجب ہے کہ بے نماز، بے روزہ شخص کو بقدر اختیار واستطاعت نماز، روزہ کی تلیقن کرے اس طرح سود، رشوۃ چور ڈاکہ، قتل، جھوٹ، جھوٹی گواہی، دھوکا ملاوٹ وغیرہ حرام ہے، تو ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ ان جرائم اور گناہوں میں مبتلا حضرات کو بقدر قوت و استطاعت رکنے کی فہمائش کرے۔

غرض جو مسائل مشہور اور منصوص ہیں کہ واضح اور صاف طور پر مذکور ہیں مثلاً یہ کہ ایمان لانا ضروری ہے، نماز، روزہ، حج، زکوۃ، کسب حلال وغیرہ فرض ہے، سود، رشوت چوری، ڈاکہ، زنا، قتل، گانا، باجہ، تصویر کشی، تصویر سازی وغیرہ حرام ہے، ان کا باہم ایک دوسرے کو بتلانا، سمجھانا اور عمل کی ترغیب دینا وغیرہ علماء کے ساتھ عوام الناس کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ ہر شخص دوسرے کو، ان دینی اعمال واحکام کی بجا آوری کی فہمائش کرے اور منکرات و گناہوں سے منع کرے ہاں جو مسائل غیر منصوص ہیں یعنی قرآن، حدیث میں صاف موجود نہیں بلکہ خاص غور خوض کے بعد سمجھے اور نکالے جاتے ہیں، یہ دعوت الی اللہ تعلیم دین اور تبلیغ احکام و مسائل کے طرح، صرف علماء ہی کا کام ہے کہ عوام الناس ان اجتہادی مسائل میں خطرناک غلطیاں کر کے ضلوا فاضلو کا مصداق بنیں گے بہر حال ہر عامی شخص بقدر علم و استطاعت امر و نہی کرنے اور تلقین تذکیر اور ترغیب کے ذریعے دینی فہمائش کرنے کا مکلف ہے، ہاں علماء کرام اس ذمہ داری کو نبھاتے ہوئے دعوت الی اللہ تعالیٰ تعلیم دین اور تبلیغ احکام و مسائل کے بھی مکلف ہیں کہ یہ کام عوام الناس کے بس کا نہیں۔

چودہ سو سال سے ہر دور میں بمقتضائے حالات، دعوت الی اللہ تعلیم دین تبلیغ احکام و مسائل امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دینی تذکیر و نصیحت کیلئے مختلف اور مناسب طریقے اختیار کئے جاتے رہے مثلاً اہل کفر کے ساتھ، علماء اسلام کا احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے بحث مباحثہ اور مناظرہ و مجادلہ کرنا، ان کے کافرانہ عقائد و نظریات کا رد اور دین اسلام پر ان کے شبہات واعتراضات کے تسلی بخش بلکہ دندان شکن جواب دینا، اہل اسلام کو تعلیم دین اور تبلیغ احکام کے لئے درس قرآن دینا، درس حدیث دینا تفسیر، حدیث اور

مسائل فقہیہ کا بیان کرنا مفتیان کرام کا فتاویٰ لکھنا مسائل ضروریہ پر چھوٹی بڑی کتابیں اور رسائل تحریر کرنا، جمعہ کے خطابات، عمومی جلسات و اجتماعات کے ذریعہ، عوام الناس تک دینی اصلاحی باتیں پہنچانا، قریہ قریہ، بستی بستی، میں علماء کرام کا وعظ کہنا، انفرادی ملاقاتوں میں شرعی اوامر و نواہی کی تذکیر و نصیحت کرتے رہنا، دینی مضامین اور کتابیں شائع کر کے، دور و نزدیک کے لوگوں تک دینی تعلیمات بہم پہنچانا، صوفیا و مشائخ عظام کا تزکیہ اور احسان کے ذریعہ اصلاحِ اعمال و احوال کی کوشش کرنا یہ سب دعوت الیٰ اللہ تعلیم دین اور تبلیغ احکام و مسائل کی مختلف صورتیں ہیں، اس طرح حکامِ وقت، امراء، والدین، ارباب قوت و اختیار کا، اپنے حلقۂ اختیار میں، بے عمل یا بد عمل افراد کو، اعمال صالحہ (نماز، روزہ کسبِ حلال وغیرہ) کی تذکیر و فہمائش کرنا اور اعمال سیہ، جرائم اور گناہوں سے بچنے کی تلقین و تاکید کرنا، وغیرہ یہ سب امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی مختلف صورتیں اور درجات ہیں، جو شخص جس طرح کرے زبانی یا تحریری انفرادی (اکیلے) اجتماعی (کسی جماعت کی شکل میں) ہر طرح جائز اور درست ہے:

اس کی مثال یوں، سمجھئے کہ جس طرح دنیا میں ہر علم و فن کے لوگ حکماء ہوں یا اطباء، مستری ہوں یا معمار، انجینیر ہوں یا ڈاکٹر، تین درجات پر ہیں ادنیٰ متوسط، اعلیٰ، جسمانی بیماریوں کے معالجین کے تین درجات دیکھ لیجئے ڈسپنسر، عام ڈاکٹر، سپیشلٹ ڈاکٹر معمولی تکلیف اور درد کا علاج اور ظاہر زخم کی مرہم پٹی وغیرہ، یہ کام طب اور ڈاکٹری کی ابتدائی اور معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا ڈسپنسر کر دیتا ہے، اگرچہ عام لوگ ایسے شخص کو بھی توسعاً اور مجازاً ڈاکٹر ہی کہا کرتے ہیں، اگر کسی مریض کا معاملہ اس سطح سے اونچا ہو مثلاً سخت تیز بخار ٹائیفائڈ، کان میں درد اور پیپ، آنکھ میں درد اور ریشہ وغیرہ ہو تو وہ ڈسپنسر اس مریض کو ایم بی ایس ڈاکٹر کے پاس بھیج دیتا ہے تاکہ اس مریض کی تشخیص ہو کر مناسب علاج ہو سکے اگر کسی مریض کا معاملہ اس سطح سے اونچا ہو مثلاً اس کے گردے، پتے وغیرہ میں پتھری ہے اور آپریشن کی ضرورت ہے یا دل کی دھڑکن بے قاعدہ ہے اور دورہ پڑتا ہے یا دماغی توازن درست نہیں یا پھیپھڑے میں انفیکشن ہے، ٹی بی وغیرہ کی شکایت ہے یا اس طرح کا پیچیدہ مرض ہے تو ایم، بی، بی ایس ڈاکٹر ایسے مریض کو کسی فزیشن اور سرجن سپیشلٹ ڈاکٹر کے پاس جانے اور علاج کرانے کا مشورہ دیتا ہے۔

بعینہ اس طرح دینی ، روحانی بیماریوں کے معالجین بھی تین درجوں پر ہیں عام دیندار ، عام علماء ، خواص علماء ، و مشائخ مثلاً ظاہری روحانی بیماریاں جیسے نماز نہ پڑھنا ، روزہ نہ رکھنا، حلال حرام میں تمیز نہ رکھنا، ان واضح بیماریوں کا علاج واصلاح ہر دیندار مسلمان بقدر استطاعت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعے کرنے کا ذمہ دار ہے کہ نماز، روزہ کسبِ حلال وغیرہ معروفات کی تلقین و ترغیب دے اور سود، رشوت چوری، زنا، قتل، وغیرہ منکرات اور جرائم سے رکنے کی فہمائش کرے سو نمازی اور روزہ دار شخص، بے نماز بے روزہ شخص کو نماز کیلئے کہے اور حلال خور شخص، سود رشوت چوری، چٹی دلالی کا دھندہ کرنے والے کو اس حرام خوری سے رکنے کی فہمائش کرے اس طرح کی ترغیب دے، دینی اعمال و احکام سے بیزار اور دور مسلمانوں کو، دین کی قدر و اہمیت بتلا کر ان کے دل میں دینی جذبہ اور شوق پیدا کرے عام لوگ اگر چہ اس کو دعوت و تبلیغ کہہ دیتے ہیں (جیسے ڈسپنسر کو ڈاکٹر کہہ دیتے ہیں) مگر یہ محنت اور کام در حقیقت بے عمل اور بد عمل کو اعمال صالحہ پر لگانے اور ان سے اعمال سیہ چھڑانے کی ایک کوشش ہے جو تذکیر و تلقین پند و نصیحت اور تحریک اصلاح کہلانے کی مستحق ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا بھی دوسرا درجہ ہے اس لئے کہ دعوت تو اصول دین کی ہوتی ہے اور تعلیم ، قرآن و حدیث اور ان کی تشریحات کی ہوتی ہے اور تبلیغ احکام و مسائل کی ہوتی ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا پہلا درجہ قوت و طاقت اقتدار سے متعلق ہے غرض دینی احکام کا بنیادی اور موٹا موٹا علم تو علماء اسلام کی محنت سے ہر مسلمان کو ہے خواہ وہ بے عمل ہو یا بد عمل کسے معلوم نہیں کہ نماز ، روزہ، حج، زکوٰۃ، حلال کمانا اور کھانا فرض ہے اور سود، رشوت، چوڑی جھوٹ، حرام وغیرہ ناجائز ہے، سو یہ تذکیر و تلقین ان شرعی اوامر و نواہی پر عملدر آمد کی ترغیب دینے کیلئے کی جاتی ہے سو جب تلقین و تذکیر سے کسی بے عمل یا بد عمل شخص میں دینی احکام پر عمل کرنے کا کچھ احساس پیدا ہو تو ایسے آدمی کو کسی عالم دین سے رابطہ اور تعلق قائم کرنے کا مشورہ دیا جائے تاکہ وہ عالم دین اس شخص کو قرآن، حدیث کی روشنی میں شرعی اوامر و نواہی کی پابندی کرنے کے فضائل و فوائد سمجھائے ۃ ان کی ادائیگی کا صحیح طریقہ اور مسائل شرعیہ بتلائے اور دینداری اختیار کرنے کی عالمانہ ترغیب دے۔

باوجود اتنی محنت و کوشش کے بھی اگر اس شخص میں عمل بالشریعہ کا جذبہ اور داعیہ کما حقہ پیدا نہیں ہوا تو ایسے شخص کو کسی کہن مشق عالم دین، کسی شیخ الحدیث کسی شیخ التفسیر، کسی صاحبِ نسبت شیخ کی خدمت میں جانے کا مشورہ دیا جائے تاکہ ان کے فیضِ صحبت اور پُر تاثیر ناصحانہ کلام سے اس کے دل کی دنیا بدلے چونکہ انسان بھلے یا برے جتنے اعمال کرتا ہے ان کا اصل سرچشمہ وہ باطنی اخلاق اور مخفی ملکات ہیں جو انسان کی طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں ان تجربہ کار علماء اور مشائخ کی نگاہ انہیں ملکات کی اصلاح پر ہوتی ہے، جس سے تمام اعمال خود بخود سنورنے لگتے ہیں مثلاً کسی کو حبِ مال (دولت کی محبت) کا مرض ہے، جس کے نتیجے میں وہ سود رشوت، چوری، ڈاکہ، دھوکہ، ملاوٹ، کم تولنا، کم ناپنا، وغیرہ تک یہ سب مظالم اور جرائم کر گزرتا ہے تو اہل اللہ مختلف تدبیروں سے دنیا کی ناپائیداری اور اس کے عیش کے عارضی ہونے کا استحضار اس کے دل میں پیدا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے حبِ دنیا کا مرض چھٹنے لگتا ہے اور ان جرائم سے اسے نفرت ہونے لگتی ہے، اس طرح مثلاً کسی کے دل میں غرور اور تکبر ہے، طیش اور غصہ بہت کرتا ہے، بات بات پر بگڑ جاتا ہے، لڑنے مرنے، پر آجاتا ہے دوسروں کی تحقیر، توہین اور تذلیل کرنے سے نہیں چوکتا تو اہل اللہ اس کے دل میں، خدائے جبار و قہار کے حضور پیشی اور ان فتنہ سامانیوں کی جوابدہی کا استحضار پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے یہ بد اخلاقیاں اور غرور کافور ہونے لگتا ہے غرض انسان کی کامل اصلاح کے لئے ان ملکات اور اخلاق باطنہ کی اصلاح ضروری ہے تاکہ حبِ دنیا اور خواہشات نفسانیہ کی بجائے خدا، رسول اور قرآن حدیث کی محبت پیدا ہو اور بے عملی اور دنیاداری کی بجائے، باعمل اور دیندار زندگی گزارنے کا ذوق نصیب ہو۔

مولوی محمد ارشد قاسمی فیض آبادی

آج کا یہ اجلاس مولوی احمد اللہ شاہ فیض آبادی کا یوم شہادت منانے کے لئے منعقد کیا جارہا ہے اس لئے کہ ۱۵ر جون ۱۸۵۸ء کو مولوی احمد اللہ شاہ فیض آبادی نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ جس ذات کا یوم شہادت منایا جارہا ہے ضروری ہے کہ کچھ ان کی زندگی کے حالات ہمارے سامنے ہوں۔ اور ان کی خدمات جو انہوں نے ملک و قوم کے لئے کی ہیں ہم اس سے آشنا ہوں تاکہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ مولوی احمد اللہ شاہ کون تھے کہاں پیدا ہوئے اور کہاں مسکن بنایا اور کہاں جام شہادت پی کر ہمیشہ کے لئے محو خواب ہوئے۔

لیکن اس کے جاننے سے پہلے چند لفظوں میں یہ بات بھی جاننا ضروری ہے کہ آزادی کی لڑائی کہاں سے اور کیوں شروع ہوئی اور اتنی بڑی جنگ عظیم کیسے بن گئی۔

۱۶۰۱ء میں سب سے پہلے انگریزوں کا ایک قافلہ ہندوستان آیا اور پھر ۱۶۰۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے بغرض تجارت دوسرا قافلہ وارد ہند ہوا جو میسور کے علاقہ میں اترا یہ زمانہ جہانگیر بادشاہ کا ہے۔ شہنشاہ جہانگیر نے جب دیکھا کہ ان لوگوں میں تجارتی ہنر موجود ہے تو اس نے ان لوگوں کو رہنے اور تجارت کرنے کے لئے میسور کا ایک علاقہ دیدیا جہاں انگریزوں نے تجارت میں محنت کی اور مضبوط ہوگئے اسی تجارتی قافلہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کہتے ہیں۔

رفتہ رفتہ انگریزوں نے اپنی چال استعمال کی اور ایک مختصر سی مدت میں ایک صوبہ پھر دو صوبہ پھر تین صوبہ حتیٰ کہ چار صوبوں پر قابض ہوگئے اور اب انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ہم کو بھارت پر اپنی حکومت قائم کرنی ہے اور یہاں کے لوگوں کو اپنا غلام بنانا ہے چنانچہ وہ ہمیشہ اسی جدوجہد میں مصروف رہے۔

ادھر دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے جب انگریز کی ریشہ دوانیاں اور مسلم دشمنی اور ملک کے ساتھ غداری کو محسوس کیا تو ۱۸۰۶ء مطابق ۱۲۱۸ھ میں انگریزوں سے لڑنے اور جہاد کرنے کا فتویٰ جاری کردیا۔ گویا

ہندوستان کی مکمل جنگ آزادی کی بنیاد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا فتویٰ ہے۔
شاہ صاحب کے فتوے کے الفاظ کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ "ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت سے اعلان جنگ کر دے۔ اور جب تک اس کو ملک بدر نہ کردے اس ملک میں زندہ رہنا اپنے لئے حرام جانے۔
شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی فیض آبادیؒ اس فتوے کے مضمرات پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
"حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دھلویؒ نے انگریزوں کے خلاف جو ظلم وستم کی شکایت کی ہے اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا بھی ذکر کیا ہے کیونکہ یہ دونوں بغیر امن کا پروانہ لئے شہر دہلی یا اس کے نواح میں نہیں آسکتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحبؒ انگریزوں کے مظالم سے صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوؤں کی بھی گلو خلاصی چاہتے تھے۔

مولوی احمد اللہ شاہ اصل نام و سلسلۂ نسب:

تاریخ آزادی کے ہیرو، وطن عزیز کے بہادر فرزند فدائے ملک و ملت سلطان ٹیپو کے ایک مصاحب چیناپٹن کے نواب تھے ان کا نام سید محمد علی تھا۔ انہیں نواب محمد علی کے یہاں ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا باپ کے نام کی مناسبت سے احمد علی نام رکھا گیا اور ضیاء الدین عرف قرار پایا مگر عجیب بات ہے کہ اصل نام سے شہرت بہت کم ہوئی جب یہ لڑکا عمر عزیز کی تقریباً چھے دھائیاں طے کرنے کے بعد جدو جہد آزادی کا علمبردار ہوا تو احمد اللہ شاہؒ کہلانے لگا ریاست گولکنڈہ کے آخری بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ تھے جو عبداللہ قطب شاہ کے داماد تھے جب اس خاندان میں حکومت نہ رہی تو ابوالحسن کے پوتے چیناپٹن جابسے اور وہاں کے نواب کہلائے اس خاندان کے نامور بزرگ سید جلال الدین عادل کے فرزند ارجمند سید محمد علی تھے اور سید محمد علی کے فرزند سید احمد علی تھے جو بعد میں احمد اللہ شاہ کے نام سے مشہور ہوئے۔

تعلیم و تربیت:

خاندانی عظمت و شرافت کے بموجب آپ کی تعلیم و تربیت امیرانہ ہوئی اور اس زمانہ کے رواج کے مطابق علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ فنون حربہ میں بھی ماہر بنایا گیا۔ ہوش سنبھالا تو طبیعت کا میلان اوراد و ظائف کی طرف تھا نماز روزہ، احکام شریعت کے زبردست

پابند تھے۔ ہر عمل میں سنت رسول ﷺ پر عمل ضروری سمجھتے تھے۔ والدین سے سلطان ٹیپو کی شہادت اور انگریز کی جابرانہ داستان سن کر بہت متاثر ہوئے۔ جس کی وجہ سے نوابی ٹھاٹھ باٹھ سے بیزار ہوگئے اور مجاہدانہ زندگی گذارنے کا فیصلہ کرلیا۔

مجاہدانہ زندگی کا آغاز:

سب سے پہلے حیدر آباد کا سفر کیا اور پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد یورپ کا سفر کیا دورانِ سفر برطانیہ بھی گئے اور ملکہ وکٹوریہ کے مہمان ہوئے وہاں سے واپسی پر حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے اور حج وعمرہ کیا یہاں سے نکل کر ایران ہوتے ہوئے چین کے راستے ہندوستان آئے اور سانبھر کے علاقہ میں ڈیرا ڈالا۔

مولوی احمد اللہ شاہ اور پہلی جنگ آزادی:

چونکہ طبیعت میں شرافت اور نیکی حد درجہ تھی اس لئے مراحل سلوک طے کرنے کے لئے جے پور کے مشہور بزرگ قربان علی شاہ کی خدمت میں چلے گئے۔ ان کی خدمت سے فیوض و برکات و کمالات حاصل کر کے ٹونک تشریف لئے گئے جہاں نواب وزیر الدولہ سے مجلسیں گرم رہیں ٹونک کی آب وہوا اگرچہ مزاج کے مطابق نہ تھی مگر جذبۂ جہاد کے لئے سب سے موافق فضا ٹونک ہی کی تھی۔

نواب وزیرالدولہ نے سید احمد شہید اور مولانا شاہ اسماعیل شہید سے تربیت پائی تھی احمد اللہ شاہ ٹونک سے گوالیار آئے یہاں ایک مشہور بزرگ محراب شاہ قلندر تھے جب مولوی صاحب نے شاہ صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونا چاہا تو محراب شاہ قلندر نے ایک شرط لگائی کہ "جہاد کی سوکھی رگوں میں تازہ خون دوڑائیں گے اور وطن عزیز کو انگریز سے نجات دلائیں گے"

مولوی صاحب نے وہ شرط منظور کرلی اور سلسلۂ قادریہ میں محراب شاہ قلندر سے فیوض و برکات و کمالات حاصل کئے یہ وہی جگہ ہے جہاں اب سے تقریباً تیس سال پہلے سید احمد شہیدؒ نے جہاد میں روانہ ہوتے ہوئے دو ہفتہ قیام فرمایا تھا اور اس جگہ کے راجہ ہندو راؤ کو سید احمد شہیدؒ نے جہاد کے لئے ابھارا تھا۔

شاہ صاحب کی دہلی روانگی:

محراب شاہ قلندر کی شرط نے مولوی احمد اللہ شاہ کو جہاد کے لئے مضطرب کردیا اسی لئے فوراً دہلی کا رخ کیا یہ وہی دلی تھی جس کی ولی اللّٰہی تربیت گاہ میں روحِ انقلاب نے جنم لیا تھا

جہاں شاہ عبد العزیز محدث دھلویؒ کی تربیت گاہ سیاسی میں وطن عزیز (بھارت) کو انگریز کے پنجے سے نجات دلانے والی تحریک پروان چڑھی تھی اور جہاں حریت کے سب سے بڑے علمبردار سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کو پرچم قیادت عطا ہوا تھا۔ اور اسی دلی سے مولوی نصیر الدین دہلویؒ کی زیر قیادت شمع آزادی کے پروانوں کا آخری قافلہ روانہ ہوا تھا ان وجوہ کی بنا پر مولوی احمد اللہ شاہ کا قدم دہلی کی طرف اٹھنا طبعی اور ضروری تھا۔

اگرچہ انگریزوں کے اقتدار کا مرکز کلکتہ اور فورٹ ولیم تھا مگر ہندوستانیوں کی سیاست کا مرکز دہلی ہی تھا اسی وجہ سے انگریز فرمارواؤں نے یہ آرڈر جاری کر دیا تھا کہ "یہاں ریزیڈنٹ کی نگاہ بہت سخت ہو"

مولانا سید احمد شہید اور مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ کا جو قافلہ دہلی سے روانہ ہوا تھا وہ بالاکوٹ کی پہاڑی تک ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۱ء تک برسر پیکار رہا اور بالاکوٹ کی پہاڑی پر ۵/ دان تک مسلسل جنگ کر کے انگریزوں سے لڑتے ہوئے عظیم سپوتوں نے وطن عزیز کو غلامی سے بچانے کے لئے اپنی جان دے دی تھی۔

دہلی سے آگرہ روانگی:

ادھر مولانا احمد اللہ شاہ نے دھلی میں انگریزوں کی پکڑ کو بھانپ لیا اور یہ فیصلہ کیا کہ یہاں سے انگریزوں کا مقابلہ کرنا کوئی زیادہ مفید نتیجہ نہ دے گا اس لئے دہلی سے آگرہ کا سفر کیا۔ چونکہ قدیم تاریخ میں اکبر آباد (آگرہ) اور شاہ جہان آباد (دہلی) کا پرانا ربط تھا لیکن آگرہ مولوی احمد اللہ شاہ کے لئے بالکل اجنبی شہر تھا اس کے لئے اس لئے مفتی صدر الدین آزردہ جیسے اعلیٰ مدبر شخص نے اس کی ذمے داری لی کہ جیسے ہی شاہ صاحب آگرہ آویں ان کی رسائی یہاں کے کلیدی لوگوں تک کرادی جائے اور یہ ان کا اعتماد حاصل کرلیں اس کے لئے مفتی صدر الدین آزردہ نے۔ مفتی انعام اللہ خاں جو سرکاری وکیل اور محکمہ شرعیہ کے مفتی تھے۔ مولوی احمد اللہ شاہ کو ان کے مکان پر آگرہ میں مقیم کرایا کچھ ہی وقت میں ان کا مکان علم و تصوف کا گہوارہ بن گیا لوگوں کا رجوع شاہ صاحب کی طرف تیزی سے ہونے لگا۔ یہاں علم و فضل کے ساتھ قوت خطابت کا یہ عالم تھا کہ جہاں آپ کے وعظ کا اعلان ہوتا ہندوؤں اور مسلمانوں کا بے پناہ ہجوم ہوتا۔ بعض بعض جلسوں میں دس دس ہزار (ایک روایت کے مطابق ۵۰/۵۰ ہزار تک کا مجمع ہوتا) آدمی کا مجمع ہو جاتا، شاہ صاحب کے اندر

خطابت کے علاوہ فن سپہ گری کی بھی مہارت تھی اور ایک اچھے نشانہ باز تھے تلوار کے ہاتھ بھی بہت جچے تلے ہوتے تھے اسی وجہ سے شاہ صاحب آنے والوں کو فن سپہ گری اور انگریز سے مقابلہ کی حکمتیں بھی سکھاتے اور تلوار چلانا بھی۔

مولوی احمد اللہ شاہ پر پہلا مقدمہ:

آگرہ کی سر زمین میں وہی پرانی روح جو سید احمد شہیدؒ نے بیدار کی تھی پھر مولوی احمد اللہ شاہ نے دوبارہ پیدا کر دی جس سے انگریز سخت خائف ہوئے مولانا پر مقدمہ کر دیا گیا جس کو سن کر مولوی احمد اللہؒ نے فرمایا کہ اے ساتھیو ! گھبراؤ نہیں یہ امتحان کی پہلی منزل ہے۔

مولوی احمد اللہ شاہؒ پر لگائے گئے الزامات کی کسی نے کوئی گواہی نہیں دی جس کی وجہ سے مراد آباد کے جج مسٹر ولق نے سماعت کے بعد بری کر دیا اور کسی کا بال بیکا نہیں ہوا۔

آگرہ سے کانپور اور لکھنؤ کا سفر

مولوی احمد اللہ شاہ آگرہ میں مقیم تھے کہ اودھ میں مولانا امیر علی شاہ کی شہادت کا ہنگامہ پیش آیا جب شاہ صاحب کو اس کی تفصیلات کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اب ہمارے امتحان کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ آپ نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ مریدین کا بھی ایک جم غفیر ساتھ اور سب کے ہمراہ ان کا توشہ بھی موجود تھا ماؤں نے بیٹوں کو اجازت دی۔ بیویاں شوہروں کو رخصت کر رہی تھیں۔

شاہ صاحبؒ آگرہ سے چل کر پہلے کانپور پہونچے وہاں عظیم اللہ خاں وغیرہ سے ملاقاتیں ہوئیں پھر لناؤ کے راستے لکھنؤ، پہونچے اور گھاس منڈی میں قیام کیا۔ وہیں مولانا فضل حق خیر آبادی سے ملاقات ہوئی۔ شاہ صاحبؒ کی توجہ ہی سے مولانا فضل حق خیر آبادی بھی انگریز کے جانی ومالی دشمن بن گئے۔ آج سے تقریباً چالیس سال پیشتر اسی لکھنؤ نے مجاھد حریت سید احمد شہید کا استقبال بڑی شان وشوکت سے کیا تھا۔ لکھنؤ میں یہ دور واجد علی شاہ کا ہے۔

فیض آباد کا سفر اور مستقل قیام:

لکھنؤ میں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں جب تیز ہو گئیں اور واجد علی شاہ کو گرفتار کر لیا گیا تو شاہ صاحب اپنے لئے خطرہ محسوس کیا اور وہاں سے کوچ کر کے فیض آباد کا رخ کیا اور یہاں آکر چوک سرائے میں قیام پذیر ہو گئے اور یہیں سے انگریزی سامراجیت کا زبردست مقابلہ کیا۔

مولوی احمد اللہ صاحبؒ کی گرفتاری اور بزور طاقت رہائی

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمال نے آپ کو گرفتار کرنا چاہا تھا مگر عوام کے ہجوم اور ان کی بے پناہ عقیدت کے باعث پولیس یہ جرأت نہ کر سکی تو فوج سامنے آئی حضرت شاہ صاحب اور ان کے ساتھیوں نے مقابلہ شروع کر دیا مگر چونکہ فوج کا یہ اقدام دفعتہً تھا اور شاہ صاحب اور آپ کے ساتھی پہلے سے تیار نہ تھے اس لئے یہ مقابلہ ناکام رہا حضرت شاہ صاحبؒ کسی فوجی کی تلوار کی ضرب سے بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ آپ کو فوراً گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ ادھر عنانِ حکومت ایک دوسرے بزرگ سکندر شاہ فیض آبادی نے سنبھالی اور (راجہ مان سنگھ کے ساتھ) مولوی صاحب کو رہا کرانے کے لئے تحریک چلانے لگے بالآخر آپ نے جیل خانہ پر دھاوا بول دیا اور جیل کا دروازہ توڑ کر مولوی احمد اللہ شاہؒ کو رہا کرا لیا۔ شاہ صاحب نے اپنی رہائی کے بعد پورے ہندوستان کی رہائی کا فیصلہ کیا اور تحریک میں تیزی پیدا کر دی شاہ صاحبؒ کی گرفتاری کا یہ واقعہ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کا ہے (شاندار ماضی ص ۲۷۴ ج ۴)

رفتہ رفتہ حضرت شاہ صاحب کے گرد فدایان جمع ہونا شروع ہو گئے اور سب نے انگریز سے مقابلہ کا پکار ارادہ کر لیا چنانچہ مختلف مواقع پر انگریزوں سے مقابلے ہوئے بالآخر شاہ صاحبؒ نے تمام ساتھیوں اور محبِ وطن سپاہیوں کو لے کر لکھنؤ کا رخ کیا، راستے میں مختلف مقامات پر انگریزی فوجوں سے مقابلہ رہا۔ چنہٹ کے مقام پر تو بڑا ہی سنگین مقابلہ ہوا جس میں شاہ صاحب نے انگریزی فوجوں کے قدم اکھاڑ دئے اور جنگ لڑتے ہوئے آگے کی طرف روانہ ہو گئے۔

لکھنؤ میں مولانا احمد سعید سبط شاہ غلام علی نے علم محمدی اٹھا رکھا تھا اور عوام میں بے چینی پیدا ہو گئی تھی مگر شاہ صاحبؒ کے پہونچتے ہی پر ہر ایک ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ اور تمام منتشر مجاہدین لکھنؤ بھی آپ کے پاس جمع ہو گئے۔ سر ہنری لارنس چیف کمشنر لکھنؤ نے حتی الوسع بغاوت کو فرو کرنا چاہا مگر سعی بے نتیجہ رہی۔

شاہ جہاں پور میں معرکہ:

مولانا احمد اللہ شاہ کا علم بغاوت تیزی سے بلند ہو تا رہا سنی شیعہ تنازع کی وجہ سے لکھنؤ کی فضاء انگریزوں سے مقابلہ کے لئے سازگار نہ تھی فیروز، جرنل بخت خاں، تجمل حسین خاں،

جنرل محمد اسماعیل فتح گڈھ و تانا راؤ پیشوا غرض تمام ہی سرغنہ جنہوں نے بار بار شکست اٹھانے کے بعد بھی ہمت نہیں ہاری تھی سب شاہجہاں پور میں شاہ صاحب کے پاس جمع ہو گئے۔ یہاں پر انگریزی فوج سے زبردست مقابلہ رہا۔

ادھر میرٹھ میں منگل پانڈے نے علم بغاوت بلند کیا جس کی خبریں شاہجہانپور ۱۵ر مئی ۱۸۵۷ء کو پہونچی۔ انتظام بر پلٹین ۲۸ر مقرر ہوئی۔ مولوی سرفراز علی گورکھپوری اس زمانہ میں شاہجہان پور میں موجود تھے جن کی تقریر سے پلٹین کے سپاہی بھی بے حد متأثر ہوئے۔ ۲۵ر مئی ۱۸۵۷ء کو عید الفطر کے دن افسروں نے خزانہ لٹنے کی افواہ سن کر اسپیشل گارڈ او سنتری ڈبل کرنے کا حکم دے دیا۔ ۳۱ر مئی کو انگریز گرجا گھر میں جمع تھے کہ انقلابی فوجوں نے ان پر یورش کی کچھ انگریز زخمی ہوئے پھر انہوں نے گرجا گھر کا دروازہ بند کر لیا اس شور کو سن کر آس پاس کے انگریز ان کی مدد کو دوڑے جن کے ہاتھوں میں بندوقیں اور طمنچے تھے انہوں نے ان مجاہدین سے مقابلہ شروع کیا تو مجاہدین نے بھی بندوقیں سنبھالیں معرکہ تیز ہو گیا کچھ انگریز افسر مارے گئے اور کچھ بھاگنے پر مجبور ہو گئے جنہوں نے شاہ جہانپور چھوڑ کر دوسرے محفوظ مقام کو تلاش کیا کچھ انگریزوں نے راجہ پوائین نے یہاں پناہ لی۔ مگر پورے علاقہ میں اتنا اشتعال پھیل چکا تھا کہ راجہ پوائین نے بھی ذمے داری لینے سے انکار کر دیا۔ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد لوگوں نے زمام حکومت نواب غلام قادر کے حوالہ کی۔

نواب غلام قادر ابن راج میاں نواب یہ بہادر خاں بانی شہر شاہجہانپور کے خاندان سے تھے۔

اس کے ایک سال بعد ۲۸ر اپریل ۱۸۵۸ء کو نواب غلام قادر نے بجوریا کے گھاٹ انگریزی فوج کے چھکے چھڑا دئے شہر کے مورچوں کی کمان مولی احمد اللہ شاہ کے سپرد تھی شاہ صاحبؒ نے لگاتار ایسے حملے کئے کہ انگریز جیل خانہ کے تھوڑے سے علاقہ میں محصور رہنے پر مجبور ہو گئے ۱۰ر مئی ۱۸۵۸ء تک انگریز محصورین کی حالت نازک ہو چکی تھی کہ جنرل جالنس تازہ دم فوج لے کر پہونچ گیا پھر بریلی پر مکمل قبضہ کے بعد ۱۸ر مئی ۱۸۵۸ء کو تسیر کالن کیمبل فاتحانہ حوصلہ مندوں کے ساتھ شاہجہانپور پہونچا۔ شاہ صاحبؒ موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ قصبہ محمدی چلے گئے۔

قصبہ محمدی میں شاہ صاحب کی حکومت اور معرکہ آرائی:

قصبہ محمدی میں شاہ صاحبؒ کی حکومت قائم ہو گئی اور شاہ صاحب نے تانا راؤ کو وز

مالیات بنایااور ایک سکہ جاری کیا جس پر فارسی زبان میں یہ لکھا ہوا تھا۔

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ

حامئ دین محمد احمد اللہ بادشاہ

ابھی شاہ صاحب پوری طرح جمنے بھی نہ پائے تھے کہ سر کالن کیمبل نے اپنے ہمراہوں کے ساتھ قصبہ محمدی پر حملہ کردیا۔ انگریزی فوج کی طاقت زیادہ تھی شاہ صاحبؒ کو ناکامی ہوئی بالآخر محمدی چھوڑنا پڑااور شاہ صاحب کے ساتھیوں نے بھی نیپال کی طرف روانگی اختیار کی اس میں محمود خاں اور بیگم حضرت محل و نانا راؤ وغیرہ شامل تھے۔ شاہ صاحب نے پوائین کا رخ کرتے وقت سوچا کہ اگر راجہ پوائین ہماری مدد کردے گا تو ہم لوگوں کو قدم جمانے کا موقع مل جائے گا۔

شاہ صاحبؒ کے خون سے ہاتھ بھرنے والا مجرم:

آگے کی تفصیل مشہور مورخ فیض آباد کے سابق ایم پی مسٹر آر کے سنہا کی زبانی ملاحظہ ہو۔

ادھر مولوی نے سوچا کہ اگر پوائین کا راجہ کچھ مدد کردے تو دشمن کو تباہ کرنے میں آسانی ہو جائے گی اس کے لئے انہوں نے بیگم حضرت محل کی شاہی مہر سے ایک درخواست پوائین کے راجہ کے پاس بھیجی مگر یہ بزدل راجہ جنگ کے نام سے گھبرا گیا اس نے لکھ بھیجا کہ وہ مولوی سے ملنا چاہ رہا ہے۔

اسی دوران انگریز سے ساز باز ہوئی کہ اگر راجہ کے پاس مولوی آجائے تو اس کو راجہ جان سے مار ڈالے تو راجہ کو ۵۰ ہزار روپئے نقد دئے جائیں گے جسے پوائیں کے راجہ جگناتھ سنگھ نے منظور کرلیا۔ چنانچہ انگریزی فوجوں نے راجہ کا بھرپور تعاون کیا اور راجہ کے محل میں چاروں طرف بالائی منزل پر فورس لگادی گئی جو بالکل مسلح اور تیار تھی"

واقعۂ قتل:

۱۵/ جون ۱۸۵۸ء مطابق ۱۳/ ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ کو راجہ کی دعوت پر مولوی صاحب راجہ سے ملنے کیلئے روانہ ہو گئے۔ لیکن دیکھ کر تعجب ہوا کہ راجہ نے شہر میں داخل ہونے کے بعد قلعہ کا دروازہ بند کرادیا اور چاروں طرف دیواروں پر فوجی دستے متعین ہیں اور ان کے بیچ میں راجہ جگناتھ سنگھ مع اپنے بھائی کنور بلدیو سنگھ کھڑا ہے مولوی صاحب ان سب باتوں کا مطلب سمجھ گئے پھر بھی انہوں نے اپنے چہرے پر شکن نہیں آنے دی۔ وہ راجہ

سے گفتگو کرنے لگے پر کمینہ راجہ ان کی بات کہاں سننے والا تھا۔ جب مولوی صاحب پر یہ بات واضح ہو گئی کہ راجہ آسانی سے دروازہ کھولنے والا نہیں ہے تو مولوی نے اپنے مہاوت سے کہا کہ ہاتھی کو آگے بڑھاؤ اور قلعہ کا دروازہ توڑ دو۔ لیکن دروازہ ٹوٹنے سے قبل ہی راجہ کے بھائی نے مولوی صاحب پر گولی چلادی اور آزادی کا پروانہ آزادی کی شمع میں جل کر راکھ ہو گیا۔ اور ہمیشہ ہمیش کے لئے زندہ جاوید ہو گیا۔ (انا للّٰہ و انا الیہ راجعون)

اس نے ہندوستان کی لاج بچائی اور اپنے مرشد کا قول پورا کر دیا لیکن آخر تک ناانصافی کے آگے سر نہیں جھکایا۔ جب مادر وطن کا سچا سپوت زمین پر گرا تو راجہ اور اس کے غدار بھائی دونوں دوڑے انہوں نے ان کا سر دھڑ سے الگ کر ڈالا اور اُسے کپڑے سے ڈھانپ لیا اور شکاری کتے کی طرح اپنے مالک کی طرف دوڑے پولیس تھانہ ۱۳ میل دور شاہجہانپور میں تھا جب وہاں پہونچے تو انگریز افسر کھانا کھا رہا تھا دونوں کتوں نے اپنے ناپاک ہاتھوں سے مولوی کا سر ان فرنگیوں کے قدموں میں لڑھکا دیا۔ اگلے دن تہذیب کا ڈھنڈھورہ پیٹنے والے فرنگیوں نے دہشت پھیلانے کے لئے مولوی کا سر کوتوالی کے دروازہ پر لٹکا دیا۔ اور ان کی لاش کو جلا کر راکھ کھیت میں پھنکوادی اور گدھے کا ہل چلوادیا۔

شاہ صاحب کا مدفن:

بعد میں دریا پار محلہ جہان آباد متصل احمد پور مسجد کے پہلو میں سر کو دفن کرادیا گیا فرنگیوں کو ان کی منہ مانگی مراد مل گئی لیکن اس کے بدلے میں غداروں کو صرف پچاس ہزار روپئے ہی ملے افسوس کہ وہ مولوی جو فیض آباد کے ذرہ ذرہ میں بسا اور جس کا نام تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا جانا چاہئے تھا اس کے ساتھ ہندوستان کے تاریخ نویسیوں نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ جب کہ غیر ملکی تاریخ نویسوں نے اس مولوی کی تعریف کی ہے۔

مولوی نے آزادی کی جو چنگاری روشن کی تھی وہ ایک شعلۂ جوالہ بنی جس کی آنچ فرنگی برداشت نہ کر سکے اور آخر میں انہیں ہندوستان چھوڑنا ہی پڑا مولوی کے موت کی خبر جب انگلینڈ پہونچی تو انگریزوں چین کی سانس لی ان کی نگاہ میں شمالی ہند میں انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن کا خاتمہ ہو گیا۔ (فیض آباد کی جھلکیاں ۴۵/۵۵)

جنوبی ہندوستان میں سلطان ٹیپو کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش کو دیکھ کر لارڈ ھارس نے

انتہائی خوشی و مسرت سے کہا تھا کہ آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔ اور شمالی ہندوستان میں مولوی احمد اللہ شاہؒ کا سر دیکھ کر انگریز نے خوشی کا اظہار کیا اور بقول ساور کر برطانیہ میں اس کی اطلاع پر خوشی کا جشن منایا گیا اور کہا شمالی کہ ہندوستان میں ہمارا سب سے بڑا دشمن آج قتل ہو گیا۔

شاہ صاحب کے بارے میں انگریزوں کے تأثرات:

مولوی احمد اللہ شاہؒ کے متعلق اپنوں کے علاوہ ملک دشمنوں یعنی انگریزوں نے بھی کچھ تأثرات کا اظہار کیا ہے جو نقل کئے جاتے ہیں۔

انگریزی مورخ ملین لکھتا ہے: مولوی ایک ہوشمند اور نڈر آدمی تھا وہ صحیح معنوں میں ایک فوجی رہنما تھا اسی کا کام تھا کہ اس نے سر کالن جیسے فوجی جنرل کو دو بار نیچا دکھایا تھا۔

ہسٹری ڈی انڈین ٹیوٹ میں فارسٹر لکھتا ہے کہ: جن کو فیض آبادی مولوی کہا جاتا ہے ان کے متعلق یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ عالم باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھا روحانی طاقت کی وجہ سے صوفی تھا اور جنگی مہارت کی وجہ سے سپاہی اور سپہ سالار تھا اس کی طبیعت ظلم سے پاک تھی۔ (بحوالہ شاندار ماضی ص ۴۳۳ ج ۴)

جنرل ٹامسن جو ایک بہادر انگریز تھا اور رہنگامہ ۱۸۵۷ء میں شریک تھا شاہ صاحب کی بابت لکھتا ہے: مولوی احمد اللہ شاہؒ بڑی طاقت و قابلیت رکھتا تھا وہ ایسا شجاع تھا کہ خوف اس کے نزدیک نہیں آتا تھا۔ یہ عزم کا پکا ارادہ کا مستقل تھا۔ باغیوں میں اس سے بہتر کوئی سپاہی نہیں تھا۔ یہ فخر اسی کو حاصل ہے کہ اس نے دو مرتبہ سر کالن کیمبل کو میدانِ جنگ میں ناکام رکھا۔ اگر محبِ وطن ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے جو غلطی برپا ہو گئی ہو، سازشیں کی جائیں اور لڑائیاں لڑی جائیں تو مولوی یقیناً اپنے ملک کا محبِ صادق تھا۔ اس نے کبھی تلوار کو مخفی اور سازشی خون سے آلودہ نہیں کیا وہ بہادرانہ اور معجزانہ طور پر ان سے معرکہ آرا ہوا جنہوں نے اس کا ملک چھین لیا تھا۔ دنیا کی ساری قومیں اس کو تعظیم وادب کے ساتھ جو شجاعت و صداقت کے لئے لازمی تھی اور جن کا مستحق تھا اس کو یاد کریگی۔ (تاریخ شاہجہانپور بحوالہ باغی علماء ص ۴۹ و ۵۰)

یہ تھے وہ تأثرات کے چند نمونے جن کے قائل انگریز ہیں اور یہ تھی قربانی جسے آج ہمارے ملک کے متعصب تاریخ دانوں نے نظر انداز کر دیا ہے جب کہ غیر ملکی تاریخ نویس آج بھی تاریخ کے ساتھ انصاف سے کام لے رہے ہیں۔
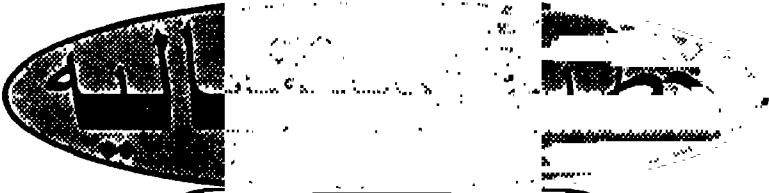
تحفظ ختم نبوت کانفرنس

الحاج قاضی اکرام الحسن صاحب صدر مجلس استقبالیہ

۲۰؍ جون ۱۹۹۸ء مطابق ۲۴ صفر ۱۴۱۹ھ (بروز ہفتہ)

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم

صدر محترم، علماء عظام اور سامعین کرام!

اللہ جل مجدہ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ اس نے محض اپنے فضل وکرم سے ہم خدام کو تحفظ ختم نبوت جیسے اہم عنوان پر مشرق دہلی کی اس سرزمین پر اس مبارک ومسعود کانفرنس کے انعقاد کی توفیق سے نوازا ساتھ ہی میں خود اپنے اور احباب ورفقاء اراکین مجلس استقبالیہ کی طرف سے ان سبھی مہمانان کرام اور شرکاء حضرات کا خلوص دل کے ساتھ استقبال کرتا ہوں جنہوں نے اپنی تمام مصروفیات کے باوجود اپنے محبوب پیغمبر خاتم النبیین حضرت محمد مصطفی ﷺ کی محبت میں سرشار ہو کر اس کانفرنس میں شرکت کی اور اس کی رونق کو دوبالا کیا۔ اللہ تعالی اس کانفرنس کو قبول فرمائے اور اس کے مفید ثمرات ظاہر فرمائے آمین۔

حضرات گرامی! مشرقی دہلی کی یہ نئی آبادی ویلکم و جعفر آباد جو آج فدایان ختم نبوت کے لئے فرش راہ بنی ہوئی ہے اسی شہر دہلی کا ایک حصہ ہے جو اپنے اندر بے شمار تاریخی نقوش محفوظ کئے ہوئے ہے۔

اسلامیان ہند کے لئے یہ شہر عرصۂ دراز تک رشد وہدایت کا مرکز اور علمی پیاس بجھانے کا خاص مخزن رہا ہے خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت محبوب الٰہیؒ، خوجہ باقی باللہؒ، شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ، شاہ محمد اسحاقؒ، مولانا سید نذیر حسین دہلویؒ، مولانا عبد العلی دہلوی اور ابھی ماضی قریب میں علامہ مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، اور سبحان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ جیسے اساطین علم وفضل نے اس شہر میں علوم نبوت کے جو چشمے بہائے اور جس طرح متحدہ ہندوستان کے چپہ چپہ کو نور محمدی سے جگمگایا وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔

قوم وملی تحریکات میں بھی اس شہر کو ایک خاص مقام حاصل رہا ہے تحریک آزادی کے عظیم

مرکز کی حیثیت سے یہاں سے جو بھی آواز اٹھی وہ ملک کے کونے کونے میں سنی گئی۔ آج اسی شہر دہلی کے تقسیم وطن کے بعد آباد ہونے والے مشرقی حصہ ویلکم و جعفر آباد کی عیدگاہ کے وسیع وعریض میدان میں ہم پورے جوش وجذبہ کے ساتھ ناموس رسالت کے محافظین کو خوش آمدید کہتے ہوئے امید کرتے ہیں کہ اس عیدگاہ سے بلند ہونے والی "حق کی آواز" انشاء اللہ منکرین ختم نبوت کے محلوں کی بنیادوں کو متزلزل کردیگی۔

محترم حضرات!

تحفظ ناموس رسالت کی جدوجہد شہر دھلی کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آج سے تقریباً ستر سال پہلے جب ایک دریدہ دہن مصنف نے آقائے نامدار سرور کائنات جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی شان اقدس میں بیہودگی کرتے ہوئے رنگیلا رسول تصنیف کی تو ۳۰؍جون ۱۹۲۷ء کو اسی دہلی کے پچھتر ہزار سے زائد عاشقانِ نبوت نے دہلی کی شاہجہانی جامع مسجد کے سایہ تلے جمع ہو کر اس خلاف زبردست مظاہرہ کیا تھا جس کی قیادت اس وقت کے جمعیۃ علماء ہند کے صدر حضرت علامہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ نے کی تھی۔ علامہ مرحوم نے اپنی صدارتی تقریر میں صاف صاف اعلان کیا تھا کہ "مسلمان خواہ کہیں کا رہنے والا ہو یہ معلوم کرنے کے بعد کہ اس کے رسول اللہ ﷺ کی عزت وناموس پر حملہ کیا گیا ہے کبھی چین کسے گھر میں نہیں بیٹھ سکتا اور اس معاملہ میں مسلمان کسی چیز کی پرواہ کرنے والا نہیں ہے"۔

اسی طرح ۱۹۵۲ء میں جب "امرت پتریکا" نے رسالت مآب ﷺ کی شان رحمت میں گستاخی کی تو جمعیۃ علماء ہند کی آواز پر ۱۴؍اگست ۱۹۵۲ء کو اسی شہر دہلی میں لاکھوں مسلمانوں نے اس دریدہ دہن اخبار کے خلاف مظاہرہ کرکے اس بات کا ثبوت پیش کیا تھا کہ مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر اپنے رسول کے خلاف کسی ہرزہ سرائی کو برداشت نہیں کر سکتا۔

آج جبکہ خود ساختہ برطانوی نبی مرزا قادیانی کے زرخرید غلام اسلام دشمن طاقتوں کا سہارا لیکر سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ اور دین حق سے برگشتہ کرنے اور عقیدۂ ختم نبوت کی بیخ کنی کی خفیہ مہم چھیڑے ہوئے ہیں تو دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کی قیادت میں عاشقانِ نبوت کا یہ عظیم قافلہ اپنے عشق ومحبت کا مظاہرہ کرنے اور اپنے دین وایمان کی حفاظت کے لئے ایک بار پھر یہ اعلان کردینا چاہتا ہے۔

جو جان مانگو تو جان دیدیں جو مال مانگو تو مال دیدیں ۔۔۔ مگر یہ ہم سے نہ ہو سکے گا نبی کا جاہ وجلال دیدیں

حاضرین محترم!

قادیانیت کا یہ فتنہ اسلام کی تاریخ میں پیدا ہونے والے فتنوں میں انتہائی خطرناک فتنہ ہے۔ اس

فرقہ اور اس کے بانی نے اسلام کا نام لیکر اور اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے ہوئے جس طرح اسلامی شریعت کے بنیادی عقیدے "ختم نبوت" کو پامال کرنے کی کوشش کی ہے اس کے پیشرو جھوٹے مدعیان نبوت مسلیمہ کذاب اسود عنسی وغیرہ بھی یہ کام انجام نہ دے سکے تھے۔

حضرات محترم!

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ فتنۂ قادیانیت کا اہل اسلام کی طرف سے یہ تعاقب صرف اس لئے ہے کہ وہ خود کو مسلمان کہہ کر سیدھے سادے مسلمانوں کو اپنے دام تزویر کا شکار بنارہے ہیں حالانکہ بقول مرزا قادیانی ان کے اور اسلام کے درمیان ہر چیز میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ جب قادیانی مذہب، اور اسلام کے اصول علیحدہ ہیں تو پھر وہ اپنے کو مسلمان کیوں کہتے ہیں اگر وہ اسلام سے متوازی عقائد کی بناء پر خود اپنی کوئی غیر اسلامی شناخت قائم کرلیں اور اپنے کو مسلمان کہنے کی حرکت سے باز آجائیں تو ہمیں ان سے کوئی تعارض کرنیکی ضرورت ہی نہ رہے گی اور جس طرح ہم دوسرے مذاہب والوں یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں وغیرہ کے ماننے والوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتے اسی طرح ہمیں قادیانیوں سے بھی کوئی سروکار نہ ہوگا لیکن اگر وہ اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے اسی طرح ناموس رسالت کی دھجیاں اڑاتے رہیں گے تو ہم ان کا آخری حد تک تعاقب جاری رکھیں گے یہاں تک کہ حق غلب آجائے۔

اسی عزم کا اظہار کرنے کے لئے آج مشرقی دہلی کے ویلکم جعفر آباد کی اس عیدگاہ کے وسیع وعریض میدان میں تحفظ ناموس رسالت کی تحریکوں کی اس جماعت جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام اور مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن دار العلوم دیوبند کی نگرانی میں یہ دوسری تحفظ ختم نبوت کانفرنس منعقد ہورہی ہے۔ اس کانفرنس کے انعقاد کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی اس ارتدادی فتنہ سے محفوظ رہیں اور ہمارے پاک پیغمبرؐ کی عزت وآبو پر کسی کو ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوسکے۔

حضرات گرامی!

علماء صلحاء اور تحفظ ناموس رسالت کے پروانوں کے اس عظیم الشان اجتماع میں میں نے بہت سا قیمتی وقت لے لیا میں اس سمع خراشی کے لئے اپنے بزرگوں اور ساتھیوں سے معذرت خواہ ہوں، اور آخر میں ایک بار پھر اپنے ان سب معاونین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فریضہ تصور کرتا ہوں جنہوں نے اس کانفرنس کے انعقاد میں کسی بھی طرح کے تعاون سے مجھے اور مجلس استقبالیہ کو نوازا ہے میں حضرات علماء کرام اور حاضرین کا بھی شکر گذار ہوں جنہوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اپنی تشریف آوری سے اس کانفرنس کو رونق بخشی۔ اللہ تعالی ہماری اور آپ سب کی ناموس رسالت کی حفاظت کیلئے اس حقیر کوشش کو شرف قبولیت سے نوازے آمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

تحفظ ختم نبوت کانفرنس دہلی

خطبۂ صدارت

امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيدنا محمد خاتم الانبياء والمرسلين ،وعلى آله واصحابه احمعين اما بعد !

حاضرین گرامی مرتبت، حضرات علماء کرام اور سامعین عظام!

دہلی کے باغیرت اور باحمیت مسلمان قابل مبارکباد ہیں جن کی توجہ اور دینی فکرمندی کی بدولت آج دوسری عظیم الشان "تحفظ ختم نبوت کانفرنس" کا انعقاد عمل میں آرہا ہے۔ اس عظیم دینی کانفرنس کی صدارت کے گراں قدر اعزاز سے مجھے نواز کر آپ حضرات نے جس محبت وخلوص کا ثبوت دیا ہے اس پر میں تہہ دل سے مشکور ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ ہمارا یہ دینی اجتماع اپنے مسلمان بھائیوں میں صحیح اسلامی عقائد کی اشاعت اور غلط اور باطل قسم کے نظریات سے حفاظت کا ذریعہ بنے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ رب العزت اسے ہر اعتبار سے مقبول فرمائے آمین!

حضرات گرامی ! آج مجھے مختصر وقت میں کانفرنس کے اصل موضوع سے متعلق کچھ بنیادی اور اصولی باتیں عرض کرنی ہیں جن کا لحاظ کرنے سے قادیانیوں کے بے سروپا شبہات وتلبیسات کا بآسانی ازالہ ہو سکتا ہے۔

مذہب اسلام کے حدود وشرائط:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ دنیا میں ہر جماعت اور اہل مذہب کو یہ فطری حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جماعت کے حدود وشرائط متعین کریں۔ کسی دوسرے کو اس میں خواہ مخواہ دخل اندازی کا حق نہیں ہوتا۔ اسلام نے بھی اسی فطری حق کا استعمال کرتے ہوئے اپنے حدود خود متعین کئے ہیں۔ اور اعلان کیا ہے کہ جو ان حدود کا پابند رہے گا وہ تو مسلمان کہلائے گا اور جو ان شرائط کا خیال نہیں رکھے گا وہ مسلمان نہیں کہلایا جاسکتا۔ ان حدود وشرائط کا خلاصہ قرآن

کریم میں اس طرح بیان فرمایا گیا:

یا ایها الذین آمنوا آمنوا باللہ ورسولہ والکتاب الذی نزل علی رسولہ والکتاب الذی انزل من قبل ومن یکفر باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر فقد ضل ضلا لاً بعیداً (النساء ۱۳۶) اے ایمان والو! یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی تھی پہلے اور جو یقین نہ رکھے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور کتابوں پر اور رسولوں پر اور قیامت کے دن پر وہ بہک کر بہت دور جا پڑا (حضرت شیخ الہندؒ)

یعنی ایمان کے لئے ضروری ہے کہ تمام ضروریات دین کو دل سے تسلیم کیا جائے۔ اور کتاب وسنت سے ثابت شدہ متواتر اور قطعی احکامات پر یقین رکھا جائے۔ اگر ان میں سے کسی ایک قطعی عقیدہ پر بھی ایمان نہ رہے تو پھر آدمی مؤمن نہیں رہ سکتا۔ دسویں صدی کے مشہور عالم (جنہیں خود قادیانی بھی مجدد تسلیم کرتے ہیں) ملا علی قاریؒ ارشاد فرماتے ہیں:

اعلم ان المراد با هل القبلة الذین اتفقو ا علی ما هو من ضرورات الدین کحدوث العالم وحشر الا جساد وعلم اللہ تعالیٰ با لکلیات والجزیات وما اشبه ذالك المسائل المهمات (شرح فقہ اکبر ۱۸۵)

جاننا چاہئے کہ اہل قبلہ (مسلمان) وہ لوگ ہیں جو دین کے ضروری عقائد سے متفق ہوں۔ مثلاً دنیا کا حادث ہونا، اور میدان حشر میں دوبارہ اجساد کا جمع کیا جانا، اور اللہ تعالیٰ کا علم تمام جزئیات وکلیات کو محیط ہونا، اور ان کے مشابہ دین کے اہم مسائل محض کلمہ پڑھنا کافی نہیں۔

سامعین گرامی! اس وضاحت سے صاف معلوم ہوگیا کہ مسلمان ہونے کے لئے محض کلمہ طیبہ زبان سے پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ تمام ایمانیات پر یقین رکھنا لازم ہے۔ آج قادیانی جماعت کے لوگ مسلمانوں کو دھوکہ دینے کیلئے زبانی طور پر کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں۔ اپنی دوکانوں، نشست گاہوں وغیرہ پر کلمے کے اسٹیکر لگا کر اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں۔ اور علماء کا شکوہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "دیکھئے کلمہ پڑھنے کے باوجود ہمیں دائرۂ الاسلام سے خارج کیا جا رہا ہے" اس لئے یہ بات ہر مسلمان کو معلوم ہو جانی چاہئے کہ آدمی کا کلمہ طیبہ **لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ** پڑھ لینا اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ کلمہ کے تقاضوں کو قبول نہ کرے، اور ان تقاضوں میں ایک اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ختم نبوت بلا کسی تاویل وتوجیہہ کے قبول کی جائے۔ عقیدۂ ختم نبوت کو تسلیم کئے بغیر کلمہ پڑھنا بے سود ہے۔

عقیدۂ ختم نبوت جزوِ ایمان ہے:

سامعین عالی مقام! خود پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ایک ارشاد سے عقیدۂ ختم نبوت کا جزو ایمان اور ضروری ہونا معلوم ہوتا ہے۔ جو آپؐ نے حضرت زید ابن حارثہؓ کے واقعہ کے ضمن میں ارشاد فرمایا۔ واقعہ یہ تھا کہ حضرت زیدؓ کو کچھ شرارت پسندوں نے اغوا کر کے مکہ میں لاکر بیچ دیا تھا۔ شدہ شدہ آپ آنحضرت ﷺ کی غلامی میں آگئے، کسی طرح حضرت زید کے قبیلہ والوں کو خبر ہوئی اور درخواست کی کہ آپؐ جتنی دین چاہیں لے لیں مگر ہمارے لڑکے زید کو ہمارے حوالے کردیں۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اسألکم ان تشهدوا ان لا اله الا الله وانی خاتم انبیائه ورسله وارسله معکم

. (مستدرک حاکم ۳/ ۲۱٤)

میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم یہ گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یہ شہادت دو کہ میں (آنحضرت ﷺ) تمام انبیاء اور رسولوں کے سلسلہ کو ختم کرنے والا ہوں۔ پھر میں زید کو تمہارے ساتھ بھیج دوں گا۔ (یہ آپؐ کی بعثت کے بعد کا واقعہ ہے)

دیکھئے کس وضاحت سے حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عقیدۂ ختم نبوت کو کلمہ شہادت میں شامل فرمایا ہے۔ اس لئے یہ عقیدہ ایسا نہیں ہے کہ اسے یوں ہی نظرانداز کر دیا جائے۔ آنحضرت ﷺ کی اس وضاحت کے بعد قادیانیوں کی ان ساری کوششوں کا قلع قمع ہو جاتا ہے جو وہ اس عظیم عقیدہ کی اہمیت گھٹانے کے لئے عموماً سادہ لوح مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

علامہ اقبال مرحوم کا تجزیہ:

حضرات گرامی! یہاں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مشہور مفکر اور دانشور علامہ محمد اقبال مرحوم کا ایک وقیع تجزیہ پیش کروں جس سے مسئلہ کی نوعیت اور اہمیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے علامہ موصوف فرماتے ہیں:

"اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدت الوہیت پر ایمان، انبیاء پر ایمان اور رسول کریمؐ کی ختم رسالت پر ایمان، دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز اور اس امر کے لئے فیصلہ کن ہے کہ فرد یا گروہ ملت اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔ مثلاً برہمو سماج خدا پر یقین رکھتے ہیں اور رسول کریم ﷺ کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں لیکن انہیں ملت اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیاء

کے ذریعہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول کریم کی ختم نبوت کو نہیں مانتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی اسلامی فرقہ اس حد فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریم کی شخصیت کا مرہون منت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں یا ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو پورے مفہوم کے ساتھ قبول کرلیں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقہ اسلام میں ہو، تاکہ انہیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں"۔ (حرفِ اقبال ۱۳۶ ار ۱۳۷ بحوالہ قادیانیت، ص ۱۵۴ ر ۱۵۵)

قادانیوں کی تکفیر کیوں؟

حاضرین گرامی ! اس تفصیل میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا کام ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم خواہ مخواہ لوگوں کو کافر بناتے رہیں کوئی بھی جماعت اپنی عددی طاقت کو کم کرنا نہیں چاہتی ہماری ذمہ داری صرف حفاظت دین کی ہے۔ یعنی ہم اس پر نگاہ رکھیں کہ کہیں اصلی کا لیبل لگا کر جعلی سامان کو تو فروغ نہیں دیا جارہا ہے ؟ اگر کہیں ایسا ہو تا ہے تو ہر مسلمان بالخصوص علماء کا یہ دینی فرض ہے کہ وہ واضح لفظوں اعلان کر دیں کہ فلاں چیز اصلی ہے اور فلاں چیز نقلی ہے۔ اسی بات کو سامنے رکھ کر آج ساری امت اس بات پر متفق ہے کہ قادیانی جماعت جو عقیدۂ ختم نبوت کی منکر ہے اور مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کی قائل ہے وہ دائرہ اسلام سے بالکلیہ خارج ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قادیانیوں کے کفر پر امت میں جیسا اتفاق ہے اس کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

علماء اسلام کے بعض فتاویٰ:

حضرات سامعین ! مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوۂ نبوت کی ۱۹۰۱ء سے لے کر آج تک ہر زمانہ میں اور ہر طبقہ کے علماء و مفتیان نے قادیانیوں کے کفر سے متعلق فتوے دیئے ہیں۔ مثلاً مناظر اسلام حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے فرمایا:

"مرزا غلام احمد قادیانی دائرہ اسلام سے خارج ہے"۔

امام ربانی قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے فرمایا:

"مرزا قادیانی کافر دجال اور شیطان ہے"۔

اکابر علماء دیوبند شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ دیوبندی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ صاحب دیوبندی، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند وغیرہ حضرات نے ایک متفقہ فتویٰ پر دستخط کئے جس کا پہلا جزء یہ تھا "مرزا غلام احمد اور اس کے جملہ معتقدین درجہ بدرجہ مرتد، زندیق، ملحد، کافر اور فرقہ ضالہ میں یقیناً داخل ہیں"۔

جمعیۃ علماء ہند نے ۱۹۵۶ء میں ایک فتویٰ جاری کیا جس میں کہا گیا "قادیانی جماعت مع اپنے بانی اور تمام ان پارٹیوں کے جو مرزا صاحب پر اعتماد رکھتی ہے اسلام سے خارج ہے اور مرتد کے حکم میں ہیں۔ نہ ان سے رشتہ مناکحت جائز ہے، نہ رشتہ موانست و مودت نہ انہیں مسلمانوں کے مقابر میں دفن کرنا جائز ہے، نہ ان سے وہ معاملات و تعلقات رکھنے جائز ہیں جو مسلمانوں سے رکھے جاسکتے ہیں"۔

اس فتویٰ پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی وغیرہ علماء کے دستخط ہیں۔ اسی طرح کے فتاویٰ مظاہر علوم اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے جاری کئے گئے۔

مشہور اہل حدیث عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری نے فتویٰ دیا: "مرزا صاحب اور ان کی جماعت چونکہ عقائد باطلہ کی حامل ہے اور اصول اسلام سے منحرف ہے اس لئے وہ کافر ہے اور دین محمدی ﷺ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے"۔

مشہور بریلوی عالم مولانا احمد رضا خاں نے فتویٰ دیتے ہوئے کہا: "علماء کرام حرمین شریفین نے قادیانی کی نسبت بالاتفاق فرمایا کہ جو اس کے کافر ہونے کے بارے میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔ اس صورت میں فرض قطعی ہے کہ تمام مسلمان موت وحیات کے سب علاقے اس سے قطع کریں"۔

علاوہ ازیں عالم اسلام کے ممتاز مفتیان اور دینی اداروں کی طرف سے بھی قادیانیوں کی تکفیر کے فتاویٰ اور فیصلے جاری کئے گئے ہیں۔ جامعہ ازہر نے ۱۹۳۹ء میں تحقیقات کے بعد قادیانیوں کے کفر وارتداد کا اعلان کیا اور حکم جاری کردیا کہ آئندہ کسی قادیانی کو جامعہ ازہر میں داخلہ نہ دیا جائے۔

۱۹۷۴ء میں ایک سو چار مسلم ملکوں کی نمائندہ تنظیم رابطہ عالم اسلامی نے بھی ایک طویل تجویز منظور کرکے قادیانیوں کے کفر وارتداد اور ان کی سیاسی وسماجی تخریب کاریوں کو واشگاف کیا۔

اسی طرح سعودی عرب کے سب سے اعلیٰ اختیاراتی فقہی ادارے المجمع الفقہی نے فیصلہ کرتے ہوئے یہ دوٹوک الفاظ لکھے:

"عقیدۂ قادیانیت جو احمدیت کے نام سے بھی موسوم ہے اسلام سے مکمل خارج ہے۔ اس کے پیروکار کافر اور مرتد ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور دھوکہ دینے کے لئے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور فقہی کمیٹی یہ اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کے ذمہ خواہ وہ حکمران ہوں یا علماء مصنفین، خطیب ہوں یا داعی فرض ہے کہ اس گمراہ ٹولے کا سختی سے مقابلہ کریں اور دنیا میں جہاں کہیں اس باطل ٹولے کا وجود نظر آئے اس کا قلع قمع کرنے کے لئے کمربستہ ہوجائیں۔

الغرض قادیانیوں کی تکفیر پر اس وقت امت مسلمہ کا اتفاق ہے اور اس کا تعلق صرف پاکستان ہی سے نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر خطے میں رہنے والے مسلمان قادیانیوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اسلامی شعائر استعمال کرنے سے باز آجائیں۔

حضرات گرامی! قادیانیوں کا یہ پروپیگنڈہ قطعاً جھوٹ اور فریب ہے کہ ہندوستان میں ان کا تعاقب پاکستان کی شہ پر کیا جارہا ہے۔ ہم یہ واضح کردینا چاہتے ہیں کہ ہمارے دینی عقائد کا تعلق کسی خاص علاقے یا ملک سے نہیں ہے۔ اور نہ ہمیں اس سلسلہ میں کسی دوسرے ملک کی سیاست سے کوئی سروکار ہے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ جو لوگ اسلامی حدود وشرائط پر پورے نہیں اترتے وہ اسلام کا نام استعمال کرنا بند کردیں۔ اگر آج بھی قادیانی اپنے کو غیر مسلم کہنے لگیں تو ہمیں ان کے تعاقب یا تعرض کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

مرزا غلام احمد قادیانی کے دعاوی:

حضرات گرامی! جماعت احمدیہ کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی نبوت اور (مسیح موعود ہونے) کے بڑے بلند بانگ دعوے کئے ہیں مثلاً

۱۔ "خدا وہ خدا ہے جس نے اپنے رسول کو یعنی اس عاجز کو ہدایت حق اور تہذیب اخلاق کے ساتھ بھیجا" (اربعین در روحانی خزائن ج ۱۷ رص ۴۲۶)

۲۔ "سچا خدا وہی خدا ہے جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا" (دافع البلا روحانی ج ۱۸ رص ۲۳۱)

۳۔ "میں رسول بھی ہوں اور نبی بھی ہو۔" (ایک غلطی کا ازالہ درروحانی خزائن ۱۸/۲۱۱)
۴۔ "نبی کا نام پانے کے لئے میں ہی مخصوص کیا گیا"۔(حقیقۃ الوحی در خزائن ۲۲/۴۰۶)
۵۔ "انبیاء گرچہ بودہ اند بسے من بعرفاں نہ کمترم زکسے" (نزول المسیح خزائن ۱۸/۴۷۷)
(ترجمہ: اگرچہ دنیا میں بہت سارے نبی ہوئے ہیں لیکن علم وعرفان میں کسی سے کم نہیں ہوں)

سامعین گرامی! اس طرح کی دعاوی سے مرزا غلام احمد کی تحریرات بھری پڑی ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہاں میں صرف اس جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ کسی بھی دینی منصب پر فائز ہونے والے کے لئے کم از کم کن صفات کا حامل ہونا ضروری ہے اور اس طرح کے کسی منصب پر فائز ہونے کا دعویٰ کرنے والے کے لئے سب سے پہلے کس طرح کا ثبوت پیش کرنا ضروری ہے۔

آنحضرت ﷺ کا اسوۂ مبارکہ:

سامعین عظام! سید الاولین والآخرین سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ ﷺ کا شاندار اسوۂ مبارکہ ہمارے پیش نظر ہے۔ آپ نے اعلان نبوت سے پہلے اور بعد میں ایسی صاف ستھری زندگی اور کمال اخلاق کا مظاہرہ فرمایا کہ آپ کا بڑے سے بڑا دشمن بھی آپؐ کے ذاتی کردار اور صدق وامانت پر انگلی اٹھانے کی جرأت نہ کرسکا آپ ﷺ نے جب صفا کی پہاڑی سے پہلی مرتبہ مکے والوں کو توحید کا پیغام سنایا تو اس سے پہلے اپنی تصدیق بھی کرائی اور جب سب نے بیک آواز کہہ دیکہ "ماجربنا علیك الا صدقاً" (بخاری شریف ۷۰۲) یعنی ہمارے تجربے میں آپ ہمشہ سچے ہی ثابت ہوئے تو آپ نے ان میں توحید ورسالت کا اعلان فرمایا ۔اب ہمیں مرزا غلام احمد قادیانی کے بلند بانگ دعاوی کا بھی اسی تناظر میں جائزہ لینا چاہئے کہ جب مرزا قادیانی نعوذ باللہ خود کو آنحضرت ﷺ کا ظل اور بروز کہتا ہے اور اپنی بعثت کو آنحضرت ﷺ ہی کی بعثت ثانیہ قرار دیتا ہے (خطبہ الہامیہ خزائن ۱۶/۲۷۰) تو یہ بحث تو بعد میں کی جائے گی کہ ظلی بروزی نبی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ موجود ہیں یا نہیں؟ اور امام مہدی ظاہر ہو چکے ہیں یا نہیں؟ پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ اس طرح کے دعوے کرنے والا سچا بھی ہے یا نہیں؟ اگر سچا ثابت ہو جائے تو بحث آگے بڑھ سکتی ہے اور اگر جھوٹا ثابت ہو تو اگلی بحث بے کار ہے۔ کیونکہ جھوٹ کے ساتھ نبوت وولایت کا کوئی درجہ بھی جمع نہیں ہو سکتا۔ خود مرزا قادیانی نے ایک جگہ لکھا ہے:

"ظاہر ہے کہ جب ایک بات میں کوئی جھوٹا ثابت ہو جائے تو پھر دوسری باتوں میں بھی اس پر اعتبار نہیں رہتا۔ (چشمہ معرفت روحانی خزائن ۲۳/۲۳۱)

دوسری جگہ لکھتا ہے:

"جھوٹ بولنے سے بدتر دنیا میں اور کوئی برا کام نہیں"۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی ص۴۵۹/ج ۲۲)

ایک جگہ اور وضاحت کرتا ہے:

"ایسا آدمی جو ہر روز خدا پر جھوٹ بولتا ہے اور آپ ہی ایک بات تراشتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ یہ خدا کی وحی ہے جو مجھ کو ہوئی ہے۔ ایسا بدذات انسان تو کتوں اور سوروں اور بندروں سے بدتر ہوتا ہے۔" (ضمیمہ براہین احمدیہ پنجم روحانی خزائن ۲۱/۲۹۲)

مرزا قادیانی کے جھوٹ:

حضرات گرامی! اسی اصل نکتہ کو سامنے رکھ کر جب ہم قادیانی لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ مرزا قادیانی جو بظاہر جھوٹ بولنے کو دنیا کی بدترین برائی سمجھتا ہے خود اس برائی سے اس کی تحریرات بھرپور ہیں۔ میں بطور نمونہ صرف تین تحریریں پیش کرتا ہوں جس سے آپ بخوبی مرزا قادیانی کے جھوٹے ہونے کا اندازہ لگا سکیں گے۔

۱۔ مرزا نے لکھا ہے: "تاریخ داں لوگ جانتے ہیں کہ آپ (آنحضرت ﷺ) کے گھر میں گیارہ لڑکے پیدا ہوئے تھے اور وہ سب کے سب فوت ہو گئے تھے"

(چشمہ معرفت ص۲۸۶/روحانی خزائن ۲۳/۲۹۹)

یہ بالکل کھلا ہوا جھوٹ ہے اور مرزا کی من گھڑت بات ہے۔ آنحضرت ﷺ کے گیارہ صاحبزادے آج تک کسی ایک بھی مؤرخ نے ثابت نہیں کئے بلکہ معتبر قول میں آپ کے صرف تین صاحبزادے قاسم، عبداللہ (جن کا نام طیب اور طاہر بھی تھا) اور ابراہیم ثابت ہیں۔ اور غیرمعتبر اقوال زیادہ سے زیادہ سات تک ملتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں (سیرت المصطفیٰ)

۲۔ مرزا کہتا ہے: "تین شہروں کا نام اعزاز کے ساتھ قرآن شریف میں درج کیا گیا ہے مکہ، مدینہ اور قادیان۔" (ازالہ اوہام، روحانی خزائن ۳/۱۴۰ حاشیہ)

یہ بھی سفید جھوٹ ہے۔ قرآن پاک میں کہیں بھی قادیان کا نام نہیں آیا ہے۔

۳۔ مرزا قادیانی نے ایک جگہ لکھا ہے: "**وقد سبونی کل سب فمار ددت علیهم جوابهم**" (ان علماء) نے مجھے ہر طرح کی گالیاں دیں مگر میں نے ان کو جواب نہیں دیا۔

(مواہب الرحمٰن روحانی خزائن ۱۹/۲۳۶)

ایک طرف تو یہ دعویٰ کہ میں نے کسی گالی دینے والے کو جواب نہیں دیا، دوسری طرف مرزا کی کتابیں اپنے مخالفین کو مغلظات قسم کی گالیاں دینے سے بھری پڑی ہیں۔ یہ گالیاں ایسی گندی اور رکیک ہیں کہ شریف آدمی انہیں زبان پر لانا بھی گوارا نہیں کرسکتا۔

مرزا کی گالیاں:

مثلاً ایک جگہ اپنے دشمنوں کو اور ان کی بیویوں کو اس طرح کوستا ہے:

" ان العدا صاروا خنازیر الفلا ونساؤھم من دونھن الاکلب

(نجم الہدیٰ، روحانی خزائن ۱۴/۵۳)

ترجمہ: ہمارے دشمن جنگلوں کے خنزیر ہوگئے، اور ان کی عورتیں کتیوں سے بڑھ گئیں۔

مشہور عالم مولانا عبدالحق غزنوی پر اس طرح گالیوں کے پھول برستے ہیں:

"مگر تم نے حق کو چھپانے کے لئے جھوٹ کا گوہ کھایا الخ...... پس اے بدذات، خبیث، دشمن اللہ رسول کے الخ...... (ضمیمہ انجام آتھم خزائن ۱۱/۳۳۴)

مولانا سعد اللہ صاحب کو تو مرزا نے ایسی کھل کے گالیاں دی ہیں کہ گالیوں کے موجد کی روح بھی شاید شرما گئی ہوگی۔ ملاحظہ کریں مرزا کہتا ہے۔

"ومن اللئام اری رجیلاً فاسقاً غولاً لعیناً نطفة السفھاء"

ترجمہ: اور کمینوں میں سے ایک حقیر فاسق مرد کو دیکھتا ہوں جو شیطان، ملعون، بے وقوف کا نطفہ ہے۔

شکس، خبیث، مفسد ومزور

نحس یسمی السعد فی الجھلاء

ترجمہ: بدگو ہے، خبیث فتنہ پرداز اور ملمع ساز ہے، منحوس ہے جس کا نام جاہلوں نے سعد اللہ رکھا ہے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی ۲۲/۴۴۵)

یہ تو صرف چند نمونے ہیں ورنہ ایسی بدزبانیاں مرزا قادیانی کی تحریروں میں جابجا نظر آتی ہیں اور اس کی ہر بدزبانی اس کے اس دعویٰ کو جھوٹا قرار دیتی ہے کہ اس نے اپنے مخالفوں کو جواب نہیں دیا ہے۔

جھوٹی پیش گوئیاں:

سامعین عالی مقام! پھر کسی مدعیٔ نبوت کی سچائی جاننے کے لئے ایک بڑا معیار اس کی پیش گوئیاں ہوتی ہیں کہ وہ درست نکلیں یا نہیں۔ چنانچہ خود مرزا قادیانی نے لکھا ہے:

"بدخیال لوگوں کو واضح ہو کہ ہمارا صدق و کذب جانچنے کے لئے ہماری پیش گوئی سے بڑھ کر اور کوئی محک امتحان (معیار آزائش) نہیں ہو سکتا ہے" (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن ۲۸۸/۵)

ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"کسی انسان کا اپنی پیش گوئی میں جھوٹا نکلنا خود تمام رسوائیوں سے بڑھ کر رسوائی ہے۔" (تریاق القلوب، خزائن ۱۵/ ۳۸۲)

اب ہمیں چاہئے کہ ہم دیگر کسی موضوع پر گفتگو کے بجائے خود مرزا قادیانی کے بتائے ہوئے معیار امتحان یعنی پیش گوئیوں کے وقوع کی جانچ کر کے ہی مرزا قادیانی کے صدق و کذب کا فیصلہ کریں۔ چنانچہ جب ہم مرزا کی پیش گوئیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس کی سبھی ادعائی پیش گوئیاں وقوع سے محروم رہیں۔ اور عجیب بات ہے کہ جس پیش گوئی پر زیادہ زور صرف کیا وہی پوری نہ ہو کے رہی، مثلاً چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ مرزا قادیانی نے اپنی موت کے متعلق پیش گوئی کی کہ "ہم مکہ میں رہیں گے یا مدینہ میں" (تذکرہ ۵۹۱)

حالانکہ موت تو کجا کبھی مرزا کو ان مقامات مقدسہ کی زندگی میں زیارت بھی نہ ہو سکی۔ اور اس کی موت کا وقعہ لاہور میں پیش آیا۔

۲۔ ایک نوجوان لڑکی محمدی بیگم سے نکاح کی پیش گوئی کی اور جب اس کے والد نے لڑکی کا نکاح دوسرے شخص سے کر دیا تو مرزا قادیانی نے بڑے زور شور سے اشتہارات شائع کرائے کہ نکاح سے ڈھائی سال کے اندر اندر اس لڑکی کا باپ اور شوہر مر جائیں گے اور یہ کہ وہ لڑکی ضرور میرے نکاح میں آئے گی۔ اور جوش میں یہ کہا کہ:

"من ایں را برائے صدق خود یا کذب خود معیار می گردانم۔ (انجام آتھم ۲۲۲)

ترجمہ: میں اس (پیش گوئی) کو اپنے صدق و کذب کے لئے معیار قرار دیتا ہوں۔

مگر خدا کا کرنا کہ مرزا قادیانی دنیا سے محمدی بیگم سے نکاح کی حسرت لئے چلا گیا مگر یہ پیش گوئی پوری نہ ہو سکی اور وہ خود اپنے معیار کے مطابق کاذب قرار پایا۔ اور محمدی بیگم کا شوہر ڈھائی سال میں تو کیا مرتا مرزا قادیانی کے مرنے کے بعد بھی ۴۰ سال زندہ رہا اور

۱۹۴۸ء میں وفات پائی۔

۳۔ مشہور اہل حدیث عالم اور مناظر اسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری سے خطاب کرتے ہوئے "آخری فیصلہ" کے عنوان سے مرزا نے ایک تحریر میں یہ پیش گوئی کی تھی "اگر میں ایسا ہی کذاب اور مفتری ہوں جیسا کہ اکثر اوقات آپ اپنے پرچہ میں مجھے یاد کرتے ہیں تو میں آپ کی زندگی میں ہی ہلاک ہو جاؤں گا"۔ (مجموعہ اشتہارات ۳/۵۷۹)

اللہ کی قدرت کہ اس اعلان کے ٹھیک ایک سال ایک ماہ گیارہ دن بعد مرزا قادیانی بمرض ہیضہ وفات پاکر بقلم خود اپنے کذاب ومفتری ہونے کی سند دے گیا اور حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اس کے بعد ۴۰ سال تک باحیات رہ کر مرزائیوں کوناکوں چنے چبواتے رہے۔

حضرات گرامی! مجھے خاص طور پر یہ تفصیلات اس لئے بتانی پڑرہی ہیں کہ عموماً قادیانی مبلغین ہمارے سادہ لوح بھائیوں کے پاس آکر ختم نبوت کے معنی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے عقیدہ کے متعلق فضول قسم کی باتیں اور رکیک تاویلات پیش کرنی شروع کردیتے ہیں جس سے سننے والا شک اور شبہ میں مبتلا ہو جاتا ہے ایسے موقع پر ہمارے لئے قابل غور بات یہ ہونی چاہئے کہ جس شخص کو نبی یا مسیح یا مہدی بتایا جارہا ہے آیا وہ خود اس قابل بھی ہے یا نہیں کہ اس کو ایسے عظیم منصب پر فائز مانا جائے؟ اس کے بغیر سب بحثیں قطعاً بے معنی ہیں۔ اور علماء اسلام نے مرزا قادیانی کی تحریرات اور دعاوی کا مطالعہ کرکے مرزا قادیانی کے جھوٹ کو اتنا آشکارا کردیا ہے کہ اب اس میں کسی قسم کے شک اور شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے بلکہ خود مرزا کی اپنی تحریرات سے اس کا کاذب اور مفتری ہونا واضح ہے۔

انگریزی نبوت:

حضرات گرامی! قادیانی جماعت کی تاریخ پڑھنے سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس کی مکمل ساخت اور پرداخت انگریزی حکومت کے زیرسایہ ہوئی ہے۔ اور حکومت برطانیہ نے ملت اسلامیہ کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے اور تحریکات جہاد کو سبوتاژ کرنے کے لئے مرزا قادیانی کی صورت میں جھوٹے مدعی نبوت کو کھڑا کیا تھا۔ چنانچہ فریضہ جہاد کو منسوخ کرکے مرزا نے باحسن وجوہ برطانوی مفادات کی تکمیل کی اور تحریرات

میں جابجا انگریز سے مکمل وفاداری کا اقرار کیا بعض تحریرات ملاحظہ ہوں:

(الف) مرزا قادیانی اپنے ایک اشتہار میں لکھتا ہے:

"میں اپنے کام کو نہ مکہ میں اچھی طرح چلا سکتا ہوں، نہ مدینہ میں، نہ روم میں، نہ شام میں ، نہ ایران میں، نہ کابل میں مگر اس گورنمنٹ (انگریزی) میں جس کے اقبال کیلئے دعا کرتا ہوں۔" (تبلیغ رسالت ۸/۶۹)

(ب) ایک جگہ لکھتا ہے:

"میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید و حمایت میں گذرا ہے۔ اور میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کئے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھا کی جائیں تو پچاس الماریاں بھر سکتی ہیں۔" (تریاق القلوب ۲۵)

(ج) دوسری جگہ لکھتا ہے:

"میں نے بیسیوں کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں اس غرض سے تالیف کی ہیں کہ گورنمنٹ محسنہ (برطانیہ) سے ہرگز جہاد درست نہیں بلکہ سچے دل سے اطاعت کرنا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے۔" (تبلیغ رسالت ۶/۶۵)

اس طرح کی بے شمار عبارتیں قادیانی لٹریچر میں موجود ہیں۔ اور آج تک قادیانی جماعت دنیا میں انہی اسلام دشمن طاقتوں کے سہارے پروان چڑھ رہی ہے۔

بنیادی اختلاف:

حضرات گرامی! میں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارا اور قادیانیوں کا اختلاف محض جزئی اور فروعی نہیں ہے جیسا کہ قادیانی لوگ عوام کو جا کر سمجھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا قادیانیوں سے اصولی اور بنیادی اختلاف ہے۔ قادیانیت اسلام کے متوازی ایک الگ دین ہے اس کو دیگر فروعی اختلاف رکھنے والے فرقوں کے درجہ پر ہرگز نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ بات خود مرزا قادیانی اور اس کے خلفاء کی تحریروں سے واضح ہے مرزا بشیر الدین محمود اپنے والد مرزا غلام احمد قادیانی کی یہ فیصلہ کن وضاحت نقل کرتا ہے:

"آپ (مرزا صاحب) نے فرمایا کہ یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفات مسیح یا چند مسائل میں ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی ذات، رسول کریم،

قرآن ، نماز، حج، زکوٰۃ غرض کہ آپ نے تفصیل سے بتلایا کہ ایک ایک چیز میں ہمیں ان سے اختلاف ہے" (الفضل قادیان، ۳۰ر جولائی ۱۹۳۱ء بحوالہ قادیانی مذہب ۵۵۲ جدید ایڈیشن)

اسی اختلاف کو سامنے رکھ کر مرزا قادیانی نے اپنے نہ ماننے والے تمام مسلمانوں کو کافر اور جہنمی کہا ہے (اشتہار معیار الاخیار ص ۸) اور مرزا محمود احمد خلیفہ دوئم کہتا ہے: "ہمارا یہ فرض ہے کہ غیر احمدیوں کو مسلمان نہ سمجھیں۔" (انوار اخلافت ص ۹۰)

اب غور کرنے کی بات صرف یہ ہے کہ جب دین کے کسی بھی معاملہ میں ہمارا قادیانیوں سے اتحاد نہیں ہے اور قادیانیوں کے نزدیک ان کے علاوہ سب مسلمان کافر ہیں تو آخر پھر ہمیں کیوں مجبور کیا جاتا ہے کہ ہم زبردستی قادیانیوں (احمدیوں) کو مسلمان سمجھیں۔ ہماری اور قادیانیوں کی راہیں بالکل الگ الگ ہیں۔ ان کا خود ساختہ دین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفی ﷺ کے لائے ہوئے دین سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لئے انہیں اپنے آپ کو مسلمان یا شریعت محمدی کا تابعدار کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ قادیانیوں سے ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کا نام لینا چھوڑ دیں۔ یا پھر باقاعدہ اسلام کے تمام عقائد کو تسلیم کر کے تجدید ایمان کرلیں، اور مرزا غلام احمد کو کافر مان لیں۔

ہندوستان میں اس فتنہ کے تعاقب کی ضرورت:

حضرات گرامی! گذشتہ ۱۲ سال سے یہ فتنہ ہندوستان میں بھی تیزی سے پھیل رہا ہے اور تمام تر مادی وسائل کے ذریعہ اس ارتدادی تحریک کی سرگرمیاں بالخصوص جہالت زدہ علاقوں میں جاری ہیں۔

الحمد للہ کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند اپنے محدود وسائل کے مطابق کام کر رہی ہیں اور بفضلہ تعالیٰ اس کی محنتوں سے رائے عامہ بیدار ہوئی ہے اور عوام و خواص کو مسئلہ کی نوعیت سمجھنے کا موقع فراہم ہوا ہے۔ خدا کرے کہ یہ کوششیں مزید بار آور ہوں۔ ہمارے مسلمان بھائی ہر طرح کے باطل فتنوں سے محفوظ رہیں اور اللہ تعالیٰ ہمارے دین و ایمان کی مکمل حفاظت فرمائے۔ آمین!

اخیر میں طویل سمع خراشی پر معذرت کرتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ یہ چند بکھری ہوئی باتیں اصولی طور پر موضوع کو سمجھنے میں معاون ہوں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ

وآخر دعوانا الحمد للہ رب العالمین

ایک لاکھ کی تعداد میں مسلمانان دہلی کی طرف سے ایمانی غیرت کا پرجوش مظاہرہ

تاریخ ساز، روح پرور دوسری عظیم الشان تحفظ ختم نبوت کانفرنس

منعقدہ ۲۰؍جون ۱۹۹۸ء ۲۴؍صفر ۱۴۱۹ء — بمقام عیدگاہ ویلکم جعفر آباد مشرقی دہلی

رپورٹ:- محمد عثمان منصورپوری ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند

قادیانی گروہ اسلام کا نام لے کر اسلام کو مٹانا چاہتا ہے۔ مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کو خاتم النبیین بنا کر پیش کرتا ہے۔ دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کو (جو مرزا پر ایمان نہیں رکھتے) کافر پکے کافر اور دائرہ اسلام سے خارج مانتا ہے۔
مسلمانوں کو لازم ہے کہ اس دھوکہ باز منظم گروہ سے (جو اپنے کو نام نہاد احمدی جماعت سے متعارف کراتا ہے) ہوشیار رہکر اس کا مذہبی سماجی معاشرتی بائیکاٹ کریں، دنیا بھر کے تمام مکاتب کے مفتیان کرام قادیانی گروہ کے کافر، زندیق ہونے کا اعلان کرتے آئے ہیں۔

الحمد للہ کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دار العلوم دیوبند ملک بھر میں قادیانی فتنہ کی سرکوبی، اور مسلمانوں کو اس کے مکر و فریب سے بچانے کے اپنی جد وجہد مسلسل جاری رکھے ہوئے ہے۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ ہر جگہ مجلس کو مسلمانوں کے مختلف طبقات کا تعاون ملتا ہے۔ خصوصاً جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ علماء کرام، اور دینی حمیت رکھنے والے غیور مسلمانوں کو اسوۂ صدیقی کے مطابق توفیق ملی ہے کہ ملک کے جس صوبے میں بھی قادیانی فتنہ سر ابھارتا ہے تو سب سے پہلے صوبائی و مقامی جمعیتیں سینہ سپر ہوکر میدان میں آجاتی ہیں۔ اور قادیانی ٹولہ کو للکارتی ہیں، اور فتنہ قادیانیت کے محاسبہ اور تعاقب کے لئے صوبائی مجلسوں کی تشکیل تربیتی کیمپوں کا انعقاد، تحفظ ختم نبوت کی کانفرنسیں، ضرورت پڑنے پر قادیانیوں سے براہ راست بحث مباحثہ اور مناظروں کا انتظام کرتی ہیں پھر رفتہ رفتہ دیگر دردمندان ملت فضلاء مدارس عربیہ و دانشوران قوم بھی اس مبارک قافلہ میں شریک ہو جاتے ہیں یہ محض حسن اتفاق نہیں بلکہ جمعیۃ علماء ہند کے اغراض و مقاصد

اسلام اور شعائر اسلام کی حفاظت کے پیش نظر جمعیۃ کی اپنی ذمہ داری بھی ہے تاہم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کے مرکزی دفتر نے اپنے پیغام اور کام کو ملک بھر میں عام کرنے کی جو کوشش کی ہے، اس میں پر خلوص تعاون دینے والے فضلاء مدارس عربیہ ودانشوران قوم کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

خصوصیت سے جمعیۃ علماء ہند اور اس کی شاخوں کا بیحد ممنون ہے، کیونکہ پنجاب، ہماچل، ہریانہ، یوپی راجستھان، بہار، بنگال، آسام، کرالہ، کرناٹک، تاملناڈ، آندھرا پردیش، وغیرہ جہاں بھی تربیتی کیمپ برائے رد قادیانیت لگائے گئے۔ کانفرنسوں یا مناظروں کا انتظام کیا گیا ان سب کا اہتمام کل ہند مجلس کی خصوصی نگرانی وراہنمائی میں مقامی جمعیتوں نے کیا اور وہ صوبائی مجالس تحفظ ختم نبوت کی تشکیل کرا کے مسلسل قادیانی تعاقب کی تحریک میں ان کا تعاون کرتی رہتی ہیں۔

چنانچہ دہلی میں جب قادیانی فتنہ نے پیر پھیلانے شروع کئے۔ اور اپنے ہیڈ کواٹر تغلق آباد سے نکلکر ۱۹۹۶ء سے ماولنکر ہال دہلی میں سالانہ کھلے اجلاس کر کے اپنے اسلام اور خدمت اسلام کا ڈھنڈورا پیٹنے لگے تو صدر جمعیۃ علماء ہند امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ نے جمعیۃ کی مجلس عاملہ میں اس مسئلہ پر ارکان کی توجہ مبذول کی اور کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کو صورت حال سے آگاہ فرما کر دہلی میں قادیانی تعاقب کے لئے پروگرام مرتب کرنے کی ضرورت ظاہر فرمائی اور جمعیۃ علماء کی طرف سے بھرپور تعاون کی پیش کش فرمائی۔ اسی تحریک کے بعد ۱۴ جون ۱۹۹۷ء کو جامع مسجد شاہجہانی دہلی کے وسیع وعریض اردو پارک میں تقسیم ملک کے بعد پہلی فقید المثال تحفظ ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں محتاط اندازہ کے مطابق پچاس ہزار سے زیادہ مسلمانوں نے شرکت کی اور وہ قادیانی دجالوں کے مکر وفریب سے آگاہ ہوئے اس آگاہی کو برقرار رکھنے کے لئے کانفرنس کے بعد وقفہ وقفہ سے سال بھر دہلی کے مختلف علاقوں میں تحفظ ختم نبوت کے سلسلہ میں میٹنگیں اور جلسے ہوتے رہے۔ لیکن حضرت امیر الہند مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم نے جمعیۃ کی مجلس عاملہ میں امسال بھی بڑے اجلاس کی ضرورت ظاہر فرمائی جس کو بالاتفاق منظور کیا گیا اور کل ہند مجلس کو ضروری کارروائی کے لئے متوجہ کیا گیا۔

کانفرنس کی تیاری:

چنانچہ حضرت مولانا مدظلہ نے اس سال ۳۱؍مئی ۱۹۹۸ء کو دہلی کے عمائدین وعلماء کرام کی ایک اہم میٹنگ طلب فرمائی جس میں باتفاق آراء ۲۰؍جون ۱۹۹۸ء کو بعد نماز مغرب بمقام عیدگاہ ویلکم

جعفر آباد دہلی دوسری تحفظ ختم نبوت کانفرنس طے ہوگئی اور حضرت کی نگرانی میں مجلس استقبالیہ کی تشکیل بھی عمل میں آگئی جس کے صدر الحاج قاضی اکرام الحسن صاحب چوہان بانگر دہلی اور جنرل سیکرٹری جناب الحاج فیاض الدین صاحب (عرف حاجی میاں) مالک حاجی ہوٹل جامع مسجد دہلی اور خزانچی جناب مولانا قاری حماد اعظمی ناظم جمعیۃ علماء ہند دہلی منتخب کئے گئے اور نشرواشاعت کی ذمہ داری جناب مولانا معزالدین صاحب ناظم امارت شرعیہ ہند کے سپرد کی گئی ارکان مجلس استقبالیہ نے زور شور سے اجلاس کی تیاری شروع کردی اور کل ہند مجلس کی راہنمائی حاصل کرتے رہے، کانفرنس کی اہمیت کے پیش نظر سال گذشتہ کی طرح دفتر کل ہند مجلس کے رفقاء بھی دہلی آکر جمعیۃ کے دفتر میں مقیم ہوگئے جن میں راقم الحروف محمد عثمان منصورپوری ناظم مجلس اور جناب مولانا شاہ عالم صاحب نائب ناظم، اور جناب مولانا محمد یامین صاحب، جناب مولانا محمد عرفان صاحب، جناب مولانا محمد راشد صاحب، مبلغین دارالعلوم دیوبند جناب مولانا محمد خالد گیاوی مبلغ شعبہ تحفظ ختم نبوت مظاہر العلوم سہارنپور دار جدید اور جناب مولانا بدرالہدیٰ صاحب دربھنگوی، جناب مولانا محمد عیاض صاحب مئوی، جناب مولانا محمد سلیم صاحب بارہ بنکوی (متخصصین شعبہ تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند) کے اسماء گرامی شامل ہیں۔ مسلمانوں کے سامنے قادیانی فتنہ کی سنگینی واضح کرنے کے بعد کانفرنس میں شرکت کی دعوت دینے کے لئے جمعوں کے عربی خطبات سے پہلے مختصر تقریروں کے پروگرام ۲۹ مئی سے شروع کردئے گئے پھر مسلسل ۵رجون ۱۲ر جون، ۱۹رجون، ۹۸ء کے پروگراموں کی تشکیل کے لئے رات دن محنت کی گئی، اور چاروں جمعوں میں مجموعی طور پر چارسو مسجدوں میں یہ پروگرام ہوئے۔ اس طرح تقریباً دس لاکھ مسلمانوں نے قادیانی فتنہ کی مکاری وعیاری کو سنا علاوہ مساجد کے پروگراموں کے پارکوں وغیرہ میں بھی اس سلسلہ کے اجلاس ہوئے کانفرنس کی تشہیر وغیرہ کے لئے پوسٹر بھی ہزاروں کی تعداد میں چسپاں کئے گئے۔ اہل علاقہ کی طرف سے کانفرنس کی تائید میں پوسٹر الگ شائع ہوئے۔

مساجد وغیرہ کے پروگراموں میں تقریروں کے لئے دہلی وبیرون دہلی کے مدارس کے حضرات نے کل ہند مجلس کی دعوت پر اپنا قیمتی وقت عنایت فرمایا اور سخت گرمی کے باوجود دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں دہلی کی دور دراز کالونیوں میں پہونچ کر تقریریں فرمائیں۔ فجزاھم اللہ تعالیٰ۔

بیرون دہلی کے مدارس کے نام درج ذیل ہیں۔

دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، دار جدید، مظاہر العلوم سہارنپور (وقف) دار قدیم،

جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد، مدرسہ اعزاز العلوم ویٹ غازی آباد، مدرسہ خادم الاسلام ہاپوڑ، مدرسہ امدادیہ مراد آباد مدرسہ جامع الہدیٰ مراد آباد مدرسہ رحمانیہ ٹانڈہ بادلی رامپور، مدرسہ دالعلوم ٹانڈہ بادلی، مدرسہ جامعہ محمودیہ نوگزہ میرٹھ، مدرسہ حسینیہ تاولی ضلع مظفر نگر، مدرسہ فیض ہدایت رحیمی رائے پور، مدرسہ کاشف العلوم چھٹمل پور، مدرسہ اسلامیہ رائے پور ہریانہ، مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی بلند شہر۔

اور شہر دہلی کے مدارس میں یہ نام قابل ذکر ہیں:

مدرسہ امینیہ کشمیر گیٹ دہلی مدرسہ عبد الرب دہلی، مدرسہ حسین بخش دہلی، مدرسہ باب العلوم، جعفر آباد، مدرسہ بیت العلوم جعفر آباد ومدارس اسلامیہ مصطفیٰ آباد و شاہدرہ و سیماپوری۔

بسلسلہ تیاری کانفرنس علاقائی جلسوں کے اہتمام میں درج ذیل حضرات نے نمایاں حصہ لیا۔

جناب مولانا قاری عبد الغفار صاحب جعفر آباد جناب احسان صاحب تغلق آباد، جناب سلیم الدین صاحب سنگم وہار، جناب شیخ علیم الدین صاحب بلی ماران

اس موقع پر رفیق محترم جناب مولانا قاری شوکت علی صاحب، مہتمم مدرسہ اعزاز العلوم ویٹ کے پر خلوص تعاون کا تذکرہ نہ کرنا ناسپاسی ہوگی ۔ موصوف نے اپنی علالت اور مصروفیات کے باوجود اس عرصہ میں بار بار دہلی کا سفر فرمایا۔ اور کئی کئی روز قیام فرماکر مساجد وغیرہ کے پروگراموں کی تشکیل وترتیب میں مدد دی اور ان میں بیانات کے لئے دہلی کے مختلف علاقوں کے دورے فرمائے۔ اور موقع بموقع اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے دہلی کی یہ کانفرنس جمعیۃ علماء ہند کی تحریک پر ہی ہوری تھی پھر بھی دفتر جمعیۃ علماء کے بھرپور تعاون کا تذکرہ کئے بغیر چارہ نہیں۔ ناظم جمعیۃ علماء ہند جناب مولانا سید محمود مدنی صاحب اور جناب مولانا قاری حماد صاحب اعظمی نے باحسن وجوہ اپنی ذمہ داری پوری فرمائی یہ حضرات ایک جانب رفقاء مجلس جو دفتر میں مستقل قیام پذیر تھے۔ اور وقت بے وقت اپنے کام انجام دے کر دفتر واپس آتے، ان کے کھانے وغیرہ کا بندوبست رکھتے تھے۔ بالخصوص چار جمعوں کو باہر کے جو علماء کرام کثیر تعداد میں بیان کے لئے تشریف لاتے تھے۔ ان کے قیام وطعام کا مناسب انتظام کرنے کی فکر فرماتے اور خود ضیافت کے فرائض انجام دیتے ان کی ہدایت کے مطابق دفتر میں موجود آرگنائزر اور دوسرے کارکنان کانفرنس سے متعلق امور مفوضہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے بالخصوص کانفرنس سے دو روز قبل اور دو روز بعد دفتر میں سیکڑوں مہمانوں کی راحت رسانی میں شب وروز مصروف رہے۔

ادھر وسیع و عریض جلسہ گاہ کے جملہ انتظامات جمنا پار مشرقی دہلی کے حضرات نے اپنے ذمہ لے لئے تھے اس سلسلہ میں جناب مولانا ظفر الدین صاحب، جناب مولانا محمد شمیم صاحب، جناب مولانا محمد اسماعیل صاحب اور جناب مولانا روض الدین صاحب وغیرھم نے علاقہ کے اہل خیر حضرات سے رابطہ قائم فرما کر ان انتظامات کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا چنانچہ اسٹیج، فرش، روشنی اور لاؤڈ اسپیکر کے جملہ مصارف جناب الحاج اکرام الحسن صاحب صدر مجلس استقبالیہ نے ادا فرمائے، نماز کی صفیں جناب نسیم الدین صاحب سیلم پور والوں نے مہیا فرمائیں اور ٹھنڈے پانی کا انتظام جناب حاجی محبوب الٰہی صاحب جعفر آباد نے فرمایا، اور تقریباً دو ہزار مہمانوں کے ایک وقت طعام کا انتظام جناب حاجی مہتاب صاحب کھلونہ والوں نے فرمایا۔ اور میونسپلٹی کے ذریعہ ٹینکر مہیا کرنے اور علاقہ میں صفائی ستھرائی کے لئے جناب ضمیر احمد صاحب (منا) کونسلر، اور جناب متین احمد صاحب ایم ایل اے نے جد و جہد فرمائی۔ فجزاهم الله تعالیٰ

کانفرنس کا آغاز:

کانفرنس کے آغاز کا پروگرام بعد نماز مغرب تھا مگر حب نبوی و بغضِ گستاخ رسول کے ایمانی جذبات سے معمور شمع رسالت کے پروانے عصر کے وقت ہی سے عید گاہ ویلکم جعفر آباد پہونچنے شروع ہوگئے۔ اور مغرب کی نماز تک ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوگئے مغرب کی نماز عید گاہ میں ادا کی گئی۔ اور نماز کے فوراً بعد کانفرنس کا افتتاح ہوگیا۔ سب سے پہلے مولوی حافظ قاری محمد عفان منصور پوری متعلم دار العلوم دیوبند نے تلاوت کلام پاک کی۔ اس کے بعد جناب مولانا قاری شوکت علی صاحب مہتمم اعزاز العلوم ویٹ نے تحریک صدارت پیش فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس تاریخ ساز اجلاس کی صدارت کے لئے میں امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد صاحب مدنی مدظلہ صدر جمعیۃ علماء ہند کا نام نامی پیش کرتا ہوں حضرت موصوف کی ملکی و ملی خدمات کی ایک طویل فہرست ہے، آج کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دار العلوم دیوبند کی شکل میں قادیانی تعاقب کی جو تحریک چل رہی ہے، اس کے شروع کرنے اور اس کے عام کرنے میں حضرت موصوف کا تاریخی کردار ہے، مختلف صوبوں میں تربیتی کیمپوں اور کانفرنسوں کا انعقاد، حضرت موصوف کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔

لہٰذا اس کانفرنس کی صدارت کے لئے سب سے زیادہ موزوں شخصیت حضرت امیر الہند کی سمجھتا ہوں، امید کہ آپ سب حضرات تائید فرمائیں گے اس تائیدی کاروائی کے بعد دار العلوم دیوبند کے مشہور استاذ تجوید و قرأت جناب مولانا قاری شفیق الرحمٰن صاحب بلند شہری

کو تلاوت کلام اللہ کی دعوت دی موصوف نے سورہ احزاب کی آیت خاتم النبیین پر مشتمل چند آیات نہایت ترتیل سے تلاوت فرماکر کانفرنس کو قرآنی انوار سے منور فرمایا۔ تلاوت کلام اللہ کے بعد دارالعلوم دیوبند کے طالبعلم مولوی محمد صالح سلطانپوری نے نعتیہ کلام پیش کیا۔

خطبہ استقبالیہ:

اس کے بعد احقر نے خطبہ استقبالیہ پیش کرنے کے لئے صدر مجلس استقبالیہ جناب الحاج قاضی اکرام الحسن صاحب، صدر مسلم آل انڈیا ایکتا ویلفر کمیٹی کو دعوت دی، مگر موصوف کو عین وقت پر کانفرنس کی نگرانی سے متعلق ایک ضروری کام کی وجہ سے جانا پڑ گیا اِس لئے موصوف کی نمائندگی کرتے ہوئے جناب مولانا محمد انیس صاحب آزاد قاسمی مدیر تحریر "تنویر حرم" نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔

خطبہ صدارت:

حضرت موصوف نے تقریباً پچاس منٹ میں خطبہ صدارت کی خواندگی مکمل فرمائی جو بطرز خطاب نہایت واضح تھی۔ مکمل خطبہ صدارت اسی شمارہ میں ملاحظہ کرلیا جائے۔

حضرت مولانا ارشد مدنی کی تقریر:

پھر ناظم اجلاس نے دارالعلوم دیوبند کے ناظم تعلیمات واستاذ حدیث حضرت مولانا سید ارشد صاحب مدنی مدظلہ کو دعوت خطاب دیتے ہوئے نام نامی کا اعلان کیا۔

موصوف کرسی خطابت پر رونق افروز ہوئے اور خطبہ مسنونہ کے بعد ارشاد فرمایا کہ آپ حضرات بار بار ختم نبوت کا لفظ سن رہے ہیں اس لفظ کا مطلب کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

حضرات! آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام تشریف لائے۔ ہر نبی اپنے ماننے والوں کو پروانۂ جنت دیتا رہا مگر صرف اپنے زمانہ تک یعنی جب اس کے بعد دوسرا نبی آئے تو اب پچھلے نبی کا پروانہ نہیں چلے گا بلکہ دوسرے نبی کو مانکر اس سے پروانۂ جنت حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ لیکن ہمارے آقا اور سردار حضرت محمد ﷺ نے مبعوث ہوکر اپنے ماننے والوں کو جو پروانۂ جنت عطا فرمایا وہ قیامت تک کام آنے والا ہے اب کوئی اور نبی نہیں آئے گا جس کے پروانہ پر جنت ملنا موقوف ہو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی جب قیامت کی بڑی علامت کے طور پر نزول فرمائیں گے۔ وہ بھی حضور ﷺ والا پروانۂ جنت لوگوں کو عطا فرمائیں گے اور حضور ﷺ کی شریعت پر ہی خود چلیں گے اور پوری امت کو چلائیں گے۔ یہ مطلب ہے ختم نبوت کا۔

حضرات! اس کے برخلاف مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی بکواس کرتا ہے کہ میرے

آجانے کے بعد حضور ﷺ کا عطا فرمایا ہوا پروانۂ جنت کافی نہیں ہے۔ بلکہ نجات پانے اور جنت میں جانے کے لئے مجھ پر ایمان لاکر پروانہ حاصل کرنا ضروری ہے اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ نعوذ باللہ، خاتم النبیین مرزا قادیانی ہوا۔ ہمارا قادیانیوں سے یہی بنیادی اختلاف ہے آپ نے متنبہ فرمایا کہ جس طرح سچے نبی کا انکار کفر ہے اسی طرح جھوٹے نبی کو تسلیم کرنا بھی کفر ہے۔

حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی کی تقریر:

اس کے بعد اناؤنسر نے مشہور خطیب مہتمم دارالمبلغین لکھنو حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند سے گذارش کی کہ اپنے فاضلانہ خطاب سے سامعین کو محظوظ فرمائیں۔

موصوف نے خطبۂ مسنونہ کے بعد آیت کریمہ پڑھی :ومن اظلم ممن افتری علی اللہ کذباً وقال اوحی الی ولم یوح الیہ شیء (سورہ الانعام آیت ۹۳)اس آیت کریمہ کی روشنی میں موصوف نے واضح فرمایا کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کا گروہ اللہ تعالیٰ پر افترا کرنے والا اور وحی کا مدعی کاذب ہونے کی وجہ سے اس زمانہ کا سب سے بڑا ظالم ہے، پھر بھی عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ طفلانہ سوال کرتے ہیں کہ آپ لوگ قادیانیوں کا تعاقب کیوں کررہے ہیں۔ حالانکہ یہ تو انبیاء علیہم السلام کا اسوہ مبارک ہے جو اپنے زمانہ میں شر کا مقابلہ کرتے ہوئے لوگوں کو خیر کی طرف بلاتے رہے آج قادیانی گروہ، خیر (ختم نبوت) کے خلاف انکار ختم نبوت کا شر پھیلانے میں معروف عمل ہے تو اہل حق کا فرض ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی شان خاتم النبیین کو خوب اچھی طرح بار بار مسلمانوں کو سمجھائیں اور قادیانی گروہ کی تحریفات وتلبیسات سے آگاہ کریں چنانچہ اللہ کی توفیق سے دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند قادیانی شر کا سر کچلنے کے لئے پیش پیش ہیں۔

ناظم کل ہند مجلس کی معروضات:

اس کے بعد خاکسار راقم الحروف ناظم کل ہند مجلس نے اجمالی طور پر کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کی خدمات جو وہ مختلف صوبوں وعلاقوں میں انجام دے رہی ہے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے سامعین کو بتایا کل ہند مجلس کا مرکزی دفتر دہلی میں ۱۹۹۱ء سے قادیانی سرگرمیوں پر مسلسل نظر رکھے ہوئے ہے۔ اور جب بھی جس کالونی میں ضرورت پیش آئی اور ذمہ داران نے دارالعلوم سے رابطہ قائم فرمایا تو وہاں سے موضوع کے ماہر علماء و مبلغین روانہ کئے گئے۔ جنھوں نے حسب ضرورت کئی کئی دن ان علاقوں میں قیام کر کے مسلمانوں کو قادیانی گروہ اور قادیانیت زدہ لوگوں کی چالبازی

سے محفوظ رکھنے کی کوششیں فرمائیں۔ اور جب قادیانی فتنہ نے دہلی میں اور زیادہ پیر پھیلانے کے لئے ماولنکر ہال میں کانفرنسیں کرنی شروع کیں تو ذمہ داران نے ضرورت محسوس کی کہ قادیانی فتنہ کی سرکوبی کے لئے بڑے اور کھلے اجلاس کئے جائیں اسی سلسلہ کی آج دوسری عظیم الشان تحفظ ختم نبوت کانفرنس عیدگاہ ویلکم جعفر آباد کے وسیع وعریض میدان میں منعقد ہورہی ہے دارالعلوم دیوبند، جمعیۃ علماء ہند اور اسکے نہج پر کام کرنے والے صاحبان امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اور فتنہ پردازوں سے مقابلہ آرائی کو اپنا خصوصی مشن بنائے ہوئے ہیں، جس پر ان حضرات کو نبی کریم ﷺ کی عظیم بشارت ہے کہ ان کو امت مسلمہ کے اولین حضرات (صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم) جیسا ثواب ملے گا۔ حدیث پاک ہے۔

انه سيكون في آخرهذه الامة قوم لهم مثل اجراولهم يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكرويقاتلون اهل الفتن. الخ. (بيهقي)

ترجمہ :۔ اس امت (امت محمدیہ) کے اخیر زمانہ میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوگی جس کا ثواب اس امت کے ابتدائی دور کے لوگوں (صحابہؓ) ثواب کے مانند ہوگا یہ جماعت اچھی باتوں کا حکم کرے گی۔ بری باتوں سے روکے گی اور فتنہ پردازوں کا مقابلہ کرے گی۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کی پیش کردہ قرارداد :

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اور کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کے صدر حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے عظیم الشان کانفرنس کا پیغام بصورت قرارداد پڑھ کر سنایا جس کا متن درجہ ذیل ہے:

حامداً ومصليا ومسلما، اما بعد! مسلمانان دہلی کی یہ دوسری عظیم الشان تحفظ ختم نبوت کانفرنس اس بات کو نہایت تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں قادیانیوں مرتدوں کی ارتدادی سرگرمیاں منصوبہ بند طریقہ سے جاری ہیں یہ لوگ جہاں عیسائی مشریوں کے طرز پر پبلک اسکول قائم کرکے معصوم مسلم بچوں کے ذہنوں خراب کررہے ہیں وہیں پسماندہ اور جہالت زدہ علاقوں میں رفاہی اداروں کے قیام اور مالی امداد وغیرہ کے ذریعہ سادہ لوح مسلم عوام کو دام فریب میں مبتلا کررہے ہیں نیز قادیانیوں نے انٹرنیٹ اور ٹیلی ویژن پر سیٹلائٹ پروگراموں کے ذریعہ اپنے باطل مذہب کی اشاعت کا سلسلہ جاری کرر کھاہے جس کے توسط سے آج یہ ارتدادی فتنہ شہر شہر اور گھر گھر تک پہونچ گیا ہے اس لئے

الف یہ کانفرنس تمام مسلمانوں پر واضح کردینا چاہتی ہے کہ قادیانی جماعت کے لوگ

اپنے عقائد باطلہ (مثلاً مرزا قادیانی کی صورت میں آنحضرت ﷺ کی بعثت ثانیہ، انکار ختم نبوت اور وفات حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے عقائد) کی بنا پر مرتد، زندیق اور کافر ہیں ان سے مسلمانوں جیسے تعلقات رکھنا ،مسلمانوں کے قبرستان میں ان کے مردوں کو دفن کرنا اور ان سے رشتہ ناطہ رکھنا سب قطعاً حرام ہے اور ان کا سماجی اور معاشرتی بائیکاٹ کرنا واجب ہے

ب ۔ یہ عظیم کانفرس قادیانیوں کو آگاہ کرتی ہے کہ وہ اپنے عقائد باطلہ سے توبہ کرکے صدق دل سے حلقہ اسلام میں آجائیں اور مرزا قادیانی کو جھوٹا مدعی نبوت اور کافر تسلیم کرلیں یا پھر اسلام کا نام لینا اور مسلمانوں کے شعائر استعمال کرنا چھوڑدیں مسلمان ان کی اس دجل وتلبیس کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتے۔

ج ۔ یہ عظیم کانفرس حکومت ہند سے مطالبہ کرتی ہے کہ چونکہ قادیانی دھوکہ اور فریب دے کر حقیقتاً غیر مسلم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں جو دستور ہند میں دی گئی مذہبی آزادی کی دفعہ (۲۵) کے خلاف ہے اس لئے حکومت ہند دستور ہند کی خلاف ورزی کی بنا پر قادیانیوں کو مسلمانوں کے شعائر استعمال کرنے پر پابندی لگائے اور انہیں باضابطہ طور پر غیر مسلم قرار دے

د ۔ یہ کانفرس تمام مسلم جماعتوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنے حلقہ اثر میں قادیانی جماعت کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھیں اور اپنے پروگراموں میں عقیدہ توحید وختم نبوت کی مثبت انداز میں قابل اطمینان تشریح کرکے قادیانیوں کی تحریفات وتلبیسات سے مسلم عوام کو آگاہ کیا کریں

ہ ۔ یہ کانفرس بالخصوص دینی مدارس کو توجہ دلاتی ہے کہ وہ اپنے طلباء کو ردّ قادیانیت کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرنے کا اہتمام کریں اور اساتذہ کو اس موضوع پر تیار کرنے کے لئے جابجا تربیتی کیمپوں کا انعقاد کریں اور خاص کر قادیانیت سے متاثرہ علاقوں میں مکاتب کے قیام کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو زیغ وضلال سے محفوظ رکھے آمین۔

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری کی تقریر:

دارالعلوم دیوبند کے ممتاز استاذ حدیث، رد قادیانیت کے مربی خصوصی، ناظم عمومی کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری کرسی خطابت پر جلوہ افروز ہوئے۔ حضرت موصوف نے خطبہ مسنونہ کے بعد ارشاد فرمایا کہ ختم نبوت اور رد قادیانیت کے متعلق بہت کچھ مواد آپ کے سامنے آچکا ہے۔ البتہ قرارداد کی دفعہ (۴) میں کہا گیا ہے کہ قادیانیوں کی تحریفات وتلبیسات سے مسلم عوام کو آگاہ کیا جائے، اس موضوع پر تفصیلی گفتگو باتی

رہ گئی ہے، میں اس کے بارے میں اپنی معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے میں یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بارہ سال قبل جب ہندوستان میں قادیانی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو ان کے تعاقب کرنے کی فکر سب سے پہلے رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم حضرت مولانا سید اسعد صاحب مدنی مدظلہ کو ہوئی اور موصوف کی خصوصی تحریک و تجویز پر ہی ۱۹۸۶ء میں دارالعلوم دیوبند میں عالمی اجلاس تحفظ ختم نبوت منعقد کیا گیا تھا۔ اس وقت اس کو بظاہر غیر ضروری سمجھا گیا تھا۔ لیکن بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ حضرت مولانا مدنی مدظلہ کی نگاہ دوربیں تھی اور حضرت نے بڑی دوراندیشی سے کام لیکر ہم سب کو رد قادیانیت کی مہم میں لگادیا جس کے نتیجہ میں جگہ جگہ قادیانی ارتدادی فتنہ کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے والے علماء کرام اور دردمندان ملت تیار ہورہے ہیں۔ آج کی یہ کانفرنس بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے، حضرت مولانا مفتی سعید احمد اصاحب نے اپنی تقریر مین قادیانیوں کے دجل وفریب کو بڑے اچھے انداز میں سمجھایا جسے سامعین نے خوب توجہ سے سنا

فریب (۳) قادیانی گروہ بڑی معصومیت سے سادہ لوح مسلمانوں سے اپنی پریشانی کا اظہار کرتا ہے کہ ہم تو مسلمانوں والا کلمہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتے ہیں۔ اپنی مسجدوں، دکانوں مکانوں پر جلی حرفوں میں کلمہ لکھ کر لگاتے ہیں۔ پھر بھی علماء ہمیں کافر کہتے ہیں بلکہ ہمیں کلمہ پڑھنے اور لکھنے کی اجازت نہیں دیتے اسکا جواب یہ کہ قادیانیوں کا کفریہ عقیدہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی دوسری بعثت مرزا غلام احمد قادیانی کی شکل میں ہوئی ہے مرزا قادیانی بعینہ محمد ہے (نعوذ باللہ) اس لئے جب قادیانی کلمہ پڑھتے ہیں تو ان کی مراد محمد سے مرزا قادیانی ہوتی ہے۔ لہٰذا کلمہ لاالہ الا اللہ پڑھنے کے باوجود قادیانی گروہ کافر ہے۔ اور علماء ان کو حق نہیں دیتے کہ مسلمانوں کا کلمہ خود اپنے کفریہ مذہب کے لئے استعمال کریں۔ حضرت مفتی صاحب کی تقریر سوا گھنٹہ جاری رہی۔

حضرت مفتی صاحب کی تقریر کے بعد مجلس استقبالیہ کے جنرل سکریٹری جناب الحاج فیاض الدین صاحب (حاجی میاں) نے کلمات تشکر پیش فرمائے، اور تمام علماء کرام محترم سامعین اور تمام منتظمین کانفرنس کا شکریہ ادا کیا۔

تعارف وتبصرہ

جناب مولانا مفتی خورشید انور صاحب گیاوی استاذ-دارالعلوم دیوبند

کتاب: آسان منطق، ترتیب تیسیر المنطق
تصنیف: جناب مولانا حافظ عبداللہ صاحب گنگوہیؒ
ترتیب: حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
صفحات: ۸۰
کتابت وطباعت: معیاری
ٹائٹل: دیدہ زیب
طبع اول: ۱۴۱۷ھ
ناشر: مکتبہ وحیدیہ دیوبند یوپی ۲۴۷۵۵۴

اہل نظر جانتے ہیں کہ ہر دور کے تقاضہ کے مطابق نصاب میں مناسب تبدیلی نصاب کی زندگی، حرکیت، فعالیت اور بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دینے کی بھرپور صلاحیت کی روشن دلیل ہے۔ اس لئے دیگر علوم وفنون کے نصاب کی طرح منطق کے نصاب میں بھی حذف وترمیم کا متحرک سلسلہ جاری رہا اس حذف وترمیم کے بعد آج یہ نصاب تیسیر المنطق سے شروع ہو کر عموماً سلم العلوم پر مکمل ہو جاتا ہے۔ جس میں مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، اور قطبی شامل ہیں۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی بالعموم "سلم" ہے اور بنیادی کڑی بہر حال تیسیر المنطق ہے۔

تیسیر المنطق: آج سے اسی سال پہلے جناب مولانا حافظ عبداللہ صاحب گنگوہیؒ نے یہ مفید وبابرکت کتاب لکھی تھی۔ کتاب اپنے زمانہ تصنیف کی واضح اور رواں زبان میں لکھی گئی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ آج تک درسی کتب خانہ میں کتاب کا نعم البدل تو کیا، بدل بھی نہیں آسکا ہے۔ کتاب کی مقبولیت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ روز تصنیف سے آج تک برصغیر کے تقریباً تمام اسلامی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ اور بلاشبہ آج بھی کتاب کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ البتہ اسی سال کے اس طویل عرصہ میں زبان اور انداز بیان دونوں بدل چکے ہیں، کتاب قدیم انداز پر مرتب ہے، ادھر فارسی سے دوری اور استعداد کی کمزوری! ان اسباب ووجوہ کی بنا پر اب طلبہ کو اردو کا یہ رسالہ بھی

مشکل معلوم ہونے لگا،اس لئے اب کتاب اپنی افادیت میں درج ذیل امور میں توجہ طلب تھی۔

(۱) بعض اسباق میں طوالت تھی،اس لئے اختصار کی ضرورت تھی (۲) زبان قدیم ہوگئی تھی، اس لئے قدرے جدید اور آسان کرنے کی ضرورت تھی۔ (۳) کتاب کے بار بار چھپنے سے بعض حواشی اور تمرینات خلط ملط ہوگئی تھیں، اس لئے توضیح وتصحیح کی ضرورت تھی۔ (۴) کتاب میں ایک دو جگہ تسامح تھا، جس کی اصلاح کی ضرورت تھی۔ (۵) تمرینات میں بعض مثالیں نامانوس تھیں، جن کو حذف کرنے کی ضرورت تھی۔

اس طرح مجموعی اعتبار سے ضرورت تھی کہ کتاب کو از سر نو عہد حاضر کے نئے آسان انداز پر مرتب کیا جائے۔

خدا کا فضل وکرم ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے مقبول استاذ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مد ظلہم نے کتاب کی اہمیت، افادیت اور دور حاضر کی ضرورت کے پیش نظر درج ذیل امور کی رعایت کرتے ہوئے نئے آسان انداز پر "آسان منطق" کے نام سے کتاب مرتب فرمائی ہے۔

(۱) اسباق مختصر کئے گئے ہیں۔ (۲) اصل عبارت کو سلیس بناتے ہوئے ہر اصطلاح واضح اور مختصر عبارت میں لکھی گئی ہے۔ (۳) تمرینات بڑھائی گئی ہیں۔ (۴) متفرق حاشئے کو ملا کر ایک حاشیہ بنادیا گیا ہے۔ (۵) حسب ضرورت مزید حاشئے بڑھائے گئے ہیں، اور کتاب کے آخر میں تمرینات کا حل دے دیا گیا ہے۔ (۶) کتاب میں جہاں جہاں تسامح تھا اس کو اصل کتاب میں لے کر تعبیر بدل دی گئی ہے یا مثال بدل دی گئی ہے (۷) تمرینات میں سے بعض نامانوس مثالیں حذف کردی گئی ہیں، جس کی تقریب میں صراحت کردی گئی ہے۔ کتاب کے شروع میں "تقریب" ہے جس کے آخر میں طرز تدریس ہے۔

"آسان منطق کی سب سے بڑی مقبولیت یہ ہوئی کہ سال رواں سے دارالعلوم دیوبند کی مؤقر مجلس تعلیمی نے دارالعلوم کے سال دوم عربی کے نصاب میں تیسیر المنطق کی جگہ آسان منطق داخل کرلی ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں اس کتاب کے پڑھانے والے اساتذہ کرام کے تاثرات بڑے اچھے ہیں۔ ان کا کہنا ہے اسباق کو مختصر کردینے سے اور ہر ہر اصطلاح کی تعریف الگ الگ کردینے سے کتاب بڑی آسان ہوگئی ہے۔ پھر سمجھ کر یاد کئے ہوئے اسباق تمرینات سے پختہ ہوجاتے ہیں اور سوالات سے تکرار ومذاکرہ ہوتا رہتا ہے۔ پڑھنے والے طلبہ عزیز بہت جلد آسانی سے سمجھ کر یاد کرلیتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند میں ہونے والے ماہانہ امتحانات میں راقم نے گذشتہ مہینہ اس کتاب کا امتحان لیا، طلبہ نے اصطلاحات اور مثالیں فرفر زبانی سنادیں، اور تمرینات کے برجستہ جواب دیئے جس سے اندازہ ہوا کہ کتاب طلبہ کی سمجھی ہوئی ازبر ہے خدا کا شکر ہے نتیجہ اچھا اور امید افزا رہا۔ اس لئے یہ کتاب ہر اعتبار سے پذیرائی کے قابل ہے۔ امید ہے کہ مدارس عربیہ کے ذمہ داران حضرات اس کتاب کو قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھیں گے اور دارالعلوم دیوبند کی طرح تیسیر المنطق کی جگہ اسے نصاب میں داخل کرکے اپنے ہونہار طلبہ کو اس نعمت غیر مترقبہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کریں گے۔

مدارس اسلامیہ وعربیہ کے ذمہ داران کو جان کر خوشی ہوگی کہ دارالعلوم دیوبند میں سال گذشتہ نصاب تعلیم پر غور وخوض کے دوران جو چند کتابیں از سرنو ترتیب یا تصنیف کے لئے تجویز کی گئی تھیں، وہ اب شائع ہو گئی ہیں۔ وہ یہ ہیں:

(۱) مبادی الفلسفہ عام قیمت ۔/۱۶ تالیف حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالنپوری

(۲) تسہیل الاصول عام قیمت ۔/۱۸ تالیف حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب و حضرت مولانا ریاست علی صاحب

(۳) مفتاح العربیہ (حصہ اول) عام قیمت ۔/۲۸ تالیف حضرت مولانا نور عالم صاحب مدیر الداعی

(۴) مفتاح العربیہ (حصہ دوم) عام قیمت ۔/۴۰ تالیف حضرت مولانا نور عالم صاحب مدیر الداعی

(۵) منتخبہ قصائد دیوان متنبی عام قیمت ۔/۵۰

(۶) باب الادب دیوان حماسہ عام قیمت ۔/۲۶

نوٹ : ان تمام کتابوں پر رعایت پچاس فیصدی ہوگی

ملنے کا پتہ

مکتبہ دارالعلوم دیوبند

سہارنپور یوپی ۲۴۷۵۵۴ انڈیا

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

ماہ جمادی الاول ۱۴۱۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۹۸ء

جلد ۸۲	شمارہ ۹	فی شمارہ ۶/-	سالانہ ۶۰/-

نگران
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانہ بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۴۰۰/- روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/-، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/-
ہندوستان سے ۶۰/-

Tel. : 01336 - 22429
Fex : 01336 - 22768
Tel. : 01336 - 24034EDITER

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرف آغاز		۳
۲	رحمت عالم ﷺ کی تعلیمات و اصلاحات	مولانا اختر عادل سستی پوری (بہار)	۶
۳	اسلام میں غلامی کی حقیقت	محمد فرقان قاسمی علیگ سلطانپوری	۱۵
۴	اصلاح خلق کا الٰہی نظام	مولانا مفتی محمد اسماعیل پاکستانی	۲۶
۵	امام غزالیؒ	جاوید اشرف مدھے پوری	۴۰
۶	رپورٹ تحفظ ختم نبوت کانفرنس	مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری	۴۸
۷	حکیم افہام اللہؒ		۵۱
۸	جدید کتابیں		۵۲
۹	مدارس عربیہ کے لئے خوشخبری		۵۶

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔

● ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔

● چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے، اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہو گا۔

● پاکستانی حضرات مولانا نور الحسن ولد عبد الستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

● ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

● بنگلہ دیشی حضرت مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دار العلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
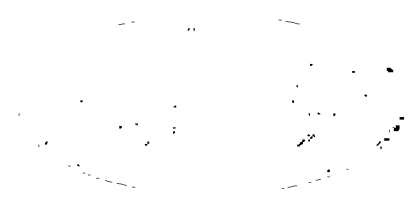
سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو لازمی طور پر "اقلیت" ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہئے بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت، دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کیلئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے، اس حیثیت کے تصور کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جاسکے، ساتھ ہی اس میں تعداد(Number) کے ساتھ نوعیت(Kin) کا سوال بھی کام کرتا ہے، فرض کیجئے ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے دوسرے کی دو کروڑ ہے، اب اگر چہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اس لئے دو کروڑ سے کم ہوگا، مگر سیاسی نقطہ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کر کے اس کی کمزور ہستی کا اعتراف کرلیں اس طرح کی اقلیت ہونے کیلئے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل(Factore) کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کرلیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکہ دینا ہے اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی

ہوئی نہیں ہے، اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے، بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی، لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار کے لئے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک آزاد جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کر سکے گی؟

"میں مسلمان ہوں، اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں، بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے، لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری راہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے، ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کیلئے جگہ نکالی، ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا، یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا، اور ہمیشہ کے لئے بس گیا، یہ دنیا کی "مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا، ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا جس دن یہ واقعہ

ظہور میں آیا اس دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔

ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے، یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالامال تھی ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازہ ہم پر کھول دیئے ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی ہم نے اسے جمہورت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گذر چکی ہیں، اب اسلام اس سرزمین پر ویسا ہی دعوار کھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔

ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے، ہماری زبانیں ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو، ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگ گئے، ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انہوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا، ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا، یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے، جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی، ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں، تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔
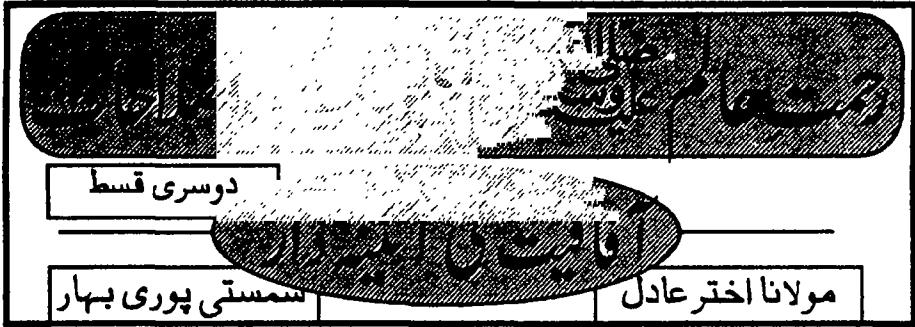
دین و دنیا کے تضاد کا خاتمہ:

حضور کی پاکیزہ تعلیمات کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے دین و دنیا کی وحدت کا تصور قائم کیا، پہلے زمانے میں دین اور دنیا دو متضاد چیزیں سمجھ لی گئی تھیں، جس کا لازمی مطلب یہ تھا کہ کوئی شخص دین و دنیا دونوں کا جامع نہیں ہوسکتا تھا، یہ دونوں الگ الگ کشتیاں تھیں اور کوئی شخص بیک وقت ان دونوں کشتیوں میں سوار نہیں ہوسکتا تھا، دین کو اختیار کرنے کا مطلب یہ تھا کہ دنیا سے یک دم کنارہ کش ہو جائے اور دنیوی تمام تعلقات کو بالائے طاق رکھدے جس کا نام رہبانیت تھا، اور اگر کوئی شخص دنیا کے ساتھ لگا رہنا چاہتا تو اس کو دین چھوڑ دینا پڑتا تھا، اس طرح پوری دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی تھی، ایک اہل دنیا کا کیمپ تھا تو دوسرا اہل دین کا پھر ان دونوں کیمپوں کی رقابت و جنگ کا سلسلہ شروع ہوا کہ دونوں کے درمیان نقطۂ اتحاد کا تصور کرنا بھی مشکل ہوگیا، یا تو انسان دنیا کے معاملہ میں بالکل شتر بے مہار ہو گیا تھا یا پھر دین کے نام پر راہب اور سادھو بن گیا تھا۔

یہ ہمارے حضور رحمۃ للعالمین کا معجزہ تھا کہ آپ نے دین و دنیا کی اس غیریت و رقابت کو ختم فرمایا، آپ نے فرمایا: دین اور دنیا اپنی ذات سے کوئی چیز نہیں ہے، اصل چیز انسان کا عزم وارادہ، نیت واحساس اور جذبہ وخیال ہے، انسان اچھی نیت سے کوئی کام کرے تو وہ اچھا ہے اور بری نیت سے کرے تو خراب ہے، حضور نے واضح طور پر فرمایا کہ دنیا کا کوئی کام بھی اگر حسن نیت کے ساتھ اور خدا کی رضاجوئی کے لئے کیا جائے تو وہ عبادت اور مستحق ثواب ہے، اور کوئی دینی کام بھی غلط ارادہ سے کیا جائے تو وہ خالص دنیا ہو جاتا ہے، اس پر کوئی اجر و ثواب نہیں ملتا کوئی شخص اپنی بیوی کے منہ میں حسن نیت کے ساتھ لقمہ ڈالے تو یہ بھی عبادت ہے، اور کوئی غلط نیت کے ساتھ جہاد و قربانی اور ہجرت وعبادت کرے تو بے کار ہے، اس پر ثواب تو کیا خدائی گرفت کا اندیشہ ہے، اس طرح آپ نے دین و دنیا دونوں کو نیت وارداہ کی زنجیر میں جوڑ دیا اور دونوں کی غیریت ختم فرما کر ایک لڑی میں پرو دیا اب یہاں نہ کوئی صرف دنیا دار ہے اور نہ کوئی تنہا دیندار ہے،

ہر ایک مسلمان ہے، اور جو مسلمان ہے وہ دین و دنیا دونوں کا جامع ہے، اور حضرت مولانا علی میاں ندوی دامت برکاتہم کے الفاظ میں

یہاں لباس دنیا میں درویش، قبائے شاہی میں فقیر و زاہد ہیف و تسبیح کے جامع، رات کے عبادت گذار اور دن کے شہسوار نظر آئیں گے، اور اس میں کسی قسم کا تضاد محسوس نہیں ہوگا (نبی رحمت ص ۶۳۲)

معیار حسن کی تبدیلی:

حضور کی رحمۃ اللعالمین کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ آپؐ نے حسن و جمال اور عزت و کمال کا معیار تبدیل کر دیا، پہلے عزت و کمال کا معیار دنیا طلبی، شان و شوکت، دولت اور قوت و جاہ تھی، انسان چھوٹے چھوٹے دائروں میں بٹا ہوا تھا، اور ہر ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں تھا، بڑا انسان وہ مانا جاتا تھا جو بڑا دولتمند ہو، یا بڑا طاقتور ہو، یا حکومت و شوکت جس کے پاس ہو، اس لئے ہر شخص کی جدوجہد کا نقطۂ عروج یہ تھا کہ وہ بڑا سے بڑا دولتمند بن جائے حاکم وقت ہو جائے، دنیا میں اپنی طاقت و قوت کا سکہ بٹھا دے مختصر یہ کہ حضورؐ سے پہلے انسانی کمال و ارتقاء کا معیار سراسر مادی تھا حضور ﷺ نے اس معیار کو بدل کر معنوی بنا دیا، آپؐ نے کہا کہ یہ چیزیں حیوانیت و بہیمیت یا شیطانیت کی پیداوار ہیں، انسان رحمٰن کا خلیفہ ہے، شیطان یا حیوان کا نہیں، اس لئے اس کی ترقیات و کمالات کا معیار بھی رحمانی ہونا چاہیئے نہ کہ شیطانی یا حیوانی قرآن نے کہا:

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (الحجرات ۱۳)

سب سے زیادہ عزت والا خدا کے نزدیک وہ ہے، جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہے۔

یعنی معیار کمال دنیا طلبی نہیں خدا طلبی اور خدا ترسی ہے، اور جو شخص عزت و عظمت کا طلب گار ہے اس کو چاہیئے کہ خدا کا راستہ پکڑے، جو کرے خدا کے لئے کرے، ایک انسان کا سب سے بڑا اعزاز یہی ہے، اور یہی اعزاز اس کی فطرت سے ہم آہنگ ہے، چنانچہ حضورؐ کے بعد دنیا کا نقشہ ہی بدل گیا، دنیا کیلئے دوڑنے دھوپنے والی قوم خدا کے راستے پر سرگرداں نظر آنے لگی، مادیت کی پرستار انسانیت نے معنویت و روحانیت کو اپنا سرمایہ بنا لیا، اور حصول دنیا کو سب سے بڑا اعزاز سمجھنے والے لوگوں نے خدا طلبی اور علم و معرفت کو اپنے سروں کا تاج بنا لیا، انسانوں کے مزاج بدل گئے، دلوں میں خدائی محبت کا شعلہ بھڑکا، خدا طلبی کا ذوق عام ہوا، اور انسانوں کو ایک نئی دھن لگ گئی۔

حضرت مولانا علی میاں ندوی نے اپنی کتاب "نبی رحمت" میں بعد کے حالات کا بڑا اچھا نقشہ کھینچا ہے:

عرب و عجم، مصر و شام، ترکستان اور ایران، عراق و خراسان، شمالی افریقہ اور اسپین، اور بالآخر ہمارا ملک ہندوستان اور جزائر شرق الہند سب اسی پیمانۂ محبت کے متوالے اور اسی مقصد کے دیوانے نظر

آتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انسانیت صدیوں کی نیند سوتے سوتے بیدار ہوئی، آپ تاریخ و تذکرے کی کتابوں میں پڑھیئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ خدا طلبی اور خداشناسی کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا شہر شہر، قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں بڑی تعداد میں ایسے خدا مست، عالی ہمت، عارف کامل، داعی حق اور خادم خلق، انسان دوست، ایثار پیشہ انسان نظر آتے ہیں، جن پر فرشتے بھی رشک کریں، انہوں نے دلوں کی انگیٹھیاں گرمادیں عشق الٰہی کا شعلہ بھڑکا دیا، علوم وفنون کے دریا بہادیئے، علم ومعرفت کی محبت کی جوت جگادی، اور جہالت و وحشت، ظلم وعداوت سے نفرت پیدا کردی مساوات کا سبق پڑھایا، دکھوں کے مارے اور سماج کے ستائے ہوئے انسانوں کو گلے لگایا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بارش کے قطروں کی طرح ہر چپہ زمین پر ان کا نزول ہوا ہے اور ان کا شمار ناممکن ہے (نبی رحمت ص ۲۳۴)

ترک شراب کی تعلیم:

حضور ﷺ کی تعلیمات کا یہ پہلو بھی بہت اہم ہے کہ آپ نے شراب اور نشہ میں وحشت انسانیت کو اس لعنت سے نجات دلائی جس وقت تمام دنیا شراب پر لٹو تھی، جب بزرگوار پولوس کی ہدایت کے پابند سادہ پانی پینے کو معیوب سمجھتے تھے، جب ایران شراب کے پیالہ کو جام جم سمجھتا تھا، جب ہندوستان دیوتاؤں اور ٹھاکروں کے تقرب کے لئے اس کا استعمال ضروری سمجھتا تھا، جب بہت سے دینی و دنیوی مراسم کی تکمیل شراب کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی، جب عرب کے کسی شاعر و زبان آور کا کلام شراب کی تعریف و توصیف سے خالی نہ ہوتا تھا، شراب گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی، ایسے وقت میں ہمارے حضور ﷺ نے دنیا کو ترک شراب کی تعلیم دی، اور فرمایا کہ شراب اُم الخبائث ہے، تمام گناہوں کی جڑ شراب ہے فتنوں کی آگ کو بھڑکانے والی شراب ہے، شراب میں انسان غلط اور صحیح کی تمیز کھو بیٹھتا ہے، شراب انسان کو اندھا کردیتی ہے، ماں، بیٹی اور بیوی کا امتیاز اس سے اٹھ جاتا ہے، شراب انسان کو مفلوج و معطل کردیتی ہے، اس کے ہاتھ سے عدل وانصاف اور صدق و حق کی میزان گرجاتی ہے، اور جس سوسائٹی میں شراب کا رواج ہوتا ہے وہاں اخلاقی مفاسد کا طاعون پھیل جاتا ہے۔

حضور رحمۃ اللعالمین نے معاشرہ میں اس بھڑکتی ہوئی جہنم کا مشاہدہ فرمایا، اور تڑپ گئے، آپ نے آگے بڑھ کر بڑی محبت کے ساتھ انسانوں کو شراب کے نقصانات سے آگاہ کرایا، اور کہا اگر اچھے انسان بننا چاہتے ہو تو شراب ترک کردو، یہ تمہاری دنیا و آخرت دونوں کو لے ڈوبے گی، تم اپنی ساری دولت اس شراب کے جہنم میں جھونک ڈالوگے اور اپنی عاقبت الگ خراب کروگے، اس لئے لوگو! شراب چھوڑ دو حضور نے ایک عرصہ تک لوگوں کا ذہن بنایا، اور ان کے دل و دماغ میں شراب کے نقصانات کا احساس پیوست کیا، اس کے بعد ترک شراب کا حکم نافذ فرمایا۔

اسلام کے اس حکم کا تیرہ سو برس تک دنیا نے مقابلہ جاری رکھا، بالآخر یورپ کی جنگ عظیم (از ۱۴ تا ۱۹۱۸ء) نے اس حکم کی اصلیت کو منکشف کر دیا۔ شاہ برطانیہ جارج پنجم نے ترک مے نوشی میں قوم کو خود نمونہ بن کر دکھایا، پھر روس وانگلستان و فرانس میں ایک حد تک اس پر عمل کیا گیا۔ امریکہ نے شراب نہ تیار کرنے کا عزم ظاہر کیا، ہندوستان کے بھی کئی حصوں میں اس پر پابندی لگائی گئی۔ یہ انقلاب تھا ہمارے حضور رحمۃ للعالمین کا، کہ سب سے پہلے آپ ہی نے دنیا کو اس لعنت کی طرف توجہ دلائی اور منع شراب کا قانونِ رحمت سارے عالم کے سامنے پیش کیا۔

تعصبات کا خاتمہ:

ہمارے حضور ﷺ نے بیجا تعصبات کا خاتمہ فرمایا، اور اپنی تعلیمات و نوازشات میں بغیر کسی نسلی، لسانی، مذہبی جغرافیائی یا لونی تعصبات کے سارے نوع انسانی کو جگہ دی، کوئی نہیں جس کو محض تعصب کی بنا پر دھکے دے کر یہاں سے نکالا گیا ہو۔

عطائے حقوق کا معاملہ ہو یا مذہبی اور فکری آزادی کا تحفظ شریعت کا موقعہ ہو یا اعتراف حق کا کسی بھی جگہ دیگر اقوام و مذہب کو ہمارے حضور نے نظر انداز نہیں کیا یہ اسلام کا امتیاز ہے کہ وہ اپنی تعلیمات میں بے پناہ وسعت و عمومیت رکھتا ہے، یہاں تنگ نظری اور تعصب نام کی کوئی چیز نہیں ہے، قرآن کی درج ذیل آیات دیکھئے اور غور کیجئے کہ قرآن نے جس وسیع تناظر میں گفتگو کی ہے اس سے عصبیت و تنگ نظری کی بنیادیں کیسے منہدم ہوگئی ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

یایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود (مائدہ۔۱) اے ایمان والو! معاملات کو پورا کرو۔

کوئی قید نہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ جو معاملہ ہو اس کو تو صرف پورا کرنا ہے، اور دوسروں کے ساتھ ہونے والے معاملات کو پورا نہیں کرنا ہے! ہرگز نہیں، نہایت عموم کے ساتھ تمام معاملات کی تکمیل کا حکم دیتا ہے خواہ وہ کسی سے ہوئے ہوں۔

(۱) ولا یجرمنکم شنآن قوم ان صدوکم عن المسجد الحرام ان تعتدوا (مائدہ۔۲) ترجمہ: اس قوم کی نفرت جس نے تم کو کعبہ سے روکا تھا تم کو ادھر کھینچ کر نہ لیجائے کہ تم بھی ان پر زیادتی کرنے لگو۔

اس میں نہایت وضاحت کے ساتھ قومی عصبیت کے بیجا استعمال سے منع فرمایا گیا ہے۔

(۲) وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (مائدہ ۲) ترجمہ: نیکی و خدا ترسی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ و سرکشی میں مدد نہ کرو۔

اس میں بھی اپنے اور غیر کی کوئی قید نہیں لگائی گئی ہے، نیک کام خواہ کوئی کر رہا ہو اس کی مدد کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ درست نہیں کہ محض قومی عصبیت کی بناء پر کسی نیک کام کی مخالفت کی جائے۔

۴) قل آمنت بما انزل الله من لے رسول کہدیجئے اللہ نے جو کتاب میں اتارا میرا اس پر ایمان
تب و امرت لا عدل بینکم اللہ ہے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کیا کروں،
نا و ربکم لنا اعمالنا و لکم ہمارا رب اور تمہارا رب اللہ ہی ہے، ہمارے لئے ہمارے اعمال
مالکم لا حجة بیننا و بینکم اللہ تمہارے لئے تمہارا اعمال ہمارے تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں، اللہ
جمع بیننا و الیہ المصیر (شوریٰ ۱۵) ہی ہم کو اکٹھا کرے گا اور اللہ ہی کی طرف واپسی ہوگی۔
اس آیت میں فکر و عمل کی جس آزادی کا اعلان کیا گیا ہے اس کی نظیر کسی مذہب و قوم میں نہیں پیش کی جا سکتی۔

(۵) یایها الذین امنوا کونوا قوامین اے ایمان والو تم اللہ کے واسطے قائم رہنے والے
للہ شہداء بالقسط ولا یجرمنکم شنان اور انصاف کے ساتھ سچی گواہی دینے والے بن جاؤ اور
قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ہو اقرب کسی قوم کی عداوت تم کو بے انصافی پر آمادہ نہ کرے،
للتقوی و اتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما عدل ہی خدا ترسی سے قریب تر ہے، اللہ سے ڈرو وہ
تعملون (مائدہ ۸) تمہارے اعمال کی خبر رکھتا ہے
اس آیت میں حق و انصاف کے معاملہ میں قومی عصبیت و تنگ نظری کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے۔

(٦) قل یا ھل الکتاب تعالوا الی اے رسول کہدیجئے کہ اے کتاب والو! (یہودیو اور عیسائیو) آؤ
کلمة سواء بیننا و بینکم الانعبد ایک ایسی بات پر سمجھوتہ کرلیں جو ہمارے اور تمہارے لئے مساوی
الا اللہ ولا نشرك به شیئاً و لا یتخذوا ہے کہ اللہ کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کریں، اللہ کا شریک کسی کو نہ
بعضناً اربابا من دون اللہ فان تولوا بنائیں اللہ کے سوا کوئی انسان کسی انسان کو اپنا رب نہ ٹھہرائے اگر
فقولوا شهدوا بانا مسلون لوگ اس پیغام سے انکار کریں تب ان سے کہدو کہ تم گواہ رہنا ہم تو
(آل عمرن ٦٤) ان احکام کے ماننے والے (مسلمان) ہیں

اس آیت میں اختلاف کے باوجود اتفاق کی دعوت دی گئی اور اس کے لئے ایک نقطۂ اتفاق تجویز
گیا ہے، لیکن کوئی محض عناد کی بنا پر اس نقطۂ اتفاق کو بھی نہ مانے تو بھی ان سے تعرض کرنے کو
ہں کہا گیا، بلکہ فکر و خیال کی پوری آزادی دی گئی ہے۔
اسلام کے علاوہ کوئی مذہب نہیں جس نے اتنی رواداری سے کام لیا ہو اور جس نے تعصب کی ایک
ب بنیاد کو اکھاڑ کر پھینک دیا ہو۔

(۷) قرآن نے صاف لفظوں میں مذہبی آزادی کا اعلان کیا۔
لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی (بقرہ ۲۵٦)
دین کے معاملہ میں کسی پر کوئی دباؤ یا سختی نہیں حق و باطل کو تو صاف واضح کر دیا گیا ہے۔

وسیع النظری کی عملی تعلیم:

اورصرف نظریاتی حد تک نہیں بلکہ عملی طور پر بھی حضور کے اقدامات کا اگر جائزہ لیا جائے تو آپ کا ہر اقدام کسی بھی قسم کے تعصب سے بالاتر نظر آئے گا، نبی کریم ﷺ نے مدینہ پہونچ کر جومعاہدہ یہودیوں کے ساتھ کیا تھا اس میں آپ نے یہودیوں کو مسلمانوں کے برابر درجہ دیا، اور اس میں کسی بھی قسم کے تعصب کو راہ نہیں دی۔

جب کہ یہود وہ ذلیل قوم ہے جس نے ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے جال بچھائے، بلکہ اسلام سے قبل ان کی پچھلی تاریخ بھی سازشی سرگرمیوں سے لبریز ہے، اسی بناپر اقوام عالم کے درمیان اس کو کسی دور میں بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا بابل کی بت پرست سلطنت نے ہمیشہ ان کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کیا، مصر کی حکومت نے بھی ان پر رحم نہیں کھایا، اور نہ یہوداہ کی نسل میں پیدا ہونے والے مسیح کی امت نے ان کو کبھی انسان یا آدمی سمجھ کر ان سے کوئی مراعات کی۔

لیکن حضور ﷺ نے یہود کے اس ذلت آمیز پس منظر کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کیا، جو بلاشبہ آپ کے رحمت عالم ہونے کی علامت ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی رواداری:

حضور ﷺ تو خیر پیغمبر رحمت ہی تھے، آپؐ کے غلاموں نے بھی ہمیشہ دوسری اقوام کے ساتھ فراخدلانہ اور غیر متعصبانہ معاملہ کیا۔ جس کی نظیر دوسری قوموں میں مشکل سے ملے گی، اس کی ایک موٹی مثال خود ہندوستان میں لے لیجئے، یہاں اونچی قوموں کے لئے لفظ آریہ نہایت موزوں سمجھا جاتا ہے مگر آریہ ورت کا جورقبہ کتاب "ستیار تھ پرکاش" میں بیان کیا گیا ہے، اس میں مدراس، بنگال اور صوبۂ بہار کے اکثر علاقے شامل نہیں ہیں، اس طرح اس احاطہ بندی نے کروڑوں انسانوں کو شریف قوم یا آریہ کہلانے سے محروم کردیا تھا۔

مگر مسلمانوں کی فیاضی دیکھئے کہ انہوں نے دریائے انڈو (اٹک) کو قدرتی حد قرار دے کر اس طرف رہنے والوں کو ہندو لقب دیا، اس طرح اس ملک کے تمام شہریوں کو شریفانہ مقام ملا۔

اس کے بعد جب مسلمانوں کا یہاں کے لوگوں کے ساتھ معاملہ پڑا تو انہوں نے ان کو لالہ کا خطاب دیا، جس کے معنی بڑا بھائی ہیں، اور یہ لفظ بتک سرحدی صوبہ میں اسی معنی میں خود مسلمانوں کے درمیان مروج ہے۔

اورنگ زیب کو متعصب کہا جاتا ہے، مگر ان کے دربار کے ہندو امراء کی فہرست اکبر کے دربار سے (جس کی رواداری مسلم ہے) زیادہ لمبی ہے، اورنگ زیب نے راجپوتانہ کی ہندو ریاست کو اپنی حکومت میں شامل نہیں کیا، حالاں کہ دکن کی چار اسلامی سلطنتوں کو انہوں نے فتح کرکے جزو سلطنت بنالیا تھا (رحمۃ العالمین ص ۴۷ج ۲)

اس کے علاوہ مسلمانوں نے ہندو راجاؤں کو عظیم الشان خطابات دیئے، مندروں کیلئے بڑی بڑی جاگیریں وقف کیں، ان کو بڑے بڑے عہدوں سے نوازا، کیا کوئی اور قوم اس کی مثال پیش کر سکتی ہے؟ اور کیا کسی دوسری قوم نے بھی مسلمانوں کو اتنا ممنون کرم کیا ہے، جتنا مسلمانوں نے ساری انسانیت کو کیا ہے؟ انصاف پسند تاریخ داں اس کا جواب نفی کے سوا نہیں دے سکتا۔

قوم کے کردار پر مزاج نبوت کا اثر پڑتا ہے، اور ہمارے حضور چوں کہ مساوات انسانی کے سب سے بڑے علمبردار تھے، اس لئے آپ کی امت کا جو ذہن تیار ہوا اس پر اس کا عکس پڑا اسی کے ذیل میں حضورؐ کی اس تعلیم پر بھی ایک نگاہ ڈالتے چلیں جس کو مساوات کا نام دیا جاتا ہے۔

انسانی مساوات کی تعلیم:

(۱۷) حضور اکرم ﷺ کی نگاہ میں دنیا کے سارے انسان برابر تھے سب سے پہلے آپؐ ہی نے مساوات کا اعلان کیا، اور واضح طور پر ان تمام تفریقات کا خاتمہ فرمایا جو انسان نے خود پیدا کر لئے تھے، ارشاد فرمایا:

لافضل لعربیٍ علی عجمی۔ ولا لعجمیٍ علی عربیٍ ولا لابیض علی اسود ولا لاسود علی ابیض الا بالتقویٰ (زادالمعاد ۱۸۵ ج ۲)

عرب کے کسی باشندے کو عجم کے کسی باشندے پر اور عجم کے کسی شخص کو عرب کسی شخص پر گورے رنگ والے کو کالے رنگ والے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں فضیلت کا ذریعہ صرف خدا ترسی ہے۔

مساوات کے عملی نمونے:

عملی طور پر بھی آپ نے انسانیت کو درس دیا کہ سارے انسان بحیثیت انسان برابر ہیں، فرق درجات میں ہو سکتا ہے، حقوق انسانی میں نہیں۔

۱۔ جنگ بدر کے موقعہ پر سواریاں کم تھیں، ایک ایک اونٹ تین تین آدمیوں کے لئے مقرر ہوا تھا، دو سوار ہو جاتے اور ایک شخص پیدل چلتا، اس طرح ہر شخص باری باری پیدل چلتا اور سوار ہوتا تھا نبی کریم ﷺ کی سواری میں حضرت علی مرتضیٰؓ حضرت ابو درداءؓ شریک تھے، جب نبی ﷺ کے پیدل چلنے کی نوبت آتی تو آپ پیدل چلتے وہ دونوں سوار ہوتے۔ (رحمۃ للعالمین ص ۸۷ ج ۳)

جب کہ لشکر میں کوئی مسلمان ایسا نہیں تھا جو حضور پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ نہ رکھتا ہو، پھر وہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ وہ سوار ہوں اور حضور پیدل چلیں۔

مگر رحمۃ للعالمین انسانیت کو مساوات کا درس دینے آئے تھے، اور آپ اپنی رحمت میں دنیا کے سارے انسانوں کو شریک کرنا چاہتے تھے، اس لئے کسی کو مجال انکار نہ تھی اس قسم کے واقعات حیات نبوی میں بہت ملتے ہیں۔

۲۔ حضور نے اپنی سگی پھوپھی زاد بہن کی شادی زید بن حارثہ سے کی جن کو اہل مکہ زرخرید غلام جانتے تھے، اور جن کو بازار عکاظ سے خرید کر لانیوالے حکیم بن حزام (حضرت خدیجہ کے خواہر زادہ) ابھی موجود تھے۔

۳۔ ایک بار حضرت ابوذر غفاریؓ نے اپنے غلام کو او حبشی کے بچے! کہدیا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ بس بس کسی گوری عورت کے بچے کو کسی کالی عورت کے بچے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت تو عمل سے ہے۔

۴۔ ایک دوسرے موقعہ کا ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے غلام کو کسی وجہ سے مارا، حضورؐ بھی اسی وقت پہونچ گئے، آپؐ نے فرمایا ابوذر! جو قدرت تجھے اس غلام پر ہے اس سے زیادہ قدرت اللہ کو تجھ پر ہے، حضرت ابوذر یہ سن کر زمین پر گر پڑے اور غلام سے کہنے لگے کہ اپنا پاؤں جوتے سمیت میرے رخسار پر رکھدے تاکہ میرا یہ غرور نکل جائے۔

۵۔ جنگ بدر میں فوج کی صف بندی ہو رہی تھی، ایک صحابی صف کے برابر نہ تھے نبی ﷺ نے ایک پتلی چھڑی سے جو حضور ﷺ کے ہاتھ میں تھی ان صحابی کے پہلو میں چوکا دیا کہ برابر ہو جاؤ تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ! مجھے تو اس سے تکلیف پہونچی، میں تو بدلہ لوں گا، فرمایا میں موجود ہوں، وہ بولا کہ میرے بدن پر تو کرتہ نہ تھا، حضور ﷺ بھی کرتہ اٹھالیں، حضور ﷺ نے کرتہ اٹھایا تو اس نے بڑھ کر جسد نورانی کو چوم لیا عرض کیا کہ میرا مقصد اس گستاخی سے یہ تھا کہ دنیا سے رخصت ہوتا ہوا اس شرف کو بھی حاصل کرتا جاؤں (رحمۃ اللعالمین ص ۳۸۸ ج ۳)

اس نیک دل صحابی کی نیت خواہ کچھ رہی ہو، مگر مساوات کا عالم یہ ہے کہ فخر موجودات ایک ادنیٰ امتی کو بدلہ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

۶۔ فاطمہ نامی ایک عورت مکہ میں چوری کے جرم میں ماخوذ ہوئی، ان کے لئے حضور نے ہاتھ کاٹ دینے کا فیصلہ فرمایا، لوگوں نے حضرت اسامہؓ کے ذریعہ جو آنحضرت ﷺ کے بہت پیارے تھے سفارش کرائی، نبی ﷺ نے فرمایا کیا تم حدود الٰہی میں سفارش کرتے ہو؟ اگر فاطمہ بنت محمد بھی ایسا کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ ڈالتا۔ (بخاری کتاب الحدود ص ۱۰۰۳ ج ۲)

۷۔ اسود ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ وہ ایک بار آں حضرت ﷺ کے سامنے رنگین کپڑا پہن کر گئے، حضور نے خط خط فرمایا، اور چھڑی سے ان کے شکم میں ٹھوکا بھی دیا، میں نے کہا یا رسول اللہ! میں تو قصاص لوں گا، حضور نے فوراً اپنا شکم کھول کر میرے سامنے کر دیا کہ قصاص لے لو۔ (شفاء قاضی عیاض ص ۲۱۱)

مساوات کے اس سے زیادہ شاندار نمونے کوئی قوم اور تہذیب پیش نہیں کر سکتی۔

(۱۸) مشفقانہ ہدایات:

حضور ﷺ کو انسانوں سے کس درجہ محبت تھی کہ آپ ان کی ذرا ذرا سی تکلیف کا خیال فرماتے اور ان کو مناسب ہدایات دیتے تھے، مثلاً آپ رات کو بھوکا سونے سے منع فرماتے تھے اور ایسا کرنے کو بڑھاپے کا سبب فرماتے تھے، اسی طرح کھانا کھاتے ہی سو جانے سے بھی منع فرماتے تھے (زادالمعاد ص ۸۷ / ۸۷ ج ۲)

کم کھانے کی ترغیب دیتے تھے، فرماتے تھے کہ معدہ کا ایک تہائی حصہ کھانے کیلئے ایک تہائی حصہ پانی کے لئے، اور ایک تہائی حصہ خود معدہ کے لئے چھوڑ دینا چاہئے (زادالمعاد / ۷ / ۲)

امراض کے سلسلہ میں تندرست لوگوں کو محتاط رہنے کی تاکید فرماتے تھے (زادالمعاد ص ۵۰ ج ۲)

بیمار کو طبیب حاذق سے علاج کرانے کا حکم فرماتے (نیم حکیم سے نہیں) (زادالمعاد ص ۴۶ / ج ۲)

اور پرہیز کرنے کا بھی حکم دیتے تھے (زادالمعاد ص ۳۵ / ۲) آپ نے نادان طبیب کو علاج کرنے سے منع فرمایا اور اسے مریض کے نقصان کا ذمہ دار قرار دیا (زادالمعاد ص ۷۴ / ۲)

یہ تمام ہدایات حضور کی رحمۃ اللعالمینی کا مظہر ہیں، انسانیت کا آپ کے دل میں کتنا درد تھا کہ آپ نے انسانوں کو ہر ایسی چیز پر متنبہ فرمایا جس سے انسان کسی خطرہ سے دوچار ہو سکتا تھا، ہزاروں ہزار صلاۃ و سلام نازل ہوں رحمۃ للعالمین پر اس طرح کی بے شمار تعلیمات و احسانات ہیں جن سے حضور کا انسانیت کے ساتھ بے پناہ دود وغم اور ساری دنیا کے فلاح و بہبود کی فکر و تڑپ ٹپکتی ہے، مذکورہ تعلیمات و اصلاحات میں سے کسی بھی تعلیم و اصلاح میں کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا گیا ہے، یہ تمام تعلیمات و ہدایت ساری انسانیت کے لئے ہیں، امیر و غریب، شاہ و گدا رنگ و نسل، خطہ و قوم کی کوئی تمیز نہیں ہے، ساری انسانیت کے لئے ہیں، امیر و غیر ب، شاہ و گدا رنگ و نسل خطہ و قوم کی کوئی تمیز نہیں ہے، آپ کا پیغام سارے عالم کے انسانوں کے لئے ہے، جو چاہے ان کو قبول کر لے اور کامیاب ہو جائے اور جو چاہے رد کر کے ناکام ہو جائے حضور کے علاوہ دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے اپنے کاموں میں اس طرح ساری دنیا کو پیش نظر رکھا ہو، اور ساری انسانیت کو جس نے اپنے درس و پیغام میں مخاطب بنایا ہو، اس لئے یہ بات عین الیقین کے درجہ میں ثابت ہو جاتی ہے کہ ساری دنیا میں رحمۃ للعالمین کا مقام ہمارے حضور کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے۔ ———

اسلام میں غلامی کی حقیقت (دوسری قسط)

محمد فرقان قاسمی علیگ سلطانپوری

غلامی کا صحیح تاریخی پسِ منظر:

جب اسلام آیا تو دنیا بھر میں غلامی کا دور دورہ تھا اور یہ اپنے وقت کے معاشرتی اور معاشی نظام کا ناگزیر جزو بن چکی تھی اس صورت کو بدلنے کیلئے ضروری تھا کہ عرصۂ دراز تک ایک خاص تدریجی انداز میں یہ کام کیا جائے۔ یہی تدریجی اور طویل المیعاد پالیسی ہمیں دوسرے اسلامی احکام کے نفاذ میں بھی نظر آتی ہے مثال کے طور پر شراب کی حرمت کا اعلان اچانک اور یک بیک نہیں کیا گیا بلکہ اس سے پہلے سالہا سال تک اس کے لئے ذہنوں کو تیار کیا گیا باوجودیکہ شراب نوشی ایک شخصی برائی ہے اور عہدِ جاہلیت میں عربوں کے اندر پہلے سے کچھ ایسے موجود تھے جو شراب نوشی کو انسانی عزو شرف کے منافی سمجھ کر اس سے اجتناب کرتے تھے لیکن غلامی کے مسئلے میں اُن لوگوں کا نظریہ بھی اس سے قطعی مختلف تھا وہ غلامی کو غلط خیال نہیں کرتے تھے۔ وقت کے معاشرتی ڈھانچے اور ابنائے زمانہ کے مزاج اور نفسیات میں غلامی کی جڑیں گہری پیوست تھیں کیونکہ شخصی، سماجی، معاشی اور اقتصادی بے شمار حقیقتیں، مصلحتیں اور ضرورتیں غلامی سے جڑی ہوئی تھیں اس لئے بیک وقت اسے ختم کر دینے سے ایک ایسا خلا پیدا ہو جاتا جو بے شمار مفاسد کا پیش خیمہ ہوتا لہٰذا اسلام نے اس کے متعلق ایسی دوررس تدبیریں اختیار کیں جس سے غلامی کے مضر اثرات بھی زائل ہوگئے اور سوسائٹی میں کوئی خلا واقع نہیں ہوا۔

اسلام کا طریقۂ کار:

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام تمام بنی نوع انسان کا مذہب ہے اور ہر زمانے، ہر دور کے انسان اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر پاکیزہ زندگی کے تمام اعلیٰ اور صحت مند اصولوں سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں تو ہمارا منشاء یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اسلام کوئی ایسا جامد نظام حیات ہے جس نے ہمیشہ کیلئے انسانی زندگی [illegible] ہرگز نہیں، کیونکہ اس طرح کی

تفصیلی ہدایات اسلام نے صرف ان بنیادی انسانی مسائل کے بارے میں دی ہیں جو تاریخ کے نشیب و فراز سے متاثر ہوئے بغیر ہر دور میں یکساں رہتے ہیں۔ باقی رہے تغیر پذیر حالات، تو اسلام ان کے متعلق چند اصولی ہدایات دے کر انہیں چھوڑ دیتا ہے تاکہ اُن اصولوں کی روشنی میں زندگی کا ارتقاء جاری رہے ٹھیک یہی طریقہ اسلام نے غلامی کے بارے میں اختیار کیا۔ اُس نے غلاموں کی آزادی کے لئے نہ صرف ایک ٹھوس بنیاد العتق یا مکاتبت کی صورت میں فراہم کر دی بلکہ اس اُلجھے ہوئے قدیم مسئلے کو آئندہ ہمیشہ ہمیش کے لئے سلجھانے کے خاطر ایک مستقل اور پائیدار حل کی نشاندہی بھی کر دی۔

انسانی فطرت اور اسلام :

اسلام انسانی فطرت کو بدلنے نہیں آیا بلکہ اس کی تہذیب کے لئے آیا ہے تاکہ اپنی تمام حدود اور پابندیوں کے باوجود کسی خارجی جبر اور دباؤ کے بغیر تکمیل انسانیت کے اعلیٰ ترین منصب کو پا سکے۔ چنانچہ جہاں تک افراد کی سیرتوں میں انقلاب لانے کا تعلق ہے اسلام کو اس میں معجز نما کامیابی حاصل ہوئی ہے اور بحیثیت مجموعی انسانی معاشرے کی تہذیب میں بھی شاندار کامیابی نے اس کے قدم چومے ایسی کامیابی کہ جس کی نظیر تاریخ انسانی میں کہیں اور تلاش کرنا بے سود ہے مگر ان تمام عظیم الشان کامرانیوں کے باوجود اسلام کا یہ منشاء کبھی نہیں رہا کہ وہ انسانوں کی ماہیت کو تبدیل کرے اور انہیں مثالی تکمیل کے ایک ایسے درجہ تک پہونچا دے جہاں تک نوعِ انسانی کے لئے عملاً پہونچنا محال ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو خدا تعالیٰ زمین پر انسانوں کو نہیں بلکہ فرشتوں کو پیدا کرتا اور ان کو ایسے احکام و فرامین دیتا جن پر صرف فرشتے ہی عمل پیرا ہو سکتے ہیں جن کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے :

"لَا یُعصُونَ اللّٰہَ مَا اَمَرَ ھُم وَ یَفعلُونَ مَا یُؤ مرونَ" ترجمہ : انہیں جو حکم دیا جاتا ہے اس میں وہ خدا کی (ذرا بھی) نافرمانی نہیں کرتے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو وہ فوراً بجا لاتے ہیں (سورت ۵ آیت ۶۶)

مگر خداوند تعالیٰ کا منشا انسانوں کو فرشتے بنانا نہیں بلکہ اچھے انسان بنانا ہے کیونکہ اُس نے زمین پر انسانوں کو پیدا کیا ہے اور وہ انسانوں کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہے اور اس کو یہ بھی خوب معلوم ہے کہ ان کی فطری صلاحیتوں کی نشو و نماء کے لئے کس قدر عرصہ درکار ہے تاکہ وہ اس کے عطا کردہ احکام و فرامین کو سمجھ کر ان پر کماحقہ عمل پیرا ہو سکیں بہر حال اسلام کی عظمت کے ثبوت کے لئے یہی بات کافی ہے کہ تاریخ میں اس نے پہلی بار غلامی کے خلاف آواز بلند کی اور ایک ایسی تحریک آزادی برپا کر دی کہ جس کی مثال باقی دنیا میں سات صدی بعد تک بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ سات سو سال بعد جا کر کہیں دنیا اس قابل ہوئی کہ اس تحریک آزادی کو قبول کر کے اپنے یہاں جاری اور

ساری کرسکے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ جدید تحریک آزادی سے بہت پہلے اسلام جزیرہ نمائے عرب میں غلامی کا خاتمہ کرچکا تھا اگر غلامی کا ایک اور سبب جس کی وجہ سے عرصہ دراز تک یہ لعنت بن کر دنیا پر مسلط رہی، موجود نہ ہوتا تو اسلام جزیزہ نمائے عرب کے طرح اپنے زیر اثر باقی تمام علاقوں سے بھی غلامی کا قطعی استیصال کردیتا مگر اس نئے سبب کی موجودگی میں اسلام کیلئے عملاً ایسا کرنا ممکن نہ رہا کیونکہ اس کا تعلق جتنا مسلمانوں سے تھا اتنا ہی ان کے مخالفین سے بھی تھا جن پر اسلام کی کوئی گرفت یا اثر نہیں تھا جس چیز کی وجہ سے غلامی کا کلی استیصال ممکن نہ ہوا وہ جنگوں کی موجودگی اور فراوانی تھی۔ یہی جنگیں اس دور میں غلامی کا سب سے بڑا سر چشمہ تھیں۔ اس باب میں ذرا آگے چل کر ہم اس موضوع پر قدرے تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

آزادی کی لازمی شرط:

غلامی کے مسئلے پر گفتگو کرتے وقت ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ آزادی کہیں سے خیرات کے طور پر نہیں ملتی بلکہ اسکو اپنے دست وبازو کی مدد سے حاصل کیا جاتا ہے چنانچہ کوئی قانون بنادینے فرمان جاری کردینے سے صدیوں کے غلام خود بخود آزاد نہیں ہوجاتے امریکی قوم نے اس سلسلے میں جو تجزیہ کیا ہے وہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ امریکی صدر ابراہام لنکن نے بیک جنبش قم غلاموں کی آزادی کا فرمان جاری کردیا تو کیا اِس سے صدیوں کے غلام فی الحقیقت آزاد ہوگئے تھے؟ نہیں کیونکہ ذہنی وفکری طور پر وہ آزادی کے لئے بالکل تیار نہ تھے چنانچہ اُس وقت اِس قسم کے مناظر بھی دیکھنے میں آئے کہ قانوناً آزاد ہوجانے کے بعد بھی غلام اپنے سابق آقاؤں کے پاس جاتے اور ان سے التجائیں کرتے کہ وہ انہیں اپنے گھروں سے نہ نکالیں بلکہ حسبِ سابق غلام بناکر انہیں اپنے یہاں رہنے دیں کیوں کہ آزاد ہوجانے کے بعد وہ اپنے کو بے یارومددگار سمجھ رہے تھے جبکہ اسلام نے آزادی کے وِلاء کے ذریعہ اس کا حل نکالا۔

غلامی کی نفسیات:

انسانی نفسیات کی روشنی میں اس واقعہ کا جائزہ لیا جائے تو بادی النظر میں عجیب وغریب نظر آنے کے باوجود کچھ زیادہ تعجب خیز معلوم نہ ہوگا ہر انسان کی زندگی چند عادات کی کرم فرمائی کی دستان ہوتی ہے وہ جن حالات میں زندگی بسر کرتا ہے وہ اس کے خیالات، جذبات بلکہ اس کے پورے نفسیاتی مزاج کو متاثر کرتے ہیں۔ مادّہ پرستوں کے نزدیک تو فکر انسانی مادی حالات کی پیداوار ہوتی ہے مگر

اِن لوگوں کا یہ دعویٰ محض ایک مغالطہ ہے حقیقت یہ ہے کہ مادی حالات صرف اسی صورت میں بروئے کار آتے ہیں جبکہ زندگی میں ان کے لئے ایک نفسیاتی اساس پہلے سے موجود ہو۔ افکار و خیالات پر مادی حالات اور واقعات کی اثراندازی تو مسلم امر ہے مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ افکار و نظریات خالص مادی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں یہ حقیقت ہے غلام کی نفسیاتی تربیت اور مزاج آزاد انسان کی ذہنی و عملی کیفیت سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ لیکن عہدِ قدیم کے لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ آزاد اور غلام انسان کا یہ ذہنی اور جذباتی فرق کسی بنیادی انسانی اور نوعی فرق و اختلاف کی پیداوار ہے بلکہ اس اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ دائمی غلامی کے بندھن میں گرفتار رہنے کے سبب غلام کی نفسیاتی زندگی کا ایک مخصوص مزاج بن جاتا ہے جس میں فرمانبرداری کا جذبہ تو کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے مگر یہ جذبہ آزادی اور ذمہ داری کے احساس سے بالکل خالی ہوتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ آزاد معاشرے کے ذمہ دار فرد کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں کماحقہ بجالا سکے۔ اپنے طور پر غلام نہ آزادانہ سوچ سکتا ہے اور نہ محض اپنے بل پر کسی قسم کا کوئی اور اقدام ہی کر سکتا ہے بلکہ آزادی سے بہرہ ور ہونے کے بعد آزاد انسان جن ذمہ داریوں سے دوچار ہوتا ہے اُن سے عہدہ بر آ ہونے کی صلاحیت ہی وہ سرے سے کھو بیٹھتا ہے اور ذمہ داریوں سے جان چھڑا کر بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔

غلام کی زندگی:

ایک غلام اپنا کام صرف اسی وقت تک بخوبی انجام دے سکتا ہے جب تک اس کو سوچنا نہ پڑے بلکہ اس کا کام تو محض اپنے آقا کے احکام و فرامین کی اطاعت تک محدود ہوتا ہے چنانچہ اگر کبھی اُس پر بطور خود فیصلہ کرنے کی ذمہ داری آن پڑتی ہے تو اس کی حالت دگرگوں ہونے لگتی ہے اس کی قوتِ فیصلہ ماؤف ہو جاتی ہے اور اپنی زندگی کے انتہائی معمولی معاملات میں بھی کوئی فیصلہ کرنے یا اس کے نتائج سے مردانہ وار آنکھیں چار کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا۔ اس دُون ہمتی کا سبب، اس کی کوئی ذہنی یا جسمانی کمزوری نہیں ہوتی بلکہ نفسیات کی زبان میں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے افعال کے نتائج کا سامنا کرنے کی اخلاقی جرأت سے محروم ہوتا ہے۔ وہ موہوم خطرات اور مشکلات سے خوف زدہ رہتا ہے اور خواہ مخواہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اِن مشکلات پر قابو پانا اس کے بس سے باہر ہے۔ یہ سوچ کر وہ اپنی ذات کے خول میں سمٹ جاتا ہے اور بالآخر اپنی جان بچانے کی کوشش میں کارزارِ حیات سے راہِ فرار اختیار کر لیتا ہے۔

مشرق میں غلامی کے آثار:

ماضی قریب میں برصغیر اور عرب ممالک نیز دوسرے مشرقی ممالک کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں

اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی استعمار کی لائی ہوئی ذہنی اور جسانی غلامی نے اہل مشرق کی زندگیوں کو کس قدر بے اثر اور بے وقعت بنادیا تھا۔ مغربی سامراجیوں نے اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مشرق میں ذہنی اور جسمانی غلامی کا جال پھیلا دیا اور جب وہ یہاں سے جانے لگے تو مشرق کو اپنے مضبوط بندھنوں میں کس گئے۔

چنانچہ یہی وہ ذہنی غلامی ہے جس کا اظہار مغرب زدہ لوگوں کی گفتگو اور تقریروں سے ہوتا ہے۔ جب وہ بعض قوانین کو بے کار اور فرسودہ قرار دیکر یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ دور میں ان کا نفاذ مشکل بلکہ ناممکن ہے تو دراصل اسکی تہہ میں وہی غلامانہ سوچ وذہنیت کار فرما ہوتی ہے جسکی بدولت ایک غلام اپنی آزاد مرضی سے فیصلہ کرنے اور ان کے نتائج کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی انگریز یا امریکی ماہر قانون کسی گھناؤنے سے گھناؤنے قانون کی بھی حمایت کردے تو یہ مغرب زدہ لوگ بخوشی اسکے نفاذ پر تیار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح وہ اپنی آزاد مرضی سے آزاد فیصلے کرنے اور اپنے بل بوتے پر انکے نفاذ کی ذمہ داری قبول کرنے سے بچ جاتے ہیں مشرقی ممالک میں اسوقت جو دفتری نظام ملتا ہے وہ بھی اسی عہد غلامی کی یادگار ہے۔ ان دفاتر کا بے جان طریقہ کار اور اسکے مرعوب و ہیبت زدہ عمال کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مغرب کی غلامی کا منحوس سایہ اب بھی کس طرح اہل مشرق کی روحوں پر مسلط ہے۔ ان عمال حکومت میں سے کوئی بھی اپنی آزاد مرضی سے آزادانہ فیصلے کرنے کا اہل نظر نہیں آتا۔ اسکو جب تک اپنے حکام بالا سے واضح ہدایات اور احکام نہ ملیں وہ بطور خود کوئی ذمہ دارانہ فیصلہ کر ہی نہیں سکتا۔ یہی حال اسکے حکام بالا کا بھی ہے جو اپنے ماتحت عملہ کی طرح قوت فیصلہ سے محروم ہوتا ہے اور اپنے محکمے کے وزیر کے احکام پر ہی انکے سارے کاروبار کا دارومدار ہے اور وزیر صاحب کے راہنما امریکہ اور یورپ کے ممالک ہیں۔ اگر ان لوگوں کی ذہنیت غلامانہ نہ ہوتی تو یہ لوگ یوں بے جان مشینیں بن کر نہ رہ جاتے۔ اور نہ یوں بے بس ہو کر دوسروں کے محتاج ہوتے کیونکہ انکی مخصوص غلامانہ ذہنیت دوسروں کے احکام بے چوں وچرا بجالانے کے لئے تو بہوت خوب اور اچھی ہے مگر آزاد فیصلوں کی صلاحیت کے لحاظ سے قطعاً بے کار ہے ایسی ذہنیت کی موجودگی میں آزادی کے تقاضے بہر حال پورے نہیں ہو سکتے اور نہ آزادانہ زندگی گذاری جاسکتی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ بظاہر آزاد دکھائی دیتے ہیں مگر درحقیقت انکی حالت غلاموں سے کچھ بھی بہتر نہیں ہے۔

غلامی کی اصل وجہ :

واقعہ یہ ہے کہ یہی غلامانہ ذہنیت ایک غلام کو، غلام بناتی ہے۔ یہ شروع میں تو خارجی حالات کے زیر اثر ابھرتی ہے مگر جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے اسکی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے اور بالآخر یہ اپنی مستقل اور آزاد حیثیت پیدا کر لیتی ہے۔ جس طرح کسی درخت کی شاخ جب کچھ زمین پر پڑی رہتی ہے تو آہستہ آہستہ زمین مین وہ اپنی جڑیں پیوست کر دیتی ہے اور اس کا علیحدہ وجود قائم ہو جاتا ہے یہی حال انسانی ذہنیت کا بھی ہے۔

اصلاح کی صحیح تدبیر :

اس طرح کی غلامانہ ذہنیت صرف غلامی کے خلاف قانون بنا دینے یا احکام کے جاری کر دینے سے ختم نہیں کی جا سکتی ہے۔ اسکے خاتمے کے لئے اندرونی انقلاب اور نئے حالات بروئے کار لانے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ غلام کی نفسیاتی اور مزاجی کیفیت کو ایک بالکل نیا رخ دیا جا سکے اور اسکی شخصیت کے ان پہلوؤں کو بالخصوص اجاگر کیا جا سکے جو آزاد انسان کی حیثیت سے زندگی مین اپنی ذمہ داریاں بجا لانے کیلئے بہر حال ہر فرد بشر کیلئے ناگزیر اور ضروری ہیں۔

اسلام کا تدریجی طریقہ کار :

چنانچہ اسلام نے ٹھیک ان ہی خطوط و نشانات پر کام کیا۔ ابتداء میں اس غلاموں سے منصفانہ ،اور شریفانہ اور فیاضانہ برتاؤ کرنے کی تعلیم دی۔ یہ غلاموں کے پراگندہ نفسیاتی توازن کو بحال کرنے اور ان میں انسانی عظمت و وقار کا احساس بیدار کرنے کا بہترین نسخہ تھا۔ کیونکہ انسان جب ایک بار آزادی اور انسانی عظمت کو پہچان لیتا ہے تو پھر وہ اسکے تقاضوں اور ذمہ داریوں سے نہیں گھبراتا۔ اور نہ آزاد امریکی غلاموں کے مانند دوبارہ غلامی کی آغوش میں گوشۂ عافیت ڈھونڈتا ہے۔

جہاں تک غلاموں سے حسن سلوک کرتے اور انکے انسانی مقام و مرتبہ کو بحال کرنے کا تعلق ہے۔ اس بارے میں اسلام کی تاریخ انتہائی حیران کن اور قابل تعریف مثالوں سے لبریز نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم اوپر بعض قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کا حوالہ دے چکے ہیں۔ یہاں ہم مختصر طور پر صدر اسلام کی عملی زندگی سے کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں۔

غلام، آقاؤں کے بھائی بنا دیئے گئے :

مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد نبی ﷺ نے مسلمانوں میں جو بھائی چارہ قائم کیا اس میں آپؐ نے عرب سرداروں کو آزاد کردہ غلاموں کا بھائی بنا دیا، حضرت بلالؓ بن رباح کو آپؐ نے خالد بن رویحہ الخثعمی کا، حضورؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہؓ کو حضرت حمزہؓ کا اور حضرت خارجہؓ بن زید کو حضرت

ابو بکرؓ کا بھائی بنادیا۔ اخوت کا یہ رشتہ اپنے اثرات کے لحاظ سے حقیقی خونی رشتہ سے کسی طرح کم نہ تھا۔

غلاموں سے شادی بیاہ:

مگر اسلام نے صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کو اپنے غلام حضرت زیدؓ کے حبالہ عقد میں دیدیا۔ لیکن چونکہ شادی کا نہایت گہرا تعلق انسان بالخصوص عورت کے لطیف احساسات اور جذبات سے ہے اس لئے حضور ﷺ کے ارشاد پر حضرت زینبؓ نے حضرت زیدؓ سے اپنے نکاح کو قبول تو کر لیا مگر میاں بیوی میں ذہنی موافقت پیدا نہ ہو سکی کیونکہ حضرت زیدؓ دنیاوی دولت اور مجد و شرف کے اس مقام سے محروم تھے جو حضرت زینبؓ کے خاندان کا طرۂ امتیاز تھا۔ مگر حضورؐ کے پیش نظر جو مقصد تھا وہ بہر حال پورا ہو گیا۔ اپنے خاندان کی ایک لڑکی غلام کے نکاح میں دیکر در اصل آپؐ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ظالم انسانوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کو غلامی کی جس قعر مذلت میں ڈال رکھا ہے اس سے نکل کر ایک غلام بھی عزت و تکریم کے اس بلند مقام پر فائز ہو سکتا ہے جو اس زمانے میں صرف قریشی سرداروں کو حاصل تھا۔

اسلامی لشکر کی قیادت:

اسلام نے غلاموں کو فوجی قیادت اور قومی سیادت کے مناصب عطا کئے ہیں چنانچہ جب حضور ﷺ نے انصار و مہاجرین کے برگزیدہ اصحاب پر مشتمل ایک فوج بنائی تو اسکا قائد اپنے غلام حضرت زیدؓ کو بنایا پھر زیدؓ کے بعد اسی جیسے ایک لشکر کی قیادت انکے صاحبزادے حضرت اسامہؓ کو سونپ دی حالانکہ اس فوج میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے چیدہ اور مسلمہ سرداران عرب بھی موجود تھے جو آپ کی زندگی میں آپؐ کے قابل اعتماد مشیر کار تھے اور آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشین بھی بنے اسطرح آپؐ نے غلاموں کو آزادوں کے ہم پلہ ہی نہیں قرار دیا بلکہ آزاد انسانوں کی فوجی قیادت کے مناصب بھی غلاموں کو سونپ دیئے اس معاملے میں حضورؐ نے اس حد تک تاکید کی کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "سنو اور اپنے امراء کی اطاعت کرو خواہ تمہارا سردار کسی ایسے حبشی غلام کو بنادیا جائے کہ جسکا سر منقی جیسا ہو اسکی اطاعت کرو جب تک وہ تمہارے درمیان خدا کے احکام کا نفاذ کرتا رہے" بالفاظ دیگر اسلام نے ایک غلام کے اس حق کو بھی تسلیم کیا کہ وہ اسلامی مملکت میں اعلیٰ ترین منصب پر بھی فائز ہو سکتا ہے حضرت عمرؓ کو جب اپنا جانشین منتخب کرنیکی ضرورت پیش آئی تو آپؐ نے فرمایا کہ "اگر ابو حذیفہ کے غلام سالم بقید حیات ہوتے تو میں انکو خلیفہ مقرر کر دیتا" یہ در اصل پیغمبر اسلام ﷺ کی روایت ہی

کی توسیع و توضیح تھی جو صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں یوں بصورت عمل جلوہ گر ملتی ہے۔

حضرت بلالؓ اور حضرت عمرؓ:

حضرت عمرؓ کی زندگی کا مطالعہ ایک اور پہلو سے بھی اسلامی معاشرے میں غلاموں کے بلند مقام پر روشنی ڈالتا ہے۔ "فئے" کے مسئلے میں ایک آزاد کردہ غلام حضرت بلالؓ بن رباح نے حضرت عمرؓ کی رائے سے شدید اختلاف کا اظہار کیا جبکہ اس وقت حضرت عمرؓ خلیفہ تھے۔ وہ جب حضرت بلالؓ کو مطمئن کرنے میں کسی طرح کامیاب نہ ہوئے تو انہوں نے خدا سے دعا کی۔ "اللھم اکفنی بلالاً واصحابہ" (اے اللہ بلال اور ان کے ساتھیوں سے میری کفایت فرما) خلیفہ وقت کا اپنی رعایا فرد ایک سابق غلام کی مخالفت کے جواب میں یہ عمل کتنا معنیٰ اور حقیقت افروز ہے۔

غلاموں سے حُسنِ سُلوک کی اصل وجہ:

یہ اُن بے شمار مثالوں میں سے محض چند مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے پہلے مرحلے میں غلاموں کو روحانی اور ذہنی طور پر آزادی سے بہرہ ور کرنے کیلئے اُن سے کتنا فیاضانہ برتاؤ کیا۔ جس کے نتیجے میں غلاموں میں اپنے انسانی مقام کا شعور بیدار ہوا اور ان کے دلوں میں اپنی کھوئی ہوئی آزادی پالینے کی خواہشیں انگڑایاں لینے لگیں۔ اسلام نے ایک طرف تو مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ رضاکارانہ طور پر اپنے غلاموں کو آزاد کریں اور دوسری طرف غلاموں کی روحانی اور ذہنی سطح کو بلند کرنے پر پوری پوری توجہ دی اور انہیں اس بات کی ضمانت دی اگر وہ چاہیں تو اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو اور اُن تمام حقوق و مراعات کو حاصل کر سکتے ہیں جو اُس وقت تک صرف اُن کے آقاؤں کو حاصل تھیں۔ غلاموں کی اس روحانی اور ذہنی تربیت کا مقصود اُن میں آزادی کی خواہش بیدار کرنا اور انہیں آزادی کی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے آمادہ اور تیار کرنا تھا۔ چنانچہ جب یہ لوگ آزادی کے اہل بن گئے تو اسلام نے آگے بڑھ کر اُن کو عملاً بھی آزاد کر دیا۔ کیونکہ اب وہ آزادی کے مستحق بھی تھے اور اس کی حفاظت کی صلاحیت بھی اُن میں پیدا ہو چکی تھی۔

مغرب پر اسلام کی برتری:

جو نظامِ حیات انسانوں میں آزادی کا جذبہ بیدار کرتا ہے، ان کے جذبۂ آزادی کو زبان دیتا ہے، اس کے عملی اظہار کے لئے تمام ضروری ذرائع اور تدابیر اختیار کرتا ہے اور پھر جونہی وہ اس کے لئے تقاضا کرتے ہیں وہ ان کی آزادی انہیں لوٹا دیتا ہے اور وہ نظامِ زیست جو غلاموں کو ہمیشہ ہمیش کیلئے غلامی کے بندھن

میں بند ھا دیکھنا چاہتا ہے اور ان کو اتنا کمزور و بے بس بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے۔ جب تک خارجی دنیا میں چند در چند اقتصادی اور معاشرتی انقلابات رونما نہ ہوں اور لاکھوں انسان قتل وغارت گری کا لقمہ نہ بن جائیں ان دونوں نظاموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

غلامی کے انسداد کے سلسلے میں اسلام کو دوسرے نظاموں کے مقابلے میں جو برتری حاصل ہے اس کے مختلف پہلو ہیں۔ اسلام کا مقصود غلاموں کو ظاہری وباطنی ہر لحاظ سے آزاد کرنا تھا ابراہام لنکن کی طرح اسلام نے غلاموں کو ذہنی طور پر آزادی کے لئے تیار کئے بغیر محض نیک خواہشات پر تکیہ کر کے ایک فرمان کے اجراء ہی کو کافی نہیں سمجھا۔ اسلام کا یہ طریقہ کار ظاہر کرتا ہے کہ اس کو انسانی نفسیات کا کتنا گہرا ادراک حاصل ہے اور اُس نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے کس طرح تمام ممکن ذرائع و وسائل سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اسلام نے غلاموں کو بس آزادی نہیں کیا بلکہ تعلیم وتربیت کے ذریعہ انہیں اس قابل بھی بنادیا کہ وہ آزادی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکیں اور اس کی حفاظت کر سکیں۔ اسلام کی اس تعلیم نے معاشرے میں تعاون محبت اور خیر سگالی کی روح دوڑادی۔ یورپ کی طرح نہیں کہ جب تک اپنے انسانی حقوق کی خاطر وہاں کے غلام مرنے مارنے پر تل نہیں گئے انہیں آزادی حاصل نہ ہو سکی۔ اسلام نے غلامی کا انسداد کسی مجبوری کے تحت نہیں کیا۔ یورپ میں شدید نفرت انگیز طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں غلام آزادی سے روشناس ہوئے۔ مگر اسلام نے غلامی کے سدباب کے لئے بطور خود اقدام کیا اور اس بات کا انتظار نہیں کیا کہ طبقاتی چپقلیش جنم لیں، تصادم برپا ہوں اور تلخیاں پیدا ہوں تب کہیں جاکر غلاموں کو آزادی نصیب ہو، یورپ میں طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں جنم لینے والی تلخی اور نفرت نے انسانیت کے روحانی سوتے خشک کر دیئے جس کے نتیجے میں انسان کے روحانی ارتقاء کو زبردست نقصان پہونچا ہے۔ مضمون کے آخر میں ہم چاہتے ہیں کہ اس اہم معاشرتی بنیاد کا بھی جائزہ لے لیں جو غلاموں کی روحانی تعلیم وتربیت کے بعد اسلام نے انکی آزادی کی تکمیل کیلئے فراہم کیا۔

جنگیں اور غلامی:

قبل ازیں ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ اسلام نے غلامی کے تمام اسباب کا سوائے ایک سبب یعنی جنگ کے، کامیابی کیساتھ خاتمہ کر دیا تھا۔ کیونکہ جنگ کا خاتمہ عہد اسلام کیلئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اسلام کی اس تحریک آزادی کے بعد جنگ ہی غلامی کا واحد بڑا ذریعہ رہ گیا تھا۔ اب ہم ذرا تفصیل سے اس باقی رہ گئے سبب یعنی جنگ پر گفتگو کریں گے۔

ایک قدیم روایت

قدیم ترین زمانے سے دنیا کی اقوام میں یہ طریقہ رائج تھا کہ میدان جنگ میں جس فوج کو شکست ہو جاتی تھی اسکے تمام افراد کو بلا استثناء یا تو تہہ تیغ کر دیا جاتا تھا یا پھر انہیں غلام بنالیا جاتا تھا چنانچہ ۵۹۹ء میں رومی شہنشاہ ماریوس (marius) نے لاکھوں قیدیوں کو جنگ میں پکڑا تھا مگر اس نے رہا کرنے ان کے بدلے میں فدیہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان سب کی گردنیں اڑادیں مرور ایام کے ساتھ جنگ کی یہ روایت زمانہ قدیم کے انسان کی زندگی کی ایک ٹھوس حقیقت اور ایک ناگزیر ضرورت بن گئی تھی۔

مسلمان جنگی قیدی:

اس معاشرتی پس منظر میں اسلام کا ظہور ہوا کہ اسکو مجبوراً اپنے مخالفین کے خلاف کئی ایک لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ جو مسلمان ان جنگوں میں گرفتار ہوتے تھے کفار انہیں غلام بنالیتے تھے اور انکے سارے حقوق سلب کر لیتے تھے اور انکو ان تمام مظالم و مصائب کا نشانہ بنایا جاتا تھا جو اس دور میں غلاموں کیلئے مقدر سمجھے جاتے تھے۔ عورت کی عصمت و آبرو کو بھی کوئی احترام حاصل نہ تھا۔ چنانچہ قیدی عورتوں کی عصمت دری میں فاتحین کو کوئی باک نہ ہوتا تھا۔ اور بعض اوقات تو باپ، بیٹے اور بہت سے احباب مل کر ایک ہی عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے تھے۔ وہ انکی مشترک داشتہ بنتی تھی۔ اس سلسلے میں نہ نسائیت کا احترام انہیں مانع ہوتا تھا اور نہ عورت کا کنوارا پن یا بیاہا ہونا ہی ان کا ہاتھ پکڑ سکتا تھا۔ جو بچے جنگوں میں پکڑے جاتے ان کا بھی یہی حشر ہوتا تھا۔

ایک عملی مجبوری:

ان حالات میں اسلام کیلئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کے تمام قیدیوں کو فی الفور رہا کر دے کیونکہ اگر وہ ایسا برتاؤ کرتا تو یہ مصلحت سے بعید ہوتا اور اس سے دشمنوں کو مزید شہ ملتی اور وہ کسی جوابی کاروائی کے خطرے سے بے نیاز ہو کر مسلمانوں کے اعزہ و اقرباء کو غلام بناتے اور دل کھول کر انہیں اپنے مظالم اور انتقامی کاردائیوں کا تختۂ مشق بناتے رہتے۔ چنانچہ اس صورت حال میں اسلام کیلئے واحد معقول راہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ دشمن کے قیدیوں کیساتھ کم از کم ویسا ہی سلوک کرے جیسا کہ دشمن مسلم قیدیوں کے ساتھ روا رکھتا تھا۔ جنگی قیدیوں کی روایت اس وقت ختم نہیں کی جا سکتی تھی جب تک کہ دشمن بھی اس بارے میں اسلام کے ساتھ تعاون نہ کرتا۔ چنانچہ اسلام نے اسکے وجود کو اسوقت

تک برداشت کیا جب تک حالات اسکے خاتمے کیلئے سازگار نہ ہو گئے۔اس ساری دنیا کے لوگ جنگی قیدیوں کے متعلق ایک مشترکہ لائحہ عمل پر متفق نہ ہو گئے۔

جنگوں کی پرانی تاریخ:

زمانہ قدیم سے لیکر اب تک جنگوں کی تاریخ غداری، مکاری اور ظلم و تشدد کی داستان رہی ہے یا پھر دوسروں کو غلام بنا کر اپنے جارحانہ مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ انکے پیچھے مختلف قوموں کی ہوس ملک گیری اور خود غرضی کار فرما ملتی ہے۔یہ جنگیں بادشاہوں اور فوجی قائدین کی شخصی اغراض، غرور و خودسری یا جذبہ انتقام کی پیداوار تھیں۔چنانچہ ان گھٹیا اور خود غرضانہ مقاصد کیلئے لڑی جانیوالی ان جنگوں میں جو قیدی پکڑے جاتے تھے انکو غلام بنانے کی وجہ یہ نہیں ہوتی تھی کہ وہ فاتحین سے عقیدہ اور نصب العین کے لحاظ سے گھٹیا انسان ہیں یا مفتوح ان سے جسمانی، نفسیاتی یا ذہنی صلاحیتوں میں فروتر ہیں بلکہ غلامی کی وجہ ان کا یہ قصور تھا کہ وہ مفتوح قوم سے تعلق رکھتے تھے۔جس نے میدان جنگ میں فاتحین کے ہاتھوں شکست کھائی تھی لہٰذا فاتحین کو پورا پورا اختیار حاصل تھا کہ وہ انہیں جسطرح چاہیں ذلیل کریں۔انکی آبروؤں سے کھیلیں۔انکے پرامن شہروں اور بستیوں کو تباہ و برباد کریں اور انکی عورتوں، مردوں، بوڑھوں اور بچوں کو تہِ تیغ کرتے پھریں۔کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا کیونکہ انکے سامنے نہ کوئی نصب العین تھا اور نہ کوئی اعلیٰ اصول حیات ۔

دوسری قسط

اصلاح خلق کا الٰہی نظام

از مولانا مفتی محمد اسماعیل صاحب

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ابتداء اور آغاز کہاں سے کیا:

نیک اعمال اور بھلائیوں کی ترغیب یا منکرات اور برائیوں سے ترہیب وتنبیہ کے کام کی ابتداء اور آغاز اپنے اہل وعیال اور قریبیوں سے کرنا ضروری ہے کہ کتاب وسنت میں اپنی اصلاح کے ساتھ پہلے متعلقین (بیوی بچے، قریبی رشتہ دار وغیرہ) اور ماتحت لوگوں (نوکر، چاکر شاگرد، مرید ملازمین، رعایا وغیرہ) کی اصلاح کا حکم ہے کہ ان پر انسان کو قدرت اور اختیار حاصل ہوتا ہے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے وجوب وعدم کا مدار بھی قدرت پر ہے اور اسی بنا پر ہر شخص اپنے متعلقین اور زیر دستوں پر راعی ومسئول ٹھہرایا گیا ہے ماں باپ کے ذمہ ضروری ہے کہ وہ اپنی اولاد کو نماز، روزہ پردہ، شرم وحیا وغیرہ کا عادی بنائیں، مالک کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے نوکر چاکر، ماتحت ملازمین کو دینی اوامر ونواہی کرتا رہے۔ غرض ہر شخص اپنے دائرہ اختیار میں امور خیر کا حکم کرنے اور امور شر سے روکنے کا ذمہ دار ہے یہ درجہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض، واجب ہے، باقی درجے اس سے کم اور فروتر ہیں اس بارے میں قرآن حدیث میں واضح احکام موجود ہیں مثلاً۔

یاأیھا الذین امنوا قوا انفسکم واھلیکم ناراً الآیہ (التحریم پ ۲۸) وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الأقربین الآیۃ (الشعراء ۱۹ پ) وَامر اَھلك بالصلوٰۃِ واصطبر عَلَیھا الایۃ (طٰہٰ پ ۱۶) اَلاَ کلکم راعٍ وکلکم مسئولٌ عن رعیتہ الحدیث (بخاری) مُرُوا اولاد کم بِالصلوٰۃِ وھم ابناء سبعِ سنین واضربوھم علیھا وَھم ابناء عشر (الحدیث ، ابوداؤد) وَلاَ ترفع عنھم عصاك ادباً (الطبرانی)

ایک حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ اس شخص پر رحمت نازل فرمائے جو گھر والوں کو تنبیہ کے واسطے گھر میں کوڑا لٹکائے رکھے (جامع صغیر) غرض اصلاح کے پیغمبرانہ طریق کار کا اہم اصول یہ ہے کہ جو ہدایت عام مخلوق خدا کو دی جائے اسے پہلے اپنے گھر سے شروع کیا جائے، اپنے اہل خانہ کو اس کا ماننا اور بوجہ اختیار اس کا منوانا نسبتاً آسان بھی ہوتا ہے۔ اس کی نگرانی بھی ہر وقت کی جاسکتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کو جب " وانذر عشیرتک الاقربین " کا حکم ہوا تو آپ نے سب سے پہلے اپنے خاندان قریش کے لوگوں کو کوہ صفا پر جمع کر کے کلمۂ حق پہنچایا۔ نیکی بھلائی اور دینداری کی اشاعت کی اس سے زیادہ مفید اور آسان راہ اور کوئی نہیں کہ ہر گھر کا بڑا اور ذمہ دار پہلے اپنے اہل و عیال کو اس کا قائل کر کے، اس طرف لے آئے اس لئے کہ اہل خانہ اور قریبی خاندان کے لوگ اگر موافق اور معاون نہ ہوں تو ایسے شخص کی ہر نیک سعی دوسروں پر اتنی مؤثر نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو دعوت اور تبلیغ کے جواب میں، ابتداء اسلام کے وقت، عام لوگ یہی کہہ دیا کرتے تھے کہ پہلے اپنے خاندان قریش کو تو آپؐ درست کرلیں، پھر ہماری خبر لینا، غرض تلقین و تذکیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے وہی طریق کار صحیح اور معتبر ہے جو حضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کا تھا کہ سب سے پہلے اپنے گھر، کنبہ قبیلہ، برادری میں دینداری پیدا کرنے کی کوشش کی جائے پھر محلہ میں پھر آس پاس کی آبادی اور مضافات تک پھر رفتہ رفتہ آگے بڑھا جائے اپنے اہل خانہ عزیز اقرباء اور قریبی حلقوں کو چھوڑ کر، دور دراز جا کر، نیکی اور ترویج و اشاعت کو ترجیح دی جائے تو طریق نبویؐ کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ، اس چلت پھرت اور آمد رفت میں نمود و نمائش کا مظاہرہ تو زیادہ ہوگا مگر تاثیر اور کامیابی کی توقعات بہت کم۔

رئیس التبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب دہلوی کے ایک ملفوظ میں بھی ہے کہ ہمارے اس کام کی صحیح ترتیب تو یہی ہے کہ پہلے قریب قریب جایا جائے اور اپنے ماحول میں کام کرتے ہوئے آگے بڑھا جائے۔ (ملفوظات ص ۹۸)

غرض جس طرح زکوٰۃ، صدقات، خیرات، احسان، حسن سلوک وغیرہ میں اپنوں اور قریبوں کا حق مقدم ہے اور دوہرے ثواب کا موجب ہے اس طرح دعوت الی اللہ، تعلیم دین، تبلیغ احکام و مسائل اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں بھی انہیں مقدم رکھنا ضروری ہے حتیٰ کہ جہاد و قتال میں بھی شریعت اسلامی نے یہی ترتیب رکھی ہے کہ قریبی کفار سے پہلے نمٹا جائے قال یاا یھا الذین آمنوا قاتلو االذین یلو نکم من الکفار (التوبہ ۱۱پ) کہ اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑتے (ہوئے آگے) جاؤ جو تمہارے نزدیک اور آس پاس رہتے ہیں۔ مفتی شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں کہ قریب ہونا مقام کے اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے اور رشتہ، نسب اور تعلقات کے اعتبار سے بھی کیونکہ اسلامی جہاد درحقیقت انہیں کی خیر خواہی کے تقاضہ سے ہے اور خیر خواہی اور ہمدردی میں رشتہ دار تعلق والے اور قریبی مقدم ہیں۔ اسی طرح مقامی قرب وجوار کا اعتبار کر کے، مدینہ کے قرب وجوار کے کفار، بنو

قریظہ ، بنونضیر، اہل خیبر کو دوسروں پر مقدم کیا گیا، اس کے بعد باقی عرب سے قتال ہوا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد سب سے آخر میں کفار روم سے قتال ہوا اپنے اہل خانہ، اولاد، عزیز و اقارب طرف ہماری کوئی توجہ نہیں ہوتی۔

بعض قابل توجہ ضروری امور :

دور حاضر میں مسلمانوں کی اکثریت آئے دن دین سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ عوام کے اس طبقہ میں دین کی محبت اور دینداری کا جذبہ اور شوق پیدا کرنے کیلئے ، علماء کرام اور مشائخ عظام جہاں خطبات جمعہ و عیدین ، عمومی اجتماعات مواعظ و بیانات ، دروس قرآن و حدیث اور دینی کتابوں اور رسائل کی تصنیف و تالیف، افتاء وارشاد، تلقین و تذکیر، وغیرہ مختلف ذرائع اور طریقوں سے شب و روز محنت کر رہے ہیں وہاں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب دہلویؒ کی جاری کردہ جماعت بھی اپنی بساط مسلمانوں میں دین بیداری پیدا کرنے کے لئے قابل قدر خدمت انجام دے رہی ہے اسکی محنت سے خاصے لوگ دینداری کی طرف مائل ہو کر اور حضرات علماء دین اور مشائخ عظام سے دینی تعلق جوڑ کر ، اپنی زندگیوں کا رخ درست کرنے لگے ہیں۔ غرض شرعی اصولوں کی رعایت اور پابندی کے ساتھ یہ عوامی اور جماعتی طریقہ بہت مؤثر اور مفید ہے۔ بلکہ واقعات و تجربات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے نفع بخش اثرات نہایت دوررس ہیں بانئ جماعت حضرت مولانا محمد الیاس صاحب دہلویؒ دارالعلوم دیو بند کے فاضل، حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور حضرت سہارنپوری کے خلیفہ تھے اسلئے دیوبندی مکتب فکر کے علماء اور مشائخ از ابتداء تا حال، اس جماعت کی سرپرستی، معاونت، معاندین و مخالفین کے اعتراضات کا جواب اور جماعت افراد کی عمل کو انکا ذاتی فعل قرار دیکر ، جماعت کا دامن ان داغ دھبوں سے پاک صاف کرتے چلے آئے ہیں۔ اب جبکہ علماء حق کی سرپرستی اور معاونت سے یہ کام خوب پھیل گیا ہے اور علماء دین کی تائید و ترغیب سے عوام الناس خاصی تعداد میں اس میں جڑنے لگے ہیں تو اب بہت سے ایسے حضرات جو دینی مسائل واحکام اور حدود مراتب سے کماحقہ واقف نہیں مگر وہ زیادہ وقت لگانے کی بناپر جماعت کے سر برآوردہ، ذمہ دار اور حضرات بزرگان کی صف میں جا پہونچے ، اور اس کام کے بظاہر ثمرات کو دیکھ کر اس جماعتی کام کے متعلق فکری اور نظریاتی غلو کا شکار ہو گئے ہیں جسکے کچھ مضر نتائج، سامنے بھی آنے لگے ہیں لہذا حسب ارشاد نبوی ﷺ الدین النصیحہ (رواہ مسلم) دل چاہا کہ اس فکری و نظری غلو کی اصلاح کی کوشش کی جائے تاکہ یہ جماعتی کام اسی نہج پر ہوتا رہے جس پر اسے شروع کیا گیا تھا۔

جزوی اصول قابل اصلاح تو بہت ہیں کہ انکاذکر طوالت کو چاہتا ہے اسلئے فقط چند اہم اور بنیادی امور پر تنبیہ یہاں مقصود ہے اسطرح بقیہ چھوٹے موٹے امور کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی۔ حق تعالی راہ حق کی ہدایت و توفیق عطا فرمائے ان ارید الا الاصلاح و ما توفیقی الا باللہ۔

(۱) اولاً یہ معلوم کرنا چاہئے کہ حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ نے یہ مروجہ جماعتی کام کیوں شروع کیا؟ کیا آج کے تبلیغی احباب کو حضرت کاوہ مقصد معلوم ہے اور وہ اسے پیش نظر بھی رکھے ہوئے ہیں؟

واضح ہو کہ دین سے غفلت اور بے پرواہ لوگوں کو دین پر لانے اور اسپر برقرار رکھنے کا واحد راستہ صرف یہ ہے کہ ان میں دینی جذبہ اور شوق پیدا کر کے انکا تعلق علماء دین اور مشائخ عظام سے جوڑ دیا جائے، اسلئے کہ بقول حضرت لاہوریؒ علماء دین اپنے علم سے دین کا رنگ بتلاتے ہیں اور مشائخ حضرات اپنی صحبت و تربیت سے دین کا رنگ چڑھاتے ہیں چونکہ حضرت دہلویؒ یہ حقیقت بخوبی سمجھتے تھے اسلئے انھوں نے اپنی اس عوامی تحریک کا مقصد اصلی برملا طور پر واضح فرمایا کہ میرا مقصد (اس کام سے) یہ ہی کہ لوگ اسکے بعد تعلیم کی ضرورت محسوس کریں تاکہ معلمین (علماء کرام) کے پاس جاکر وہ علم دین سیکھیں اور مشائخ کے پاس جاکر اپنے اخلاق کی تربیت کرائیں ہم نے تو صرف جذبہ پیدا کر دیا ہے کہ اپنے اخلاق درست کرو (بحوالہ مجالس حکیم الاسلام)

ایک موقعہ پر فرمایا علماء کرام سے کہنا ہے کہ ان جماعتوں کی چلت پھرت اور کوشش سے عوام میں دین کی صرف طلب اور قدر ہی پیدا کی جاسکتی ہے اور ان کو دین سیکھنے پر آمادہ ہی کیا جاسکتا ہے، آگے دین کی تعلیم و تربیت کا کام علماء اور صلحاء (مشائخ) کی توجہ فرمائی سے ہی ہو سکتا ہے (ملفوظات ص ۱۴۵)

ایک موقع پر فرمایا کہ ہماری اس تحریک کا اصل مقصد اس وقت بس دین کی طلب و قدر پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہے نہ کہ صرف کلمہ اور نماز وغیرہ کی تلقین و تصحیح (ملفوظات ص ۶۸)

ایک موقع پر فرمایا کہ ہماری اس تبلیغی تحریک کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارے کارکن جہاں کہیں بھی جائیں اپنی محنت و کوشش سے غافلوں کو جوڑ کر مقامی علماء کے حوالے کریں تاکہ وہ انہیں دین سکھائیں (ملفوظات ص ۴)

ایک موقع پر فرمایا کہ سب سے بڑا فائدہ اس کام سے یہ ہوگا کہ عوام کا علماء سے جوڑ ہوگا اور وہ علماء و صلحاء (مشائخ) سے دین سیکھیں گے (ملفوظات ص)

ایک موقع پر فرمایا کہ یہ ظاہر ہے کہ ہمارے قافلے پورا کام نہیں کر سکتے ان سے تو بس اتنا ہی

ہو سکتا ہے کہ ہر جگہ پہونچ کر اپنی جد و جہد سے ایک حرکت و بیداری پیدا کریں اور غافلوں کو متوجہ کر کے وہاں کے مقامی اہل دین سے وابستہ کرنے کی کوشش کریں (ملفوظات ص ۳۰) سو مندرجہ بالا چند ملفوظات سے بخوبی واضح ہو گیا کہ حضرت دہلویؒ اپنی اس تحریک کے ذریعے عوام الناس کا تعلق علماء و مشائخ سے جوڑ کر انہیں دین دار بنانا چاہتے تھے۔

علماء دین اور مشائخ عظام کے ساتھ جماعت کے کارکنان کو کیا رویہ رکھنا چاہئے، اس کے متعلق حضرت دہلویؒ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں۔

ایک موقع پر فرمایا کہ علماء و صلحاء کی خدمت میں دین سیکھنے اور دین کے اچھے اثرات لینے کیلئے جانا چاہئے (ملفوظات ص ۲۶)

ایک موقع پر فرمایا کہ علماء کی خدمت میں دینی استفادہ اور حصول برکات کی نیت سے حاضر ہوتے رہنا چاہئے (ملفوظات ص ۶۷)

ایک موقع پر فرمایا کہ ہمارے کارکن جہاں بھی جائیں وہاں کے حقانی علماء و صلحاء کی خدمت میں حاضری کی کوشش کریں لیکن یہ حاضری صرف استفادہ کی صورت میں ہو اور ان حضرات کو براہ راست اس کام کی دعوت نہ دیں...... ان کی خدمت میں بس استفادے کیلئے ہی جایا جائے (ملفوظات ص ۳۳)

حضرت شیخ الحدیثؒ نے حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالن پوریؒ کا یہ بیان نقل فرمایا ہے کہ بزرگ، عالم، پیر، شیخ، کی خدمت میں دعوت دینے کی نیت سے نہ پہونچیں بلکہ ان میں قرآن، حدیث کا جو نور ہے، اس سے فیض اٹھانے کی نیت سے پہونچیں اگر صرف ظاہر داری ہو اور اندر سے استفادہ کی نیت نہ ہو تو فائدہ نہ ہوگا بلکہ اس سے اللہ والے کے دل میں تمہاری طرف سے تکدر کا خطرہ ہے اسلئے استفادہ کی نیت سے جائیں (محصلہ)

حضرت دہلویؒ نے ایک خط حضرت شیخ الحدیث کو تحریر فرمایا کہ میری یہ تمنا ہے کہ خاص اصولوں کے ساتھ، مشائخ طریقت کی خدمت میں حاضر ہوں آداب کا لحاظ کرتے ہوئے بزرگوں سے فیض ندوز ہوں (محصلہ) علاقہ میوات کے ذمے داران جماعت کو لکھا کہ کارکنانِ تبلیغ جو ذکر دوازدہ تسبیح رر ہے ہیں، انہیں ایک ایک چلہ رائے پور (خانقاہِ حضرت رائے پوریؒ) میں گزارنے پر آمادہ کرو (محصلہ،)

ایک موقع پر فرمایا کہ مجھے جب بھی میوات جانا ہوتا ہے تو میں ہمیشہ اہل ذکر کے مجمع کے ساتھ اتا ہوں پھر بھی عمومی اختلاط کیوجہ سے قلب کی حالت اس قدر متغیر ہو جاتی ہے کہ جب تک

نکاف کے ذریعے اسکو غسل نہ دوں یا چند روز سہارنپور یا رائے پور کے خاص مجمع اور خاص ماحول میں لرنہ رہوں تو قلب اپنی اصلی حالت پر نہیں آتا (ملفوظات ص ٦٦) حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے نقل مایا ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی طرف سے سخت ہدایت ہے کہ جس بستی میں جماعت ئے وہاں کے علماء اور مشائخ کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں، ان سے صرف دعاء کی درخواست ے ان کو ہرگز دعوت نہ دے (ص ۱۱۰)

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے متعلق نقل فرمایا ہے کہ وہ خطوط میں اور الوداعی ہدایات ں فرمایا کرتے تھے کہ دینی اکابر (علماء و مشائخ) کی خدمت میں حاضری ہو تو ان سے صرف دعا کی خواست کی جائے، دعوت نہ دیجائے...... فرمایا میں جو دیوبند، سہارنپور جماعتیں بھیجتا ہوں، اس لیے ں کہ تبلیغ کی جائے، میں تو اس غرض سے بھیجتا ہوں کہ آج عوام، علماء سے دور ہوتے جارہے ہیں، ان کے قریب ہو جاویں، اسی میں انکا فائدہ ہے (۴۴) دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر مفتی حضرت لانا مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ - جو ہندوستان میں اس تبلیغی کام کے سرپرست رہے ہیں انھوں نے پنے فتاویٰ محمودیہ میں متعدد مقامات پر یہ مضمون تحریر فرمایا ہے مثلاً

فتاویٰ محمودیہ (ص ۲۱۸ ج ۱۲) پر لکھا ہے، علماء و مشائخ کو ہرگز ہرگز یہ دعوت نہ دیں کہ یہ حضرات اپنے ئی مشاغل ترک کرکے مدارس و خانقاہیں بند کرکے نکل کھڑے ہوئے، دینی مدارس کا قیام از حد ضروری ہے نہ صحیح علماء پیدا ہونے بند ہو جائیں گے اور دین جاہلوں کے ہاتھوں میں جاکر کھلونا بن جائیگا - خانقاہوں یام بھی ضروری ہے اسلئے کہ محض کتابیں پڑھ لینے سے عامۃً تزکیۂ باطن نہیں ہوتا...... الخ

فتاویٰ محمودیہ (ص ۲۲۸ ج ۱۲) پر لکھا ہے، جو واقعی علماء حق ہیں، وہ جن مشاغل کو اختیار کیے ہوئے ں (درس و تدریس، تصنیف و تالیف، وعظ و بیان، تزکیۂ نفوس، افتاء و ارشاد وغیرہ) ان کے اوقات میں اتنی بائش نہیں کہ جماعتوں کے ساتھ جائیں، تبلیغی جماعت کے اصول میں ہے کہ حضرات علماء و مشائخ جو ئی مشاغل میں لگے ہوئے ہیں، ان کو باہر نکلنے کی دعوت ہرگز نہ دی جائے...... الخ

یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے ایک ملاقات کے دوران جب شیخ التفسیر نرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی خدمت میں جماعتی دعوت کا عندیہ پیش کیا تو اس پر حضرت شیخ فسیرؒ نے ناگواری کے ساتھ صرف اتنا فرمایا کہ مولوی یوسف صاحب! جس دن آپ نے یہ سمجھ لیا دین کا کام صرف یہی ہے اس دن سے یہ کام رک جائے گا (دیکھئے خدام الدین کا تبلیغ نمبر ۱۹)

بانی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ، حضرت شیخ الحدیثؒ، حضرت مولانا مفتی

محمود حسن صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالنپوریؒ کے چند ارشادات، علماء کرام اور مشائخ عظام کے دینی و مرکزی حیثیت اور ان کی عظمتِ شان کے متعلق آپ نے ملاحظہ فرمایا، اب موجودہ اکثر تبلیغی احباب کا رویہ اور ذہنیت جو اکثر و بیشتر علماء، مشائخ اور مدارس کے بارے میں دیکھنے سننے میں آتی رہتی ہے، مشتے نمونہ از خروارے وہ بھی ملاحظہ ہو مثلاً

(۱) دین کا کام تو ہم جہلاء کر رہے ہیں مولوی صاحبان تو مسجدوں اور مدرسوں میں گاؤ تکیے لگائے بیٹھے ہیں، اپنے پیٹ کا دھندہ کرتے ہیں، دین کی خدمت کہاں کرتے ہیں۔

(۲) اب تو مدارس کے علماء اور طلباء کو بھی چاہئے کہ وہ مدارس سے نکل کر اور اس راہ میں آکر دین کے کام میں لگ جائیں۔ باقی سب دھوکہ ہے۔

(۳) باہر بے دینی کی آگ لگی ہوئی ہے اور مولوی صاحبان مدرسوں میں بیٹھ کر قرآن، حدیث اور کتابیں پڑھانے میں لگے ہوئے ہیں۔

(۴) اس دور میں اس کام کی مثال کشتیٔ نوح کی مثل ہے جو اس میں شامل ہو گیا وہ تو بچ گیا، جو شامل نہ ہوا وہ ڈوب گیا۔

متعدد جگہ یہ دیکھنے سننے میں آتا رہتا ہے کہ اہل حق میں سے کوئی علم دین، درس قرآن یا عمومی وعظ کہنے کو آئیں، اور تبلیغی احباب وہاں کتاب پڑھتے ہوں تو اس وقت بھی وہاں کتاب پڑھنے پر ضد کی جاتی ہے

متعدد مساجد میں جہاں علماء کرام روزانہ درس قرآن دیتے ہیں، بعض تبلیغی احباب اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی طرح درس قرآن کے بجائے کتاب پڑھی جائے اور بعض مساجد میں تو اختلاف کا بہانہ بنا کر درسِ قرآن بند کرانے کی کوشش کی کہ مضامین قرآن سے کفر و شرک اور مسائل کی بحثیں شروع ہو پڑتی ہیں جن سے جوڑ کے بجائے توڑ پیدا ہوتا ہے۔ بس کتاب کی تعلیم ہی کافی ہے، کہ اس سے عوام میں سدھار آئے گا۔ یہ باتیں مقصدِ جماعت اور اکابرِ جماعت کے مندرجہ بالا ارشادات سے میل کھاتی ہیں؟

حسن ظن تو یہی ہے کہ ایسی خلاف ضابطہ باتیں نہ تو مرکز نظام الدین کے حضرات کہہ سکتے ہیں در نہ ہی مرکز رائیونڈ والے مگر ان حضرات کیلئے لمحہ فکریہ ہے کہ جماعت کے بزرگوں کی موجودگی ں ایسی باتیں عام تبلیغی حضرات کی زبانوں پر نہ آئیں جماعت کے سرپرست حضرت مولانا مفتی ںود حسن صاحب گنگوہیؒ فتاوی محمودیہ ج ۱ ص ۴۴۳ پر لکھتے ہیں

اصول کی پابندی نہ کرنے اور اپنی حد سے بڑھ کر تقریر کرنے سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور ںنوں کے ذہن میں یہ بھی آجاتا ہے اصل کام تو ہمارا ہی ہے باقی دوسرے طریقوں مدرسوں،

انقاہوں، وعظ و تذکیر، تصنیف و تالیف وغیرہ کے ذریعہ جو دینی کام کیا جاتا ہے اس کو یہ لوگ معمولی ہم بلکہ نااہل تو حقیر سمجھنے لگتے ہیں یہ ان کی غلطی اور فتنے کی چیز ہے اہل علم و دانش کو ان کی نگرانی اور صلاح ضروری ہے ورنہ یہ فتنہ متعدی ہو جائے گا۔

ج ا ص ۴۳۹ پر لکھتے ہیں:

دین سیکھنے کے جو دوسرے طریقے ہیں ان کو ناجائز کہنا جائز نہیں اور اصول تبلیغ کے بھی خلاف ہے اس سے پورا پرہیز لازم ہے، ہر مسلم کا اکرام اور علمی و دینی خدمت کرنے والوں کا اکرام بھی لازم ہے۔

ایک سوال کہ (یہ جماعت لوگوں کو دیندار بنانے کی ایک تحریک اور محنت و کوشش ہے یا شرعاً و اصطلاحاً عوت و تبلیغ ہے کیا کارکنان جماعت کو داعیان اسلام یا مبلغین اسلام کہنا درست ہے؟) کے جواب میں لکھتے ہیں

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے اس جماعت کا مقصد اور کام خود واضح فرما کر اس کی حیثیت ور درجہ متعین فرمادیا ہے کہ دین سے غافل اور بے پروا لوگوں میں دین کا جذبہ اور شوق پیدا کر کے علماء اور مشائخ سے ان کا تعلق جوڑ دینا ہماری اس تحریک اور جماعت کا منتہائے مقصود ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ایک صاحب کے جماعت کے نام پر، اسی اشکال و اعتراض کا ان الفاظ میں جواب دیا ہے۔ تبلیغی جماعت کے بارے یں استفسار کیا گیا ہے، جہاں تک اس جماعت کے مقاصد، نماز، روزہ، ذکر، کلمہ طیبہ وغیرہ کا تعلق ہے، انکی ترویج قابل اعتراض نہیں، رہا طریق کار تو اسمیں دو رائیں ہو سکتی ہیں اور ہیں لیکن یہ اختلاف س درجہ کا نہیں کہ اسے وجہ خلاف یا صورت نزاع بنایا جائے البتہ اس طریقہ کار کے ساتھ بے بصر کارکنوں کا تقشف (خشکاپن) اور بے علم مبلغین کا تمرد (کبر) اسے منکر بنا دیتا ہے اور زیادہ تر اسی کی ںکایتیں موصول ہوتی رہتی ہیں سو اس جماعت کے ذمہ داروں کو اس طرف توجہ دلائی جا سکتی ہے۔

میرے خیال میں اس جماعت کے طریقۂ عمل سے جو الجھن بیدار قلوب میں پیدا ہو رہی ہے اس کی وجہ اس تحریک کا عنوان ہے یعنی "تبلیغ اور تبلیغی جماعت" تبلیغ کا مفہوم عرف شریعت میں ابلاغ دین اور ابلاغ اسلام ہے جو غیر مسلموں کے لئے ہوتی ہے۔ خود مسلمانوں کو دیندار بنانے کی کوشش و دعوت و تبلیغ نہیں کہا جاتا بلکہ اسے تذکیر اصلاح اور تہذیب نفوس وغیرہ کہا جاتا ہے۔ یہ تحریک بھی دراصل ایک اصلاحی ترقی ہے جو ایک مربی نے اپنے متوسلین کیلئے اختیار کی، کوئی مربی گھر میں بٹھا کر چلہ کشی کراتا ہے، انھوں نے گھر سے نکالکر سفر کی چلہ کشی کرائی شاید اسلئے جماعتوں کا مرکز میں آنا ضروری کیا گیا ہے اس لیئے یہ ایک مربیانہ انداز ہے جسے تبلیغ توسعاً ہی کہا جا سکے گا، خود میں

نے بھی کہا ہے اور لوگ بھی کہتے ہیں مگر توسعاً ہی کہتے ہیں۔

ورنہ ظاہر ہے کہ دعوت و تبلیغ کے چار درجے ہیں (۱) بالحکمۃ، (۲) بالموعظۃ الحسنۃ، (۳) بالمجادلۃ الحسنۃ (۴) اور بالمدافعۃ الحسنۃ، ان جماعتوں کو مجادلہ اور بحث کی اجازت نہیں حکمۃ میں دلائل آتے ہیں سوان کے یہاں بیان مسائل بھی موضوع سے خارج ہے چہ جائیکہ حکیمانہ دلائل خود موضوع ہوں، وہ صرف فضائل کو لیتے ہیں اور اوٹی پر بولتے نہیں، اسکے علاوہ مسلمانوں کے جماعتی مسائل سے تعرض کیا جاتا ہے، یہ ان کے یہاں کلیۃ خارج از موضوع ہے یعنی اجتماعیات کے رنگ میں بھی دعوت نہیں دی جاتی اس صورت میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ صرف ایک اصلاحی کوشش اور تحریک ہے کہ لوگ دیندار بنیں، سو اس پر جب تبلیغ کا عنوان چسپاں دیکھا جاتا ہے تو لوگ اس تحریک کو اس دعوت و تبلیغ کے معیار پر جانچتے ہیں، جو ابتداء اسلام میں اقوام عالم کو دائرۂ اسلام میں داخل کرنے کیلئے کی جاتی تھی اور بعد میں بہت سے اہل اللہ نے اسے اپنا شعار بنایا کم سے کم اسلام کے مسائل، و فضائل، اجتماعیات، انفرادیات پر روشنی ڈال کر لوگوں کو قائل کیا جس سے بہت سے صالح القلوب لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے گئے۔ ظاہر ہے کہ اس تحریک کا بنیادی مقصد صرف مسلمانوں کو دیندار بنانا ہے اور وہ بھی دیانات کی حد تک اسلئے عنوان (تبلیغ اور تبلیغی جماعت) لوگوں کیلئے باعث الجھن بن جاتا ہے۔ الخ (ماخوذ ماہنامہ الاسلام برطانیہ)

خود حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے اکثر جگہ اس جماعت کو دینی تحریک اور کام کرنے والے احباب کو، کارکنان کے لفظ سے ذکر فرمایا ہے نہ کہ مبلغین اسلام اور داعیان اسلام کے الفاظ سے بہر حال حضرت دہلویؒ سے کہیں بھی اس جماعت کا نام "تبلیغ کرنے والی جماعت" منقول نہیں بلکہ وہ اس جماعتی گشت کو دینی سلسلے کی چلت پھرت کے قافلے اور جماعتیں فرماتے اور اگر کہیں اس کام پر دعوت و تبلیغ کا لفظ اور جماعت پر تبلیغی جماعت کا لفظ استعمال فرمایا ہو تو بموجب تشریح حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ مجازاً اور توسعاً ہی فرمایا ہے نہ کہ حقیقتاً ہاں عام لوگوں نے اس جماعت کا نام، تبلیغی جماعت، مشہور کیا جس سے یہ غلط فہمی اور دھوکہ آج تک خاص و عام کو لگ رہا ہے کہ یہ جماعت تبلیغ کرنی والی ہے، یا تبلیغ دین صرف یہ جماعت ہی کرتی ہے، یا جو شخص اس جماعت میں لگا ہوا نہیں، وہ تبلیغ دین نہیں کر رہا ہے خواہ وہ تعلیم و تفسیر قرآن، تشریح احادیث، مسائل فقہیہ کے بیان، افتاء وارشاد، وعظ و نصیحت وغیرہ بنیادی اور اہم ترین دینی، تعلیمی اور تبلیغی کاموں میں مشغول ہو (۳) کیا کر یہر دردمند مخلص شخص کو اصلاح خلق کیلئے یہ مروّجہ جماعتی طریقہ ہی اختیار کرنا ضروری ہے یا جس طرح بھی اور جائز اور مستحسن طریقے سے جو شخص دینی اصلاحی کام کرے درست ہے۔ واضح ہو کہ احکام شریعت دو طرح

کے ہیں۔(۱) منصوص بالوضع (۲)اور غیرمنصوص بالوضع۔ منصوص بالوضع احکام سے مراد وہ ہیں کہ انکا حکم دینے کے (۱۷) ساتھ شرع نے انکی ادائیگی کا طریق کار بھی متعین کر دیا ہے مثلاً نماز، روزہ، حج، عمرہ وغیرہ کا ان کی بجاآوری کا حکم دینے کے ساتھ انکی ادائیگی کا طریق کار بھی مقرر کر دیا گیا ہے مثلاً نماز کا حکم اقیمو الصلوۃ .. الایۃ دیا تو اسکی ادائیگی کا طریق کار بھی صلو اکما رایتمونی اصلی (الحدیث) فرماکر متعین کر دیا گیا کہ نماز ویسے پڑھو جیسے میں محمدؐ کو پڑھتا دیکھتے ہو گویا، مامور بہ اور اسکا طریق ادا ہردو مقصود و مطلوب ہیں۔

غیر منصوص بالوضع احکام و مسائل، وعظ و بیان، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، جہاد و قتال وغیرہ کہ ان میں سے ہر ایک کے متعلق کچھ ہدایات اور حدود و قیود تو بتلادیں کہ انکا پاس و لحاظ رکھا جائے باقی طرز طریق اور انداز ادا میں آزادی دیدی کہ جس مناسب طریقے سے چاہو کر لو گویا مامور بہ تو مطلوب و مقصود ہے مگر اسکا طریق ادا نہ متعین ہے اور نہ مقصود ہے ایسے احکام کی ادائیگی اور بجاآوری کا ہر جائز طریقہ بس ایک ذریعہ ہوگا جو مقصود نہ ہوگا کہ اسی کا اختیار کرنا ہی سب کو ضروری ہو اور نہ ہی وہ شرعی حیثیت (فرض، واجب، سنت وغیرہ) کا حامل ہوگا کہ اس میں شمولیت ہر ایک کو ضروری ہو اور نہ ہی وہ متعین ہوگا کہ اس میں ترمیم و تنسیخ یا تغیر و تبدل نہ ہو سکے۔

لوگوں کو دینی تذکیر و نصیحت کرنا اور شرعی اوامر و نواہی پر عملدرآمد کی ترغیب دینا، یہ چونکہ غیر منصوص بالوضع احکام میں سے ہے اس لئے چودہ سو سال سے ہر دور میں اہل اللہ مشائخ عظام اور علماء کرام اس کیلئے مختلف مناسب طریقے اختیار فرماتے رہے، انہیں کا مثل ایک طریقہ یہ بھی ہے جو حضرت دہلویؒ نے آج سے پچاس ساٹھ سال قبل شروع کیا کہ جماعتی شکل میں لوگوں کے پاس جاکر انہیں دینی تذکیر و نصیحت کی جائے یہ نظم اور طریقہ بھی مثل اور طریقوں کے فی نفسہ جائز اور درست ہے کہ غیر منصوص بالوضع احکام میں ہر جائز طریقہ اختیار کرنا صحیح ہوتا ہے مگر اسے فرض واجب کہنا یا منصوص من اللہ سمجھنا خطرناک ہے ایک اچھا طریق کار اور مستحسن کام ہے جس سے صحیح دینی فائدہ اسے حاصل ہوگا جو اپنے متعلق شرعی اوامر و احکام پورے کرتے ہوئے اور اپنی دینی ذمہ داریاں و حقوق ادا کرتے ہوتے۔ اس میں شمولیت رکھے۔ اس ذریعے اور طریقے کو اگر کوئی شخص فرض واجب، کہنے سمجھنے لگے یا اسے مقصود ہی بنالے جیسا کہ بعض بے علم و کم فہم یہ کہتے سنے جاتے ہیں تو الگ یہ ایک غلطی ہے اسکی اصلاح ضروری ہے حضر مولانا دہلویؒ کا ایک ملفوظ بھی ہے کہ، آجکل دین کے باب میں یہ غلط فہمی عام ہوگئی ہے کہ مبادیات کو غایات اور ذرائع کو مقاصد کا درجہ دیدیا گیا

ہے۔ یہ غلطی ہزاروں خرابیوں سے بڑھ کر ہے۔ (ملفوظات ص ۷۶)

جماعت کے موجودہ عالمی سرپرست حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی برکاتہم نے اس سلسلے کے ایک مضمون میں نہایت اہم تنبیہات فرمائی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی، رسول کا مرتبہ، حیثیت اور مقام اور ہوتا ہے اور کسی امتی مجدد و مصلح کا درجہ اور۔ نبی اور رسول کی حیثیت اور شان تو یہ ہوتی ہے کہ اسکے بتلائے ہوئے طریق کار کے اتباع میں ہی نجات منحصر ہوتی ہے لیکن کسی مجدد و مصلح کے طریق کار کا یہ درجہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس کے طریق کار میں نجات منحصر ہو اور اسی کو اختیار کرنا ہر کسی کو لازم اور ضروری ہو ہاں البتہ اس کے طریق کار سے وابستگی میں ایک خاص دینی نفع ضروری ہوتا ہے۔ آگے مولانا ندوی فرماتے ہیں کہ ہماری اس دینی تحریک کا ایک خاص طرز ہے اس میں بعض چیزیں تو وہ ہیں کہ جن کی شریعت نے ہمیں سختی سے تاکید کی ہے مثلاً نماز، ذکر اللہ اکرام مسلم، ترک لایعنی وغیرہ لیکن بعض چیزیں وہی ہیں جو صرف انتظامی امور ہیں مثلاً خصوصی گشت، عمومی گشت، جوڑ، اجتماعات وغیرہ جو اصولی طور پر قرآن حدیث اور عمل صحابہؓ سے مستنبط کئے جاتے ہیں حضرات صحابہؓ سے بھی خاص اسی ہیئت میں نہ ملیں گے کہ یہ چیزیں تجرباتی ہیں لہذا ان چیزوں پر یا ان خاص شکلوں پر ضد و اصرار کرنا غلط ہوگا ہم صاف کہتے ہیں کہ یہ بالکل امکان ہے کہ پچیس برس کے بعد اللہ کے کچھ بندے پیدا ہوں جو صاحبِ نظر ہوں اور اللہ کے ساتھ ان کا تعلق بھی ہو اور ہمارے اس جماعتی طریقے میں زمانے کی ضرورت اور تقاضے کے لحاظ سے تبدیلیاں کریں اس وقت اگر ایک جامد طبقہ ان کی مخالفت ہمارا نام لے کر محض اس بنا پر کرے کہ ہمارے بزرگ ایسا نہ کرتے تھے تو اس کا یہ رویہ غلط اور اصرار ہٹ دھرمی ہوگا۔ کبھی کبھی ضروری ہے اور اس کے علاوہ سب بیکار اور غلط ہیں تو یہ بے اعتدالی اور تعصب نہایت خطرناک رویہ ہے کہ اسی ضد، ہٹ دھرمی اور تعصب کی بنا پر امت میں مختلف گروہ پیدا ہوئے۔ سو جب تک یہ چیزیں (شب جمع، گشت، سہ روزہ چلہ وغیرہ) فائدہ مند معلوم ہوں ہمیں اس وقت تک انہیں جاری رکھنا چاہئے لیکن اگر شبِ جمعہ کا اجتماع، ہمارے شہر لکھنؤ کی نوچندی جمعرات کے طرح ایک رسم بن جائے، رات کا قیام رَت جگا کے طرح رسم کی صورت اختیار کرلے اور دینی نسبت سے چلنا، گشت کرنا، ایک رسم بن جائے تو یہ ایک بدعت قائم ہو جائے گی اور ایک مذہب بن جائے گا اور اس اور اسوقت کے ربّانی مصلحین کا یہ فرض ہوگا کہ ان کے خلاف جدوجہد کریں اور ان رسومات کو مٹائیں۔ بہت سی چیزیں صحیح مقاصد اور دینی مصلحتوں سے شروع ہوتی ہیں لیکن آگے چل کر غلط صورت اختیار کر لیتی ہیں، ایسے موقع پر حقیقت و رسم، و منت

وبدعت فرض ومباح وغیرہ میں تمیز (فرق) کرنا تفقہ فی الدین ہے جو نہایت ضروری ہے۔

غرض چودہ سو سال سے ہر دور میں مقتضائے حالت، مصلحین امت اِصلاح خلق کیلئے مختلف اور مناسب طریقے اختیار فرماتے رہے۔ ہر صاحب علم و عمل، اپنی صواب دید کے مطابق جو موضع اور مناسب طریقہ، انفرادی (اکیلے) یا اجتماعی، تحریری یا تقریری اختیار کرے وہ مباح درست ہے مگر ہو گا وہ ایک ذریعہ اور انتظامی چیز: جسے اختیار کرنا یا شامل ہونا کسی پر فرض لازم نہیں ہو سکتا سو حضرت دہلویؒ یہ جماعتی طریقہ تذکیر و نصیحت فی نفسہ درست ہے جسمیں جانے والوں کا دینی نفع ہے مگر اسپر اسرار کرنا، نہ جانے والوں سے نفرت اور بدگمانی رکھنا، فرض واجب کے درجے کے درجے میں اس ترتیب او قات کی پابندی کرنا، اسمیں شرکت کیوجہ سے اہم ضروریات دینیہ یا دنیویہ کا ترک کرنا یہ سب غلو، تجاوز عن الحد اور ذریعے کو مقصد بنالینا ہے جو شرعاً ناجائز اور غلط ہے۔ دینی احکام کی روشنی میں فقہاء کرامؒ نے یہ ضابطہ لکھا ہے کہ جو کام اور مندوب اور مستحب ہو، اسپر اصرار کرنا، اور اسکی سخت پابندی کرنا، اسے بدعت کے دائرے میں داخل کر دیتا ہے (دیکھئے مجمع البحار ص ۲۴۴ مرقاۃ شرح المشکوٰۃ ص ۱۴ ج ۲ وھکذا فی شرح المشکوٰۃ للطیبیؒ)

(۴) اکثر جماعتی حضرات، اہل حق علماء کرام کی تشکیل کردہ دینی تحریکوں اور جماعتوں مثلاً جمیعۃ علماء اسلام، مجلس احرار اسلام، انجمن سپاہ صحابہ رضی اللہ عنہ، مجلس تحفظ ختم نبوت، خدام اہل سنت، تنظیم اہل سنت وغیرہ پر موقع بموقع تنقید کرتے رہتے ہیں، اپنے حلقے کے لوگوں کو ان سے متنفر اور دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ خود ان تحریکوں اور جماعتوں کے افراد وارکان کو ان سے برگشتہ اور بددل کر کے، اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ کیا دوسری دینی تحریکوں، جماعتوں، اور اداروں کے ساتھ ایسا رویہ رکھنا اللہ کے حکم، نبی پاک ﷺ کے طریقے اور اکرام مسلم کے مطابق ہے؟

واضح ہو کہ نبیؐ ورسولؐ کی ذات ہمہ پہلو جامع، روشن اور معتدل ہوتی ہے انکی شریعت اور طریق کار بھی، ہمہ پہلو جامع، روشن اور نہایت معتدل ہوتا ہے جو عام انسانی طبقات اور اذہان کو برابر متأثر اور مطمئن کر سکتا ہے بخلاف کسی مجدد و مصلح کے کہ جو نسبت ان خوبیوں میں اس شخصیت کو ذات نبیؐ کے ساتھ ہوتی ہے، وہی نسبت اسکے طریقہ کار کو، طریق نبوت و رسالت ہوتی ہے۔ ہر مصلح و مجدد کی ذات میں کوئی نہ کوئی ایک خاص خوبی ضرور نمایاں ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ مصلح یا مجدد ٹھہرتا ہے اسلئے اسکی تحریک میں اور اس سے وابستہ لوگوں میں اسی خاص دینی خوبی (مثلاً ذکر اللہ یا صفائی معاملات، یا ایثار و انفاق، یا جذبۂ جہاد و شہادت، یا دینی معاملات میں پختگی وغیرہ) کے اثرات زیادہ نمایاں ہوتے ہیں مگر صفت اعتدال

کے ساتھ تمام دینی خوبیوں میں برابر ترقی ہو، یہ صرف طریق نبوت کا ہی خاصہ ہے نہ کہ کسی مجدد و مصلح کے اصلاحی طریق کار کا، وجہ اسکی یہ ہے کہ امت میں طبقات کا اتنا اختلاف ہے اور لوگوں کے اذہان اِسقدر متفاوت ہیں کہ کسی مصلح کی کوئی اصلاحی تحریک یہ دعوئی ہی نہیں کرسکتی کہ وہ اپنے ایک ہی مخصوص انداز سے تمام انسانی طبقات اور اذہان کو برابر متأثر کرسکتی ہے اور ہر حالت میں، ہر جگہ، ہر ماحول میں یکساں کامیاب ہے جب کسی اصلاحی تحریک یا جماعت کے بارے میں یہ غلط نظریہ قائم کرلیا جاتا ہے تو اس تحریک یا جماعت کے افراد اس غلط ذہنیت کی بنا پر، باقی دینی تحریکوں اور جماعتوں سے بالکل بے نیاز ہو کر انہیں غیر ضروری بلکہ بیکار بتلانے لگتے ہیں۔ یہ افراط و تفریط جب کسی مجدد و مصلح کی تحریک میں راہ پا جاتی ہے تو اس تحریک سے وابستہ لوگ، دوسری دینی تحریکوں کے کارکنان سے ضد، عناد، چشمک، عدوات رکھنے لگتے ہیں، اسی گروہی تعصب اور دھڑے بندی کی بنیاد پڑتی ہے کہ مختلف دینی جماعتوں سے وابستہ لوگ، ایک دوسرے سے بیزار اور باہم مخالف ہو رہتے ہیں۔

غرض اہل حق کی قائم کردہ مختلف دینی تحریکیں اور جماعتیں، دین کے مختلف شعبوں اور متعدد شیونِ نبوت کو نبھانے اور سنبھالنے کے لئے قائم کی گئی ہیں دعوت الی اللہ، تعلیم دین، تبلیغ احکام و مسائل کا شعبہ حضرات علماء قرّاء مبلغین و مناظرینِ اسلام، شیوخ الحدیث و التفسیر اور حضرات مفتیانِ کرام نے سنبھال رکھا ہے اسلامی سیاست دین کا ایک حصہ ہے کہ قوت اقتدار کے ذریعے نفاذِ اسلام کی کوشش کی جائے یہ شعبہ جمعیۃ علماء مجلس احرار اسلام وغیرہ نے سنبھالا ہوا ہے منکرین ختم نبوت کی چالبازیوں اور ریشہ دوانیوں سے امت مسلمہ کو خبردار کرنے کے لئے مجلس تحفظ ختم نبوت وجود میں آئی، شیعہ، روافض کے بغض و نفاق اور پوشیدہ کفر سے عوام اہل سنت کو خبردار کرنے کے لئے تنظیم اہلسنت، خدام اہلسنت دفاع صحابہؓ، سپاہ صحابہؓ وغیرہ تنظیمیں اور تحریکیں وجود میں آئیں ان تنظیموں، تحریکوں اور دینی جماعتوں کی مخالفت، بے دینی اور گمراہی ہے بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم ہمیں تو ان دینی تحریکوں، اداروں اور ان کے ذمہ داروں کا احسان مند اور شکرگزار ہونا چاہئے کہ بہت سے وہ لوگ جو ہمارے اس جماعتی طور و طریق سے دینداری کے طرف آتے، ان کو ان حضرات مخلصین نے قابو (Cover) کر رکھا ہے سو یہ اللہ کے طرف سے ایک انتظام سمجھنا چاہئے کہ ہر ذریعے اور ہر راستے سے اس کی مخلوق، اس کے دین کے طرف آرہی ہے ان حضرات کی محنت کوشش جانثاری اور اچھی کارکردگی کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہئے اور حسبِ ارشاد ربانی:

واعتصموا بحبل اللهِ ولا تفرقوا الآیہ آپس میں اتحاد و اتفاق کو قائم رکھتے ہوئے، ارشاد وَتَعَاوَنُوا عَلَىٰ البر والتقوىٰ الایۃ ایک دوسرے کے دینی کاموں میں معاونت کی جائے نہ کہ باہم بغض

وعناد رکھا جائے۔ اکثر یہی تو لوگ ہیں جو ان دینی تحریکوں اور اداروں کی برکت سے صحیح العقیدہ بنے ہیں اور ہماری جماعتوں میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان سے بغض و عداوت پرلے درجے کی حماقت اور اپنے آپ کو رسوا کرنے والی بات ہے کسی جماعت سے متعلق کسی شخص میں کوئی کوتاہی آپ کو معلوم ہوئی تو اسے ہمدردی و خیر خواہی سے سمجھایا جائے یا ان کے بڑوں سے اس سلسلے میں درخواست کی جائے نہ کہ اس جماعت اور اس کے دینی مقصد کی ہی مخالفت شروع کردی جائے جیسے ہماری جماعتوں میں پھرنے والے بعض افراد کی بڑی کوتاہیاں اگر کسی کے سامنے آئیں تو ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے بڑے حضرات کے ذریعے ان کی اصلاح کرائیں یا نرمی اور ہمدردی سے سمجھائیں مگر اس بناء پر کوئی شخص اگر ہماری جماعت اور اس کے دینی مقصد کی ہی مخالفت کرنے لگے تو یہ عند اللہ جرم ہوگا کہ یہ جماعت تو بالاصل دینی تذکیر و نصیحت اور دینداری کی ترویج کے لئے بنائی گئی ہے یہ چند اصولی امور ایسے ہیں جن کی رعایت دین کے خداموں کیلئے ضروری ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ اصلاح بجائے مزید خرابیاں ملت میں پیدا ہو جائیں اور ہماری ساری محنت و کاوش ہمارے حق میں وبال بن جائے۔ اعاذنا اللہ منہا

(یہ مضمون "الغزالی" "علامہ شبلی" کے حصہ اول کی تلخیص ہے، حوالہ جات کے لیے اصل سے رجوع فرمائیں)

ولادت:

حجۃ الاسلام محمد غزالی کی ولادت ۴۵۰ھ میں طاہران میں ہوئی، طاہران، خراسان کے ضلع "طوس" کا ایک شہر ہے۔ ان کے والد محمد، سوت کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے، اسی مناسبت سے ان کا خاندان "غزالی" کہلاتا تھا اور اسی سے منسوب ہو کر امام صاحب "غزالی" سے مشہور ہوئے۔

تعلیمی مراحل:

امام صاحب کے والد کچھ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے، جب موت نزدیک آئی، تو امام صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی امام احمد غزالی کو اپنے ایک دوست کے سپرد کیا کہ انہیں اچھی تعلیم اپنی نگرانی میں دلادیں، تاکہ ان کی جہالت کا کفارہ ہو جائے۔ بزرگ دوست نے کچھ دنوں تک تعلیم کا بندوبست کیا، لیکن جب امام صاحب کے والد نے جو مصارف، تعلیم کے لیے انہیں دیے تھے، ختم ہوگئے تو دونوں بھائیوں سے کہہ دیا کہ میرے پاس اتنا مال و متاع نہیں کہ تمہاری آگے کی تعلیم کا نظم کر سکوں، اب خود ہی انتظام کرلو۔ اس زمانے میں باقاعدہ مدارس اگرچہ نہیں تھے لیکن علم دوست۔ روسا کی دست کشائیوں کے طفیل بہت سے طلبہ کبار شیوخ واساتذہ کے پاس فکر معاش سے آزاد ہو کر تعلیم حاصل کرتے تھے، چنانچہ امام صاحب ایک ایسے ہی مدرسے میں داخل ہوگئے۔

ابتدائی تعلیم اور طرز تعلیم:

امام صاحب کے شہر میں ہی احمد بن محمد رازکانی درس دیتے تھے، آپ نے فقہ کی ابتدائی کتابیں انہی سے پڑھیں، اس کے بعد جرجان، امام ابو نصر اسماعیلی کی خدمت میں پہنچے۔ اس زمانے میں سبق پڑھانے کا انداز یہ ہوتا تھا کہ استاذ علمی مسائل پر گفتگو کرتا اور شاگرد اسے قلمبند کر کے نہایت احتیاط سے محفوظ رکھتا، ان یادداشتوں کو "تعلیقات" کہتے تھے۔ امام صاحب کے پاس بھی اس طرح کی تعلیقات تھی۔

کچھ عرصے کے بعد جب وطن لوٹے، تو یہ تعلیقات ہمراہ تھی، اتفاق سے راستے میں ڈاکہ پڑا اور تمام سامان لٹ گیا، امام صاحب ڈاکوؤں کے سردار کے پاس پہنچے اور کہا کہ مجھے صرف وہ مجموعہ چاہئے اس لیے کہ میں نے انہیں کے سننے اور یاد کرنے کے لیے یہ سفر کیا تھا" وہ طنزیہ ہنسا اور کہا: "تم نے خاک پڑھا کہ ان کاغذات کے بغیر کورے رہ گئے۔" پھر اس نے کاغذات واپس دیدئے۔ لیکن یہ جملہ تیر کی طرح امام صاحب کے دل میں چبھ گیا، وطن آکر ان یادداشتوں کو یاد کرنا شروع کیا اور پورے تین سال صرف کر کے ان کے حافظ بن گئے۔

سفر نیشاپور اور امام الحرمین کی شاگردی:

اب امام صاحب کی علمی استعداد اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ عام علماء ان کی علمی تشفی نہیں کرسکتے تھے۔ اس لیے وطن سے نکلے اور نیشاپور، جو اسلامی علوم وفنون اور مشاہیر علمائے اسلام کا شہر تھا، وہاں پہنچ کر یگانۂ روزگار استاد امام الحرمین عبد الملک کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نہایت جدوجہد کے ساتھ علم کی تحصیل شروع کی اور مختصر مدت میں ہی فارغ ہوکر معاصرین میں ممتاز ہو گئے امام الحرمین کے حلقۂ درس میں سیکڑوں طلبہ تعلیم پاتے تھے۔ لیکن آپ سب میں ممتاز تھے۔ امام الحرمین کہا کرتے تھے: "غزالی دریائے زخار ہے"۔

نائب مدرسی:

اس زمانے میں یہ طریقہ رائج تھا کہ استاد درس دے چکتا تو سب سے لائق شاگرد، باقی شاگردوں کے سامنے اس مضمون کو دہراتا کہ ان کے بھی ذہن نشین ہو جائے، اس سے "معید" کہتے تھے۔ امام غزالی کو بھی یہ شرف حاصل تھا۔ امام غزالی نے امام الحرمین کی زندگی میں ہی کافی شہرت پالی تھی اور صاحب تصانیف ہو گئے تھے۔ امام الحرمین ان پر ناز کرتے تھے، تاہم جب تک وہ حیات رہے، آپ ان کی صحبت سے الگ نہ ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد نیشاپور سے روانہ ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۲۸ر برس تھی، لیکن عالم اسلام میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔

دربار سے انسلاک:

شروع میں امام صاحب کا مزاج جاہ پسند تھا اور یہ چیز اس دور کے ماحول کے پیش نظر کسی میں پیدا ہو جانا ایک فطری بات تھی۔ نظام الملک کا دربار اہل کمال کی آماجگاہ تھا، آپ نے وہیں کا رخ کیا، نظام الملک آپ کا علمی شہرہ سن چکا تھا، نہایت اعزاز واکرام سے آپ کا استقبال کیا۔ نظام الملک نے مناظرہ کی مجلسیں منعقد کیں، اس دور میں کسی کے فضل وکمال کا امتحان یہی ہوتا تھا کہ وہ مناظرہ میں حریفوں کو شکست دے، چنانچہ متعدد نشستیں ہوئیں، مختلف علمی مضامین پر بحثیں رہیں، لیکن ہر ایک میں امام صاحب

غالب رہے اس سے ان کی دھاک دربار میں بیٹھ گئی اور ہر طرف ان کے چرچے پھیل گئے۔

نظامیہ کے مدرس اعظم:

مدرسہ نظامیہ عالم اسلام کا سب سے بڑا اور وقیع مدرسہ تھا، اس کی مدرسی کا منصب عظیم الشان رتبہ تھا، کتنے اہل کمال نے اس کی آرزو میں عمریں گزادیں، نظام الملک نے امام صاحب کو نظامیہ کے مسند درس کے لیے منتخب کیا۔ امام صاحب کی عمر اس وقت صرف ۳۴ برس تھی۔ یہ فخر انہی کا طرۂ امتیاز بنا۔ امام صاحب جمادی الاول ۴۸۴ھ میں نظامیہ بغداد میں مسند آرائے تدریس ہوئے اور شان وشوکت کے ساتھ درس دینا شروع کیا، ان کے علمی دروس کا سکہ اس قدر جم گیا کہ تین سو مدرسین اور سو امراء ورؤسا بھی شریک ہوتے تھے۔ جاہ ورتبہ کا یہ عالم ہوا کہ وزرا اور امرا تک کو ان کی عظمت وجلال نے دبالیا، ان کی شرکت کے بغیر سلطنت کا کوئی مہتم بالشان معاملہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا تھا۔ اس زمانے میں اسلامی جاہ جلال کے جو دو مرکز تھے۔ خاندانِ سلجوق اور آلِ عباس، دونوں درباروں میں آپ احترام وعظمت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

آپ کے ہاتھوں ایک اہم ملکی مہم کا تصفیہ:

۴۸۵ھ میں ملک شاہ سلجوقی کی وفات ہوئی، شاہ محل ترکان خاتون نے امرائے دربار کو جمع کیا او رملک شاہ کے چار سالہ بیٹے محمود کو جانشین نامزد کیا اور ساتھ ہی خلیفہ بغداد مقتدر باللہ سے درخواست کی کہ خطبہ اسی کے نام کا پڑھا جائے۔ خلیفہ نے اپنی کمزوری کے سبب یہ تو منظور کرلیا کہ امورِ سلطنت ترکان خاتون کے زیر حکومت ہی انجام پائیں۔ لیکن خطبہ خلیفہ کے نام سے ہی پڑھے جانے پر زور ڈالا اِدھر ترکان خاتون کو خطبہ وسکہ پر بڑا اصرار تھا، مفاہمت کی تمام کوششیں بے سود ہو چکی تھیں، بالآخر امام غزالی سفیر بنا کر بھیجے گئے، امام صاحب کی بدولت ترکان خاتون راضی ہو گئیں اور ایک بڑی اہم ملکی کشمکش ان کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔

تلاشِ حق کا سفر:

درباری تعلقات کی بلندیوں اور عالم گیر علمی شہرت کی رفعتوں کا یہ سفر جاری تھا کہ دفعۃً آپ نے ان بلند پروازیوں کو جھٹک دیا ار مسند درس اور درباری تعلقات کو چھوڑ چھاڑ، صحرا کا رخ کیا۔ اب آپ ایک درویش اور جویائے حق تھے، جسے دنیا سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہ کیوں اور کیسے ہوا، خود انہیں کی زبان سنئے۔ امام صاحب "المنقذ من الضلال" میں لکھتے ہیں:

"چوں کہ میری طبیعت ابتدا سے تحقیقات کی طرف مائل تھی، اس لیے رفتہ رفتہ یہ اثر ہوا کہ تقلید کی

بندش ٹوٹ گئی اور جو عقائد بچپن سے سنتے سنتے ذہن میں جم گئے تھے۔ ان کی وقعت جاتی رہی، میں نے خیال کیا کہ اس قسم کے تقلیدی عقائد تو عیسائی، یہودی سبھی رکھتے ہیں، حقیقی علم اس کا نام ہے کہ کسی قسم کے شبہ کا احتمال تک نہ رہ جائے۔ مثلاً یہ امر یقینی ہے کہ عدد تین سے زائد ہے، اگر کوئی شخص کہے کہ نہیں، بلکہ تین زائد ہے اور اس کے ثبوت میں وہ شخص یہ کہے کہ میرا دعویٰ حق ہے، کیوں کہ میں عصا کو سانپ بنا سکتا ہوں اور وہ بنا کر دکھا بھی دے، تو میں کہوں گا کہ بے شبہ عصا کا سانپ بنجانا سخت حیرت انگیز ہے، لیکن اس سے اس یقین میں فرق نہیں آسکتا کہ دس، تین سے زائد ہے"۔

"اب میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس قسم کا یقینی علم مجھ کو کس حد تک ہے، معلوم ہوا کہ صرف حسّیات اور بدیہیات تک لیکن جب کدو کاوش زیادہ بڑھی، تو حسیات میں بھی شک ہونے لگا، یہاں تک کہ کسی امر کی نسبت یقین نہیں رہا تقریباً دو مہینے تک یہی حالت رہی، پھر خدا کے فضل سے یہ حالت تو جاتی رہی، لیکن مختلف مذاہب کی نسبت جو شکوک تھے، باقی رہے، اس وقت جس قدر فرقے موجود تھے، چار تھے متکلمین، باطنیہ، فلاسفہ، صوفیہ۔ میں نے ایک ایک فرقہ کے علوم وعقائد کی تحقیقات شروع کی، علم کلام کے متعلق جس قدما کی تصنیفات تھیں، سب پڑھیں، لیکن وہ میری تسلی کے لیے کافی نہ تھیں، کیونکہ ان میں جن مقدمات سے استدلال ہوتا ہے، ان کی بناء یا تقلید ہے، یا اجماع، یا قرآن وحدیث کے نصوص، اور یہ چیزیں اس شخص کے مقابلے میں بطور حجت کے پیش نہیں کی جاسکتیں، جو بدیہیات کے سوا اور کسی چیز کا قائل نہ ہو۔

فلسفہ کا جس حصہ یقینی ہے، یعنی ریاضیات وغیرہ، اس کو مذہب سے تعلق نہیں، اور جو حصہ مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی الٰہیات، وغیرہ وہ یقینی نہیں، فرقۂ باطنیہ کے عقائد کا تمام تر مدار، امام وقت کی تقلید پر ہے۔ لیکن امامِ وقت کی حقیقت کی نسبت کیوں کر یقین کیا جاسکتا ہے۔ اب صرف تصوف باقی رہ گیا۔

سب سے اخیر میں نے تصوف کی طرف توجہ کی اس فن میں حضرت جنید، شبلی، بایزید بسطامی کے جو ملفوظات ہیں، ان کو دیکھا۔ ابو طالب مکی کی قوت القلوب اور حرث محاسبی کی تصنیفات پڑھیں، لیکن چوں کہ یہ فن دراصل عملی فن ہے، اس لیے صرف علم سے کچھ نتیجہ نہیں حاصل ہو سکتا تھا اور عمل کے لئے ضرور تھا کہ زہد وریاضت اختیار کی جائے، ادھر اپنے اشغال کو دیکھا، تو کوئی خلوص پر مبنی نہ تھا، درس وتدریس کی طرف طبیعت کا میلان اس وجہ سے تھا کہ وہ جاہ پرستی اور شہرت عامہ کا ذریعہ تھی۔ ان واقعات نے دل میں تحریک پیدا کی کہ بغداد سے نکل کھڑا ہوں اور تمام تعلقات کو چھوڑ دوں۔

یہ خیال رجب ۴۸۸ھ میں پیدا ہوا، لیکن چھ مہینے تک [illegible] لیت ولعل میں گذرے، نفس کسی طرح گوارا نہیں کرتا تھا کہ ایسی بڑی عظمت وجاہ سے دست بردار ہو جائے، ان ترددات میں نوبت [illegible] یہاں تک پہنچی کہ

زبان رک چکی، درس دینا بند ہوگیا، رفتہ رفتہ ہضم کی قوت جاتی رہی، آخر طبیبوں نے علاج سے ہاتھ اٹھالیا اور کہہ دیا کہ ایسی حالت میں علاج کچھ سود مند نہیں ہو سکتا۔ بالآخر میں نے سفر کا قطعی ارادہ کر لیا۔ علماء اور ارکانِ سلطنت کو جب یہ خبر ہوئی۔ تو سب نے نہایت الحاح کے ساتھ روکا اور حسرت سے کہا کہ یہ اسلام کی بد قسمتی ہے ایسی نفع رسانی سے آپ کا دست بردار ہونا، شرعاً کیوں کر جائز ہو سکتا ہے۔ تمام علماء و فضلا یہی کہتے تھے، لیکن میں اصل حقیقت کو سمجھتا تھا، اس لیے سب چھوڑ چھاڑ کر دفعۃً اٹھ کھڑا ہوا اور شام کی راہ لی"

دمشق میں قیام اور ریاضت و مجاہدہ:

جب آپ بغداد سے نکلے، ذوقعدہ ۴۸۸ھ کا مہینہ تھا، طبیعت پر عجب وارفتگی چھائی تھی، کبھی عیش و تنعم اور ٹھاٹھ باٹ کا وہ عالم تھا کہ دیکھنے والے ہیبت زدہ رہ جاتے اور اب یہ حال کہ صرف کمبل بدن پر ہے اور ساگ پات پر گذران ہے۔ بغداد سے شام پہنچے اور دمشق میں مسلسل دو سال قیام کیا، یہ زمانہ زیادہ تر ریاضات و مجاہدہ، مراقبہ و نفس کشی میں گزرا، تاہم علمی اشغال بھی جاری رہے۔

امام صاحب نے ریاضت و مجاہدہ کا طریقہ تصوف کی کتابوں سے سیکھا تھا، لیکن آپ نے شیخ ابو علی فارمدی سے بیعت بھی کی تھی اور مورخین کا اندازہ ہے کہ آپ نے بیعت طالب علمی کے زمانے میں ہی کی ہوگی، جب کہ آپ کی عمر ۲۷ برس سے زیادہ نہ تھی۔ دمشق میں دو سال ٹھہرتا ہوا، ایک دن مدرسہ امینیہ گئے، دیکھا کہ مدرس نے سلسلۂ کلام میں کہا: "امام غزالی نے یہ لکھا ہے" وہ مدرس امام صاحب کو پہچانتا نہ تھا، امام صاحب نے اس خیال سے کہ یہ چیز غرورِ نفس کا سبب نہ بن جائے، بیت المقدس کا رخ کیا۔ یہاں بھی صخرہ کے کمرے میں بند ہو کر دن دن بھر ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہتے۔

سفر بیت المقدس اور حج و زیارت:

بیت المقدس کی زیارت کے بعد مقام خلیل گئے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر ہے، پھر حج کے لیے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ گئے اور مکہ میں کافی دنوں قیام کیا، اسی سفر میں مصر و اسکندریہ بھی پہنچے اور اسکندریہ میں طویل قیام رہا، تلاش حق کا یہ سفر دس سال جاری رہا، اس دوران متبرک مقامات کی زیارت کی اکثر آبادی سے نکلنے اور ویرانی میں چلے جاتے چلتے کھینچتے اور نفس کی ریاضتیں کرتے، سفر کے کچھ حالات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ شرح احیا اور مکاتیب غزالی میں لکھا ہے:۔

حالات سفر:

ایک شخص نے ان کو بیابان میں دیکھا، اس وقت ایک خرقہ بدن پر تھا اور ہاتھ میں پانی کی چھاگل تھی۔ وہ ان

کو چار سو شاگردوں کے حلقہ میں دیکھ چکا تھا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا کہ کیا درس دینے سے یہ حالت بہتر ہے؟ امام صاحب نے حقارت کی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور یہ اشعار پڑھے:

ترکت ھوی لیلی وسعدی بمنزل　　　وعدت إلی مصحوب اول منزل

فنادت بی الأشواق مهلاً فهذه　　　منازل من تهوی رویدك فانزل

۴۹۹ھ ہجری میں جب مقام خلیل میں پہنچے تو حضرت ابراہیم کے مزارِ مبارک پر حاضر ہو کر تین باتوں کا عہد کیا:

(۱) کسی بادشاہ کے دربار میں نہ جاؤں گا۔

(۲) کسی بادشاہ کا عطیہ نہ لوں گا۔

(۳) کسی سے مناظرہ و مباحثہ نہ کروں گا، چنانچہ مرتے دم تک ان باتوں کے پابند رہے۔

بیت المقدس میں ایک دن مہدِ عیسیٰ میں یعنی جہاں حضرت عیسیٰ کا گہوارہ تھا، حاضر ہوئے، چند مقدس بزرگ یعنی اسماعیل حاکمی، ابراہیم، ابوالحسن بصری بھی ساتھ تھے، دیر تک صحبت رہی، امام صاحب نے ذوق کی حالت میں یہ اشعار پڑھے:

فدیتك لو لا الحب کنت فدیتنی　　　ولکن یسحر المقلتین سبیتنی

اتیتك لما ضاق صدری عن الهوی　　　ولوکنت تدری شوقی اتیتنی

ابوالحسن بصری پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی جس سے تمام حاضرین پر اثر ہوا، یہاں تک کہ اکثروں نے گریبان چاک کر ڈالے،

امام صاحب نے احیاء العلوم جیسی شاہکار کتاب اسی سفر میں تصنیف کی، گویا جہاں روحانی بلندیوں کی طرف محو پرواز تھے، علمی فتوحات کی مہم بھی جاری تھی، حالاتِ سفر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے علمی مشاغل کو بھی ایک قلم خیر باد نہیں کہا تھا، رسالہ "قواعد العقائد" بھی اسی سفر میں بیت المقدس والوں کی فرمائش پر لکھا۔

دوبارہ تدریسی مشغلہ:

تلاش حق کے اس روحانی سفر کی ریاضات و مجاہدات سے جب تمام حجابات اٹھ گئے تو اپنے زمانہ پر نظر ڈالی، جس میں انبوہ کا انبوہ غلط ڈگر پر جا رہا تھا، عقلیات کا دور دورہ تھا، اسی زمانہ میں حکومت وقت کا فرمان پہنچا کہ "درس و افادہ کی خدمت قبول کیجئے" امام صاحب نے اصلاح خلق کے لیے عزلت گزینی کو ترک کیا اور ذو قعدہ ۴۹۹ھ میں نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں مسند درس کو زینت بخشی اور پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہو گئے ۵۰۰ھ امام صاحب نے عہدۂ تدریس سے کنارہ کشی اختیار کی اور طوس میں خانہ نشیں ہو گئے

یہیں گھر کے پاس ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی، جس میں اخیر دم تک علوم ظاہری و باطنی کا درس دیتے رہے۔

حاسدین کی فتنہ پردازیاں:

امام صاحب کے رتبہ و منزلت اور شہرت و مقبولیت میں جس قدر اضافہ ہوتا جاتا تھا، آپ کے حاسدین بڑھتے جاتے تھے اور آپ کی قدر و مرتبت گھٹانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ آپ نے آغازِ شباب میں "منخول" نامی کتاب لکھی تھی، جس میں امام ابو حنیفہ کے متعلق نامناسب باتیں کہی تھیں، فتنہ پرداز حاسدوں نے نمک مرچ لگا کر سلطان سنجر کے دربار میں آپ کے خلاف شکایتیں کیں۔ سنجر امام ابو حنیفہ سے حسن عقیدت رکھتا تھا۔ حاسدوں کو اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ سنجر صاحبِ علم نہ تھا کہ خود معاملے کو فیصل کر سکتا، اس نے ان حاسدین کی بات پر یقین کر لیا اور امام صاحب کو دربار میں طلب کیا۔

امام صاحب بیت المقدس میں مقام خلیل میں کسی دربار میں نہ جانے کا عہد کر چکے تھے، چنانچہ طویل مراسلت ہوئی اور سنجر نے متاثر ہو کر روبرو گفتگو کرنی چاہی، لیکن اس طرح تو بادشاہ پر امام صاحب کا جادو چل سکتا ہے، انھوں نے پھر سازشیں شروع کر دیں، بالآخر آپ کو دربار میں طلب کیا گیا، امام صاحب مجبوراً سلطان سنجر کے دربار میں تشریف لے گئے، اس نے بڑے احترام سے آپ کا استقبال کیا اور اپنے تخت شاہی پر بٹھلایا، پھر امام صاحب نے بیباکانہ گفتگو کی، ساری صورت حال بتلائی اور بادشاہ کو رعایا کی فلاح و بہبود کی نصیحتیں کیں۔ فرمایا: "میری نسبت جو یہ مشہور کیا جاتا ہے کہ میں نے امام ابو حنیفہؒ پر طعن کیے ہیں، محض غلط ہے۔ امام ابو حنیفہ کی نسبت میرا وہی اعتقاد ہے، جو میں نے کتاب احیاء العلوم میں لکھا ہے، میں ان کو فن فقہ میں انتخابِ روزگار خیال کرتا ہوں"۔

سنجر پر اس گفتگو کا بہت زیادہ اثر ہوا اور اس نے کہا: "آج عراق و خراسان کے تمام علماء کا مجمع ہوتا، تو سب لوگ آپکے کلام سے مستفید ہوتے، تاہم یہ حالات آپ اپنے ہاتھ سے قلمبند کیجیے، تاکہ تمام ممالک میں مشتہر کیے جائیں، جس سے لوگوں کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ میرا اعتقاد علما کی نسبت کیسا ہے؟ آپ کو درس و افادہ کی خدمت ضرور قبول کرنی ہوگی۔ فخر الملک جس نے آپ کو نیشاپور کے قیام پر مجبور کیا تھا، میرا ادنی خادم تھا، میں حکم دوں گا کہ تمام علما سال میں ایک بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور اپنی مشکلات آپ سے حل کریں"۔

دربار شاہی سے امام صاحب کامران طوس واپس آئے، تمام شہر استقبال کو امڈ پڑا، لوگوں نے جشن عام کر کے آپ پر زر و جواہر نثار کیے۔

فتنہ پردازوں کو آپ کی مقبولیت دیکھ کر کسی کروٹ چین نہیں آتا تھا اور وہ مخالفتوں کے نئے تانے بانے بنتے رہتے تھے، لیکن ان کی کوششیں بارآور نہ ہوتی تھیں۔ امام صاحب بدستور مسلمانوں کے دینی پیشوا اور

تمام حلقوں میں مقبول رہے، اخیر میں پھر سلطنت و حکومت کی طرف سے کوششیں کی گئیں کہ امام صاحب نظامیہ بغداد میں اپنے درس سے خلقت کو فائدہ پہنچائیں اور اس کے لیے تمام وسائل کام میں لائے گئے، لیکن امام صاحب بہر صورت راضی نہ ہوئے اور معذرتوں کا حال لکھ کر گلو خلاصی اختیار کی اور گوشہ عافیت سے باہر نہ نکلے۔ اپنے طول طویل خط میں بغداد نہ آنے کے یہ اعذار لکھے:

"ایک یہ کہ یہاں طوس میں اس وقت ڈیڑھ سو مستعد طلبہ مصروف تحصیل ہیں، جن کو بغداد جانے میں زحمت ہوگی۔ دوسرے یہ کہ جب میں پہلے بغداد میں تھا، تو میرے اہل و عیال نہ تھے۔ اب بال بچوں کا جھگڑا ہے اور یہ لوگ ترک وطن کی زحمت نہیں اٹھا سکتے تیسرے یہ کہ میں نے مقام خلیل میں عہد کیا ہے کہ کبھی مناظرہ و مباحثہ نہ کروں گا اور بغداد میں مباحثہ کے بغیر چارہ نہیں۔ اس کے سوا دربار خلافت میں سلام کرنے کے لیے حاضر ہونا ہوگا اور میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں مشاہرہ اور وظیفہ قبول نہیں کر سکتا اور بغداد میں میری کوئی جایداد نہیں"۔

فن حدیث کی تکمیل:

طالب علمی کے دور میں امام صاحب نے فن حدیث نہیں پڑھا تھا، لیکن بڑی خواہش تھی اسکی تکمیل کی صورت بھی نکل آئی، حافظ عمر بن ابی الحسن الرواسی، جو مشہور محدث تھے، حسن اتفاق سے طوس میں آئے، امام صاحب نے ان کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور ان سے صحیح بخاری و مسلم کا درس لیا۔

اخیر ایام عمر:

زندگی کے آخری دنوں میں نفس کشی اور ذوق عبادت بہت بڑھ گیا تھا، ہمہ وقت اور رات دن مجاہدات و ریاضات میں بسر کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود بھی علمی اشغال سے ہاتھ نہ اٹھایا اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ کچھ نہ کچھ جاری رہا۔ امام صاحب کی کتاب "مستصفیٰ" جو اصول فقہ میں ان کی نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے، اس کا سن تالیف ۵۰۴ھ ہے۔ اس کے ایک سال بعد ہی امام صاحب کا انتقال ہو گیا۔

وفات:

امام صاحب کی وفات طاہران شہر میں ۱۴/ جمادی الأخری ۵۰۵ھ میں ہوئی۔ آپ یہیں آسودۂ خواب ہیں، امام صاحب کے بھائی احمد غزالی آپ کے قصۂ وفات کا یوں ذکر کرتے ہیں: "پیر کے دن امام صاحب، صبح کے وقت بستر خواب سے اٹھے، وضو کر کے نماز پڑھی، پھر کفن منگوایا اور آنکھوں سے لگا کر کہا "آقا کا حکم سر آنکھوں پر" یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیے، لوگوں نے دیکھا، تو دم نہ تھا"۔ آپ کی وفات سے تمام اسلامی دنیا غموں میں ڈوب گئی۔

تحفظ ختم نبوت کانفرنس چنڈی گڈھ

نعرہائے تکبیر کے ساتھ عوام کا اعلان
اب ہم مسلمانوں کو قادیانیوں کے دجل وفریب سے آگاہ کرتے رہیں گے۔

رپورٹ : مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری نائب ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند

گذشتہ کچھ عرصہ سے قادیانیوں نے پنجاب میں اپنی ریشہ دوانیاں تیز کردی ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد وہ بھولے بھالے مسلمان جو پنجاب کے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں نہایت قلیل تعداد میں رہ کر اپنے دین وایمان کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ اب قادیانیوں نے ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر خود کو مسلمان ظاہر کرکے انہیں دین اسلام سے ہٹانے اور مرزائی مذہب میں داخل کرکے مرتد بنانے کی مہم تیز کردی ہے۔

کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کی کوششوں سے چنڈی گڈھ شہر میں مرکزی دفتر کے زیر نگرانی ایک کمیٹی بنام مجلس تحفظ ختم نبوت چنڈی گڈھ، ہریانہ وہماچل پردیش قائم کی گئی۔ جو باوجود بے سروسامانی کے متعدد کارہائے نمایاں انجام دے چکی ہے۔

الحمد للہ مجلس کی مساعی جمیلہ سے تینوں صوبوں کے متعدد دیہاتوں میں بے شمار افراد کو جو قادیانیت سے متاثر یا قادیانیت کی لعنت کا طوق گلے میں ڈال چکے تھے، ہدایت نصیب ہوئی ہے۔

مجلس کی مساعی جمیلہ میں سے یہ ایک عظیم کارنامہ ہے کہ اس سال ۱۲ ربیع الاول کے موقع پر چنڈی گڈھ کی جامع مسجد کے وسیع وعریض پارک میں تحفظ ختم نبوت کانفرنس بلانے کا اہتمام کیا اور جس جگہ دو سو ۲۰۰ افراد کا جمع ہونا مشکل تھا وہاں ڈیڑھ ہزار سے زائد شیدائیان ختم رسالت ﷺ دیکھنے میں آئے۔ اور بعد نماز مغرب ساڑھے سات بجے پروگرام شروع ہوا تو رات کے ساڑھے بارہ بج گئے پھر بھی مجمع سے کوئی ایک فرد اٹھنے کیلئے تیار نہ تھا، کانفرنس کو خطاب کرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند سے راقم الحروف (شاہ عالم) و حضرت مولانا قاری شفیق الرحمن صاحب استاذ تجوید دارالعلوم دیوبند، صوبہ ہریانہ سے جناب حضرت

مولانا مفتی محمد طیب صاحب مہتمم مدرسہ بدرالعلوم رائے پور گوجراں یمنا نگر ہریانہ ، ہماچل سے جناب حضرت مولانا محمد ممتاز صاحب مہتمم مدرسہ اصلاح الفکر شملہ۔اور جناب حضرت مولانا ظہیر صاحب بدر جناب مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی آر گنائزر جمیعۃ علماء ہند بر آے پنجاب و ہماچل و ہریانہ کودعوت دی گئی تھی جبکہ اسٹیج پر مقامی علماء کے علاوہ اخباری نمائندے اور جلسے میں بعض صوبائی وزراء بھی موجود تھے۔طے شدہ پروگرام کے مطابق ٹھیک ساڑھے سات بجے جناب مولانا شکیل احمد صاحب مہتمم مدرسہ الیضاح العلوم مجددی وناظم اعلیٰ مجلس تحفظ ختم نبوت چنڈی گڑھ نے مائک سنبھالا تلاوت قرآن مجید ونعت شریف کے بعد جناب مولانا اجمل خاں صاحب خطیب جامع مسجد کو دعوت سخن دی موصوف نے زیر صدارت حضرت مولانا ظہیر عالم صاحب بدر قاسمی اجلاس کی کاروائی آگے بڑھانے کی عوام وخواص سے تائید پاکر مختصر لفظوں میں جلسہ کے اغرض ومقاصد بیان کئے۔

موصوف نے بتایا کہ چنڈی گڑھ اور اسکے اطراف وجوانب میں عوام کی جہالت سے قادیانیوں نے فائدہ اٹھانا شروع کردیا ہے اس لئے وقت کا تقاضا ہے کہ امت مسلمہ کے ہر فرد کو اس فتنہ کی زہرناکی اور خطرناکی سے آگاہ کردیا جائے۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا کوئی مسلمان بھائی ناواقفیت کی وجہ سے اسلام کے نام پر اسلام سے نکل کر قادیانی اور مرتد بن جائے اور اسے خبر بھی نہ ہو مولانا اجمل خاں صاحب کے بیان کے بعد خود صدر جلسہ جناب مولانا ظہیر عالم صاحب بدر قاسمی نے مجمع سے خطاب کیا اور ہماچل وہریانہ اور پنجاب میں ہونے والی قادیانی ریشہ دوانیوں کی مختصر روداد سناتے ہوئے ہر عام وخاص کو اس صورت حال سے بیدار رہنے کی تاکید فرمائی مولانا موصوف کے بعد جناب مولانا و قاری شفیق الرحمٰن صاحب مدظلہ کرسی خطابت پر جلوہٴ افروز ہوئے اور تقریباً ایک گھنٹہ تک دلکش ،شیریں آواز اور مقررانہ طرز وانداز سے مجمع کو مسحور کئے رکھا۔جناب قاری صاحب کا موضوع سیرت النبی ﷺ تھا موصوف نے اس موضوع میں اس پہلو کو بھی اپنایا جس سے باطل فرقوں اور بالخصوص مدعیان نبوت کی خوب خوب قلعی کھولی۔

حضرت قاری صاحب کے بعد جناب مولانا شکیل احمد صاحب ناظم اعلیٰ مجلس تحفظ ختم نبوت نے مجلس کی کارگذاری پڑھکر سنائی جو تقریباً ۱۲ صفحات پر مشتمل تھی اور بتایا کہ ابتک مجلس کے پاس مستقل کوئی فنڈ نہیں بس اہل خیر حضرات کے بذل ہمت سے سارے کام انجام دیئے جارہے ہیں۔

مختصر مدت میں اور اس بے سروسامانی کے عالم میں مجلس کی مساعی جمیلہ دیکھ کر مجمع کا دل باغ باغ ہوگیا۔

الحمد اللہ جلسہ کی یہ کاروائی چلتی رہی ادھر دشمنان اسلام قادیانیوں کا کلیجہ جلتا رہا "کھسیانی بلی کھمبا نوچے"

کے مصداق کچھ نہ ہو سکا تو اس سیکڑ کی بجلی ہی غائب کرادی گئی مگر گھنٹو، بجلی اور مائک نہ ہونے کے باوجود مجمع سے اپنی جگہ سے ایک فرد بھی نہ ہلا جبکہ جلسہ طے شدہ پروگرام کے مطابق صرف ۹ر بجے تک چلنا تھا اور دس بج چکے تھے پھر بھی مجمع اپنی جگہ پر سکون تھا دریں اثناء اناؤنسر نے راقم سطور کو دعوت دی۔ بیٹھتے ہی بندہ نے اخباری نمائندوں کو مرزا قادیانی کے ان دعاوی کے حوالے نوٹ کرادینا ضروری سمجھا جنکا ذکر پہلے مقررین کے بیان میں آچکا تھا تاکہ بات پکی رہے اور مجمع میں جو متاثرین ہوں انھیں بھی کوئی شک وشبہ نہ رہ جائے۔

حوالجات نوٹ کرانے کے بعد بندہ نے "مجلس تحفظ ختم نبوت اور موجودہ زمانہ میں اسکی ضرورت" پر روشنی ڈالی کیونکہ یہی موضوع بندہ ناچیز کیلئے منتخب کیا گیا تھا، اس ضمن میں مختصر سی باتیں ناچیز نے مجمع کے سامنے رکھیں، کہ الحاد وبے دینی کا دور ہے جو چاہتا ہے ہمارے قرآن مجید کے خلاف اسلامی تعلیمات وعقائد کے خلاف اٹھتا ہے اور دھڑلّے سے ان کی بے حرمتی کرتا ہے اور ہم خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہتے ہیں کیا ہماری غیرت وحمیت کا یہی تقاضا ہے؟ ہمارے اکابر واسلاف نے جان وخون کا نذرانہ دیکر ہم تک دین وایمان پہونچایا ہے ہونا یہ چاہئے کہ ہم بھی تن، من، دھن، کی قربانی پیش کریں اور اسلامی تعلیمات وعقائد کو اپنے سینہ سے لگائے رکھیں۔

قادیانیوں نے اسلام کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر رکھا ہے اسلام کے نام پر اسلام کی بیخ کنی میں لگے ہوئے ہیں اسلامی تعلیمات کو مسخ کرکے اسلام ہی کے نام پر پیش کررہے ہیں اور یہیں شہر چنڈ یگڑھ اور اسکے اطراف وجوانب میں یہ سب کچھ ہورہا ہے مسلمانوں کے ایمان کو خریدا جارہا ہے۔ اس فتنہ کے سدباب کے لیے مجلس تحفظ ختم نبوت کا قیام لازمی اور ضروری تھا۔ راقم سطور کے بیان کے بعد جناب مولانا مفتی محمد طیب صاحب نے بیان فرمایا موصوف نے اپنے مختصر سے مگر جامع بیان میں قادیانیوں کی اسلام دشمن طاقتوں سے بالخصوص انگریزوں سے پرانی اور نئی دوستی کا پردہ فاش کیا اور سوا بارہ بجے حضرت مفتی صاحب ہی کی دعاء پر اجلاس اختتام کو پہونچا، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اجلاس کو نافع خلائق بنائے اور اسکے معاونین بالخصوص مولانا محمد عمران صاحب مدرس مدرسہ ایضاح العلوم اور انکے رفقائے کار کو اجر عظیم عطا فرمائے (آمین)

حکیم افہام اللہ صاحب، رکن شوریٰ کی وفات

دار العلوم دیوبند میں ایصال ثواب کا خصوصی اہتمام

حضرت مولانا حکیم افہام اللہ صاحب، رکن شوریٰ دار العلوم دیوبند کے انتقال کی خبر جوں ہی ادارے میں آئی، فوراً ہی نائب مہتمم حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب کے حکم سے مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے دار الحدیث میں کلمہ طیبہ کے ختم کا انتظام کیا گیا۔

اس موقع پر حضرت مولانا عبد الحق صاحب نے جو کہ اس ادارے میں علیا کے استاذ ہیں...... مولانا افہام اللہ صاحب کی خدمات اور سلسلہ رشد وہدایت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

مولانا حکیم افہام اللہ صاحب، انہونا ضلع رائے بریلی اتر پردیش کے رہنے والے تھے، آپ کا نسبی تعلق جون پور سے تھا سلسلہ رشد وہدایت میں آپ حضرت شاہ وصی اللہ صاحب سے متعلق تھے" مشہور عالم دین و مرشد حضرت مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی مدظلہ آپ کے سمدھی ہیں، حکیم صاحب مرحوم کے صاحب زادے جناب حکیم محمد کلیم اللہ صاحب حضرت مولانا ہردوئی مدظلہ کی صاحب زادی سے منسوب ہیں کلیم اللہ صاحب بھی ایک کامیاب معالج ہیں اور علی گڈھ میں ان کا مطب مرجع خاص وعام ہے حکیم صاحب موصوف ماہر نباض اور طبیب حاذق تھے۔ علی گڈھ یونیورسٹی کورٹ کے رکن اور دیگر بہت سی تنظیموں اور اداروں سے وابستہ تھے، عرصہ دراز سے صاحب فراش تھے، علیگڈھ میں ایک عرصے تک تدریسی خدمات انجام دی ہیں اور طبیہ کالج کے پرنسپل بھی رہے۔

دار العلوم دیوبند کے جامعہ طبیہ سے گہرا تعلق رکھتے تھے اور اس کے اہم امور میں حتی الامکان معاونت فرماتے تھے، آپ ۱۳۹۲ھ میں دار العلوم کی رکن شوریٰ کے ممبر منتخب ہوئے اور تادم حیات ممبر رہے دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے آپ نے اس ادارے کی بیش قیمت خدمات انجام دیں یہاں تک کہ علماء اور ملازمین آپ کے فیض یافتہ رہے ہیں۔

دار العلوم دیوبند کے اساتذہ و طلبہ نے آپ کے لئے ایصال ثواب کیا اور پسماندگان کیلئے صبر جمیل کی دعاء کی۔

الفوز الکبیر جدید عربی لباس میں

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے مشہور و معروف کتاب الفوز الکبیر قرآن فہمی کے اصول و قواعد پر نہایت مفید اور اہم کتاب ہے خود شاہ صاحب قدس سرہ الفوز الکبیر کے دیباچہ میں ارقام فرماتے ہیں کہ:

میں نے اس رسالہ میں نہایت کار آمد باتیں عمدہ ترتیب کے ساتھ جمع کر دی ہیں، اگر عزیز طلبہ ان کو اچھی طرح سمجھ کر یاد کرلیں تو اللہ تعالیٰ کی بے پایاں مہربانی سے امید ہے کہ کتاب اللہ کے مطالب میں کشادہ شاہراہ کھل جائے گی، اگر کوئی عمر بھر کتب تفسیر کا مطالعہ کرتا رہے اور پوری زندگی اساتذہ تفسیر سے علوم قرآن سیکھتا رہے، تب بھی یہ کار آمد باتیں ایسی عمدہ ترتیب کے ساتھ اسے حاصل نہیں ہو سکتیں، نیز دار العلوم دیوبند کے مایۂ ناز فرزند مبصر عالم دین اور عظیم سیاسی مفکر در ہنما حضرت مولانا عبید اللہ سندھی نور اللہ مرقدہ شاہ صاحب کے کمالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ:

"ہم نے امام فخر الدین رازی (محمد بن عمر متوفی ۶۰۶ھ) کی تفسیر پڑھی، نیز جار اللہ زمخشری (محمود بن عمر متوفی ۵۳۸ھ) کی تفسیر کا مطالعہ کیا، ان کے علاوہ معالم التنزیل از (ابو محمد حسین بن سعود فراء) بغوی (متوفی ۵۱۰ھ) اور تفسیر حافظ (عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمر المعروف بہ) ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) بھی پڑھی، ان سے ہمیں اپنی استطاعت کے مطابق سوائے تحیّر کے کچھ نصیب نہیں ہوا، اگر طالب علمی کے عہد میں ہم نے نجم الائمہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ (متوفی ۱۳۳۹ھ) سے چند آیتوں کی تفسیر نہ سنی ہوتی جو کتابوں میں نہیں ملتی، اور ہمارے لئے وہ اطمینان کا ذریعہ بنی" اور اس کے ساتھ ہی شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ) کے بعض تفسیری جملے ہم نے نہ پڑھے ہوتے تو ہم علم تفسیر کے حاصل کرنے سے قطعاً مایوس ہو جاتے، ہم مانتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں مسلمانوں نے انہیں کتابوں سے قرآن سمجھا تھا، جب وہ قرآن کی حکومت مجتہدانہ اصول پر قائم کر رہے تھے، مگر اس قسم کی تفسیروں سے قرآن فہمی ہمارے لئے ناممکن ہے۔

ہم نے مولانا شیخ الہند قدس سرہ سے اصول تفسیر پر کتابیں مانگیں، آپ نے کتاب الاتقان فی علوم القرآن، از حافظ جلال الدین (عبد الرحمن بن ابی بکر سیوطی ۹۱۱ھ) ہمیں مرحمت فرمائی، اور میں نے پوری کوشش سے ساری کتاب بار بار پڑھی، سوائے چند اوراق کے مجھے اس میں کوئی چیز دلچسپ نظر نہ آئی، جسے اصول کا درجہ دیا جا سکے، یہ زمانہ ایسا تھا کہ میں اصول فقہ سے فارغ ہو کر اس میں ایک مستقل تصنیف لکھ

چکا تھا، اسی زمانہ میں حضرت مولانا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ایک مختصر سا رسالہ اصول تفسیر میں شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی لکھا ہے، جس کا نام الفوز الکبیر ہے یہاں میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت مولانا قدس سرہ کی عادت مبارکہ کا ضمناً ذکر کروں، آپ جانتے تھے کہ امام فخر الدین رازی اور علامہ تفتازانی کو عموماً طلبہ میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ان مذکورہ حضرات کے مقابلہ میں طلبہ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی بات سننے کے لئے بھی تیار نہیں، نجم الائمہ شیخ الہند اگر کسی مسئلے میں امام رازی یا علامہ تفتازانی کی تغلیط کرتے تو مبہم طور پر یہ فرماتے کہ محققین کی رائے اس مسئلہ میں یوں ہے، طلبہ سمجھتے کہ یہ "محققین" ان حضرات سے بھی کوئی مقدم ہستیاں ہوں گی ایک لمبے عرصے کے بعد میں سمجھ پایا کہ محققین سے مراد حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم اور ان کے اساتذہ کرام اور مشائخ عظام ہیں، جو شاہ ولی اللہ صاحب پر ختم ہو جاتے ہیں۔

یہ باعث تھا کہ آپ نے، الفوز الکبیر، مجھے شروع میں عطانہ کی، بلکہ فقط اس کا تذکرہ کر دیا، جب میں سندھ پہنچا تو مجھے الفوز الکبیر کا نسخہ ملا اس سے پیشتر امام رازی کی تفسیر کا مطالعہ کر کے کافی پریشان ہو چکا تھا، فصل اول کا مطالعہ ختم کر لینے کے بعد میں مطمئن ہو گیا کہ ان شاء اللہ علم تفسیر مجھے آسکتا ہے پھر اس دن سے آج تک میں ان کے مسلک سے باہر جانے کی ضرورت محسوس نہیں کر سکا، (الفرقان بریلی کا شاہ ولی اللہ نمبر ۲۴۷ ص ۲۴۸ ص)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب، قدس سرہ اور مولانا عبیداللہ سندھی نوراللہ مرقدہ نے الفوز الکبیر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ مبالغہ آمیزی نہیں بلکہ حقیقت ہے اسی لئے آج تمام مدارس عربیہ میں الفوز لکبیر داخل نصاب ہے، مگر عام طور پر اتنی مفید اور اہم کتاب کو جلالین شریف کے بعد اسوقت پڑھایا جاتا ہے جب عزیز طلبہ سالانہ امتحان کی تیاری میں مشغول و منہمک ہو جاتے ہیں، اور اسباق سے زیادہ آموختہ کی طرف ان کی توجہ مبذول ہو جاتی ہے، اس لئے دارالعلوم دیوبند کے ارباب انتظام نے یہ طے کیا کہ الفوز الکبیر کو شروع سال میں حسامی سے پہلے پڑھایا جائے تاکہ خاطر خواہ فائدہ برآمد ہو اور قرآن فہمی کے اصول و قواعد سے فرزندان دارالعلوم اچھی طرح واقف ہو جائیں۔

دارالعلوم کے ارباب انتظام کا یہ اقدام نہایت مفید ثابت ہو اور عزیز طلبہ الفوز الکبیر کو دلچسپی سے پڑھنے لگے مگر اساتذۂ کرام کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا کیونکہ جن صاحب نے الفوز الکبیر کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا ہے ان کی تعریب میں بہت خامیاں ہیں ان خامیوں کو واضح کر کے پڑھانے میں کافی وقت درکار ہے اور واضح نہ کرنے کی صورت میں طلبہ کو مطمئن کرنا دشوار ہے، اس لئے بعض اساتذہ کرام نے دارالعلوم دیوبند کے درجۂ علیا کے استاذ حدیث، اور الفوز الکبیر کی عربی میں شرح لکھنے والے صاحب قلم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری دامت برکاتہم سے اس کی از سر نو تعریب کرنے کی خواہش ظاہر کی، موصوف نے

ان کی اس طلب وخواہش پر الفوزالکبیر کی از سر نو تعریب کا فریضہ انجام دیا اور سابقہ عربی ترجمہ میں جو خامیاں تھیں ان کو دور فرماکر اساتذۂ کرام اور عزیز طلبہ پر عظیم احسان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ استاذ محترم کو ہماری طرف سے بہترین جزاء عطا فرمائیں، موصوف نے عربی ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے کتاب کو آسان سے آسان تر بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے، پوری کتاب میں علامات ترقیم اور ضروری اعراب لگاکر فہم مراد کو آسان کر دیا ہے، عناوین بڑھاکر اور قیمتی حواشی ارقام فرماکر کتاب کے مطالب کو واضح فرمایا ہے، اور کتاب میں جہاں جہاں آیت کریمہ کے ضروری حصے پر اکتفا کیا گیا ہے، وہاں حاشیہ میں پوری آیت سورت کے حوالے کے ساتھ رقم فرمائی ہے، جس سے غیر حافظ اساتذۂ کرام کو پڑھانے میں جو دقت پیش آتی تھی وہ دور ہو جائے گی، اسلئے جو نیک بخت حضرات الفوزالکبیر کو اچھی طرح سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں وہ الفوزالکبیر کی نئی تعریب کی طرف کامل توجہ فرمائیں، اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے علمی فیوض وبرکات سے بھرپور فائدہ اٹھائیں ارباب مدارس عربیہ اس کو داخل نصاب فرمائیں تو نہایت مناسب اور بہت مفید اقدام ہوگا۔

۲　نام کتاب　:　سہ ماہی احوال وآثار، خاص اشاعت، بیاد حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی امیر جماعت تبلیغ مع ضمیمہ اوراق غم

تالیف وترتیب　:　مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی مدیر سہ ماہی احوال وآثار کاندھلہ

صفحات: ۴۸۷ سرورق، دیدہ زیب، کمپیوٹر کتابت، عمدہ کاغذ، معیاری طباعت

ناشر:　دفتر سہ ماہی احوال وآثار حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ ضلع مظفرنگر یوپی ہند

ومکتبہ رشیدیہ ۲۵ لوئرمال لاہور پاکستان قیمت۔ ڈیڑھ سو روپے (۱۵۰)

مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی حفظہ اللہ علم وتحقیق کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں اوساط علمیہ میں ان کے علمی وتحقیقی مقالات وقعت وپزیرائی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں زیر نظر ضخیم سوانحی دستاویزی نمبر مولانا موصوف ہی کی محنت وکاوش کا نتیجہ ہے جس میں ان کی غیرت طلب نے شرکت قلم کو گوارا نہیں کیا۔ تن تنہا اس قدر ضخیم ومعیاری نمبر کی ترتیب واشاعت ان کی بلند ہمت کی منہ بولتی شہادت ہے جسے دیکھ کر برملا زبان قلم پکار اٹھی " ایں کار از تو آید مرداں چنیں کنند ہ تقریباً تین سو عنوانات پر پھیلے ہوئے اس خاص شمارہ میں مولانا موصوف نے وہ سب کچھ جمع کر دیا ہے جسے کسی شخصیت کو پڑھتے ہوئے ایک متجسس نظر تلاش کرتی ہے۔

حضرت امیر جماعت مولانا انعام الحسن کے سوانحی خاکہ کے ضمن میں ان کے آبائے اجداد کا ضروری تذکرہ مولانا کے عہد طفولیت اور دور تعلیم وتحصیل کی سرگزشت حضرت مجدد تبلیغ مولانا محمد الیاس کاندھلوی قدس سرہ سے ارادت ونسبت، جماعت تبلیغ کی تاریخ، مولانا موصوف کی جماعت سے وابستگی، حضرت

رئیس التبلیغ مولانا محمد یوسف کاندھلوی کی رفاقت اور ان کی رحلت کے بعد مولانا مرحوم کی تبلیغی سرگرمیاں جس کے تحت ہندوبیرون ہند ان کے تبلیغی اسفار کی مکمل تفصیل اور ان کے تبلیغی مواعظ کا ایک بڑا حصہ آگیا ہے۔ ان بکھرے ہوئے مضامین کو فاضل مرتب نے اس کمال مہارت کے ساتھ یکجا کردیا ہے کہ ایک حصہ کے مطالعہ کے بعد ذہن از خود دوسرے حصہ کی جانب منتقل ہوجاتا ہے۔ اس دقیع اور بیش قدر علمی مجموعہ کا حق تو یہ تھا کہ اس کے محاسن وخوبیوں کو پورے شرح وبسط سے عالم آشکارا کیا جائے اور اس کے ہر ہر گوشے پر سیر حاصل بحث کی جائے۔ اور اپنا قلبی جذبہ اور دلی داعیہ بھی یہی تھا مگر رسالہ کی تنگ دامانی اپنی تدریسی مشغولیت آڑے آتی رہی اور اسی لیت ولعل میں تین چار ماہ کا وقت گذر گیا۔ مزید تاخیر مناسب نہ سمجھ کر یہ چند سطریں اس احساس کے ساتھ سپرد قلم ہیں کہ "بعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی" انشاء اللہ یہ خاص شمارہ علمی حلقوں میں اپنا مقام خود پیدا کرے گا۔

۴ نام کتاب : مضامین مقبول۔
تصنیف وتالیف: پروفیسر مقبول احمد۔
صفحات : ۲۷۰ طابع قادری پریس اعظم گڑھ
ناشر : ڈاکٹر مقبول احمد
قیمت : ۲۰۰/
ملنے کا پتہ : دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ جامعہ نگر نئی دلی عثمانیہ بکڈپو، رابندر راسرانی کلکتہ ۷۳۔

پروفیسر مقبول احمد ایک دردمند دل رکھتے ہیں ملت کے مسائل اور اس کی ترقی وفلاح وبہبود کے لئے سوچتے ولکھتے ہیں زیر تبصرہ کتاب موصوف کے انہی مقالات کا مجموعہ ہے جس کے پیش لفظ میں پروفیسر خلیق نظامی مرحوم لکھتے ہیں ہندوستان میں مسلمان جن مسائل سے دوچار ہیں ان کا تجزیہ مقبول صاحب نے بہت گہرائی اور سنجیدگی سے کیا ہے۔ وہ اسلام کے سماجی اور دینی اثرات پر پوری نظر رکھتے ہیں اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ نے پیش گفتار میں ان الفاظ میں مضامین مقبول کی افادیت کو بیان کیا ہے۔ یہ سارے مضامین بڑے غور وفکر سے لکھے گئے ہیں اور ان سے لکھنے والے کا دردمندانہ جذبہ اور مسلمانوں کی ترقی وسربلندی کے لئے فکرمندی پوری طرح عیاں ہے۔

ان صاحب نظر ارباب علم وفن کے اظہار حال کے بعد مزید کسی تبصرہ کی حاجت نہیں۔

چونکہ دل سے جوبات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے اس لئے بجاطور پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ مضامین مقبول انشاء اللہ مقبول ہونگے اور قومی وملی زندگی کی تعمیر وترقی میں ان سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔

مدارس اسلامیہ وعربیہ کے ذمہ داران کو جان کر خوشی ہوگی کہ دارالعلوم دیوبند میں سال گذشتہ نصاب تعلیم پر غور وخوض کے دوران جو چند کتابیں از سرنو ترتیب یا تصنیف کے لئے تجویز کی گئی تھیں، وہ اب شائع ہوگئی ہیں۔ وہ یہ ہیں:

(۱) مبادی الفلسفه عام قیمت ۔/۱۶ تالیف حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالنپوری

(۲) تسهیل الاصول عام قیمت ۔/۱۸ تالیف حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب و حضرت مولانا ریاست علی صاحب

(۳) مفتاح العربیه (حصہ اول) عام قیمت ۔/۲۸ تالیف حضرت مولانا نور عالم صاحب مدیر الداعی

(۴) مفتاح العربیه (حصہ دوم) عام قیمت ۔/۴۰ تالیف حضرت مولانا نور عالم صاحب مدیر الداعی

(۵) منتخبه قصائد دیوان متنبی عام قیمت ۔/۵۰

(۶) باب الادب دیوان حماسه عام قیمت ۔/۲۶

نوٹ : ان تمام کتابوں پر رعایت پچاس فیصدی ہوگی

ملنے کا پتہ

مکتبہ دارالعلوم دیوبند

سہارنپور یوپی ۲۴۷۵۵۴ انڈیا

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

ماہ جمادی الثانی ۱۴۱۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۹۸ء

جلد ۸۲	شمارہ ۱۰	فی شمارہ ۶/	سالانہ ۶۰/

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب

استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۲۰۰/ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/
ہندوستان سے ۶۰/

Tel. : 01336 - 22429
Fex : 01336 - 22768
Tel. : 01336 - 24034EDITER

فہرست مضامین

○ یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔

● ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔

● چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے، اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔

● پاکستانی حضرات مولانا نور الحسن ولد عبد الستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

● ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

● بنگلہ دیشی حضرت مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دار العلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

حبیب الرحمٰن قاسمی

ہندوستان میں اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلمانوں کا تشخص وامتیاز آج جن خطرات سے دوچار ہے ۱۸۵۷ء میں بھی شاید یہ صورت حال پیش نہ آئی ہو۔ مغربی تہذیب، ترقی پسندی، سوشلزم، ہندواحیاء پرستی وغیرہ بہت سی تحریکیں ہیں جو ہماری تہذیب اور انفرادیت کے خلاف برسرپیکار ہیں، بالخصوص ہندواحیاء پرستی نے تو جارحیت کی صورت اختیار کرلی ہے، جو اپنے وسیع تر وسائل وذرائع کی طاقت سے اسلامی تہذیب وتمدن کو مسخ کرکے اپنے اندر ضم کرلینے پر تلی ہوئی ہے، یونیفارم سول کوڈ کی تجویز، تعلیمی پالیسی میں مذہب بیزاری کا عنصر، نصابی کتابوں میں اسلام، پیغمبر اسلام اور اسلامی تاریخ و روایات سے متعلق گمراہ کن غلط بیانیاں، قومی ثقافت اور کلچر کے نام پر ہندو عقائد و نظریات اور دیومالائی افسانوں کی حکومتی پیمانے پر اشاعت وترویج اس جارحانہ تسلط پسندی اور انضمامی رجحان کے ادنیٰ مظاہر ہیں۔

یوں تو ہندواحیاء پسندوں کی دشمنی عیسائیت اور کمیونزم سے بھی ہے، لیکن بچند وجوہ ان کے لئے سب سے بڑا چیلنج مسلمان اور ان کی تہذیب وروایات ہیں کیونکہ مسلمانوں کی اپنے تشخص اور اپنی مذہبی انفرادیت کے ساتھ اتنی کثیر آبادی کو (جو مذہبی وتہذیبی اعتبار سے بین الاقوامی سطح پر مسلم دنیا سے وابستہ ہے) ہندواحیاء پسند اپنے سیاسی ومذہبی تسلط کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں ہندواحیاء پسندوں نے تشدد وجارحیت کے ذریعہ ماضی میں ہندوستان کے اندر موجود دیگر ثقافتی ومذہبی اکائیوں کو اپنے اندر یا تو ضم کرلیا یا معاشرہ میں انہیں بے اثر اور اچھوت بنادیا تھا لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں ان کے سارے جارحانہ حربے بے اثر ثابت ہوئے۔ وہ انہیں اپنے اندر جذب کرلینے یا سوسائٹی میں بے اثر بنادینے میں کامیاب نہ ہوسکے بلکہ اس کے برعکس اسلام کی انقلابی اور انسانی مساوات کی تعلیم عام ہونے سے ہندوستان میں آباد پسماندہ طبقات (جو غالب اکثریت میں ہیں) کا رجحان اسلام اور مسلمانوں کی طرف بڑھ گیا جسے دیکھ کر ہندواحیاء پسند غم واضطراب سے بالکل پاگل ہوگئے اور ہر طرف سے یکسو ہوکر مسلمانوں کے وجود اور ان کے مذہب کی بیخ کنی میں لگ گئے ہیں۔

یوں تو اس وقت ہمارے ملک میں ہندو احیاء پسندی کا رجحان بڑی حد تک عام ہے لیکن اس تحریک کی سب سے بڑی علمبردار آر ایس ایس ہے جسکی ذیلی تنظیموں میں سیاسی سطح پر بھارتیہ جنتا پارٹی سماجی و قومی سطح پر وشو ہندو پریشد اور بھارتیہ جن مورچہ اور تعلیم گاہوں کی سطح پر اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد، ہیں یہ آخر الذکر تنظیم اگرچہ پارٹی سے منسلک ہونے کا انکار کرتی ہے لیکن اس کے اصول، خصوصیات طرز عمل، اور مطالبات صاف بتارہے ہیں کہ اس کی تمام تر فکری غذا کا سرچشمہ آر ایس ایس ہی ہے۔

آر ایس ایس کی سرگرمیوں کی وسعت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اسکی آخر الذکر تنظیم جو طلبہ پر مشتمل ہے اس کا دائرہ عمل ملک کی اکثر عصری تعلیم گاہوں کو محیط ہے خاص طور پر دہلی یونیورسٹی مہاراشٹر کے انجینیرنگ کالجز، جھانسی، کانپور، بنارس، مرزاپور، گورکھپور کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس کے اثرات بہت قوی ہیں علاوہ ازیں کرناٹک، کیرلا، حیدر آباد اور راجستھان کی تعلیم گاہوں میں بھی اس کی جڑیں نہایت مضبوط و مستحکم ہیں آر ایس ایس اپنی اسی فعال متحرک اور پر جوش تنظیم کے ذریعہ سرکاری محکموں اور حکومت کے کلیدی عہدوں پر قابض ہوتی جارہی ہے۔

مزید براں سابقہ حکومت کی غلط پالیسیوں مسائل کو ان کے صحیح خدوخال میں دیکھنے سے چشم پوشی، اقتدار کو صحیح مصرف میں استعمال کرنے سے گریز مذہبی معاشی اور جان ومال کے تحفظ جیسے جذباتی معاملات کی جانب سے سرد مہری اور سیکولر کی دعویدار پارٹیوں کی اندھی ہوس اقتدار نے ان فرقہ پرست تنظیموں میں سیاسی طور پر سب سے زیادہ فعال ومتحرک بھارتیہ جنتا پارٹی کو بھرپور سیاسی قوت سے ہم کنار کردیا ہے۔

آر ایس ایس کی ان تمام تر کوششوں کا واحد مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں آباد دیگر اکائیوں بالخصوص مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کرکے اور انہیں معاشی طور پر بدحال بنا کر ان کی خود اعتمادی کو ختم کردیا جائے اور اس طرح نفسیاتی وحشت میں مبتلا کرکے انہیں مجبور کردیا جائے کہ وہ ہندو تہذیب میں ضم ہو جائیں تاکہ اکھنڈ بھارت کا اس کا دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے باہمی منافرت کے بڑھتے ہوئے جذبات، آئے دن کے فرقہ وارانہ فسادات، قومی تہذیب کے نام پر اکثریتی ہندو دیومالائی تہذیب و ثقافت کی ترویج وترقی، یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ پر اصرار، سرکاری تعلیم گاہوں میں بغیر کسی تخصیص کے وندے ماترم کا گیت گانے اور ہندوستان کی فرضی تصویر پر پھول مالا چڑھانے کا اجراء مدارس دینیہ جو اسلامی علوم اور تہذیب وروایت کے محافظ ونقیب ہیں ان کے خلاف آئے دن کی سرکاری سطح پر سازشیں اس تہذیبی جارحیت اور انضمامی رجحان کے وہ چند اسباب اور طریقے ہیں جنہیں زینہ بنا کر یہ جارحیت پسند تنظیم اپنے اصل مقصد تک پہنچنا چاہتی ہے اس کے اس رجحان کی ہلکی سی عکاسی راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ نامی کتاب میں ان الفاظ کے ذریعہ کی گئی ہے۔

ہندو ہندستان میں قدیم زمانے سے آباد ہیں یہاں ہندو ہی ایک قوم ہیں کیونکہ یہاں کی تہذیب وتمدن انہیں کی عطا کردہ ہے۔ غیر ہندو یا تو حملہ آور یا مہمان کی حیثیت سے یہاں آئے۔ غیر ہندو خاص طور سے مسلمان اور عیسائی ہر اس چیز کے دشمن رہے ہیں جس کا تعلق ہندوؤں سے ہے اس لئے وہ ہمارے لئے خطرہ ہیں۔ ہندوؤں کی آزادی وترقی میں دراصل اس ملک کی آزادی وترقی ہے ہندوستان کی تاریخ ان بیرونی دشمنوں کی جارحیت سے ہندوؤں کی اپنے مذہب وتہذیب کے تحفظ کے سلسلے میں جدوجہد کی تاریخ ہے ہندوؤں کا اتحاد اور ان کا استحکام وقت کا شدید تقاضا ہے ہندوؤں کو جو چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے ہیں ان کا مقابلہ مل کر کرنے اور ان سے بدلہ لینے کے لئے اپنی قوت بڑھانی چاہیے جارحیت سب سے بڑی حفاظت (کی چیز) ہے۔

یہ ہیں ہندو احیاء پرستی کے وہ مہلک وخطرناک عزائم جس کے حصار میں ہمارا ملی تشخص، ہماری مذہبی انفرادیت، ہماری اسلامی روایات اور خود ہمارا وجود گھرا ہوا ہے اور یہ حصار دن بہ دن مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جارہا ہے، آج وقت کا شدید تقاضا ہے کہ ہمارے فضلاء، دانشور رہبران ملت، نوجوانان قوم اور خاص طور سے خانوادۂ ولی اللہی سے منتسب علماءِ دین میدان میں نکل کر اپنے اسلاف کے جہد وعمل کی تاریخ کو پھر سے زندہ کریں اس سلسلے میں پہلا کام کرنے کا یہ ہے کہ مسلمانوں کے ایک ایک بچہ کے اندر مسلمان ہونے کا احساس بیدار کردیں یہ احساس اپنی تہذیب و تمدن کی حفاظت میں بہت اہم کردار کا حامل ہوگا۔ دوسرے جارح طاقت کا ہمت وجرأت، حکمت و تدبر اور صبر واستقامت کے ساتھ دفاع کریں، تیسرے اسلام کی اخلاقی وسماجی تعلیمات کو عام کرنے کی سعی بلیغ کریں، ان تدبیروں کے ساتھ خدائے کارساز سے امداد ونصرت کی دعائیں بھی کرتے رہیں ظاہر ہے کہ یہ امور مسلسل جدوجہد کے طالب ہیں اور جذباتی نعروں اور اشتعال انگیز تقریروں کی طرح اپنے اندر شہرت کی کشش بھی نہیں رکھتے ہیں اس لئے شہرت طلبی کے جذبات کو پس پشت ڈال کر صبر واستقامت کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے خدانخواستہ اگر ہم نے وقت کے اس اہم طوفان سے چشم پوشی کی اور اپنی عافیت کوشیوں میں مبتلا رہے جس کے نتیجہ میں وہ ملی ورثہ جو آباء واجداد کے ذریعہ ہم تک پہنچا تھا اسے اپنی اگلی نسل تک منتقل کرنے میں ناکام رہے تو جان لیجئے کہ تاریخ اس جرم عظیم کو کبھی بھی معاف نہیں کریگی۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

مولانا حافظ اقبال رنگونی مانچسٹر

مسئلہ تقلید کے چند اہم گوشے

مقلدین اور غیر مقلدین کو قریب کرنے کے لئے تقلید پر اٹھنے والے ۳۸؍ سوالات کے جوابات

الحمد لله و سلام علیٰ عباده الذین اصطفیٰ امابعد

تقلید دین فطرت میں شروع سے چلی آرہی ہے ترک تقلید کی تحریک ہندوستان کے انگریزی دور میں اٹھی ابتداء میں جو لوگ ترک تقلید میں نکلے وہ تقلید کو گناہ کہنے والے لوگ نہ تھے اور نہ اسے شرک فی الرسالت سمجھا جاتا تھا لیکن افسوس ہے کہ آجکل کے غیر مقلدین اس باب میں انتہاء پر آپہنچے ہیں اور تقلید کو کھلے بندوں گناہ کہہ رہے ہیں اور ائمہ اربعہ کے مقلدوں کے بارے میں طعن و تشنیع کرتے انکی زبانیں نہیں تھکتیں اور نہ انکے قلم رکتے ہیں انکے کچھ لوگ مسئلۂ تقلید پر اردو اور انگریزی کی چند کتابیں ہاتھ میں اٹھائے عام مسلمانوں کو گمراہ کرنے میں کوئی لمحہ ضائع نہیں کرتے اور اس مسئلہ کو ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں گویا تقلید اسلام کے متوازی کوئی دوسری راہ ہے اور اس سے آنحضرت ﷺ کی کھلی مخالفت ہوتی ہے (معاذ اللہ) اس نازک موڑ پر عوام کی غلط فہمیاں دور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ مسلمانوں کا رشتہ اپنے اسلاف سے نہ ٹوٹے اس سلسلے میں مختلف سوالات ہمیں مختلف وقتوں میں وصول ہوئے ہم نے انہیں اپنی ترتیب سے یکجا کر کے انکے مختصر جواب عرض کر دیئے ہیں اور اس میں ہم نے مقلدوں کے اکابر کے کچھ بیانات بھی نقل کئے ہیں ہم اختلاف کی خلیج کو زیادہ وسیع نہیں کرنا چاہتے تاہم یہ جاننا ضروری ہے کہ تقلید میں ہرگز کوئی فکری یا فطری عیب نہیں ہے جس کے باعث مجلس میں اس سے بدکنا اور سٹیج پر اس سے بھڑکنا ضروری ہو جائے، تقلید کو وحشت انگیز قرار دینا اسی طرح غلط ہے جس طرح آج یورپ میں کسی داڑھی والے مسلمان کو دہشت گرد قرار دینا پرلے درجے کی بے حیائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بات کو سمجھنے اور تعصب کو دور کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے آمین۔

(۱) سوال:۔ تقلید کسے کہتے ہیں؟

جواب : تقلید کا لفظ قلادہ سے ماخوذ ہے اگر یہ لفظ انسان کیلئے استعمال ہو تو اس کے معنی ہار کے ہیں، اور اگر یہ لفظ جانور کیلئے آئے تو اس سے مراد گلے کا پٹہ ہے، ام المومنین حضرت عائشہؓ نے کسی سے عاریتاً گلے کا ہار مانگا تو اسے حدیث میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے "استعارت من اسماء قلادۃ" (صحیح بخاری ج ا ص ۵۳۲ صحیح مسلم ج ا ص ۱۶۰) اور آپ نے ایک مرتبہ یہ فرمایا "انسلت قلادۃ لی من عنقی فلو قعت" (مسند احمد ج ۶ ص ۲۷۲) ظاہر ہے کہ یہاں قلادہ کا معنی پٹہ کرنا کسی طرح درست نہیں یہ گلے میں پہننے کا ہار ہے۔

(۲) سوال :۔ تقلید کا لفظی معنی کیا سمجھا جاتا ہے؟۔

جواب: تقلید کے معنی اتباع اور پیروی حکم کے ہیں۔

(۳) سوال :۔ تقلید کا اصطلاحی معنی کیا ہے۔

جواب :۔ تقلید کا اصطلاحی معنی یہ ہے کہ کسی صاحب علم اور قرآن و سنت کے کسی ماہر کے کسی قول کو حسن ظن اور اعتماد کی بناء پر شریعت کا حکم سمجھے اور اس پر عمل کرے۔ اس کے لئے اس عالم سے کسی دلیل کا انتظار نہ کرے۔ یعنی کسی ایسے عالم کی بات کو جو قرآن وحدیث اور آثار صحابہ کا ماہر ہو اس کی بات کو بایں نیت قبول کرے اور اس پر عمل کرے کہ یہ شخص قرآن و سنت کی صحیح مراد بتلا رہا ہے۔ اور قرآن و سنت کا یہی مفہوم ہے۔ اس کا نام تقلید ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے مائیہ ناز عالم اور مفتی اعظم مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب (۱۳۷۲ھ) لکھتے ہیں:

ہمارا اعتقاد ہے کہ حضرت امام اعظم (امام ابو حنیفہؒ) کتاب اللہ اور احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا افضل السلام وازکی التحیہ کے اعلیٰ درجے کے عالم اور علوم دینیہ کے اول درجے کے ماہر تھے انہوں نے قرآن پاک اور احادیث سے جو احکام فقہیہ نکال کر فقہ کو مدون کیا وہ صحیح معنوں میں قرآن پاک اور احادیث کا عطر ہے خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ کے لازوال خزائن سے فقہ فی الدین کا بیش قدر ذخیرہ انہیں عطا فرمایا تھا اور تفقہ فی الدین میں ان کی رفعت شان نہ صرف احناف بلکہ علمائے مذاہب اربعہ کے نزدیک مسلم ہے اس لئے ان کے بتائے ہوئے اور نکالے ہوئے احکام پر عمل کرنا بعینہ قرآن وحدیث پر عمل کرنا ہے۔

آپ آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں کہ :

"ہم خدانخواستہ امام ابو حنیفہؒ کو بالذات واجب الاطاعت نہیں سمجھتے بلکہ ان کا اتباع اور تقلید صرف اسی حیثیت سے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی صراط مستقیم پر چلانے والے ہیں اور شاہراہ سنت پر ہمارے رہبر ہیں" (کفایت المفتی ج ۱، ص ۳۳۲)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مقلد اپنے امام کو واجب الاطاعت اور معصوم عن الخطا سمجھ کر اس کی اتباع اور تقلید نہیں کرتا بلکہ محض اس لئے اس کی باتوں کو مانتا ہے کہ وہ ہم سے زیادہ قرآن و سنت کو سمجھتے ہیں اور ان کی دینی نظر بڑی عمیق ہے اور ان کی دیانت و امانت ہر شبہ سے بالاتر ثابت ہوئی ہے۔

انتہائی افسوس کی بات ہے کہ غیر مقلد عوام اگر اپنے عالم کی بات کو اس لئے قبول کریں کہ وہ ان سے زیادہ قرآن و حدیث کو جانتے ہیں اور غیر مقلد مولوی اپنے علامہ شوکانی۔ نواب صدیق حسن خاں، مولانا نذیر حسین اور مولانا عبداللہ روپڑی کی بات اس لئے قبول کریں کہ وہ قرآن و حدیث کے ان سے بڑے عالم ہیں تو کیا مقلدین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ ان کی بات مانیں جن کے بارے میں قرآن و حدیث کے ماہر ہونے، مقام اجتہاد پر فائز ہونے اور دیانت و امانت اور تقویٰ کے اعلیٰ مدارج پر قائم ہونے کی ایک دنیا گواہی دے چکی ہے؟ جس طرح غیر مقلد عوام کو اپنے عام عالم سے حسن ظن اور اعتماد ہے اور ان کے عالم کو اپنے سے اعلم پر اعتماد ہے اسی طرح احناف کو امام اعظم ابو حنیفہؒ پر اعتماد اور حسن ظن ہے اور وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں قرآن و سنت کی روشنی میں ہی کہتے ہیں جس طرح ایک غیر مقلد دلائل کا تفصیلی جائزہ نہیں لیتا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اس کے عالم نے جو کچھ کہا ہے دلیل سے کہا ہے اسی طرح مقلدین بھی ان دلائل کا انتظار نہیں کرتے، وہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ انہوں نے کوئی بات بے دلیل نہیں کہی ہے۔

(۴) سوال:۔ تقلید کا قومی سطح پر مفہوم کیا ہے عالمی سطح پر تقلید کیسے کہتے ہیں؟

جواب:۔ ہر قوم دوسری قوموں کے مقابلہ میں اپنے شخصیات سے پہچانی جاتی ہے یہ تشخصات اتنے کم بھی نہ کر دئے جائیں کہ کسی گروہ کا قومی دائرہ مختصر ہوتے ہوتے ختم ہی ہو جائے یا صرف مرکز تک ہی رہ جائے اپنے تشخصات کو قومی سطح پر ساتھ رکھنا اور ضائع نہ ہونے دینا اور اپنے تمام افراد کو اپنے ساتھ رکھنا قومی سطح پر تقلید کہلاتا ہے یہ ذہنی اور عملی انتشار سے بچنے کی ایک فکری راہ ہے ڈاکٹر اقبال نے مغربی قوموں کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور ان کی کمزوریاں ان کے سامنے تھیں ہندوستان واپس آکر انہوں نے اقوام مشرق کو ایک دائرہ میں رہنے کا سبق دیا اور کہا۔

راہ آباء رو کہ ایں جمعیت است
معنیٔ تقلید ضبط ملت است

یعنی اپنے بڑوں کے رستے سے نہ ہٹو اکٹھے رہنا اسی کا نام ہے یہ اسلاف کی تقلید ہے جس سے پوری ملت ایک ضابطے میں آجاتی ہے۔

یاد رکھئے جو قوم اپنے ماضی سے کٹتی ہے وہ لقمہ اغیار ہو جاتی ہے فکری آوارگی سے بچنے والے لوگ ہمیشہ تقلید آباء کرتے ہیں، یہاں محض صلبی آباء مراد نہیں علمی آباء مراد ہیں جو عقل و اهتداء کا نور رکھتے ہوں۔

آئین نو سے بچنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

(۵) سوال :۔ کیا تقلید سب کے لئے واجب ہے؟

جواب :۔ جو لوگ قرآن و سنت اور آثار صحابہ سے پوری طرح واقف ہوں ان کی مرادات اور عموم و خصوص کی پوری توجیہات پر نظر رکھتے ہوں اس کے ناسخ منسوخ کا علم ہو اور قرآن و سنت سے مسائل کے استنباط واستخراج پر عبور رکھتے ہوں اگر ایسے لوگ براہ راست مسائل کا استنباط کریں (جنہیں مجتہد کہا جاتا ہے) تو انہیں اس کی اجازت ہے، لیکن عوام اور آج کل کے اہل علم جو شرائط اجتہاد سے کوسوں دور ہیں ان کے لئے تقلید سے چارہ نہیں، جو لوگ قرآن صحیح نہ پڑھ سکیں، ایک حدیث صحیح نہ پڑھ سکیں اگر ایسے لوگ براہ راست قرآن و سنت سے مسائل اخذ کرنے لگیں تو کیا یہ دین سے ایک کھلا مذاق نہیں ہوگا؟ سو ان کے لئے ضروری ٹھہرا کہ وہ اہل علم کی تقلید کریں اور براہ راست مسائل کا استنباط کرنے کے بجائے ان حضرات کا دامن تھامیں جن کی امانت و دیانت اور تقویٰ اور اجتہاد کی ایک دنیا معترف ہے اور جن کے پیچھے صرف عوام ہی نہیں محدثین و مفسرین کی بھی ایک بڑی تعداد عملاً چلی ہو اور باوجود محدث ہونے کے انہوں نے بھی انہی بزرگوں کا دامن تھاما ہو، دین کی سلامتی کے لئے ضروری ہے کہ آدمی غیر منصوص مسائل میں کسی مجتہد درجے کے اہل علم سے وابستہ ہو اور حدیث پر از خود عمل کرنے کی آفت سے بچے عبداللہ ابن وہب (۱۹۷ھ) نے کتنی کھل کر بات کہی ہے " الحديث مضلة الا للعلماء و لولا مالك و الليث لضللنا "
(ترتیب المدارک ج ا ص ۹۱ از علامہ قاضی عیاض)

حضرت سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ) فرماتے ہیں:

"الحدیث مضلة الا الفقهاء" (کتاب الجامع للقیروانی ج۱ص۱۱۷)

(۶) سوال:۔ صحابہ کرام میں تقلید تھی یا نہیں؟

جواب :۔ صحابہ کرامؓ نے گو کہ بذات خود آنحضرت ﷺ سے تعلیم حاصل کی تھی اور آپ ﷺ کے بیانات کو سنا تھا اور آپ ﷺ کے حالات سے واقف رہے اس کے باوجود صحابہ بھی اپنے سے اعلم کی تقلید کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے جب یہ فرمایا کہ میرے بعد ابو بکرؓ اور عمرؓ کی اقتداء کرنا (جامع ترمذی ج۲ص۲۰۷) تو سوال ہوتا ہے کہ کیا اس وقت بھی حضور ﷺ کی اقتداء نہ ہو سکتی تھی؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہے کہ مسائل غیر منصوصہ میں کوئی حکم بصراحت نہ ملے تو پھر ان میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی بات ماننا، آنحضرت ﷺ نے خود ہی محدث اور فقیہ میں فرق فرمایا کہ ایک شخص روایت حدیث کرے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس حدیث کی گہرائی کو نہ پاسکے یہ کام آگے فقیہ کا ہے جو اصل مراد رسول ﷺ کو پالیتا ہے، سو صحابہ میں بھی فقہی آراء میں اختلاف ہوا (کتب حدیث جامع ترمذی وغیرہ میں اس کے بکثرت شواہد ملتے ہیں) سو صحابہ میں بھی جو عالم تھے وہ اپنے سے اعلم کی بات ماننے کو کبھی شرک نہیں سمجھتے تھے اور نہ کوئی اسے شرک فی الرسالت کہتا تھا۔

(۷) سوال:۔ اسلام کے پہلے بارہ سو سال میں کہیں بھی غیر مقلدوں کے نام سے کوئی جماعت موجود رہی ہے؟

جواب:۔ نہیں! پہلے دور میں ائمہ اربعہ کے مذاہب کے ساتھ ساتھ کئی اور مذاہب بھی موجود رہے جیسے مذہب امام سفیان ثوری۔ مذہب امام اوزاعی۔ مذہب ابی ثور وغیرہم لیکن آہستہ آہستہ ان کے پیرو ناپید ہوتے گئے یہاں تک کہ ان کے مذاہب ختم ہوگئے ان کی اتباع کرنے والا کوئی نہیں رہا اور سب کے سب ان چار مذاہب میں آشامل ہوئے ان ادوار میں بہت سے ایسے اہل علم بھی ہوئے جنہیں مقام اجتہاد حاصل تھا لیکن انہوں نے بھی تقلید ہی میں عافیت سمجھی۔ البتہ تاریخ میں بہت ہی قلیل لوگ (جن کے نام ایک ہاتھ کی انگلیوں پر شمار کئے جاسکتے ہیں) ایسے تھے جنہوں نے تقلید نہ کی لیکن وہ کبھی ایک جماعت میں منظم نہ ہوئے ان کا یہ انتشار ذہنی خود جماعت بندی کے تصور سے ایک کھلا ٹکراؤ تھا یہی وجہ ہے کہ تاہم بعد کے اہل علم نے ان کی باتوں کو بالکل بے وزن ٹھہرا لیا اور آج یہ لوگ تاریخ کے دریچوں میں الگ تھلگ کھڑے نظر آرہے ہیں۔ اس علیحدگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ

انہوں نے بہت سے مسائل میں ٹھوکر کھائی اور وہ تنہا کے تنہا رہ گئے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اب ان چار مذاہب سے خروج کرنا جائز نہیں جو ان سے باہر ہوگا وہ سواد اعظم سے خارج سمجھا جائے گا۔ ہم یہاں علامہ ابن خلدون (۸۰۸ھ) اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی (۱۱۷۶ھ) کے بیانات نقل کئے دیتے ہیں علامہ ابن خلدون المغربی (۸۰۸ھ) لکھتے ہیں۔

دیار وامصار میں ان ہی ائمہ اربعہ میں تقلید منحصر ہوگئی اور ان کے سوا جو امام تھے ان کے مقلد ناپید ہوگئے۔ اور فی زمانہ مدعی اجتہاد مردود اور اس کی تقلید مہجور اور متروک ہے اور اہل اسلام ان ہی ائمہ اربعہ کی تقلید پر مستقیم ہوگئے ہیں (مقدمہ ابن خلدون ص)

ولما اندرست المذاهب الحقة الاهذه المذاهب الاربعة كان اتباعها اتباعا للسواد الاعظم والخروج عنها خروجا عن السواد الاعظم (عقدالجید ص ۳۸)

(ترجمہ) جب مذاہب اربعہ کے سوا سارے مذہب ناپید ہوگئے تو اب انہی چار مذاہب کا اتباع سواد اعظم کا اتباع کہلائے گا اور ان چار سے نکلنا سواد اعظم سے نکلنا شمار ہوگا۔

(۸) سوال۔ جب شیعہ کے سوا پوری امت ان چار مذاہب پر متفق ہوگئی تو کیا تقلید پر پوری امت کا اجماع نہ ہوگیا؟ اور کیا کسی شخص کو اجماع امت سے نکلنے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟

جواب:۔ تقلید جائز ہے یا نہیں اس پر پوری امت کا اجماع ہے کہ جائز ہے۔ پھر انسان مجتہدین میں سے جس کی چاہے تقلید کرے بشرطیکہ اسکی فقہ اسے ملی ہو۔ یہ بات بھی طے ہوچکی ہے کہ اب تقلید صرف ان چار مذاہب کی ہی ہوسکے گی اس کے سوا نہ کسی کا مذہب مدون ہے نہ اسکی تقلید ہوسکے گی۔ صحابہ کے مذاہب بھی چونکہ ایک جگہ مدون نہیں ہوسکے اس لئے ان کی اتباع بھی بطور ایک مذہب کے (کہ اس میں ہر مسئلہ مل جائے) نہ ہوسکے گی۔ اس لئے ان چار مذاہب سے خروج کی اجازت نہیں ہے۔

(۹) سوال۔ تقلید اور اتباع دونوں کا مفہوم ایک ہے یا دونوں الگ الگ ہیں؟

جواب:۔ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے، غیر مقلدوں کے شیخ الکل مولانا نذیر حسین دہلوی لکھتے ہیں:

معنی تقلید کے اصطلاح میں اہل اصول کے یہ ہیں ماننا لینا اور عمل کرنا ساتھ قول بلادلیل اس شخص کے جس کا قول حجت شرعی نہ ہو تو بنا بر اس اصطلاح کے۔ رجوع کرنا عامی کا

طرف مجتہدوں کی۔ اور تقلید کرنی ان کی کسی مسئلہ میں تقلید نہ ہوگی بلکہ اس کو اتباع اور سوال کہیں گے اور معنی تقلید کے عرف میں یہ ہیں کہ وقت لاعلمی کے کسی اہل علم کا قول مان لینا اور اس پر عمل کرنا اور اسی معنی عرفی میں مجتہدوں کے اتباع کو تقلید بولا جاتا ہے (معیار الحق ص۷۶)

(نوٹ) مولانا ثناء اللہ امرتسری اپنے شیخ الکل کی طرح بات کو ختم کرنا نہیں چاہتے اختلاف کو باقی رکھنا چاہتے ہیں وہ اپنے استاد کی اس تشریح سے متفق نہیں ہیں ان کا کہنا ہے کہ دونوں میں مغایرت ہے وہ لکھتے ہیں کہ

ہمارا اعتقاد ہے کہ ہم اتباع سلف کے مامور ہیں تقلید سلف کے مامور نہیں۔ تقلید اور اتباع میں بہت فرق ہے تقلید محض قول بلا معرفت دلیل کے قبول کرنے کا نام ہے اور اتباع علی وجہ البصیرت قبول کرنے کا نام ہے (تقلید شخصی وسلفی ص۴۲)

معلوم نہیں عام غیر مقلدوں کے نزدیک استاد شاگرد میں سے کس کی بات درست اور صحیح ہے اور یہ لوگ اس باب میں کس کی اتباع اور تقلید کرتے ہوں گے۔

(۱۰) سوال۔ امام ابو حنیفہ کس کے مقلد تھے؟

جواب:۔ امت نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے کہ آپ مجتہد تھے تاہم آپ نے بعض مسائل میں حضرت امام ابراہیم نخعی (۹۶ھ) کی پیروی کی ہے اور ان کے مذہب سے اتفاق کیا ہے۔ غیر مقلدوں کے پیشوا نواب صدیق حسن خان صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ

كان ابو حنيفة الزمهم بمذهب ابراهيم (الجنه فى الاسوه الحسنه بالسنه ص ۴۲)

(ترجمہ) امام ابو حنیفہ حضرت ابراہیم نخعی کے مذہب کو سب سے زیادہ پکڑنے والے تھے۔

(۱۱) سوال۔ امام ابراہیم نخعی کس کے مقلد تھے؟

جواب:۔ آپ بھی اپنے دور کے مجتہد تھے تاہم آپ کے مذہب کا زیادہ مدار خلیفہ راشد حضرت عمر فاروقؓ اور صحابی رسول حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کے اقوال پر تھا اور قرآن وسنت کی مرادات اور اصولوں میں آپ بالعموم انہی کے فیصلے پر اپنے مذہب کا مدار رکھتے تھے۔

(۱۲) سوال:۔ امام شافعیؒ کس کے مقلد تھے۔

جواب:۔ امام شافعیؒ کو مجتہد تسلیم کیا گیا ہے پھر بھی آپ نے بھی بعض مسائل میں حضرت امام عطاء (۱۱۷ھ) کی تقلید کی ہے۔ نواب صاحب لکھتے ہیں:

قال الشافعیؒ فی مواضع من الحج قلته تقلید العطاء (الجنہ ۶۸)

ترجمہ: امام شافعیؒ نے بہت سے مقامات پر یہ بات کہی ہے کہ میں نے یہ بات امام عطا کی تقلید میں کہی ہے۔

(۱۳) سوال :۔امام احمد بن حنبل کس کے مقلد تھے۔

جواب:۔امام احمد بن حنبل تیسری صدی کے مجتہد ہیں اگر انہیں کسی مسئلہ میں قرآن و سنت ملتی تو پھر آپ امام شافعیؒ کے قول پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھتے تھے اور اسے حجت قرار دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی سائل نے ایک مسئلہ کے متعلق یہ بات کہی کہ اس میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے امام احمدؒ نے جواباً کہا کہ اس باب میں امام شافعیؒ کا قول موجود ہے اور ان کا قول ایک مستقل حجت اور دلیل ہے حمید بن المصری کہتے ہیں کہ:

" قال کنت عند احمد بن حنبل نتذاکر فی مسئلة فقال رجل لا حمد یا عبد الله لا یصح فیه حدیث قال ان لم یصح فیه حدیث ففیه قول الشافعیؒ و حجته اثبت شیٔ فیه "

(تھذیب ج ۹ ص ۲۸)

ہم امام احمدؒ کے پاس بیٹھے ایک مسئلہ کے بارے میں مذاکرہ کر رہے تھے اتنے میں ایک سائل نے امام احمد سے کہا کہ اس باب میں کوئی ایک حدیث بھی صحیح نہیں (یعنی آپ جو فیصلہ کر رہے ہیں اس میں کوئی حدیث بھی صحیح نہیں ہے) آپ نے کہا اگر اس باب میں کوئی صحیح حدیث نہ ملے تو کیا ہوا اس میں امام شافعیؒ کا قول تو موجود ہے اور ان کا قول خود ایک حجت ہے۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ کے اقوال امت میں ہمیشہ ایک حجت سمجھے گئے ہیں محدثین (امام بخاری وغیرہم) نے اپنی کتب حدیث میں ائمہ کے اقوال سے باقاعدہ سند پکڑی ہے اور اسے کوئی عیب نہیں جانا، اور آج تک کسی صاحب حدیث (محدث) نے اس کی تغلیط نہیں کی کیا صحیح بخاری میں کوفہ کے امام ابراہیم نخعی کی فقہی آراء موجود نہیں اور کیا امام بخاری نے علم میں اپنے آپ کو کوفہ کا محتاج نہ جانا۔

ایک شبہ کا ازالہ:

حضر امام احمدؒ جب خود مجتہد ہیں تو پھر انہوں نے امام شافعیؒ کے قول کی تقلید کیوں کی؟

جواباً عرض یہ ہے کہ مسائل منصوصہ میں تو حضرت امام احمد کتاب و سنت سے استنباط

کرنے کے اہل تھے اور مجتہد تھے جن نئے مسائل کی انہیں ضرورت در پیش ہوتی وہ کتاب وسنت میں اجتہاد کر کے خود مسائل کا استخراج کر سکتے تھے لیکن جہاں انہیں پیش آمدہ حوادث میں کتاب وسنت سے کوئی اصل نہ ملے تو وہاں وہ استحسان کی بجائے پہلے کے کسی مجتہد کی پیروی میں زیادہ احتیاط سمجھتے تھے سو ان کا کسی بات میں امام شافعیؒ کی تقلید کرنا ان کے مجتہد ہونے کی شان کے خلاف نہیں ہے یہ اسی طرح ہے جس طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ باوجود بلند پایہ مجتہد ہونے کے حضرت عمرؓ کے فیصلے کے آگے اپنی رائے چھوڑ دیتے تھے۔

اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ غیر منصوص مسائل میں اپنے سے اعلم کی تقلید کرنا اور ان کے قول پر اپنے مذہب کی بناء رکھنا درست ہے یہ کوئی معیوب بات نہیں، بلکہ محدثین کا طریقہ رہا ہے اور کسی اہل حدیث (محدث) کو اس سے اختلاف نہیں ہوا۔

(۱۴) سوال:۔ ائمہ اربعہ کے مذاہب کی اصل کیا ہے اور یہ مذاہب کن سے ماخوذ ہیں؟

جواب:۔ ائمہ اربعہ کے مذاہب کی اصل صحابہ کے فقہی اقوال ہیں انہوں نے یہ اقوال صحابہ سے لئے اور انہیں قرآن وسنت کی روشنی میں جانچا۔ مذاہب اربعہ کی اصل قرآن وسنت رہی ہے تاہم قرآن وسنت کو سمجھنے کے لئے انہوں نے زیادہ تر حضرت عمر فاروقؓ کی پیروی کی ہے۔ یوں سمجھئے کہ حضرت عمر فاروقؓ کا مذہب متن کی طرح ہے جس سے کسی سنی مسلمان کو نہ نکلنا چاہئے اور یہ مذاہب اسکی شروحات ہیں۔ اور شروحات میں متن کو باقی رکھتے ہوئے اختلاف کا ہونا اہل علم سے مخفی نہیں ہے حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں

مذہب فاروق اعظم بمنزلہ متن است ومذہب اربعہ بمنزلہ شروح (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۸۲)

(ترجمہ) فاروق اعظمؓ کا مذہب بمنزلہ متن کے ہے اور ائمہ اربعہ کے مذاہب اسکی شروحات کے طور پر ہیں صحابہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود سب سے زیادہ حضرت عمرؓ کے پیرو رہے ہیں

(۱۵) سوال:۔ کیا ابتدائی صدیوں میں علماء کسی کی تقلید کرتے تھے؟

جواب:۔ جی ہاں۔ اس دور میں عوام اہل علم کی طرف رجوع کرتے تھے اور اہل علم اپنے سے اعلم کی تقلید کرتے تھے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں

لان الناس لم یزالو ا من زمن الصحابة الی ان ظهرت المذاهب الا ربعة یقلدون من اتفق من العلماء من غیر نکیر یعتبر انکاره ولو کان ذلك باطلا لا نکروه

(عقد الجید ص ۲۹)

(ترجمہ) صحابہ کرام کے دور سے لے کر مذاہب اربعہ کے ظہور تک لوگ علماء کی جس کا بھی اتفاق ہو جاتا بغیر کسی نکیر کے تقلید کر لیتے تھے اگر تقلید باطل (اور حرام) ہوتی تو وہ حضرات (پہلی دوسری صدی کے علماء) اسکا (کھلا) انکار کرتے اور لوگوں کو کہتے کہ یہ غلط ہے انکا انکار نہ کرنا اور متفق علیہ طور پر اس سلسلہ کا جاری رہنا بتاتا ہے کہ اہل علم کی تقلید کو ہر دور میں ضروری سمجھا گیا ہے کسی بھی دور میں اسے باطل نہیں گردانا گیا غیر مقلدوں کے پیشوا نواب صدیق حسن خان صاحب اس کا کھلا اعتراف کرتے ہیں۔

فلا تجد احدامن الا ئمۃالا وھو مقلدمن ھو اعلم منہ فی بعض الا حکام (الجنہ ص ۶۸)

ترجمہ :۔ تو نہ پائے گا کسی بھی ایک امام (محدث اور عالم) کو مگر یہ کہ وہ بعض احکام میں اپنے سے اعلم کا مقلد ہے۔

(۱۶) سوال:۔ کیا چوتھی صدی سے قبل لوگ کسی کی تقلید کرتے تھے۔

جواب:۔ ہم ابھی بتلا چکے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں عوام اہل علم کی اور اہل علم اپنے سے اعلم کے مقلد تھے یہ لفظ نواب صاحب کی تحریر میں موجود ہے) ان اہل علم میں محدثین بھی تھے اور عوام بھی یہ سب کے سب کسی نہ کسی امام کے پیروکار تھے۔ ۲۲۸ھ میں جب عباسی خلیفہ واثق باللہ نے سد سکندری کا حال معلوم کرنے کیلئے ایک وفد بھیجا تو انہوں نے وہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ حنفی مذہب کے پیروکار ہیں۔ نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں:

محافظاں سد کہ دراں جابودند ہمہ دین اسلام داشتند ومذہب حنفی وزبان عربی وفارسی می گفتند لماز سلطنت عباسیہ بے خبر بودند (ریاض المرتاض ص ۳۱۶)

ترجمہ:۔ سد سکندری کی حفاظت کرنے والے (یعنی وہاں کے باشندے) اہل اسلام ہیں اور حنفی مذہب پر ہیں انکی زبان عربی اور فارسی ہے البتہ عباسی سلطنت سے وہ بے خبر ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ تیسری صدی میں بھی امام ابو حنیفہؒ اور دیگر ائمہ کی تقلید ہوتی رہی امام احمد بن حنبلؒ حیات تھے آپ کی وفات (۲۴۱ھ) میں ہوئی ہے۔

(۱۷) سوال:۔ عامی آدمی اور ان پڑھ کیلئے کسی مجتہد کی تقلید ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:۔ تاریخ اسلام پر نظر کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عوام تو کجا بڑے بڑے محدثین اور مفسرین بھی مجتہد کی تقلید کرتے تھے اور وہ اپنے آپ کو مذاہب اربعہ میں سے کسی نہ کسی مذہب

سے وابستہ کئے ہوئے تھے ظاہر ہے کہ جب محدث (اہل حدیث) اور مفسر (اہل تفسیر) کو تقلید اعلم سے چارہ نہیں تو عوام کس طرح غیر ملقدرہ سکتے ہیں۔ پیشوائے غیر مقلدین کا یہ بیان دیکھئے کہ وہ عوام کے لیے مجتہد کی تقلید کو واجب کہتے ہیں:

ووجب علی العا می تقلید و الا خذبفتواہ و قد استفا ض الخبر عن النبی ﷺ انہ لما بعث معا ذا الیٰ الیمن قال یا معاذ (الحدیث) (لقطہ العجلان ص ۱۴۷)

ترجمہ۔ عام آدمی پر مجتہد کی تقلید کرنا واجب ہے اور اسکے فتوی پر عمل کرنا لازم ہے اور آنحضرت ﷺ سے یہ بات خبر استفاضہ کے طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ آپ نے جب حضرت معاذؓ کو یمن کی جانب روانہ فرمایا تو کہا کہ اے معاذ ! (الحدیث)

(۱۸) سوال:۔ مذاہب اربعہ سے خروج سواد اعظم سے خروج سمجھا جائے گا یا نہیں؟

جواب:۔ اسکا ہم جواب اوپر سوال نمبر ۷ کے جواب میں دے آئے ہیں۔ پیش نظر رہے کہ ابتدائی صدیوں میں بہت سے مذاہب پائے جاتے تھے جوں جوں زمانہ گذرتا گیا مذاہب اربعہ کے سواسب مذاہب ناپید ہوتے گئے اور اب دنیا میں ان مذاہب کے پیروکار نہیں ملتے اور نہ ہی ان کی فقہ کسی ایک جگہ مدون ملتی ہے۔ سوائے مذاہب اربعہ کے۔ اسلئے اب ان مذاہب سے خروج کرنے والا یقیناً سواد اعظم سے خروج کرنے والا سمجھا جائے گا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی یہ عبارت آپ پہلے پڑھ آئے ہیں۔

ولما اندرست المذاھب الحقۃ الا ربعۃ ھذہ المذھب الاربعۃ کان اتباعھا اتباعا للسواد الاعظم والخروج عنھا خروجا عن السوادالاعظم (عقدالجید ص ۳۸)

(ترجمہ) جب مذاہب اربعہ کے سواسارے مذہب ناپید ہوگئے تو اب انہی چار مذاہب کا اتباع سواد اعظم کا اتباع کہلائے گا اور ان چار سے نکلنا سواد اعظم سے نکلنا شمار ہوگا۔

(۱۹) سوال: احناف کا دعوی ہے کہ فقہ حنفی شورائی فقہ ہے یہ کہاں تک صحیح ہے۔

حواب:۔ فقہ حنفی کے شورائی فقہ ہونے پر کسی کا اختلاف نہیں: یہ فقہ کسی ایک شخص یا ایک امام کی انفرادی رائے یا تشریح کا نام ہیں بلکہ مختلف علوم کے حامل علماء (محدثین، مفسرین، ائمہ لغت علماء ادب و عربیت وغیرہم) کے بحث و مباحثہ کے بعد فقہ حنفی تدوین ہوئی ہے اور اسکے مسائل طے پائے ہیں نامناسب نہ ہوگا کہ ہم یہاں غیر مقلدوں کے معروف آرگن الاعتصام لاہور کا یہ بیان درج کردیں۔

امام اعظمؒ نے بیشک اپنے زمانے کے مقتضیات تمدن کو سامنے رکھ کر طریقہ شوری کے ذریعہ اسلامی قوانین اور فقہ کی تدوین فرمائی اور حقیقت میں یہ عظیم الشان کام تھا اسکی عظمت وضرورت کا انکار ناممکن ہے۔
(الاعتصام ۸ جولائی ۱۹۶۰ ص ۵ کالم ۱)

(۲۰) سوال:۔ جب ہم آنحضرت ﷺ کے امتی ہیں تو پھر ہمیں حنفی شافعی نہیں کہنا چاہئے یہ حق پیغمبر کا ہے کہ اس کی طرف نسبت کی جائے نہ کہ غیر پیغمبر کی طرف اپنے کو منسوب کیا جائے۔

جواب:۔ کسی مناسبت کی بناء پر کسی کی طرف نسبت کرنا شرک نہیں ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ پیغمبر نہیں۔ تاہم تابعین نے اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی نہ امام بخاری نے اسے شرک کہا ہے بلکہ اپنی صحیح میں اسے جگہ دی ہے۔

عن ابی عبدالرحمٰن وکان عثمانیا فقال لا بن عطیۃ وکان علویا (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۳۳)

ابوعبدالرحمٰن سے مروی ہے اور وہ عثمانی تھے آپ نے ابن عطیہ کو کہا اور وہ علوی تھے۔

(۲۱) سول:۔ تقلید کے لئے کیا یہ ضروری ہے کہ ایک ہی مذہب کی کی جائے؟

جواب:۔ سوال نمبر ۲۰ کے جواب میں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ ایک ہی مذہب کی تقلید کی جانی چاہئے۔ اگر کوئی شخص ایک مسئلہ کے لئے حنفی ہو جائے پھر کسی اور مسئلہ کے لئے شافعی بن جائے اور کچھ عرصہ بعد مالکی ہو جائے اور پھر کسی مسئلہ کے لئے شافعیت پر آجائے تو اس کا یہ مذہب تبدیل کرنا قوت دلائل کی بناء پر نہ ہوگا اپنی ضرورت اور سہولت کی بناء پر ہوگا یہ کسی مذہب کی تقلید نہ ہوگی اپنے نفس کی تقلید ہوگی جس سے قرآن نے سختی سے روکا ہے اور بتلایا ہے کہ ہوئی وخواہش کے پیچھے نہ چلو تجھے راستہ سے بچلا دیں گے۔ قرآن کریم میں ہے۔

و لاتتبع الھویٰ فیضلك عن سبیل اللہ ان اللہ الذین یضلون عن سبیل اللہ لھم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب. (پ ۲۳ سورہ ص ۲۶)

(ترجمہ) اور نہ چل جی کی خواہش پر پھر وہ تجھ کو بچلا دے اللہ کی راہ سے بیشک جو لوگ بچلتے ہیں اللہ کی راہ سے ان کے لئے سخت عذاب ہے۔

ہاں ذاتی ضرورت میں نہیں وسیع قومی مفاد میں کسی مذہب کے علماء کبار دوسرے مذہب کے کسی مسئلہ کو اختیار کریں تو اس کی چند شرائط کے ساتھ اجازت ہے یہ تلفیق نہ ہوگی تلفیق وہ

ہے جو ذاتی ضرورت کے لئے ہو جس کی بنا نفسانی خواہش پر ہو اور یہ اہل علم سے مخفی نہیں سو تقلید کے لئے کسی ایک مذہب معین کی پابندی ہونی چاہئے۔ پھر حنفی مذہب میں تو کسی ایک امام کی تقلید نہیں اس میں امام ابو یوسف امام زفر امام محمد امام طحاوی امام کرخی امام سرخسی کے اقوال پر بھی کئی جگہ فتویٰ دیا گیا ہے۔ اور علامہ شامی اور علامہ طحطاوی جیسے علماء کبار نے بعض مقامات پر امام مالک کے قول پر بھی فتویٰ دیا ہے

(۲۲) سوال :۔ مذاہب اربعہ بدعت حسنہ ہیں یا بدعت سیءہ اور اس کے مقلدین کو بدعتی کہنا صحیح ہے یا نہیں۔

جواب :۔ غیر مقلدوں کے شیخ الکل مولانا نذیر حسین دہلوی کے استاذ حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ :

اتباع مسائل مذاہب اربعہ بدعت نیست نہ سیءہ نہ حسنہ بلکہ اتباع آنہانست است ہرگز مقلد ایشاں را بدعتی نخواہند گفت زیرا کہ تقلید ایشاں تقلید حدیث شریف است باعتبار الظاہر والباطن پس متبع را بدعتی گفتن ضلال و موجب نکال است (مأۃ مسائل ص ۹۲، ۹۳)

ترجمہ :۔ مذاہب اربعہ کے مسائل کا اتباع کرنا کوئی بدعت نہیں نہ بدعت حسنہ ہے نہ بدعت سیءہ بلکہ ان کی اتباع دراصل سنت کی ہی اتباع ہے۔ ائمہ اربعہ کے مقلد کو بدعتی نہ کہنا چاہئے اس لئے کہ ان کی تقلید درحقیقت حدیث شریف کی تقلید ہے خواہ اسے ظاہر کے اعتبار سے کہو خواہ اسے باطن کے اعتبار سے۔ پس متبع حدیث کو بدعتی کہنا گمراہی ہے اور یہ بات عذاب کا موجب ہوگی۔

غیر مقلدوں کے پیشوا نواب صدیق حسن خان کے استاذ محترم مفتی صدر الدین صاحب (دیکھئے الحطہ ص ۱۰) لکھتے ہیں :

کہ مذہب یکے از ائمہ اربعہ اختیار کند آن متبع سنت رسول ﷺ و شخصے عامی بلکہ عالم را نیز کہ بمرتبہ اجتہاد نرسیدہ باشد تقلید یکے از مجتہدان امت واجب است و بالفعل مذاہب اربعہ از مجتہدین است مشہور و متواتر و مقبول و مدون و منقول است پس تقلید یکے را از یں چہار ائمہ اختیار باید کرد و منکران حقیت مذاہب اربعہ و بدعت گویند آں را تقلید ضال و مضل اند۔

وھم اضلوا کثیرا ضلوا عن سواء السبیل (تنبیہ الضالین ص ۴۵)

یعنی۔ جو شخص ائمہ اربعہ میں سے کسی کا مذہب اختیار کرتا ہے وہ متبع سنت ہے اور عام آدمی

اور عالم بلکہ وہ شخص جو مرتبہ اجتہاد کو نہ پہنچ جائے اسے بھی کسی ایک مجتہد کی پیروی کرنا ضروری ہے اور عملی طور پر مذاہب اربعہ مجتہدین سے تواتر اور شہرت کے ساتھ مقبول اور مدون اور منقول ہیں پس ان میں سے کسی ایک کی تقلید اختیار کرنی چاہئے اور مذاہب اربعہ کے حق ہونے کے منکر اور تقلید کو بدعت کہنے والے ضال اور مضل ہیں اور انہوں نے بہت سے لوگوں کو راستہ سے گمراہ کیا ہے اور وہ خود بھی سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

(۲۳) سوال:۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں سب کے سب غیر مقلد تھے یہ حنفی تو بہت بعد کی پیداوار ہیں آپ کی کیا رائے ہے۔

جواب:۔ ہندوستان میں جب سے اسلام نے قدم رکھا ہے سب مسلمان اہل سنت اور مذہب حنفی کے پیروکار رہے اس لئے یہ کہنا کہ احناف بہت بعد کی پیداوار ہیں درست نہیں۔ غیر مقلدوں کے پیشوا نوب صدیق حسن خان لکھتے ہیں:

> خلاصہ حال ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ ہے کہ جب سے یہاں اسلام آیا ہے چونکہ اکثر لوگ بادشاہوں کے طریقہ اور مذہب کو پسند کرتے ہیں اس وقت سے لے کر آج تک یہ لوگ حنفی مذہب پر قائم رہے اور ہیں اور اسی مذہب کے عالم اور فاضل قاضی اور مفتی اور حاکم ہوتے رہے (ترجمان وہابیہ ص۱۰)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں ۹۹ رفیصد لوگ حنفی المذہب رہے ہیں ہاں غیر مقلدوں کے بارے میں یہ بات کہی جائے کہ یہ اب پیدا ہوئے ہیں تو بجا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم کچھ کہیں نواب صدیق حسن خان صاحب نے ان کے بارے میں ایک طویل حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا ہے اسکا صرف ایک ابتدائی حصہ ملاحظہ کریں:

فقدنبت في هذا الزمان ذات سمعة و رياء تدعى لا نفسها علم الحديث و القرآن و العمل والعرفان بها (الحطه ٦٧)

اس زمانے میں ایک فرقہ پیدا ہوا ہے جو شہرت پسند اور ریاکار ہے جسے علم قرآن اور علم حدیث کا دعوی ہے اور وں اس پر عمل و عرفان کا مدعی ہے۔

موصوف کے اس بیان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ فرقہ غیر مقلدین انگریز کے دور کی پیداوار ہے۔ اسی جماعت کے ایک اور بزرگ شیخ الکل کے شاگرد رشید مولانا محمد شاہجہان پوری بھی اس فرقہ

کے نوزائیدہ ہونے کی اس طرح تصریح کرتے ہیں۔

پچھلے زمانہ میں شاذونادر اس خیال (غیر مقلدوں کے خیال) کے لوگ کہیں ہوں تو ہوں مگر اس کثرت سے دیکھنے میں نہیں آئے بلکہ ان کا نام ابھی تھوڑے ہی دنوں سے سنا ہے اپنے آپ کو تو وہ اہل حدیث یا محمدی. یا موحد کہتے ہیں مگر مخالف فریق میں ان کا نام غیر مقلد یا لامذہب لیا جاتا ہے۔
(الارشاد الی سبیل الرشاد ص ۱۳)

اس فرقہ کے ابتدا میں مختلف نام تھے ابھی انگریز انکے کسی ایک نام پر متفق نہ ہوئے تھے انہوں نے انہیں اہل حدیث نام بہت بعد میں دیا ہے ۔ پہلے انکی زیادہ شہرت لامذہب کے نام سے تھی اب آپ فیصلہ کریں کہ کون اس صدی کی پیداوار ہے اور کون ایک پورے تاریخی تسلسل کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ ہم نے غیر مقلدوں کے ان دو بزرگوں کی شہادتیں پیش کی ہیں ان کے علاوہ بھی شہادتیں ہیں ان سے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ غیر مقلدین کی جماعت تاریخ کا کوئی تسلسل نہیں رکھتی یہ برصغیر میں انگریزی اقتدار میں وجود میں آئی ہے۔

سواپنے تاریخی وجود میں قادیانی اور یہ جماعت غیر مقلدین ایک ہی دور کے لوگ ہیں۔

(۲۴) سوال:۔ شاہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے عجیب مقام سے نوازا تھا آپ پہلے سے مقلد چلے آرہے تھے مگر طبیعت اس پر جمتی نہ تھی یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ نے آپ کو امام ابو حنیفہؒ کی تقلید پر متوجہ فرمایا۔ آپ خود تحریر فرماتے ہیں۔

و استفدت منه ﷺ ثلاثة امور خلاف ما كان عندى و ما كانت طبعى تميل اليه اشدميل فصارت هذه الاستفادة من براهين الحق تعالىٰ على ،الى قوله ، و ثانيهما الوصاة بالتقليد بهذه المذاهب الاربعة (فيوض الحرمين ص ١٨٦)

(ترجمہ) مجھے آنحضرت ﷺ کی جانب سے تین ایسی باتیں حاصل ہوئی ہیں جن کی طرف میرا قلبی میلان نہ تھا۔ حضور ﷺ سے یہ استفادہ میرے اوپر برہان حق ہو گیا ان تین امور میں سے دوسری بات یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے وصیت فرمائی کہ میں مذاہب اربعہ کی تقلید کے اندر رہوں۔

مذاہب اربعہ میں آپ کو کس مذہب سے وابستہ رہنے کی ہدایت کی گئی، اس کا جواب حضرت شاہ صاحبؒ یوں دیتے ہیں:

وعرفنى رسول الله ﷺ ان فى المذهب الحنفى طريقة انيقة هى اوفق الطريق

بالسنة المعروفة التي جمعت و نقحت في زمان البخاري و اصحابه (ایضاً ص ۴۸)

(ترجمہ) آنحضرت ﷺ نے مجھے بتایا کہ مذہب حنفی میں ایک عمدہ طریقہ موجود ہے جو دوسرے طرق کی بہ نسبت اس سنت مشہورہ کی زیادہ موافق ہے جس کی تدوین اور تنقیح امام بخاری اور ان کے اصحاب کے زمانہ میں ہوئی محدث کبیر حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی قدس سرہ نے فیض الباری کے آخر میں ان مسائل کی ایک لمبی فہرست پیش کی ہے جن میں حضرت امام بخاریؒ امام شافعیؒ کی تحقیق سے حنفیوں کے زیادہ قریب ہیں سو حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کا مکاشفہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ ہندوستان کے رہنے والے تھے یہاں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی تقلید ہوتی تھی آپ نے لکھا کہ یہاں کے رہنے والے امام ابوحنیفہ کی پیروی کریں کیونکہ ان علاقوں میں دیگر ائمہ کے مذاہب اور ان کی کتابیں رائج نہیں ہیں۔ آپ لکھتے ہیں۔

فان كان انسان جاهلا في بلاد الهند و جب عليه ان يقلد بمذهب ابي حنيفةؒ و يحرم عليه الخروج من مذهبه (انصاف ص ۷۰)

(ترجمہ) اگر کوئی جاہل شخص ہندوستان میں رہتا ہو اور اسے دینی معاملات میں کوئی بات پیش آجائے تو اس کے لئے واجب ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کی تقلید کرے اور اس شخص کے لئے مذہب حنفی سے نکلنا حرام ہوگا۔

غیر مقلدین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب اہل حدیث (غیر مقلد) نہیں تھے۔ ان کے ایک پرفیسر طالب الرحمٰن کے قریبی عزیز ڈاکٹر شفیق زیدی اپنے ایک ہم مسلک عالم اشرف سندھو (جس نے حضرت شاہ صاحب کو اہل حدیث بتایا تھا) کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

شاہ ولی اللہ صاحب کو اہل حدیث قرار دیتے ہوئے یہ بات اشرف سندھو بھول گئے کہ اسی انفاس العارفین میں لکھا ہے۔ ایسے نظریات والے کو صرف اس لئے اہل حدیث کہنا ظلم ہے۔

(اہل توحید کے لئے لمحہ فکریہ ص۱۴)

(۲۵) سوال:۔ امام بخاریؒ امام مسلمؒ اور دیگر محدثین کے مذاہب کیا تھے؟

جواب:۔ بعض علماء نے امام ابوداؤد امام ترمذی کو مجتہد منتسب بتایا ہے (انصاف ص۷۹)

حضرت امام بخاری کو بعض نے مجتہد اور بعض نے شافعی بتایا ہے۔ کہ آپ امام شافعی کے استنباط کردہ

مسائل کے پیروکار ہے۔ نواب صاحب نے الحطہ بذکر الصحاح الستہ اور دیگر کتابوں میں اکثر مولفین صحاح ستہ کو ائمہ اربعہ میں سے کسی نہ کسی کا مقلد بتایا ہے۔

(۲۶) سوال:۔ شیخ محمد عبدالوہاب نجدی کا مذہب حنبلی تھا آپ فروع میں امام احمد بن حنبل کے پیروکار تھے سعودی عرب کا سرکاری مذہب بھی حنبلی ہی ہے۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب کو جب غیر مقلد کہا گیا تو انہوں نے اس کی سختی سے تردید کی اور لکھا:

فنحن و لله الحمد متبعون لا مبتدعون علی مذهب الامام احمد حنبل.

(محمد بن عبدالوہاب ص ۴۷ اللعلامہ احمد عبدالغفور طبع بیروت)

(ترجمہ) ہم الحمدللہ متبع سنت ہیں امام احمد کے مذہب پر ہیں ہم بدعتی نہیں ہیں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف کے نزدیک تقلید کے منکر بدعتی ہیں آپ ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں:

انی ولله الحمد متبع ولست بمبتدع عقیدتی و دینی الذی ادین الله به (ایضاً ۹)

(ترجمہ) میں الحمدللہ متبع (کسی مجتہد کے پیچھے چلنے والا ہوں مبتدع ۰ غیر مقلد) نہیں میرا عقیدہ اور میرا دین جو میں نے اللہ کے حضور اختیار کیا ہوا ہے یہی ہے............الخ

آپ کے صاحبزادے شیخ عبداللہ نے اپنے اور اپنے والد کے مسلک کے سلسلے میں لکھا کہ:

نحن ایضاً فی الفروع علی مذهب الامام احمد بن حنبل و لا ننکر علی من قلد الائمة لا ربعة دون غیرهم لعدم ضبط مذاهب الغیر کا لرافضة و الزیدیة و الامامیة و نحوهم لا نقرهم علی شئ من مذاهبهم الفاسدة بل نجبر هم علی تقلید احد الائمة الاربعة و لا نستحق مرتبة الاجتهاد و لا احد منا یدعیه.

(الشیخ محمد بن عبدالوہاب ص ۵۶ تالیف شیخ احمد بن حجر تصحیح شیخ عبدالعزیز بن باز)

(ترجمہ) ہم فروعات میں امام احمد بن حنبل کے مذہب پر ہیں اور ہم ان لوگوں پر نکیر نہیں کرتے جو ائمہ اربعہ کی تقلید کرتے ہیں اوروں کی نہیں کرتے کیونکہ دوسرے مذاہب منضبط نہیں جیسے رافضی اور زیدیہ اور امامیہ کے مذاہب، ہم ان کو ان مذاہب فاسدہ پر برقرار نہ رہنے دیں گے ہم ان کو مجبور کریں گے کہ وہ ائمہ میں سے کسی ایک کی تقلید کریں اور ہم مرتبہ اجتہاد کے مستحق نہیں ہیں اور نہ ہم میں سے کوئی اس کا مدعی ہے۔

(۲۷)سوال:۔ کیا حضرت شاہ اسماعیل شہید مقلد تھے ؟ان کی ایک کتاب رفع یدین پر موجود ہے کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ غیر مقلد تھے حنفی نہ تھے۔

جواب :۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید خاندان ولی اللہی کے ایک ممتاز فرد ہیں اور یہ سارا گھرانہ بیت الحنفیہ رہا نواب صدیق حسن خان نے اسے تسلیم کیا ہے۔ آپ کے حنفی ہونے کی گواہی آپ کے پیر بھائی مولانا عبد الرحمٰن پانی پتی سے لیجئے جو اس وقت آپ کے ساتھ ساتھ رہے مولانا موصوف لکھتے ہیں:

مولوی اسمٰعیل کو ہم نے دیکھا ہے اہل سنت اہل مذہب حنفی ومحدث ومفسر تھے (کشف الحجاب ص ۲۳)

اس سے پہلے آپ نے یہ بھی لکھا ہے:

گواب کے لوگوں نے مولوی اسمٰعیل کو نہیں دیکھا پر ہم نے ان کو دیکھا ہے وہ ایک عالم مقلد نیک نیت باخدا اور شہید تھے وہ ہرگز لا مذہب غیر مقلد نہیں تھے انکو غیر مقلد کہنے والا جھوٹا ہے (ایضا ص ۲۲)

رہی یہ بات کہ آپ نے رفع یدین پر ایک رسالہ لکھا اس لئے وہ غیر مقلد ہوئے نہایت غلط استدلال ہے۔ رفع یدین شوافع بھی کرتے ہیں اور حنابلہ بھی کیا یہ سارے شوافع اور حنابلہ غیر مقلد ہو گئے ؟حضرت شاہ صاحب کی تحقیق میں رفع یدین متروک نہیں تھا تاہم عملاً آپ رفع یدین نہیں کرتے تھے اگر آپ رفع یدین کرتے ہوتے تو آپ کے ساتھی مولانا عبد الرحمٰن پانی پتی کبھی یہ نہ کہتے کہ آپ حنفی تھے۔

غیر مقلدوں کے ڈاکٹر شفیق زیدی اپنے ہم مسلک عالم مولانا عبد المجید سوہدروی (جنھوں نے شاہ اسمٰعیل شہید کو اہل حدیث (غیر مقلد) بتایا تھا) کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

یہاں یہ بحث نہیں کہ صراط مستقیم کتاب کس کی ہے بلکہ عبد المجید صاحب جیسے جید اہل حدیث عالم صراط مستقیم کے مضامین ہی کو مواعظ حسنہ قرار دے رہے ہیں کیا ایسی کتب کے حوالے سے سید احمد اور شاہ اسمٰعیل صاحب کو اہل حدیث ثابت کرنا ایمانی موت نہیں ؟(اہل توحید کیلئے لمحہ فکریہ ص ۲۰)

غیر مقلدوں کے ایک اور عالم مولوی عبد العزیز نورستانی صراط مستقیم کے ناشر مکتبہ سلفیہ لاہور کے بارے میں لکھتے ہیں ان کتابوں کو جن لوگوں نے طبع فرمایا اور اس قسم کے شرکیہ کلام جو مسلک اہل حدیث کے سراسر خلاف ہے کو بلا تعلیق وتردید چھپوا کر شائع کیا قابل مذمت ہے انکو اس گناہ سے توبہ کر کے اپنی توبہ کا اعلان کرنا چاہئے (ایضا ص ۱۵)

اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ جو لوگ حضرت شاہ اسمٰعیل کو اہل حدیث بتانا ایمان کی موت

سمجھتے ہوں اور انکی کتابوں کو شائع کرنے والوں کو قابل مذمت گردانتے ہوں کیا وہ انہیں اہل حدیث (غیر مقلد) مانتے ہونگے؟

(۲۸) سوال:۔ اہل حدیث اور غیر مقلد ایک ہیں یا ان میں فرق ہے اہل حدیث سے کیا مراد ہے۔

جواب لفظ اہل حدیث سے مراد محدثین ہیں یہ ایک علمی طبقہ کا نام ہے جس طرح مفسرین کیلئے اہل قران علمائے عربیت کیلئے اہل ادب فقہاء کیلئے اہل فقہ اسی طرح اہل حدیث اور کبھی اصحاب الحدیث بولا جاتا رہا ہے ہاں شافعیہ کیلئے یہ لفظ ضرور کہیں کہیں ملتا ہے جو لوگ ان پڑھ ہوں اور حدیث کی ایک سطر بھی نہ پڑھ سکتے ہوں انہیں اہل حدیث کہنا محدثین کی توہین نہیں تو کیا ہے۔

اہل حدیث محدثین ہیں ان محدثین میں احناف بھی ہیں شوافع بھی موالک بھی اہل حدیث کا لفظ کبھی بھی ترک تقلید کے معنی میں نہیں آیا یہ لفظ ہمیشہ ایک علمی طبقہ پر بولا گیا ہے جبکہ غیر مقلد کی اپنی ایک نئی تاریخ ہے اور انہوں نے اس لفظ پر آنے سے پہلے کئی اور مرحلے طے کئے ہیں آخر کار مولانا حسین بٹالوی کی کوششوں سے یہ لفظ انگریز سرکار سے انکے لئے الاٹ ہوا۔

سو اہل الحدیث ہمیشہ سے یہ ایک علمی طبقہ کا نام رہا ہے امام بخاری کہتے ہیں کہ اس سے مراد اہل علم کا ایک طبقہ ہے اماھذہ الطائفة فقال البخاری ھم اھل العلم (نووی شرح مسلم ۲ ص ۱۴۳) معلوم ہوا کہ اہل حدیث کا لفظ کبھی بھی عام لوگوں پر نہیں آسکتا۔

معروف غیر مقلد عالم مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی لکھتے ہیں۔

بعض جگہ تو انکا رذکر اہل حدیث سے ہوا ہے بعض جگہ اصحاب حدیث سے بعض جگہ اہل اثر کے نام سے اور بعض جگہ محدثین کے نام سے مرجع ہر لقب کا یہی ہے (تاریخ اہل حدیث ۱۲۸)

آپ ہی بتائیں کہ اس وقت غیر مقلدوں میں جو ان پڑھ طبقہ ہے کیا اس پر محدثین کا لقب آسکتا ہے کیا انہیں اصحاب الحدیث کہا جاسکتا ہے؟ کیا جناب میاں فضل حق صاحب جیسے نیک لوگوں کو اہل حدیث (محدثین) کہا جاسکتا ہے۔ اگر نہیں تو انہیں اہل حدیث کہنا کیسے روا ہوگا آپ انہیں لامذہب کہیں یا غیر مقلد یہ انکا صحیح نام ہے۔

تیسری و آخری قسط

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مولوی محمد فرقان قاسمی علیگ سلطان پوری

جہاد اسلام کی اصل روح:

اس کے برعکس جہاد کا محرک اسلام کا یہ جذبہ تھا کہ انسانیت صراط مستقیم پر گامزن ہو اس مقصد کے حصول میں پر امن ذرائع سے کام نہ چلے تو مجبوراً اسلام قوت کا استعمال کرتا ہے اسلام کی جنگیں کسی فوجی قائد کی خود غرضی اور ہوس ملک گیری کی پیداوار نہیں تھیں نہ ان کے پیچھے دوسروں کو غلام بنانے کا جذبہ کار فرما تھا بلکہ یہ جنگیں محض خدا کیلئے لڑی گئی تھیں اور ان کا اصل مقصود رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ تھا مگر بات صرف جذبہ ہی پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اسلام نے ان جنگوں کیلئے باقاعدہ اصول و قوانین بھی مقرر کئے ہیں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا: اللہ کا نام لیکر جاؤ اور اسکی راہ میں جا کر لڑو جو خدا سے بغاوت کرے اس سے لڑو مگر عہد شکنی نہ کرنا لاشوں کا مثلہ نہ کرنا اور نہ کسی بچے کو قتل کرنا اسی طرح حضور ﷺ نے امن پسند لوگوں پر ہتھیار اٹھانے کی ممانعت کی ہے مال و اسباب تباہ و برباد کرنے یا کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے سے آپ نے مسلمانوں کو روک دیا اور انہیں تاکید کی کہ وہ کسی شر یا فساد کی حوصلہ افزائی کا باعث نہ بنیں کیونکہ " واللہ لا یحب المفسدین "(سورۃ ۶۴ آیت ۵)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ فساد کرنیوالوں کو پسند نہیں کرتا۔

اسلامی جہاد کی اعلیٰ روایات اور تاریخ:

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی تمام جنگوں میں چاہے وہ جنگیں انہیں اپنے مکار صلیبی دشمنوں کے خلاف لڑنی پڑی ہوں اپنی ان اعلیٰ روایات کو ہمیشہ برقرار رکھا ہے عیسائیوں نے جب بیت المقدس (یروشلم) پر قبضہ کیا تو انھوں نے وہاں کی مسلمان آبادی کو ہر طرح کے ظلم و ستم اور زیادتی کا نشانہ بنایا ان کی آبروؤں کو پامال کیا ان کے زن و مرد کو بے دریغ قتل کیا یہاں تک کہ شہر میں مسلمانوں کی عظیم الشان مسجد بھی انکی دست درازی سے نہ بچ سکی لیکن جب مسلمانوں نے دوبارہ اس شہر کو فتح کر لیا تو

انہوں نے ظالموں سے کوئی بدلہ نہیں لیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں ظلم وزیادتی کا بدلہ لینے کا پورا پورا حق حاصل تھا ارشاد خداوندی ہے "فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیه بمثل مااعتدی علیکم" (سورۂ بقرہ آیت ۱۹۴) ترجمہ جو تم پر دست درازی کرے تم بھی اس پر اسی طرح دست درازی کرو اس کے بجائے مسلمانوں نے اپنے سابق دشمنوں کیساتھ ایسا شریفانہ اور فیاضانہ برتاؤ کیا جس کی نظیر چشم فلک نے آج تک کہیں نہیں دیکھی مسلمانوں کے یہی اعلیٰ جنگی مقاصد اور روایات ہیں جو ان کو غیر مسلموں سے ممتاز کرتے ہیں ورنہ اسلام بڑی آسانی سے اس نظریہ کو فروغ دے سکتا تھا کہ جو لوگ بت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہوں اور حق وصداقت کے خلاف سرگرم عمل ہوں وہ سرے سے انسان ہی نہیں ہیں بلکہ نیم وحشی لوگ ہیں اسلیئے یہ لوگ صرف اس قابل ہیں کہ انہیں غلام بنا کر رکھا جائے۔ اگر یہ لوگ ذہنی اور انسانی اوصاف میں فروتر نہ ہوتے تو حق وصداقت کے دشمن کیسے ہو سکتے تھے اور دین حق کے خلاف محاذ کس طرح قائم کر سکتے تھے چونکہ انکی یہ حرکت مرتبۂ انسانیت کی نفی ہے لہٰذا یہ لوگ کسی عزت واحترام کے مستحق نہیں ہیں اور نہ اس آزادی کا ان کا کوئی حق ہو سکتا ہے جو دنیا میں فقط مردان حر کیلئے مخصوص اور مقدر ہے۔ اسلام اگر چاہتا تو بڑی آسانی سے یہ نظریہ اختیار کر سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا اس نے کبھی یہ نہیں کہا اور نہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ جنگی قیدی مرتبۂ انسانیت سے گرے ہوئے نیم وحشی انسان ہیں لہذا ان کو غلام بنا لیا جائے۔ اگر اس وقت اسلام یک طرفہ کاروائی کر کے غلامی کے خاتمے کا فیصلہ کر دیتا تو اس سے دشمن شیر ہو جاتے اور انھیں اس بابت کی کھلے چھوٹ مل جاتی کہ وہ کسی انتقامی کاروائی کے اندیشے کے بغیر بلا چون وچرا اپنی قید میں آئے ہوئے مسلمانوں کو ہر طرح کے مصائب و آلام اور ذلت کا تختۂ مشق بناتے رہیں۔

اسلام نے کبھی غلامی پر اصرار نہیں کیا:

مصلحت کے ان تمام تقاضوں کے باوجود اسلام نے کبھی اس بات پر اصرار نہیں کیا کہ جنگی قیدیوں کو لازماً غلام ہی بنایا جائے۔ اس کے برعکس اس کا طریقہ یہ تھا کہ اگر امن وامان قائم ہو جاتا تو کسی کو غلام نہیں بنایا جاتا تھا۔ خود پیغمبر اسلام ﷺ نے غزوہ بدر میں گرفتار ہونے والے سرداران مکہ سے فدیہ لے کر اور کچھ کو بغیر فدیے کے پڑھائی لکھائی سکھا دینے پر آزاد کر دیا تھا اسی طرح آپؐ نے نجران کے عیسائی وفد سے جزیہ لینا قبول کر لیا تھا اور اسکے عوض انکے تمام قیدی چھوڑ دیئے تھے۔ اسلام کے یہ روشن کارنامے دیکھ کر ہی انسانیت رفتہ رفتہ اس قابل ہوئی کہ ماضی کے تاریک اثرات سے آزاد ہو اور جنگی قیدیوں کے مسئلے کا کوئی خالص انسانی حل تلاش کر سکے۔

چنانچہ مختلف جنگوں میں مسلمانوں نے جو قیدی گرفتار کئے ان سے کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی گئی اور نہ انہیں کسی طرح کی اذیت تحقیر و تذلیل کا نشانہ بنایا گیا بلکہ اس کے بجائے انکی کھوئی ہوئی آزادی بحال کرنے کی راہ نکالی گئی اور اس کے لئے شرط صرف یہ رکھی گئی کہ وہ آزادی کے بعد انکے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی قابلیت رکھتے ہوں چنانچہ اگر ان میں سے کوئی اس معیار پر پورا اترتا تو اسے بلا تامل آزاد کر دیا جاتا تھا حالانکہ ان میں سے بعض لوگ تو ایسے تھے جو مسلمانوں کی قید میں آنے سے قبل کئی نسلوں سے غلام در غلام چلے آتے تھے یہ لوگ غلاموں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جن کو ایرانی اور رومی سلطنتیں دوسرے ملکوں سے پکڑ لاتی تھیں اور پھر انہیں مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے محاذ جنگ پر بھیج دیتی تھیں۔

دشمن کی گرفتار شدہ عورتیں:

جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے اسلام نے غلامی اور قید کی حالت میں بھی انکی نسوانیت کا احترام ملحوظ رکھا ہے حالانکہ وہ دشمن قوم سے تعلق رکھتی تھیں اور جنگ میں گرفتار ہو کر آتی تھیں اسلام نے کسی مسلمان کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ انہیں بے آبرو کرے اور میدان جنگ میں ملنے والے مال غنیمت کا جزو سمجھتے ہوئے ان پر قابض ہو جائے۔ اس نے ان عورتوں کو مشترکہ ملکیت بھی نہیں قرار دیا کہ جو چاہے انھیں اپنی ہوس ناکی اور درندگی کا شکار بناتا پھرے اور کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ ہو اسکے برعکس اسلام نے ان عورتوں کو صرف انکے مالکوں کیلئے مخصوص کر دیا اور صرف انہی کو ان سے متمتع ہونے کا حق دیا جس کے بعد کسی غیر کیلئے ان سے جنسی تعلقات جائز نہ رہے مزید برآں انکے لئے بھی مکاتبت کے ذریعہ

زادی کی راہ کھول دی گئی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ طے کر دیا گیا کہ اگر کوئی باندی اپنے مالک کے صلب سے بچے کی ماں بن جائے تو اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ خود بخود آزاد ہو جائے گی اور اس کا بچہ بھی آزاد انسان سمجھا جائیگا اس سے ظاہر ہوا کہ قیدی عورتوں کیساتھ قید کے دوران اسلام کا برتاؤ کتنا فیاضانہ اور پاکیزہ تھا۔

یہ ہے اسلام میں غلامی کی داستان یہ تاریخ انسانی کا درخشاں باب ہے اصولی لحاظ سے اسلام نے کبھی بھی غلامی کو پسندیدہ قرار نہیں دیا بلکہ اپنے تمام وسائل و ذرائع سے اس کو مٹانے کی ہمیشہ کوشش کی اور اس بارے میں کبھی کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑ رکھا وقتی طور پر اسلام نے اس کے وجود کو برداشت کیا بھی تو محض اسلئے کہ اس کے سامنے اسکے سوا اور کوئی متبادل راہ موجود نہ تھی کیونکہ غلامی

کے قطعی انسداد کیلئے صرف مسلمانوں کی رضامندی ہی کافی نہ تھی بلکہ غیر مسلموں کی حمایت اور ت
بھی ضروری تھا اسلام اسوقت تک غلامی کا قطعی انسداد نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ باقی دنیا بھی
قیدیوں کو غلام بنانے سے اجتناب کرنے کا قطعی فیصلہ نہ کر لیتی۔

دور جدید میں غلامی کا کاروبار:

بعد کے ادوار میں غلام انسانوں کی خرید و فروخت اور انکی تجارت کی جو مثالیں م
اسلامیہ کی تاریخ میں ملتی ہیں اسلام کا ان سے کوئی واسطہ نہیں غلامی کی یہ صورتیں کسی اسلامی
نتیجہ نہیں تھیں بلکہ انکی حیثیت اسلامی تاریخ میں وہی ہے جو اسلام کے نام پر مختلف جرائم کا ار
کرنے والے موجودہ مسلم حکمرانوں کی ہے جس طرح ان جرائم کو اسلام کی جانب منسوب کر
نہیں ہے اسی طرح غلامی کی ان صورتوں کا اسلام کی جانب انتساب بھی صحیح نہیں۔

غلامی پر بحث کا خلاصہ:

(۱) مسئلہ غلامی پر غور کرتے وقت مندرجہ ذیل حقائق ہمیشہ ہماری نگاہوں میں رہنے چا
اسلام کے بعد کے ادوار میں مختلف حکومتوں نے غلامی کی پشت پناہی کی اور اسکی
شکلوں کو مختلف طریقوں سے برقرار رکھا حالانکہ ان حکومتوں کو کوئی خاص مجبوری درپیش نہیں
انکے اس طرز عمل کی وجہ ہوس ملک گیری اور حرص اقتدار تھی جس کی وجہ سے ہر قوم یا طبقہ دو
قوموں یا طبقات کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتا تھا اسکے علاوہ غلامی کی ایک اور وجہ غربت اور افلاس
تھی جو لوگ غریب گھرانے میں پیدا ہوتے تھے یا زمینوں پر مزارعین کی حیثیت سے کام کرتے
انھیں حقیر خیال کیا جاتا تھا اور ان سے غلاموں کی طرح کام لیا جاتا تھا اسلام غلامی کی تمام صور
کے قطعی انسداد کا حامی تھا چنانچہ اسلام نے تمام صورتوں کو ختم کر دیا سوائے ایک صورت یعنی
جس کے لئے حالات ابھی تک سازگار نہیں تھے۔

(۲) یورپ میں ایک عرصہ دراز تک غلامی بغیر کسی خاص ضرورت کے موجود رہی ہے
تک کہ بعد میں جب اسکا خاتمہ ہوا بھی تو اسکی وجہ یہ نہیں تھی کہ اہل یورپ دل سے اسکے خاتمے
حامی تھے بلکہ اسکے پیچھے انکی بعض مجبوریاں تھیں ورنہ انھوں نے کبھی خوش دلی سے اسکے خاتمے کو
نہیں کیا چنانچہ خود یورپی مصنفین کی تحریریں گواہ ہیں کہ یورپ میں غلامی کے انسداد کی اصل
معاشی حالات تھے جنگی وجہ سے غلام بجائے اسکے کہ وہ اپنے آقا کی دولت میں اضافے کا سبب
کیلئے الٹا معاشی بوجھ بن گئے تھے کیونکہ اب غلاموں میں آقاؤں کیلئے نہ محنت کرنے کا جذبہ باقی رہ گیا

نہ ان کے جسموں میں اتنی قوت رہ گئی تھی کہ وہ آقاؤں کی معاشی خوشحالی کا ذریعہ بن سکتے انکی خوراک اور نگرانی پر جتنا خرچ ہوتا تھا وہ ان سے حاصل ہونے والی آمدنی سے کہیں زیادہ بڑھ گیا تھا الغرض یورپ میں غلاموں کی آزادی کی تحریک خالص معاشی اسباب کی پیداوار تھی اور سود وزیاں کا خالص کاروباری مسئلہ تھا اس کا اور اسلام کے اس بلند پاکیزہ نصب العین کا آپس میں کوئی تقابل ہی نہیں اسلام نے دنیا کو انسانیت کا بلند تصور دیا اور اسکے ذریعہ غلاموں کو اس آزادی سے بہرہ ور کیا یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ اس طرح کے پے در پے خونی انقلابات کے تذکرے سے یکسر خالی نظر آتی ہے جن سے یورپ کی تحریک آزادی کی تاریخ داغدار ہے ان انقلابات کے بعد وہاں کے آقاؤں کیلئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اپنے غلاموں کو غلام بنا کر اپنے قابو میں رکھ سکتے لہٰذا انہیں بادل نخواستہ اپنے غلاموں کو آزاد کرنا پڑا۔

مگر ان معاشرتی انقلابات کے باوجود یورپی غلاموں کو اپنی آزادی کے تحفظ کی ضمانت کبھی حاصل نہیں ہوئی بلکہ ان انقلابات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے بعد ان کی غلامی اور محتاجی کے بندھن کچھ اور ہی زیادہ مضبوط ہو گئے اور انکی تقدیر اپنی مزروعہ زمینوں سے بندھ کر رہ گئی جنکی فروخت پر وہ بھی بک جاتے تھے ان کاشتکاروں کو اپنی زمین چھوڑ کر کہیں اور جانے کی اجازت نہ تھی چنانچہ اگر کاشتکاروں میں سے کوئی اس حرکت کا مرتکب ہوتا تو ملکی قانون کی نگاہ میں وہ بھگوڑا اور مفرور قرار پاتا اور گرفتار ہونے پر اسکے جسم کو داغا جاتا اور پھر پابجولاں اپنے مالک کی تحویل میں دے دیا جاتا تھا۔ غلامی کی یہ نوع یورپ میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے انقلاب فرانس تک موجود رہی ہے گویا یورپ کو غلامی کے خاتمے کی توفیق اسلام کے منشور آزادی کے کوئی گیارہ صدی بعد جا کر حاصل ہوئی۔

چہرہ روشن اندرون تاریک تر:

لیکن ٹھہریئے خوبصورت ناموں اور خوشنما الفاظ وترکیب سے دھوکا نہ کھائیے کہنے کو تو انقلاب فرانس کے بعد فرانس سے اور ابراہام لنکن کے بعد امریکہ سے غلامی کی لعنت ختم ہو گئی اور دنیا نے غلامی کے خلاف فیصلہ بھی دیدیا مگر حقیقت اتنی خوشگوار نہیں جتنی کہ ان الفاظ میں نظر آتی ہے کیونکہ اصلیت یہ کہ غلامی کا وجود اب بھی دنیا میں موجود ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو جبر واستبداد کا دیوتا مختلف بہروپ بدل کر یوں دنیا بھر میں رقصاں نظر نہ آتا اگر غلامی کی لعنت سے فی الحقیقت دنیا پاک ہو چکی ہے تو الجزائر میں فرانسیسی کٹھ پتلی فوجوں کی درندگی اور وحشت کے کارناموں کا عنوان کیا ہوگا؟ اور ان تاریک جرائم کو کس نام سے تعبیر کیا جائے گا جو امریکی اپنے ہم وطن حبشیوں کے ساتھ روا رکھے ہوئے ہیں نیز کچھ دن قبل تک جنوبی افریقہ کے سیاہ فام باشندوں کیساتھ اہل یورپ کے ظالمانہ طرز عمل کو کیا نام دیا جائے گا؟

غلامی کے نئے نام:

آخر غلامی اس کے سوا اور کیا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو غلام بنا کر اس کو تمام حقوق انسانی سے محروم کردے، غلامی کا حقیقی مفہوم یہی ہے لہٰذا چاہئے کہ ہم خوشنما نعروں سے دھوکا نہ کھائیں بلکہ ان کی اصلیت پہچاننے کی کوشش کریں اور غلامی کی اُن مختلف صورتوں پر آزادی، اخوت و مساوات کے خوبصورت و خوشنما لیبل چسپاں نہ کرتے پھریں کیونکہ خوبصورت اور رنگین لیبلوں سے کسی شی کی خباثت و بُرائی، لطافت اور اچھائی میں تبدیل نہیں ہوجاتی اور نہ کسی کے مکروہ اور گھناؤنے جرائم پر اس طرح کے رنگین پردے ڈال کر انہیں چھپایا جاسکتا ہے خصوصاً جب کہ نسلِ انسانی کو ان کی تلخیوں کا ایک دو دفعہ نہیں بلکہ بار بار تجربہ بھی ہوچکا ہو۔

اسلام کی صداقت شعاری:

اپنے مُدعا اور موقف کے اظہار و بیان میں اسلام نے کبھی کسی مداہنت سے کام نہیں لیا بلکہ ہر موقعہ پر کھل کر اُن کا اظہار کیا ہے تاکہ اس کے اصل عزائم کسی پر مخفی نہ رہیں۔ اُس نے صاف اور واضح الفاظ میں غلامی کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا اس کے اصل اسباب کی نشاندہی کی۔ اس کے سدباب کے طریقے بتائے اور اس کے خاتمے کی راہ ہموار کی۔

تہذیب جدید کی منافقت:

اس کے برعکس تکلف و تصنع کے غازے سے مزین تہذیب جدید اپنے حقیقی مُدعا اور طریقہ کار دونوں میں ابہام کا شکار ہے، تہذیب جدید نہ تو اپنے حقیقی عزائم کے اظہار میں بے باک ہے اور نہ اس کا طریقہ کار ہی واضح ہے اس کا امتیازی وصف ہے ؎

چہرہ روشن، اندرون چنگیز سے تاریک تر

تیونس، الجزائر اور مراکش میں اس تہذیب کے فرزندوں نے ہزاروں افراد کو محض اس جرم میں موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا کہ وہ آزادی چاہتے تھے اور اپنے لئے احترام انسانیت کے طالب تھے اپنے وطن پر غیروں کے بجائے اپنی حکومت چاہتے تھے۔ اپنی زبان میں گفتگو کے خواہش مند تھے اور چاہتے تھے کہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح اُن کا وطن بھی آزاد ہو۔ جہاں وہ بیرونی مداخلت سے آزاد رہ کر اپنی مرضی سے اپنے دین اور عقیدے کے مطابق اپنی زندگی بسر کرسکیں اور جس نہج پر چاہیں دوسروں سے اپنے اقتصادی اور سیاسی روابط قائم کرسکیں۔

تہذیب جدید کے علمبرداروں نے ان بے گناہوں کے خون سے بے دریغ اپنے ہاتھ رنگے۔ انہیں سڑنے کیلئے غلیظ اور متعفن جیل خانوں میں محبوس کردیا۔ ان کی آبروؤں کو لوٹا ان کی عورتوں کی عصمت دری کی اور آپس میں شرطیں لگا لگا کر حاملہ عورتوں کے پیٹ سنگینوں سے چاک کئے بیسویں صدی کی اس دوغلی تہذیب کے علمبرداروں نے ان سب گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کیا، مگر ہر جگہ زبان سے یہی اعلان کیا کہ وہ دنیا کو آزادی، اخوت ومساوات کا درس دینے نکلے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ان گھناؤنے اور مکروہ جرائم کو تو روشنی اور ترقی کا نام دیتے ہیں مگر چودھویں صدی قبل اسلام نے بغیر کسی خارجی دباؤ اور مجبوری کے محض احترام آدمیت سے سرشار ہو کر غلاموں سے جو فیاضانہ برتاؤ کیا اور صاف صاف اعلان کیا کہ غلامی انسانی زندگی کا کوئی مستقل جزو نہیں بلکہ ایک عارضی حالت ہے، اس کو یہ حضرات وحشت، رجعت پسندی اور تاریک خیالی سے تعبیر کرتے ہیں ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپکا حسنِ کرشمہ ساز کرے!

اسی طرح اگر امریکی اپنے ہوٹلوں اور تفریح گاہوں پر یہ کتبے آویزاں کرتے ہیں،، صرف سفید فام کیلئے۔ کالوں اور کتوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں،، مہذب امریکیوں کا کوئی ہجوم سیاہ فام نسل کے کسی فرد کو اپنی وحشت اور بربریت کا شکار بنانے کے بعد اسے سڑک پر اپنے جوتوں سے اسوقت تک گیند کیطرح اچھالتا پھرتا ہے جب تک کہ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز نہ کر جائے اور لطف یہ ہے کہ اس سارے ہنگامۂ وحشت وبربریت کو وہاں کی پولیس خاموش تماشائی کیطرح کھڑی دیکھتی رہتی ہے اور مظلوم کو اس غضبناک ہجوم سے بچانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتی حالانکہ وہ سیاہ فام زبان مذہب اور انسانیت کے لحاظ سے انہی کا ہم جنس اور ہم وطن ہے۔ تہذیب جدید کے فرزندوں کا دامن ان تمام گھناؤنے جرائم اور افعال سے داغدار ہے مگر اسکے باوجود انکی تہذیب شرافت اور ترقی پر آنچ نہیں آتی اور نہ انکے ترقی یافتہ اور مہذب ہونے پر کوئی حرف آتا ہے ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ایک طرف فرزندان تہذیب کا یہ طرزِ عمل ہے اور دوسری طرف اسلامی تاریخ کی یہ درخشاں مثال کہ جب خلیفہ ٔوقت حضرت عمرؓ کو ایک غلام نے قتل کی دھمکی دی تو قدرت واختیار ہونے کے باوجود آپؓ نے غلام کو کچھ نہیں کہا۔ اُسے نہ قید کیا گیا، نہ جلاوطن کیا گیا، اور نہ یہ کہہ کر اس کو جلاد کے حوالے کیا گیا، کہ وہ نیم وحشی انسان ہے جو اپنی آنکھوں سے حق وصداقت کا

مشاہدہ کرنے کے باوجود محض تعصب وہٹ دھرمی کی بناء پر باطل اور جھوٹ کی پرستش پر مُصر ہے،
اس دھمکی کے جواب میں حضرت عمرؓ نے بس اتنا کہا: "اِس غلام نے مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی ہے "پھر اس کے بعد اس سے کوئی تعارض نہیں کیا اور نہ اس کی آزادی پر کوئی قدغن عائد کی، اس غلام پر خلیفہ کے قتل کا الزام صرف اس وقت عائد کیا گیا جب وہ عملاً اس گھناؤنے فعل کا ارتکاب کر چکا تھا:

افریقہ میں انگریزوں کے مظالم:

انگریزوں نے افریقہ کے سیاہ فام باشندوں سے جو سلوک رَوا رکھا تھا اور بقول برطانوی اخبارات کے وہ "ان کو اس طرح مارا ہے گویا کہ جانوروں کا شکار کھیلا ہے" انہیں اپنے بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر رکھا تھا۔ یہ انگریزوں کی انصاف پرستی اور تہذیب جدید کا نقطہ کمال ہے، یہاں پر ہمیں برطانوی انصاف اور تہذیب جدید اپنے حقیقی روپ میں جلوہ گر ملتی ہے اور یہی وہ اعلیٰ اور شاندار اصولِ حیات ہیں جن کی بناء پر اہل مغرب اقوام عالم پر اپنی بالادستی اور برتری کے مدعی ہیں اور اسلام کو اس جرم میں سطحی، وحشیانہ اور رجعت پسند قرار دیتے ہیں کہ اس نے دشمن کے قیدیوں کو برابر کے سلوک کی بنیاد پر وقتی طور پر غلام بنانے کی اجازت دی ان کے خیال میں اسلام رجعت پسندانہ مذہب ہے کیونکہ اس نے جانوروں کی طرح آدمیوں کے شکار کی اجازت نہیں دی اور محض کالی چمڑی کی وجہ سے کسی کو قتل و غارت گری کے حوالے نہیں کیا، یہی نہیں بلکہ اس کی رجعت پسندی کا یہ عالم تھا کہ اس نے صاف صاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیا "سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تمہارا حاکم ایسا کوئی حبشی ہو جس کا سر منقیٰ جیسا ہو"۔

قیدی عورتوں کے مسئلے کا حل:

قیدی عورتوں کے مسئلے کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ جنگ میں جو غیر مسلم عورتیں گرفتار ہو کر آئی تھیں اسلام نے مرنے کے مسئلہ کا یہ حل نکالا کہ ان کو مسلمانوں میں بانٹ دیا جاتا تھا گنجائش ہوتی تو ایک آدمی کو کئی کئی عورتیں بھی سونپ دی جاتی تھیں جن پر اس کو مالکانہ حقوق حاصل ہوتے تھے اور صرف وہی مالک انہی ان مملوکہ باندیوں سے جنسی تعلقات قائم کر سکتا تھا بلکہ اگر وہ چاہتا تو اُن میں سے اپنی پسند کی عورتوں سے باقاعدہ شادی بھی کر سکتا تھا، جدید یورپ اسلام کے اس طرز عمل پر نفرت سے ناک بھوں چڑھاتا ہے مگر مرد و زن اپنی حیوانی جذبات کی تسکین کے لئے آپس میں ناجائز تعلقات قائم کرتے ہیں اور اس سلسلے میں کسی قانونی اور انسانی اصول کو خاطر میں نہیں لاتے، انہیں دیکھ کر جدید یورپ کے میر ضمیر میں کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی اور نہ حیوانوں کے طرح آزاد شہوت رانی اس کے

نزدیک کوئی گناہ ہے، دراصل اسلام کا ناقابلِ تلافی قصور یہ ہے کہ وہ بدکاری کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ان شرمناک مظاہر کو برداشت کرتا ہے جس کا جدید یورپ عادی ہو چکا ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ اسلام سے اس قدر ناراض نظر آتے ہیں۔

قیدی عورتوں کی حالتِ زار اور اسلام:

دوسری قوموں میں قیدی عورتوں سے انتہائی شرمناک سلوک روار کھا جاتا تھا۔ قید کے بعد وہ قحبہ گری اور بدکاری کی گھناؤنی زندگی گزارنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں پاتی تھیں، کیونکہ معاشرے میں ان کو کوئی عزت حاصل نہیں تھی، اور نہ ان کی پشت پر کوئی اقتدار و قوت ہی موجود تھی جو ان کی عصمت دری اور آبرو کی محافظ بنتی، ان کے مالک ان کے محافظ بن سکتے تھے مگر ان کے لئے تو وہ آمدنی کا ذریعہ تھیں، چنانچہ بسا اوقات خود اپنی باندیوں کو قحبہ گری کا پیشہ کرانے پر مجبور کرتے تھے، مگر جب رجعت پسند اور ترقی ناآشنا (بطور طنز) اسلام کا دور آیا تو اس نے بدکاری اور فحاشی کے اس ذریعہ کا بھی خاتمہ کر دیا اور یہ قانون بنادیا کہ باندیوں سے صرف وہی لوگ جنسی تعلقات قائم کر سکتے ہیں جو ان کی قانونی مالک ہیں، باندیوں کی معاشی کفالت کا بار بھی اسلام نے مالکوں کے کندھوں پر ڈال دیا تاکہ وہ کسی معاشی مجبوری اور اضطراب کی وجہ سے غلط کاری اور بے راہ روی کی شکار نہ ہو جائیں بلکہ اپنے مالکوں کے تحفظ میں پاک اور ستھری زندگی گذار سکیں۔

آزادیٔ نسواں کی حقیقت:

لیکن یورپ کا حساس ضمیر اس "وحشت و بربریت" (بطور طنز) کا روادار نہیں ان کے نزدیک اسلام کا یہ طرز عمل دورِ وحشت کی یادگار ہے لہٰذا وہ بدکاری اور عصمت فروشی کو نہ صرف یہ کہ عملاً روا سمجھتا ہے بلکہ اسکو قانونی تحفظ بھی عطا کرتا ہے۔ اور اپنے مکروہ استعماری عزائم کی تکمیل کی خاطر دنیا بھر کو اس کی گندگی اور وبا میں مبتلا کر دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ لعنت اب بھی دنیا پر مسلط ہے اگرچہ اس کے نام نئے ہیں اور اس پر طرح طرح کے خوش رنگ پردے پڑے ہوئے ہیں آزادیٔ نسواں کے تمام دعوؤں کے باوجود عورت اب بھی مظلوم ہے اور عام مردوں کے لئے دل بہلانے کا سامان بنی ہوئی ہے دورِ جدید کی بنی ٹھنی طوائف اور پیشہ ور عورت کو کیا کسی لحاظ سے بھی حقیقی معنی میں آزاد عورت قرار دیا جاسکتا ہے؟ کیا آج کی عورت حقیقی آزادی سے بہرہ ور ~~ہے؟ اسلام نے~~ باندیوں اور مالکوں کے درمیان جن انسانی اور روحانی رشتوں کو استوار کیا تھا انکی پاکیزگی اور شرافت اور پھر تہذیب جدید کے زیرِ سایہ ہونے والی عصمت فروشی کے اس مکروہ اور گھناؤنے کاروبار

میں کوئی نسبت و تقابل ہو سکتا ہے؟ نہیں ہر گز نہیں۔

قحبہ گری اور تہذیب جدید:

اسلام اپنے نظریے اور افکار میں بالکل واضح اور روشن ہے۔ تہذیب جدید اس خصوصیت سے محروم، پریشان خیالی اور ژولیدہ فکری کا شکار ہے۔ اس کی ایک مثال قحبہ گری اور عصمت فروشی کا کاروبار ہے۔ تہذیب نو اس کی غلامی کے دور کی ایک یادگار تسلیم کرتی ہے مگر اس کے باوجود یہ کہہ کر اس کو باقی رکھنے پر بھی اصرار کرتی ہے کہ یہ ایک ناگزیر معاشرتی ضرورت ہے۔ اب ذرا اس ناگزیر معاشرتی ضرورت پر بھی ایک نگاہ ڈالتے چلئے جس کی وجہ سے یورپ قحبہ گری کی اس لعنت کو باقی رکھنے پر مصر ہے۔

خود غرضی:

موجودہ زمانے میں قحبہ گری کی بڑی وجہ تہذیب جدید کی خود غرضی ہے، جس کی وجہ سے جدید یورپ کا کوئی مہذب فرد اپنی لذت کے سوا کسی اور کی معاشی کفالت کا بار اٹھانے پر تیار نہیں ہے خواہ وہ اس کی بیوی یا بچے ہی کیوں نہ ہوں، وہ لذت کا طالب ہے مگر کسی قسم کی ذمہ داری اپنے سر لینے کے لئے تیار نہیں، چنانچہ اپنی جنسی تسکین کے لئے اس کو عورت کی تلاش ہوتی ہے لیکن صرف اس کے جسم سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔

قحبہ گری کی اصل وجہ:

یہ ہے وہ ناگزیر معاشی ضرورت جس کو بنیاد بنا کر موجودہ زمانے کے یہ روشن خیال عورت کی اس غلامی کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ محض فریبِ نظر ہے کیونکہ قحبہ گری کی اصل وجہ جدید انسان کی خواہش پرستی اور غلط بینی ہے اس لئے جب تک اس کی انسانیت کی سطح بلند نہیں ہوگی قحبہ گری کی اس لعنت کا تدارک ناممکن ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی واضح رہے کہ مغرب کی جن مہذب حکومتوں نے بعد کے ادوار میں قحبہ گری پر قدغن عائد کی ہے ان کا اصل محرک طوائف کی نسائیت یا انسانیت کا جذبہ احترام نہیں تھا اور نہ ان کا یہ فعل کسی اخلاقی نفسیاتی یا روحانی ارتقاء کا مظہر تھا کہ جس کی بنا پر ان کے نزدیک قحبہ گری کوئی مردود اور مکروہ شئ بن گئی ہو بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ زناکاری اور عیاشی کے تمام لوازمات سے بھرپور سوسائٹی گرلز جب میدان عمل میں اتر آئی تو ان طوائف کی کوئی خاص معاشرتی ضرورت و اہمیت باقی رہی اور نہ بدکاری کے جرم یا گناہ ہونے کا تصور ہی باقی رہ گیا تھا مگر اس کے باوجود ذاتی

لوگوں کی ہٹ دھرمی کا یہ عالم ہے کہ وہ چودہ صدی پیشتر باندیوں کے متعلق اسلام کے طرز عمل کی آڑلے کر اب تک اس پر طعن و تشنیع کی زبان دراز کرتے رہتے ہیں۔ اور اسلام کو غلامی کا طعنہ دیتے رہتے ہیں اور یہ فراموش کر جاتے ہیں کہ اسلام نے احترام انسانیت سے متعلق جو معاشرہ برپا کیا، ان کی بیسویں صدی کی تہذیب جدید سے کہیں زیادہ پاکیزہ و فطری تھا اور ہے۔

یہ سوسائٹی گرلز۔

جدید مغربی معاشرت میں لذت پرستی اور عیاشی کی خوگر "سوسائٹی گرلز" جس بیباکی اور آزادی سے اپنے جسموں کو دوسروں کے حوالے کرتی نظر آتی ہے اس سے ہمیں دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ یہ آزادی نہیں بلکہ غلامی کی وہ قسم ہے کہ جس میں غلام برضا و رغبت غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیتے ہیں مگر اس طرح کے چند غلام فطرت افراد کا وجود اور اپنی انسانی حریت سے یوں ان کی دست برداری کو کوئی صالح معاشرہ سند جواز نہیں عطا کر سکتا مگر یورپ اپنے بلند بانگ دعوٰں کے باوجود اس گھناؤنی غلامی کو گلے لگائے ہوئے ہے۔

یورپ تہذیب کا اصل کارنامہ:

اس صورت حال سے مغربی نظام حیات کی تباہ کاری واضح ہے جو ایک ایسا معاشی سیاسی، فکری اور روحانی ماحول پیدا کر دیتا ہے جس میں لوگ اتنے مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ آزادی پر غلامی کو ترجیح دینے لگتے ہیں دراصل یورپی تہذیب اب تک جو کارنامہ انجام دے سکی ہے اس کا طول و عرض بس یہی کچھ ہے ۔

بے کاری و مے خواری و عریانی و افلاس

یورپ میں غلامی کی اصل وجہ:

یہ ہے یورپی غلامی کی مختصر داستان، اس کی تاریخ مردوں، عورتوں پوری پوری قوموں اور طبقات کی غلامی کی تاریخ سے عبارت ہے اس کے وجود میں آنے کے مختلف اسباب تھے جس کے بعد ایک طویل عرصہ تک بغیر کسی خاص معاشرتی ضرورت یا مجبوری کے اس کو باقی رکھا گیا۔ یورپ کو اس قسم کے حالات بھی درپیش نہیں تھے جس سے چودہ صدی قبل اسلام کو واسطہ پڑ چکا تھا اور اس نے مجبوراً غلامی کی ایک شکل کو باقی رکھا تھا، اس کے برعکس یورپ میں غلامی کا یہ ناجائز استمرار اس کی گھناؤنی تہذیب اور غیر انسانی فطرت کا عکس تھا۔ نہ کہ اس کی کسی خاص ضرورت یا مجبوری کا شاخسانہ!

ماضی کے اشتراکی ممالک:

آخر میں ہم الفاظ ماضی کے اشتراکی ممالک کے بارے میں بھی کہنا چاہتے ہیں۔ان ممالک کے باشندوں پر بھی غلامی کی لعنت مسلط تھی اور وہ اشتراکیت کے ظلم واستبداد کے پاؤں تلے کراہ رہے تھے ان ملکوں میں بس ایک ہی آقا ہوتا تھا اور وہ تھی حکومت۔باقی لوگوں کا کام بے چون وچرا اطاعت تھا حد یہ ہے کہ اس کے شہریوں کو اپنے پیشے اور ملازمت کے انتخاب تک کی آزادی حاصل نہ تھی کیونکہ وہ غلام تھے اور غلام کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔

اس لحاظ سے ماضی کے اشترکی ممالک اور سرمایہ دار ممالک میں کوئی فرق نہ تھا، ایک میں حکومت قوت واختیار کا منبع تھی اور دوسرے میں بڑے بڑے سرمایہ دار قوت واقتدار پر قابض ہیں اور مزدوران کے رحم وکرم پر ہوتے تھے۔

قارئینِ کرام سے:

مضمون کے خاتمہ سے قبل ایک بات ہم قارئین کرام سے بھی کہنا چاہتے ہیں۔مختلف نظام حیات کے حامی حضرات اپنے اپنے نظریے کی تعریف میں رطب اللسان نظر آئیں گے مگر ہمیں امید ہے کہ اگر وہ ہماری ان معروضات کو نگاہ میں رکھیں گے تو ان کے فریب میں نہ آئیں گے۔ہماری گذارشات سے امید ہے کہ قارئین نے یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرلی ہوگی کہ دراصل ناموں کے اختلاف کے ساتھ یہ قدیم زمانے کی غلامی ہی کی نئی صورتیں ہیں جو تہذیب جدید اور نام نہاد سماجی ترقی کے پردے میں قائم ودائم ہیں۔کیا اسلام کی بتائی ہوئی صراط مستقیم کو چھوڑ کر انسانیت ترقی کرسکی؟ یا وہ بتدریج اخلاقی انحطاط وتنزل کا شکار ہوتی چلی جارہی ہے اب قارئین کرام اس کا اندازہ خود کرسکتے ہیں اور یہ دیکھ سکتے ہیں کہ آج کے مادی ترقی یافتہ دور میں بھی پوری دنیا، اسلام کی رہنمائی کی کس قدر شدید محتاج ہے۔

استغنائے سلمان رضی اللہ عنہ

محمد بدیع الزماں ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہارون نگر فرسٹ سیکٹر پھلواری شریف پٹنہ ۸۰۱۵۰۵

بالِ جبریل میں اقبال مسلمان نوجوانوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل؟ نہ زور حیدریؓ تجھ میں نہ استغنائے سلمانیؓ
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

اقبال کا کہنا ہے کہ اگر قوم کے افراد میں "زور حیدری" اور "استغنائے سلمانی" کی صفات نہ ہوں تو بادشاہت بھی اُن کے لئے کوئی قابل فخر چیز نہیں کیونکہ ان صفات کے نہ ہونے کی صورت میں حکومت بہت جلد ان کے ہاتھوں سے نکل جائے گی۔ اقبال کا ان نوجوانوں سے یہ بھی کہنا ہے کہ مسلمان کی معراج تہذیب حاضر اختیار کرنے میں نہیں بلکہ اپنے اندر حضرت سلمانؓ جیسی صفت استغناء پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

اس طرح اقبال نے مسلم نوجوانوں کو متذکرہ بالا دو صفات سے متصف ہونے کی صلاح دی ہے۔ طوالت کی وجہ سے اس مضمون میں صرف ایک صفت "استغنائے سلمانیؓ" پر گفتگو کی جارہی ہے۔

استغنا لفظ "غنی" سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی ہیں ہر ایک سے مستغنی اور بے نیازی" یہ خدا کی ایک صفت ہے جسے خود خدا نے قرآن کی درجہ ذیل دس سورتوں میں بیان فرمائی ہے:۔

(۱) سورۃ یونس ۱۰، آیت ۶۸ (۲) سورۃ ابراہیم ۱۴، آیت ۸ (۳) سورۃ الحج ۲۲، آیت ۶۴ (۴) سورۃ النمل ۲۷، آیت ۴۰ (۵) سورۃ لقمٰن ۳۱، آیات ۱۲ اور ۲۶ (۶) سورۃ فاطر ۳۵، آیت ۱۵ (۷) سورۃ محمد ۴۷، آیت ۳۸ (۸) سورۃ الحدید ۵۷، آیت ۲۴ (۹) سورۃ الممتحنہ ۶۰، آیت ۶ (۱۰) سورۃ التغابن ۶۴، آیت ۶ خدائے تعالیٰ کی اِس صفتِ بے نیازی پر "رموزِ بیخودی" میں اقبال کا یہ شعر ہے ؎

بے نیازی زنگِ حق پوشیدہ است مسلمانیر نگِ غیر از پیرہن شوئیدہ است

خدائے تعالیٰ نے سورۃ البقرہ ۲۵ کی درج ذیل آیت ۱۲۸ میں انسانوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ اللہ کا رنگ اختیار کریں:۔

"(اے نبی ﷺ) کہو اللہ کا رنگ اختیار کرو اُس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہو گا؟ اور ہم اُسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں"

صفتِ استغنا اقبال کے نظامِ افکار میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے جسے اُنہوں نے اپنے کلام میں اسے بڑے شد و مد سے پیش کیا ہے۔ "بالِ جبریل" کی غزل ۱(دوم) میں کہتے ہیں ؂

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں، غلامی میں　　　زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

انسان میں اس بے نیازی کا رنگ صرف "شانِ فقر" سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ "شانِ فقر" کا ہی دوسرا رخ ہے۔ اقبال کے نزدیک معراجِ سلمانی شانِ استغنا سے حاصل ہوتی ہے جو شانِ فقر کی پروردہ ہے۔ اور یہ شانِ فقر صرف اتباعِ رسول ﷺ پر منحصر ہے اور اتباعِ رسول ﷺ بغیر عشق کے ممکن نہیں۔ غرض یہ چاروں ایک دوسرے سے مربوط اور لازم و ملزوم ہیں۔

جب ایک انسان استغنا کی صفت سے متصف ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کے سوا کسی اور سے حاجت روائی کی آرزو نہیں رکھتا اور ہر حال میں صرف اللہ کو حاجت روا سمجھتا ہے۔ وہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا کیونکہ وہ صرف اللہ کی خوشنودی کا طلبگار ہوتا ہے۔ یہی مومن کی پہچان ہے۔ بالِ جبریل کی "نظم" "مسجد قرطبہ" کے پانچویں بند میں مومن کی اس صفت کی مزید وضاحت اقبال نے اس طرح کی ہے:۔

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات　　　ہر دو جہاں سے غنی، اُس کا دلِ بے نیاز
اُس کی اُمیدیں قلیل، اُس کے مقاصد جلیل　　　اُس کی اُدا دل فریب، اُس کی نگہ دل نواز

چونکہ اقبال نے حضرت سلمانؓ (جو ایرانی النسل تھے اور ایمان لانے کے قبل آتش پرست تھے) کو استغنا کے معاملہ میں مثالی بنا کر پیش کیا ہے اس لئے ذیل میں آپؓ کے شانِ استغنا پر چند روایات پیش کی جارہی ہیں:

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت سلمانؓ بیمار ہوئے تو اُن کی عیادت کے لئے حضرت سعدؓ تشریف لائے۔ اُنہیں دیکھا کہ یہ رو رہے تھے۔ حضرت سعدؓ نے اُن سے کہا: اے میرے بھائی! تم کیوں رو رہے ہو؟ کیا تم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہیں رہے؟ آپؓ کے لئے تو بھلائی میں سبقت لے جانے والے بہت اعمال ہیں۔ حضرت سلمانؓ نے فرمایا:۔

"میں دو باتوں میں سے کسی ایک پر نہیں رو رہا۔ نہ تو دنیا کی لالچ کی وجہ سے اور نہ آخرت کی کراہت کی وجہ سے لیکن حضور ﷺ نے ہم لوگوں سے ایک وعدہ لیا تھا۔ میرا گمان یہ ہے کہ مجھ سے اس کی وفا میں کوتاہی ہوئی ہے"

حضرت سعدؓ نے دریافت کیا کہ تم سے حضور ﷺ نے کیا وعدہ لیا تھا؟ فرمایا:

"آپ نے ہم لوگوں سے وعدہ لیا تھا کہ تم میں ہر ایک کے لئے سوار کی زادِ راہ کے برابر کافی ہے اور میرا گمان ہے کہ میں نے اس معاملہ میں حد سے تجاوز کیا ہے۔ اور لیکن تم اے سعد اللہ کے تقویٰ کا لحاظ رکھنا"

حضرت ثابت فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت سلمانؓ نے کچھ اوپر بیس درہم اور تھوڑا سا نفقہ اپنے پاس چھوڑا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ جب حضرت سلمانؓ کا مال جمع کیا گیا تو

اس کی کل قیمت پندرہ درہم تھی۔ ایک روایت میں ہے پندرہ دینار تھی۔ ایک روایت میں ہے ایک دینار تھی اور باقی حضرات کی روایات میں ہے کہ کچھ اوپر دس درہم تھے۔ حضرت علی بن بذیمہؓ کی روایت میں ہے کہ حضرت سلمانؓ کا اثاثہ جو بیچا گیا تو اس کی قیمت چودہ درہم تھی۔

یہ تھا حضرت سلمانؓ کا وسعتِ دنیا پر خوف وگریہ اور یہ تھی آپؓ کی "شان استغنا" جسکو نمونہ کے طور پر اقبال نے پیش کیا ہے مگر پھر بھی سلمان فارسی کی شان استغناء کے بہت سے رخ قابل ذکر و تقلید ہیں جو درج ذیل ہیں:

حضرت عطیہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سلمانؓ فارسی کو دیکھا کہ ایک کھانے پر جسے یہ کھا رہے تھے اصرار کیا گیا کہ اور کھایئے۔ آپ نے فرمایا: "میرے لئے کافی ہے میرے لئے کافی ہے میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے، آپ ﷺ فرماتے تھے: جو دنیا میں لوگوں میں سے پیٹ زیادہ بھرے گا اس کی بھوک آخرت میں سب سے زیادہ ہوگی۔ اے مسلمان! دنیا مومن کے لئے جیل خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت ہے"

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ حضرت سلمانؓ کا سالانہ وظیفہ پانچ ہزار درہم تھا اور یہ قریب تیس ہزار مسلمانوں کے امیر تھے۔ یہ لوگوں میں ایک ایسی عبا میں خطبہ دیا کرتے تھے جس سے بعض حصہ کو بچھاتے تھے اور بعض کو اوڑھتے تھے اور جب اُن کو وظیفہ دیا جاتا تھا تو اس کو سخاوت کر دیتے تھے اور اپنے ہاتھ سے کھجور کی ٹوکریاں بناتے تھے اور اس کو بیچ کر گذر اوقات کرتے تھے۔

حضرت مالک بن انسؓ سے روایت ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ درخت اور دیوار کے سایہ سے سایہ پکڑتے۔ جدھر سایہ پھرتا اُس طرف کھسک جاتے۔ اُن کے لئے کوئی گھر نہیں تھا۔ کسی صاحب نے اُن سے عرض کیا: کیا میں آپؓ کے لئے کوئی عمارت نہ بنادوں جس میں آپ گرمی سے سایہ پکڑیں اور سردی میں سکونت اختیار کریں؟ حضرت سلمانؓ نے فرمایا: ہاں بنادو۔ جب وہ پیٹھ پھیر کر چلا تو آپؓ نے اُسے آواز دے کر بلایا اور اس سے پوچھا "کس طرح بناؤ گے" اُس نے کہا: "میں اسے اس طرح کا بناؤں گا کہ آپؓ کھڑے ہوں تو آپؓ کے سر کو لگے اور اگر آپؓ اس میں لیٹیں تو آپؓ کے پیر سے اڑے" آپؓ نے فرمایا: ہاں اسی طرح کا چاہئے:

حسنؓ سے روایت ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس اُن کے اس مرض میں آئے جس میں آپؓ کی وفات ہوئی ہے اور عرض کیا کہ: "اے خلیفہ رسول اللہ! حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: "اللہ پاک تم لوگوں پر دنیا فتح کرنے والا ہے لہذا تم میں سے کوئی ہرگز گذر اوقات سے زیادہ نہ لے"۔

جہاں اقبال نے اپنے کلام میں ایمان و یقین کے حکمتوں کو پیش کرنے کیلئے صحابہ کرامؓ کے نام گرامی سے شخصیتوں سے منسوب اصطلاحیں وضع کیں اُن میں حضرت سلمان فارسیؓ سے بھی انہوں نے اصطلاحیں اور "سلمانی" وضع کیں جنہیں انہوں نے آپ کے ایمان کی پختگی اور روحِ محمدی ﷺ کے معنوں میں استعمال کیا ہے:

"سلمان" کی اصطلاح سے کلام میں کُل درجِ ذیل اشعار ہیں۔

نظر تھی صورتِ سلمانؓ ادا شناس تری　　شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
(بانگ درا۔ بلالؓ۔ بعد از نظم "چاند")

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا؟　　بُت گری پیشہ کیا؟ بُت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا؟　　رسمِ سلمانؓ و اویسِ قرنی کو چھوڑا
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں　　زندگی مثلِ بلالِ حبشیؓ رکھتے ہیں
(بانگ درا شکوا اکیسواں بند)

اقبال نے پہلے شعر میں حضرت بلالؓ کو صورتِ سلمانؓ سے مماثلت دے کر دونوں کو آنحضرت کا سچا عاشؓ مراد لیا ہے اور دوسرے شعر میں مرادعشق رسولؐ میں گرویدگی اور اُس عشق کی آشفتہ سری لیا ہے حضرت سلمانؓ کے متعا مشہور ہے کہ کسی نے آپؓ سے پوچھا کہ: "آپؓ کا نسب کیا ہے؟" تو آپؓ نے جواب میں فرمایا "سلمان ابن اسلام"

دوسری اصطلاح "سلمانی" ہے اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں درج ذیل چار اشعار ہیں۔

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے　　وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
(بانگ درا طلوعِ اسلام۔ چوتھا بند)

یہ فقر مسلماں نے کھودیا جب سے　　رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی
(ضرب کلیم۔ فقر و راہبی)

اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن　　بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی
(ضرب کلیم: محراب گل افغان کے افکار" بیسواں بند)

چوتھا شعر مضمون کے شروع میں آچکا ہے متذکرہ بالا اشعار کے پہلے شعر میں صدق سلمانی سے مراد عشق رسول ﷺ میں گرویدگی اور نصب العین کا حصول ہے دوسرے شعر میں "دولتِ سلمانی کے ساتھ "فاروقی کی اصطلاح لاکر یہ نکتہ ذہن نشیں کرلیا گیا ہے کہ خودی کی تربیت شہروں اور آبادیوں میں نہیں بلکہ بیابانوں میں ہوتی ہے۔

انہی شانِ بے نیازی اور توکل الی اللہ پر اقبال "بالِ جبریل کی غزل ۱۵ اول میں خدا کا شکر ا کرتے ہوئے خدا کے حضور عرض پرداز ہیں:۔

تری بندہ پروری سے مرے دن گذر رہے ہیں　　نہ گلہ ہے دوستوں سے نہ شکایتِ زمانہ

یہ تھیں "استغنائے سلمانی کی چند مثالیں جن کا سرچشمہ اتباع اور عشق رسول ﷺ تھا آپ نے ذاتی طو پر آپؐ کو دیکھا، آپ ﷺ کی صحبت میں رہے اور آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی، اپنے اعمال، اقوال اور کردا میں پیروی کرکے اپنے ایمان کو پختہ کیا اور اپنے کو سورۃ الاحزاب ۳۳ کی درج ذیل آیت ۲۱ کا مصداق بنایا۔

"درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول ﷺ میں ایک بہترین نمونہ (اُسوۂ حسنہؐ) تھا ہر اُس شخص کے لئے جو اللہ اور یومِ آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔

قادیانیت کا تعاقب کیسے کریں؟

تحفظ ختم نبوت کانفرنس (محمدی لکھیم پور) میں حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری
استاذ حدیث دار العلوم دیوبند کا خصوصی خطاب

مرتب: مولانا محمد یامین قاسمی مبلغ دار العلوم دیوبند

بعد از خطبہ مسنونہ!

وجاهدوا فی الله حق جهاده هواجتبٰکم (الآیہ)

حضرات علماء کرام، اکابرین ملت اور عزیز طلبہ! اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے بطور تمہید تین باتیں عرض کرنا ضروری ہیں:

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کسی بھی فتنہ کی مثال چنگاری جیسی ہے، دنیا میں جب بھی کوئی فتنہ جنم لیتا ہے تو وہ معمولی حیثیت سے شروع ہوتا ہے اور پھر تدریجاً ترقی کر کے بہت بڑا ہو جاتا ہے اسی لئے حدیث پاک میں ہدایت کی گئی ہے کہ رات کو سوتے وقت چراغ گل کر دیا کرو ایسا نہ ہو کہ "فاسق" (چوہا) بدکردار چراغ کی بتی سے پورے گھر کو خاکستر کر دے، کیونکہ چھوٹی سی چنگاری بھی گھر بھر کو جلانے کے لئے کافی ہے اسی طرح فتنہ کی چھوٹی سی چنگاری بھی اگر اس کو ختم نہ کیا جائے تو پوری ملت کے شیرازہ کو برباد کر سکتی ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ آپ حضرات کم و بیش اس تاریخی حقیقت سے واقف ہونگے کہ قادیانیت "کو پاکستان سے دیش نکالا ملا ہے اور اسی وقت (۱۹۸۴) سے قادیانیوں کا چوتھا سربراہ مرزا طاہر پاکستان سے فرار ہو کر اپنے قدیم اور باوفا سرپرست کے زیر سایہ لندن میں مقیم ہے، وہاں ان کا کھربوں روپیوں کی دولت سے بنایا ہوا ہیڈ کوارٹر ہے اور کروڑوں پاؤنڈ کی لاگت سے قادیانیوں نے برطانیہ میں سیٹ لائٹ، ٹی وی اسٹیشن خرید کر ڈش انٹینا کے ذریعہ تمام دنیا میں اپنے تبلیغی مشن کا جال پھیلا رکھا ہے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود لندن مرکز بنانے کی جگہ نہیں ہے۔

قادیانیوں کا اصل مذہبی مرکز تو "قادیان" ہے چونکہ قادیانی مذہب کا بانی مرزا غلام احمد قادیانی یہیں

پیدا ہوا ہے، قادیان ہی میں "بہشتی مقبرہ" اور منارۃ المسیح بھی بنایا گیا ہے اگر تقسیم ہند کے وقت پنجاب کے حالات کشیدہ اور خراب نہ ہوتے اور وہاں کی فضا ان کے لئے ہموار ہوتی تو وہ ہر گز قادیان چھوڑ کر پاکستان نہ جاتے مگر حالات کی کشیدگی، فضا کی ناہمواری سے انہیں یہاں سے کوچ کرنا پڑا، پاکستان پہونچ کر قادیانیوں نے چاہا کہ اب وہ اسی ملک میں اپنا مرکز قائم کریں، چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر حکومتی ذرائع اور سرکاری رسوخ و وسائل کو کام میں لاکر "ربوہ(۱)" میں اپنی مذہبی جولانگاہ بنائی، وہاں بھی "جنتی مقبرہ" بنایا اور اپنے خود ساختہ قوانین جاری کیے، لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ کسی دن یہاں سے بھی ان کو بوریا بستر باندھنا پڑے گا اور انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے گا، مگر پاسبان ختم نبوت کی مسلسل جدوجہد اور عظیم قربانیوں کے نتیجے میں وہ روز سعید بھی آیا کہ قادیانیوں کے لئے پاکستان کی زمین تنگ ہو گئی، مسلمانوں کی فہرست سے ان کا نام نکال دیا گیا اب پھر انہوں نے اپنے اصل قدیم مرکز قادیان کی طرف توجہ منعطف کی، اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے ہندوستان کی حکومت اور یہاں کے باشندوں کی سرپرستی و ہمدردی حاصل کی چنانچہ ۱۹۹۱ء میں جب مرزا طاہر پہلی مرتبہ لندن سے ہندوستان آیا تو حکومتی سطح پر اس کا استقبال کیا گیا اور ایک سربراہ حکومت کی طرح اس کا اعزاز و اکرام کیا گیا، اس وقت سے قادیانیوں کی تمام تر توجہات ہندوستان پر مرکوز ہیں، ملک کے مختلف علاقوں میں ان کی تبلیغی سرگرمیاں جاری ہیں وہ کسی بھی طرح یہاں کی فضا کو اپنے حق میں استوار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے مبلغین و معلمین سادہ لوح مسلمانوں کو بہکانے میں سرگرم ہیں۔ غرض کہ پاکستان کے دیش نکالے کے بعد اب وہ ہندوستان کو اپنا اصل مرکز بنانے کے لئے ہر وقت کوشاں ہیں۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ قادیانیوں کی ریشہ دوانیوں اور اس فتنہ کے سد باب کے لئے ہمیں کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے۔ تاکہ کام کی لائن متعین کر کے قدم آگے بڑھایا جائے۔

عام مسلمانوں بلکہ عام علماء کو بھی اس قسم کے فتنوں کا پتہ اس وقت چل پاتا ہے جب معاملہ بے قابو ہو جاتا ہے البتہ کچھ دینی بصیرت کے حامل، ایمانی فراست رکھنے والے، اللہ کے نیک بندے حالات کا رخ پہچان لیتے ہیں اور اٹھنے والے فتنوں کا اندازہ کر کے اس کے قلع قمع اور تعاقب کی تدبیریں کرتے ہیں، علماء کرام جو وارثین نبوت ہیں ان کی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی جدوجہد شروع کر دیں اور قادیانی فتنہ کو

"(۱) ربوہ" چنیوٹ سے سرگودھا جاتے ہوئے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر دریائے چناب پار کر کے ہے، ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے وقت جو مرزائی ہندوستان سے پاکستان گئے توانہوں نے اس جگہ کو حکومت سے حاصل کیا جس کا کل رقبہ ۱۰۳۴ ایکڑ ہے اور ۱۰۳۴۰ اس کے معاوضہ کے ادا کیے گئے۔ "ربوہ" کے ایک جانب پہاڑ واقع ہے جس پہاڑ کے دامن میں بہت بڑی چہار دیواری ہے اسی کے اندر قادیانیوں کا نام نہاد جنتی مقبرہ بھی ہے۔

روکنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں اگر ہمارے علماء نے اس طرف توجہ نہ کی تو تقسیم ہند سے پہلے کے حالات پیدا ہو جانے کا شدید خطرہ ہے۔

صورت حال سے عدم واقفیت کی بنا پر بہت سے شکوک و شبہات ذہنوں میں ابھرتے ہیں انہی کو سامنے رکھ کر یہ ابتدائی معروضات میں نے پیش کی ہیں تاکہ ان سب کا ازالہ ہو جائے اور یہ سمجھ میں آجائے کہ دار العلوم دیوبند نے تحفظ ختم نبوت کی تحریک کیوں شروع کی ہے اور اس فتنہ کے تعاقب میں وہ اس قدر حساس اور فکر مند کیوں ہے؟

حکمت عملی:

فتنہ قادیانیت کی فتنہ سامانیوں کو روکنے اور مسلمانوں کو اس سنگین فتنہ سے محفوظ رکھنے کے لئے کیا صورت اختیار کی جائے؟ اس وقت میرے ذہن میں دو صورتیں ہیں:

(۱) پہلی صورت تو یہ ہے کہ عام مسلمانوں کو اس فتنہ کی خطرناکی سے باخبر کیا جائے اور مسلم رائے عامہ کو اس طرح بیدار کر دیا جائے کہ کسی بھی جگہ قادیانیوں کو فتنہ پھیلانے کا موقع ہی نہ مل سکے۔

رائے عامہ کو بیدار کرنا بڑی معقولیت کی بات ہے اور یہ طریقہ پوری دنیا میں رائج ہے جس ملک کے عوام اپنی حکومت سے کوئی بات منوانا چاہتے ہیں تو وہ بڑے بڑے جلسے اور جلوس کا اہتمام کر کے اپنے مطالبات پیش کرتے ہیں۔ اگر قادیانیت کے خلاف ہر طرف رائے عامہ بیدار و ہموار ہو جائے تو کسی بھی فتنہ پرور کو کہیں بھی گھسنے کا موقع نہ مل سکے گا۔ عوام کو آنے والے فتنہ سے آگاہ کرنا خواص کی ذمہ داری ہے، گورنمنٹ میں بھی ایک مستقل شعبہ اسی کام پر مامور ہوتا ہے کہ وہ آنے والے خطرات پر نظر رکھے اور کسی بھی ناگہانی آفت سے آگاہی دیتا رہے، دشمن کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لئے سائنسی جدید آلات ایسے ایجاد ہو گئے ہیں جن سے ہر ملک فائدہ اٹھا رہا ہے اسی طرح جب دین و ایمان کے خلاف کوئی فتنہ سر ابھارے تو علماء وقت کا دینی فریضہ ہے کہ وہ عام مسلمانوں کو اس فتنہ سے باخبر کریں تاکہ وہ محتاط ہو جائیں اور اس کی زد سے بچنے کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کریں۔

(۲) فتنۂ قادیانیت کے سدباب اور اس کی بیخ کنی کے لئے دوسری صورت یہ ہے کہ نہایت خاموشی کے ساتھ تمام کام کیا جائے اور ہر علاقہ کے ذمہ دار حضرات پورے علاقہ پر نظر رکھیں اور اولاً اس بات کا پتہ چلائیں کہ یہ فتنہ کس چور دروازے سے داخل ہو رہا ہے۔

مذکورہ دونوں صورتوں میں سے کس کو اختیار کیا جائے ان میں سے کون سی حکمت عملی زیادہ مفید و کار آمد ہے تو میرے خیال میں ان دونوں میں کوئی تضاد اور ٹکراؤ نہیں، دونوں ہی کام کرنے کے لائق

ہیں، ایک طبقہ مسلم رائے عامہ بیدار کرنے کی ذمہ داری کو پورا کرے اور دوسرا طبقہ خاموش تعاقب والی حکمت عملی کو اپنا کر اپنے دینی فریضہ کو انجام دیے۔

خاموش کام کرنے والے ذمہ داران امت (علماء کرام) کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی پورے علاقہ پر گہری نظر رہنی چاہئے اور جہاں کہیں بھی ان کو اس فتنہ کی بو محسوس ہو وہ وہاں دو کام ضرور کریں۔

(الف) فتنہ پرور کا پامردی اور پورے عزم وہمت کے ساتھ تعاقب کیا جائے اور جب تک فتنہ اپنے کیفر کردار تک نہ پہونچ جائے اپنی جدوجہد کو جاری رکھا جائے، فتنہ قادیانیت نہایت خطرناک اور چالاک فتنہ ہے، قاطع مرزائیت مولانا محمد اسماعیل کٹکی مدظلہ رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند فرمایا کرتے ہیں کہ اس فتنہ کی مثال کچھوے کی سی ہے کچھوہ آگے بڑھنے سے پہلے چاروں طرف دیکھتا ہے جب وہ محسوس کرلیتا ہے کہ کوئی آس پاس نہیں تو اپنا منھ اور پاؤں نکال کر چلنے لگتا ہے لیکن جیسے ہی اسے کوئی آہٹ یا خطرہ محسوس ہوتا ہے تو پھر منھ اندر کرلیتا ہے اور پاؤں سمیٹ لیتا ہے بالکل یہی حال قادیانیوں کا ہے کہ وہ پہلے پورے ماحول کا جائزہ لیتے ہیں اور جب انہیں اطمیان ہو جاتا ہے کہ میدان خالی ہے حالات سازگار ہیں، یہاں کوئی تم سے مزاحمت کرنے والا نہیں تو بڑی چالاکی کے ساتھ اپنا کام شروع کردیتے ہیں لیکن جب انہیں اندازہ ہوتا ہے کہ تمہاری سرکوبی کے لئے کوئی موجود ہے اور ساری فتنہ پردازیوں پر نظر رکھی جارہی ہے تو ان کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں۔

(ب) خاموش کام کرنے والوں کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اولاً ان اسباب وعلل کو معلوم کریں کہ جن کی وجہ سے اس فتنہ کو اپنے بال و پر کھولنے کا موقع ملتا ہے تاکہ سب سے پہلے ان اسباب کا علاج کیا جاسکے ہندوستان کے جن علاقوں میں قادیانی مبلغین سرگرم ہیں وہاں کے اسباب وحالات کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس کے دو بڑے سبب ہیں۔

فتنوں کے پھیلنے کے وجوہ واسباب

(۱) جہالت جو لوگ دین کی بنیادی ضروری تعلیمات اور اسلام کے اساسی عقائد سے ناواقف ہوتے ہیں وہ لوگ قادیانیوں کے دام فریب میں آسانی سے پھنس جاتے ہیں "فتنۂ قادیانیت" دام ہر رنگ زمین" ہے یہ لوگ قرآن وحدیث کا حوالہ دیتے ہیں صحابہؓ وتابعینؒ کی زندگی پیش کرتے ہیں اور اسلامی اصطلاحات کا سہارا لیتے ہیں اور خود کو مسلمان ظاہر کرکے اُن سیدھے سادے مسلمانوں کو اپنے دام تزویر میں گرفتار کرتے ہیں لہذا سب سے پہلے جہالت کو دور کرنے کی ضرورت ہے مسلمانوں کو دینی عقائد اور اسلامی تعلیمات سے آشنا کرایا جائے اس کے لئے جگہ جگہ دینی مکاتب قائم کئے جائیں

اور عقائد و اعمال کی اصلاح و درستگی کی طرف خصوصی توجہ کی جائے نیز اسلام کے خلاف اٹھنے والی تحریکات سے ان کو باخبر کیا جائے اگر ہم نے یہ کام کرلیا تو انشاء اللہ کسی بھی فتنہ کو پیر جمانے کا موقع نہ مل سکے گا اور وہ اپنی موت آپ مرجائے گا۔

ٹورنٹو ہوائی اڈہ کا ایک واقعہ:

قادیانیوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج ان کا مذہبی لٹریچر مختلف زبانوں میں چھپ کر تقسیم ہو رہا ہے ایک مرتبہ دوران سفر مجھے ٹورنٹو ہوائی اڈہ پر نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا جس ہال میں میں نے نماز ادا کی وہاں تمام مذاہب کا لٹریچر رکھا ہوا تھا لیکن دین اسلام کی کوئی کتاب وہاں موجود نہیں تھی میں نے وہاں کے ایک ذمہ دار سے ملاقات کی اور اس سے کہا کہ یہاں تمام مذاہب کی کتابیں رکھی ہوئی ہیں مگر دین اسلام کی کوئی کتاب نہیں ہے تو اس نے قادیانیوں کی کتابوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ یہ دیکھئے آپ کے مذہب کا لٹریچر بھی یہاں موجود ہے یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا وہ ذمہ دار مذہباً عیسائی تھا اس کو تو میں کوئی جواب نہ دے سکا لیکن آپ سوچئے کہ قادیانی خود کو مسلمان باور کرانے کے لئے کس قدر کوشاں ہیں اس لئے اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ ناواقف مسلمانوں کو قادیانیوں کی حقیقت و اصلیت سے باخبر کیا جائے۔

(۲) غربت و افلاس۔ دوسری وجہ مسلمانوں کی ناداری و مفلسی اور معاشی بدحالی ہے قادیانی مبلغین ان مسلمانوں کو جو اقتصادی اعتبار سے کمزور ہیں نشانہ بناتے ہیں اگر وہاں مسجد نہیں تو مسجد کی تعمیر کرادیتے ہیں مدرسہ قائم کرتے ہیں غریبوں کا مالی تعاون کرتے ہیں طلبہ کو تعلیمی وظائف دیتے ہیں قادیانیوں کے پاس دولت کی فراوانی ہے ایک فنڈ تو ان کے پاس وہ ہے جو عیسائیوں اور دوسری اسلام دشمن تنظیموں سے انہیں پہونچتا ہے دوسرا فنڈ وہ ہے کہ ہر ایک قادیانی اپنی آمد کا ۲۵ فی صد اپنے مشن کو دیتا ہے آمدنی کے دیگر ذرائع بھی نہایت مضبوط و فراواں ہیں اس لئے ذمہ داران امت اس طرف بھی توجہ کریں کہ مسلمانوں کی معیشت مضبوط و اطمینان بخش ہو جائے فتنوں کو راہ ملنے میں غربت و افلاس کا بڑا دخل ہے مشہور ہے "کاد الفقر ان یکون کفراً" محتاجی کفر تک پہونچادیتی ہے قوم کی ناداری و مفلسی کا مسئلہ کوئی لاینحل اور مشکل مسئلہ نہیں ہے ہمارے سامنے حضور پاک ﷺ کی مبارک زندگی ہے۔ جزیرۃ العرب میں بھی یہ مسئلہ نہایت اہم تھا وہاں بھی غربت و افلاس سے لوگ پریشان تھے مگر آپ ﷺ نے اس پر خصوصی توجہ فرمائی۔ اسلامی خزانہ چاہے تو حرب و دفاع کے شعبہ پر خرچ ہوتا یا پھر عام مسلمانوں کے درمیان تقسیم کردیا جاتا تھا اگر اسلامی بیت المال خالی ہو جاتا تو بھی آپؐ ضرورت مندوں کا پورا خیال فرماتے ازواج مطہرات کو جو نان و نفقہ سال بھر کیلئے دیا جاتا تھا وہ ایک ہی ماہ میں خرچ ہو جاتا تھا اور پھر آپؐ کے گھر میں دو

دو ماہ چولہانہ جلتا تھا ایک مرتبہ ایک قبیلہ کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جسکی حالت بڑی خستہ تھی آپؐ نے اعلان کرادیا "الصلوة جامعة" جمعہ کے علاوہ جب کبھی تمام مسلمانوں کو جمع کرنا مقصود ہوتا تھا تو آپؐ یہ اعلان کرادیتے اس اعلان کو سنکر تمام مسلمان جمع ہوگئے آپؐ نے حضرات صحابہ کرام سے اس قبیلہ کیلئے تعاون کی اپیل کی بہر حال جب اسلامی بیت المال خالی ہوجاتا تھا تو عام مسلمان دوسرے خستہ حال مسلمانوں کی مدد فرماتے تھے سیرت کے ان واقعات سے معلوم ہوا کہ غربت و افلاس کو دور کرنے کیلئے اجتماعی منظم کوشش ہونی چاہئے۔

آج ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت نہیں لیکن اس کے باوجود بڑے بڑے جامعات دینی ادارے اور اسلامی مراکز عام مسلمانوں کے تعاون سے چل رہے ہیں۔ جب ہم لاکھوں کے بجٹ سے مدرسے چلا سکتے ہیں تو کیا ہم یہ فنڈ جمع نہیں کرسکتے ہمیں اس کے بارے میں غور و فکر کرنی چاہئے تاکہ جہالت و پسماندگی کو دور کرکے ہم اس فتنے سے مسلمانوں کو بچاسکیں۔

پہلے کیا کریں؟

خاموشی کے ساتھ کام کرنے والوں کے لئے سطور بالا میں دو رایوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ دونوں رائیں اکابر سے معلوم ہیں اگر فتنہ قادیانیت کے سدباب کیلئے دونوں ہی کام کئے جائیں تو بہترین نتائج برآمد ہونگے لیکن ترتیب عملی کے اعتبار سے اگر پہلے رائے عامہ کو بیدار کیا جائے اور پھر خاموش تعاقب کیلئے جہالت اور غربت دور کرنے کے اسباب کو اختیار کیا جائے تو کام کی یہ ترتیب زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔

دار العلوم دیوبند اور آپ کی ذمہ داریاں۔

اس وقت علاقہ کے علماء اور ذمہ دار حضرات کی موجودگی میں یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ تمام علماء تو اسی ایک کام کیلئے خود کو وقف نہیں کرسکتے کیونکہ اگر ایسا کریں گے تو دین کے دوسرے کام متاثر ہونگے اس لئے نظام کار اور تقسیم کار ہونا ضروری ہے۔ اس کی جو صورت میرے ذہن میں ہے وہ یہ ہے کہ آپ اپنے علاقہ کے کچھ علماء کو اس کام کیلئے خاص کریں وہ کم از کم تین ماہ کے لئے دار العلوم تشریف لائیں ہم وہاں ان کی میزبانی کریں گے اور دار العلوم ان علماء کے قیام و طعام اور مطالعہ کے لئے علمی مواد کا انتظام کرے گا باقی علماء کے لئے آپ اپنے یہاں سہ روزہ تربیتی کیمپ کا نظم بنائیں ان علماء کو موضوع کے بارے میں معلومات فراہم کرانے اور فتنہ قادیانیت کے نشیب و فراز سے واقف کرانے کے لئے دار العلوم دیوبند سے ذمہ دار حضرات آپ کی خدمت میں حاضر ہونگے۔

وارثین نبوت کی ذمہ داریاں:

میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں جو آیت قرآنی تلاوت کی تھی اس آیت میں ہم سے یہی مطالبہ کیا گیا ہے کہ اللہ کے دین کے لئے جان توڑ محنت کرو جہاد اور مجاہد کا لفظ اسی مقصد کی تحصیل میں اپنی پوری طاقت خرچ کرنے اور اس کے لئے مشقت کرنے کے معنی میں آتا ہے جہاد کا اعلیٰ درجہ کفار کے ساتھ قتال کرنا ہے حق جہاد کا مطلب پورے اخلاص کے ساتھ دنیوی نام ونمود سے بے نیاز ہو کر تقاضۂ دین کے مطابق جدوجہد کرنا ہے اللہ کا راستہ جتنی محنت چاہتا ہے اتنی محنت کرو یہ نہ سوچو کہ ہم ناتواں اتنا بڑا کام کیسے کر سکتے ہیں اسی کے لئے فرمایا گیا ''وما جعل علیکم فی الدین من حرج'' یعنی اللہ نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی دین میں ایسی تنگی نہیں جس کو انسان برداشت نہ کر سکے اس دین کے احکام میں کوئی حکم ایسا نہیں جو فی نفسہ ناقابل برداشت ہو تھوڑی بہت محنت ومشقت تو دنیا کے ہر کام میں ہوتی ہے آگے فرمایا گیا کہ تمہارا نام مسلم ہے نزول قرآن سے پہلے بھی اور قرآن میں بھی تم کو مسلم کہا گیا حضرت آدمؑ سے لے کر آپ تک پورا دین اسلام ہے لیکن اس امت سے پہلے کسی امت کو اس نام سے نہیں پکارا گیا کسی کو یہودی کسی کو نصرانی کہا گیا مسلم کے مخصوص نام سے صرف اسی امت کو سرفراز کیا گیا اسلام کے معنی ہیں سرافگندن جیسے بیل جوا دیکھتے ہی اپنا سر جھکا دیتا ہے تو مسلم کے معنی ہوئے کہ جیسے ہی حکم خداوندی آئے اپنا سر تسلیم خم کردو اپنے نام کی لاج رکھو آگے آیت میں بڑا گہرا اور لمبا مضمون ذکر کیا گیا ہے جس کے بیان کا اب موقع نہیں۔

اس آیت کی روشنی میں علماء کرام جو انبیاء کے سچے جانشین اور وارث ہیں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور انہیں پورا کریں اگر کوئی وارث اپنے مورث کے ترکہ کو برباد کرتا ہے تو وہ پوت نہیں کپوت ہے لہذا تمہیں نیابتِ نبوت کا جو کام سونپا گیا ہے اللہ پر اعتماد کر کے اس کی ادائیگی کی فکر کرو سب سے پہلے خود کو تیار کرو اور نماز جو بنیادی چیز ہے اسے قائم کرو جب تم دین کی محنت کے لئے اٹھو گے تو اللہ پاک تمہاری نصرت وحمایت کرے گا جہاد فی دین اللہ میں دین کی ہر محنت داخل ہے فتنہ قادیانیت کا تعاقب بھی اسی جہاد کی ایک قسم ہے اس لئے کام کی لائن طریقہ عمل متعین کر کے آگے بڑھو۔

یار زندہ صحبت باقی

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(**نوٹ**) حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری دامت برکاتہم نے یہ تقریر ۱۴ر جون ۱۹۹۸ء کو دارالعلوم محمدی ضلع لکھیم پور کھیری کے ایک نمائندہ اجتماع میں فرمائی تھی حاضرین میں لکھیم پور سیتاپور ہردوئی اور شاہجہاں پور ضلع کے علماء مدارس کے طلباء اور علاقہ کے ذمہ دار حضرات تھے۔

اللہ تعالیٰ شانہ نے سورۃ الاحزاب میں فرمایا ہے:

ماکان محمدٌ ابا احد من رجالکم ولٰکن رسول الله وخاتم النبین و کان الله بکل شئ علیماً

"تمہارے مردوں میں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی کے باپ نہیں ہیں اور لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کی مہر ہیں اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔"

آیات بالا میں یہ فرمایا کہ تم میں جو رجال ہیں یعنی بالغ مرد ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کسی کے نسبی باپ نہیں ہیں ہاں آپ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اور خاتم النبیین ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ پر نبوت ختم فرمادی آپ پر نبوت ختم کردی گئی تو رسالت بھی ختم کردی گئی کیونکہ ہر رسول نبی بھی تھا، رسول کا اطلاق صاحب شریعت جدیدہ کے لئے تھا اور نبی کا اطلاق ہر پیغمبر پر ہوتا تھا، صاحب شریعت جدیدہ ہو یا نہ ہو، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین فرمانے سے آپ کے خاتم الرسل ہونے کا بھی اعلان ہو گیا۔

آپ سے پہلے جو انبیاءؑ اور رسلؑ تشریف لاتے تھے وہ خاص قوم کے لئے اور محدود وقت کے لئے تشریف لایا کرتے تھے۔ خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک تمام جنات اور تمام انسانوں اور تمام قوموں اور قبیلوں اور تمام زمانوں اور تمام مکانوں کے بسنے والوں کے لئے رسول ہیں۔ سورۂ سبا میں فرمایا۔

"وَ ماار سلناك الا کافةً للنّاس بشیراً وّنذیراً ولکنّ اکثر النّاس لایعلمون،،

،،اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کیلئے بشیر اور نذیر بنا کر لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے،،

آپ کے بعد جو بھی کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے گمراہ ہے کافر ہے اور اس کی تصدیق کرنے والا بھی گمراہ ہے کافر ہے اور آیت قرآنیہ کا منکر ہے جس میں صاف اس بات کا اعلان فرمادیا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، احادیث شریفہ صحیح اسانید کے ساتھ بہت زیادہ کثیر تعداد میں کتب حدیث میں مروی ہیں جن میں واضح طور پر بتایا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت اور رسالت ختم ہے ان احادیث کو بعض اکابر نے اپنے رسائل میں جمع بھی فرمادیا ہے قرآن وحدیث کی تصریحات کے باوجود بعض لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا خود بھی کافر ہوئے اور اپنے ماننے والوں کو بھی کفر پر ڈالا۔

یاد رہے کہ خاتم النبیین حضرت امام عاصم کوفی کی قراءت میں بفتح التاء ہے اور انکے علاوہ دیگر قراء کی قراءت بکسر التاء یعنی خاتِم النبیین ہے خاتَم (تا کے زبر کے ساتھ) مہر کے معنی میں آتا ہے۔ اور خاتِم (ت کے زیر کے ساتھ) صیغہ اسم فاعل ہے جس کے معنی ختم کرنے والا، دونوں قراء توں کا مآل ایک ہی ہے یعنی آخر الانبیاء سیدنا محمد ﷺ خاتم النبیین بھی ہے یعنی آپ ﷺ کی تشریف آوری سے سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا اور آپ ﷺ خاتم النبیین ہی ہیں یعنی ﷺ آپ کی ذات گرامی کو نبیوں کے لئے مہر بنادیا گیا جیسے مہر آخر میں لگائی جاتی ہے اسی طرح آپ ﷺ کو سلسلہ نبوت کا مہر بنادیا گیا۔ اب آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔

یہ دوسری قراءت جو (ت) کے زیر کے ساتھ ہے قراءت متواترہ ہے اس کا انکار بھی کفر ہے ہم نے خصوصیت کے ساتھ یہ قراءت اس لئے ذکر کی ہے کہ بعض ملحدوں نے خاتم النبیین (بفتح التاء) کا ترجمہ افضل النبیین کر کے آنحضرت ﷺ کے خاتم الانبیاء ہونے کا انکار کیا ہے۔ گذشتہ صدی میں نصاریٰ کے کہنے سے پنجاب کے ایک آدمی غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعوی کر دیا تھا نصاریٰ کو اس سے اپنا مقصد نکالنا مقصود تھا انہوں نے اس جھوٹے نبی سے جہاد شرعی منسوخ کرنے کا اعلان کرایا اور اسے اور اس کے ماننے والوں کو دنیاوی لالچ دیکر اپنا لیا دنیا کے طالب اس شخص کی جھوٹی نبوت کا اقرار کرتے چلے گئے اور جب ان کے سامنے آیت قرآنیہ ولکن رسول الله وخاتم النبیین پیش کی گئی تو طرح طرح کی تاویلیں کر کے اس کو رد کر دیا اور آیات کے معانی اور مفاہیم اپنی طرف سے تجویز کر دئے اور نبوت کی قسمیں بنالیں حقیقی اور ظلی اور بروزی کی تقسیم جاری کر دی، تاوقت تحریر ان لوگوں کی جماعت موجود ہے جو یہود و نصاریٰ کی سرپرستی میں پرورش پاتی ہے اور اسلام اور قرآن اور مسلمان کی دشمنی میں برابر لگی ہے۔

یہ ایک موٹی سی بات ہے کہ جو شخص قرآن کی کسی آیت کا منکر ہو وہ نبی تو کیا ہوگا ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی نہیں وہ تو ملحد اور زندیق اور کافر ہے تمام مسلمان ملحدوں اور زندیقوں سے چوکنا رہیں یہ لوگ ایمان کے ڈاکو ہوتے ہیں۔

احادیث شریفہ میں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قیامت سے پہلے تشریف لانے کی خبر دی گئی ہے اس بات کو سامنے رکھ کر قادیانی کہتے ہیں اگر محمد ﷺ پر نبوت ختم ہو گئی ہے تو وہ کیسے آئیں گے؟ سادہ لوح مسلمانوں کو یہ بات بتا کر یہ لوگ دھوکہ دیتے ہیں بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب تشریف لائیں گے تو نئی نبوت لے کر نہیں آئیں گے وہ محمد ﷺ کی شریعت کے تابع ہوں گے اور اسی پر عمل کریں گے اور امت محمدیہ سے بھی شریعت محمدیہ پر عمل کرائیں گے وہ رسول ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے ہی نبی تھے۔ جنہیں آسمان پر اٹھالیا گیا تھا دنیا میں آکر دجال کو قتل کر کے شادی کر کے مسلمانون کے ساتھ رہ کر وفات پا جائیں گے اس سے محمد ﷺ کے خاتم النبیین ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا شریعت محمدیہ میں جزیہ لینا شروع ہے وہ اسے منسوخ کر دیں گے اس منسوخ کرنے کی خبر رسول اللہ ﷺ نے پیشگی دیدی ہے لہذا یہ بھی آپ ﷺ ہی کا منسوخ کرنا ہوا۔

حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے نزول عیسیٰ بن مریم فی آخرالزماں کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا ہے اس میں "معجم کبیر للطبرانی" اور "کتاب البعث والنشور للبیہقی" سے حدیث نقل کی ہے اور اس کی سند جید بتائی ہے جس میں اس بات کی تصریح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول ﷺ کی ملت پر ہوں گے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

" عن عبد الله بن مغفل رضی الله عنه : قال قال رسول الله ﷺ يلبث الدجال ماشاء الله ، ثم ينزل عيسى بن مريم مصدقا بمحمد و على ملته اماما مهديا و حكما عدلا ، فيقتل الدجال "

" صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

والذی نفسی بیده لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکماً عدلاً الحدیث.

(باب نزول عیسیٰ علیہ السلام ص ۴۹۰)

لفظ حکما کی تشریح کرتے ہوئے ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری ج۶ ص ۴۹۱ میں لکھتے ہیں:

" و المعنى انه ينزل حاكماً بهذه الشريعة فا ن هذه الشريعة باقية لا تنسيخ بل يكون عيسى عليه لاسلام حاكماً ، و فى رواية الليث عن ابن شهاب عند مسلم حكما مقسطا، و لمطبرانى من حديث عبد الله بن مغفل ينزل عيسى ابن مريم مصدقاً بمحمد على ملته "

مام نوری رحمہ اللہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

" أى ينزل حاكماً بهذه الشريعة لا ينزل نبيا بر سالة مستقلة و شريعة نا سخة ، بل لو حاكم من حكام هذه الامة " (صحيح مسلم ص ۸۷ ج ۱)

اس عبارت کا مطلب وہی ہے جو ابھی اوپر عرض کر چکے ہیں کہ جب سیدنا حضرت عیسیٰؑ نازل ہوں گے ریعت اسلامیہ محمدیہ ﷺ کے مطابق ہی فیصلے دیں گے مستقل نبی نہ ہوں گے اور نہ مستقل شریعت لے کر آئیں گے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کو منسوخ کر دیں بلکہ وہ اسی امت کے حکام میں سے ایک حاکم ہوں گے۔

قادیانی جماعت آیت کریمہ کی تصریح کا انکار کرنیکی وجہ سے کافر ہے اور اس وجہ سے بھی کافر ہے کہ ہوں نے خاتم النبیین کے معنیٰ میں تحریف کی ہے اور اس کا معنیٰ افضل النبیین بتایا ہے۔ ان کو معلوم نہیں قراءت متواترہ میں ایک قراءت تا کے زیر کے ساتھ بھی ہے ان کا انکار کرنا بھی کفر ہے۔

قادیانیوں نے ختم نبوت کا انکار کرنے کے لئے ایک یہ بات نکالی ہے کہ حدیثوں میں حضرت مسیح یہ السلام کے تشریف لانے کی خبر ہے اور ہم جسے نبی مانتے ہیں یہ وہی مسیح ہے، ان لوگوں کی تردید کے ئے یہی کافی ہے کہ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جگہ جگہ مسیح ابن مریم فرمایا ہے دنیا جانتی ، اور قادیانیوں کو بھی اس کا علم ہے کہ مرزا قادیانی کی ماں کا نام مریم نہیں تھا، جن کو قرآن وحدیث ماننا

نہیں ہوتا وہ اپنی تاویلات و تحریفات کے پیچھے چل کر گمراہ ہوتے ہیں۔
مرزا قادیانی اگر سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کا پابند ہوتا تو جہاد کو کیوں منسوخ کرتا۔

در حقیقت مرزا قادیانی کا حکومت برطانیہ اور تمام نصرانی اور یہودی حکومتوں کے نزدیک یہی توسب سے بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے جہاد کے منسوخ ہونے کا اعلان کردیا اس کے اسی اعلان کی وجہ سے تو نصرانی اور یہودی حکومتیں اس کی جماعت کو گلے لگائے ہوئے ہیں اور جہاں قادیانی دفتر قائم کرنا چاہیں ان کے دفاتر قائم کراتی ہیں اور ان کی پشت پناہی اور پرورش کرتی ہیں، ہر سوجھ بوجھ والا انسان اس بات پر غور کرے کہ کافر حکومتوں کو ان کی پرورش کرنے کی کیا ضرورت ہے "فَهَل من مدکر"

جب علمائے اسلام کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ قادیانی غیر مسلم اور کافر ہیں تو انہیں ناگوار معلوم ہوتا ہے حالانکہ خود ان کے نزدیک بھی رسول اللہ ﷺ کو خاتم النبیین ماننے والے اور قرآن کے مطابق عقیدہ رکھنے والے کافر ہیں۔ یہ لوگ جس شخص کو نبی مانتے ہیں اس نے خود اپنے نہ ماننے والوں کو کافر اور جہنمی، بلکہ ولد الحرام کہا ہے۔ (ذرا مدعی نبوت کی زبان ملاحظہ کرلیں) قادیانیو! جب تم مسلمانوں کو کافر کہتے ہو اور یہ مانتے ہو کہ ان کی جماعت الگ ہے اور تم ان سے علیحدہ ہو تو برا ماننے کی کیا ضرورت ہے ؟ سیدھی بات یہ ہے کہ ہندوؤں کی طرح تم یوں کہدو کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔ ہم تمہارا پیچھا چھوڑ دیں گے تمہیں اصرار ہے کہ ہم مسلمین ہیں حالانکہ عرب و عجم کے اکابر علماء نے تمہیں کافر قرار دے دیا، پاکستانی قومی اسمبلی نے تمہارے کافر ہونے کا اعلان کردیا۔ ساؤتھ افریقہ کی نصرانی حکومت کے سپریم کورٹ نے تمہارے غیر مسلم ہونے کا فیصلہ کردیا تو تم کس منہ سے کہتے ہو کہ ہم مسلمین ہیں۔ سورہ حج میں تو یوں فرمایا ہے کہ "هو سما كم المسلمين من قبل" اس میں خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کو مسلمین کا لقب دیا ہے۔ تم محمد رسول اللہ ﷺ کو خاتم النبیین نہیں مانتے تو تمہارا ان سے کیا جوڑ ہے اگر تمہیں لفظ کافر اور غیر مسلم ایسا ہی ناگوار ہے تو تم کم از کم یوں ہی علان کردو کہ ہم ہیں تو مسلم لیکن وہ مسلم نہیں جو حاملین قرآن ہیں اور جو محمد رسول اللہ ﷺ کو خاتم النبیین مانتے ہیں۔ فریب دینے کی کیا ضرورت ہے تم خود اس پر غور کرلو۔

بات اصل یہ ہے کہ جس کسی جماعت کی بنیاد جھوٹ، فریب، دغابازی پر ہوتی ہے اسے اسی کے مطابق چلنا پڑتا ہے ورنہ جماعت ہی ختم ہوجائے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

(جب معمار پہلے اینٹ ٹیڑھی رکھ دے تو۔ ثریا تک دیوار ٹیڑھی چلی جائے گی)

قادیانیو! یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ کافر دوزخ میں جائیں گے ان کی بخشش نہیں ہے، اور اسی لئے

تم اپنے لئے یہ لفظ گوارا نہیں کرتے لہٰذا یہ تو سوچو کہ قرآن کریم نے جو ختم نبوت کا اعلان کر دیا ہے اس کا انکار کرنے سے تم پر کفر کیسے عائد نہ ہوگا۔

قرآن کریم کی کسی بھی ایک آیت کا انکار کفر ہے اور اس کی تحریف بھی کفر ہے اور تکذیب بھی کفر ہے ہمیں تمہاری خیر خواہی مقصود ہے دنیا کے مفاد کو چھوڑو کفر سے توبہ کرو قرآن کے ماننے والے بنو، محمد رسول اللہ ﷺ کو خاتم النبیین مانو! اگر کفر پر تمہاری موت آگئی تو قیامت کے دن پچھتاؤ گے اور اس وقت پچھتانا کام نہ دے گا اس وقت اپنے بہکانے والے اور گمراہ کرنے والوں پر بھی لعنت کرو گے، سورۃ الاحزاب کی آیت کریمہ جس میں محمد رسول اللہ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کا اعلان ہے اس کے تین صفحات کے بعد قرآن مجید میں کافروں کی بدحالی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"یومُ تقلب وجوههم فی النار یقولون یٰلیتنا اطعنا اللہ و اطعنا الرسول و قالوا ربنا انا اطعنا سادتنا و کبراء نا فاضلو نا السبیلا ربنا اٰتهم ضعفین من العذاب والعنهم لعنا کبیراً۔

"جس روز ان کے چہرے دوزخ میں الٹ پلٹ کئے جائیں گے یوں کہتے ہوں گے اے کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی اور یوں کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنے سرداروں کا اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا تھا، سو انہوں نے ہم کو راستہ سے گمراہ کیا تھا۔ اے ہمارے رب ان کو دہری سزا دیجئے اور ان پر بڑی لعنت کیجئے"

جن لوگوں نے تمہیں گمراہ کیا ہے آیت کریمہ واضح مفہوم کی تحریف کرنے پر ڈالا ہے ان کی باتوں میں نہ آؤ اس دنیا میں تو اپنا بڑا امان رہے ہو دوزخ میں ان پر لعنت کرو گے اور ان کے لئے ڈبل عذاب کی دعا مانگو گے۔

و آخر دعو انا ان الحمد للہ رب العالمین

(۱) نام کتاب :۔ اشاعت خاص ماہنامہ الفرقان لکھنؤ اپریل ۱۹۹۸ء تا اگست ۱۹۹۸ء
بیادگار حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ

تالیف و ترتیب :۔ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی سابق ایڈیٹر الفرقان

ضخامت :۔ چھ سو باسٹھ صفحات ۶۶۲

کاغذ و کور :۔ معیاری، خوشنما دیدہ زیب

طباعت :۔ کاکوری آفسیٹ پریس لکھنؤ

قیمت :۔ ایک سو پندرہ روپئے (۱۱۵/۰۰)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نور اللہ مرقدہ علمی رسوخ اور مذہبی پختگی میں اکابر واسلاف کے نمونہ اور جانشین تھے ان کی پوری زندگی دین کامل کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کے دفاع اور اسلام کی صحیح ترجمانی میں گزری اور بعد از وفات اپنے پیچھے علمی آثار وباقیات کا ایسا گرانمایہ و نفع بخش ذخیرہ چھوڑ گئے جس سے ملتِ اسلامیہ مستفید ہوتی رہے گی ماہنامہ الفرقان کی یہ خاص اشاعت اسی بافیض شخصیت کی حیات وخدمات اور محاسن وکمالات کا مرقع ہے جسے خود حضرت مولانا نعمانیؒ کے خلف رشید مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی زیدہ مجدہ نے مرتب کیا ہے مولانا سنبھلی زیدہ مجدہ کہنہ مشق صحافی اور صاحب نظر مصنف کی حیثیت سے اوساط علمیہ میں اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں اور ان کی تالیفات عام طور پر استحسان کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

اس زیر تبصرہ جدید تالیف میں بھی انہوں نے اپنے کمال فن، ژرف نگاہی اور نفاست ذوق کا معیار قائم رکھا ہے۔ اور اسے خوب سے خوب تر بنانے میں اپنی بھرپور صلاحیتوں کو استعمال کیا ہے۔ اور جرائد رسائل کے خصوصی شماروں میں لائق تحسین اضافہ کیا ہے۔

یہ ضخیم خصوصی نمبر چھ حصوں میں منقسم ہے جس کے عنوانات یہ ہیں (۱) مسافر آخرت منزل آخرت کی طرف (۲) خبر وفات کی صدائے بازگشت (۳) گلہائے تازہ (۴) فکر نعمانی کی جھلکیاں

(۵)اپنے خطوط کے آئینہ میں (٦) کارزار حیات میں۔ پھر ان مرکزی عنوانات کے تحت بہت سارے ذیلی عنوانات ہیں جن سے صاحب تذکرہ کی حیات کے تمام گوشے ممتاز و نمایاں ہوگئے ہیں اور قاری کو اپنے ذوق و مفید مطلب باتوں کی تلاش بھی آسان اور سہل ہو گئی ہے۔ یہ سوانحی مرقع اس لحاظ سے بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں حضرت مولانا مرحوم کے بارے میں ان کے رفقاء معاصرین، متعلقین و متوسلین اور معاصر اہل قلم و ارباب نظر کے تاثرات و خیالات کا ایک اچھا خاصا حصہ آگیا ہے جس سے مستقبل میں تذکرہ نگار کے لئے مولانا موصوف کے علمی و دینی مقام و مرتبہ اور دائرہ جہد و عمل کے تعین میں بڑی سہولت ہوگی، مضامین کا انتخاب اور ترتیب لائق تحسین ہے۔ الحاصل اس اشاعت خاص کو اگر مجموعہ خوبی سے تعبیر کیا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا، اس لئے بلاشبہ مرتب کی یہ کاوش علمی حلقوں میں وقعت کی نظر سے دیکھی جائے گی اور ارباب ذوق اس کے مطالعہ سے محظوظ ہونگے۔

(۲) نام کتاب :۔ تفسیر ہدایت القرآن (پارہ ۱۵ سورہ بنی اسرئیل و کہف تمام)
تالیف :۔ مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
کتابت :۔ کمپیوٹر کمپوزنگ
طباعت :۔ معیاری
کاغذ :۔ عمدہ
ضخامت :۔ دو سو اٹھاسی صفحات (۲۸۸)
ناشر :۔ مکتبہ حجاز دیوبند سہارنپور ۲۴۷۵۵۴
قیمت :۔ درج نہیں۔

مولانا، مفتی سعید احمد پالنپوری زیدہ مجدہ ایک کامیاب مدرس و استاذ ہونے کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اب تک مختلف علمی موضوعات پر ان کی بہت سی تالیفات شائع ہو کر علمی طبقہ میں معروف و مقبول ہو چکی ہیں "تفسیر ہدایت القرآن" بھی مولانا موصوف کے سلسلہ تالیف کی ایک اہم کڑی ہے۔ جس کے سابقہ اجزاء شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔ جدید حصہ قرآن حکیم کے پندرھویں پارہ کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ تفسیر ہدایت القرآن کا یہ سلسلہ اس اعتبار سے نہایت مفید ہے کہ اس میں تفسیری مباحث کو انتہائی سہل و دلنشیں اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ اور تفصیل و اختصار کے بجائے توسط اختیار کیا گیا ہے جس سے قاری کا ذہن طویل تفسیری مباحث میں الجھنے کے بجائے قرآن حکیم کے مفہوم و معانی تک سہولت سے پہنچ جاتا ہے پھر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے احادیث و آثار، سلف صالحین کے اقوال اور محققین علمائے تفسیر کی تحقیقات کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ اس لئے

بغیر کسی تردد کے اس تفسیر کے مطالعہ کا مشورہ دیا جاسکتا ہے۔اور بجاطور پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ دیگر اجزاء کی طرح یہ جزء بھی پسند کیا جائے گا اور عام وخاص اس سے زیادہ استفادہ کی کوشش کریں گے۔

(۳)نام کتاب :۔ امدادالسالک واحکام تصوف

ترتیب :۔ مولانا مفتی مہربان علی بڑوتی

مجاز بیعت حضرت مولانا مظفر حسین صاحب زید مجدہ

ضخامت :۔ چار سولہ صفحات (۴۱۶)

تعداد :۔ ایک ہزار

ناشر :۔ مکتبہ دعوۃ الصدق دیوبند

قیمت :۔ درج نہیں

ملنے کے پتے :۔ کتب خانہ حیات الاسلام ہرسولی مظفر نگر۔

مکتبہ فیض اشرف جلال آباد ضلع مظفر نگر یوپی

مکتبہ نعیمیہ جامع مسجد دیوبند ضلع سہارن پور۔

ربانی بکڈپو کڑ شیخ چاند لال کنواں دہلی ع۶

زیر تبصرہ کتاب تین مختصر رسائل کا مجموعہ ہے۔(۱) ضروریات سلوک جو بطور مقدمہ کے لکھا گیا ہے (۲) امدادالسالک، اس میں طالبین کے خطوط اور ان کے جوابات جمع کردئے گئے ہیں (۳) احکام تصوف، اس جز میں سلوک وتصوف کے شرعی حدود واحکام معتبر کتب فتاویٰ سے اخذ کرکے مناسب ترتیت کے ساتھ جمع کردے گئے ہیں۔اس طرح ہر سہ رسائل کا یہ مجموعہ سلوک وتصوف سے ذوق رکھنے والوں کے لئے ایک خوان یغما بن گیا ہے۔

آج کل جب کہ لوگ مادیت کی جانب آنکھ بند کرکے بھاگے جارہے ہیں زہد وقناعت، اور متاع دنیا سے بے نیازی عنقا ہوگئی ہے الا ماشاء اللہ جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ امت کی اکثریت سلوک وتصوف سے دور ہوتی جارہی ہے۔اس قسم کے عام فہم رسائل شب تاریک میں قندیل رہبانی سے کم نہیں ہیں مولانا مہربان علی صاحب دین سے شغف رکھنے والوں کی جانب سے مستحق شکریہ ہیں کہ انہوں نے صحیح وقت پر اس سلسلے کی ترتیب واشاعت کا کام شروع کیا ہے اللہ تعالیٰ ان کے حوصلہ میں بلندی اور کام میں برکت عطاء فرمائے اور امت کو ہدایت دے کہ وہ اپنے بھولے ہوئے سبق کو پھر سے ذہن نشین کرلے۔امید ہے کہ آئندہ ایڈیشنوں میں کتاب وطباعت کے معیار کو اور بہتر بنانے کی طرف توجہ دی جائے گی۔

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

ماہ رجب ۱۴۱۹ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۹۸ء

جلد ۸۲	شمارہ ۱۱	فی شمارہ ۶/-	سالانہ ۶۰/-

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۴۰۰/- روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/-، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/-
ہندوستان سے ۶۰/-

Tel. : 01336 - 22429
Fex : 01336 - 22768
Tel. : 01336 - 24034 (EDITOR)

○ یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے، اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا نورالحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا راہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندستان وپاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرت مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مولانا جعفر احمد صاحب محدث مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز

حبیب الرحمٰن قاسمی

ہندستان کی تقسیم نے جہاں مسلمانوں کے حصے بخرے کردیئے وہیں بہت سے نئے اور سنگین مسائل سے بھی انہیں دوچار کردیا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں سب سے بڑا مسئلہ جان، مال اور آبرو کی حفاظت کا کھڑا ہوا، اور وہ برابر بڑھتا چلا گیا حتیٰ کہ اس نے اقتصادی، سیاسی اور کاروباری زوال کی شکل میں پورے ملک کے مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھر بھی کیسی عجیب بات ہے کہ ہندوستان کا مسلمان زندہ ہے اور اتنا زندہ ہے کہ فرقہ پرست طاقتوں کو اپنی مسلم دشمن پالیسیوں پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ چنانچہ حالات نے کروٹ بدلی تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ اب مسلمان سے زیادہ خود اسلام نشانہ پر ہے اور مختلف شکلوں میں ہے۔ اب اگر مسلمانوں پر بھی حملہ ہے تو ان کی جان، مال اور آبرو سے بڑھ کر ان کے ایمان و عمل پر دھاوا بولا جارہا ہے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ راجستھان، آگرہ، ہاتھرس اور علی گڈھ کے دیہاتوں میں تقریریں، پمفلٹ، کتابیں، جلسے اور مذہبی تقریبات کے ذریعہ مسلم برادریوں کو برادری کے نام پر ہندو مذہب میں داخل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور یہ کوشش بہت منظم طور پر جاری ہے حتیٰ کہ ان کی غربت، بیماری اور مجبوریوں کو بھی فرقہ پرست عناصر ایمان کی تبدیلی کئے لئے استعمال کررہے ہیں، مگر یہ حملے اسی وقت تک کارگر رہیں گے جب تک پڑھا لکھا طبقہ ان جاہل دیہاتیوں کو سہارا دینے کے لئے آگے نہیں آتا۔ اس لئے اگر ان کے بچوں کو دینی تعلیم دی جائے اور ان کے مردوں، عورتوں کو معمولی مذہبی تربیت دینے کا انتظام کردیا جائے تو یہ علاقے اب بھی محفوظ ہوسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں مسلمان بیدار ہوگئے

ہیں وہاں کی برادریاں محفوظ ہو گئی ہیں۔

اس قسم کے جو لوگ اسلام پر حملہ آور ہیں ان کا بڑا طبقہ عدالتوں کے اندر بھی ہے اور باہر بھی وہ کہیں قرآن پر کہیں اذان پر اور کہیں ڈاڑھی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی طبقہ ہے جس نے مطلقہ عورت کے گذارے کے نام پورے مسلم پرسنل لا کو داؤ پر لگادیا۔ اور علاوہ ازیں بچوں کی پرورش اور وراثت کے نام پر حقیقی اور غیر حقیقی اولاد کو برابر کرنے کے لئے فیصلے دے رہا ہے۔ یہی اسلام دشمن طبقہ نصاب کی کتابوں میں اسلام کے خلاف، پیغمبر اسلام اور ان کی تعلیمات کے خلاف برابر زہر گھولتا رہتا ہے یا اخبارات ورسائل میں مضامین لکھ لکھ کر مسلمانوں کو مشکوک، غیر مسلموں کو مخالف بنانے اور سیکولر طاقتوں کو پشیمان کرنے کی مسلسل جدوجہد کررہا ہے۔

مسلم دشمنی کا ایک نیا روپ اور ظاہر ہوا ہے کہ مسلم عبادت گاہوں پر قبضہ کر کے انھیں مندروں میں تبدیل کردیا جائے جیسا کہ بابری مسجد اجودھیا میں ہو چکا ہے اور اب متھرا، بنارس، سنبھل، جونپور، بجنور، بدایوں، جالور، برندابن وغیرہ مقامات کی مساجد، عیدگاہ وغیرہ کے خلاف تخریب کاری کی کوششیں جاری ہیں۔ عوام اور حکومت کو گمراہ کرنے کے لئے جھوٹے اور مکروہ پروپیگنڈے ہر سطح پر کئے جارہے ہیں۔ اس طرح ہمارے ہندوستان کا مسلمان چاروں طرف سے مسائل میں گھرا ہوا ہے بلکہ مسلمان ہی نہیں خود اسلام بھی نرغے میں آگیا ہے۔

ادھر چند سالوں سے ان مسلم دشمن طاقتوں نے سیاسی طور پر بھی اپنا دباؤ بڑھادیا ہے۔ اور ایک نئی اسکیم کے تحت براہ راست مسلمانوں اور ان کے مذہبی شعائر و آثار بالخصوص مدارس دینیہ پر حملہ کرنے کے ساتھ ہندوستان کی سیکولر اور جمہوری حیثیت کو ختم کر کے ملک کو ہندو اسٹیٹ بنانے کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔ اپنے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے وہ ہندو عوام کو طرح طرح سے جھانسے دے رہی ہیں۔ اور انتہائی غلط پروپیگنڈوں کے ذریعہ انھیں اپنے ساتھ متحد و منظم کررہی ہیں۔ حالات وواقعات بتاتے ہیں کہ ان کی یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب ہے۔ یہ صورت حال ہندوستان میں آباد اقلیتی اکائیوں کے لئے خطرناک ہونے کے ساتھ خود ملک کی سالمیت، اس کی وحدت اور عظمت کے لئے بھی ایک کھلا چیلنج ہے۔ اس لئے یہ نازک ترین مسئلہ یہاں کی غیر ہندو اقلیتوں کے ساتھ سیکولر پسند جمہوریت نواز سیاسی پارٹیوں کی بھی توجہ کا انتہائی محتاج ہے لیکن۔

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے

اس صورت حال سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خدا کے دربار میں ہندوستان کے عام باشندوں کیلئے کوئی نیا فیصلہ ہونے والا ہے۔ کیونکہ تاریخ میں جب بھی کوئی قوم اسلام سے ٹکرائی ہے تو اسلام نے ہمیشہ اسے جیت لیا ہے۔ ایسے میں ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اسلام کے اصولوں اور صحیح تصویر کو لوگوں کے سامنے رکھ دیں۔ افسوس کہ ہندوستان کی ہزار سالہ زندگی میں ہم نے یہاں کی مختلف قوموں کو ان کی مختلف زبانوں کو اور شہر سے دیہات تک پھیلی ہوئی برادریوں کو اسلام سے روشناس کرانے کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔

وقت باقی ہے کہ موجودہ مسلم ادارے یہ فرض ادا کریں۔

اس کے لئے حسب حوصلہ مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(۱) اسلام کے اصولوں اور اس کی تعلیمات سے ہندوستان کی تمام چودہ زبانوں کو مالامال کریں۔

(۲) ایسے علماء تیار کریں جو مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ کر کے اسلام کی حقانیت وصداقت کو ثابت کرسکیں۔

(۳) ایسے قانون داں پیدا کئے جائیں جو اسلام سے براہ راست واقف ہوں اور وقت آنے پر اس کا قانونی دفاع کرسکیں۔

(۴) ایسے اصحاب قلم اور ارباب صحافت ابھارے جائیں جو اسلام کے ترجمان بن کر نہ صرف ستیہ پرکاش کا بلکہ ایسے تمام فرقہ وارانہ اعتراضات کا جواب دے سکیں۔

(۵) ایسے اہل علم کی خدمات حاصل کی جائیں جو مستشرقین کے بخیہ ادھیڑ کر اسلام کے چہرے سے باطل کی نقابیں الٹ سکتے ہوں۔ اگر ہندوستان کے تمام مسلم ادارے باہمی تعاون واشتراک سے کام کریں تو بڑا کارنامہ انجام دے سکتے ہیں ورنہ الگ الگ بھی ان موضوعات پر کام کے لئے تیار ہو جائیں تو بڑھتا ہوا اندھیرا اب بھی چھٹ سکتا ہے اور اسلام کی صبح نو ہماری نسلوں پر آج بھی طلوع ہوسکتی ہے۔ ورنہ صرف حکومت کا شکوہ کر کے یا اکثریت یا اقلیت کی بحثوں میں الجھ کر آپ مایوسی تو پیدا کر سکتے ہیں امید کی کرنیں نہیں پھیلا سکتے۔

اگرچہ بت ہیں زمانے کی آستینوں میں
ہمیں ہے حکم اذاں لاالٰہ الا اللہ

اسلامی عقائد واحکام

پر عمل کرنیکا علمی منہاج

السلفیه مرحلة زمنیةمباکة لامذهب الاسلامی

تالیف داکٹر محمد سعید رمضان البوطی کاایک باب ترجمہ مولانا محمد عارف استاذدارالعلوم دیوبند

دارالعلوم

اعتقادی و عملی زندگی میں، اسلامی تعلیمات کو صحیح طور پر پورا کرنے کے لئے، انسان کو تین مراحل سے گزرنا ہوگا۔

(۱) نصوص شرع (قرآن وحدیث) کی صحت کا مکمل یقین ہو، سلسلہ نقل میں کہیں انقطاع نہ ہو۔

(۲) نصوص کے معانی و مفہوم کی مکمل واقفیت، اور اس بات کا اطمینان کہ شریعت کی مراد یہی ہے۔

(۳) ان معانی و مفاہیم (جن کو اس نے نصوص شرعیہ سے پورے اطمینان کے ساتھ اخذ کیا ہے) کو منطق (یعنی علم ودرایت کے اصولِ عامہ) اور عقل کی کسوٹی پر پرکھنا، تاکہ معلوم ہو سکے کہ عقل اس سلسلہ میں کیا کہتی ہے۔

ان تینوں مراحل سے گزرنے کے لئے کسی نہ کسی "وسیلہ" کی ضرورت ہے، اور اسی "وسیلہ" کو ہم "منہاج" کہتے ہیں، لیکن یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ صحابہ کرام اس ضابطہ سے مستغنی ہیں کیونکہ سرچشمہ اسلام سے قرب کی وجہ سے (جن کی تفصیلات ماسبق میں آچکی ہیں) ان حضرات کے لئے، ان مراحل سے گزرنے کی ضرورت نہ تھی۔

یہ طے ہے کہ دینی فہم وبصیرت، اور اسلام کے مبادیات واحکام کی پابندی کا "منہاج" تین بنیادی عناصر سے مرکب ہے۔

اور ہر عنصر صرف تہائی راستہ طے کراتا ہے، ان تینوں عناصر کی تکمیل کے بغیر اسلام کی صحیح معرفت، اور اعتقادی و عملی زندگی میں اسلامی تعلیمات کی صحیح و مکمل پابندی نہیں ہو سکتی۔

عنصر اول:

چند ایسے قواعد و معلومات کے مجموعہ کا نام ہے، جس کے ذریعہ سے کسی خبر یا واقعہ کے صحیح یا غلط ہونے کا "منہاج" معلوم ہوتا ہے، نیز عقل کی نظر میں خبر صحیح اور اس کی تاثیر کے مراتب کا علم ہوتا ہے۔

عنصر دوم:

چند تشریحی و دلالتی قواعد و معلومات کا مجموعہ ہے جو در حقیقت عربوں کی باہمی گفتگو اور تفاہم سے ماخوذ ہے اور ان کی روشنی میں عربی لغات، لغوی دلالتوں کے اصول اور بیان و تشریح کے قواعد وجود میں آئے اور پھر ان سے تشریح نصوص، اور ان کے مدلولات و معانی تک رسائی کا مکمل "علمی منہاج" وضع کیا گیا۔

عنصر سوم:

چند خالص عقلی و منطقی معیاروں کا نام ہے، جو علم و معرفت کے میدان میں عقل انسانی کی روش، اور علمی مفروضات، دعاوی پر عقلی محاکمہ اور استقراء وتتبع سے اخذ کیئے گئے ہیں، اور چونکہ انسان کے پاس علم و معرفت کا واحد ذریعہ عقل ہے اس لئے علمی مفروضات و دعاوی کی تمحیص اور چھان پھٹک کا واحد ذریعہ یہی معیار ہے۔

مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اس منہاج و معیار کے پہلے دونوں عناصر پر مختصر بحث کر دی جائے، اور تیسرے عنصر کو منطق کی بڑی کتابوں کے حوالہ کر دیا جائے کیوں کہ آج مسلمانوں میں گروہ بندی کی کوئی انتہا نہیں پھر اسلام اور مسلمانوں کا دم بھرنے اور انہیں سلفی و خلفی (بدعتی) میں تقسیم کرنے پر اصرار کرنے والے بہت سے حضرات اس "منہاج" سے بہت کم آشنا ہیں، اور شاید ان کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت، اور قدر و قیمت بھی نہیں۔

پہلے عنصر کی تشریح :

یہ عنصر وجود کے اعتبار سے سب سے مقدم ہے، کیوں کہ اس کی ضرورت بھی سب سے پہلے پڑی، اس لئے کہ روایت حدیث میں تساہل کے آغاز، اور الحاد و زندقہ کی فضا پیدا ہو جانے کی وجہ سے واضعین حدیث بھی سر اٹھانے لگے تھے پھر رفتہ رفتہ عہد رسالت سے بعد نے اس کو تقویت دی، جس کی بنا پر روایت و نقل حدیث کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف شروع ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سا منہاج تھا جس کی پابندی کر کے مسلمانوں نے اس مصیبت کو ٹال دیا، اور آئندہ بھی اس کی راہ سے نصوص شرعیہ کو کھلونا بنانے کا سد باب ہو گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ احادیث رسول ﷺ کو، صحت و وثوق کے لحاظ سے تین درجوں اور مراتب میں رکھنا ضروری ہے، اور وہ تین درجے یہ ہیں:

پہلا درجہ

جس حدیث کو رسول اللہ ﷺ سے اتنی بڑی جماعت نے روایت کیا کہ عقلاً ان کا کذب پر اتفاق کر لینا محال ہو، اور پھر اسی طرح یہ روایت عہد تدوین تک نقل ہوتی رہی، اس کو متواتر کہتے ہیں، اور یہ روایت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ اس درجہ کی روایت کا حکم یہ ہے کہ ہر شخص کو اس پر یقین کرنا ضروری ہے کیوں کہ جو حدیث ابتداء سے انتہاء تک اس نوعیت کے ساتھ بغیر کسی انقطاع کے منقول ہو عقل کے لئے اس کے تسلیم کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

دوسرا درجہ:

اس درجہ میں وہ روایت آتی ہے جس کو نقل کرنے والے محض ایک دو صحابی ہوں، پھر ان سے روایت کرنے والے ایک دو تابعی ہوں اور یہی سلسلہ عہد تدوین تک دراز رہے، البتہ اس کے راوی عادل و ضابط ہوں اس کی سند میں کوئی انقطاع یا اس کے خلاف کوئی معتبر روایت بھی نہ ہو۔ اس درجہ کی روایت کو صحیح کہا جاتا ہے اس سے قطعی یقین تو نہیں، البتہ غلبہ ظن حاصل ہوتا ہے کیوں کہ راوی سے نسیان خطاء و ذہول کا امکان گو بعید درجہ میں باقی رہتا ہے، لیکن امکان صدق اس درجہ کمزور بھی نہیں کہ محال کے درجہ میں پہنچ جائے، بہر کیف خبر واحد صحیح سے اعلیٰ درجہ کا غلبہ ظن حاصل ہوتا ہے کہ اس سے اوپر قطعیت اور یقین کا درجہ ہے۔

یاد رہے کہ خبر واحد کا یہ حکم (افادہ غلبہ ظن) کلی اور مجموعی طور پر ہے، ورنہ یہ مسلم ہے کہ بعض ایسے اشخاص بھی ہوتے ہیں جن کی انفرادی خبر سے بھی یقین ہو جاتا ہے، لیکن یہ عمومی ضابطہ نہیں، ہر شخص اس درجہ تو نہیں پہونچ سکتا۔

عقائد کے باب میں خبر واحد حجت ملزمہ نہیں یعنی خبر واحد سے ثابت ہونے والے حکم کا جزم و یقین نہ کرنے سے انسان کی عدالت مجروح ہو سکتی ہے، اور اس پر فسق کا حکم لگ سکتا ہے، لیکن اسلام و ایمان پر آنچ نہیں آتی، کیوں کہ اعتقاد ایک غیر اختیاری فعل ہے، یعنی عقل کے لئے قطعی الثبوت دلائل فراہم ہوں تو وہ خود بخود جزم و یقین کر لیتی ہے، کسی خارجی دباؤ کی ضرورت نہیں، لیکن کسی قطعی دلیل کے بغیر عقل کو اعتقاد و یقین پر مجبور نہیں کیا جا سکتا وہ شک اور غلبہ ظن کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور یہ بھی اس کا غیر اختیاری فعل ہے، اگر اس کو اس صورت میں بھی جزم و یقین پر مجبور کیا جائے، تو تکلیف مالا یطاق ہے، جو کسی طرح بھی درست نہیں۔

عبادات معاملات، اور دوسرے عملی احکام اس سے، بالکل مختلف ہیں کیوں کہ احادیث متواترہ کی روسے احکام عملیہ میں ظنی دلائل کو معتبر مانا گیا ہے۔ یعنی اگر کسی حدیث میں صدق کا رجحان اور غلبہ ظن ہو تو اس سے ثابت ہونے والے شرعی حکم پر عمل کرنا واجب ہے۔ اس لیے کہ خود رسول اللہ ﷺ دور نزدیک قبائل، اور مختلف شہروں میں اکا دکا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو شرعی احکام کی تعلیم و تبلیغ کے لئے بھیجتے تھے اور وہاں کے لوگوں کو حکم تھا کہ ان حضرات کی اتباع و اطاعت کریں، حالانکہ ان سے سہو نسیان اور غلطی کا احتمال رہتا ہے، پھر یہ آپ کا یہ فرمانا گویا یہ حکم تھا کہ اگر یہ حضرات کوئی دینی مسئلہ بتائیں جس کا تعلق احکام عملیہ سے ہو، اور صدق کا ظن غالب ہو، تو اس پر عمل واجب ہے۔

تیسرا درجہ:

تیسرے درجہ میں حدیث ضعیف ہے جس کی متعدد انواع واقسام ہیں، اور مجموعی طور پر ان سب کا حکم ایک ہے، یعنی عقائد، یا احکام عملیہ کسی میں بھی اس کا اعتبار نہیں، البتہ بعض علماء ضعیف حدیث کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن یہ نظریاتی اصول معلوم ہوتا ہے، علمی طور پر اس کا ثبوت نہیں، اس کی کچھ تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

اکثر علماء کے نزدیک فضائل اعمال میں ضعیف حدیث معتبر ہے بشرطیکہ اس کا ضعف شدید نہ ہو اور راوی حدیث اس کی صحت کا جزم واعتقاد نہ رکھے (۲) لیکن اس منہاج کو عملی شکل دینے میں ایک زبردست نظریاتی مسئلہ یہ پیش آیا کہ چہار دانگ عالم میں پھیلے ہوئے رواۃ حدیث کے حالات اور ان کے ظاہری وباطنی اخلاق کے معلوم کرنے کا طریقہ کیا ہو؟ کہ اس کی روسے اسانید حدیث کی درجہ بندی ہو سکے۔

بلاشبہ یہ ایک مسئلہ تھا لیکن محض نظریاتی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دور کے علماء کے اخلاص اور کتاب وسنت کے تحفظ کی راہ میں ان کی بے پایاں لگن کی وجہ سے انہیں اس مشکل سے نبرد آزما ہونے کی توفیق دی اور انہوں نے ایک نادرۂ روزگار فن کی بنیاد رکھی جس کی نظیر آج تک موجودہ وسابقہ تہذیبیں پیش کرنے سے قاصر ہیں اس فن کو فن جرح وتعدیل کہا جاتا ہے اور یہ فن درحقیقت اسی منہاج کے زیر بحث جزو کی ایک کڑی ہے اور اس کے لیے معین ومددگار فن رجال کی کتابوں میں تمام رواۃ حدیث کے مفصل حالات استقامت دین اور اعتبار واعتماد کے لحاظ سے ان کی حیثیتوں کا ذکر ہے یہ سب کچھ ان کے اخلاص جذبہ خدمت دین ان کی دیدہ ریزی اور جانفشانی کا نتیجہ ہے ورنہ اس فن کا کوئی نام تک نہ جانتا

دوسرے عنصر کی تشریح :

نقل وروایت کے اعتبار سے نصوص کی صحت پایہ ثبوت تک پہونچنے کے بعد ان کے صحیح معنیٰ ومفہوم کی تعیین وتحدید کا نمبر آتا ہے اعتقادی وفقہی مسائل میں اختلاف کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان حضرات کے سامنے نصوص فہمی اوران کے معانی کی تعیین کا کوئی متفقہ معیار ومیزان نہ تھا بلکہ بعد میں چل کر اس کو وضع کیا گیااور یہی دین اور دینی احکام وعقائد کی صحیح فہم کا دوسرا جزو قرار پایا اس معیار کے تین اجزاء ہیں (۱)مبداء ومدخل (۲) جوہر (۳) تتمہ اس معیار کے تینوں اجزاء کی مختصر تشریح پیش ہے

(۱) مبدء ومدخل :

اسلامی عقائد واحکام کا سرچشمہ کیا ہے؟ مبدا میں اسی کا بیان ہوگا مطول ومفصل کتابوں میں اس موضوع (طریقہ ودرایت) پر عمومی طور سے اور خصوصاً زیر بحث مبدا ومدخل پر طویل بحث موجود ہے یہاں اسی کا خلاصہ پیش ہے۔ اسلامی احکام ومبادیات دو طرح کے ہیں

(۱) اخبار واعلام (۲) امر ونہی۔ ظاہر ہے کہ کسی خبر یا امر ونہی کا علم تجربہ مشاہدہ اور احساس وشعور کے ذریعہ ناممکن ہے اس کے لیے اخبار واعلام کا پایا جانا ضروری ہے یعنی کوئی اخباری نص آئے جس میں ماضی حال یا مستقبل کے واقعات کا ذکر ہو یا امر ونہی کے ذریعہ کسی خاص عمل کی رہنمائی یا اس سے ممانعت ہو۔ تمام اسلامی عقائد قسم اول (اخبار واعلام) کی شکل میں اور جملہ احکام وفرائض قسم ثانی (امر ونہی) کی شکل میں ہم تک پہونچے ہیں بہر کیف کسی بھی اسلامی حکم وعقیدہ کے ثبوت کے لئے کسی نہ کسی اخباری یا انشائی نص کا تحقق ضروری ہے یا اسی کے درجہ کی کوئی دوسری چیز مثلاً ان پر قیاس واستدلال محض اجتہاد ورائے کی بنیاد پر اسلام میں کسی عقیدہ یا حکم کا ثبوت ناممکن ہے اسلام اور دوسرے خودساختہ افکار وخیالات اور مذاہب وادیان میں اساسی فرق یہی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

اجتہاد کسی مطلوب کی بنیاد پر ہوگا اور مطلوب کوئی ایسی مستقل ذات ہوگی جو دلالت مقصودہ یا کسی مستقل ذات پر قیاس وتشبیہ کے ذریعہ مقصود ومطلوب ہو نیز فرماتے ہیں

جب مسئلہ یہ ہے تو ہر عالم کا فریضہ ہے کہ وہ کوئی مسئلہ علم کی رو سے ہی بتائے اور علم کے طریقے دو ہیں خبر لازم اور قیاس بالادلہ

آگے لکھتے ہیں :

اگر کوئی شخص خبر لازم اور قیاس سے ہٹ کر کوئی بات کہتا ہے تو یہ عالم بمقابلہ جاہل گناہ کے

زیادہ قریب ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے سوا کسی کو یہ حق نہیں دیا کہ علم سابق سے ہٹ کر کوئی بات کہے اور علم رسول ﷺ کے بعد، علم سابق کے راستے یہ ہیں کتاب اللہ سنت رسول اللہ آثار وقیاس۔(۱)

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ علم کے بغیر کوئی دینی بات نہیں کہی جاسکتی، اور علم کا ذریعہ "خبر" ہے اور یہ بھی طے ہے کہ یہ "خبر" "کتاب اللہ میں ملے گی جو اسلامی احکام و مبادیات کا اولین سرچشمہ ہے، اور قرآن کریم کے مطابق، رسول اللہ ﷺ کے اقوال افعال قرآن کی تشریح و تفسیر ہیں ،بلکہ قرآن کریم کسی مسئلہ میں خاموش ہو تو بھی رسول ﷺ کی ہدایت تعلیم پر عمل کرنا ضروری ہے لہٰذا اسلام کا دوسرا ماخذ حدیث ہے،

نیز قرآنی ہدایت ہے کہ مسلمانوں کے اجماعی مسئلہ کی پابندی ضروری ہے فرمان باری ہے:

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولی و نُصله جهنم و ساء ت مصیراً

ترجمہ: اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے، جب کہ اس پر سیدھی راہ کھل چکی ہو، اور مسلمانوں کے راستہ کے خلاف چلے تو ہم اس کو وہی طرف حوالہ کردیں گے، جو اس نے اختیار کیا، اور ہم اس کو دوزخ میں ڈالیں گے، اور وہ بہت بری جگہ پہونچا۔

اس قرآنی حکم، اور تواتر معنوی کے درجہ کی بے شمار روایتوں کی وجہ سے "اجماع" کا شرعی حجت وماخذ ہونا طے ہے۔

اور مزید غور و خوض کے بعد، یہ قرآنی تعلیم بھی سامنے آتی ہے کہ شرعی احکام کی علت و سبب کو معلوم کیا جائے، جہاں جہاں وہ علت و سبب پایا جائے، سب کا حکم ایک ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بکثرت، احکام کی علتوں کا ذکر کرنے کے بعد" **فاعتبروا یا اولی الابصار**"(حشر) 'یا' یا **اولی الالباب** (سورہ بقرہ ۱۷۹) فرمایا گیا۔ جس کا مقصد یہ تعلیم دینا ہے کہ یہ حکم اسی واقعہ و حادثہ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ جہاں کہیں بھی یہ علت پائی جائے یہی حکم ہوگا۔

---

(۱) **مثلاً حدیث ان امتی لا تجتمع علی ضلالة** یعنی میری امت گمراہی پر اتفاق نہیں کرسکتی، رواہ ابن ماجہ فی الفتن۔ بخاری کتاب الفتن، اور مسلم کتاب الامارۃ کی ایک طویل حدیث میں ہے "**تلزم جماعة المسلمین و امامهم**" نسائی، اور احمد کی روایت میں ہے "**الشیطان مع من فارق الجماعة**" **ترمذی کتاب الفتن**، اور نسائی کتاب التحریم میں ہے :**إنّ الشیطان مع الواحد وهو من الاثنین أبعد** اور ابن ماجہ کتاب الفتن، اور مسندِ احمد میں ہے، علیکم بالسواد الاعظم اس مفہوم کی اور بہت سی احادیث ہیں۔

اس کی وضاحت اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذؓ کو یمن روانہ کرتے ہوئے دریافت فرمایا کہ تم فیصلہ کیسے کروگے؟ انہوں نے جواب دیا کہ کتاب اللہ سے آپ نے فرمایا کہ اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تو حضرت معاذؓ نے جواب دیا سنت رسول اللہ سے آپ نے پوچھا کہ اگر سنت میں بھی نہ ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ پوری محنت سے اجتہاد کروں گا یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کے سینہ پر مارا، اور فرمایا اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ کے قاصد کو ان کی منشاء کے مطابق کام کرنے کی توفیق دی۔" (۲)

یہاں پر اجتہاد سے مراد جیسا کہ شراح حدیث لکھتے ہیں کتاب و سنت کی روشنی میں قیاس کرنا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم اسلام کا اولین اور اصل سرچشمہ ہے، پھر قرآنی ہدایت کے مطابق سنت اور اجماع امت بھی اسلامی مآخذ و مصادر میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان سب کے بعد انسان نصوص شرع کی علتوں کو تلاش کرکے احکام کا استنباط کرے، علتوں کے اندر جس قدر وسعت ہوگی، احکام کا دائرہ اسی قدر وسیع اور ہمہ گیر ہوگا۔

لہٰذا اسلامی مصادر و مآخذ چار ہوئے جن میں اصل اور بنیادی کتاب اللہ ہے، بقیہ تینوں مصادر اسی کی فرع ہیں۔

یہاں تک اس معیار کے مبدأ و مدخل کا بیان تھا، ایک مسلمان جب اس سے مکمل طور پر واقف ہوگیا، اور اس کو یقین ہے کہ قرآن کریم ہی دین کا اصل مأخذ و سرچشمہ ہے تو لامحالہ اسے اپنی تمام تر توجہات کا مرکز قرآن کریم کو بنانا ہوگا۔ غور و فکر کی تمام صلاحیتیں اسی میں صرف کرے، تاکہ قرآن کریم کے صحیح معنی و مراد تک پہونچ سکے، البتہ احادیث سے بھی روشنی حاصل کرنی ضروری ہے کیوں کہ آپ ﷺ کے افعال واقوال، قرآن کریم کی مکمل تفسیر ہیں۔ ایک مسلمان جب اس انداز سے غور فکر کرے گا تو اس پر دینی حقائق و معارف کا انکشاف ہوگا۔ اور اس کو معلوم ہوگا کہ علوم دو طرح کے ہیں:

قسم اول:

وہ علم جو ہر ذی عقل و ہوش کو حاصل ہے، خواہ اس کی علمی صلاحیت جس درجہ کی ہو۔ اور اس سے ناواقفیت کوئی عذر نہیں۔ اس طرح کے علم میں کسی تاویل کی گنجائش، اس کے ادراک و فہم میں کوئی نزاع یا اس کی روایت میں خطا کا امکان نہیں، اس علم کے ذیل میں جو چیزیں آتی ہیں وہ یہ ہیں، کل، بدیہی فرائض واحکام مثلاً روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ کی فرضیت، اور سود، زنا، چوری،

اور شراب کی حرمت کا علم۔

یہ ساری چیزیں قرآن کریم میں صراحتاً موجود ہیں، ہر شخص جانتا ہے، کسی کا ان میں اختلاف نہیں، اور اس طرح کا علم قطعی الدلالۃ والثبوت کہلاتا ہے یعنی ہر وہ نص جو تواتر کے ساتھ ہم تک پہونچے اور اس کا مفہوم اس قدر واضح ہو کہ کسی تاویل یا خطاء کا احتمال نہیں، اس کا حکم یہ ہے کہ ہر انسان اس کا مکلف ہے ہر عاقل وبالغ کے لیے اس کی واقفیت ضروری ہے اس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں، کیونکہ مجتہد زیادہ سے زیادہ ظن کے درجہ پر پہونچتا ہے، بلکہ اس کے اجتہاد میں غلطی کا بھی احتمال ہوتا ہے پھر ہر ایک کی اجتہادی صلاحیت یکساں نہیں، اور لامحالہ نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ یہ علم اس طرح کے کسی بھی شائبہ سے پاک ہوتا ہے۔(۱)

قسم دوم :

علم کی یہ قسم خواص کے لئے ہے، جن کی سطح علمی مصروفیات اور مسلسل بحث و تحقیق کی وجہ سے عوام سے بالا ہوتی ہے، نیز اس قسم کا تعلق کلی عقائد، یا بدیہی احکام سے نہیں، بلکہ ان کی تفصیلات و تفریعات سے اور ان سے متعلق دقیق دلائل سے ہے، اور اس کے تحت حد تواتر سے کم درجہ کی اخبار آتی ہیں جن کو خبر واحد کہا جاتا ہے۔ اسی طرح قیاس کی تمام انواع واقسام اس کے تحت آتی ہیں۔

علم کی اس قسم کا ایک بڑا حصہ درجہ ظن سے اوپر نہیں جاتا، یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی مسلسل بحث و تحقیق کے ذریعہ اس میں بھی یقین کے درجہ پر پہونچ جائے، لیکن یہ انفرادی واقعہ ہوگا، کلی نہیں۔ اس قسم کا حکم یہ ہے کہ اس درجہ کا علم حاصل کرنا ہر شخص کا فریضہ نہیں، بلکہ صرف خواص اور سارے خواص بھی نہیں بلکہ اتنی بڑی تعداد جو بقیہ کی ضرورت پوری کر سکے، اور حسب ضرورت ان سے معلوم کر کے عمل کیا جاسکے، نیز اس قسم کے علم کا حکم یہ ہے کہ اس کی بنیاد پر، انسانوں کو جزم واعتقاد پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اس سے بالکلیہ ناواقفیت، اور اس کے بارے میں شک کی بھی گنجائش ہے، بشرطیکہ خواص کی اتنی بڑی تعداد اس کا علم رکھے جن سے ضرورت پوری ہوسکے اور لوگوں کو کیا جاننا مناسب اور بہتر ہے، اس کی تعلیم دی جاسکے (۲)

اس کا ایک حکم یہ بھی ہے کہ احکام عملیہ میں اس قسم کے علم۔ خصوصاً خبر واحد کا اعتبار ہے، یعنی ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے بہت سے مسائل، اجتہادی امور کی طرح درجہ ظن سے اوپر نہ جائیں، جن میں سر فہرست اخبار آحاد ہیں، لیکن چوں کہ جزم واعتقاد اختیاری فعل نہیں، بلکہ قطعی دلائل و براہین کا مرہون منت ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اگر اپنے لطف و کرم سے اس طرح کے مسائل میں جزم

واعتقاد کا مکلف نہیں بنایا، تو اس کا یہ تقاضا نہیں کہ عملی طور پر اس کو واجب ولازم بھی نہ قرار دیا جائے۔احادیث متواترہ اس بات کی شاہد ہیں کہ عملی احکام وتشریعات کے باب میں اخبار احاد اور اس درجہ کے دوسرے دلائل پر عمل کرنا واجب ہے، جن سے مجتہد کو صرف غلبہ ظن حاصل ہوتا ہے مثلاً قیاس، اور نص کے مفہوم سے استنباط وغیرہ۔

اس مسئلہ کی نہایت واضح اور قطعی دلیل یہ ہے کہ دو عادل گواہوں سے فیصلہ کرنے کا حکم، قرآن کریم میں صراحتاً موجود ہے، حالانکہ گواہوں سے غلطی یا کذب بیانی کا احتمال موجود ہے اگرچہ یہ احتمال ضعیف وکمزور کیوں نہ ہو۔

اسی طرح ایک شخص خانہ کعبہ سے دور ہو تو بھی اسی کی طرف رخ کرے گا اس حالت میں احتمال ختم نہیں ہوتا کہ وہ کسی قدر کعبہ سے منحرف ہو، حضور ﷺ اکاد کا صحابہ کو مختلف علاقوں میں تعلیم و تبلیغ کے لیے بھیجتے تھے، ان حضرات کے بتائے ہوئے احکام خبر واحد، اور ظن سے بالا نہیں۔

اس طرح کے واقعات کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ حکم الٰہی نظر آتا ہے کہ اگر کسی صحیح اجتہادی طریقہ سے ہمیں کسی امر یا نہی کا علم ہو جائے تو اس پر عمل ضروری ہے۔(۱)

اس قسم کے علم میں شک و شبہ یا اس سے عدم واقفیت موجب کفر نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسا کرنے والا کامل ایمان رکھتا ہے، اس لیے کہ اگر وہ اس عمل سے کافر نہ ہو تو یہ بھی ضروری نہیں کہ اس میں اس کی وجہ سے بدعت فسق یا کسی درجہ میں گمراہی بھی نہ ہو۔کیوں کہ بہت سے اسلامی فرقے، جو کتاب اللہ اور اہل سنت وجماعت کی نہج سے منحرف ہیں اور اس انحراف کی وجہ سے ان پر کفر کا فتویٰ بھی نہیں لگتا، تاہم ان کا فسق وعصیان، اور بدعت میں ملوث ہونا قطعی ہے۔

اگر یہ فرقے زیر بحث جامع منہاج کے پابند ہوتے، تو ان کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا، اور ان کے اندر اس منہاج کے سمجھنے اور برتنے کی صلاحیت نہیں، تو حق یہ تھا کہ وہ بھی عام مسلمانوں کی روش اختیار کریں جن کے بارے میں فرمان باری ہے: "فسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون (سورہ نحل ۴۳ سورہ انبیاء) ترجمہ: سو یاد رکھنے والوں سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے)

خلاصہ یہ کہ جب ایک مسلمان صحیح طور پر اس مبدا ومدخل کو سمجھ گیا، اور اس کو یقین ہے کہ اسلام کا اولین سرچشمہ کتاب اللہ ہے، باقی دوسرے مصادر و مآخذ اسی سے متفرع ہیں، تو وہ اپنی تمام تر کوششوں کا مرکز اسی کتاب اللہ کو بنائے، غور وفکر کرے، احادیث نبویہ کو اپنے سامنے رکھے کہ وہ کتاب اللہ کی مکمل تفسیر وتشریح ہیں

(۲) جوہر:

جوہر سے مراد عربی زبان کے قواعد وضوابط ہیں، جو عربی عبارات والفاظ کی فہم و تشریح کے لئے از بس ضروری ہیں یہ قواعد وضوابط دو قسم کے ہیں.

(۱) دلالت (۲) بیان

قسم اول، دلالت:

اس سے معانی پر الفاظ کی دلالتوں کے اصول مراد ہیں، ان کی چار انواع ہیں

اول: وہ اصول جن کا تعلق معنی پر لفظ کی دلالت کی کیفیت سے ہے پھر یہ کیفیت مختلف شکل کی ہے یعنی حقیقت 'مجاز 'مشترک منطوق مفہوم کسی لفظ کے حقیقی معنی سے نکال کر مجازی معنی میں استعما ل کی شرائط کا بیان، مفہوم اور مشترک کے معنی کی وضاحت پھر ان کے واسطہ سے لفظ کی دلالت کی شرائط اور اس کی کیفیت کا بیان۔

دوم

وہ اصول جن کی رو سے الفاظ کی دلالت کو قوت، وضعف کے لحاظ سے مختلف درجات اور خانوں میں رکھا جاتا ہے مثلاً محکم مفسر، نص 'ظاہر اور خفی 'مشکل 'مجمل 'پھر وہ قواعد جن کے ذریعہ ان دو درجوں کے الفاظ میں (اگر دلالت اور مفہوم میں تعارض ہو) تطبیق دی جائے۔

سوم: وہ اصول جن کی رو سے جملہ دو قسموں خبر وانشاء کا وجود ہوتا ہے نیز یہ وضاحت خبر صرف احکام وضعیہ (جو درحقیقت احکام تکلیفیہ کے بنیاد تصور کیے جاتے ہیں) کو بتاتی ہے، اور یہ کہ احکام تکلیفیہ پر لالت کیلئے جس چیز کا سہارالیا جاتا ہے وہی انشاء ہے جو صیغۂ امر ونہی سے صادر ہے پھر اگر امر ونہی کے صیغے قرائن سے خالی ہوں تو ان سے کیا مراد ہے اس کی وضاحت۔

چہارم: وہ اصول جن سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ دلالت میں کسی قدر عموم و شمول ہے، جس کی بنیاد پر لفظ: خاص یعنی محدود دلالت والا، عام یعنی وسیع الدلالت، مطلق یعنی کسی ایک غیر معین فرد پر دلالت کرنے والا اور مقید یعنی کسی ایک یا چند، خاص صفت کے ساتھ متصف افراد پر دلالت کرنے والا، میں تقسیم ہوتا ہے۔

قسم دوم، بیان:

اس سے مراد درج ذیل حالات میں ملحوظ قواعد وضوابط پر تنبیہ ہے

الف ...... جب کسی لفظ خاص (محدود مفہوم رکھنے والا) اور عام (وسیع وعریض مفہوم)

رکھنے والے لفظ کے درمیان جزوی تعارض ہو تو کچھ عربی قواعد واصول ہیں، جن کے ذریعہ اس تعارض کوختم کرکے، دونوں جملوں کے درمیان تطبیق دی جاسکتی ہے۔

ب ..... مطلق ومقید کے درمیان جزوی تعارض ہو تواس کو دفع کرنے کے لئے کچھ قواعد ضوابط معین ہیں

ج..... کسی لفظ میں تاویل، اور اس کے اپنے اصلی معنیٰ سے نکالنے کا تقاضا ہو تو قواعد و ضوابط کی شکل میں اس کا معیار و میزان مقرر ہے، جس کا لحاظ کرکے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کس جگہ تاویل کی گنجائش، بلکہ واجب ہے، اور کہاں نہیں۔ کوئی مجمل اور غیر واضح لفظ آجائے کہ دوسرے دلائل اور قرآئن کے بغیر مراد سمجھ میں نہ آئے تو ان ضوابط کی مدد سے اس غموض اور ابہام کو دور کیا جاسکتا ہے، اور معنی مراد تک رسائی ہوسکتی ہے۔

۳ تتمہ :

تتمہ کا تعلق ان لوگوں سے ہے، جو احکام شرعیہ کے استنباط واستخراج، نصوص کی دلالتوں سے واقفیت اور متعارض نصوص میں تطبیق کا کام انجام دینا چاہتے ہیں، کیونکہ ہر مسلمان اس کا اہل نہیں۔

وہ شرائط جن کی تکمیل کے بعد ایک عالم درجہ اجتہاد پر فائز ہوسکتا ہے۔ اور اس درجہ پر پہونچنے کے بعد، اس کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں۔؟ متبع ومقلد جو اس درجہ تک پہونچنے سے قاصر ہیں ان کی وضاحت، نیز دین اور دینی احکام سے واقفیت، اور تکالیف شرعیہ کو کیسے پورا کیا جائے، یہ تمام چیزیں اس تتمہ میں ملیں گی 'نیز فتویٰ واستفتاء کے احکام وشرائط' اور اجتہاد کے وقت ادلہ میں باہمی ترتیب، تعارض کے وقت ترجیح کے اصول وضوابط، سب اس تتمہ میں داخل ہیں۔ یہی وہ "منہاج،، ہے جس کے ذریعہ مسلمان اپنے دین (عقائد واحکام عملیہ) پر مکمل کاربند ہوسکتا ہے۔ اور یہ "منہاج، جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ تین اجزاء (مبد اور مدخل، جوہر، اور تتمہ) سے مرکب ہے اور ان سب کا مجموعی نام " اصول فقہ یا قواعد تفسیر نصوص ' ہے اور اسی کی روشنی میں یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کون، دین اور دینی احکام کا پابند اور صراط مستقیم پر گامزن ہے اور کون اس سے منحرف، خواہ وہ جس دور سے وابستہ ہو۔ یعنی جو شخص اس معیار پر پورا اترے گا، وہ کتاب وسنت پر گامزن ہے خواہ وہ عصر سلف کا ہو، یا عصر خلف کا، بصورت دیگر یہی کہا جائیگا کہ وہ راہ حق سے منحرف ہے، اگرچہ وہ قرن اول سے وابستہ ہو۔
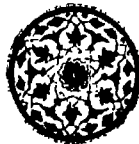
معراج النبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرش سے عرش تک

مولانا محمود الرشید جامعہ اشرفیہ لاہور

اللہ اللہ قدرت والے تیری قدرت یہ ساری کائنات محو حیرت اور انگشت بدنداں ہے، اتنا بڑا آسمان بغیر سہارے اور ستون کے کھڑا کرنے والے بغیر زنجیر و رسی سورج، چاند اور ستاروں کو جکڑنے والے اتنی، وسیع زمین کو پانی کی پیٹھ پہ کھڑا کرنے والے مضبوط اور وزنی چٹانوں اور پہاڑوں کو تھامنے والے فلک بوس درختوں کو وجود دینے والے اللہ فضاؤں میں بڑے بڑے جہازوں کو تھامنے والے، بغیر سہارے اور پیٹرول فضاؤں میں پرندوں کو چلانے والے اللہ۔ پانی کی تہوں میں اور پانی کی سطح پر بڑے بڑے سیٹمر ز جہازوں کو تھامنے اور سہارا دینے والے اللہ۔ تیری قدرتیں عجیب اور تیری حکمتیں لازوال ہیں۔ اے آسمان وزمین کے مالک، اے عرش و کرسی، لوح و قلم کے پیدا کرنے والے اللہ۔ انسانی عقل و شعور اور فہم و فراست سے تیری قدرتیں وراء الوراء ہیں، روزانہ فرشتوں کی فوجیں زمینوں پر اترتی ہیں۔ اور اپنے اپنے فرائض کی بجا آوری کے بعد واپس چلی جاتی ہیں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کم وبیش انبیاء دنیا میں بھیجے گئے۔ ان کے ساتھ فرشتہ کے ذریعے بات کی گئی۔ سیدنا موسیٰ جو کلیم اللہ تھے بات کرنے کی غرض سے کوہ طور کی بلندیوں پہ پہنچے۔ دیدار خدوندی کے طلب گار ہوئے۔ لیکن ان کی تمناء دل دل ہی میں رہی۔

قربان جائے خالق کائنات اور ان کے محبوب کالی کملی والے گنبد خضراء کے مکین، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر رب العالمین نے جب چاہا اپنے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرش بریں پہ اپنے پاس بلالیا اور راز و نیاز کی باتیں کیں اپنا دیدار بھی کرایا اور تحائف بھی عنایت فرمائے فرش پہ جبریلؑ کو بھیجا گیا جنت کی سواری بھی بھیجی گئی اور آمد کے لئے دعوت بھی دی گئی کالی کملی والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل امین کے ہمراہ براق پہ سوار ہو کر اللہ کے عرش پہ پہنچے۔

معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ قرآن کریم میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا ذکر دو مقامات پر آیا ہے، ایک سورۃ اسراء میں اور دوسرے سورۃ النجم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں

"پاک ہے وہ ذات، جو راتوں رات اپنے بندے کو لے گیا مسجد حرام
سے مسجد اقصیٰ تک جس کے ارد گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں، تا کہ ہم اپنے

بندے کو اپنی قدرت کے نمونے دکھائیں، وہی ہے سننے والا، دیکھنے والا"۔ (پارہ ۱۵ سورت اسراء، آیت ۱)

اس آیت مبارکہ کے شروع میں لفظ "سبحان" ذکر فرما کر اللہ تعالیٰ کی قدرت، عظمت اور الوہیت کا پرچار کیا گیا ہے۔ بقول علامہ ابن کثیرؒ کہ حق تعالیٰ نے لفظ "سبحان" ذکر کر کے اپنی بزرگی بیان کی، اپنی شان کی عظمت بیان کی اپنی قدرت کو بیان کیا جو اس کی ذات کے سوا کسی کے بس و اختیار میں نہیں ہے وہ ایسی سبحان اور پاک ذات ہے جس کے سوا نہ کوئی رب ہے اور نہ ہی کوئی معبود ہے۔

(۲) رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آسمانوں پر جانا اور لے جایا جانا عجیب و غریب تھا، جس براق (سواری) پہ سوار ہو کر گئے اس کی تیز رفتاری بھی عجیب تھی، اس لئے اس واقعہ کے شروع میں لفظ "سبحان" کا ذکر فرمایا تاکہ اس تمام واقعہ کی نسبت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف ہو، اشکالات اور اعتراضات کا دروازہ بند رہے اگر کھلے بھی تو ذات حق کی قدرت سامنے دیکھتے ہوئے، اعتراض کرنے والوں کو منہ کی کھانی پڑے۔

اسراء و معراج

قرآن حکیم کے پندرہویں پارہ کی ابتداء میں لفظ "اسریٰ" آیا ہے، اور احادیث میں لفظ "عروج" عین کی پیش کے ساتھ آیا ہے، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں، اصطلاح علماء میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کو اسراء کہتے ہیں، اور مسجد اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک کی سیر کو معراج کہتے ہیں، اور بسا اوقات اول سے آخر تک کی پوری سیر کو اسراء اور معراج کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں،، (سیرت مصطفیٰ ج ا ص ۲۷۵)

(۲) علامہ قطب الدین دہلوی لکھتے ہیں:

جاننا چاہئے کہ ایک تو "معراج" ہے اور ایک "اسراء" اسراء اس سفر کو کہتے ہیں جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شب میں مسجد حرام (بیت اللہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک کیا، اور مسجد اقصیٰ سے آسمان تک کے سفر کو معراج کہا جاتا ہے، اسراء نص قرآن سے ثابت ہے اور اس کا انکار کرنا دائرہ اسلام سے خارج ہونا ہے اور معراج مشہور و متواتر حدیثوں سے ثابت ہے اس کا انکار کرنے والا گمراہ اور بدعتی کہلاتا ہے (مظاہر حق ج ۵ ص ۴۲۱) یہی ترتیب شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے رسالہ المعراج فی القرآن میں قائم کی ہے۔

تاریخ معراج

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لئے طائف تشریف لے گئے طائف سے واپسی کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور پھر

مسجد اقصیٰ سے سات آسمانوں کی سیر کرائی جسم اور روح کے ساتھ بیداری کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرائی جانے والی اس سیر کو "معراج" کہا جاتا ہے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی واقعہ طائف ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی راتوں رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قدرت غیبی کے ساتھ مسجد حرام لے جایا گیا، وہاں سے مسجد اقصیٰ پہنچایا گیا، اس کے بعد ان مقامات قرب واختصاص، ساتوں آسمانوں کی سیر، اللہ تعالیٰ کی سیر اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے مشاہدے اور انبیاء کرام سے ملاقات کے وہ تمام واقعات پیش آئے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے"

"ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ (حد سے) آگے بڑھی انہوں نے اپنے پروردگار کی قدرت کی کتنی ہی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں (سورت النجم ۱۷۔۱۸)

"یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی ایک ضیافت وعزت افزائی تھی جو آپ کی دلداری ودل نوازی اور طائف کے ان زخموں کو مندمل کرنے اور اس توہین وناقدری اور بے گانگی وبے وفائی کی تلافی کے لیے تھی جس کے سخت امتحان سے آپ وہاں گزرے" (نبی رحمت ص ۱۸۹)

سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ۱۲ نبوی کو معراج کرائی گئی جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اکیاون ۵۱ سال آٹھ ماہ بیس روز ہو چکی تھی، نبوت کا بارہواں سال تھا رجب کا مہینہ تھا ستائیسویں رات تھی مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے تاریخ اسلام میں ایسے ہی لکھا ہے مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے سن ۱۳ نبوی کو متفقہ تاریخ سفر معراج قرار دیا ہے مولانا ادریس کاندھلوی نے دس اقوال پیش کئے ہیں ان میں راجح یہی بتایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے دسویں سال کے بعد کسی بھی سال سفر معراج پیش آیا۔

ابتداءواقعہ معراج:

واقعہ معراج کی ابتدا یوں ہوئی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی چچازاد بہن حضرت ام ہانی بنت ابو طالب کے گھر آرام فرمارہے تھے حضرت جبرئیل اللہ کے حکم سے بصد ادب حاضر ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پہ ہاتھ رکھ کر انہیں بیدار کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور ادھر ادھر دیکھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی نظر نہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور سو گئے دوبارہ جبرئیل نے بیدار کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھ کھولی مگر کسی کو وہاں موجود نہ پایا پھر سو گئے تیسری بار حضرت جبرئیل نے پھر بیدار کیا اور آپ کو لے کر حطیم میں

آ گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک چاک کیا گیا، (تاریخ اسلام میرٹھی)

سیرت النبی ابن ہشام میں یوں لکھا ہے

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں حجر اسود کے پاس سو رہا تھا کہ یکایک جبرئیل نے آ کر مجھے بیدار کیا میں اٹھا کسی کو نہ دیکھ کر میں پھر سو گیا انہوں نے پھر جگایا میں اٹھا پھر لیٹ گیا تیسری بار انہوں نے میرا بازو پکڑ کر مجھے بیدار کیا اور اٹھایا اور کھڑا کیا میں جبرئیل کے ساتھ دروازے پہ آیا وہاں دیکھا کہ سفید رنگ کی سواری کھڑی ہے جس کا قد خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا اس کے دو پر بھی تھے اپنے پروں کو اس نے اپنے قدموں پر جھکار کھا تھا وہ سواری اپنا ہر قدم وہاں رکھتی تھی جہاں تک اس کی نگاہ پہنچتی تھی جبرئیل نے مجھے اس پہ بٹھایا وہ میرے ہمرکاب ہوئے اور ذرا بھر مجھ سے جدا نہ ہوئے" (سیرت النبی ابن ہشام ج ۱)

قاضی سلمان منصور پوری لکھتے ہیں:

"نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں حطیم میں لیٹا ہوا تھا (قتادہ نے لفظ "حطیم" کی جگہ کہیں لفظ "حجر" بھی استعمال کیا ہے، دونوں نام ایک ہی مقام کے ہیں، (یعنی خانہ کعبہ کی اندر کی وہ زمین جسے قریش نے باہر چھوڑ دیا تھا) جب آنے والا (جبرائیل) میرے پاس آیا، اس نے اپنے ساتھی (میکائیل) سے کہا کہ ان تین میں سے درمیان والے نبی ﷺ ہیں، پھر وہ میرے پاس آیا، سینہ سے لے کر زیر ناف تک میرا جسم شق کیا، پھر سونے کا طشت لایا گیا، جو ایمان و حکمت سے پر تھا، میرے قلب کو دھویا اور ایمان و حکمت سے بھر دیا، پھر زخم درست کر دیا، پھر میرے لئے سواری لائی گئی، جس کا قد خچر سے کم اور حمار سے اونچا تھا، اس کا قدم اس کی حد بصر تک پڑتا تھا، مجھے سوار کیا گیا، جبرئیل میرے ساتھ ساتھ چلا، آسمانِ دنیا تک مجھے لے کر پہنچ گیا" (رحمت للعالمین ج ۳ ص ۱۵۴)

ام ہانیؓ کے گھر

ایک رات نبی اکرم ﷺ حضرت ام ہانیؓ کے دولت کدہ پہ آرام فرما تھے، نیم خوابی کی حالت تھی، اچانک چھت پھٹی، چھت کے راستے جبرئیل اندر داخل ہوئے، حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ہمراہ اور بھی فرشتے تھے، آپ ﷺ کو بیدار کیا، اور مسجد حرام کی طرف لے گئے، رحمت دو عالم ﷺ وہاں حطیم میں جا کر لیٹ گئے اور سو گئے، جبرئیل و میکائیل نے آپ ﷺ کو پھر بیدار کیا، اور زمزم کے کنوئیں پر لے گئے، وہاں آپ ﷺ کا سینہ چاک کیا گیا، آپ کا دل نکال کر زمزم کے پانی سے دھویا گیا، ایک سونے کا طشت لایا گیا، جو ایمان و حکمت سے بھرا ہوا تھا، اس ایمان و حکمت کو آپ

کے دل میں رکھ کر سینہ سی دیا گیا، آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان نبوت کی مہر لگائی گئی، اس کے بعد ایک جنتی سواری (براق) لائی گئی، آپ ﷺ اس پر سوار کیے گئے، آپؐ کے سوار ہوتے ہی وہ جنتی جانور حرکت کرنے لگا، جبرئیل نے پوچھا: یہ کیسی شوخی ہے، تیری پشت پر حضرت محمدؐ سے معظم ومکرم بندہ آج تک سوار نہیں ہوا، براق شرم کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہو گیا، سوری آپؐ کو لے کر چل پڑی۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے خصائص کبری مین لکھا کہ:

"سواری پر رسول اکرم کو سوار کرنے کے بعد جبرئیل امین آپ ﷺ کے پیچھے سواری پہ سوار ہو گئے"۔

براق کا سفر

رحمت للعالمین ﷺ کی سواری مسجد حرام سے ہوتی ہوئی یثرب اور پھر بیت المقدس پہنچی، دوران سفر آپ ﷺ نخلستانوں کی زمین پر سے گذرے جبرئیل علیہ السلام نے آگاہ کیا کہ یہ وادی یثرب ہے (اس کا نام بعد میں مدینہ رکھا گیا) آپ ﷺ نے یہاں اتر کر نماز ادا کی اس کے بعد وادی سینا میں پہنچے۔ جہاں شجر موسیٰ علیہ السلام کے قریب نماز ادا کی۔ جبرئیل علیہ السلام نے آگاہ فرمایا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو فرمائی۔ پھر حضرت ﷺ کا گذر مدینہ شہر سے ہوا، آپ ﷺ نے یہاں بھی نماز ادا کی۔ پھر آپ ﷺ کا گذر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے ولادت بیت اللحم سے ہوا ان تمام مقامات پر آپ ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کے کہنے پر نماز ادا کی، اور سفر طے کیا (خلاصہ از سیرت مصطفیٰ ج ۱)

مولانا عاشق الٰہی مرحوم لکھتے ہیں۔

"آپؐ اس براق پہ سوار ہوئے اور مسجد حرام سے یثرب کے وہ نخلستان قطع کرتے ہوئے جہاں پر چند روز بعد ہجرت کرنی تھی۔ اور طور سینا پر گزرتے ہوئے جس پر موسیٰ نے اللہ پاک سے باتیں کی تھیں ..... اور بیت الحم دیکھتے ہوئے جہاں عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تھے اور دو ۲ دو ۲ رکعت ان متبرک مقامات پر ادا کرتے بیت المقدس پہنچے؛ جہاں حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک سارے انبیاءؑ آپ ﷺ کے منتظر اور نماز میں آپ کا اقتداء کرنے کے متمنی تھے، آپ ﷺ کا خوش قسمت براق اس دروازہ کے حلقہ سے باندھا گیا جو اب باب محمد ﷺ کے نام سے مشہور ہے، اور اس کے بعد سیدنا محمد ﷺ نے اس مسجد اقصیٰ میں جس کو ہر طرف سے اللہ کی برکتیں گھیرے ہوئے ہیں ابتداءً تحیۃ

سیڑھی تھی، جس پر حضرت آدمؑ کی اولاد کی روحیں مرنے کے بعد آسمانوں کی طرف چڑھتی ہیں او، بوقت موت نظر اٹھاکراسی سیڑھی کو دیکھتی ہے حضرت جبرئیل نے آپ کو اس سیڑھی پرسوار کیا، آپ ﷺ آسمان کے ''باب الحفظ ''تک فرشتوں کے ہمراہ پہنچ گئے۔

یہاں ایک سوال ابھرتا ہے، کہ رسول اکرم ﷺ جس براق پر مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک پہنچے تھے وہ کہاں چلی گئی تھی؟ اس کے جواب میں اتنا عرض ہے، جو مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے لکھا کہ ''براق مسجد اقصیٰ کے دروازے پہ ہی بندھا رہا آپ سیڑھی کے ذریعے اوپر تشریف لے گئے'' علامہ قطب الدین مظاہر حق، میں لکھتے ہیں ''آنحضرتؐ براق کی سواری ہی کے ذریعہ آسمان میں داخل ہوئے'' (ج۵ص۴۲۸)

ملاّ علی قاریؒ نے لکھا کہ

''مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک براق پہ سوار ہو کر گئے، وہاں براق کو حلقہ کے ساتھ باندھ دیا گیا، وہاں سے آگے سیڑھی کے ذریعہ آسمانوں پر گئے'' (بحوالہ ایضاً) بعض علماء کرام نے ان دونوں روایتوں میں یوں ربط پیدا کیا ہے کہ ممکن ہے، سیڑھی پر سوار ہو کر براق پہ آسمانوں کی طرف گئے ہوں'' (اللہ خوب خوب جانتا ہے)

علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں

''آسمانوں کی سیر کر کے آپؐ بیت المقدس میں اترے، وہاں سے براق پہ بیٹھ کر پھر مکہ آئے'' (البدایہ ج۳)

پہلا آسمان

حضرت جبرئیلؑ کے ہمراہ آپ پہلے آسمان پہ پہنچے، آپؐ کے لئے آسمان کا دروازہ کھولا گیا، آسمان کے دربان نے آپ کا استقبال کیا اور مرحبا، کہا آسمان میں داخل ہونے کے بعد حضرت آدمؑ سے سلام کیا، حضرت آدمؑ نے اس فرزند صالح اور نیک نبی کو مرحبا کہا حضرت آدمؑ نے آپؐ کے لئے دعاء خیر کی۔ آپ ﷺ نے حضرت آدمؑ کی دائیں اور بائیں جانب کچھ صورتیں دیکھیں، حضرت آدمؑ دائیں طرف دیکھتے تو خوش ہوتے اور ہنستے تھے، اور جب بائیں طرف نظر اٹھاتے تھے تو ناخوش ہوئے اور روتے تھے، جبرئیل نے عرض کیا، دائیں طرف ان کی نیک اولاد کی صورتیں ہیں جو جنت والے ہیں، اور بائیں طرف ان کی بری اور گنہ گار اولاد کی صورتیں ہیں، یہ دوزخ والے ہیں (بخاری و مسلم) حضرت آدمؑ کی دائیں طرف ایک دروازہ تھا، جس سے بہت عمدہ خوشبو آرہی تھی، جب دائیں طرف دیکھتے تو خوش ہو جاتے تھے، اور بائیں طرف دیکھتے تو پریشان ہو جاتے تھے۔ (زرقانی ج۶ص۶۰ بحوالہ سیرت مصطفیٰ ج۱)

دوسرا آسمان

دوسرے آسمان پہ پہنچے، یہاں آپ ﷺ نے حضرت یحیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کی، جو دونوں خالہ زاد بھائی تھے، ان دونوں نے برادر صالح اور نیک نبی کو مرحبا کہا۔

تیسرا آسمان

تیسرے آسمان پہ پہنچے، آسمان کا دروازہ کھولا گیا، اندر داخل ہوئے، دربان نے مرحبا کہا، اس آسمان پہ پیکر حسن و جمال حضرت سیدنا یوسفؑ سے سلام و ملاقات ہوئی، انہوں نے بھی برادر صالح اور نیک نبیؐ کو مرحبا کہا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یوسفؑ کو حسن و جمال کا بہت بڑا حصہ عطاء کیا گیا ہے۔

چوتھا آسمان

چوتھے آسمان پہ تشریف لے گئے۔ دروازہ کھولا گیا، دربان نے مسرت و شادمانی کا اظہار کرتے ہوئے مرحبا مرحبا کہا، وہاں حضرت سیدنا ادریسؑ سے ملاقات و سلام کیا، انہوں نے بھی برادر صالح اور نبی صالح کو مرحبا کہا۔

پانچواں آسمان

پانچویں آسمان پہ پہنچے، دروازہ کھولا گیا، آسمان پنجم کے دربان نے استقبال کیا اور مرحبا کہا، یہاں آپؐ نے حضرت ہارونؑ سے ملاقات کی، آپؑ حضرت موسیٰؑ کے بھائی تھے، آپؑ نے نبی اکرم ﷺ کو مرحبا کہا۔

چھٹا آسمان

چھٹے آسمان پہ پہنچے، دروازہ کھولا گیا، آسمان ششم کے دربان نے استقبال کیا اور مرحبا کہا، اس آسمان پر کلیم خدا حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے آپ ﷺ کی آمد پر خوشی و شادمانی میں مرحبا کہا۔ جب نبی علیہ السلام آگے کی سمت قدم بڑھانے لگے تو موسیٰؑ رونے لگے، ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ کیوں روئے، فرمایا: یہ نوجوان میرے بعد نبی ہوا، اس کی امت کے لوگ میری امت سے بہت زیادہ تعداد میں داخل جنت ہوں گے (رحمت للعالمین ج ۳ ص ۱۵۵)

ساتواں آسمان

ساتویں آسمان پہ پہنچے، دروازہ کھولا گیا، دربان نے مرحبا کہا، حضرت نبی اکرم ﷺ نے اپنے جدّ امجد حضرت سیدنا ابراھیمؑ سے ملاقات کی، حضرت ابراھیمؑ فرشتوں کے کعبہ بیت معمور کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے، نبی اکرم ﷺ کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا ابن صالح اور نبی صالح کو مرحبا کہا۔

سدرۃ

ساتوں آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے آپ اوپر پہنچے، اس مقام کو "سدرۃ المنتہیٰ" کہا جاتا ہے

"سدرۃ" سین کی زیر کے ساتھ عربی زبان میں، بیری کے درخت کو کہا جاتا ہے، ساتویں آسمانوں اوپر ایک بیری کا درخت ہے جو چیز نیچے سے اوپر جاتی ہے، یہاں آکر کھڑی ہو جاتی ہے، پھر اوپر لیجایا جاتاہے اور جو چیز ملاء اعلیٰ سے اترتی ہے وہ یہاں پہنچ کر کھڑی ہو جاتی ہے پھر اترتی ہے، اس لئے اس کو "منتہیٰ" کہا جاتا ہے، نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

"مجھے سدرۃ المنتہیٰ تک اٹھا گیا، اس کا پھل بڑے مٹکوں جیسا اور اس کے پتے ہاتھی کان جیسے بڑے ہیں، جبرئیل نے بتایا کہ سدرۃ المنتہیٰ یہی ہے، وہاں چار نہریں دیکھیں، دو اندر تھیں، دو کھلم کھلا، جبرئیل نے بتایا کہ اندر اندر چلنے والے دریا تو بہشت کے دریا ہیں اور کھلے والے نیل و فرات" (رحمت للعالمین ج ۳)

بیت معمور

ساتویں آسمان کے اوپر فرشتوں کا کعبہ ہے، جس کو "بیت معمور" کہا جاتا ہے :یہ آ- ہفتم پر بالکل بیت اللہ شریف کے برابر ہے، حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے مطابق ستر ہزار فر- اس کا روزانہ طواف کرتے ہیں، اور جو فرشتہ ایک بار طواف کر لیتا ہے پھر دوبارہ اس کی کبھی باری نہ آتی، نبی اکرم ﷺ نے بیت معمور کو بھی دیکھا، اور وہاں نماز پڑھی۔

جنت

قرآن حکیم کی سورت النجم میں ارشاد ربانی ہے

"سدرہ کے پاس ہے جنت ماوی"

ایک روایت جو حضرت ابوسعید خدریؓ سے ہے، اس کے مطابق حضرت نبی اکرم ﷺ بیت معمور میں نماز پڑھنے کے بعد سدرۃ المنتہیٰ کی طرف اٹھائے گئے، اس کے بعد جنت کی طرف لے جائے گئے، آپ ﷺ نے جنت کی سیر کی آپ ﷺ نے جنت کے موتیوں والے گنبد دیکھے آپ ﷺ نے جنت کی مٹی کو خوشبو والی بتایا (ابن حجر فتح الباری)

مقام صریف الاقلام

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں :

"بعد ازاں پھر آپ کو عروج ہوا اور ایسے بلند مقام پر پہنچے کہ جہاں صریف الاقلام کو سنتے تھے، لکھنے کے وقت قلم کی جو آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس کو صریف الاقلام کہتے ہیں اس مقام پر قضاء و قدر کے قلم مشغول کتابت تھے، ملائکۃ اللہ امور الٰہیہ کی کتاب اور احکام خداوندی کو لوح محفوظ سے نقل کر رہے تھے، (زرقانی بحوالہ سیرت مصطفیٰ ج ۱ ص ۲۸۷)

مولانا کاندھلوی رقم طراز ہیں :

"احادیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام صریف الاقلام، سدرۃ المنتہیٰ کے بعد ہے"(ایضاً)

دیدار خداوندی

حضرت نبی اکرم ﷺ مقام صریف الاقلام سے چل کر بارگاہ خداوند قدوس میں پہنچے جہاں آپ نے اپنے پروردگار کا دیدار کیا، سید احمد زینیؒ سیرت حلبیہ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں :

"اس رات آپ ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا" (سیرت حلبیہ ج۱ص۲۹۱)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں :

"حضرت محمدؐ ﷺ کس سواری کے لئے معراج کی رات میں ایک رفرف اتری، آپ ﷺ اس پر بیٹھ گئے پھر آپ ﷺ بلند کیئے گئے یہاں تک کہ اپنے پروردگار کے قریب پہنچ گئے" (نسیم الریاض بحوالہ سیرت مصطفیٰ)

حضرت انس ابن مالکؓ کی روایت ہے فرمایا :

"میرے لئے آسمان کا ایک دروازہ کھولا گیا۔ اور میں نے نور اعظم کو دیکھا۔ اور پھر اللہ نے جو کلام کرنا چاہا وہ مجھ سے کلام فرمایا" (خصائص کبریٰ سیوطیؒ بحوالہ سیرت مصطفیٰ ج۱)

مولانا ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں :

"امام طبرانی اور حکیم ترمذی نے حضرت انسؓ سے روایت کیا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ میں نے نور الٰہی کو دیکھا پھر اللہ نے میری طرف وحی بھیجی جو چاہی، یعنی مجھ سے بے واسطہ کلام فرمایا، (سیرت مصطفیٰ ج۱ص۲۹۰)

مولانا کاندھلویؒ مزید لکھتے ہیں :

ابن عباسؓ کی روایت سے دنا فتدلیٰ اور فاوحیٰ الیٰ عبدہ ما اوحیٰ کی تفسیر بھی ہو جاتی ہے کہ آیت میں "دنو" اور "تدلی" سے حق جل شانہ کا ایسا قرب خاص اور تام مراد ہے کہ جس کے ساتھ دیدار پر انوار اور مسرت التیام بھی ہوا، اور فاوحیٰ الیٰ عبدہ ما اوحیٰ سے بلاواسطہ مکالمہ خداوندی اور بلا واسطہ کلام اور وحی مراد ہے، اس لئے کہ دیدار کے بعد بالواسطہ کلام کے کیا معنی؟ دیدار بلاواسطہ کے بعد کلام بلاواسطہ کا ذکر مناسب اور موزوں ہے" (سیرت مصطفیٰ ج۱ص۲۹۰) ان روایات و بیانات سے اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں رہا کہ حضرت نبی اکرم ﷺ کو معراج کی رات اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوا۔

تحائف وعطایا :

سفر معراج میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تحائف وعنایات سے سرفراز فرمایا، ان میں

سب سے اہم اور بڑا تحفہ نماز کا ہے، کہ اس رات حضرت محمد ﷺ کی امت پر ایک دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جن کی ادائیگی پر پچاس نمازوں کا اجر و ثواب ملے گا۔

(۲) اس رات کی ملاقات میں آپ ﷺ کو سورت بقرہ کی آخری آیات عطاء کی گئیں۔

(۳) آپ ﷺ کی امت کے وہ لوگ جو اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے، اللہ تعالیٰ ان کے بڑے بڑے گناہ معاف فرمادے گا۔

(۴) آپ ﷺ کو دیدار خداوندی کا عظیم شرف ملا۔

مشاہدات :

معراج کی رات آپ ﷺ کے مشاہدات کا ذکر تاریخ و سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے کہ

(۱) اس رات آپ ﷺ نے موسیٰ کو اپنی قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔

(۲) معراج کی رات آپ ﷺ نے موسیٰ، دجال، اور جہنم کے داروغے کو دیکھا جس کا نام مالک تھا۔

(۳) آپؐ نے ایسی قوم کو دیکھا، جس کے ناخن تانبے کے تھے، وہ اپنے چہروں اور سینوں کو چھلنی کر رہے تھے، یہ غیبت کرنے والے لوگ تھے

(۴) آپ ﷺ نے سود خوروں کو دیکھا کہ وہ نہر میں تیر رہے ہیں اور پتھروں کے لقمے بنا بنا کر کھا رہے ہیں

(۵) فرض نماز میں سستی کرنے والوں کو دیکھا کہ ان کے سروں کو کچلا جارہا تھا، پھر ان کے سر درست ہو جائے تھے پھر ان کو دوبارہ کچلا جاتا تھا۔

(۶) آپ ﷺ نے ان لوگوں کو دیکھا جو زکوۃ ادا نہیں کرتے تھے کہ ان کی شرم گاہ پر آگے اور پیچھے چیتھڑے لپٹے ہوئے ہیں، اور اونٹ و بیل کی طرح چرتے ہیں، جہنم کے کانٹے اور پتھر کھا رہے ہیں۔

(۷) آپؐ نے اپنی امت کے بے عمل واعظوں اور خطیبوں کو دیکھا کہ ان کی زبانیں قینچی سے کاٹی جارہی تھیں، پھر اتنی ہی ہو جاتی تھیں، پھر بار بار کاٹی جاتی تھیں۔ (سیرت مصطفیٰ ج ا ص ۲۷۹/۲۷)

واقعہ معراج سے متعلق بہت سے واقعات، تفصیلات، دشمنان اسلام کی طرف سے پھیلائے گئے شکوک و شبہات کا یہاں ذکر نہیں کیا جاسکا، انشاء اللہ کسی دوسرے مضمون میں اس موضوع پر بھی تفصیلا لکھا جائے گا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عظمت شان

پروفیسر بدرالدین الحافظ

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ سے کسی نے سوال کیا یارسول اللہ کون لوگ آپ کے نزدیک زیادہ محبوب ہیں آپ ﷺ نے فرمایا عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، لوگوں نے کہا ہم تو مردوں کے بارے میں سوال کررہے ہیں آپ نے فرمایا اس کے والد (ابوبکر رضی اللہ عنہ) اور حضور ﷺ اس جملہ میں کہنا چاہتے تھے کہ میرے نزدیک کوئی بھی اتنا بڑا معاون ومددگار نہیں ہے جیسے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، کیونکہ انہوں نے میری غمخواری کی اپنی جان سے اپنے مال سے اور اپنی بیٹی سے میرا نکاح کردیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی فرماتے تھے کہ ہم سب میں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کے نزدیک سب سے بڑے سب سے بہتر سب سے محبوب تھے۔ اور اس سلسلہ میں اقوال چاہے مکمل تائید نہ بھی کریں احوال اس کی مکمل شہادت دیں گے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر حال میں حضور ﷺ کے معتمد علیہ تھے چاہے عام مسلمانوں کے حالات ہوں یا انفرادی معاملہ حضور ﷺ آپ پر بھروسہ فرماتے اور ہر مشورہ میں شریک رکھتے کیونکہ جو شخص محبت میں قابل اعتماد ہوتا ہے وہی قابل ترجیح بھی ہوتا ہے اور پھر حضور ﷺ کی محبت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی مالی منفعت کا پرتو نہ تھی بلکہ محض ان کی عظمت اور خلوص اس کا پیمانہ تھا۔

آنحضرت ﷺ نے جب ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امامت کے لئے آگے بڑھایا تھا تو وہاں صرف ان کا اخلاص ہی کارفرما نہ تھا بلکہ حضور ﷺ کا ان پر اعتماد اور انکی مخلصانہ دعوت کے علاوہ مسلمانوں کا بھی ان پر بھرپور اعتماد اس کا سبب تھا۔ اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنحضرت ﷺ سے محبت کا سبب ان کا کمال ایمان وایقان اور حضور ﷺ کی شخصیت سے بے پناہ متأثر ہونا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب محبت ہوگئی تو پھر اپنا مال اور جان سب اس محبوب کے حوالہ کردیا۔

بس یہی مخلصانہ اعتماد اور بھرپور ایمان نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد بھی صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیات اور خلافت میں جاری وساری رہا اس میں ذرہ برابر فرق نہ آیا جیسا کہ ان کا ہر عمل اور قول اس کا گواہ ہے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وراثت کا معاملہ:

اب رہا معترضین کا یہ اعتراض کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ کو ان کے والد کی وراثت سے محروم کیا تو یہ سب کچھ حق و صداقت کی بنیاد پر تھا کیونکہ انبیاء کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا، اس لئے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی طرح سے بخل نہیں کیا کہ حضور ﷺ کے مال سے ان کے وارثین کو محروم کریں کیونکہ خود ان کی صاحبزادی کا معاملہ بھی سامنے ہے جو ان کی محبوب ترین بیٹی تھیں اس لئے یہاں صرف دین و شریعت اور خود حضور ﷺ کی وصیت ملحوظ رہی اس کے سوا کچھ نہیں۔

اس کے بعد یہ کہنا بھی غلط ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حق خلافت سے محروم کیا وہ اس کے حقدار تھے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ انتقال کے وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے والد کے پاس موجود نہیں تھیں اس لئے حضور ﷺ نے جو کچھ خلافت کے لئے فرمایا وہ چھپا لیا گیا کیا صدیق اکبرؓ کے لئے یہ ممکن تھا کہ حضور ﷺ ان کو اس سلسلہ میں وصیت فرمائیں یا اشارہ کریں اور آپ اس پر عمل نہ کریں، حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے مزاج حق شناسی اور صداقت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا ہی غلط ہے اور پھر اس پر کوئی مضبوط دلیل بھی نہیں ہے، نہ قرآن و حدیث اس پر شاہد ہیں۔ ہاں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس طرح بغیر حیلہ و تدبیر اور ظلم یا جنگ و جدال کے خلافت کو حاصل کیا وہ اس پر شاہد ہے کہ آپ اس کے مستحق تھے اور اس لئے بھی کہ عام مسلمانوں نے ان کو پسند فرمایا۔ اور پھر آپ نے اپنے دور خلافت میں منکرین زکوٰۃ اور ارتداد کے مسائل، سرحدی معاملات کو جس طرح حل کیا وہ خود اس پر دلیل ہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس منصب کے مستحق تھے اور انہوں نے کسی کا حق نہیں چھینا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بیعت کا معاملہ:

آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت یا اس کے بعد جو حادثہ رونما ہوا یہ تاریخ اسلام کا پہلا [و]اقعہ تھا اس سے قبل ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا اور خلافت کے انتخاب میں جو کچھ ہوا وہ بھی ایک نیا ہی [حا]دثہ تھا نہ پہلے سے کسی نے اس کو سوچا تھا نہ ایسا خیال تھا، اس لئے حضرت علیؓ کا صدیق اکبر رضی اللہ [تع]الیٰ عنہ کی بیعت سے توقف کرنا کوئی حیرت انگیز نہیں تھا پھر اس تاخیر کے لئے بھی بعض لوگ [چھ]ماہ کہتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ تاخیر صرف چند گھنٹوں ہی کی تھی تو اس مسئلہ میں نہ حضرت علی [ر]ضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اور نہ ہی صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قصوروار ٹھہرایا جا سکتا ہے چاہے یہ مدت

کم ہو یا زیادہ ہو، کیونکہ آگے کے حالات اس اختلاف کی کوئی شہادت نہیں دیتے۔ اس لئے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بغیر کسی تأمل کے حضرت علیؓ کو بہت سے امور کا ذمہ دار بنایا، مدینہ منورہ کی حفاظت کی ذمہ داری آپ کے سپرد کی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے بغیر کسی تکلف کے قبول کیا یہ ان کی صدق دلی اور بزرگی کی ایک علامت ہے۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے فرمان کو چھپایا اور انہیں محروم کیا تو بتایئے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسے کیسے بھول جاتے اور جان و دل سے ان کی فرمانبرداری کیسے کرتے اس لئے بعض ہوس رکھنے والوں کا یہ کہنا کہ قرآن کی کچھ آیات یا احادیث چھپالی گئی ہیں غلط ہے۔

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا مسئلہ:

یہاں مسئلہ یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا گیا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پھر مؤخر کر دیا۔ تو یہاں ان حالات کے پیش نظر کسی موازنہ اور مقابلہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ یہاں ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے استخلاف کے مسئلہ میں خود کوشش کی اور اپنی رائے متعین کر دی لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اس معاملہ پر غور کرنے کے لئے چند چنیدہ لوگوں کو دعوت دی اور عام مسلمانوں سے فرمایا "آج اللہ نے تمہارے ایمان کو میری بیعت سے آزاد کر دیا اور اس نے تم سے میری گرہ کو کھول دیا (یعنی بیعت کا عہد و پیمان ختم ہو گیا) اور تمہارا معاملہ تمہیں لوٹا دیا گیا اب تم باہم مشورہ کر لو جس کو تم پسند کرو۔ لہذا میری زندگی میں فیصلہ کر لو تو زیادہ مناسب ہے کہ میرے بعد اختلاف میں نہ پڑو" حضرت حسن بصری کی روایت کے مطابق معاملہ زیادہ دیر نہیں رکا اور لوگ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے: "ان الرای یا خلیفة رسول الله رائیك" (۱) یا خلیفہ رسول اللہ رائے تو آپ ہی کی ہے، حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ذرا ان کو مہلت دی اور اللہ کی بارگاہ میں اس کے دین کے لئے اس کے بندوں کے لئے سوچنے لگے پھر چند اصحاب سے مشورہ کیا جس میں عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت اُسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شامل تھے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا فیصلہ فرمایا، اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا۔ انہوں نے فرمایا اگر آپ کی رائے کے مطابق اس منصب کے لئے عمرؓ ٹھیک ہیں۔ کیونکہ وہ آپ کے رفیق اور مساعد تھے تو میں

ں یہی رائے رکھتا ہوں لہذا آپ جو مناسب سمجھ رہے ہیں کریں اور کسی آدمی کو مخاطب کرنا چھوڑ
ں اور اگر اللہ کی مشیت یہی ہے جو آپ سوچ رہے ہیں تو میں بھی اس کے ساتھ ہوں، اور جس بات
آپ نہیں سوچ رہے ہیں تو اس میں کوئی خیر نہیں ہے، اس کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
ے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عہد نامہ لکھوایا۔ انہوں نے لکھا۔ مہر لگائی اور باہر نکل کر
وں سے پکار کر کہا۔ کیا تم لوگ اس مکتوب کی تحریر پر بیعت کرتے ہو، اور کہا جاتا ہے کہ صدیق اکبر
ضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اپنی آرامگاہ سے جھانک کر فرمایا۔ اے لوگوں: میں نے جو عہد نامہ تیار کیا
ہے، کیا تم اس سے راضی ہو، لوگوں نے کہا اے خلیفہ رسول اللہ ہم راضی ہیں اور ان میں حضرت علی
ضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھڑے ہو کر فرمایا ہم عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ کسی پر راضی نہ ہوں گے
ں کے بعد عام بیعت ہوئی اور تمام مسلمانوں نے اس بیعت پر اتفاق کیا۔

اس کے بعد ان دو اختلافی مسائل یعنی خلافت اور وراثت کے بارے میں ہم پھر وہی کہیں
ے کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ نے وراثت انبیاء کی فیصلہ کن وصیت اور مسلمانوں کی وحدت، اتحاد
تفاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو کچھ کیا وہ حق و صداقت کے عین مطابق تھا، باقی تمام صحابہ کرام سے
دیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعلق باہم رحم و کرم، اکرام و تعظیم اور حق و صداقت کے مطابق چلتا
اصدیق اکبر رضی تعالیٰ عنہ کے سب سے زیادہ قریب فاروق اعظمؓ ہی تھے اور آپ نے ان کا ایمانی
ملب اور معاملہ فہمی کو جتنا باریکی سے سمجھا تھا دوسرے صحابہ کرام اس قدر اس سے واقف نہ تھے۔
ں سلسلہ میں جب صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ
نہ سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا ٹھیک ہیں مگر ان میں
رے سختی ہے اس پر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہاں اس لئے کہ وہ مجھے معاملات میں نرم
تے ہیں لیکن اگر کوئی معاملہ ان کے سپرد کر دیا جائے تو اس کے خلاف ہوگا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ
الیٰ عنہ نے چند مخصوص صحابہ کرام کو اپنے قریب مدینہ منورہ میں رکھنے کو ترجیح دی اور دور دراز
اقوں میں بھیجنا پسند نہ کیا کیونکہ وہ امور خلافت میں اچھے مشیر کار اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ جب
ن سے سوال کیا گیا کہ اہل بدر کو آپ والی بنا کر دوسرے مقامات پر بھیجیں تو آپ نے فرمایا میں انہیں
نیا کے مال و متاع میں ملوث کرنا پسند نہیں کرتا نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ دنیاوی فتنوں میں مبتلا ہوں اس
عاملہ میں تحقیق کے ساتھ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ صاحبین میں سب سے پہلے کس کو یہ خیال آیا مگر
ہر حال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی شدت سے اس کی پابندی کی اور کبارِ صحابہ کو دور نہیں
یجا۔ اسی لئے یہ ممکن ہے کہ کبارِ صحابہ کو دور نہ رکھنے کا خیال، آپ ہی کا ہوگا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا
ہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس اصول کی مخالفت کرتے تو فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ

انہیں اس طرف واپس لے آتے، چنانچہ جب حضرت معاذ بن جبلؓ شام کی طرف جانے لگے تو محسوس ہوا کہ اب مدینہ منورہ ایک فقیہ سے خالی ہوگیا ہے اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کو روکنے کے لئے کہا کہ لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے انہیں مدینہ میں رکھئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جب ایک شخص شہادت حاصل کرنے کی نیت سے جہاد میں جانا چاہتا ہے تو میں اسے کیوں روکوں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا خدا کی قسم اگر اس شخص کی قسمت میں شہادت لکھی ہے تو بستر پر بھی آسکتی ہے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ انتہائی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے اس سلسلہ میں انکی وہ وصیت جو انہوں نے فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منصب خلافت پر نامزدگی کے وقت فرمائی تھی آب زر سے لکھنے کے لائق ہے فرماتے ہیں :

دیکھو بعض لوگ ایسے ہیں جو صرف اپنے نفس کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں کہ جب کوئی انھیں راہ حق سے بچلانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں دیکھو تم ان سے بچتے رہنا اور یہ بھی سمجھ لو کہ یہ لوگ اس وقت تک تم سے خائف رہیں گے جب تک تم اللہ سے ڈرتے رہو گے میں نے تمہارے معاملات میں ہر اس شخص کو بہتر منصب عطا کیا جو میرے نزدیک اچھا تھا لیکن تم میں سے ہر شخص کی ناک چڑھ گئی کیونکہ وہ منصب اسکی آرزو سے کم درجہ کا تھا، تم نے اصل میں یہ دیکھا کہ دنیا اُمڈ آئی حالانکہ دنیا ابھی نہیں آئی وہ تو اس وقت آئیگی جب تمہارے ہاں ریشمین چلمنیں اور دیباج کے تکئے لگے ہوں گے۔ اور جب تم لوگ آذر بیجان کے بنے ہوئے اونی گدوں پر بھی تکلیف محسوس کروگے جیسے کسی خاردار پودے پر سونے میں تکلیف کا احساس ہوتا ہے لیکن خدا کی قسم اگر تم میں کوئی شخص آئے اور بغیر کسی جرم کے تلوار سے اپنی گردن کاٹ لے وہ زیادہ اچھا ہوگا دنیا کے عشق میں مبتلا ہونے سے ذرا غور فرمائے یہ اس شخص کی قیمتی نصائح ہیں جس کے سامنے ایک طرف موت کھڑی ہے اور دوسری طرف صالح زندگی کے تجربات ہیں جبکہ وہ تمام عمر انہی تجربات اور عادات وخصائل کے درمیان رواں دواں رہا، اور یہ ہمت وجرأت اور حوصلہ اسے کہاں سے حاصل ہوا، یہ اسی ذات گرامی کی جلوہ گری تھی جس کی ایک نظر نے انھیں کندن بنادیا تھا اور قوت فیصلہ ہمت وحوصلہ کی تلوار ہاتھ میں دیدی تھی کہ سخت سے سخت مواقع پر ذرا نہ ڈگمگائے غور کیجئے رسول اکرمؐ کی وفات فاروق اعظمؓ کا فرط غم سے تحیر کا عالم اور وارفتگی اور صدیق اکبرؓ کی بروقت تقریر حالانکہ اس وقت تک تو حضرت ابو بکرؓ خلیفہ بھی نہ بنے تھے، تو آخر وہ کونسی قوت تھی جو انہیں استقلال واستقامت کا پہاڑ بناگئی؟

درحقیقت صبروعزیمت کی یہ دولت انکے اسی اخلاص ومحبت کی دین تھی جو انہیں ان کے مدنی فداں روحی وابی وامی سے تھی۔

ظلمت کدۂ ہند میں نجم ہدایت کی روشنی

(یعنی ہندستان آنے والے پہلے صحابیؓ)

از: محمد خالد حسین نیموی القاسمی معین مدرس دارالعلوم دیوبند

عرب اور ہندستان کے درمیان قدیم زمانے سے گہرے خوشگوار روابط اور وسیع تجارتی تعلقات تھے، ہند کی سرزمین اپنی خوبصورتی، رنگارنگ خوشنما قدرتی مناظر اور رعنائیوں کی وجہ سے عربوں کے لئے باعث کشش بنی ہوئی تھی اور یہاں کی بہت ساری چیزیں عرب میں بنظر مقبولیت دیکھی جاتی تھیں؛ اسی طرح عرب کی متعدد چیزیں ہندستان مین پسند کی جاتی تھیں۔ ہندستانی تاجروں کی ایک خاصی تعداد عرب ممالک میں قیام پذیر تھی اور عرب تجار بھی کثرت سے سیلون، مالدیپ، مالابار اور سندھ سے لے کر گجرات تک بحر ہند کے پورے سواحل پر پھیلے ہوئے تھے۔

یہاں تک کہ جب اسلام کا آفتاب عالمتاب آسمان دنیا پر جلوہ افروز ہوا اور اس کی ضیاپاش کرنیں رفتہ رفتہ پورے عالم کو منور کرنے لگیں، تو ہندستان بھی اس آفتاب ہدایت کی ضیاپاشیوں سے محروم نہ رہ سکا۔ اور اسلام کا ابر نیساں ---- وبلاامتیاز پست وبلند، گلشن وصحر اسب کو سیراب کر رہا تھا۔ اس کے چھینٹے پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں ہی کسی حد تک ہندستان پر بھی پڑنے لگے اور برصغیر کی سسکتی انسانیت بہت تیزی کے ساتھ اس آب حیات سے سیرابی حاصل کرنے لگی۔

اس سلسلے کا پہلا وہ کارواں جو سب سے پہلے اسلام کا آب حیات لے کر ہماری اس محبوب سرزمین پر خیمہ زن ہوا، اس کے محرک اول، ہند کی دھرتی پر اسلام کی عظیم ترین دولت عام کرنے کے لئے راہ ہموار کرنے اور یہاں آکر سرود ربانی سنانے والی سب سے پہلی شخصیت، اسلامی ہند کے محسن اعظم اور ہندستانی سواحل پر فروکش ہونے والی اسلامی فوج کے سرخیل (۱) صحابی رسول حضرت عثمان بن ابی العاصی ثقفیؓ کی ذات گرامی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں پر ان کا اتنا بڑا احسان ہے کہ صدیوں مسلمان نسلیں گراں بار رہیں گی۔ ذیل کے سطور میں اس عظیم اسلامی مجاہد کی زندگی کے واضح روشن نقوش اور ان کے اہم کارناموں کی جھلکیاں مربوط انداز میں پیش کی جائیں گی۔

سلسلۂ نسب :

والد کی طرف سے سلسلۂ نسب یوں ہے : ابو عبد اللہ عثمان بن ابی العاصی بن بشیر بن عبد دھیان بن عبد اللہ بن ھمام بن ابان بن یسار بن مالک بن حطیط بن جشم بن قسی،۔۔جن کا نام ثقیف ہے اور قبیلہ بنو ثقیف انھیں کی جانب منسوب ہے۔

اور والدہ محترمہ کی طرف سے سلسلۂ نسب یہ ہے: صفیہ بنت امیہ بن عبد شمس۔ان کی والدہ عرب کی شریف خواتین میں سے تھیں۔والدہ کی جانب سے نسب کے سلسلہ میں دوسرے اقوال بھی ہیں۔(۲)

آنحضرت ﷺ کی خدمت میں :

علامہ ابن سعدؒ اپنی ''طبقات'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ : ماہ شعبان ۹ ھ میں حضرت عثمان بن ابی العاصی اپنے قبیلہ بنی ثقیف کے ایک وفد کے ہمراہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں تشریف لائے۔چونکہ حضرت عثمان ثقفیؓ وفد میں شامل تمام لوگوں سے عمر میں چھوٹے تھے اس لئے لوگ انہیں عام کم عمر بچوں کی طرح کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے اور جب وہ لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت جانے لگتے تو حضرت عثمان کو اپنے ساتھ لے جانے کے بجائے کجاووں اور اونٹنیوں کی حفاظت کے لیے وہیں چھوڑ دیتے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ وہ لوگ رسول اللہ کی خدمت میں چلے گئے اور حسب معمول حضرت عثمان کو اونٹوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا ۔ایسے موقعہ پر حضرت عثمان کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا اور رسول اللہ کی خدمت میں حاضری کے لئے مناسب موقعہ کی تلاش میں رہے۔جب وہ لوگ خدمت نبوی سے دوپہر کے وقت واپس آئے تو چونکہ سخت گرمی کا موسم تھا، اس لیے وہ لوگ سو گئے، چنانچہ جب وہ پوری طرح نیند کے آغوش میں چلے گئے تو حضرت عثمان نے موقعہ غنیمت جانا، اور چھپ چھپا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔اور رفقاء وفد سے پہلے آنحضرت صلعم کے دست حق پرست پر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔اور اپنے اسلام کو ان سے مخفی رکھا۔(۳)

دین کی تڑپ :

بیعت اسلام کے بعد وہ مطمئن نہیں بیٹھے ، بلکہ کثرت سے موقعہ بموقعہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے، دین کے مختلف امور کے بارے سوالات کرتے اور قرآن کریم پڑھوا کر سنا کرتے، چنانچہ انہوں نے اس دوران رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سن سن کر متعدد سورتیں یاد کر لیں۔

اگر کبھی ایسا ہوتا کہ آنحضرت ﷺ آرام فرمارہے ہوتے تو علم دین کے شوق میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس چلے جاتے اور ان سے بھی قرآن کریم پڑھوا کر سنتے اور اسے یاد کرتے، کبھی حضرت ابو بکرؓ بھی مشغول ہوتے تو حضرت ابی ابن کعبؓ کے پاس جاکر اپنی تشنگی فرو کرتے۔

ان کے اس دینی جذبے، لگن اور شوق کو دیکھ کر رسول اکرم ﷺ بے حد خوش ہوئے ا ان سے خصوصی شفقت و محبت کا معاملہ فرمانے لگے اور ان کے بارے میں فرمایا: إنه كيّسٌ و أخذ من القرآن صدرا یعنی کہ عثمان بہت زیرک اور دانشمند ہے، اس نے قرآنی علوم سے سینہ بھر لیا ہے۔ (۴)

طائف کی گورنری:

جب بنی ثقیف کا مکمل وفد مسلمان ہو گیا، اس وقت آنحضرت ﷺ نے ان کو عہد نامہ لکھوا کر دیا اور وہ لوگ اپنے شہر طائف لوٹنے لگے، لوٹتے وقت انہوں نے آپ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اے اللہ کے رسول! ہمارے اوپر ہم میں سے کسی کو امیر نامزد کر دیجیے تاکہ ہم اجتماعی زندگی میں ان کے فیصلوں پر عمل پیرا ہو سکیں۔ چنانچہ ان کی اس گذارش پر آپؐ نے حضرت عثمان ثقفیؓ کو ان کا امیر بنادیا، جبکہ دوسروں کے بالمقابل وہ بالکل نوعمر تھے، لیکن آپؐ نے عمر کا اعتبار نہ کر کے ان کی دیانت کا اعتبار کیا، اس لیے کہ وہ اپنے اہل قبیلہ میں تفقہ فی الدین کے اعتبار سے سب سے فائق اور علوم قرآن کے سب سے زیادہ حریص تھے۔

حضرت ابو بکرؓ نے بھی حضور اکرمؐ کے سامنے اس امر کی گواہی دیتے ہوئے فرمایا: انّي قدْ رأيتُ يا رسُول اللّه هٰذا الغُلامُ منْهمْ منْ أحْرصِهمْ على التّفقّه فيْ الإسلام، وتعلّم القرآن (۵)

یعنی اے اللہ کے رسول میں اس قبیلہ کے دیگر افراد کے مقابلہ میں اس نوعمر کو علوم قرآنی کے حصول اور تفقہ فی الدین کا زیادہ شائق پاتا ہوں۔

پیغمبر کی وصیت:

حضرت عثمان ثقفی کی طائف واپسی کے وقت رسول اللہ ﷺ نے انہیں چند چیزوں کے بارے میں بطور خاص ہدایت فرمائی تھی۔ جنہیں وہ اپنے زمانۂ امارت میں برت سکیں، خود حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں: "كان اخر ماعهد اِليَّ رَسُولُ اللّهِ، حِيْنَ بَعَثَنِيْ عَلَى ثَقِيْفٍ أنْ قَالَ: يا عُثمانُ ! تجاوز في الصّلوة، وأقدر النّاسَ بِاَضْعَفِهم فإان فِيْهم الكبيرَ و الصَغِيْرُ، و الضعيفُ و ذاالحاجة" (٦)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے بنو ثقیف کا جب مجھے امیر بنا کر بھیجا تو ان کی آخری وصیت یہ تھی کہ اے عثمان! نماز میں اختصار سے کام لیا کرو، اور لوگوں کا اندازہ، ان میں جو ضعیف ہوں ان کے اعتبار سے لگایا کرو۔ اس لیے کہ ان میں ہر طرح کے انسان ہوتے ہیں، بڑے بھی، چھوٹے بھی، کمزور بھی، ضرورت مند بھی۔

ایک دوسری روایت میں یہ بھی ہے: "أن اتّخذ مؤذّناً لايأخُذُ على أذانِه أجرًا، وإذا أمّمتَ قومًا فاقدرْهُمْ بأضْعفِهِمْ وإذا صَلّيتَ لِنَفْسِكَ فأنتَ و ذلكَ" یعنی اذان کے لئے ایسے مؤذن کا انتخاب کرو جو اذان دینے پر اجرت نہ لے۔ اور جب تم کسی قوم کی امامت کراؤ تو لوگوں کا اندازہ ضعیفوں کا خیال رکھ کر لگاؤ۔ اور جب تم تنہا نماز پڑھو تو تمہیں اختیار ہے۔ (۷)

ارتداد کے خلاف اہم کارنامہ:

عثمان ثقفیؓ اس کے بعد سے مسلسل حضورؐ کی مکمل زندگی، حضرت ابو بکرؓ کے پورے عہد خلافت اور حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت کے دو سالوں تک طائف کے گورنر رہے۔ اس پوری مدت میں اپنی ذمہ داریوں کو بحسن خوبی انجام دیتے رہے، اس دوران کئی اہم کارنامے بھی انجام دیے۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جو فتنۂ ارتداد کی تند و تیز آندھی چلی اس نے اکثر قبائل عرب کو اپنے لپیٹ میں لے لیا۔ دن بدن قبائل کے قبائل مرتد ہونے لگے، لیکن حضرت عثمانؓ کا رعب و دبدبہ اور ان کی عزیمت نے اس فتنے کے لئے سدِّ سکندری کا کام کیا، اور اہل طائف اپنے باعزیمت امیر کی وجہ اس عظیم فتنے میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہے۔ اس لئے کہ جب ان میں سے بعض کے دل میں ارتداد کے تعلق سے غلط خیالات آنے لگے، تو انہوں نے بنو ثقیف کو للکارتے ہوئے کہا: يَا مَعشَرَ ثَقِيف ! كُنتُم آخِرَ النَّاسِ إسلاماً فلا تكونوا أول الناس ردّة" (۸) یعنی اے ثقیف کی جماعت! تم اسلام لانے میں تو دوسرے قبائل سے پیچھے رہے، لیکن ردت کے سلسلے میں کیوں آگے بڑھ رہے ہو؟ خبر دار !اخیر میں ملنے والی اس دولت کو سینے سے لگائے رکھو اور مرتد ہونے کا خیال بھی مت کرو۔

عہد فاروقی میں تبادلہ:

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ حضرت عثمان بن ابی العاصی امیر المومنین فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت کے ابتدائی دو سالوں تک طائف کے گورنر رہے۔ اور شاید اخیر زندگی تک طائف ہی کے امیر رہتے، کیونکہ انہیں رسول اللہ نے نامزد کیا تھا لیکن عہد فاروقی میں جب خلافت اسلامیہ کا دائرہ وسیع

سے وسیع تر ہوتا گیا تو مختلف ممالک کے لیے باصلاحیت اور فعّال افراد کی ضرورت پڑنے لگی
امارت کے امور کو سنبھال سکیں، چنانچہ ایسی ہی ایک ضرورت بحرین اور عمان کے لئے پڑی؛ تو ار
حل و عقد صحابہ کرامؓ نے خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کے سامنے حضرت عثمان ثقفیؓ کا نام وہاں
گورنری کے لئے پیش کیا۔ ان کا نام پیش کیے جانے پر حضرت عمرؓ نے (ان کی اعلیٰ صلاحیتوں سے واق
ہونے کے باجود) توقف کیا اور پر تفکر انداز میں فرمایا کہ ان کا نام تو ٹھیک ہے، لیکن چونکہ عثمان ا
شخص ہیں جنہیں خود رسول اکرم ﷺ نے طائف کا امیر نامزد فرمایا تھا؛ اس لیے میں انہیں وہاں
معزول نہیں کر سکتا۔

حضرت عمرؓ کے اس محتاط جواب پر صحابہ کرامؓ نے ان سے مشورتاً عرض کیا کہ آپ ا
کے لئے یہ تدبیر اختیار فرما سکتے ہیں کہ آپ انہیں اختیار دے دیجئے کہ وہ جسے چاہیں اپنا قائم مقا
بنا دیں۔ اور عمان و بحرین کے لیے ان کی خدمات حاصل کر لیجئے، اس طرح سے انہیں معزول کرنا بھ
لازم نہیں آئیگا اور کام بھی ہو جائیگا۔

اس مشورے کو حضرت عمرؓ نے قبول فرمایا اور عثمان ثقفیؓ کے پاس لکھ بھیجا کہ آپ جسے
مناسب سمجھیں اسے اپنا قائم مقام گورنر متعین کر دیں۔ اور بذات خود میرے پاس تشریف لے آئیں
۔ اس مکتوب کو پا کر حضرت عثمان نے اپنے بھائی حکم بن ابی العاصی کو طائف کا گورنر متعین کیا۔ اور خو
حضرت عمرؓ کے پاس مدینہ چلے آئے۔ (۹)

بحرین اور عمان کی گورنری:

امیر المومنین کی طلبی پر حضرت عثمان ثقفیؓ جب مدینہ آگئے تو حضرت عمرؓ نے حسب مشور
انہیں بحرین اور عمان کا گورنر متعین فرمایا، حضرت عثمانؓ ان دونوں ممالک کا گورنر بننے کے بعد خود تو
عمان چلے گئے، اور چند ضرورتوں کے پیش نظر اپنے بھائی حکم کو طائف سے بلا کر انہیں بحرین روانہ
کر دیا۔ عزل و نصب کے یہ تمام واقعات ۱۵ھ ہجری میں پیش آئے۔

حضرت عثمان اور ان کے بھائی حکم نے بحرین اور عمان کی گورنری کو اپنے اعلیٰ مقاصد کے
لیے سد راہ نہیں بننے دیا، بلکہ اللہ کے آخری دین کے غلبے کے لیے اسے استعمال کیا اور جو طاغوتی
قوتیں اس راہ میں حائل ہوئیں ان سے اس صفحہ گیتی کو ہمیشہ کے لیے پاک کر دیا، دونوں بھائیوں نے
اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو اعلاء کلمۃ اللہ میں صرف کر دیا، اس دوران انہوں نے فارس اور
خراساں کے بیشمار علاقوں کو شرک و بت پرستی کی تاریکیوں سے پاک کر کے وحدہ لاشریک لہ کی

روشنیوں سے معمور کردیا، اور ان علاقوں کو فتح کرکے سلطنت اسلامیہ کے زیر نگیں کردیا۔ ان فتوحات کا آغاز اس وقت ہوا جب انہوں نے گورنر بننے کے فوراً بعد توج نامی شہر کو فتح کرکے دیگر اسلامی فتوحات کے لیے راہ ہموار کرلی اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک اسلام کے پیغام کو ہندوستان جیسے دور دراز ممالک تک نہ پہونچادیا (جس کی تفصیل ذیل کے سطور میں آرہی ہے (۱۰)

امتیازی اوصاف اور روایات

حضرت عثمان ثقفیؓ جس طرح اور بہت ساری خصوصیات کے حامل تھے اسی طرح دیگر صحابہ میں بھی ایک امتیازی مقام رکھتے تھے چنانچہ امام احمد بن حنبل "کتاب العلل" میں حسن بصری علیہ الرحمۃ (جنہوں نے دسیوں صحابہ کرام کی زیارت وصحبت کا شرف حاصل کیا ہے) سے نقل کرتے ہیں "وكانَ الحسنُ يقُولُ مار أينا أفضل منْه يعْني عُثْمان بن ابي العاصي الثقفي" یعنی حضرت حسن بصر فرماتے ہیں کہ میں نے عثمان بن ابی العاصی ثقفی سے افضل کسی انسان کو نہیں دیکھا (۱۱)

چونکہ انہوں نے اپنی زندگی کے بیشتر حصے کو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرنے میں صرف کردیا اور انہیں رسول اللہ ﷺ کی طویل صحبت بھی حاصل نہیں ہوئی، اس لیے دوسرے مجاہدین صحابہ کی طرح ان کی روایتوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "تہذیب الاسماء واللغات" میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان ثقفیؓ نے رسول اکرم ﷺ سے نو احادیث روایت کی ہیں ان میں سے تین روایتیں مسلم شریف میں اور باقی روایات سنن کی دوسری کتابوں میں ہیں (۱۲)

ان سے روایت کرنے والوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے ان میں ان کے بھائی حضرت حکم بن ابی العاصی کے علاوہ حضرت سعید بن المسیب، موسی بن طلحہ، نافع بن جبیر، محمد بن سیرین اور حسن بصری رحمہم اللہ جیسے معزز تابعین بھی ہیں۔

نور ہدایت کے ساتھ "ہند" میں:

حضرت عثمان بن ابی العاصی کے دیگر تمام اوصاف حمیدہ اپنی جگہ، لیکن ان تمام خوبیوں میں ممتاز اور قابل ذکر خوبی اور عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نور ہدایت اور لازوال خدائی پیغام یعنی اسلام کو سب سے پہلے ایک ایسی سرزمین تک پہونچایا، یا پہونچانے کے لئے انتھک کوششوں کے ذریعہ راہ ہموار کی؛ جو اپنی تمام رعنائیوں اور دلکشیوں کے باوجود شرک وبت پرستی، ضلالت وگمراہی کی تہ در تہ تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی، ظلم وبربریت، نفرت وعداوت فتنہ وبدامنی اور چھوا چھوت کے مہیب

دیو نے اسے پوری طرح اپنے چنگل میں جکڑ لیا تھا۔ اور مظلوم انسانیت کسی آب حیات کی تلاش میں سسک رہی تھی، ایسے موقعہ پر اہل ہند کی سیرابی کی خاطر حجاز کے چشمہ حیات سے آب حیات لے کر آنے والی شخصیت حضرت عثمان ہی کی ذات گرامی تھی۔ یہ اور ان کے دو بھائی حکم بن ابی العاصی اور مغیر بن ابی العاصی کی شخصیات تھیں جنہوں نے ہندوستانی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلام کے داعی اور مبلغ کی حیثیت سے ہندوستان کے سواحل تھانہ (ممبئی) بھروچ (گجرات) دیبل (کراچی) پر پڑاؤ کیا ہے۔

تاریخ کی ستم ظریفی:

لیکن تاریخ کی یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ اس نے ان اولین مبلغین اسلام کے کارناموں کو اپنے صفحات میں کماحقہ جگہ نہیں دی۔ اور بقول قاضی اطہر مبارک پوری "عام مورخین متعدد قوی دلائل کے باوجود حضرت عثمان ثقفیؓ اور ان کے بھائیوں کے ہندستان آنے سے بے خبر ہیں، اور اگر کسی کی نظر سے یہ دلائل گذر بھی جائیں تو بھی وہ ان سے اعراض برتتے ہیں۔ اور اگر ان میں بعض کو ذکر بھی کرتے ہیں تو نہایت بے اعتنائی کے ساتھ"۔ (۱۳) رہے عصر حاضر کے موزخین اور نام نہاد تاریخ داں؛ تو انہوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ اور جاہلانہ انداز میں محمد بن قاسمؒ سے پہلے کسی بھی اسلامی مجاہد اور مبلغ کے ہندستان آنے سے انکار کرنے لگے۔ افسوس! اگر وہ محمد بن قاسم کے حملے کے اسباب تلاش کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ کافی پہلے سے سراندیپ اور مالابار اور دیگر ساحلی علاقوں میں سینکڑوں مسلم خاندان آباد تھے اور انہوں نے محمد بن قاسمؒ کا استقبال کیا تھا۔ (۱۴)

کیوں کہ جن جہازوں کو راجہ داہر کے آدمیوں نے لوٹا تھا، یہ جہاز سراندیپ کے راجہ کے تحائف اور اس علاقے کے عازمین حج کی ایک تعداد لیے ہوئے خلیج عمان کی طرف آرہے تھے، اور انہی جہازوں کا واقعہ محمد بن قاسمؒ کے آنے کا سبب ہوا۔ (۱۵) سوال یہ ہے کہ یہ ہزاروں مسلمان محمد بن قاسم سے پہلے ہندستان میں کیوں کر موجود تھے؟ جواب واضح ہے مسلم تجار، مبلغین اور مجاہدین کے ذریعہ ہند میں اسلام رفتہ رفتہ ترقی کر رہا تھا اور اپنی روشن تعلیمات کی بدولت اہل ہند کے لیے کشش کا باعث بنا ہوا تھا۔ اور ان مجاہدین و مبلغین وغیرہ کے لئے راہ ہموار کرنے والے وہی پاک نفوس تھے جنہیں تاریخ "ابناء ابی العاصی" کے نام سے یاد کرتی ہے۔

تاریخی دلائل کی روشنی میں:

حضرت عثمان ثقفی اور ان کے بھائی حکم اور مغیرہ ہندوستان کب اور کیونکر آئے؟ یہاں آنے کے بعد انہیں کن احوال سے دوچار ہونا پڑا؟ اسے جاننے کے لئے چند چشم کشا اور بصیرت افزا مستند تاریخی دلائل پیش کئے جارہے ہیں، تاکہ حق بات جاننے والوں کے لئے یہ نشان راہ ہو سکے۔

علامہ ابو بکر کوفیؒ اپنی کتاب "منہاج الدین،، میں نہایت ہی تفصیل کے ساتھ انکے ہندستان آنے اور یہاں کے بادشاہ جج بن سیلانج کے ساتھ غزوہ کرنے کو بیان کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ:

"پہلی مرتبہ مجاہد بن اسلام ہندستان کی سرزمین پر امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں پہونچے اور ہندوسند میں پہلا اسلامی غزوہ بھی انہیں کے زمانے میں ہوا، واقعہ یوں ہوا کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے عثمان بن ابی العصی الثقفی کو گورنر بنا کر بحرین روانہ کیا، انہوں نے بحرین جاکر اپنے امور کو سنبھال لیا، کچھ دنوں کے بعد اسلامی افواج کے ایک جم غفیر کے ساتھ عمان چلے گیے، وہاں جاکر انہوں نے آلات حرب کو اکٹھا کیا، کشتیاں جمع کیں اور مجاہدین کا لشکر منظم کیا۔ اور اپنے بھائی مغیرہ بن ابی العاصی کو اس مجاہدین کے لشکر کا کمانڈر اعلی مقرر کیا۔ پھر انہیں "باب الہند" بحرین میں پڑاؤ کرنے کا حکم دیا تا کہ وہاں سے بآسانی جانباز مسلم مجاہدین کی جمیعت کے ساتھ پیغام امن لے کر ہندوستان جائیں اور اسے شر ورفتن سے پاک کر کے امن وامان کا گہوارہ اور بھانت بھانت کی گمراہیوں سے نکال کر راہ راست پر لائیں اور اگر وہاں کے سرکش و مغرور حکمراں اور دیگر طاغوتی طاقتیں اس خدائی پیغام کو ٹھکرائیں، تو انہیں مناسب سبق سکھائیں۔

چنانچہ عثمان بن ابی العاصی کے حکم پر ۱۵ھ ہجری میں مجاہدین کی یہ جماعت بحرین جس کا موجودہ نام احساء ہے اور جو سعودی عرب کے مشرقی علاقے میں واقع ہے۔ کے راستے دیبل (جو اس زمانے میں سندھ کی بندرگاہ تھا) پہونچے اور ہند کی اس سرزمین میں احکام خداوندی کو عام کرنا چاہا، لیکن یہاں بھی ایسا ہی ہوا جیسا کہ ہر زمانے میں اہل حق کے ساتھ ہوتا رہا ہے یعنی شیطانی لشکر نے اپنی زمین پر "حزب اللہ" کے وجود کو برداشت نہیں کیا۔ اور اس زمانے کے ہندوستانی راجہ جج بن سیلانج کا باجگزار دیبل (کراچی) کا حاکم پورے لاؤ لشکر کے ساتھ مجاہدین اسلام کی اس چھوٹی سی جماعت کے خلاف برسرپیکار ہو گیا۔ مجاہدین نے بقدر وسعت مدافعت کی۔ بالآخر کچھ دشمن کے ہاتھوں شہید ہوئے اور باقی ماندہ وطن واپس آگئے۔ لیکن جس چمن کو اسلام کے اولین مجاہدین نے اپنے خون سے سیراب کیا تھا وہ پروان چڑھتا رہا اور اسلامی روح برابر پھلتی رہی (۱۷)

حضرت عثمان ثقفیؓ اپنے بھائیوں کو دیبل روانہ کرنے کے بعد خود آرام سے نہیں بیٹھ گئے بلکہ انہوں نے بذات خود ایک دوسرا مہم سر کیا، ملاحظہ فرمائیں اس کی تفصیل علامہ بلاذریؒ کی زبانی!

حضرت عمر نے عثمان ثقفی کو ۱۵ھ میں بحرین اور عمان کا گورنر بنا کر بھیجا، وہاں جا کر انہوں متعدد کارنامے انجام دیئے ان میں اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تو اپنے بھائی حکم کو بحرین روانہ کیا تاکہ وہ مجاہدین کی ایک جمیعت کے ساتھ بھروچ (گجرات) کا رخ کریں اور خود عمان چلے گئے اور وہاں سے

انہوں بذات خود تھانہ (ممبئی) کی طرف فوج کشی کی، جب ان کی فوج واپس آئی تو انہو
امیر المومنین کو اس کی اطلاع دی، لیکن حضرت عمرؓ نے اس خطر ناک وادی میں قدم ر
ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اسی طرح اپنے بھائی مغیرہ ثقفیؓ کو خور دیبل روانہ کیا، وہاں ان کی دشمنو
مدبھیڑ ہوئی اور وہ کامیاب وکامران واپس آئے۔ (۱۸)

علامہ یاقوت الحموی تحریر فرماتے ہیں کہ خور دیبل سندھ کے نواحی علاقوں میں سے
علاقہ ہے اور دیبل بحر ہند کے ساحل پر ایک آباد شہر ہے، حضرت عثمان ثقفی نے اپنے بھائی م
وہاں بھیجا، چنانچہ انہوں نے اس کو فتح کرلیا۔ (۱۹)

حضرت عثمانؓ کے ہندوستان آنے اور بذات خود یہاں کے غزوہ میں شرکت کرنے ک
سلسلہ میں ذیل کی روایت بالکل صریح ہے۔

علامہ ابن حزم الاندلسی اپنی کتاب "جمهرة أنساب العرب" میں تحریر فرماتے
وعُثْمَانُ مِنْهُمْ (اي من بني أبي العاصي) مِنْ خيار الصحابة ؛
رسُولُ اللهُ صلّى اللهُ عليه وسلّم الطائف، وغزا فارس، وثلاثة من ؛
الهند، وله فتوح (۲۰) یعنی حضرت عثمان ابوالعاصی کی اولاد میں سے ہیں اور یہ اجلہ
کرامؓ میں سے تھے آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں طائف کا گورنر بنایا تھا انھوں
(بالواسطہ یا بلاواسطہ) ہندوستان کے تین شہروں (تھانہ، بھروچ اور دیبل) کا غزوہ کیا اور ان کی ؛
ساری فتوحات ہیں۔

الغرض حضرت عثمان ثقفی اور ان کے بھائی حکم اور مغیرہ کے قدم ہندوستان میں اس
خشت اول بنے، اور جس اخلاص کے ساتھ خشت اول رکھی گئی، اس پر تعمیر شدہ عظیم الشان عمار
اپنی رفعت و بلندی میں بالآخر ہمدوش ثریا ہو کر رہی اور اسلام ہندوستان کا دوسرا سب سے بڑا مذہ
بن گیا۔

بصرہ میں قیام اور وفات:

حضرت عثمان ثقفی امیر المومنین فاروق اعظم کے عہد خلاف کے آخری ایام تک
حضرت عثمان بن عفان کی خلافت کے ابتدائی ایام تک مسلسل عمان اور بحرین کے گورنر کی حثیہ
سے اپنے فرائض بوجہ احسن وجوہ انجام دیتے رہے۔ لیکن حضرت عثمان بن عفانؓ کچھ دنوں کے ؛
انہیں کسی مصلحت کے پیش نظر عمان و بحرین کی گورنری سے سبکدوش کردیا اور وہ اسی سال بع

۲۹ھ ہجری میں دیار حبیب مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ اور وہیں مقیم ہوگئے (۱۲) ہر چند کہ امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ نے۔ عثمان ثقفی کو معزول کردیا تھاں اس کے باوجود انہیں عثمان بن عفانؓ سے جاں نثاری کی حد تک محبت تھی اس سلسلے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ: عثمان ثقفی ان یام میں جب کہ بلوائیوں نے خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان غنی کو اپنی شازشوں کا شکار بناکر انہیں گھر میں محصور ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ ان کے پاس تشریف لائے اور ان کی حفاظت کے واسطے بلوائیوں سے قتال کرتے اور اپنے آپ کو قربان کردیئے کی پیشکش کی لیکن حضرت عثمان غنی کو نے اس سے انکار فرمایا لوٹتے وقت انہوں نے عثمان غنی سے بصرہ منتقل ہو جانے کی اجازت چاہی چنانچہ حضرت عثمان غنی نے انہیں اجازت مرحمت فرمادی (۲۲)

اس کے بعد وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ بصرہ منتقل ہوگئے، اس کو مسکن بنایا اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بعد کے زمانے تک ان کے خاندان والے بصرہ ہی میں قیام پزیر رہے۔ ان کے آثار بھی کافی دنوں تک باقی رہے، چنانچہ بصرہ کا "باب عثمان" انہی کی طرف منسوب ہے۔

حضرت عثمان بن ابی العاص اپنی مجاہدانہ زندگی کی مختلف بہاریں دیکھنے کے بعد علی اختلاف الاقوال ۵۵ھ یا ۵۱ھ میں، بزمانہ خلافت حضرت معاویہؓ اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ رضی اللہ عنہ ورضی عنہ۔ (۲۳) خدایا! ان کی لحد کو نور سے بھردے! ان پر اپنی رحمتوں کی بارشیں نازل فرما! اور انہیں ہندوستانی مسلمانوں کی طرف بہتر بن بدلہ عنایت فرما: کہ اگر انہوں نے اس سرزمین میں اسلام کے لیے راہ ہموار نہ کی ہوتی تو نہ معلوم ہمارا کاانجام ہوتا۔

بقیہ صفحہ ۵۶

تجویز (۶) دینی تعلیم کے لیے تعلیمی ویزا کی سہولت کا مطالبہ

مدارس عربیہ کا یہ کل ہند اجتماع، حکومت ہند کی توجہ اس طرف مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور ملک کے دیگر مدارس میں ماضی بعید سے غیر ملکی طلبہ زیر تعلیم رہے ہیں، لیکن چند سالوں سے حکومت ہند دینی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والے طلبہ کو تعلیمی ویزا نہیں دے رہی ہے۔ جبکہ دارالعلوم اور ان مدارس میں ہر سال غیر ملکی طلبہ کی درخواستیں آتی رہتی ہیں۔

مدارس عربیہ کا یہ کل ہند اجتماع، حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے۔ کہ دیگر ممالک سے دارالعلوم میں دینی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والے طلبہ کو حسب سابق تعلیمی ویزا دینے کی سہولت مہیا کرے،

یہ بات ہندوستان کی مذہبی رواداری اور سیکولر روایات کے مطابق ہوگی اور اس سے ملک کی نیک نامی میں اضافہ ہوگا۔

مسئلہ تقلید کے چند اہم گوشے

مولانا حافظ محمد اقبال رنگونی

مقلدین کو قریب کرنے کے لئے تقلید پر اٹھنے والے ۳۸ سوالات کے جوابات

(۲۹) سوال :۔ تقلید کے لئے چاروں اماموں کے مسائل کیوں نہیں لئے جا سکتے ایک ہی کی تقلید کیوں کی جائے۔؟

جواب :۔ یہ تو درست ہے کہ آدمی جس جگہ رہتا ہے وہاں جس مذہب کے عالم ہوں اور انکی کتابیں مدون ہیں وہاں ان کی تقلید کرے لیکن یہ جائز نہیں کہ آدمی چار کشتیوں میں بیک وقت پاؤں رکھے۔ کوئی عقل مند شخص کسی کو بیک وقت چار جگہ پر قدم رکھنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ اس لئے سلامتی کی راہ یہی ہے کہ ایک جگہ قدم رکھے۔

اسلام کے صدر اول میں آزاد تقلید میں کوئی خوف لاحق نہ تھا جب کسی اہل علم کی بات میسر آئی لے لی وجہ اس کی یہ تھی کہ اس وقت امانت و دیانت اور تقویٰ و نیک نیتی کا غلبہ تھا دور نبوت کے قریب ہونے کی وجہ سے خیر غالب تھا، خطرہ نہ تھا کہ لوگ محض خواہشات نفسانی کی تکمیل کے لئے دین سے کھیلیں گے اور کبھی کسی سے اور کبھی کسی سے اور کبھی کسی اور سے مسائل لیں گے اس لئے لوگ بغیر کسی نکیر کے تقلید مطلق کر لیتے تھے تاہم اس وقت بھی تقلید شخصی کو اہمیت دی جا رہی تھی اور صحابہ کرام اپنے سے اعلم کی اقتداء کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ دور نبوت سے دور ہو تا گیا دیانت و امانت کا معیار گرتا چلا گیا بے احتیاطی بلکہ بدنیتی غالب آنے لگی ان حالات میں علماء دین اور فقہاء اسلام نے محسوس کیا کہ اگر آزاد تقلید کی اجازت دے دی جائے تو لوگ شتر بے مہار بن جائیں گے اور دین ایک کھلونا بن کر رہ جائے گا لوگ اپنی سہولت اور خواہش کی تکمیل کے لئے مختلف حالات میں مختلف کروٹیں بدلیں گے اور دین سے یہ مذاق کہیں انہیں کفر کی سرحد کے قریب نہ لے آئے اس لئے تقلید مطلق کے بجائے تقلید شخصی کا پابند بنایا جائے جیسا کہ شروع میں بھی ہو تا رہا۔ حافظ ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں اس پر تفصیلی بحث فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ مختلف حالات میں مختلف مذاہب کے احکام پر عمل کرنا

باتفاق ائمہ قطعاً جائز نہیں ومثل هذا لایجوز باتفاق الائمة (فتاویٰ ابن تیمیہ ج۲ ص۲۸۵)

حافظ ابن تیمیہ نے یہ بات اپنی طرف سے نہیں لکھی امام احمدؒ سے نقل کی ہے جس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ تقلید مطلق میں فساد دین پیدا ہونے کا شدید خطرہ ہے اس لئے اسے ناجائز بتادیا گیا اور تقلید شخصی میں چونکہ آزادی پر گرفت ہوتی ہے اور اس سے نفسانی خواہشات کی تکمیل کے ذرائع مسدود ہو جاتے ہیں اسلئے اسے ضروری ٹھہرا گیا۔ مشہور محدث امام نووی (۶۷۶ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ

ووجهه انه لو جاز اتباع ای مذهب شاء لا فضی الی ان یلتقط رخص المذاهب متبعا هواه ویتخیر بین التحلیل والتحریم والوجوب و الجواز وذلك یودی الی انحلال ربقة التکلیف بخلاف العصر الاول فانه لم تکن المذاهب الوافیة باحکام الحوادث مهذبة وعرفت فعلی هذا یلزمه ان یجتهد فی اختیار مذهب یقلده علی التعیین (المجموع شرح المہذب ج۱ ص۹۱)

(ترجمہ) تقلید شخصی کے ضروری ہونے کا سبب یہ ہے کہ اگر اس بات کی اجازت دے دی جائے کہ انسان جس فقہی مذہب کی چاہے پیروی کرلیا کرے تو اسکا نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ ہر مذہب کی آسانیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی خواہشات نفس کے مطابق ان پر عمل کریں گے حلال و حرام اور واجب و جائز کے احکام کا سارا اختیار خود لوگوں کو مل جائے گا اور بالآخر شرعی احکام کی پابندیاں بلکل کھل کر رہ جائیں گی بخلاف پہلے زمانہ کے کہ فقہی مذاہب مکمل طور پر مدون اور معروف و مشہور نہ تھے (لیکن اب جبکہ مذاہب فقہیہ مدون اور معروف ہو چکے) ہر شخص پر لازم ہیکہ وہ کوشش کر کے کوئی ایک مذہب چن لے اور پھر معین طور پر اسکی تقلید کرلے (تقلید کی شرعی حیثیت ص۶۶) علامہ ابن خلدون (۸۰۸ھ) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تقلید اب ان چار مذاہب میں محصور ہو گئی۔ دوسرے سب مذاہب ناپید ہو گئے اور انکے مقلدین بھی نہ رہے اب کسی کا مرتبہ اجتہاد پر پہنچنا بھی ایک مشکل مرحلہ بن گیا اسلئے اب کسی نئے مذہب کی پیروی کا سوال ہی نہیں ہوتا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اجتہاد نااہلوں کے قبضہ میں نہ چلا جائے اسلئے علماء نے اجتہاد کے بند ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور لوگوں کو مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب کی تقلید کا پابند بنایا۔

فصرحوا بالعجز والاعواز و ردو الناس الی هو لاء کل من اختص به من المقلدین و حظروا ان یتداول تقلیدهم لما فیه من التلاعب (مقدمہ ابن خلدون ص۴۴۸)

پس انہوں نے اجتہاد سے عجز کا اعلان کر دیا اور لوگوں کو ائمہ اربعہ کی تقلید کی طرف لوٹایا اور اس بات کو ممنوع کر دیا کہ ان ائمہ کی بدل بدل کر تقلید کی جائے کیونکہ ایسا کرنا دین کو کھلونا بنانے کا موجب ہے۔

ہمیں اس وقت اس خاص موضوع (تقلید شخصی) پر اکابر کی تصریحات و تشریحات جمع کرنا

مقصود نہیں ہے بتلانا صرف یہ ہے کہ تقلید مطلق کا دروازہ کھول دینا اور لوگوں کو اس بات کی اجازت دے دینا کہ وہ جب چاہیں کسی بھی امام کی تقلید کرلیں ایک بڑے خطرہ میں ڈال دینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے محدثین اور علماء نے تقلید شخصی کو ہی بہتر اور اقرب الی الصواب راستہ بتایا ہے۔

جس طرح قرآن کریم سات حروف (لغات) پر نازل ہوا اور اسے پڑھا گیا لیکن اب اسے صرف ایک قراءت میں محصور کردیا گیا ہے تاکہ امت میں انتشار نہ ہو اسی طرح مطلق تقلید کو تقلید شخصی میں محصور کردیا گیا ہے تاکہ امت میں فساد کا دروازہ نہ کھل جائے اور ہر شخص آزادی فکر کے نام پر دین کو مذاق بنانے اور اسلاف سے بیگانہ کرنے کی تحریک نہ چلائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۳۰) سوال ۔ شیعہ گو امت سے اصولوں میں مختلف ہیں تاہم فروعی مسائل میں ان کا تقلید میں بھی تو کوئی موقف ہوگا وہ موقف کیا ہے؟

جواب ۔ تقلید کے باب میں شیعہ کا موقف یہ ہے کہ وہ فوت شدہ اہل علم کی تقلید جائز نہیں سمجھتے وہ زندہ علماء کی تقلید کے قائل ہیں ان میں جب کوئی مجتہد مر جاتا ہے تو وہ کسی دوسرے مجتہد سے اپنا تعلق قائم کر لیتے ہیں اس لئے انکے علماء کا ایک طبقہ ہمیشہ مجتہد العصر والزمان کے لقب سے ممتاز ہوتا ہے

ولا یجوز تقلید المیت ابتداءً (کذا فی المنھاج الصالحین للسید ابی القاسم الموسوی ص ۷)

یہ مقلد عوام جو دینی لحاظ سے بالکل ان پڑھ ہوتے ہیں وہ اپنے زندہ مولویوں کی بات بیشک مانتے ہیں پوری زندگی انکی تقلید کرتے ہیں مگر مرحوم اہل علم کی پیروی کو وہ جائز نہیں سمجھتے سو تقلید کے مسئلہ میں یہ شیعوں سے بہت قریب ہیں۔ اہل سنت ہمیشہ سے مرحومین کی پیروی کے قائل رہے ہیں سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک اصول کے طور پر بیان فرمایا۔

من کان مستنا فلیستن بمن قد مات (مشکوۃ ص ۳۲)

یہاں ہم تقلید پر بطور ایک مسئلہ کے بحث نہیں کررہے اس کے مختلف گوشوں کو عام فہم انداز میں ایک جانب قارئین کے سامنے لارہے ہیں ان مباحث پر جامع نظر ڈالنے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ مسئلہ تقلید امت کی چودہ صدیوں میں ہرگز کوئی اختلافی مسئلہ نہیں رہا یہ ایک فطرت کی آواز ہے جو دین فطرت میں چودہ سو سال سے سنی جارہی ہے اور اسکا انکار بطور ایک فرقہ کے برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں کی آمد سے قبل کہیں نہیں سنا گیا۔

(۳۱) سوال ۔ تقلید کے مباحث میں اسکے بالمقابل ترک تقلید کا لفظ ہی آتا ہے عدم تقلید پر بھی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی اس کی کیا وجہ ہے۔؟

جواب :۔ تقلید ایک فطری عمل ہے علم وفن کے ہر دائرہ میں عوام اپنے اہل علم کے پیچھے چلتے ہیں سو ہمارے دین میں کوئی ایسا نہیں گزرا کہ اسلام اپنے افکار میں فطرت سے کنارہ کش رہے البتہ خلاف فطرت چلنے والے لوگ ضرور معاشرہ میں پیدا ہوئے اسلیئے دین سے پہلی دوری ترک تقلید سے عمل میں آئی ترک تقلید کے الفاظ بتاتے ہیں کہ تقلید پہلے تھی ترک تقلید کی تحریک بعد میں چلی جیسے ختم نبوت کا عقیدہ پہلے سے تھا انکار ختم نبوت کی تحریک بعد میں چلی۔

(۳۲)سوال:= قومی تجربے میں ترک تقلید کے کیا نقصانات رہے؟

جواب: دین کے معاملے میں انگریزی دور اقتدار میں آزادروی اور آزاد فکری ایک نہایت خطرناک راہ رہی ہے۔

ترک تقلید کے پھل بڑے کڑوے رہے ہیں انکار فقہ نہ ہوتا تو کبھی انکار حدیث کی تحریک نہ اٹھتی قرآن کریم نے مسائل کو اہل علم سے پوچھنے کی تعلیم دی ہے تاکہ عوام اپنے دینی فیصلے خود کر کے کسی خطرناک راہ پر نہ جا نکلیں اور آزادی فکر کے نام پر دین میں تحریف نہ ہو جائے غیر مقلدوں کے معروف رہنما مولانا محمد حسین بٹالوی صاحب نے مرزا غلام احمد قادیانی کو اسی راہ سے دعوی نبوت پر آتے اور اسلام کو سلام کرتے دیکھا تھا اسی لئے انکو یہ بات کہنی پڑی کہ پچیس برس کے تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ بالآخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں ان میں سے بعض عیسائی ہو جاتے ہیں اور بعض لا مذہب جو کسی دین ومذہب کے پابند نہیں رہتے اور احکام شریعت سے فسق وفجور تو اس آزادی (فکر یعنی غیر مقلدیت) کا ادنی کرشمہ ہے کفر وار تداد اور فسق کے اسباب دنیا میں اور بھی بکثرت موجود ہیں مگر دینداروں کے بے دین ہو جانے کا بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ وہ کم علمی کے باوجود تقلید چھوڑ بیٹھتے ہیں (اشاعت السنہ ج ۱۱ شمارہ ۱۱ ص ۵۳)

مولانا بٹالوی صاحب کے سامنے اسکا بڑا ثبوت مرزا غلام احمد تھا ترک تقلید سے انسان دین کے معاملے میں فکری آزادی پر آجاتا ہے اور اپنی ضرورت کے تحت قرآن وحدیث کی تشریح کرنے لگتا ہے پھر وہ کسی غیر مقلد عالم کی بات بھی نہیں مانتا وہ صاف کہدیتا ہے کہ قرآن وحدیث کو سمجھنے کیلئے جب مجھے امام احمد کی بھی ضرورت نہیں تو پندرھویں صدی کے ایک مولوی کی کیا ضرورت ہے نتیجتاً وہ اسلام سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اسی لئے علماء نے پختہ علم دین رکھنے والے اہل علم سے وابستہ رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔

(۳۳)سوال:۔ جب مجتہدین نے خود کہا ہے کہ ہماری تقلید نہ کرو تو اس بات میں مقلد ان کی تقلید کیوں نہیں کرتے؟

کہا جاتا رہا ہے اہل حدیث سے پہلے دور میں غیر مقلدین کہیں بھی مراد نہیں لئے گئے سو اہل حدیث اور مقلدین میں کوئی تنافی کی نسبت نہیں آیئے دیکھیں کہ مقلدین پر اصحاب الحدیث کا لفظ کیسے بولا جاتا رہا ہے۔ (۱)ابو بکر ابی عاصم (۲۸۷ھ) کہا کرتے تھے کہ لااحب ان یحضر مجلسی متبدع ولامدع ولامنحرف عن الشافعی واصحاب الحدیث (البدایہ ج۱۱ص ۸۴) یہاں شافعیؒ اور اصحاب الحدیث کے منحرف کو ایک ہی درجہ رکھا ہے اب یہاں اصحاب الحدیث سے مراد اگر غیر مقلد ہوں تو ظاہر کہ وہ امام شافعیؒ سے کہیں نہ کہیں تو ضرور منحرف ہونگے سو اس میں انکی یہ بات ولامنحرف عن الشافعی اصحاب الحدیث کیسے درست ہوگی اور اگر امام شافعیؒ کی وہی بات مان لی جائے جو حدیث کے مطابق ہو تو کیا باقی باتوں میں امام شافعیؒ کو نہ ماننے والا ان سے منحرف قرار نہ پائے گا۔ سو یہ عبارت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہاں اصحاب الحدیث امام شافعیؒ کے پیروؤں کو ہی سمجھا گیا ہے اس سے کوئی خاص فقہی مکتب فکر مراد نہیں تقلید کے مقابل اصحاب الحدیث کا لفظ اس دور (یعنی انگریزی دور) کی پیداوار ہے اس سے پہلے کہیں یہاں معنی میں نہ تھا (نوٹ) اس عبارت میں مبتدع اور مدع کے الفاظ بھی قابل غور ہیں مدع سے مراد وہ لوگ ہیں جو اجتہاد کے اہل تو نہ ہوں مگر مدعی بنے بیٹھے ہوں اس حیثیت سے بزرگ ہمیشہ انکار کرتے رہے ہیں محمد ابن شیخ عبدالوھاب نجدی بھی ولست مبتدع کہہ کر اپنی برائت کا اظہار کرتے تھے۔

(۱) عبد اللہ بن محمد بن محمد بن عیسیٰ (۲۹۳ھ) امام سمعانی (۵۱۰ھ) آپ کے بارے میں لکھتے ہیں امام اصحاب الحدیث بمرو (الانساب ج۹ ص ۹۱۸۰ مرو میں امام شافعیؒ کے مذہب کو احمد بن سیار کے بعد آپ نے ہی پروان چڑھایا تھا وھوالذی اظہر مذھب الشافعی بمرو وبعد احمدبن سیار قراعلی المزنی ثم انتقل الی مرووحمل معہ مختصر المزنی (طبقات الشافعیہ ص ۹۰) اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام شافعی کے مذہب کو پھیلانے والے کو امام اصحاب الحدیث کہا گیا اور یہ لفظ نہ صرف امام شافعی کے مقلد کے لئے بولا گیا بلکہ اسکے لئے جو لوگوں کو امام شافعیؒ کا مذہب اپنانے اور انکی تقلید کرنے کی دعوت بھی دیتا تھا۔

(۳۶) سوال: جو لوگ ترک تقلید کے باعث اپنی علیحدہ جماعت بنائے ہوئے ہیں اور اہل حدیث کہلانے میں بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں کیا وہ بعض مسائل میں مذہب اربعہ سے نکلے ہوئے نہیں اور ان میں وہ حنفی شافعی مالکی حنبلی سب کے خلاف ہیں اور چونکہ سلف صالحین سب اپنے اپنے مذاہب کے اندر رہے (گو وہ پیروی ائمہ کے نام سے ہو یا پیروی صحابہ کے نام سے) اسلئے ان غیر مقلدین کو ان مذاہب اربعہ سے نکلنے کے باعث سلفی کہنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ سلف (صحابہ کرام) میں مسائل میں

ائمہ کا سا اختلاف رہا ہے سو کسی ایک عمل کو اپنانے والا سلفی کیسے ہے سلف تو کسی ایک عمل پر نہ تھے ان میں مختلف عمل قائم تھے اور سب سلف صالحین تھے ان میں کوئی طریق ہرگز نہ تھا سو ان لوگوں کا اپنے آپ کو سلفی کہنا کسی طرح درست نہیں ہے ہم یہاں چند مسائل بھی ذکر کرتے ہیں جن میں غیر مقلدین مذاہب اربعہ سے نکلے ہوئے ہیں۔

(۱) مذاہب اربعہ تقلید مجتہد کو واجب سمجھتے ہیں یہ غیر مقلدین اسے جائز نہیں سمجھتے یہ لوگ صرف زندہ مولویوں کی تقلید کرتے ہیں۔

(۲) طلاق ثلثہ کے مسئلہ میں ائمہ اربعہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو تین سمجھتے ہیں یہ غیر مقلدین اس مسئلہ میں ان کی مخالفت کرتے ہیں اور ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک طلاق سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اس باب میں شیعہ کے ساتھ ہیں۔

(۳) مذاہب اربعہ بیس رکعت تراویح سے کم کے قائل نہیں آٹھ رکعت تراویح ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کا عمل نہیں۔ غیر مقلدین اسے بیس رکعت تراویح کو بدعت کہتے ہیں اور اسکے خلاف ایک پورا محاذ قائم کئے ہوئے ہیں ائمہ اربعہ کے یہاں خلفائے راشدین کی پیروی سنت ہے یہ غیر مقلدین اپنے آپ کو سنت راشدین کا پابند نہیں مانتے اب آپ ہی بتائیں کیا ان لوگوں کو سلفی کہنا درست ہوگا؟

(۷۴) سوال :۔ بہت سے مسائل میں مقلدین کا آپس میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے؟ اگر لوگ تقلید چھوڑ دیں تو یہ اختلاف ختم ہو جائیگا؟

جواب :۔ ائمہ کرام کے درمیان فروعات میں اختلاف ہوا ہے اصول میں سب ایک ہیں۔ اور اس فروعی اختلاف کا سبب بھی درحقیقت صحابہ کرام کے آپس کے اختلافات ہیں معروف غیر مقلد عالم مولانا عبداللہ روپڑی صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ ائمہ اربعہ کا اختلاف قریب قریب صحابہ کے اختلاف کے ہے (فتاری اہل حدیث ج ۱ ص ۴۲) حدیث کی کتابوں میں صحابہ کے اختلافات موجود ہیں۔ اب جو شخص ائمہ کے درمیان ہونے والے اختلافات کی بحث کو اچھال اچھال کر ان پڑھ لوگو کو گمراہ کرتا ہے وہ درحقیقت صحابہ کرام پر طعن کرتا ہے۔ جس طرح صحابہ کرام سب اصول میں ایک تھے اسی طرح ائمہ کرام سب اصول میں ایک ہیں ان میں کسی کا اختلاف نہیں امام شعرانی لکھتے ہیں کہ عزیز من مبادا تجھ پر یہ امر مشتبہ ہو جائے کہ تو ائمہ کے فروعی اختلاف کو اصولی اختلاف کے مشابہ اور اسکے حکم میں سمجھنے لگے جسکی وجہ سے تیرا قدم میدان ہلاکت میں پڑ جائے (ماخوذ از اختلاف الائمہ ص ۳۳ از حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ نے اپنی مایہ ناز کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر بڑی سیر حاصل گفتگو فرمائی ہے اور صحابہ کے اختلافات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تابعین میں اختلاف کا

سبب یہی صحابہ کا اختلاف ہے آپ لکھتے ہیں۔ وبالجملة فاختلفت مذاهب اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم واخذ عنهم التابعون كذالك كل واحد ماتیسرله

ہم یہاں یہ سوال کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ کیا سب غیر مقلد علماء فروعات میں ایک ہی موقف پر ہیں کیا انکے درمیان کبھی بھی کسی مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہوا ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہوگا غیر مقلد علماء کا آپس میں زبردست اختلاف موجود ہے اگر ترک تقلید سے اختلاف ختم ہو سکتا ہے تو خود غیر مقلدوں میں دن بدن یہ اختلاف کیوں بڑھ رہے ہیں غیر مقلد تو تقلید کے قائل ہی نہیں آخر انہیں تو اختلافات سے بچنا چاہئے تھا سو حاصل یہ کہ ائمہ کے درمیان پائے جانے والے اختلافات فروعی مسائل میں ہیں اور اسکا اصل سب صحابہ کے اختلافات ہیں اور ان میں احترام کا پہلو یہ ہے کہ انکے اقوال میں سے کسی ایک قول کو اختیار کر کے دوسرے اقوال کو اجتہاداً حق کہو کہ ان پر عمل کرنے والا بھی ایک اجر ضرور پائیگا اور اگر انسان ان اقوال صحابہ میں سے صرف ایک کو صحیح سمجھے تو اس سے دوسرے صحابہ کا تخطیہ لازم آئیگا اور اہل سنت کے ہاں اصولاً کسی صحابی پر انگلی اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔

(۳۸) سوال :۔ اس امت میں امام ابو حنیفہ کی پیروی جاری ہو چکی تھی جب امام شافعی اور امام احمد بطور امام (متبوع فی الفروع) متعارف ہوئے اور امت ان کے اس مرتبہ علمی پر جمع ہوئی مطلع فرمائیں کہ کیا ان دونوں اماموں میں سے کسی نے امام ابو حنیفہؒ کے مرتبہ امامت میں کلام کیا یا انہیں امامت کے لائق نہ جانا۔

جواب :۔ ائمہ اربعہ میں حضرت امام مالک (۱۷۹ھ) تو حضرت امام ابو حنیفہ کے تقریباً ہم عصر تھے، رہے حضرت امام شافعیؒ (۲۰۴) تو انہوں نے باوجود اس کے کہ حضرت امام ابو حنیفہ سے کئی مسائل میں اختلاف کیا پر برملا کہا کہ تمام لوگ فقہ میں امام صاحب کے محتاج ہیں۔

من اراد الفقه فهو عيال على ابی حنیفة

(الانتقاء ص ۱۳۶ لابن عبدالبر المالکی) اس سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت امام کو استنباط و اجتہاد میں لائق امامت جانا ہے۔

رہی یہ بات کہ آپ نے حدیث بہت کم روایت کی ہے سو اس سے آپ کے مرتبہ امامت میں کوئی فرق نہیں آتا روایت کم کرنا اور بات ہے اور قلیل العلم ہونا اور بات ہے حضور ﷺ کے حالات اور ارشادات کو سب سے زیادہ جاننے والا کون تھا؟ پانچویں مسلمان سیدنا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مگر آپ بمقابلہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ حدیث بہت کم روایت کرتے تھے، محدث شہیر حافظ ابو یعلی الموصلی (۳۰۷) لکھتے ہیں۔

عن عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال و کان قلیل الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم (مسند ابی یعلیٰ ج ۱ص ۱۵۴)

صاحب مشکوۃ خطیب تبریزی شافعی مسلک کے محدث ہیں یہاں تک کہ انہوں نے مشکوۃ میں حدیث بھی امام ابو حنیفہ سے نہیں لی لیکن وہ اسے کسی درجہ میں علم کی کمی نہیں سمجھتے تھے اور ظاہر ہے کہ ان دونوں علم سے مراد فقہ و حدیث اور علم تفسیر ہی سمجھا جاتا تھا انہی خطیب تبریزی نے الاکمال میں امام ابو حنیفہ کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا ہے آپ لکھتے ہیں انہ کان عالما عاملا زاھداً اماما فی علوم الشریعة والغرض بایراد ذکرہ فی ھذہ الکتاب وان لم نرو عنہ حدیثا فی المشکوۃ للتبرك بہ لعلو مرتبتہ ووفور علمہ (مشکوۃ المصابیح ص ۶۲۵)

سو جب شافعیہ حضرات نے حضرت امام کے مرتبہ امامت سے انکار نہیں کیا تو آپ کے بھی شاگرد حضرت امام احمد کس طرح آپ کے پس مرتبہ علمی کا انکار کر سکتے تھے حضرت امام سیوطی (۹۱۱ھ) بھی شافعی تھے مگر آپ حضرت امام ابو حنیفہ کو (اپنی کتاب تبیض الصحیفہ ص ۴ پر) حضور ﷺ کی اس پیشگوئی کا مصداق قرار دیتے ہیں۔

لوکان الایمان عند الثریا لذھب بہ رجل من فارس اوقال من ابناء فارس حتی یتناولہ (صحیح مسلم ج ۲ص ۳۱۲) اسلام کے تمام علوم ایمان کی فروع ہیں جو شخص ایمان میں اس درجہ سباق الغایات اور رافع رایات ہو گا اسلام کے دیگر علوم ضروریہ میں وہ کیسے پیچھے رہ سکتا ہے اور یہ شہادت بھی انکے کسی اپنے مقلد کی نہیں ایک شافعی المذہب حافظ حدیث کی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ان جلیل القدر اماموں نے حضرت امام کے مرتبہ علمی کے خلاف۔ باوجود مسائل میں کسی طرح کے اختلاف کی کوئی اپوزیشن قائم نہیں کی تو یہ نام کے اہل حدیث (غیر مقلدین) کیوں حضرت امام کی اپوزشن میں آگئے بلکہ بری طرح آپ کے مرتبہ امامت پر حملہ آور ہوئے سوائے غزنوی خاندان کے اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اور ایک دو اور کے کسی کے نصیب میں نہ ہوا کہ وہ کھلے بندوں حضرت امام کی جلالت قدر کا احترام کرے۔

سر خدا کہ عالم و عابد کسے نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

کل ہند اجتماع مدارس عربیہ

منعقدہ ۲۱/رجب ۱۴۱۹ھ ۱۲/نومبر ۱۹۹۸ء بروز جمعرات

شوکت علی قاسمی بستوی
ناظم دفتر رابطہ مدارس عربیہ دار العلوم دیوبند

۲۱/رجب ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۲/نومبر ۱۹۹۸ء بروز جمعرات، دار العلوم دیوبند کی دعوت مدارس اسلامیہ عربیہ کا کل ہند اجتماع منعقد ہوا جس میں پورے ملک سے تقریباً دو ہزار نمائندے مدارس شریک ہوئے، اجتماع کی دو نشستیں، حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب دامت برکا مہتمم دار العلوم دیوبند کی زیر صدارت، دار العلوم کی عظیم الشان مسجد "جامع رشید" میں منعقد ہوئیں۔ جن میں مدارس کی مشکلات اور ان کے خلاف حکومت کی منفی پالیسی، سرکاری امداد احتراز، مدارس کا نظام تعلیم و تربیت، مدارس عربیہ کا باہمی ربط و اتحاد، اسلام کی حفاظت میں مدارس کی ذمہ داریاں، دینی تعلیم کے لیے غیر ملکی طلبہ کو تعلیمی ویزا کی سہولت، وغیرہ امور پر تفصیل سے تبادلہ خیال کیا گیا، اور اجتماعی غور و خوض کے بعد ۶/اہم تجاویز اتفاق رائے سے منظور کی گئیں تجاویز کا متن درج ذیل ہے۔ اجتماع کی مفصل روداد ان شاء اللہ اگلے شمارے میں پیش کی جائے گی۔

منظور شدہ کل ہند اجتماع مدارس عربیہ

منعقدہ ۲۱/رجب ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۲/نومبر ۱۹۹۸ء بروز جمعرات

تجویز (۱) مدارس کی مشکلات اور انکے خلاف حکومت کی منفی پالیسی

رابطہ مدارس عربیہ کا کل ہند اجتماع، مدارس عربیہ کی پیش آمدہ مشکلات کو شدت ساتھ محسوس کرتا ہے اور مدارس عربیہ کے خلاف لگائے جانے والے بے بنیاد اور غلط الزامات سرکاری طور پر مختلف عنوان سے مدارس کو نشانہ بنا کر پریشان کرنا، اور مدارس کے خلاف میڈیا پروپیگنڈے کو ایک منظم منصوبہ بند سازش خیال کرتا ہے، اسلام اور مسلمانوں اور ملک کے خلاف منصوبہ بند تحریک کا جزء سمجھتا ہے۔ مدارس کا تعلق پاکستان کی خفیہ تنظیم آئی ایس آئی سے مدارس کو دہشت گردی کا ٹریننگ سینٹر کہنا، دینی طلبہ کو مشکوک نگاہ سے دیکھنا، بیرونی طلبہ کو اسٹو ویزا میں دشواریاں پیدا کرنا، اسی سازش کا ایک حصہ ہے۔ جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ مدارس عربیہ

کو صحیح راستہ دکھاتے ہیں، اخوت وانسانیت کا پیغام دیتے ہیں، امن پسند، ایماندار، فرض شناس اور محب وطن شہری تیار کرتے ہیں کاروباری حیثیت سے نہیں محض علمی انداز پر انسانیت کی صلاح وفلاح کے لیے سب سے زیادہ بہتر کام کرتے ہیں۔

مدارس عربیہ ہی نے ملک کو ایسے جیالے، جانباز، محب وطن دیئے ہیں جنھوں نے آزادیٔ وطن میں ہر طرح کی قربانیاں بے دریغ پیش کر کے وطن عزیز کو انگریزی سامراج سے آزاد کرایا اور آج بھی آزاد ملک کے استحکام وسالمیت، امن وامان کی بقاء وپائیداری کے لیے اہم رول ادا کر رہے ہیں، اس کے باوجود ملک دشمن طاقتیں مدارس کے زریں کارناموں اور ملکی وملی خدمات کو نظر انداز کر کے ارباب حل وعقد کو گمراہ کرنے اور تاریخی کردار کو مسخ کر کے پیش کرنے میں مصروف ہیں اور اپنے ملک دشمن نظریات کو تعلیمی نظام میں شامل کرنے کی ناپاک کوشش کر رہی ہیں۔

اس لیے کل ہند اجتماع مدارس عربیہ، مدارس کے خلاف اس طرح کی سازشوں کی پر زور مذمت کرتا ہے اور اس کے سدباب کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرنے اور اسے عملی جامہ پہنانے کا عہد کرتا ہے، نیز حکومت ہند سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ مدارس اسلامیہ کے خلاف اس قسم کی سازشی مہم کو بالکلیہ، فوری طور سے بند کیا جائے اور حکومت اپنی مشینری کو یہ ہدایت جاری کرے کہ مدارس کے خلاف بے بنیاد فتنہ انگیز بیانات سے احتراز کریں اور ملک کے سیکولر جمہوری نظام کو پامال کرنے کے مذموم رویہ سے اپنے آپ کو بچائیں۔

تجویز (۲) سرکاری امداد سے احتراز

مدارس عربیہ کا کل ہند اجتماع محسوس کرتا ہے کہ مدارس اسلامیہ کی تعلیمی وفکری آزادی پر قدغن لگانے کے لئے مالی تعاون کی پیشکش کا سلسلہ برطانوی دور حکومت سے جاری ہے حالیہ دنوں میں اسطرح کوششیں پھر تیز ہوگئی ہیں اور مدارس عربیہ دینیہ کو مختلف شکلوں میں مالی امداد دینے کی ترغیب دی جارہی ہے، مدارس عربیہ اس طرح کی سازشوں سے ہوشیار رہیں اور حکومت سے کسی طرح کا مالی تعاون حاصل کرنے سے احتراز کریں۔

تجویز (۳) مدارس عربیہ کا باہمی ربط واتحاد

مدارس عربیہ کا یہ کل ہند اجتماع، ربط باہمی اور اس کے استحکام کو مفید، ضروری اور وقت کا اہم تقاضا سمجھتا ہے، رابطہ کی طرف سے منظور شدہ تجاویز کی روشنی میں رابطہ مدارس عربیہ کی مجلس عاملہ کی تشکیل، دستور ساز کمیٹی کا انعقاد، مدارس عربیہ کے دورے کے لیے وفود کی ترتیب اور تدریب المعلمین کے سلسلہ میں عملی اقدامات کو بنظر استحسان دیکھتا ہے، اور رابطہ مدارس عربیہ کے لیے حوصلہ افزا تصور کرتا ہے، تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں رابطہ کے رہنما خطوط اور ہدایات کی طرف

مزید توجہ اور استحکام کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور ذمہ داران مدارس سے درخواست کرتا ہے کہ رابطہ کے مجوزہ تعلیمی وتربیتی نظام کو اپنے مدارس میں لازمی طور پر نافذ کریں اور اپنا فرض ادا کرنے کی پوری کوشش کریں اور مرکزی دفتر سے مزید ارتباط پیدا کریں۔

تجویز (۴) اسلام کی حفاظت میں مدارس کی ذمہ داریاں

ہر دور میں مدارس عربیہ کا بنیادی مقصد، اسلام کی حفاظت کے لیے جدوجہد کرنا رہا۔ چنانچہ اسلام کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا مدارس نے ہر دور میں جم کر مقابلہ کیا۔ گرانقدر کارنامے اور بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور تاریخ میں وہ ان منٹ نقوش چھوڑے ہیں کوئی انصاف پسند نظر انداز نہیں کر سکتا ہے۔

موجودہ دور میں باطل طاقتیں، فرق ضالہ، عیسائی مشنریوں اور قادیانیوں نے منظم طور پوری قوت، اسلام کے خلاف صرف کر رکھی ہے ایسے نازک دور میں مدارس عربیہ کا کل ہند اجتماع مدارس عربیہ کو متوجہ کرانا ضروری سمجھتا ہے، کہ وہ حفاظت اسلام کی اپنی بنیادی ذمہ داری کو محسوس کریں اور ماضی سے زیادہ مستعد ہو کر اسلام کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا مقابلہ کریں۔ اور حیثیت و وسعت کے مطابق افراد سازی و عوامی بیداری کو مدارس کے بنیادی مقاصد میں داخل کر عوامی بیداری کے لیے اجتماعات اور دوروں کا نظام بنائیں، طلبہ کی تربیت کے لیے دارالعلوم د کے طرز پر اکابر دارالعلوم کی رہنمائی میں فرق باطلہ کے رد میں محاضرات کا اہتمام کریں تاکہ طلبہ اندر فولادی قوت کے ساتھ مقابلہ کی صلاحیت وہمت پیدا ہو اور وہ پوری طاقت کے ساتھ ان فتنو قلع قمع کر سکیں۔

تجویز (۵) اصلاح معاشرہ کی اہمیت وضرورت

مدارس عربیہ کا کل ہند اجتماع، مسلم معاشرہ میں فواحش ومنکرات، مغربی تہذیب وتمد ترویج واشاعت پر گہری تشویش کا اظہار کرتا ہے اور ان کو اسلام کی اشاعت میں بڑی رکاوٹ تا ہے۔ نئی نسل کو بنیادی دینی تعلیم کے بغیر عصری علوم کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے با اسلام کے بنیادی عقائد و فرائض واعمال کی واقفیت سے بھی محروم ہونا پڑ رہا ہے مدارس عربیہ کے ذمہ داران کی توجہ اس طرف نہایت ضروری ہے، تاکہ بددینی کے اس سیلاب کو روکا جاسکے۔

مدارس عربیہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں کے سدباب کے لیے خصوصی پروگرام بنائیں۔ اندرون و بیرون، اسلامی امتیاز و تشخص اور اسلامی معاشرہ کے لیے جدوجہد اور ضروری اقدامات کریں۔

بقیہ (۴۳)

دار العلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

ماہ شعبان ررمضان ۱۴۱۹ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۹۸ء جنوری ۱۹۹۹ء

جلد ۸۲	شمارہ ۱۲/۱۳	فی شمارہ ۱۲/	سالانہ ۶۰/

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

سالانہ بدل

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۴۰۰/ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/، بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/
ہندوستان سے ۶۰/

Tel. : 01336 - 22429
Fex : 01336 - 22768
Tel. : 01336 - 24034 (EDITOR)

فہرست مضامین

○ یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

☆ ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔

☆ چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے، اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔

☆ پاکستانی حضرات مولانا نورالحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

☆ ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

☆ بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مولانا جعفر احمد صاحب محمد علی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

دین و مذہب کی آزادی انسان کے ان بنیادی حقوق میں سے ایک ہے جنہیں انسانیت کا فطری خاصہ مانا جاتا ہے، اور ہر مہذب حکومت نے انسان کے اس فطری حق کا پاس ولحاظ رکھا ہے، خود ہمارے ملک میں جو مختلف افکار و مذاہب اور تہذیب و ثقافت کا گہوارہ ہے شخصی عہد سلطنت میں مذہبی آزادی کی کس قدر پاسداری کی جاتی تھی اس کا اندازہ بھارت کے "انگریزی راج" کے مصنف پنڈت سندر لال الہ آبادی کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے:

وہ عہد مغلیہ میں مذہبی آزادی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اکبر، جہاں گیر، شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو و مسلم یکساں رہتے تھے۔ دونوں مذاہب کی یکساں توقیر کی جاتی تھی، اور مذہب کے لئے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانب داری نہ کی جاتی تھی۔ (روشن مستقبل ص ۲۴)

مذاہب عالم کی تاریخ اور واقعات و مشاہدات سے پتہ چلتا ہے کہ آزادیٔ مذہب کا مسئلہ اس درجہ نازک اور جذباتی ہے کہ جب بھی کسی حاکم یا حکومت کی جانب سے اس پر قدغن لگانیکی غیر شریفانہ کوشش کی گئی ہے، تو عوام نے اسے برداشت نہیں کیا ہے۔ بلکہ اکثر حالات میں حکومت کا یہی بیجا رویہ بغاوت اور انقلاب کا پیش خیمہ بن گیا ہے۔ آزادیٔ ہند کی تاریخ کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ برطانوی حکومت کے خلاف ۱۸۵۷ء کی تاریخی جدوجہد کا اہم ترین محرک مسلمانوں اور ہندوؤں کا یہ اندیشہ تھا کہ ان کے مذہب میں رخنہ اندازی اور اسے خراب کرنیکی کوشش کی جارہی ہے۔ جنگ آزادی کے نامور مجاہد اور عظیم رہنما مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک موقع پر حکومت برطانیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

اسلام کے احکام کوئی راز نہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو وہ چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں اور مدرسوں کے اندر شب و روز اس کا درس دیتے ہیں۔ پس گورنمنٹ کو چاہئے کہ صرف

اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام ایسے ہیں یا نہیں! اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر صرف دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئیں یا مسلمانوں کے لئے ان کے مذہب کو چھوڑ دے اور کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے ان کے مذہب میں مداخلت ہو یا پھر اعلان کر دے کہ حکومت کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ نہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ "ان کے مذہب میں مداخلت نہیں ہوگی" اس کے بعد مسلمانوں کے لئے نہایت آسانی ہو جائے گی کہ وہ اپنا وقت بے سود شور و فغاں میں ضائع نہ کریں اور برٹش گورنمنٹ اور اسلام ان دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لئے پسند کر لیں (مسئلہ خلافت و جزیرۂ عرب ص ۲۰۴)

جہاد حریت کے ہر اول حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے آج سے تقریباً اسی (۸۰) سال پہلے ہندوستان میں اتحاد کی ضرورت پر اظہار خیال فرماتے ہوئے مذہبی آزادی کے مسئلہ کی نزاکت کو دوٹوک لفظوں میں واضح فرمادیا تھا ملاحظہ کیجئے حضرت کی اختتامی تقریر کا اقتباس فرماتے ہیں:

میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اجتماع کو بہت ہی مفید اور ضروری سمجھتا ہوں اور حالت کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عمائدنے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حال اگر اس کے برخلاف ہو گئی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو آئندہ کے لئے ناممکن بنادے گی اس لئے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں عنصر بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو ان اقوام کی اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر واستبداد سے شکست دے سکے گی۔

ہاں میں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت و آشتی کو اگر آپ خوشگوار اور پائدار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دل نشیں کر لیجئے۔ اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہر گز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔ (جمعیۃ علماء کیا ہے ص ۱۳۲)

حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کے مقام و مرتبہ اور ان کی ہمہ گیر مقبولیت سے باخبر اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ حضرت شیخ الہند کی اپنی تنہا کی آواز نہیں تھی بلکہ یہ پورے ملت اسلامیہ ہند کی ترجمانی تھی۔ حضرت شیخ الہند کی اسی رائے کو جمعیۃ علمائے ہند نے اپنے لاہور کے عام اجلاس میں بشکل تجویز ان الفاظ میں پیش کیا:

(الف)..... ہمارا نصب العین آزادی کامل ہے۔

(ب) وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے۔ ان کا مذہب آزاد ہو گا۔ مسلم کلچر

اور تہذیب آزاد ہوگی۔ وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

(ج)...... جمعیۃ علماء ہند کے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا سیاسی وفاق ضروری اور مفید ہے مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہ ہوگی یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصولوں پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔ (جمعیۃ علماء کیا ہے ص ۳۳۳)

پھر اپنی مجلس عاملہ منعقدہ ۱۸/۱۷ اگست ۱۹۴۲ء کے اجلاس میں دین ومذہب کے متعلق مسلمانوں کے اسی نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے واضح الفاظ میں یہ تجویز منظور کی۔

"اس موقعہ پر ہم یہ بھی واضح کردینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر علماء کو اس امر کا ذرہ بھر بھی وہم ہو تا کہ جدوجہد آزادی کا نتیجہ ہندوستان میں ہندوراج قائم ہو جانا ہے تو وہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر اس کی شدید مخالفت کرتی"

ہم آزاد ہندوستان سے وہ آزاد ہندوستان مراد لیتے ہیں جس میں مسلمانوں کا مذہب ان کی اسلامی تہذیب اور قومی خصوصیات آزاد ہوں۔ مسلمان جو انگریز کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بیش بہا اور شاندار قربانیاں پیش کریں گے ان کی نسبت ہندوؤں کی غلامی قبول کرنے کا تصور بھی ان کی سخت توہین ہے (جمعیۃ علماء کیا ہے ص ۳۴۴،۳۴۳)

ان تفصیلات سے سمجھا جاسکتا ہے کہ دین و مذہب کا مسئلہ کس قدر نازک اور جذباتی ہے۔ بالخصوص مسلمان اس بارے میں کس درجہ حساس ہیں مذہب کی اسی حیثیت واہمیت کا نتیجہ ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد جب آزاد ہندوستان کا دستور مرتب ہوا تو اس میں خصوصی طور پر مذہبی حقوق پر توجہ دی گئی اور آزادی مذہب کو بنیادی اصول میں شامل کیا گیا اور اس کے تحت حسب ذیل دفعات رکھی گئیں:

دفعہ ۲۵۔ (ا) تمام اشخاص کو آزادئ ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے، اس کی پیروی اور اس کی تبلیغ کا مساوی حق ہے بشرطیکہ امن عامہ، اخلاق عامہ صحت عامہ اور اس حصہ کی دیگر توضیحات متاثر نہ ہوں۔

دفعہ ۲۶۔ اس شرط کے ساتھ کہ امن عامہ اور صحت عامہ متاثر نہ ہوں، ہر ایک مذہبی فرقے یا اس کے کسی طبقے کو حق ہوگا۔

(الف)...... مذہبی اور خیراتی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا۔

(ب)...... اپنے مذہبی امور کا انتظام خود کرنے کا الخ

دفعہ ۲۷۔ کسی شخص کو ایسے ٹیکسوں کے ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائیگا جن کی آمدنی کسی خاص مذہب یا مذہبی فرقہ کی ترقی یا اس کو قائم رکھنے کے مصارف ادا کرنے کے لئے صراحتاً تصرف کی جائے۔

دفعہ ۲۸۔(۱) کسی ایسے تعلیمی ادارے میں جو بالکلیہ مملکتی فنڈ سے چلایا جاتا ہو کوئی مذہبی تعلیم نہیں دی جائے گی۔

(۲) فقرہ(۱) کے کسی امر کا اطلاق ایسے تعلیمی ادارہ پر نہیں ہوگا جس کا انتظام مملکت کرتی ہو لیکن جو کسی ایسے وقف یا ٹرسٹ کے تحت قائم کیا گیا ہو جو ایسے ادارہ میں مذہبی تعلیم دینا لازم قرار دے۔

(۳) کسی ایسے شخص پر جو کسی ایسے تعلیمی ادارہ میں شریک ہو جو مملکت کا مسلمہ ہو یا جس کو مملکتی فنڈ سے امداد ملتی ہو لازم نہ ہوگا کہ کسی ایسی مذہبی تعلیم میں حصہ لے جو ایسے ادارے میں دی جائے یا ایسی مذہبی عبادت میں شریک ہو جو ایسے ادارہ میں یا اس ملحقہ عمارت واراضی میں کی جائے بجز اس کے کہ ایسے شخص نے یا اگر وہ نابالغ ہو تو اس کے ولی نے اس کیلئے اپنی رضامندی دی ہو۔

ثقافتی اور تعلیمی حقوق سے متعلق دفعات:

دفعہ ۲۹۔(۱) بھارت کے علاقہ میں یا اس کے کسی حصہ میں رہنے والے شہریوں کے کسی طبقہ کو جس کی اپنی الگ جداگانہ زبان، رسم الخط، یا ثقافت ہو اس کو محفوظ رکھنے کا حق ہوگا۔

(۲) کسی شہری کو ایسے تعلیمی ادارہ میں جس کو مملکت چلاتی ہو یا۔ جس کو مملکتی فنڈے سے امداد ملتی ہو داخلہ دینے سے محض مذہب، نسل، زبان یا ان میں سے کسی بنا پر انکار نہیں کیا جائیگا

دفعہ ۳۰۔ تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی بنا پر ہوں یا زبان کی اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کے انتظام کرنیکا حق ہوگا بھارت کے آئین یکم جنوری ۱۹۸۵ء ترمیم شدہ شائع کردہ ترقی اردو بیورو وزارت تعلیم حصہ ۳ بنیادی حقوق ص ۴۶، ۴۷) ان دستوری مستحکم ضمانتوں کے ساتھ دستور ساز اسمبلی میں اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو اطمنان دلاتے ہوئے سردار ولبھ بھائی پٹیل نے یقین دہانی کرائی تھی کہ ان کے مفادات کا ان کے اطمنان کی حد تک خیال رکھا جائے گا اور اسے اسٹیٹ ایک مشن یعنی کاز کی حیثیت دے گا۔

مگر راج گدی پر بیٹھتے ہی یہ سارے عہد و پیمان اور قول و قرار ہوس اقتدار کی نظر ہو گئے اور ایک خاموش تحریک شروع کردی گئی کہ نصاب تعلیم اور سرکاری اسکولوں کے ماحول کے ذریعہ ہندو تہذیب بلکہ صحیح لفظوں میں برہمن ازم ~~کو یہاں کے بچہ بچہ کے دل ودماغ~~ میں اتار دیا جائے۔ اور پہلے قدم کے طور پر گاندھی جی کی مشہور پرارتھنا اسکولوں میں جاری کی گئی جس میں مسلم بچوں کی شرکت بھی لازم کردی گئی۔ جس کے بند یہ ہیں:

رگھوپتی رادھے راجہ رام — پتت پاون سیتارام

پتت پاون سیتارام — ایشور، اللہ تیرا نام

چنانچہ ایک مسلم ماسٹر نے اس سلسلہ میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کو خط لکھ کر یہ اطلاع دی کہ سرکاری اسکولوں میں یہ پرار تھنا لازم کر دی گئی ہے جب کہ مسلم بچوں کو مذہبی بنیاد پر اعتراض ہے تو کیا واقعی اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی بات قابل اعتراض ہے۔اس کے جواب میں حضرت مجاہد ملت نے تحریر فرمایا:

گاندھی جی کا یہ گیت اسلام کے عقیدۂ توحید کے بالکل خلاف ہے اس لئے کہ اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ ایشور، خدا اس ذات کا نام ہے جو نہ کسی کا باپ ہے، اور نہ کسی کی اولاد نہ کسی کا شوہر نہ بیوی وہ ان تمام رشتوں سے پاک ہے، اس کا کوئی ہمسر اور برابر نہیں (سورۂ اخلاص)

جس گیت میں رام، ایشور اور اللہ کو ایک ہی بتایا جا رہا ہے اور ساتھ ہی رام کو سیتا جی کا پتی اور سیتا جی کو رام کا دھرم پتنی کہا جا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اسلام اس کو قبول نہیں کر سکتا مسلمان بچوں کو اعتراض ہے تو بجا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کو اس گیت کے گانے پر مجبور کیا جائے اس لئے کہ ایک سیکولر اسٹیٹ میں یہ کبھی جائز نہیں ہو سکتا۔

اسی برہمنی تہذیب عام کو کرنے کی ہوس میں مختلف نام کی تصویروں اور مجسموں پر بطور عقیدت پھول مالائیں نہیں چھڑ انے کا نہ صرف رواج دیا گیا بلکہ اسے ضروری قرار دیا جائے نے لگا چنانچہ اس سلسلے میں بھی مولانا موصوف کے پاس ایک مراسلہ آیا۔ جس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

آپ نے اپنے خط میں دو سوال کئے ہیں جو یہ ہیں:

(۱) کیا یہ صحیح ہے کہ مذہب اسلام کی رو سے کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی بھی تصویر یا مجسمہ پر ہار پھول چڑھائے؟

(۲) کیا ملک کا سیکولر آئین یا کانگریس کا دستور کسی شخص کے لئے یہ لازم قرار دیتا ہے کہ وہ ملک و وطن کے کسی لیڈر کی تصویر یا مجسمہ پر ضرور ہار پھول چڑھائے اور جو شخص ایسا کرنے سے اپنے مذہب کی پابندی کرتے ہوئے انکار کر دے تو اس کو مجرم سمجھا جائے؟

آپ نے جو سوالات تحریر فرمائے ہیں ان کا جواب درج ذیل ہے (۱) مسٹر معین الدین وزیر آسام نے جو عمل کیا ہے وہ اسلامی بنیادی عقیدہ کے اعتبار سے قابل ستائش ہے میں ان کو جرأت حق کی داد دیتا ہوں، اسلام کے عقیدۂ توحید کا تقاضہ ہے کہ کوئی عمل مسلمان ایسا نہ کرے جس سے اس کے بنیادی عقیدہ پر بالواسطہ یا بلاواسطہ زد پڑتی ہو اسلام نے اسی وجہ سے نبی اور پیغمبروں کے ساتھ بھی اس طرح کے عمل کی اجازت نہیں دی ہے جس سے پرستش کا شائبہ یا واہمہ ہوتا ہو اسلام نے اسی بناء پر نبیوں اور پیغمبروں حتی کہ رسول پاک ﷺ کی تصویر بنانے کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اسے اسلام اور حضور کی توہین قرار دیا ہے۔

اس لئے گاندھی جی کی شخصیت کی عظمت اپنی جگہ قابل تسلیم رہتے ہوئے بھی کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ گاندھی جی کی تصویر یا مجسمہ یا کسی بھی مسلم رہنما کی تصویر پر ہار پھول چڑھائے۔

(۲) ہماری قومی حکومت کسی خاص مذہبی عقیدہ کی حکومت نہیں ہے بلکہ ملک کے عوام کی ملی جلی جمہوری حکومت ہے جس کو ہم سب سیکولر کے نام سے موسوم کرتے ہیں سیکولر اسٹیٹ کا جو دستور بنایا گیا ہے اس میں مذہب کی آزادی کو بنیادی حقوق میں اہم ترین حق تسلیم کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے عقیدہ کے مطابق مذہبی آزادی حاصل ہو یعنی کوئی شخصیت یا کوئی کمیونٹی دوسروں سے اپنے مذہبی عقائد اور اعمال زبردستی منوانے کی مجاز نہ ہوگی۔ آئین ودستور۔

لیکن قانون وانصاف اخلاق وتہذیب اور قومی اقدار اور روایات کے بر خلاف بھارتیہ جنتا پارٹی جس کی بنیاد ہی ہندو احیاء پرستی اور اسلام دشمنی و مسلم بیزاری پر قائم ہے جس کی تمام جہد و سعی اور دوڑ دھوپ "ہندی، ہندو، ہندوستان" کے بنیادی فکر وفلسفہ کے گرد گھوم رہی ہے۔ بدقسمتی سے ملک کے اقتدار پر قابض ہو گئی ہے۔ اس نے تعلیم کے عنوان سے ایک ایسے انقلاب کی راہ ہموار کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جو مسلمانوں کے نظریات و عقائد کے لئے انتہائی خطرناک و مہلک اور ان کی نوجوان نسل کے ذہنی ارتداد و گمراہی کا باعث ہو سکتا ہے۔

پرائمری اسکولوں میں جن میں مسلمان بچوں کی کثیر تعداد زیر تعلیم رہتی ہے سرکاری طور پر جو ٹائم ٹیبل بھیجا جا رہا ہے اس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ بچے تعلیم شروع کرنے سے پہلے "بھارت ماتا" کی تصویر پر پھول چڑھائیں اور "وندے ماترم" کا گیت گائیں گے اسی کے ساتھ رامائن، مہابھارت اور اپنشد کی تعلیم دی جائے گی۔

بھارت ماتا یعنی ہندوستان کی جو فرضی تصویر بنائی گئی ہے وہ در اصل ہندو مذہب "در کادیوی" کی تصویر ہے اس طرح سرزمین ہند کو درگادیوی تصور کر کے اس کی عظمت و تعریف کے آگے اسکول کے سارے بچوں کو جھکنے اور اظہار عقیدت و محبت کے طور پر پھول چڑھانے کا حکم دیا جارہا ہے، جو مسلمانوں کے عقیدہ توحید کے لحاظ سے خالص مشرکانہ گیت ہے اس کے چند بندوں کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے۔ ہندوستان کو مخاطب کر کے کہا جارہا ہے۔

"وندے ماترم" میں تری وندنا کرتا ہوں اے میری ماں یہ اس گیت کا مرکزی مصرعہ ہے اس کے چوتھے بند میں کہا گیا ہے: تو ہی مرا علم ہے تو ہی مرا دھرم ہے، تو ہی میرا باطن ہے، تو ہی میرا مقصد ہے، تو ہی جسم کے اندر کی جان ہے، تو ہی بازوؤں کی قوت ہے، دلوں کے اندر تیری ہی حقیقت ہے ایک ایک مندر میں تیری ہی محبوب مورتی ہے، تو درگا دس مسلح ہاتھوں والی، تو ہی کملا ہے کنول

کے پھولوں کی بہار، تو ہی پانی ہے علم سے بہرہ ور کرنے والی، میں تیرا غلام ہوں، غلام کا غلام ہوں، اچھے پانی، اچھے پھلوں والی میری ماں میں تیرا بندہ ہوں"

چھٹے بند میں یہ کہا گیا ہے:

• لہلہاتے کھیتوں والی مقدس موہنی آراستہ پیراستہ، قدرت والی قائم ودائم ماں میں تیرا بندہ ہوں

بلاشبہ وطنِ عزیز کے ذرہ ذرہ سے ہمیں پیار ہے، انس ہے، محبت ہے، اور بلا ریب ہندوستان ہمارا محبوب ہے، یہ ایک ایسی سچی حقیقت ہے جس کی شہادت ارض وطن کا ایک ذرہ دے رہا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک انمٹ حقیقت ہے کہ ایک سچا پکا مسلمان اپنے اس محبوب کو معبود کا درجہ کبھی نہیں دے سکتا کہ اسے خدا قادر مطلق قائم ودائم مان کر، اس کی پوجا اور بندگی کرنے لگے لیکن موجودہ حکومت ہند واحیاء پرستی کے نشہ میں اس قدر سرمست ہے کہ اسے نہ دستور ہند کا پاس و لحاظ ہے نہ قانون وانصاف کی پرواہ اور نہ ہی ملک کے سیکولر روایات کا خیال وہ تو بس اس دھن میں ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو ہندومت میں جذب کرلے اور اپنی تعلیمی پالیسی کے تحت سرکاری طاقت کے ساتھ اس کا آغاز کردیا ہے۔ ان حالات میں ہمارے سامنے بھی صرف دو راستے ہیں ایک یہ کہ ہم حالات کے سامنے سر تسلیم خم کردیں اور حکومت وقت جس سمت ہمیں لے جانا چاہتی ہے بغیر کسی مزاحمت کے ہم اس رخ پر چل پڑیں بالفاظ دیگر اپنے دین و عقیدہ تہذیب و کلچر کو ترک کرکے ہندومت میں جذب ہوجائیں۔ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان اپنا سب کچھ قربان کرسکتا ہے۔

لیکن اپنے دین ومذہب سے دست بردار ہوجائے یہ نہ کبھی ہوا ہے اور نہ آج ہوسکتا ہے دوسرا راستہ یہ ہیکہ اپنے دین، اپنی تہذیب اور اپنی ملی ایک ایک روایات ایک حفاظت اور اپنی ایک ایک ملی روایت کی حفاظت وبقاء کے لیے اپنے اکابر واسلاف کے اسوہ کے مطابق استقامت وپامردی اور ہمت و جرأت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کریں۔

بطور خاص حضرات علماء اور ملک کے دانشوروں کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ ملت کی کشتی کس سمت لے جائیں گے۔ کیونکہ خودرائی وخودپسندی کے اس دور میں بھی ملت کی زمام قیادت انہیں کے ہاتھوں میں ہے اور انہیں کے سامنے حضرات اکابر کے جہد وعمل کی مکمل تاریخ ہے اس لئے شدید ضرورت ہے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور وقت کے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ایثار و قربانی کی تاریخ کو پھر سے زندہ کریں۔

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونیں منظر سے
اس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے

سیرۃ خاتم الانبیاء کانفرنس مکہ مسجد حیدر آباد

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

الحمد لله رب العٰلمين والصلوٰة والسلام على رسوله محمد و علىٰ اله و صحبه اجمعين . اما بعد !

فقد قال النبی ﷺ انه سيكون فی آخر هذه الامة قوم لهم مثل اجر اولهم يا مرون بالمعروف و ينهون عن المنكر ويقاتلون اهل الفتن (رواہ البیہقی مشکوٰۃ ص ۵۸۴)

حضور پاک صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس امت کے آخر میں ایک ایسی قوم ہوگی جنہیں اس امت کے اولین طبقہ جیسا ثواب دیا جائے گا یہ لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے ہوں گے اور اہل فتنہ سے قتال کرنے والے ہوں گے۔

محترم سامعین! حمد و صلوٰۃ کے بعد سب سے پہلے میں صمیم قلب سے اہل حیدر آباد۔ خصوصاً دارالعلوم رحمانیہ کے مخلص کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی دعوت پر حاضری کا اتفاق ہوا اور زندگی کے یہ سعید لمحات ایک ایسے ماحول میں گذارنے کا اتفاق ہوا جو ماضی قدیم سے دارالعلوم دیوبند سے مربوط ہے، اور فکر و نظر کے اتحاد کے ساتھ ہمیشہ دارالعلوم دیوبند کو ان سے تعاون ملتا رہا ہے۔ خدا کرے کہ یہ دینی رشتے مستقبل میں مزید استحکام حاصل کریں اور ملت کا قافلہ تعاون باہمی کی فضا میں رضائے خداوندی کے حصول کی طرف رواں دواں رہے۔ آمین

حضراتِ گرامی قدر! میں نے جو روایت پیش کی ہے، اس میں بنیادی طور پر دو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ حضور پاک صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت دی ہے کہ اس امت کے آخر میں خدائے تعالیٰ ایسے لوگوں کو پیدا فرمائے گا جنہیں اس امت کے قرنِ اول کے برابر ثواب دیا جائیگا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ ثواب صرف دو امتیازی اوصاف کی بنیاد پر ملے گا، ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دوسرے فتنہ پردازوں سے مقابلہ۔ اور اس کی اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دین کو صحیح طور پر محفوظ رکھنا ان دونوں باتوں کے بغیر ممکن نہیں۔

قرنِ اول یعنی صحابہ کرامؓ کے ثواب کے برابر ثواب دیا جانا، بہت اہم اور خاص فضل کرم کی بات ہے، ایک حدیث میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:

اگر کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا خدا کی راہ میں خیرات کرے تو صحابہ کرامؓ کے معمولی خرچ کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن یہ خدا کا کتنا بڑا احسان ہے کہ وہ چند خصوصیات پر امت کے آخری طبقہ کو اولین طبقہ کے برابر ثواب عطا فرمارہا ہے۔

ان خصوصیات میں پہلی خصوصیت یہ ہے، **امر بالمعروف اور نہی عن المنکر**، یہ اِس امت محمدیہ کا خاص وصف ہے، فقہاء نے اس کو واجب علی الکفایہ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ خصوصیت اس امت کے خصوصی طبقے میں ہمیشہ موجود رہی ہے، اکابر دیوبند اور ان کے طریقہ پر کام کرنے والے تمام ادارے اور افراد اس پر عمل پیرا رہے ہیں، اور یہ دارالعلوم دیوبند کا شعار ہے، خدا ہمیں اس کے شرائط و آداب کے مطابق کام کرتے رہنے کی توفیق عطا فرماتا رہے، اور اس راہ کی دشواریوں کو دور فرمائے۔

اور دوسری خصوصیت ہے، فتنہ پردازوں سے مقابلہ اس خصوصیت کا حق ادا کرنے میں بھی دارالعلوم دیوبند اکابر دارالعلوم اور ان کے انداز پر کام کرنے والے اداروں اور شخصیات کا خاص کردار رہا ہے اور الحمدللہ، آج بھی یہ جماعت اپنے فرض منصبی کو ادا کرنے میں مستعد ہے۔

فتنے تو قرن اول ہی میں شروع ہوگئے تھے، مسیلمہ کذاب تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فتنوں کا ایک سیلاب تھا جسے قرن اول کے بزرگوں نے ختم کرنے کی جدوجہد کی' جن میں ہر طرح کے اہل بدعت کو شمار کیا جاسکتا ہے۔

محترم بزرگو اور ساتھیو! اس دور میں یہ فتنے نئے ساز و سامان کے ساتھ سامنے آتے رہتے ہیں اور قرن اول کا ثواب حاصل کرنے کے لئے ہمیں ان کا مقابلہ بھی انشاءاللہ کرتے رہنا ہے، لیکن اس اہم خدمت کے لئے ہمیں مندرجہ ذیل باتوں کو اہمیت کے ساتھ کرنا چاہئے۔

(الف) فتنوں کی پہچان اور اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ دینِ صحیح، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ حقائق کا نام ہے اور ہمارے اسلاف واکابر نے کتاب وسنت کی روشنی میں تمام باتوں کو منقح فرمادیا ہے۔ اگر دین میں کوئی اپنی طرف سے کسی چیز کا اضافہ کرتا ہے یا کسی چیز میں کمی کرتا ہے تو ہماری ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ ہم دین کو صحیح اور اصل صورت پر قائم رکھنے کی جدوجہد کریں۔

(ب) دوسری بات ہے عزم حوصلہ، ظاہر ہے کہ مخلصانہ عزم اور جرأت مندانہ حوصلے کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا ہمیں ہمیشہ اپنے فرض منصبی کو یاد رکھنا چاہئے اور خدا کے اجر و ثواب کے وعدوں کو مستحضر کرکے لگن کے ساتھ جدوجہد جاری رکھنی چاہئے۔

(ج) تیسری بات ہے تیاری انسان جو کام کرتا ہے پہلے اس کے لئے سازوسامان مہیا کرتا ہے ان فتنوں کے مقابلہ کے لئے علم صحیح سب سے بڑا ہتھیار ہے، ہمیں علم صحیح کے حصول کی جد وجہد کرنی چاہئے تاکہ آنے والے تمام فتنوں کو استدلال کے میزان پر شکست دی جاسکے۔

(د) اور چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ ہمیں یہ سب کام تعلق مع اللہ اور رضائے خداوندی کے حصول کے لئے کرنے چاہئیں جیسا کہ صحابہ کرام تابعین، ائمہ اور ہمارے اسلاف کا طریقہ رہا ہے قابل احترام علماء وسامعین! حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے آخری طبقے کو اولین طبقے کے برابر ثواب دیئے جانے کی جو بشارت دی ہے، اس کی روح ہے دین مبین کی حفاظت کے لئے کی جانے والی جد وجہد 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی یہی بات ہے اور اہل فتن سے مقابلہ میں یہی بات ہے اس دور کا سب سے اہم فتنہ قادیانیت ہے کہ اس میں مبتلا ہونے والا ایمان کی دولت سے محروم ہو جاتا ہے، دارالعلوم دیوبند نے اس فتنے کا پہلے بھی مقابلہ کیا تھا اور اب چند سالوں سے اس نے پھر بال وپر نکالے ہیں تو الحمد للہ دارالعلوم اور اسکے فرزند اس کو ختم کرنے کے لئے میدان میں ہیں۔ میری اپنے تمام احباب اور اپنی جماعت کے تمام اداروں اور افراد سے یہی درخواست ہے کہ وہ دین مبین کی حفاظت کے لئے اپنے اسلاف کی طرح کام کرتے رہے ہیں پروردگار عالم ہمیں اپنے فضل وکرم سے انہی خطوط پر کام کرنے کی توفیق عطاء فرمائیں جو ہمیں قرن اول کے ثواب کا مستحق بنائیں میں آخر میں پھر حیدر آباد کے ارباب علم اور اہل فضل وکمال کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کے تعاون اور دلچسپی سے یہ جلسہ سیرت خاتم الانبیاء منعقد ہو رہا ہے، اس تاریخی شہر کا دارالعلوم دیوبند اور اسکے اکابر سے محبت وعقیدت اور مسلک وشرب کا قریبی تعلق رہا ہے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے والد محترم حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ قدس سرہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند العدالۃ العالیہ کے چیف جسٹس رہے ہیں، اور اکابر دیوبند میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوری، حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ عثمانی اور حضرت مولانا محمد طیبؒ صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند قدس اللہ سرہم بار بار یہاں تشریف لائے ہیں 'اور اسی شہر کے اہل خیر کے تعاون سے متعدد بڑی اور اہم علمی کتابیں شائع ہوئی ہیں 'فرزندان دارالعلوم میں حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا اس شہر میں عرصہ دراز تک قیام رہا ہے، انھوں نے اس شہر کی علمی فضاؤں کو اپنے علمی کارناموں سے منور فرمایا ہے، اور آج بھی الحمد للہ متعدد علمی ادارے دارالعلوم کے مسلک ومنہاج پر کام کر رہے ہیں، اور فرزندان دارالعلوم کی ایک قابل قدر جماعت الحمد للہ علم کی اشاعت میں مصروف ہے خدا ان تمام فیوض وبرکات کو اہل حیدرآباد کے لئے قائم ودائم فرمائے۔ **والحمد للہ اولاً وآخراً**

مسئلہ رفع یدین

از: حضرت مولانا فخر الدین صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند
جمع وترتیب: مولانا ریاست علی صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

باب رفع اليدين اذاكبرو اذاركع و اذارفع

حدثنامحمد بن مقاتل قال اخبرنَاعبد الله بن المبارك قال: اخبرنا يونس عن الزهرى قال: اخبرنى سالم بن عبد الله عن عبد الله بن عمرقال رأيت رسول اللهﷺ اذاقام فى الصلوٰة رفع يديه حتىٰ تكوناحذو منكبيه و كان يفعل ذالك حين يكبرالركوع ويفعل ذالك اذارفع راسه من الركوع و يقول سمع الله لمن حمده ولايفعل ذالك فى السجود.

حدثنااسحاق الواسطى قال: حدثناخالد بن عبد الله عن بخالد عن ابى قلابة انه رأىٰ مالك بن الحويرثِ اذاصلىٰ كبرورفع يديه و اذااراد ان يركع رفع يديه و اذارفع راسه من الركوع رفع يديه و حدث ان رسول اللهﷺ صنع هٰكذا.

ترجمہ: "باب تکبیر تحریمہ کے وقت رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے ہاتھوں کو اٹھانے کا بیان" حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جب آپ نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو آپ اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے، یہاں تک کہ ہاتھ مونڈھوں کے برابر ہو جاتے، اور جب آپ رکوع کے لئے تکبیر کہتے تو بھی آپ یہی رفع کرتے تھے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو بھی ایسا ہی کرتے تھے اور "سمع الله لمن حمده" کہتے تھے اور آپ یہ عمل سجدہ میں نہیں کرتے تھے، ابو قلابہ کہتے ہیں کہ انھوں نے حضرت مالکؓ بن الحویرث کو دیکھا کہ جب وہ نماز

پڑھتے تو اللہ اکبر کہتے اور رفع یدین کرتے اور جب رکوع میں جانے کا ارادہ کرتے تو رفع یدین کرتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع یدین کرتے، اور انھوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسا ہی کیا۔

مقصد ترجمہ :

مقصد بالکل واضح ہے کہ تکبیر تحریمہ منعقد کرتے ہوئے رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے رفع یدین سنت ہے۔ امام بخاری کا مسلک یہی ہے اس موضوع پر انھوں نے ایک مستقل رسالہ، "جزء رفع الیدین" تصنیف کیا ہے جس میں انھوں نے رفع یدین کا انکار کرنے والوں یا اس کو بدعت کہنے والوں کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے، کہ رفع یدین کو بدعت کہنا صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد آنے والے اسلاف پر طعن کرنے کے مرادف ہے اور یہ کہ ترک رفع کرنے والے جیسے سفیان ثوریؒ، وکیع اور اہل کوفہ بھی رفع یدین کرنے والوں پر خفگی کا اظہار نہیں کرتے وغیرہ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام بخاری کا رسالہ بھی انصاف کا حامل ہونے کے بجائے مناظرانہ رنگ لئے ہوئے ہے اور وہ ترک رفع کرنے والوں کی تردید کے سلسلے میں حد سے تجاوز فرماگئے ہیں حیرت ہوتی ہے کہ وہ ترک رفع کی کوئی گنجائش ہی نہیں سمجھتے ان کا دعوی ہے کہ ترک رفع حدیث سے ثابت نہیں جبکہ واقعہ یہ ہے کہ دونوں مسلک حدیث ہی سے ثابت ہیں اور کتنے ہی صحابہ کرام، تابعین اور جلیل القدر ائمہ فقہاء اور محدثین ترک رفع کی ترجیح کے قائل ہیں۔

مسئلہ کی نوعیت :

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے میں دونوں فریق کے راہ اعتدال سے تجاوز کر کے مناظرانہ انداز اختیار کرنے کے سبب یہ مسئلہ اہمیت اختیار کر گیا، پھر عصر حاضر کی ادب واحترام سے محروم ایک جماعت کی جارحیت کے سبب ہندوستان میں اس مسئلہ کو مزید اہمیت حاصل ہوگئی، ورنہ ائمہ مجتہدین کے درمیان تو اس مسئلہ میں اختلاف محض اولیٰ وغیر اولیٰ یا افضل ومفضول کا ہے جن ائمہؒ نے رفع یدین کو راجح قرار دیا ہے ان کے یہاں ترک رفع بھی جائز ہے اور جن ائمہ کا مسلک مختار ترک رفع ہے، ان کے یہاں رفع یدین بھی مباح ہے، حضرت گنگوہی سے اس مسئلہ میں سوال کیا گیا تو تحریر فرمایا، "میرا مسلک ترک رفع کا ہے جیسا کہ قدماء حنفیہ نے فرمایا ہے اور طعن بندے کے نزدیک کسی پر روا نہیں کہ مسئلہ مختلف فیہا ہے اور احادیث دونوں طرف موجود ہیں اور عمل صحابہؓ بھی اور قوت ا ضعف مختلف ہوتے ہیں، بالآخر دونوں معمول بہا ہیں (فتاوی رشیدیہ ص ۲۶۴) حضرت گنگوہیؒ کی تحریر سے اکابر دیوبند کا ذوق معلوم ہو گیا کہ یہ متقدمین کے شدت پسند طبقہ سے دور تر ہیں اور ان میں سے اعتدال پسند طبقے کے رجحانات کے حامل ہیں جیسے چوتھی صدی کے مشہور مفسر اور حنفی فقیہ امام

ابوبکر جصاصؒ (المتوفی ۳۷۰ھ) نے احکام القرآن میں "کتب علیکم الصیام" کے تحت رویت ہلال پر بحث کرتے ہوئے یہ اصول بیان کیا ہے کہ عوامی ضرورت اور فرض درجہ کے احکام کے ثبوت کیلئے خبر مستفیض کی ضرورت ہے اور اگر مسئلہ مسلمانوں کی عام ضرورت سے متعلق نہ ہو اور حکم بھی فرض کے درجے میں نہ ہو تو وہاں خبر مستفیض پر انحصار نہیں، اخبار آحاد سے بھی یہ احکام ثابت ہوسکتے ہیں۔ اور ایسے مسائل میں فقہاء کے درمیان اختلاف عموماً افضل وغیر افضل کا ہوتا ہے پھر انھوں نے اس کی مثال میں کلمات اذان واقامت میں اختلاف، رکوع میں جاتے وقت رفع یدین تکبیرات عیدین وغیرہ کا شمار کیا ہے (احکام القرآن ص ۴، ۳۰۳ ج ۱) معلوم ہوا کہ فقہاء شافعیہ میں جن لوگوں نے ترک رفع پر فساد یا فقہاء احناف میں جن لوگوں نے رفع یدین پر کراہت کی کوئی بات کہی ہے وہ بیجا تشدد پر مبنی ہے اور اکابر دیوبند کے ذوق اعتدال کے منافی ہے۔

بیانِ مذاہب:

تکبیر تحریمہ کے وقت تو رفع یدین کے ثبوت اور عمل پر سب کا اتفاق ہے، اسی طرح رکوع کے بعد سجدے میں جاتے وقت، اور سجدے سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین پر روایات سے ثابت ہونے کے باوجود ائمہ اور جمہور کے نزدیک عمل نہیں ہے، البتہ رکوع میں جاتے وقت، اور رکوع سے اٹھتے ہوئے رفع یدین کے مسئلہ میں اختلاف ہوگیا، امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اپنی مشہور اور مفتی بہ روایت کے مطابق ترک رفع کے قائل ہیں، بہت سے صحابہؓ تابعینؒ اور فقہاؒ کا مسلک یہی ہے، امام ترمذیؒ نے فرمایا:

"وبه یقول غیر واحد من اصحاب صلی الله علیه وسلم و التابعین وهو قول سفیان و اهل الکوفة" اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ رفع یدین کے قائل ہیں، اور متعدد صحابہ و تابعین اور عام محدثین کا مسلک یہی ہے۔

تشریح احادیث:

امام بخاری نے باب کے ذیل میں دو روایتیں ذکر کی ہیں، پہلی روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ہے اور دوسری روایت حضرت مالکؓ بن الحویرث سے ہے، ان دونوں روایتوں میں یہ ذکر ہے کہ رسول پاک ﷺ نے تکبیر تحریمہ کے وقت بھی رفع یدین فرمایا اور رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت بھی۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں تو رأیت مذکور ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ان موقع پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا، اور حضرت مالکؓ بن الحویرث کی روایت میں صنع کا لفظ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ عمل کیا، اتنی بات سے کسی کو اختلاف یا انکار نہیں ہوسکتا کہ پیغمبر علیہ السلام سے رفع

یدین ثابت ہے لیکن رفع یدین کی ترجیح پر استدلال کے لئے اتنی بات کافی نہیں ہے، کیونکہ ابن عمر کی روایت میں مذکور "رأیت" یا مالک بن الحویرثؓ کی روایت میں مذکور صنع کا تقاضا تو تکرار بھی نہیں ہے اگر ابن عمرؓ نے ایک بار دیکھا یا آپ نے ایک بار بھی یہ عمل کیا تو رأیت یا صنع کہنا صحیح ہے۔

گویا حضرت ابن عمرؓ اور حضرت مالکؓ کی روایت سے صرف یہ ثابت ہوا کہ ان تینوں مواقع پر رفع یدین ہوا ہے، لیکن یہ بات ان روایات سے کسی طرح ثابت نہیں جاسکتی کہ اس فعل پر مداومت کے ساتھ عمل کیا گیا، نیز یہ ثابت کرنا بھی ممکن نہیں کہ یہ عمل پیغمبر علیہ السلام کا آخری عمل تھا۔ اگر روایات سے یہ ثابت کیا جاسکتا کہ پیغمبر علیہ السلام نے رفع یدین پر مداومت کی یا یہ آپ کا آخری عمل تھا تو استدلال کیا جاسکتا تھا کہ ترک رفع ناجائز یا خلاف سنت ہے یا مرجوح ہے، لیکن جب روایتیں ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک کا بھی پتہ نہیں دے رہی ہیں تو اس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوا جس کے لئے امام بخاری نے انہیں یہاں ذکر فرمایا ہے۔

دوام رفع پر استدلال کا جائزہ:

امام بخاری کی ذکر کردہ روایات باب سے تو مقصد ثابت نہیں ہو سکتا، ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں "کان یفعل" کے الفاظ بھی ہیں، جن سے استمرار پر استدلال کیا جاسکتا ہے، تو اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ حدیث پاک میں "کان یفعل" سے استمرار کا ثبوت ضروری نہیں، اگر حضور پاک ﷺ نے ایک بار بھی کوئی عمل کیا ہے تو راوی اس کو "کان یفعل" سے تعبیر کر دیتا ہے، امام نووی نے متعدد مقامات پر اس کی وضاحت کی ہے، جیسے باب صلوۃ اللیل (مسلم ص ۲۵۴ ج ۱) میں حضرت عائشہؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں "کان یصلی ثلث عشرۃ رکعۃ یصلی ثمان رکعات ثم یو ترثم یصلی رکعتین وھو جالس کان یصلی" سے استمرار کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے لیکن نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت سے وتر کے بعد دو رکعتوں کا جواز معلوم ہوا کیونکہ حضور ﷺ نے ان پر مواظبت نہیں فرمائی، بلکہ یہ فعل آپ سے ایک دو بار یا چند بار ثابت ہے اس کے بعد فرماتے ہیں:

ولاتغتر بقولھا ۃ کان یصلی فان المختار الذی علیہ الا کثرون والمحققون من الاصولیین ان لفظۃ کان لایلزم منھا الدوام ولا التکرار (مسلم ص ۲۵۴ ج ۱)

اور تمہیں حضرت عائشہؓ کے قول "کان یصلی" سے دھوکا نہ ہونا چاہئے اس لئے کہ اکثر علماء اور علم اصول کے ارباب تحقیق کا مسلک مختار یہ ہے کہ لفظ کان سے نہ دوام لازم آتا ہے اور نہ تکرار الخ۔

پھر انھوں نے لکھا کہ یہ تعبیر اپنی اصل وضع کے اعتبار سے دوام و تکرار کا تقاضہ نہیں کرتی

، پھر انھوں نے مثال دیکر اس کی مزید وضاحت کی۔

اس لئے پہلی بات تو یہ ہے، "کان یرفع" سے دوام پر استدلال ممکن ہی نہیں، محض استمرار پر بھی استدلال کرنا کمزور بات ہے، اس کو اردو زبان میں یوں سمجھئے کہ "کان یفعل" کا ترجمہ ہوا، آپ ایسا کیا کرتے تھے، اب ایسا کرنا علی الدوام تھا، یا اکثریت کے ساتھ تھا یا گاہے گاہے تھا، "کان یفعل" ہر صورت میں صادق ہے۔ لیکن اگر ہم آپ کی رعایت سے یا خارجی دلیل کے سبب استمرار پر دلالت تسلیم بھی کرلیں تو اس سے زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ثبوت تو فراہم ہوا کہ یہ عمل دسیوں بار ہو یا سینکڑوں بار ہوا، لیکن اتنی بات سے مقصد ثابت نہیں ہوتا، مقصد یعنی رفع یدین کی ترجیح، تو وہ اس عمل کے دوام پر نیز رفع یدین کے آخر حیات تک بر قرار رہنے، یعنی حضور پاک ﷺ کا آخری عمل ہونے کے ثبوت پر موقوف ہے۔ اور یہ باتیں اس روایت سے کیا کسی بھی معتبر روایت سے ثابت نہیں۔

بیہقیؒ کا اضافہ:

البتہ اس سلسلے میں اس اضافہ کو پیش کیا جاسکتا ہے جو بیہقیؒ نے ابن عمر کی روایت میں کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "فمازالت تلك صلوته حتی لقی الله تعالیٰ" یعنی یہ کہ آپؐ وفات تک نماز کو اسی طرح پڑھتے رہے، یہ اضافہ اگرچہ سنن بیہقی میں نہیں ہے بیہقی کی "خلافیات" میں ہے لیکن، معتبر لوگوں نے اس کو نقل کیا ہے، قاضی شوکانی نے پہلے حضرت ابن عمر کی روایت ذکر کی، پھر بیہقی کے اس اضافہ کو مقام استدلال میں ذکر کیا، پھر ابن مدینی کی بات نقل کی "هذاالحديث عندی علی الخلق کل من سمعه فعليه ان يعمل به لانه لی اسناده شیٔ" کہ یہ حدیث میرے نزدیک اس مسئلہ میں ساری دنیا کے لئے حجت ہے، جو بھی اس کو سنے اس پر عمل کرنا ضروری ہے کیونکہ اس کی سند میں کوئی کمی نہیں ہے۔

قاضی شوکانیؒ کی قائم کردہ ترتیب سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ابن مدینیؒ بیہقی کے اضافہ کی بھی توثیق کررہے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہوسکتا، ابن مدینی اس روایت کے بارے میں تو سب کچھ کہہ سکتے ہیں جس میں یہ اضافہ نہیں، اس کی شیخین نے بھی تخریج کی ہے، لیکن بیہقی کے اضافے کے بارے میں وہ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس کی سند میں کوئی کلام نہیں، اس اضافہ کے بارے میں تو ضعیف ہی نہیں موضوع ہونے تک کا دعویٰ کیا گیا ہے کیونکہ یہ اضافہ جن رواۃ کے ذریعہ آرہا ہے ان میں دو راوی ایک "عصمۃ بن محمد انصاری" اور دوسرے "عبدالرحمٰن بن قریش" پر بہت زیادہ کلام کیا گیا ہے عصمۃ بن محمد انصاری کے بارے میں ابو حاتم نے کہا "لیس بقوی" یحییٰ بن معین نے کہا کہ یہ کذاب ہیں، حدیث وضع کرتے ہیں، عقیلی نے کہا کہ یہ ثقات کی جانب سے باطل روایت نقل کرتے ہیں دار قطنی

نے کہا یہ متروک ہیں، ابن عدی نے کہا کہ ان کی تمام روایات غیر محفوظ ہیں۔ اسی طرح دوسرے راوی عبدالرحمٰن بن قریش کو سلیمانی نے متہم بالوضع قرار دیا ہے، وغیرہ غور کرنے کی بات ہے کہ جب اضافہ کے رواۃ کا یہ حال ہے تو ابن مدینی کیسے اس کو خلقِ خداوند پر حجت قرار دے سکتے ہیں؟ یقینی بات ہے کہ اُن کی یہ بات اصل روایت کے بارے میں ہے، اور اس سے رفع کی ترجیح پر استدلال تام نہیں ہے۔

روایت میں قابلِ غور پہلو:

یہاں تک یہ بات صاف ہوگئی کہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے صرف اتنی بات معلوم ہوئی کہ رفع یدین کا عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جیسا کہ دوسری روایات سے ترک رفع کا عمل بھی ثابت ہے۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ جس سے کسی کو انکار نہیں البتہ رفع کی ترجیح کے لئے جس دوام واستمرار اور آخر عمر تک اس کے برقرار رہنے کی صراحت کی ضرورت ہے وہ کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں گویا جتنی بات معتبر روایات سے ثابت ہے اس سے بات نہیں بنتی اور بات بنانے یعنی رفع کی ترجیح کو ثابت کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ روایت میں موجود نہیں، پھر یہ کہ روایت اگرچہ مختلف سندوں کے ساتھ تمام کتابوں میں مذکور ہے اور سند بھی نہایت شاندار ہے سلسلۃ الذہب کے نام سے موسوم ہے لیکن اس کے باوجود روایت میں کئی قابلِ غور پہلو ہیں اور یہ باتیں صرف ہمیں کو نہیں سب کو کھٹکتی ہیں اور دیکھنے والا حیران ہو جاتا ہے کہ کیا صورت اختیار کرے۔

ا۔ رفع اور وقف میں اختلاف:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ روایت کے مرفوع اور موقوف ہونے میں اختلاف ہے، سالم اس کو مرفوعاً بیان کرتے ہیں اور نافع موقوف کہتے ہیں، نیز نافع کی روایت کے موقوف یا مرفوع ہونے میں بھی اختلاف ہے، امام بخاری مرفوع ہونے کو اور امام ابوداؤد موقوف ہونے کو ترجیح دیتے ہیں اور اس اختلاف میں ان حضرات نے اگرچہ سالم کو ترجیح دی ہے لیکن یہ کلیہ نہیں ہے، سالم اور نافع میں اس طرح کا اختلاف چار روایات میں ہے اور ان میں نافع کو ترجیح دینے والے بھی موجود ہیں، سالم حضرت ابن عمر کے صاحبزادے ہیں اور نافع مولیٰ جنہیں ابن عمرؓ کی صحبت اور خدمت میں زیادہ دخل تھا، پھر یہ رفع ووقف کا یہ اختلاف غیر اہم نہیں ہے، حافظ اصیلی نے تو یہ لکھا ہے کہ امام مالک کے اس روایت کو نہ لینے کی وجہ یہی ہے کہ یہ موقوف ہے؛ کہتے ہیں۔

ولم یاخذ به مالك لان نافعاً وقفه علی ابن عمر (نیل الفرقدین ص ۴۱) امام مالک نے اس روایت کو نہیں لیا، کیونکہ نافع نے اس کو ابن عمر پر موقوف کیا ہے۔

زرقانی نے بھی یہی لکھا ہے کہ امام مالک کے اس روایت کو اختیار نہ کرنیکی وجہ رفع ووقف میں اختلاف ہے:

قال الزرقاني وبه يعلم تحامل الحافظ في قوله: لم ار للما لكية د ليلاعلى تركه ولامتمسكاالاقول ابن القاسم لانه لمااختلففيرفعه ووقفه ترك مالك في المشهور القول باستحباب ذلك لان الاصل صيانة الصلوٰة عن الافعال (زرقانی ص ۱۳ ج ۱)

زرقانی نے کہا، اس بحث سے معلوم ہوا کہ حافظ ابن حجرؒ نے یہ کہہ کر "کہ مجھے رفع یدین کے ترک کے لئے مالکیہ کے پاس کوئی دلیل اور بنیاد، ابن القاسم کے قول کے علاوہ نہیں ملی" غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا اس لیے کہ جب روایت میں رفع اور توقف کا اختلاف ثابت ہوا تو امام مالک نے مشہور قول کے مطابق اس کو ترک کر دیا کیوں کہ نماز کو (غیر ثابت) افعال سے محفوظ رکھنا اصل ہے۔

۲۔ مواضعِ رفع میں اختلاف:

ابن عمرؓ کی روایت میں دوسرا قابلِ غور اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں مواضع رفع میں بہت زیادہ اختلاف ہے، اس کو محدثین کی اصطلاح میں اضطراب کہتے ہیں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اس سلسلے میں چھ طرح کی روایات منقول ہیں:

بعض روایات میں صرف ایک مرتبہ یعنی تکبیرِ تحریمہ کے وقت رفع ہے، جیساکہ مالکیہ کی معتبر کتاب " المدونة الكبرىٰ" (ص ۶۹ ج ۱) میں ہے، اس روایت میں رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت ترکِ رفع یا رفع کا ذکر نہیں، مگر "مدونہ" میں اس روایت کو ترکِ رفع کی دلیل کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، اس کی سند (ابن وہب) عن مالك بن انس عن ابن شهاب عن سالم بن عبد الله عن ابيه الخ مذکور ہے، نیز یہ کہ مسند حمیدی میں یہی روایت رکوع اور رکوع سے اٹھتے وقت ترک رفع کی تصریح کے ساتھ ابن شہاب زہری کی سند کے ساتھ اس طرح ہے حدثنا الحميدى قال حدثناسفيان بن عيينة قال حدثناالزهرى قال اخبرنى سالم بن عبد الله عن ابيه قال رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا افتتح الصلوٰة رفع يديه حذو منكبيه وذااراد ان يركع وبعد مايرفع راسه من الركوع فلايرفع و لابين السجدتين (مسند حمیدی قلمی ص ۷۶)

اس روایت میں ان دونوں مقامات پر ترکِ رفع کی تصریح ہے، مزید یہ کہ مسند ابی عوانہ میں بھی یہی روایت سفیان بن عینیہ سے اسی سند کے ساتھ اس طرح ہے۔

سفیان بن عیینة عن الذهری عن سالم عن ابیه قال رائیت رسول الله ﷺ اذاافتح الصلوٰة رفع یدیه حذو منکبیه،و اذااراد ان یرکع و بعد مایرفع راسه من ارکوع فلایرفعهما (مسند ابی عوانہ ص ۱۰ ج ۲)

۲۔ بعض روایات میں تین جگہ، یعنی تکبیر تحریمہ اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع ہے، جیساکہ موطاامام مالک میں ہے اور اس کی متابعت میں متعدد لوگوں کی روایات ہیں۔

۳۔ بعض روایات میں تین جگہ، یعنی تکبیر تحریمہ، رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع ہے، جیساکہ حدیث باب میں ہے۔

۴۔ بعض روایات میں چار جگہ، یعنی مذکورہ بالا تین مقامات کے علاوہ دو رکعتوں سے اٹھتے وقت بھی رفع مذکور ہے، یہ روایت بخاری کے اسی صفحہ پر ہے اور امام بخاری نے اس پر مستقل ترجمہ باب رفع الیدین اذا قام من الرکعتین منعقد ہوگا۔

۵۔ بعض روایات میں مذکورہ بالا چار مقامات کے علاوہ پانچویں جگہ یعنی سجدہ میں جاتے وقت بھی رفع مذکور ہے۔ یہ روایت بخاری کے جزء رفع الیدین میں ہے۔

۶۔ بعض روایات میں ان پانچ مقامات پر انحصار نہیں، بلکہ ہر انتقال یعنی ہر قیام و قعود اور ہر خفض و رفع کے وقت رفع یدین کی صراحت ہے، اس روایت کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں طحاوی کی "مشکل الآثار" کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور اس پر شذوذ کا حکم بھی لگایا ہے لیکن اس شذوذ کا جواب دیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت اگرچہ سند کے اعتبار سے یقیناً صحیح ہے لیکن اس میں چھ طرح کی مختلف روایات کے سبب اضطراب پایا جاتا ہے، جس کو ختم کرنا ممکن ہی نہیں، یعنی یہ ممکن نہیں کہ ایک روایت کے علاوہ بقیہ تمام روایات کو ساقط اور کالعدم قرار دیدیا جائے، پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک روایت کو لیا جائے اور بقیہ تمام روایات کو نظر انداز کر دیا جائے، یہ بھی تو ہو سکتا ہے بلکہ یہی واقعہ ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عمل میں تنوع رہا ہو، اور حضرت ابن عمرؓ نے حضور پاک ﷺ کو جتنے انداز پر عمل کرتے دیکھا ہو ان کو نقل کر دیا ہو۔ اور اس طرح حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے جس طرح فعل رفع کو لیا جارہا ہے، اسی طرح ان کی رایت سے ترک رفع کو بھی لیا جاسکتا ہے۔

۳۔ حضرت ابنِ عمرؓ کے عمل میں اختلاف

حضرت ابنِ عمرؓ کی روایت کا تیسرا قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے اس سلسلے میں مختلف عمل منقول ہیں، تین مقامات پر رفع کا عمل بھی ثابت ہے اور تین سے زائد مقامات پر بھی رفع

کا عمل آپ کی روایات سے ثابت ہے، ابن حزم نے اپنی ایسی سند کے ساتھ جس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں "هذا اسناد لا داخلة فيه" "اس سند میں کوئی عیب نہیں۔ نقل کیا ہے۔

"انه كان يرفع يديه اذ دخل في الصلوة و اذ ركع و اذا قال سمع الله لمن حمده، و اذا سجد، و بين الركعتين"

یعنی ابن عمرؓ تحریمہ کے وقت، رکوع میں جاتے وقت، سمع اللہ لمن حمدہ کہتے وقت، سجدے میں جاتے ہوئے اور دو رکعتوں کے درمیان رفع یدین کرتے تھے۔

نیز یہ کہ حضرت ابن عمرؓ سے تکبیر تحریمہ کے علاوہ تمام مقامات پر ترکِ رفع بھی ثابت ہے امام طحاوی نے "شرح معانی الآثار" میں بسند صحیح و متصل نقل کیا ہے:

عن مجاهد قال صليت خلف ابن عمر فلم يكن يرفع يديه الا في التكبيرة الاولى من الصلوة " ترجمہ: مجاہد کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو انھوں نے نماز کی تکبیر اولیٰ کے علاوہ کسی موقع پر رفع یدین نہیں کیا۔ (طحاوی ص ۱۵۵ ج ۱)

مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی "مارأيت ابن عمر يرفع يديه الا في اول ما يفتتح" (عینی ص ۷۳ ج ۵) موجود ہے، اس کی سند بھی صحیح ہے۔

امام طحاوی نے اس پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کا یہ فعل حضور پاک ﷺ کی وفات کے بعد کا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب حضرت ابن عمرؓ کے علم میں رفع یدین کا نسخ آگیا ہو، پھر یہ بھی لکھا کہ اگر کوئی یہ کہے کہ مجاہد کے اس بیان کے مقابل طاؤس کا بیان بھی ہے کہ ابن عمرؓ رفع یدین کیا کرتے تھے تو جواب میں یہی کہا جائے گا کہ طاؤس کا بیان، ترکِ رفع پر دلیل قائم ہونے سے پہلے کا ہو سکتا ہے۔ طحاوی کی بات کا خلاصہ یہ ہے کہ ابن عمرؓ پہلے رفع یدین کرتے تھے، جب ترکِ رفع کی بات محقق ہو گئی تو آپ نے رفع یدین کے عمل کو چھوڑ دیا۔

لیکن ہمارے خیال میں اس سے قریب احتمال یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نہ رفع یدین مداومت سے کرتے تھے، نہ ترکِ رفع، دونوں پر وقتاً فوقتاً عمل کرتے رہتے تھے، جس شاگرد نے جو عمل دیکھا اس کو نقل کر دیا، مجاہد بھی جلیل القدر ثقات تابعین میں ہیں، ان کی پیدائش ۲۱ھ کی ہے اور حضرت ابن عمر کی وفات ۷۳ھ میں ہوئی ہے، گویا ابن عمرؓ کی وفات کے وقت ان کی عمر ۵۲ سال کی تھی ابن عمر سے ان کا خدمت گذاری کا تعلق تھا، بسا اوقات ان کی رکاب تھام کر چلتے تھے، مجاہد کا بیان (البدائع ص ۲۰۸ ج ۱) میں تو یہ نقل کیا ہے کہ میں نے دو سال تک ابن عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو وہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ کسی جگہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ مدتوں خدمت میں رہنے والا قریبی شاگرد جب یہ بیان کرے کہ میں نے تو

تکبیر تحریمہ کے علاوہ ابن عمرؓ کو رفع یدین کرتے ہوئے نہیں دیکھا تو یہی کہنا پڑے گا کہ ترکِ رفع بھی ابن عمرؓ سے کثرت کے ساتھ ثابت ہے۔ گویا رفع کرتے تو مہینوں کرتے رہتے اور ترک رفع کرتے تو اس پر مہینوں عمل کرتے رہتے، جیسا کہ حضور علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ روزہ رکھتے تو رکھتے چلے جاتے، اندازہ ہو تا کہ شاید اس مہینہ میں بے روزہ نہ رہیں گے، اور کبھی روزہ نہ رکھتے تو اتنا عرصہ گذر جاتا کہ ام المومنینؓ کو خیال ہو تا کہ شاید اس مہینے میں آپ روزہ نہ رکھیں گے، اس لیے ہمیں تو محاذ قائم کرنے کے بجائے سلامت روی کا راستہ ہی پسند ہے کہ ابن عمرؓ کا عمل دونوں طرح کا رہا ہو گا۔

۴۔ روایت ابنِ عمرؓ میں ترک رفع کے اشارے :

حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں چوتھا قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اگر وہ نماز کی پوری تفصیلی کیفیت بیان فرماتے اور اس تفصیل میں ایک جز رفع یدین بھی ہو تا تو اس کی نوعیت دوسری ہوتی اور سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے لیکن اس روایت میں یہ صورت نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابن عمرؓ تمام تفصیلات کو ترک کر کے صرف ایک جز رفع یدین کو نقل کر رہے ہیں اور دونوں سجدوں کے درمیان اس کی نفی بھی فرما رہے ہیں جب کہ یہ ایک ایسا جز ہے کہ اگر عہد رسالت میں رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت اس عمل کی مداومت تسلیم کر لی جائے تو ماننا پڑے گا کہ روزانہ فرض کی سترہ رکعتوں میں ۳۴ مرتبہ یہ عمل ہو تا تھا اور اگر سنن و نوافل کی بھی شامل کر لیا جائے تو روزانہ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو جائے گی، پھر جب یہ عمل اتنی کثرت سے کیا جا رہا تھا تو نماز کی تمام کیفیات سے صرف نظر کر کے صرف اسی جز کو اہمیت سے بیان کرنا بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی تمام کیفیات کو چھوڑ کر یہ بیان کرے کہ عہد رسالت میں ہر رکعت میں دو سجدے ہوا کرتے تھے، اور ظاہر ہے کہ خاص صورتِ حال اور مخصوص داعیہ کے بغیر ایسی بات کا نقل کرنا، سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے، اس لئے روایت میں ہر باذوق انسان کے لئے اشارہ واضح طور پر ہے کہ حضرت ابن عمرؓ خصوصی احوال کے تقاضے میں اس پر زور صرف فرماتے رہے اور وہ خصوصی احوال یہ تھے کہ اس زمانہ میں رفع یدین کا عمل بالکل گوشۂ خمول میں چلا گیا تھا ابن عمرؓ نے اس کی طرف خصوصی توجہات مبذول فرمائیں تا کہ وہ چیز بالکل متروک نہ ہو جائے جسے وہ سنت سمجھ رہے ہیں۔

اس صورت حال کا واضح ثبوت یہ ہے کہ رفع یدین کے احیاء کے سلسلے میں حضرت ابن عمرؓ کی کوششوں کے باوجود امام مالک کے زمانہ تک تو مدینہ میں اس پر عمل کرنے والے اقلیت ہی میں تھے اور اسی لئے امام مالک نے رفع یدین کو تعامل اہل شہر مدینہ کے مطابق نہ ہونے کی بنیاد پر قبول نہیں کیا جیسا کہ ابن رشد وغیرہ کے حوالہ سے بات گذر چکی ہے، مگر حضرت ابن عمرؓ کی ان تمام

کوششوں کا یہ اثر ضرور ہوا کہ اس پر عمل کرنے والے کچھ نہ کچھ پیدا ہو گئے۔

عہد صحابہ میں ابن عمرؓ کے عمل کی ایک مثال:

صحابہ کرامؓ کا طریقہ یہی رہا ہے کہ انہوں نے کسی عمل میں کوتاہی محسوس کی تو اس کی اصلاح کے لئے خصوصی توجہ صرف کی، نمازوں میں تکبیرات انتقال کا مسئلہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ جس میں حضرت ابوہریرہؓ پیش پیش نظر آتے ہیں نووی نے لکھا ہے کہ تکبیرات انتقال کی مشروعیت پر آج تمام علماء کرامؒ کا اتفاق ہے، اور متقدمین کے زمانے سے ہے لیکن حضرت ابوہریرہؓ کے زمانے میں اس مسئلے میں اختلاف رہا، کیونکہ اس وقت بعض لوگ تکبیر تحریمہ کے علاوہ کسی تکبیر کے قائل نہیں تھے، (انتہی) وجہ یہ تھی کہ یہ تکبیرات ضروری نہیں تھیں اور امام کے انتقالات سے مقتدیوں کو علم ہو ہی جاتا ہے نیز ابوداؤد میں روایت بھی موجود ہے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابزیؓ نے حضور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی اور یہ عمل نقل کیا "و کان لایتم التکبیر" (ابوداؤد ص ۱۲۱ ج ۱) ابوداؤد نے اس پر یہ لکھا ہے کہ رکوع سے اٹھتے وقت سجدے میں جاتے وقت اور سجدے سے اٹھتے ہوئے تکبیر نہیں کہتے تھے، گویا آپ ﷺ تکبیرات انتقال میں سے بعض تکبیرات کو ترک کردیتے تھے۔ اس لیے بہت سے لوگوں کے عمل میں تساہل ہو گیا تھا، روایات میں حضرت عثمان غنیؓ جیسے خلیفہ راشد کے عمل میں یہ صورت موجود ہے، مسند احمد میں حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے، ان سے پوچھا گیا کہ سب سے پہلے تکبیرات کو کس نے ترک کیا فرمایا "عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ حین کبر و ضعف صوتہ ترکہ" (مسند احمد ص ۴۳۲ ج ۴) کہ حضرت عثمان غنیؓ جب بوڑھے ہو گئے اور اُن کی آواز پست ہو گئی تو انہوں نے تکبیرات کو ترک کردیا حضرت عثمانؓ کے عمل کی یہ توجیہ بھی کی گئی ہے کہ تکبیر تو کہتے تھے مگر جہر کو ترک کردیا تھا، اس کے بعد طبری کے بیان کے مطابق حضرت معاویہؓ کے عمل میں یہ صورت ملتی ہے اور امام طحاوی نے کہا کہ بنوامیہ کسی رکن میں جاتے ہوئے تکبیر نہیں کہتے تھے صرف اٹھتے وقت کہتے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ کے آخری زمانہ میں تو یہ صورت معلوم ہوتی ہے کہ تکبیرات انتقال کا ترک عام ہو گیا تھا، روایات میں موجود ہے کہ حضرت عکرمہ نے مکہ مکرمہ میں حضرت ابوہریرہؓ کے پیچھے نماز پڑھی حضرت ابوہریرہؓ نے نماز میں تکبیرات انتقال کہیں تو عکرمہ کو بڑی حیرت ہوئی اور انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ یہ بزرگوار تو کم عقل معلوم ہوتے ہیں اس پر حضرت ابن عباسؓ نے تنبیہ کی کہ بندۂ خدا! یہی تو رسول پاک ﷺ کی سنت ہے۔

رویات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں تکبیرات انتقال برائے نام رہ گئی تھیں اس لئے حضرت ابوہریرہؓ نے اسی پر زور دیا شمار کرانا وغیرہ شروع کیا، اسی طرح حضرت ابن عمرؓ کے زمانہ میں رفع

یدین کا عمل بھی برائے نام رہ گیا اور بعید نہیں کہ کچھ لوگ رفع یدین کو بدعت سمجھنے لگے ہوں اس لئے انہون نے اس پر زور دینا شروع کیا، خود کر کے بھی دکھلاتے رہے، زبان سے بھی کہتے رہے، فضائل بھی بیان کرتے رہے اور رکوع میں جاتے ہوئے یا رکوع سے اٹھتے ہوئے ترک رفع کرنے والوں کو کنکر مار کر تنبیہ بھی کرتے رہے اور بہر حال انہوں نے رفع یدین کو ختم ہونے سے بچالیا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عمرؓ ترک رفع کو خلاف سنت نہیں سمجھتے تھے اور سمجھ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ حضور ﷺ کا طریقہ خلفاء راشدین کا عمل اور صحابہ کرامؓ کا تعامل سب ان کے سامنے ہے اور اسی لئے وہ ترکِ رفع بھی کرتے تھے جیسا کہ مجاہد کی روایت سے ثابت ہے لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ رفع یدین کا عمل بالکل معدوم ہوا جارہا ہے اور وہ بھی حضور ﷺ سے ثابت شدہ عمل ہے انہوں نے احیاء سنت کے جذبہ کے تحت ایسا کیا۔

حضرت ابن عمرؓ کا اس جذبہ کے تحت رفع یدین کی دعوت دینا یقیناً صحیح تھا وہ ایسا نہ کرتے تو اس مسئلہ میں ترک ہی کی جہت باقی رہ جاتی، فعل کی جہت ختم ہو جاتی جبکہ شریعت میں ترک وفعل دونوں ثابت ہیں۔ لیکن بعد کے زمانہ میں، یعنی دونوں جہتیں از روئے شرع واضح ہو گئیں اور کسی جانب کے انعدام کا احتمال ختم ہو گیا تو اب تمام مسلمانوں کو اپنے اپنے ائمہ کے مسلک کے مطابق عمل کرنا چاہیے اور اس طرح کے مسائل میں داعی بن کر ایک دوسرے کے خلاف محاذ نہیں قائم کرنا چاہیے کہ اس سے فتنہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ جب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دونوں باتیں ثابت ہیں پھر نزاع کیسا؟ لیکن عوام یا عام علماء تو بجائے خود کبھی کبھی اکابرِ علماء بھی مسائل میں افراط و تفریط کی جانب مائل ہو جاتے ہیں۔

رفع یدین میں شاہ اسماعیل شہید کی نیت:

جیسا کہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ایک زمانہ میں نہ صرف یہ کہ رفع یدین پر عمل کیا کرتے تھے، بلکہ اس کے داعی بھی تھے، ان کا "رسالہ تنویر العینین" بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے، جس میں انہوں نے رفع یدین کو سنتِ غیر موکدہ کہا ہے اور سنن ہدیٰ میں شمار کیا ہے اور ترکِ رفع کے بارے میں یہ فرمایا ہے۔

ولایلام تارکه و ان ترکه مدة عمره (ص۹) تارکِ رفع کو ملامت نہیں کی جائے گی اگرچہ وہ مدت العمر ترک پر عمل کرتا رہے۔

اس مسئلہ میں حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی نیت بھی احیاء سنت، اور رضاء خداوندی کے حصول کی تھی، لیکن بعد میں حقیقت حال واضح ہوئی تو جس نیک نیتی سے انہوں نے عمل شروع

کیا تھا اسی نیک نیتی کے ساتھ اس کو ترک بھی کر دیا(۱) رفع یدین کے مسئلہ میں احیاء سنت کے جذبہ پر حضرت شاہ عبد القادر صاحبؒ کی وضاحت آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔

شاہ عبد القادر دہلوی کا ارشاد:

رفع یدین کو اختیار کرنے میں حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی نیت احیاء سنت کی تھی، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ان کو حضرت شاہ عبد القادر صاحب کی جانب سے یہ کہہ کر ترک رفع کی تلقین کی گئی کہ اس سے فتنہ کا اندیشہ ہے تو شاہ اسماعیل صاحب نے جواب دیا کہ اگر عوام کے فتنہ کا خیال کیا جائے تو اس حدیث کا کیا مطلب ہوگا" **من تمسك بسنتي عند فساد امتي فله اجر مائة شهيد**" کیونکہ جب بھی سنتِ متروکہ کو اختیار کیا جائے گا تو عوام میں فتنہ پیدا ہو جائے گا شاہ عبد القادر صاحبؒ کو جب مولانا اسماعیل شہیدؒ کا جواب پہنچا تو ارشاد فرمایا کہ ہم تو یہ سمجھنے لگے تھے کہ اسماعیل عالم ہو گیا مگر وہ تو ابھی تک یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ ثواب یا یہ حکم تو اس وقت ہے جب سنت کا غیر مقابلہ ہو یعنی جہاں بدعت کو مٹا کر سنت کو زندہ کیا جا رہا ہو، اس مسئلہ میں تو سنت سنت ہی کے مقابل ہے کیونکہ جس طرح رفع یدین سنت ہے اسی طرح ارسال بھی سنت ہے پھر یہاں یہ حکم کیسے ثابت ہوگا؟ کہتے ہیں کہ جب سے شاہ عبد القادر صاحب کی وضاحت سے شاہ اسماعیل شہیدؒ کو مطلع کیا گیا تو وہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا، (خلاصہ حکایت ۷۳، ارواح ثلاثہ ص ۱۱۴) گویا حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ زبردست فقیہانہ بصیرت کے باوجود ادھر متوجہ نہ ہو سکے تھے۔

ابن عمر کی روایت پر گفتگو کا خلاصہ:

گفتگو یہ تھی کہ رفع یدین کو ترجیح دینے والے فقہاء و محدثین حضرت ابن عمر کی روایت کو اپنا سب سے مضبوط مستدل سمجھتے ہیں امام بخاری بھی رفع یدین کے زبردست مدعی ہیں اور انہوں نے

---

(۱) حضرت مولانا عبید اللہ صاحبؒ سندھی نے بعض معتبر شہادتوں کی بنیاد پر مشہور کتاب التمہید لائمۃ التجدید (صفحہ ۲۹۸ قلمی) لکھا ہے کہ جب سید احمد شہیدؒ نے افغانستان جانے کا ارادہ کر لیا تو مولانا اسماعیل شہیدؒ سے ایک دن یہ سوال کیا، کہ رفع یدین پر عمل کے سلسلے میں آپ کی کیا نیت ہے؟ جواب میں عرض کیا ابتغاء لمرضاۃ اللہ یعنی یہ عمل میں رضائے خداوندی کے حصول کیلئے کرتا ہوں تو سید صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رضائے خداوندی کے لئے اس کو ترک بھی کر سکتے ہیں، مطلب یہ رہا ہوگا کہ افغانستان جا رہے ہیں اور وہاں رفع یدین سے عوام مین فتنہ کا اندیشہ ہے اس لئے جب ترک رفع بھی سنت ہے تو رضائے خداوندی کا حصول اس عمل کرنے میں بھی ہے چنانچہ شاہ اسماعیل شہیدؒ ترک رفع پر رضامند ہو گئے اور نہایت معتبر تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے ہے کہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے آخری عمر میں رفع یدین پر عمل ترک کر دیا تھا ۱۲

بھی اسی روایت کو سب سے پہلے پیش کیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت اصح الاسانید کے ذریعے آنے کے باجود ترجیح رفع پر استدلال کے سلسلے میں مختلف وجوہ کی بنا پر کار آمد نہیں ہے۔

۱۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ روایت سے صرف یہ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے رفع یدین بھی کیا ہے، اتنی بات سب کے نزدیک تسلیم شدہ ہے مگر اس سے ترجیح پر استدلال اسی وقت ممکن ہے جب رفع یدین پر دوام و استمرار کے ساتھ تا آخرِ حیات عمل کی صراحت بھی ہوا اور یہ صراحت کسی بھی معتبر روایت میں نہیں ہے۔

۲۔ روایت میں طرح طرح کے اختلافات ہیں، مرفوع اور موقوف ہونے میں بھی اختلاف ہے اور اسی وجہ سے امام مالک نے بھی روایت کو معمول بہ نہیں بنایا۔

۳۔ روایت کے الفاظ مختلف ہیں جس کی وجہ سے مواضع رفع میں چھ طرح کا اختلاف پیدا ہو گیا ہے اس کو محدثین کی اصطلاح میں اضطراب کہتے ہیں اس سے کم اضطراب کی صورت میں بھی روایات کو ترک کیا گیا ہے۔

۴۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے عمل میں اختلاف ہے اور راوی کا عمل اپنی روایت کے خلاف ہو تو اس سے استدلال محل نظر ہو جاتا ہے۔

۵۔ روایت میں نماز کے تمام اجزاء سے صرف نظر کر کے صرف ایک جز پر زور دینے میں صاف اشارہ ہے کہ اس زمانۂ خیر القرون میں ترک رفع پر عمل کی کثرت تھی ان وجوہ کی بناء پر یہی کہا جائے گا کہ گو روایت سند کے اعتبار سے نہایت قوی ہے، لیکن اس سے رفع یدین کی ترجیح کو ثابت کرنا نہایت دشوار ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد:

حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں تو طرح طرح کے اختلافات پائے ہی جاتے ہیں، لیکن اس

(۱) طحاوی کی مشکل الآثار سے حافظ ابن حجر نے کان یرفع یدیہ فی کل خفض ورفع کے الفاظ نقل کئے ہیں اور اس پر ہذہ روایۃ شاذۃ بھی لکھا ہے (فتح الباری ص ۲۶۱ ج ۲) لیکن حضرت جابرؓ سے مسندِ احمد میں روایت ہے کہ ان سے بیعتِ رضوان میں صحابہؓ کی تعداد معلوم کی گئی تو فرمایا کہ ہم ایک ہزار چار سو تھے پھر فرمایا. کان رسول اللہ ﷺ یرفع یدیہ فی کل تکبیرۃ من الصلوٰۃ کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز میں ہر تکبیر پر رفع یدین فرمار ہے تھے ،اس روایت سے جہاں ہر خفض ورفع پر رفع یدین کی بات معلوم ہوئی وہیں یہ اشارہ بھی ملا کہ اس طرح کا رفع یدین صلح حدیبیہ ۶ھ کے موقع پر ہو نیز معلوم ہو تا ہے کہ یہ رفع یدین خلاف معمول اتفاقی طور پر کسی مصلحت کے سبب ہوا، اگر معمول ہو تا تو نقل کرنیوالوں کی تعداد اور ان کا انداز دوسرا ہو تا تاہم امام احمدؒ سے ان کے ایک جلیل القدر شاگرد عبدالملک میمونی التوفی ۲۷۴ھ نے رفع یدین کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا فی کل خفض و رفع اور یہ بھی فرمایا کہ اس سلسلے میں صحیح احادیث موجود ہیں، مگر امام احمدؒ کا مشہور مسلک یہ نہیں ہے (المغنی ص ۱۹۲ ج ۲، مشہور مسلک بیان کیا جا چکا ہے۔ ۱۲

موضوع پر دیگر روایات میں بھی زبردست اختلاف ہے ہر انتقال (۱) انتقال کے وقت رفع یدین کی روایات بھی ہیں، لیکن یہ خصوصی احوال یا بالکل ابتدائی زمانہ کی بات معلوم ہوتی ہے اور صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کی روایات بھی موجود ہیں، اور ایسی روایات بھی ہیں جن میں بعض مقامات پر رفع یدین ہے اور بعض پر نہیں، جیسے بخاری کی روایت باب ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ روایات پر غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں جہاں بعض مسائل میں تنگی سے توسع کی طرف میلان ہوا ہے، اسی طرح بعض مسائل میں خصوصاً نماز کے مسائل میں توسع سے تنگی کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ پہلے نماز میں معمولی کلام سلام جواب اور اشارہ اور کئی کام مباح تھے بعد میں ممنوع قرار دے گئے اسی طرح پہلے نماز میں ہر جگہ رفع یدین تھا بعد میں مقامات میں تخفیف ہوتی چلی گئی خود روایت باب میں یہ اشارہ ہے کہ ابن عمرؓ "لا یفعل ذلک فی السجود" فرمارہے ہیں، اس کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ پہلے اس موقع پر رفع تھا اور اس پر کچھ لوگ عمل پیرا تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں کی تردید کررہے ہیں کہ اس موقع پر رفع برقرار نہیں رہا یا ابن عمرؓ ہی کی روایت میں ترمذی شریف میں "کان لا یرفع بین السجدتین" ہے جب کہ نسائی شریف میں "بین السجدتین" رفع یدین کی روایت موجود ہے۔ اس طرح کے اختلافات سے صاف ظاہر ہے کہ پہلے رفع یدین کے مقامات زائد تھے بعد میں کم ہوتے چلے گئے ائمہ اربعہ کی روش بھی یہی بتارہی ہے کہ وہ سب اس مسئلہ میں توسع سے تنگی کی طرف آرہے ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ اب دو ہی راستے ہیں اگر ظاہر پرستی پر اُترنا ہے تو اصحاب ظواہر کے ساتھ ہو جانا چاہئے کہ انہوں نیکی روایت کو نہیں چھوڑا، اور اگر حقیقت پسندی کی طرف آنا ہے تو دیکھنا چاہئے کہ ارباب تحقیق کا کیا رجحان ہے ارباب تحقیق اور فقہاء کرام نے بالاتفاق تشہد کے بعد اور بین السجدتین رفع کو ترک کردیا ہے، ذرا نظر کو آگے بڑھاؤ کہ عبداللہ بن مسعود اور خلفاء راشدینؓ اور عام صحابہؓ کرام نے تکبیر تحریمہ کے علاوہ ہر جگہ کے رفع یدین کو ترک کردیا ہے اور ترک کرنا بھی چاہئے تھا چونکہ رفع یدین اگر انتقال کی علامت ہے تب بھی اور تعظیم کی علامت ہے تب بھی اس کو یا تو ہر جگہ برقرار رہنا چاہئے یا اس علامت کو ختم کردیا گیا ہے تو ہر جگہ ترک ہو جانا چاہئے صرف دو ہی مقامات کے ساتھ اس کو خاص کرنے کی کیا بنیاد ہے نماز میں خشوع اصل ہے اور اس کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ بقیہ تمام مقامات کے رفع کو ترک کردیا جائے اور ان روایات کو لیا جائے جن میں صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع ہے، بعض مقامات کو ترک کرنا، اور بعض مقامات پر رفع کرنا تحکم یعنی دلیل کے بغیر اپنی رائے پر اصرار کرنا معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

(از عبدالقدوس مفتی شہر آگرہ)

بہت ممکن ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن عنوان کو پڑھتے ہی قرآن مجید کی مشہور آیت کے "فقرہ لاتقربوا الصلوٰۃ" کی طرف منتقل ہوگیا ہو کہ احقر راقم السطور یہاں شاید اسی آیت سے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید کا یہ فقرۂ مشہور اس درجہ زبان زد ہو چکا ہے کہ اب اس سے متعلق کسی مضمون کی مطلق ضرورت نہیں باقی رہی ہے۔

زیر نظر مضمون کا باعث تحریر یہ ہوا کہ ابھی حال ہی میں ہفتہ وار ندائے ملت لکھنؤ کے دو شمارے (۳۱/۵۴، ۳۲/۵۴) مورخہ ۲/۸/۹۸ء، ۹/۸/۹۸ء) ایک صاحب سے دیکھنے کو ملے ان دونوں ہی شماروں میں محترم جناب محمود الرحمٰن صاحب (وائس چانسلر مسلم یونیورسیٹی علی گڈھ) کا ایک مضمون بھی شامل اشاعت تھا جس کا عنوان ہے

"حضرت محمد ﷺ کی حیات مقدسہ اور مقاصد عالیہ"

مضمون کا عنوان جاذب توجہ تھا اس لئے غور و توجہ کے ساتھ پڑھا لیکن پورا مضمون پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ عنوان دیکھ کر مضمون کے متعلق جو اندازہ ہوا تھا مضمون اس معیار پر پورا نہ اترا مضمون میں متعدد فرو گذاشتیں راہ پا گئی ہیں جو آپ کے سامنے آرہی ہیں مضمون کا آغاز اس عنوان سے فرمایا گیا ہے "دیگر انبیاء علیہم السلام اور آپ کا مشن" اس عنوان کے تحت چند سطروں کے بعد ہی فرمایا گیا ہے "سوامی ویوکانند" اور "مہاتما گاندھی" نے جس سر دھرم سمبھاؤ کا راستہ اختیار کیا وہ پیغمبر اسلام ہی کی دین ہے، پیغمبر اسلام نے اس سے بھی بڑھ کر سرو دھرم سمان، یعنی سبھی ماقبل پیغمبر مذاہب (سبھی ماقبل پیغمبر ان مذاہب) کی تعظیم کا حکم دیا ہے۔

محترم مضمون نگار صاحب، کے علم میں شاید مولانا محمد علی مونگیری علیہ الرحمہ کا وہ لطیفہ

نہیں ہے کہ کسی موقع پر ایک مجلس میں جہاں حضرت مولانا مونگیری اور چند دوسرے علماء کرام موجود تھے کہ گاندھی جی "جناب حضور اقدس ﷺ سے متعلق نہایت خوش عقیدگی کا اظہار فرمانے لگے" تو مولانا مونگیری نے برجستہ تلقین فرمائی اور فرمایا کہ ہاں! گاندھی جی پھر دیر کیا ہے اقرار رسالت فرمادیجئے! مگر گاندھی جی مولانا کی اس برمحل تلقین پر عمل کی ہمت نہ کرسکے اور اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ خاموشی اختیار کرلی۔

حضرت مولانا مونگیری علیہ الرحمہ کی اس بروقت تلقین اور گاندھی جی کا انکار خیز تبسم اس حقیقت کو واشگاف کرنے کے لئے کافی ہے کہ حضور خاتم الانبیاء ﷺ پر ایمان اسی وقت ایمان سمجھا جائے گا جب آپ کی نبوت و رسالت کا، آپ پر ختم نبوت کا اور اسی کے ساتھ ساتھ آپ کے دین و شریعت کے ناسخ الادیان و ناسخ الشرائع ہونے کا اقرار بھی شامل ہے اس صاف و سریح اعتقاد کے بغیر کسی قسم کا اظہار عقیدت اور خراج تحسین "**ایمان بالرسالة**" اور "**تصدیق رسالت**" ہرگز نہ قرار پائے گا ورنہ بڑے بڑے اور سرغنہ قسم کے کفار و مشرکین مکہ بھی تو آپ ﷺ کو "صادق" و "امین" کہتے تھے لیکن ان میں سے کسی کے لئے اہل ایمان نرم گوشہ نہیں رکھتے ایسی صورت میں کسی "منکر رسالت" کو پیغمبر السلام ﷺ کی تعلیمات سے متاثر سمجھنا دینی اعتبار سے ایک ناروا رواداری ہے۔

محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنے اسی مضمون میں قرآن مجید کی ایک آیت سے ایک بڑے مضحکہ خیز اور مفسدہ انگیز مضمون کا استنباط فرمایا ہے، زیر نظر مضمون کا اصل محرک موصوف کا یہی استنباط ہے جس کا ذکر راقم السطور کے تبصرہ کے ساتھ آئندہ سطور میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

مسئلہ زیر بحث کو اچھی طرح واضح کرنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر یہاں اس "خاص نکتہ" پر بھی کچھ روشنی ڈال دی جائے جس نے ہمارے ڈاکٹر صاحب موصوف کو ایسے عجیب و غریب استنباط کا حوصلہ بخشا ہے۔

اب سے بہت پہلے (تقریباً پندرہ بیس سال پہلے) کی بات ہے کہ پاکستان کے کسی جلسۂ تقسیم اسناد میں ہندوستان کے ایک مشہور مفکر نے شرکت فرمائی اور جلسہ کو خطاب فرمایا تھا:

ظاہر ہے کہ تقسیم اسناد کا یہ جلسہ یونیورسٹی کا تھا، خطاب فرمانے والے کے مخاطب ایسے لوگ تھے جو عصری علوم کی تحصیل اور اس کی تعلیم میں اپنی عمریں گذار رہے تھے۔

ایسے مجمع کے سامنے خطاب فرمانے والے بزرگ نے خدا جانے کس جذبہ و خیال کے تحت یہ "نکتہ" بیان فرمادیا کہ "علم ایک وحدت اور اکائی ہے اس میں "علم دین" اور "علم دنیا" کی کوئی تفریق و تقسیم نہیں ہے۔"

حقیقت خواہ کچھ ہو لیکن دیکھا یہی جارہا ہے کہ کہنے کو لاکھ لوگ کہتے رہیں "اُنظرُ الیٰ مَاقَال وَلاتَنظُر الیٰ من قال" (یہ دیکھو کہ کیابات کہی ہے؟ یہ نہ دیکھو کہ بات کس نے کہی ہے) لیکن ہوتا یہی ہے کہ بات نہیں دیکھی جاتی کہنے والا ہی دیکھا جاتا ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں کہ کہنے والی شخصیت شہرت و منزلت رکھتی ہو۔

چنانچہ جلسۂ تقسیم اسناد میں بیان کیا ہوا یہ "نکتہ" عصری تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک قیمتی دستاویز کے طور پر ہاتھ آگیا، اس کے بعد سے دیکھا یہی جارہا ہے کہ اس حلقہ کی طرف سے اس کی صدائے بازگشت برابر کانوں سے ٹکراتی رہتی ہے۔

اس "نکتہ" کی حقیقت سمجھنے کے لئے یہ تجزیہ قابل توجہ ہے کہ اگر "علم دین" اور "علم دنیا" کی کوئی تفریق و تقسیم نہیں ہے تو دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ قرآن وحدیث میں علم کے جو فضائل بیان ہوئے ہیں وہ یکساں طور پر ہر صورت علم کے لئے تسلیم کئے جائیں اور کہا جائے کہ روایات حدیث میں طالب علم کی یہ جو فضیلت بیان ہوئی ہے کہ

" امن سَلَكَ طريقاً يلتمس نيه علماً سهَّل الله له طريقاً اليٰ الجنة " (جمع الفوائد ص ۲۱)

جو شخص علم کی طلب و تلاش میں کوئی راہ طے کریگا اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کی راہ آسان فرمادیں گے۔

یہ فضیلت جس طرح قرآن مجید اور حدیث شریف پڑھنے والوں کو حاصل ہوتی ہے اسی طرح اس فضیلت کے مستحق وہ لوگ بھی ہیں جو عصری تعلیم گاہوں میں "ارتھ شاستر" "ناگرک شاستر" "سماجک وگیان" "اتہاس" اور "بھوگول" وغیرہ پڑھ رہے ہیں۔

اور اس فیصلہ کے بعد پھر تو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں بھی کا، کھا، انگا، اور اے، بی، سی، ڈی، آئی جی، اپڑھنے پڑھانے میں بھی نہ کوئی قباحت باقی رہے گی۔ نہ ہچکچاہٹ ہوگی۔

پاکستان کے جلسۂ تقسیم اسناد میں "علم" سے متعلق ہو غیر علمی نکتہ بیان ہو گیا اسے مان لینے کے بعد قرآن وحدیث میں آئی ہوتی، فضیلتیں علم دین کے ساتھ مخصوص نہیں رہ سکتی ہیں؟ بلکہ کسی مدعی علم کو اس نتیجہ سے اتفاق ہے تو اسے یہ استحقاق ہے کہ وہ علم کو ایک وحدت واکائی قرار دے، پھر علم دین وعلم دنیا کی تفریق و تقسیم کا انکار کردے، لیکن جو شخص یہ سمجھتا اور یقین رکھتا ہے کہ قرآن وحدیث میں آئی ہوئی فضیلتیں صرف علم دین کے ساتھ مخصوص ہیں تو وہ لازمی طور پر علم کی وحدت کا منکر ہے اور اس کے ساتھ ہی علم دین وعلم دنیا کی تفریق و تقسیم کا قائل بھی ہے۔

پھر علم دین و "علم دنیا" کی یہ تفریق و تقسیم ہمارے آپ کے فکر وفیصلہ پر مبنی ہی کب ہے؟ یہ تقسیم تو خود حضور پرنور اعلم العالمین سرور عالم ﷺ فرما چکے ہیں۔

"تابیر نخل" کے مشہور واقعہ پر آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ:

"انتم أعلم بامور دنیاکم" (تم لوگ اپنی دنیاوی باتیں زیادہ جانتے ہو) یعنی دینی علوم و امور تو مجھے زیادہ معلوم ہیں، اور دنیاوی امور کا علم تو تم کو مجھ سے زیادہ ہے یہ ارشاد گرامی علم دین و علم دنیاکی تقسیم و تفریق پر روشن دلیل ہے۔

اس کے علاوہ آپ ﷺ سے منقول دعاؤں میں آئے ہوئے الفاظ سے بھی علم کی اس تفریق و تقسیم پر روشنی پڑتی ہے اگر علم کی وحدت ناقابل تفریق و تقسیم ہے تو پھر حضور اقدس ﷺ کا اپنی دعاؤں میں "اسئلك علماً نافعاً" (میں آپ سے علم نافع کا سوال کرتا ہوں) یا "اعوذبك من علمٍ لاینفع" (میں ایسے علم سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو غیر مفید ہو) فرمانے کا کیا مطلب ہے؟ علم کی وحدت جب علم نافع اور علم غیر نافع میں تقسیم ہو گئی تو اس کی وحدت تو ختم ہی ہو گئی۔

مندرجہ بالا تفصیل و تشریح سے یہ حقیقت نمایاں ہوگئی کہ جلسۂ تقسیم اسناد میں بیان کیا ہوا "نکتہ" فکر کی غلطی پر مبنی تھا اور اس کا مستحق ہر گز نہ تھا کہ ڈاکٹریٹ کرنے والے حضرات اسے اپنا نقطۂ تحقیق بنائیں مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اور محترم ڈاکٹر صاحب نے شاید اسی غیر علمی نکتہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے زیر تبصرہ مضمون میں یہ سطور قلمبند فرمادیں تحریر کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

تحصیل علم کی ترغیب عام، کی ذیلی سرخی کے تحت لکھتے ہیں قرآن وحدیث میں جہاں جہاں لفظ علم آیا ہے چند علما نے اسے صرف علم؟ (لفظ دین شاید مضمون میں چھپنے سے رہ گیا ہے) پر محمول کیا ہے جب کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے مشن میں "دین اور دنیا" کا تصور علحدہ علحدہ نہیں ہے دونوں میں مکمل وحدت ہے۔..... (چند سطروں کے بعد) علم کی تحصیل کو عوامی تحریک بنانا آپ کا مقصد اولین تھا۔

(چند سطروں کے بعد) علم کی اہمیت پر اتنا زور دیا گیا کہ اسے حاصل کرنے کے لئے مسلم و غیر مسلم کا امتیاز ختم کر دیا گیا حکم دیا گیا کہ علم و حکمت کے خزانے جہاں سے ملیں حاصل کر لو "الحكمة ضالة المؤمن" (عقل و دانش اور علم و آگہی مومن کی متاع گم شدہ ہے)......ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ "اطلبو االعلم ولو كان بالصين" یعنی علم کو حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے (اسی سلسلہ کلام میں) چند سطروں بعد تحریر فرماتے ہیں۔ بعض محدثین نے اس حدیث پر شبہ کا اظہار کیا ہے۔

میں اس سلسلے میں قرآن حکیم کی آیت پیش کرتا ہوں جسے قاضی محمد سلیمان منصورپوری نے کتاب "رحمۃ للعالمین" میں غیر اقوام سے علم اخذ کرنا کے عنوان کے تحت درج کیا ہے:

هل عندكم من علم فتخرجوه لنا" یعنی (اے غیر مسلم بھائیو!) کیا تمہارے پاس علم ہے؟ ہمارے لئے ظاہر کرو (اقتباس ختم ہوا)

محترم جناب ڈاکٹر صاحب کے گراں قدر اور فکر انگیز مضمون کے یہ پانچ اقتباسات ایک ہی سلسلہ کے ہیں جن سے متعلق احقر اپنی معروضات پیش کر رہا ہے جس کی وجہ سے اصل ماخذ سے مراجعت دشوار تھی، بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہ دشواری تو آسان فرمادی کہ "رحمۃ للعالمین جلد اول ص ۲۸۸ پر مطبوعہ عبارت مل گئی، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ آیت مذکورہ کے ترجمہ میں قاضی صاحب نے بریکٹ میں (غیر مسلم بھائیوں!) کا فقرہ نہیں بڑھایا ہے جسے بڑھا کر محترم جناب ڈاکٹر صاحب نے مفہوم آیت کو کہیں سے کہیں پہنچادیا ہے، موصوف کے اس اضافہ نے جو ان کے مزعومہ نظریہ کا عکاس ہے آیت قرآنی کو عجیب مضحکہ خیز رخ سے پیش کر کے اسے کفار و مشرکین سے علمی چندہ کی دردمندانہ اپیل بنادیا ہے کہ اے غیر مسلم بھائیو! کیا تمہارے پاس کچھ علم ہے؟ تو اسے ہمارے لئے ظاہر کردو (ہم سے چھپا کے نہ رکھو، ہم تم سے علم کا چندہ لینے آئے ہیں)

محترم جناب ڈاکٹر صاحب کی نقل کردہ آیت قرآنی اگر رحمۃ للعالمین حصہ اول ہی میں آئی ہوتی تو موصوف کی غلطی کو بے بنیاد کہنا ضرور مشکل ہوتا اس وقت زیادہ سے زیادہ بطور مشورہ وخیر خواہی کہا جاسکتا تھا کہ محترم کو قرآن مجید میں یہ پوری آیت دیکھ لینا چاہئے تھی کہ آیت کا سیاق وسباق کفار ومشرکین سے چندۂ علم طلب کرنے کا مفہوم اخذ کرنے کی گنجائش بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ مگر کیا کیا جائے کہ یہ آیت زیر گفتگو رحمۃ اللعالمین کی تیسری جلد ص ۳۴۳ پر بھی مذکور ہوئی ہے اور خود قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے جلد اول میں لکھے ہوئے اپنے عنوان کے برخلاف یہ آیت یہاں بالکل ہی دوسرے رخ سے درج فرمائی ہے جس کی وجہ سے محترم ڈاکٹر صاحب کے بریکٹ والے اضافے کی کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔

لیجئے اب رحمۃ للعالمین کی دونوں جلدوں کے مندرجات ایک ہی جگہ ایک نظر میں دیکھ لیں

رحمۃ للعالمین حصہ اول۔ یہاں پہلے یہ عنوان دیا گیا ہے:

(ص ۱۸۸) غیر اقوام سے علم اخذ کرنا: اس کے بعد آیت قرآنی "هل لكم من علم فتخرجوه لنا" (سورہ انعام رکوع ۱۸) آیت میں لفظ "قل" یہاں نہیں دیا گیا ہے پھر آیت کا یہ ترجمہ دیا گیا ہے: "کیا تمہارے پاس کچھ علم ہے پس اسے ہمارے لئے ظاہر کرو" (اے غیر مسلم بھائیو کا مضحکہ خیز اضافہ بھی قاضی صاحب نے نہیں کیا ہے) رحمۃ اللعالمین حصہ سوم:۔ آیت قرآنی سے پہلے قاضی صاحب نے مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے،

(ص ۳۴۳) دلائل علم جس طرح مبنی برعلم ہیں اسی طرح ان کا مطالبہ بھی ادیان دیگر سے کیا گیا ہے کہ وہ بھی اپنے دعاوی کو بزور علم ثابت کریں اس کے بعد آیت قرآنی "قل هل لكم من علم

فتخرجوه لنا" (ترجمہ) ان سے پوچھئے کہ تمہارے پاس کچھ علم بھی ہے تو اسے ہمارے لئے پیش تو کرو" اس جگہ خود قاضی صاحب نے آیت کے ترجمہ میں "ہمارے لئے پیش تو کرو" ترجمہ کر کے کلام کا صحیح رخ نمایاں کردیا ہے کہ ان سے علمی دلیل کا مطالبہ کیا جارہا ہے اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے حضرات مترجمین کے تراجم ایک نقشہ میں پیش کردئے جائیں، نقشہ درج ذیل ہے:

اسمائے مترجمین	تراجم متعددہ حضرات مترجمین
حضرت حکیم الامۃ	"آپ کہئے کہ کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو اس کو ہمارے روبرو ظاہر کرو"
مفسر حقانی	"آپ (اے نبی) کہدو کہ تمہارے پاس کچھ علم (کتابی سند) ہے تو اس کو ہمارے روبرو نکال کر لاؤ"
مفسر کیرانوی	"آپ (ان سے) کہئے کہ کیا تمہارے پاس (خبر پر اور اس کے عذر ہونے پر) کوئی دلیل (صحیح) موجود ہے کہ تم اسکو ہمارے سامنے پیش کرو"
مفسر دریابادی	آپ کہئے کہ آیا تمہارے پاس ہے کوئی دلیل ؟ (ہو) تو اسے ہمارے سامنے ظاہر کرو"
مودودی صاحب	ان سے کہو کہ کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کرسکو (تفہیم القرآن ص ۵۹۵ ج ۱)
ڈاکٹر حامد حسن قادری	"آپ ان سے کہئے کہ کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو اسے ہمارے سامنے ظاہر کرو" (فیوض القرآن ص ۳۳۱ ج ۱)

بہت ممکن ان متعدد تراجم کو دیکھ لینے کے بعد بھی محترم ڈاکٹر صاحب کی غلطی فکر واضح نہ ہو سکی ہو تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ احقر اپنے مدعا کی تصدیق و تصویب خود حق تعالیٰ جل مجدہ اور اس کی نازل فرمودہ آیت زیر بحث کے سیاق و سباق ہی کے ذریعہ پیش کردے

قاضی محمد سلیمان منصور پوری بھی رحمۃ للعالمین جلد اول میں آیت زیر بحث کا مطلب سمجھنے میں یہی غلطی کر گئے کہ پوری آیت کو سیاق و سباق کے ساتھ نہیں دیکھا اور جزو آیت ہی سے ایک مطلب متعین کر کے آیت کا یہ عنوان قائم کردیا کہ "غیر اقوام سے اخذ کرنا" جس کی وجہ سے بات کہیں کی کہیں پہنچ گئی۔

پوری آیت شریف اور اس کی مطلب خیز ترجمانی و مختصر تشریح :

آیت زیر بحث سورہ انعام کی ایک سو انچاسویں آیت ہے جو سورہ کے اٹھارویں رکوع اور پارہ

نمبر (۸) "ولو اننا" کے پانچویں رکوع میں دیکھی جاسکتی ہے ملاحظہ ہو آیت اوراس کی ترجمانی:

سیقو ل الذین اشر کو الو شاء اللہ مااشر کناو لا آباؤناو لاحرمنامن شئُ کذالکٔ کذب الذین من قبلھم حتیٰ ذاقو ابأسناقل ھل لکم من علمٍ تخرجوہ لنا. اِن تتبعونٔ الاالظن و اِن اَنتم الاتخرصون.

عنقریب مشرکین کہیں گے کہ اگر اللہ کی مرضی ہوتی تو نہ ہم نہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے اور نہ ہم کوئی چیز (خود ہی) اپنے اوپر حرام کرلیتے۔ اسی طرح ان سے قبل کے لوگوں نے بھی تکذیب کی تھی یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا۔ آپ ان سے کہئے (کہ اپنے اس دعوے کو کہ جہاں مشیت ہو گی وہاں رضا بھی ہو گی) (کسی علمی عقلی یااصولی انداز سے ثابت بھی کر سکتے ہو یا محض اللہ پر اپنی بداعمالیوں کا اتہام رکھتے ہو) کہ کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے (اگر ہے) تو اس کو ہمارے سامنے ظاہر کرو (حقیقت یہ ہے کہ) تم تو محض وہم وگمان پر ہو اور صرا ندازوں پر کام کرتے ہو (تمہاری کوئی بات علم ویقین پر مبنی نہیں ہوتی۔

(تفسیر فیوض القرآن ص ۳۲۱ ج ۱) (مرتبہ ڈاکٹر سید حامد حسن قاضی شیخ الجامعہ بھاولپور)

"زیر بحث جزو آیت" کو سیاق وسباق کے ساتھ یہاں پوری آیت میں "خط کشیدہ" نقل کر دیا گیا ہے پوری آیت کی مختصر مگر واضح تفسیر تشریح بھی نقل کر دی گئی ہے پھر مزید لطف یہ ہے کہ یہ تفسیر محترم وائس چانسلر صاحب جیسے ایک پی ایچ ڈی ڈاکٹر کی تحریر فرمودہ ہے جنہوں نے کسی زمانہ میں الہ آباد یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا تھا اور ۱۹۶۷ء میں یہ جامعہ اسلامیہ بھاولپور میں شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) رہے ہیں اور ۱۲ر شوال ۱۳۹۰ھ (مطابق) دسمبر ۱۹۷۰ء کو اس کا ایک نسخہ حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری علیہ الرحمہ کی تصدیق وتحریر کے ساتھ مسجد نبوی شریف مدینہ منورہ میں پیش کیا گیا ہے۔

اس تفسیر پر متعدد مستند علماء کرام (حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان، حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی وغیرہم) کے علاوہ متعدد ڈاکٹر (PHD) صاحبان کی تقریظات درج ہیں

آیت بالا کی منقولہ بالا تشریح اس تفسیر فیوض القرآن سے صرف اس لئے نقل کی گئی کہ یہ نہایت مختصر اور عام فہم" اور ایک شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) ہی کی لکھی ہوئی ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ آیت زیر بحث کا مطلب بالکل صاف اور واضح ہے کسی مفسر کو اس میں اختلاف نہیں ہے۔

محترم جناب ڈاکٹر صاحب سے یہی چوک ہو گئی کہ انہوں نے "رحمۃ للعالمین (حصہ اول) کی ایک نہایت ہی مختصر ومجمل اور مبہم تحریر کو اپنے مفید مطلب پاکر کسی تفسیر سے مراجعت کئے بغیر

نقل کر دیا حالانکہ خود قاضی محمد سلیمان صاحب نے بھی رحمۃ للعالمین کی تیسری جلد تک پہنچنے کے بعد اپنے موقف کو تبدیل کر دیا ہے اور آیت زیر بحث کا مطلب وہاں وہی لکھا ہے جو واقعی اس کا مطلب اور جسے دوسرے مفسرین نے بھی متفقہ طور پر لکھا ہے۔

آیت بالا کا آغاز بطور پیشگوئی، کفار و مشرکین اور اکثر گمراہ و کج فکر لوگوں کے اس اعتراض و اعتذار سے کیا گیا ہے جس کی بنیاد اس غلط مفروضہ پر قائم کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی رضا یہ دونوں ہی باہم مترادف ہیں یا ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور کبھی کبھی یہ گمراہ لوگ عقیدۂ جبر و اختیار کا سہارا لے کر اپنی گمراہیوں اور بد اعمالیوں میں اپنے کو مجبور ٹھہراتے اور معذور گردانتے ہیں اوپر جن حضرات کے تراجم نقل کئے گئے ہیں ان میں سے بعض حضرات نے مشرکین کی بات کو اول الذکر غلط مفروضہ پر مبنی قرار دیتے ہوئے آیت کی تفسیر فرمائی ہے اور بعض حضرات نے ان کے ثانی الذکر غلط مفروضہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے تفسیر کی ہے۔

جناب عبدالماجد صاحب دریابادی نے بھی اول الذکر غلط مفروضہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے تفسیری حواشی تحریر فرمائے ہیں ان کے چند حواشی بطور اقتباس بطرز اختصار یہاں نقل کئے جاتے ہیں کہ مشرکین کے یہ "غلط مفروضے" آج بھی گمراہوں میں سینہ بہ سینہ متوارث طور پر ابھی تک چلے آرہے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ حواشی تفسیر ماجدی کے چند اقتباسات:

(الف) حاشیہ ۲۲۵،، خلاصہ اہل شرک رضلالت کے اس استدلال (یعنی لو شاء اللہ مااشرکنا) کا یہ ہے کہ خدا جب ہر چیز پر قادر ہے اور باوجود قدرت اس نے ہمیں شرک اور تحریم حلال، سے طبعاً، تکویمانہ روک دیا تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ شرک، و تحریم حلال، اسے ناپسند ہی نہیں بلکہ اسکی عین مرضی سے ہو رہے ہیں، مغالطہ استدلال کے اندر ہے کہ مشیت تکوینی، اور پسند و رضا، کو مرادف سمجھ لیا ہے۔ حلالانکہ رضائے الٰہی تشریعی کا قانون دوسرا ہے اور مشیت الٰہی تکوینی کا قانون دوسرا ہے دونوں اپنی اپنی جگہ کار فرما ہیں دونوں کے درمیان کوئی تصادم و تزاحم نہیں قانونِ مشیت نے انسان کو آزادی ہر طرح کی دے رکھی ہے انسان اپنے طریق عمل کے انتخاب میں آزاد ہے وہ اپنے ارادہ کا مالک و مختار ہے۔ اچھی و بری جو راہ چاہے اپنی پسند قصد سے اختیار کرے، لیکن رضائے الٰہی کا حکم یہ ہے کہ وہ بدی کی راہ سے بچے اور نیکی کی راہ چلے۔

بہ حیثیت خالق و قادر مطلق اس نے پیدا زہر کو بھی کر رکھا ہے اور بیماری کو بھی لیکن بہ حیثیت حاکم و آمر اس کا حکم یہی ہے کہ بیماری کا علاج کیا جائے، جو کج فہم خدا کی قدرت اور اپنی مجبوری کو اپنی اور بد کرداری کے لئے حیلہ اور آڑ بناتے ہیں وہ آخر بیماری میں اپنا علاج کیوں کرتے ہیں؟ اور روحانیت کی طرح

جسمانیات کے ہر آزار میں اپنے کو معذور کیوں نہیں سمجھتے،، (تفسیر ماجدی ص ۳۱۷ حاشیہ ۲۲۵)

(ب) حاشیہ ۲۲۶ کذالک (یعنی) منکرین و مکذبین کا یہ لنگڑا لولا استدلال کچھ نیا اور اس امت کے ساتھ مخصوص نہیں پرانی امتوں کا بھی یہی شیوہ چلا آیا ہے (بلکہ اس آیت میں استدلال کا معقول و مسکت جواب مل جانے کے بعد بھی منکرین و مکذبین گمراہ و کج فکر لوگ اپنے موروثی اور لنگڑے لولے استدلال کو برابر ہی اپنے کام میں لاتے رہتے ہیں۔ راقم السطور) تفسیر ماجدی ص ۳۱۸)

(ج) حاشیہ ص ۲۲۷ مکذبین کی دلیل عقلی کی لغویت ابھی اوپر کے حاشیہ سے ظاہر ہو چکی ہے، اب مطالبہ ان سے دلیل نقلی کا ہو رہا ہے (هل عندكم من علم فتخرجوه لنا) یعنی کس پیغمبر کی یہ تعلیم رہی ہے جو تم پیش کر رہے ہو کہ "لوشاء الله مااشركنامِن علمٍ "(سے مراد دلیل ہے) یعنی دلیل تمہارے اس (مفروضہ) مقدمہ پر کہ فعل پر قدرت دینا اس فعل سے رضا کو مستلزم ہے،، (تفسیر ماجدی ص ۳۱۸)

بات بہت بڑھ گئی اصل مقصد تو محترم جناب ڈاکٹر صاحب کی نگارشات پر مختصر تبصرہ ہی تھا، ضمناً آیت شریفہ کے مضامین کا ذکر بھی ضروری سمجھتے ہوئے سپرد قلم کر دیا گیا

اوپر جہاں محترم جناب ڈاکٹر صاحب کے مضمون زیر بحث کے کچھ اقتباسات نقل ہوئے ہیں ان میں حدیث "اُطلبو العلم ولو كان بالصين" بھی نقل ہوئی ہے اور وہیں اس حدیث سے متعلق موصوف کا کچھ تردد بھی نقل ہوا ہے کہ "بعض محدثین نے اس حدیث پر شبہ کا اظہار کیا ہے" اس حدیث سے متعلق جو معروضات سپرد قلم کی جاچکی ہیں ان کے پیش نظر موصوف کا یہ طرز عمل کہ حدیث کو چھوڑ کر اس آیت سے مطلب نکالنا تو عربی کہاوت "فرَّ مِن المطر وقام تحت الميزاب" بارش سے بھاگا اور پرنالہ کے نیچے کھڑا ہو گیا) کا مصداق ہی کہا جائے گا۔

پھر موصوف نے "اُطلبواالعلم ولو كان بالصين "سے متعلق یہ جو فرمایا ہے کہ بعض محدثین نے اس حدیث پر شبہ کا اظہار کیا ہے، موصوف کا حدیث مذکور سے متعلق یہ ریمارک بھی صحیح نہیں ہے واقعہ یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک یہ حدیث موضوع ہے جن حضرات محدثین نے موضوعات" کو علحدہ "کتابوں میں یکجا جمع کیا ہے انھوں نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے یہی وجہ ہے کہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے بھی اسے قطعاً غلط لکھا اور قابل استدلال نہ سمجھا ملاحظہ ہو (رحمۃ للعالمین حصہ سوم ص ۳۳۲)

محترم جناب ڈاکٹر صاحب نے تحصیل علم کی ترغیب عام کا عنوان قائم کر کے علوم عصریہ کو بھی علمی فضلیات کا مستحق ٹھہرانے کے لئے ایک موضوع حدیث اور ایک موضوع بحث سے غیر متعلق آیت سے اپنا مدعا ثابت کرنے کیلئے بڑی کھینچ تان کی لیکن مدعا عنقا ہی رہا کاش موصوف بذات خود کتب حدیث کی ورق گردانی کر کے حضور اقدس ﷺ کا یہ واقعہ دیکھ لیتے جو مشہور صحابی حضرت

ابوالدرداءؓ سے مروی ہے تو انھیں صحیح طور پر معلوم ہو جاتا کہ حضور اقدس ﷺ کو کیسے علم کی تحصیل مطلوب تھی روایت حدیث ملاحظہ ہو:

ابوالدرداء "جاءَ عمر بجوامع من التوراة اِلٰی النبی صلی الله علیه وسلم فقال یارسول الله جوامع من التركة اخذتُهامن اخ ولی من بنی زریق فتغیر وجهه صلی الله علیه وسلم فقال عبدالله بن زید الذی اریٰ الاذان امسح الله عقلكَ اماتری الذی بوجهِ رسول الله ﷺ فقال عمرُ رضیتُ بالله رباً و بالاسلام دیناوً بحمدٍ نبیاً بالقرآن اماماً فسری عنه ﷺ (جمع الفوائد ص ۱۸ ج ۱)

حضرت ابودرداء کہتے ہیں کہ حضرت عمر تورات کے کچھ مجموعہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں لائے اور کہا یارسول اللہ ! یہ تورات کے مجموعے ہیں جو میں نبی زریق کے ایک بھائی سے لارہا ہوں تو حضور ﷺ کے چہرہ مبارک کارنگ بدل گیا یہ دیکھکر، حضرت عبداللہ بن زید جنھوں نے (خواب میں) اذان دیکھی تھی بول پڑے کہ کیا تمہارے عقل پھر گئی ہے تم حضور ﷺ کے چہرے کی ناراضگی نہیں دیکھ رہے تو حضرت عمر نے فوراً تجدید ایمان فرماتے ہوئے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کو رب مانتا ہوں، اسلام کو اپنا دین، اور حضرت محمد ﷺ کو اپنا نبی اور قرآن کا امام مانتا ہوں (یہ سن کر) حضور ﷺ کے چہرے مبارک پر بشاشت نمایاں ہوگئی (جمع الفوائد)

محترم جناب ڈاکٹر صاحب حدیث شریف کی مندرجہ بالا روایت ملاحظہ فرماکر خود ہی فیصلہ فرماسکتے ہیں کہ جب حضور اقدس ﷺ کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے کامل الایمان کے لئے بھی تورات کے مطالعہ کی معمولی سی دلچسپی وخواہش پسند نہ آئی ان کے ہاتھ میں تورات کے مجموعے دیکھ کر چہرۂ اقدس کارنگ متغیر ہوگیا اس وقت تک چہرہ مبارک بشاش نہ ہوا جب تک حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تجدید ایمان کر کے اپنی غلطی سے مکمل طور پر رجوع نہیں کرلیا۔

ایسی صورت میں لوگوں کو تحصیل علم کے لئے چین جاپان کی تلقین کرنا اور انہیں آیت قرآنی "**هل عند کمُ من علمٍ فتخرجوه لنا**" کا سبق پڑھا کر کفار ومشرکین سے علمی چندہ حاصل کرنے کا درس دینا، کہاں تک صحیح ہے۔

زیر تبصرہ مضمون کا یہی حصہ واضح تردید اور مفصل تنقید کا متقاضی تھا جس پر سیر حاصل گفتگو ہوگئی اللہ تعالیٰ سے مفید ونافع اور مقبول بارگاہ بنائے۔

جناب ڈاکٹر صاحب کے مضمون میں اس بحث کے علاوہ بھی کچھ دوسری باتیں لائق تنقید ہیں موضع بیان میں ان پر سکوت صحیح نہ ہوگا اس لئے مختصراً ان کا بھی ذکر ہو ہی جانا چاہئے۔

محترم جناب ڈاکٹر صاحب نے مضمون کی اسی پہلی قسط میں (ندائے ملت ص ۷ کالم تین پر) تحریر فرمایا ہے۔

ایک مشہور حدیث ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مذاہب کے معتقدین محفوظ ہوں (بے حوالہ)

موصوف کے اس مضمون میں ان کی یہ کمزوری بھی جگہ جگہ دیکھنے میں آئی کہ لکھنے کو تو انہوں نے متعدد حدیثیں لکھی ہیں اور ان کی صحت وضعف وغیرہ کا بھی ذکر فرمادیا ہے لیکن حوالہ صرف ایک ''رحمۃ للعالمین'' کا دیا ہے اور بقیہ سب بے حوالے ہیں۔

اور پھر جو حدیث نقل ہوئی ہے اس کی بابت یہ تو لکھ دیا کہ مشہور حدیث ہے لیکن حوالہ ندارد، لیجئے موصوف کی طرف سے حدیث شریف کے الفاظ اور اس کا حوالہ راقم السطور پیش کئے دیتا ہے ملاحظہ ہو ''المسلمُ من سلم المسلمون من لسانه ویده'' (ترجمہ) مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں) (بخاری ترمذی ابوداؤد و نسائی)

اچھی طرح غور سے دیکھ لیں کہ موصوف کے ترجمہ حدیث میں جو فقرہ خط کشیدہ (یعنی دوسرے مذاہب کے معتقدین'' اس فقرہ کی عربی روایت حدیث کے الفاظ میں موجود نہیں ہے۔

احقر کو بڑے لوگوں کے قریب رہنے کے مواقع نہیں ہوتے ویسے سنا یہی ہے کہ بڑے لوگوں کے بیانات بالعموم ان کے سکریٹری وغیرہ لکھ دیتے ہیں، ممکن ہے زیر تبصرہ مضمون میں بھی کچھ ایسی ہی صورت ہو گئی ہو ورنہ محترم ڈاکٹر صاحب جیسی ذمہ دار شخصیت سے ایسی بدگمانی قطعاً بے محل ہو گی کہ انہوں نے بذات خود دانستہ طور پر حدیث رسول میں تحریف کی یہ جسارت کی ہو گی کسی اور کی پوشیدہ ذہنیت نے مسلمان کی جگہ دوسرے مذاہب کے معتقدین کا فقرہ فٹ کر دیا ہو گا۔

اس مختصر سے تبصرہ کے بعد کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اور آگے چل کر اسی ص ۷ کے تیسرے کالم میں ایک عنوان قائم فرمایا گیا ''عالمگیر اخوت انسانی اس عنوان کے تحت فرماتے ہیں۔

آپ کا مشن پوری انسانی برادری کو بلا تفریق مذہب وملت واحد قرار دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں کئی جگہ امت واحدہ کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ (سورہ بقرہ آیت ۲۱۳ سورہ یونس آیت ۱۹)

اس عالمگیر وحدت انسانی کا مقصد بنی نوع انسانی کے نسلی قومی، ملکی مذہبی لسانی تہذیبی اور جغرافیائی اختلافات کا خاتمہ کرنا ہے، (نداء ملت مورخہ ۲۰ اگست ص ۷ کالم ۳)

موصوف کو اپنے تجویز فرمودہ عنوان (عالمگیر اخوت انسانی) پر گفتگو کرنے کے لئے حدیث ''کلکم بنو آدم و آدم خلق من تراب۔'' کا خیال نہ آیا کہ تم سب بنی آدم اولاد آدم ہو اور آدم کی

تخلیق مٹی سے ہوئی ہے (مسند بزار) موصوف نے اسے نظر انداز کر کے سورۂ بقرہ کی آیت ر ۲۱۳ اور سورہ یونس کی آیت ۱۹ر کا حوالہ دیا ہے آیات نقل نہیں کی ہیں ہو سکتا ہے آیات کا نقل کو خلاف احترام سمجھا ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ یونس کی ان آیات میں "کان" ماضی کا صیغہ موجود ہے یہ آیات آپ کے مشن پر قطعاً کوئی روشنی نہیں ڈالتی ہیں بلکہ یہ تو ایک طرح سے تاریخ مذہب بیان کر رہی ہیں کہ پہلے ایک زمانہ تک سب لوگ امۃ واحدہ تھے، مترجمین قرآن نے آیت کا جو ترجمہ کیا ہے وہ پیش خدمت ہے از راہ اختصار صرف سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۳ر کا صرف ترجمہ نقل کیا جارہا ہے۔

(۱) ابتداء میں سب لوگ ایک ہی دین پر تھے (پھر ان میں اختلاف پیدا ہونا شروع ہوا) تو اللہ تعالیٰ نے (کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے (جو) بشارت دینے والے اور ڈرانے والے (تھے اور ان کے ساتھ سچی کتاب بھی نازل فرمائی تاکہ جن امور میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کا ان باتوں میں فیصلہ کر دے (اور واضح رہے کہ دین حق میں) اختلاف بھی انہیں نے کیا جن کو کتاب ملی تھی باوجودیکہ ان کے پاس صاف احکام آچکے تھے (اور ان کے یہ اختلافات بھی آپس کی ضد (اور خود غرضیوں) کی وجہ سے (تھے) پھر اللہ نے ایمان والوں کو (یعنی جن میں صلاحیت ایمان تھی) اس سچی بات (امر حق) کی ہدایت کی جس میں وہ اختلاف کر رہے تھے اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ (فیوض القرآن ڈاکٹر قادری)

(۲) ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں میں جو اختلافات رونما ہو گئے تھے، ان کا فیصلہ کرے (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتلایا نہیں گیا تھا۔ نہیں) اختلافات ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جاچکا تھا۔ انہوں نے روشن ہدایات پالینے کے بعد محض اس لئے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے انہیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھا دیا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا، اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے، (تفہیم القرآن مودودی صاحب ص ۱۶۳ ج ۱)

(۳) لوگ ایک ہی امت تھے پھر اللہ نے انبیا بھیجے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے، اور ان کے ساتھ کتب حق نازل کیں کہ وہ لوگوں کے درمیان اس باب میں فیصلہ کرے جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے، اور کسی نے اس میں اختلاف نہیں کیا مگر انہیں نے جنہیں وہ (کتاب) ملی تھی انہیں کی ضد کے باعث بعد اس کے کہ انہیں کھلی ہوئی نشانیاں پہنچ چکی تھی پھر اللہ نے اپنے فضل

سے انہیں جو ایمان والے تھے وہ امر حق بتادیا جس کے بارے میں وہ اختلاف کر رہے تھے اور اللہ جسے چاہتا ہے۔ راہِ راست بتادیتا ہے (ترجمہ ماجدی ص ۸۳)

جناب دریابادی نے ترجمہ میں صرف ترجمہ پر اکتفا کیا ہے تفسیری حاشیے حاشیہ پر ہیں، حاشیے کی تفصیلات بھی ملاحظہ فرمالیں:

حاشیہ ص ۷۷۲ آغاز فطرت میں (لوگ ایک ہی امت تھے) آیت نے ایک بڑی گرہ کھول دی فرنگی محققین، حسب معمول مدتوں اس باب میں بھٹکتے رہے اور ان میں سے اکثر یہی کہہ گئے کہ انسان کا ابتدائی مذہب "شرک یا تعدد آلہہ تھا شروع شروع وہ ایک ایک چیز کو خدا سمجھتا تھا اور عقیدۂ توحید تک تو نسل انسانی بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد اور عقلی و دماغی ارتقا کے بڑے طویل سفر کے بعد پہنچی ہے۔

قرآن مجید نے اس خرافی نظریہ کو ٹھکرا کر اعلان کر دیا کہ نسل انسانی آغاز فطرت میں دینی حیثیت سے ایک اور واحد تھی اس میں مذہب و ادیان کے یہ تفرقے کچھ بھی نہ تھے، (امتہ واحدۃ) میں جس وحدت کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ اس سے دینی و اعتقادی ہی وحدت مراد ہے "کانو اعلی شریعۃ من الحق "(ابن جریر طبری)

(متعدد تفسیری حوالوں کے بعد) صدیوں کی الٹ پھیر قیل و قال کے بعد اب آخری فیصلہ بڑے بڑے ماہرین اختریات انسانیات واجتماعات (سر چارلس مارسٹن پروفیسر لنگڈن پروفیسر شڈٹ کا) یہی ہے کہ انسان کا دین اولیں دین توحید تھا" (حاشیہ تفسیر ماجدی ص ۸۳)

ان اردو مترجمین و مفسرین نے یہ بات صاف طور پر نہیں ظاہر کی امت واحدہ کی حالت کب تک قائم رہی تھی اور لوگوں میں دینی و اعتقادی نزاع و اختلاف کا سلسلہ کب سے شروع ہوا؟ عربی تفسیر (اختصار ابن کثیر) میں مفسر صابونی نے یہ تفصیل دی ہے۔

قال ابن جریر عن ابن عباس قال کان بین نوح و ادم عشرۃ قرونٍ کلھم علی شریعۃ من الحق فاختلفوا فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین و قال قتادہ کانوا علی الھدی جمیعاً (اختلفوا فبعث اللہُ النبین) فکان اول من بعث نوحاً (ص ۱۸۷ ج ۱)

مفسر ابن جریر حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کرتے ہیں ہے اہوں ن ے فرمایا حضرت نوح و حضرت آدم علیہما السلام کے مابین دس قرن (ایک ہزار سال) کا فاصلہ رہا ہے۔ (اس مدت میں) سب ہی انسان اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ شریعت قانون پر عمل پیراء ہے پھر ان میں اختلافات ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے بشارت و انذار والے انبیائے کرام مبعوث فرمائے اور مفسر قتادہ نے یوں کہا ہے کہ سب کے سب ہدایت حق پر تھے پھر جب ان میں اختلافات ہوگئے تو اللہ نے انبیاء مبعوث

فرمائے چنانچہ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا:
مفسر ابن کثیر نے ان موضوعات اختلاف پر بھی کچھ روشنی ڈالی ہے فرماتے ہیں:

فاختلفوا فی یوم الجمعة فاخذ الیهود یوم السبت و النصاریٰ یوم الاحد فهدیٰ الله امة محمدﷺ لیوم الجمة و اختلفوا فی القبلة فاستقلبت النصاریٰ المشرق و الیهود بیت القدس فهدیٰ الله امة محمدﷺ واختلفوا فی الصلوٰ ة فمنهم مین یرکح لاسیجد و منهم من یسجد و لایرکع و منهم من یصلی و هو یکلم و منهم من یصلی و هو یمشی فهدی الله امة محمد للحق من ذالك و اختلفو افی الصیام فمنهم من یصوم بعض النهار و منهم من یصوم عن بعضِ الطعام فهدی الله امة محمد للحق من ذالك و اختلفوافی ابراهیم علیه السلام فقالت الیهودُ کان یهودیاً و قالتِ النصاریٰ کان نصرانیاً و جعله الله حنیفاً مسلماً فهدی الله امة محمد ﷺ للحق من ذالك واختلفوا فی عیسیٰ علیه السلام فکذبت به الیهود و قالو الامة بهتاناً عظیما. وجعله النصاریٰ الها وّ و لداً و جعله الله روحه و کلمته فهدی الله امة محمد ﷺ للحق من ذالك و کان ابوالعالیه یقول فی هذه الایة المخرج من الشبهاتِ و الضلالات و الفتن (اختصار ابن کثیر)

ان لوگوں نے یوم جمعہ کی فضیلت میں اختلاف کیا تو یہود نے (ہفتہ کا افضل دن ا) سنیچر مقرر کیا اور نصاریٰ نے اتوار مقرر کیا تو اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کی رہنمائی جمعہ کے لئے فرمادی ان لوگوں نے قبلہ کے بارے میں بھی اختلاف کیا نصاریٰ نے جہت مشرق کو قبلہ مقرر کیا اور یہود نے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا تو اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کی رہنمائی قبلہ کے لئے فرمادی (اور امت محمدیہ کا قبلہ خانہ کعبہ ہوگیا)

ان لوگوں نے نماز (کی ہیت) میں بھی اختلاف کیا چنانچہ کچھ لوگ نماز میں صرف رکوع ہی کرتے ہیں سجدے نہیں کرتے اور کچھ لوگ صرف سجدے کرتے ہیں رکوع نہیں کرتے اور کچھ ایسے ہیں کہ نماز پڑھتے رہتے ہیں اور بولتے بھی رہتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو نماز پڑھنے کی حالت میں چلتے پھرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو اس بارے میں بھی حق کی رہنمائی فرمادی ان لوگوں نے روزہ میں بھی اختلاف کیا چنانچہ کچھ لوگ تو دن کے کچھ حصہ کا روزہ رکھتے ہیں اور کچھ صرف بعض کھانوں کا روزہ رکھتے ہیں (دوسری چیزیں کھاتے پیتے رہتے ہیں) تو اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو اس معاملہ میں بھی حق بتادیا اسی طرح ان لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بھی اختلاف کیا تو یہود نے کہا کہ وہ یہودی تھے اور نصاریٰ نے کہا وہ نصرانی تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ انہیں صحیح صحیح مسلم بنایا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں بھی امر حق کیلئے امت محمدیہ کی رہنمائی فرمادی۔ اسی طرح ان لوگوں نے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی اختلاف کیا۔ چنانچہ یہود نے تو سرے سے آپ کی تکذیب ہی کردی اور آپ کی والدہ عفیفہ صدیقہ پر بہتان طرازی کی اور دوسری طرف نصاریٰ نے انہیں اپنا معبود اور خدا کا بیٹا بنالیا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے روح اللہ اور کلمۃ اللہ بنایا ہے تو اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو اس معاملہ میں بھی راہ حق دکھادی وہ بھی انہیں روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہی کہتے ہیں اور بس حضرت امام ابوالعالیہ اس آیت کے بارے میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ آیت ایسی ہے جس سے بہت سے شبہات و فتن اور بہت سی کج فکریاں اور گمراہیاں دور ہوتی ہیں (اختصار ابن کثیر لصابونی ص ۱۸۸ ج ۱)

کس قدر حیرت و تعجب کی بات ہے کہ جس آیت کو حضرت ابوالعالیہ شبہات و ضلالات اور فتنہ کا خاتمہ کرنے والی فرمارہے ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب اس آیت کے اصل مضمون و فائدہ سے چشم پوشی کر کے اس سے ایسی عالمگیر اخوت انسانی ثابت کرنا چاہتے ہیں جو بلا تفریق مذہب و ملت ہو اور جس کا اصل مقصد بنی نوع انسانی کے نسلی قومی ملکی اور دیگر اختلافات کے ساتھ ساتھ مذہبی اختلاف کا خاتمہ کرنا ہے۔

کاش یہ بزعم خود مصلحین ایسی مذہبی رواداری کی تلقین و تبلیغ کے وقت قرآن مجید کی وہ آیات بھی پیش نظر رکھا کریں جن سے اس قسم کی مزعومہ رواداری پر زد پڑتی ہے سورہ کافرون میں ''لکم دینکم و لی دین'' کا اعلان ہو جانے کے بعد بھی بلا تفریق مذہب و ملت کے خوشنما اور خوش آیند فقرہ کی کوئی گنجائش باقی ہی کہاں رکھی گئی ہے۔

اس قسم کی فکری کجی اور غلط فہمی کا اصل اور بنیادی سبب یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کا مطالعہ قرآن و حدیث اور مطالعہ دین و مذہب اکثر و بیشتر ان کتابوں پر مبنی ہوتا ہے جو غیر مسلم یورپین مصنفین کی تصنیف کردہ ہوتی ہیں۔

چنانچہ محترم جناب ڈاکٹر صاحب نے بھی اس موقع پر سورہ بقرہ اور سورۂ یونس کی آیات کا سرسری حوالہ تو یونہی دیدیا تھا کہ قارئین مضمون کو یہ اندازہ تو ہو ہی جائے کہ موصوف کی نظر آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ پر بھی ہے۔ سای وجہ سے وہ پوری طرح اس بات پر غور ہی نہ کر سکے کہ یہ حوالے ان کے اثبات مدعا میں کار آمد بھی ہوں گے یا نہیں۔ اسی بے اطمینانی کی کیفیت کی وجہ سے حوالہ میں صرف آیات کے نمبر پر اکتفا فرماتے ہوئے آگے بڑھ گئے پہلے تو اقبال کا ایک قطعہ پیش کردیا اور پھر آمدم برسر مطلب کے انداز سے پروفیسر ہرگرون بے کی بات نقل فرمائی ہے لکھتے ہیں:

پروفیسر ہرگردن بے کے الفاظ میں پیغمبر اسلام نے جس جمعیت اقوام کی بنیاد رکھی اس کا مقصد بین الاقوامی سطح پر وحدت انسانی اور اخوت انسانی کے تصور کو عملی جامہ پہنانا تھا، پھر انہیں پروفیسر ہرگردن بے کے حوالے سے نجران کے عیسائی کے ساتھ آپ ﷺ کے معتدل طرز عمل کا عمل کا بھی

ذکر کیا ہے حالانکہ وفد نجران کی آمد تاریخ اسلام کا کوئی گم شدہ ورق نہیں ہے جو موصوف کو صرف ہر گردن بے ہی بتا سکتے تھے، یہ واقعہ کتب تفسیر قرآن وحدیث وسیر کی کتابوں میں بھی مل سکتا تھا مگر کیا کیا جائے غیر مسلم مصنفین سے اظہار مرعوبیت کے بغیر بہت سے لوگوں کی سند علم اور ڈگری مستند ہی نہیں ہوتی ہے۔

اس حقیقت سے شاید کوئی تنگ نظر کوتاہ بین ہی انکار کریگا کہ مذہب اسلام میں دوسری اخوتوں سے متعلق تعلیمات کے ساتھ ساتھ اخوت کی رعایت لحاظ کی بھی تعلیم دی ہے مگر یہ تعلیم اس طرح نہیں دی ہے جس طرح محترم جناب ڈاکٹر صاحب پروفیسر ہر گردن بے کی ذریعہ دینا چاہتے ہیں۔ جس کی ایک مثال وہ بھی ہے جو اوپر گذر چکی موصوف نے آپ کے مشہور ارشاد گرامی " المسلم من سلم المسلون من لسانه و يده "میں "مسلمون "کا ترجمہ دوسرے مذاہب کے معتقدین فرمادیا ہے جو کھلی ہوئی تحریف ہے واقعہ یہ ہے کہ لفظ اخوت کے تحت متعدد قسم کی اخوتیں آجاتی ہیں۔

اخوت انسانی اخوت دینی اخوت نسبی وغیرہ

مذہب اسلام میں ان میں سے ہر قسم کی اخوت کے لئے حقوق واحکام بتائے گئے ہیں اور تعلیمات مذہب پر عمل کرنے والے ان احکام کی پابندی کرتے رہے ہیں۔ آگے چل کر مضمون کی اسی پہلی قسط میں (پانچویں کالم میں) ایک عنوان ہے حقوق انسانی کا پہلا منشور " اپنے جانی دشمنوں کے حقوق کا لحاظ۔ اس عنوان کے تحت شعب ابی طالب میں محصوری کے زمانہ کا مشہور واقعہ نقل کرنے کے بعد ایک حدیث نقل فرمائی ہے لکھتے ہیں، ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے تم میں سے کوئی اس وقوت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک دوسرے انسانوں کے لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اور جب تک وہ انسان سے صرف اللہ کے لئے محبت نہ کرے (بے حوالہ)

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ محترم مضمون نگار صاحب نے اپنے گراں قدر مضمون میں حدیثیں تو کئی نقل کی ہیں لیکن حوالہ کسی کا بھی نہیں دیا ان حدیثوں میں پہلی حدیث تو موضوع نکل گئی جس کی کمزوری کا احساس تو خود صاحب مضمون کو بھی تھا، دوسری حدیث کے ترجمہ میں گمراہ کن غلطی ہو گئی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اب یہ تیسری حدیث ہے جو بے حوالہ درج ہوئی ہے اس کا حال یہ ہے کہ موصوف کے ترجمہ کے مطابق کوئی روایت حدیث احقر کو نہیں مل سکی ہے (احقر کو اپنی کوتاہ نظری کا اعتراف ہے) اچھا ہوتا کہ موصوف نے اس حدیث شریف کا حوالہ دے دیا ہوتا؟ فاضل مضمون نگار جناب ڈاکٹر صاحب علوم عصریہ کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں ایک ذمہ دار منصب پر فائز ہیں ایسی صورت میں حدیث شریف کے معاملہ میں ان کا یہ غیر ذمہ دارانہ طرز نا قابل فہم ہے۔

اس مضمون سے متعلق احقر کی رسائی جس روایت حدیث تک ہو سکی ہے اس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

"لایومنُ احد کم حتیٰ یحب لاخیه مایحب لنفسه"

(بخاری و مسلم ترمذی نسائی)(بحولہ جمع الفوائد ص ۱۳ج ۱)

(ترجمہ حدیث) تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل الایمان نہیں ہوگا جب تک کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے بھی وہی بات پسند نہ کرے جو وہ اپنے حق میں پسند کرتا ہے)

جمع الفوائد اور مشکوٰۃ شریف میں یہ روایت تو اتنی ہی مذکور ہے اس سے زائد جو مضمون محترم ڈاکٹر صاحب نے نقل کیا ہے وہ مضمون اس روایت کے بعد ایک دوسری روایت میں آیا ہے۔ اس مضمون کا اضافہ تو کوئی قابل گرفت بات نہیں ہے آخر مضمون تو حدیث شریف ہی کا ہے۔

اعتراض جو کچھ ہے وہ اس بات پر ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب نے چونکہ حضور اقدس ﷺ کے مشن ہی سے "اخوت دینی" کو نظر انداز کر کے صرف اخوت انسانی ہی کو مقصد قرار دیدیا ہے اس لئے انہوں نے اس حدیث میں آئے ہوئے فقرہ "لاخیہ "کا ترجمہ اپنے بھائی کی بجائے دوسرے انسانوں کردیا ہے جو سراسر غلط ہے اور منشأ نبوی کے خلاف ہے۔

مضمون زیر تبصرہ میں آئی ہوئی حدیثوں کے ترجمہ میں یہ غلطی جسے "تحریف حدیث" کہا جاسکتا ہے صرف اس وجہ سے راہ پاگئی۔ ہے کہ محترم جناب ڈاکٹر صاحب نے کہنے کو تو حضور ﷺ کی "حیات "اور "مقاصد" کو موضوع بنایا ہے لیکن آپ کے مقاصد عالیہ انہوں نے اپنی اس فکر وذہنیت کے مطابق تجویز کئے ہیں جو مستشرقین و مستغربین کی کتابوں کے مطالعے نے ان کے دل ودماغ کو بخشدی ہے۔

پروفیسر رگودن بے کی بیان فکر واخوت انسانی کے جادو نے موصوف کو اس درجہ مسحور کردیا کہ انہوں نے نہ تو ان قرآنی آیات کو دیکھا جن ہیں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو "اخوت دینی" کا درس دیا ہے اور نہ ان احادیث نبویہ کو دیکھا جن میں حضور اقدس ﷺ نے امت مسلمہ کو دینی اخوت ملحوظ رکھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ قرآن مجید کی یہ مشہور آیت "انماالمومنون اخوۃٌ" محترم جناب ڈاکٹر صاحب کو کیوں یاد نہ آسکی؟ اور حضور اقدس ﷺ کی یہ مشہور حدیث جس میں حضور ﷺ نے مسلمانوں میں اخوت دینی کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے اسے ایک عجیب وغریب اور حسی مثال دے کر ذہن نشین فرمایا ہے۔ بخاری شریف اور مسلم شریف کی متفق علیہ روایت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

مثل المومنین فی توادوهم و تراحهم و تعاطفهم کمثل الجسد اِن اشتکی عضوٌ قد اعی له سائر الجسد بالسهر و الحمی"

ترجمہ حدیث شریف: مسلمانوں اور ایمان والوں کی باہم دوستی و محبت اور ایک دوسرے کے ساتھ ربط تعلق کی مثال یہ ہے کہ جیسے انسان کا بدن کہ اگر بدن کے کسی بھی عضو میں

کچھ تکلیف ہو جائے تواس تکلیف سے بدن کے سارے ہی اعضامتاثر ہو جاتے ہیں آنکھوں سے نیند غائب ہو جاتی ہے اس تکلیف کی وجہ سے بخار بھی آجاتا ہے۔

"اخوت دینی" کا درس دینے اور اس کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے اس سے زیادہ موثر و بلیغ ارشاد اور کیا ہو سکتا ہے۔ بلا تفریق مذہب وملت کا فقرہ بظاہر نظر لوگوں کی بہت خوش آیند لگتا ہے لیکن اس فقرہ کا استعمال بعض موقعوں پر حددرجہ گمراہ کن ہو جاتا ہے۔ حضور اقدس ﷺ کی بعثت و رسالت اور دعوت وارشاد کو "بلا تفریق مذہب وملت" قرار دینادراصل آپ کے مقصد اور مشن ہی سے مکمل بے خبری کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔

آخر قرآن مجید میں آئے ہوئے الفاظ "یاایہاالناس" اور یاایہاالذین آمنوا' دو طرح کے کیوں استعمال ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ کو اگر تفریق مذہب وملت اور امتیاز حق وباطل مطلوب مقصود نہ تھی تو یہ دو طرح کے انداز خطاب کیوں اختیار فرمائے گئے اور حضور اقدس ﷺ کو کیوں حکم دیا گیا کہ آپ کفار مشرکین سے فرمادیں "لکم دِینکم وَلِیَ دِینِ"

میرا الگ طریقہ رستہ الگ تمہارا میں اپنا راستہ لوں تم اپنا راستہ لو۔

مضمون کی گمراہی کا نقطۂ عروج:

محترم جناب ڈاکٹر صاحب نے حیات مقدسہ اور مقاصد عالیہ کے بلند بانگ عنوان سے جو مضمون سپرد قلم فرمایا ہے اس کے آخر میں "ایک تاریخی حقیقت کا ایک ذیلی عنوان قائم فرمایا ہے ذیل میں، اسی عنوان کے تحت موصوف کی نگارشات کے کچھ اقتباسات ملاحظہ کے لئے پیش کئے جاتے ہیں فرماتے ہیں.

اس سے قبل کے صفحات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ حضورؐ سے قبل۔ ہر ملک اور ہر دور میں انبیاء علیہم السلام کی آمد کا سلسلہ جاری رہا لیکن ان انبیا علیہم السلام کی زندگی کے معیاروں کی روشنی میں معلوم تاریخ کا حصہ نہ بن سکی اس وجہ سے آج بہت سے ممالک کے انبیاء خاص طور سے ہندستان کے پیغمبروں کی تاریخ تحقیق کی روشنی میں سامنے نہیں آسکی اس لئے مسلمان ہندوستان کے پیغمبروں کے معاملے میں کوی واضح فیصلہ نہ کر سکے یہ یقین ہے کہ یہاں پیغمبر آئے لیکن وہ کون تھے اور ان کے اسمائے گرامی کیا تھے؟ بہر حال جن حضرات کو مروجہ طور پر اوتار، بدھ اور تیر تھنکر کہا جارہا ہے۔ ہم انہی کو پیغمبر مان کر ان کا نام تعظیم و تکریم سے لیں جیسے شری رام چند، شری کرشن گوتم بدھ اور دردھاماہاویر وغیرہ ان برگزیدہ حضرات کی زندگی تاریخ کے بجائے انسانوں میں گم ہو نے کے باوجود اپنے اندر کچھ ایسی زریں اسباق بھی رکھتی ہے جو مسلمانوں کے لئے جاذب فکر و نظر ہو سکتے ہیں آخر مسلمان بنی اسرائیل کے پیغمبروں کو تسلیم کرتے ہیں جب کہ تاریخ کی کسوئی پر ان کی

زندگی بھی محل نظر ہے خالص علمی تحقیق اور تاریخی اعتبار سے ان کی حیات اور کارناموں کا جائزہ لیا جائے تو مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر ہیں اور حضور ﷺ سے تقریباً چھ سو سال قبل دنیا میں تشریف لائے مگر تاریخ کے اعتبار سے ان کا معاملہ یہ ہے کہ ایک مغربی مفکر کو یہ کہنا پڑا: "کہ تاریخی اعتبار سے یہ بات مشکوک ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اس دنیا میں کبھی وجود بھی تھا" (اناللہ وانا الیہ راجعون)

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

غیر مسلم نام نہاد مفکرین کی گمراہ کن عقیدتمندی کا نتیجہ ہے کہ فاضل گرامی جناب ڈاکٹر صاحب کو جلیل القدر اور صاحب کتاب رسول اور پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت بھی صرف اس لئے مشکوک نظر آنے لگی کہ مغربی مفکر برٹریڈ رسل کو اپنے مزعومہ تاریخی معیار کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دنیا میں وجود ہی سرے سے تسلیم نہیں ہے برٹریڈ رسل تو منکر قرآن تھا ہی محترم مضمون نگار جناب ڈاکٹر صاحب کو کیا سمجھا جائے جو ایک طرف تو سیرت نگار ہونے کا بھی گمان رکھتے ہیں اور دوسری طرف عیسیٰ علیہ السلام کے وجود مسعود کو مشکوک ٹھہرا کر بالواسطہ قرآن مجید کی صاف تصریحات کو غیر مسلم مورخین کی کتابوں کے مقابلہ میں غیر مستند اور ناقابل یقین قرار دے رہے ہیں جب کہ صورت حال یہ ہے کہ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق جس قدر تفصیلی حالات بیان ہوئے ہیں دوسرے پیغمبروں کے بیان میں نہیں ملتے مگر چونکہ برٹریڈ رسل اس پر ایمان نہیں رکھتا ہے تو ڈاکٹر صاحب جیسا مستغرب کیسے اس پر ایمان لا سکتا ہے؟

اب سے تقریباً بارہ پندرہ سال پہلے دہلی کے ایک مشہور صاحب قلم نے اپنے ایک مضمون میں ہندوستان میں گذری ہوئی بزرگ شخصیتوں شری کرشن جی شری رام چندر جی وغیرہ کے متعلق یہی بات لکھدی تھی جو ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے اسی مضمون میں لکھی ہے تو مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ علیہ الرحمہ کے صاحبزادے مفتی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف نے مرحوم نے اس کا بروقت نوٹس لیتے ہوئے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمادیا تھا "عقیدہ یا رواداری" اور از راہ عنایت احقر کے پاس بذریعہ ڈاک بھیجا بھی تھا۔

افسوس کہ احقر کے پاس اس وقت وہ رسالہ موجود نہیں ہے ورنہ کچھ اقتباسات یہاں پیش کرائے جاتے موصوف کے رسالہ میں جو تفصیلی مضمون لکھا گیا تھا اس کا حاصل رسالہ کا یہی مذکورہ بالا عنوان تھا" عقیدہ یا رواداری" یعنی ایسی حالت میں کہ ہندوستان کی ان بزرگ شخصیتوں کے مستند حالات ان کے ماننے والوں کے پاس بھی نہیں ہیں اس لئے ان کی نبوت کا یقین واعتقاد تو بہ

حال درست نہیں ہے باقی امکان کی بات اور رواداری کا معاملہ تو یہ الگ بات ہے اور از روئے مذہب کافی ہے کہ ان کی بابت اقرار وانکار کا کوئی قطعی و حتمی فیصلہ نہ کیا جائے اسلام میں یہی ہدایت دی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبروں کو سچا سمجھیں اور ان پر ایمان لے آئیں جن کے اسمائے گرامی معلوم ہوں ان پر اور جن کے معلوم نہ ہوں ان پر بھی۔ باقی متعین طور پر نام لے کر کسی کو پیغمبر اسی وقت کہا جائے گا جب کہ وہ نام قرآن میں صراحت کے ساتھ موجود ہو، اسی وجہ سے علمائے اسلام حضرات لقمان اور حضرت ذوالقرنین کی نبوت پر اتفاق نہ کرسکے حالانکہ ان کا ذکر اور انکے نام یا لقب قرآن مجید میں مذکور ہیں۔

زمانہ ما قبل تاریخ میں گذری ہوئی ان نیک سیرت شخصیتوں شری کرشن، شری رام چندر، مہاتما گوتم بدھ، وغیرہم کی نبوت کے امکان کا تذکرہ تو اور لوگوں نے بھی کیا ہے لیکن ان کے نبی ہونے کا یقینی دعویٰ اس طرح کسی نے بھی نہیں کیا ہے جس طرح محترم ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے: موصوف کی تحریر میں اس موقع پر سنجیدہ علمی استدلال کے بجائے زور و زبردستی کا رنگ آگیا ہے موصوف نے جس انداز سے بات کہی ہے اسے زرا ٹھیٹھ لہجے میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ:

ہم کہتے ہیں کہ ہمارے ہندوستان کی یہ عظیم شخصیتوں بھی نبی تھیں، اور محض اسو جہ سے کہ ان کی شخصیتیں معلوم تاریخ کی روشنی میں نہیں آسکی ہیں، اگر ان لوگوں کی نبوت کا انکار کیا جاسکتا ہے تو پھر اسی تاریخی بنیاد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نفس وجود اور ان کی نبوت کا بھی انکار کرنا چاہئے کیونکہ برٹریدرسل جیسے مفکر کے نزدیک معلوم تاریخ کی روشنی میں تو ان کا بھی وجود ہی مشکوک و مشتبہ ہے مگر مسلمان انہیں دنیا میں آیا ہوا پیغمبر مانتے ہیں تو پھر ان لوگوں کو پیغمبر کیوں نہ مانا جائے۔

موصوف کے اس استدلال کا خطرناک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے قرآن مجید پر لائے ہوئے اپنے ایمان کو برٹریڈرسل کی تاریخ اور اس کی تقلید پر قربان کردیا ہے انہیں خدا اور رسول کو اپنے ایمان سے خوش رکھنے کے بجائے برٹریڈرسل جیسے منکرین قرآن کو خوش رکھنا زیادہ ضروری نظر آیا کہ اس طرح علی گڈھ یونیورسٹی کی وہ پرانی روایات قائم رہ سکیں جن کی وجہ سے بانی مدرسۃ العلوم (علی گڈھ یونیورسٹی) جو صرف سید احمد نہ رہ کر آنریبل سر سید احمد خاں" کہلانے اور دوسرے بہت سے خطابات و عزازات پانے کے حقدار ہوگئے تھے۔

وآخر دعونا الحمد للہ رب اللعالمین

رمضان المبارک کی راتوں میں ایک رات "شبِ قدر" کہلاتی ہے۔ جو بہت ہی برکت اور خیر کی رات ہے کلام اللہ شریف میں اس کو ہزار مہینوں سے افضل بتلایا گیا ہے، ہزار مہینوں کے تراسی برس چار مہینے ہوتے ہیں، وہ شخص کتنا بڑا خوش نصیب ہے جس کو اس رات کی عبادت نصیب ہو جائے گویا اس نے تراسی سال چار ماہ سے بھی زیادہ زمانہ عبادت میں گذار دیا، اور اس زیادتی کا حال بھی معلوم نہیں کتنی ہے۔ اللہ جل شانہ کا واقعۃً بہت بڑا انعام و اکرام ہے کہ امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کو یہ ایک نعمت مبارکہ نصیب فرمائی۔

نیز یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ لیلۃ القدر کی سعادت خاص طور سے امتِ محمدیہ کو عطا فرمائی گئی ہے تاکہ اس امت کے لوگ اپنی چھوٹی عمروں کے باوجود زیادہ ثواب حاصل کرلیں۔ چنانچہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی تفسیر "درمنثور" میں حضرت انسؓ سے حضور ﷺ کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ شب قدر حق تعالیٰ جل جلالہ نے میری امت کو مرحمت فرمائی ہے پہلی امتوں کو نہیں ملی (درمنثور۔ فضائل رمضان ص ۳۴)

اس مبارک عطیہ کا سبب:

اس سلسلہ میں مختلف احادیث مروی ہیں کہ اس انعام کا سبب کیا ہوا۔ چنانچہ:

حدیث (۱) امام مالکؒ نے مؤطا میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی امتوں کی عمریں دکھلائی گئیں۔ آپ نے دیکھا کہ ان کی عمریں بہت بہت ہوئی ہیں اور آپ کی امت کی عمریں بہت تھوڑی ہیں (کہ اگر وہ نیک اعمال میں ان کی برابری بھی کرنا چاہیں تو ممکن نہیں، اس سے نبی کریم ﷺ کو رنج ہوا) تو آپ ﷺ کو شب قدر عطا کی گئی۔ (مؤطا امام مالکؒ ص ۹۹۔ الترغیب والترہیب ص ۱۰۲ ج ۲)

حدیث (۲) ابن ابی حاتم اور بیہقی نے مجاہدؒ سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ نے بنی اسرائیل کے ایک شخص کا تذکرہ فرمایا جو ایک ہزار مہینے تک مسلسل جہاد میں مشغول رہا کبھی ہتھیار

نہیں اتارے۔ مسلمانوں کو یہ سن کر تعجب ہوا اس پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے "سورۂ قدر" نازل فرمائی، جس میں اس امت کے لئے صرف ایک رات کی عبادت کو اُس مجاہد کی عمر بھر کی عبادت یعنی ایک ہزار مہینے سے بہتر قرار دی۔ (روح المعانی ص ۲۲۲ ج ۱۵ پ ۳۰)

حدیث (۳) حضرت علی و عروہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے بنی اسرائیل کے چار اشخاص کا ذکر فرمایا کہ انہوں نے اسی اسی برس تک اللہ رب العزت کی عبادت کی اور ان کا ایک لمحہ بھی خدائے تعالیٰ کی نافرمانی میں نہیں گذرا۔ وہ چار اشخاص یہ تھے۔

(۱) حضرت ایوب علیہ السلام (۲) حضرت زکریا علیہ السلام (۳) حضرت حزقیل علیہ السلام (۴) حضرت یوشع ابن نون علیہ السلام یہ سنکر صحابۂ کرامؓ کو بہت تعجب ہوا۔ (اور متمنی ہوئے کہ کاش ہماری بھی اتنی ہی عمریں ہوتیں کہ ہم بھی اتنی طویل مدت تک اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے) اتنے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لے آئے۔ اور کہا کہ اے محمد ﷺ! آپ کی امت ان حضرات کی اسی برس کی عبادت سے نیز اس بات سے کہ انہوں نے ایک لمحہ بھی نافرمانی نہیں کی تعجب کرتی ہے۔ آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے خیر و برکت نازل فرمائی ہے اور پھر "سورۃ القدر" پڑھ کر سنائی اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیحد خوشی ہوئی (قرطبی ص ۹۰ ج ۲۰ روح المعانی ص ۲۲۲ ج ۱۵ سورۃ القدر) اس سلسلہ میں اور بھی کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں بہر حال ان روایات سے بھی یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ "شب قدر" خاص طور سے اس امت کو عنایت کی گئی ہے

لیلۃ القدر کی وجہ تسمیہ:

قدر کے دو معنیٰ آتے ہیں عظمت و شرف۔ تقدیر و حکم۔ امام زہری وغیرہ حضرات علماء کرامؒ نے پہلے معنیٰ مراد لئے ہیں۔ اور فرمایا کہ اس رات کو "لیلۃ القدر اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ رات عظمت و شرف والی رات ہے۔

اور علامہ ابو بکر رزاقؒ نے فرمایا کہ اس رات کو "لیلۃ القدر" اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے اپنے اعمال کی کے سبب جس آدمی کی کوئی قدر قیمت نہ تھی اس رات میں توبہ و استغفار اور عبادت کی وجہ سے وہ آدمی صاحب قدر و شرف بن جاتا ہے۔

اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اس رات کو "لیلۃ القدر" اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس رات میں قدر و شرف والی کتاب قدر و شرف والے فرشتہ کے واسطے سے قدر و شرف والے رسول ﷺ پر قدر و شرف والی امت کے لئے نازل کی گئی ہے۔

اور دوسرے معنیٰ کے اعتبار سے اس رات کو "لیلۃ القدر کہنے کی وجہ یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے

تمام مخلوقات کے لئے جو کچھ تقدیر ازلی میں لکھا ہے اس کا جو حصہ اس سال میں رمضان سے اگلے رمضان تک پیش آنے والا ہے اس رات میں وہ حصہ ان فرشتوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو کائنات کی تدبیر اور تنفیذ امور کے لئے مامور ہیں۔ اس میں ہر انسان کی عمر، موت، رزق اور بارش وغیرہ کی مقداریں لکھوادی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ جس شخص کو اس سال میں حج نصیب ہوگا وہ بھی لکھ دیا جاتا ہے۔ اور وہ فرشتے جن کو یہ امور سپرد کئے جاتے ہیں بقولِ ابن عباس چار ہیں۔ جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل علیہم الصلاۃ والسلام۔ (قرطبی ص ۸۸، ۸۹، روح المعانی ص ۲۲۱، ج ۱۵ مرقاۃ شرح مشکوۃ ص ۵۵۸ ج ۲)

لیلۃ القدر کی تعیین :

اتنی بات تو قرآن کریم اور احادیث طیبہ کی تصریحات سے ثابت ہے کہ شبِ قدر ماہ رمضان المبارک میں آتی ہے لیکن تاریخ کے تعیین میں علمائے کرام کے متعدد اقوال ہیں، جو چالیس تک پہنچتے ہیں مگر تفسیر مظہری میں ہے کہ ان سب اقوال میں صحیح یہ ہے کہ "لیلۃ القدر" رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے اور آخری عشرہ کی تو خاص تاریخ متعین نہیں۔ بلکہ ان میں سے کسی بھی رات میں ہو سکتی ہے۔ اور وہ ہر رمضان میں بدلتی بھی رہتی ہے۔ اور ان دس راتوں میں سے بھی خاص طاق راتوں میں یعنی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹، میں احادیث صحیحہ کی رو سے زیادہ احتمال ہے۔ اس قول کے اعتبار سے وہ تمام احادیث جمع ہو جاتی ہے جو تعیین "شب قدر" کے متعلق آئی ہیں

(معارف القرآن، روح المعانی ص ۲۲۰ ج ۱۵)

چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تحروا ليلة القدر في العشر الاواخر من رمضان: شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ میں تلاش کرو (بخاری ص ۲۷۱ ج ۱)

نیز حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

تحروا ليلة القدر في الوتر من العشر الاواخر من رمضان" شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔

اسی طرح کی حدیثیں حضرت ابن عمرؓ حضرت ابو ہریرہ، اور حضرت ابو سعید خدری وغیرہ حضرات سے بھی مروی ہیں۔

نیز نبی کریم ﷺ کا آخری عشرہ میں اعتکاف فرمانا اور مستعدی سے اس میں عبادت کرنا اور اپنے اہل بیت کو بھی اہتمام سے اس عشرہ میں جگانا اور امت کو بھی اس عشرہ کے اعتکاف کا حکم دینا وغیرہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے شبِ قدر آخری عشرہ میں ہوتی ہے۔

سلف کے چند اور ارشادات:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شب قدر پورے سال میں دائر رہتی ہے۔ اسی وجہ سے آپ کا یہ ارشاد منقول ہے "**من یقم الحول یصب لیلة القدر**" جو شخص پورے سال رات میں جاگے وہ شب قدر کو پا سکتا ہے امام ابو حنیفہؒ سے بھی یہی منقول ہے۔

(مسلم شریف ص ۳۷۰ ج ۱، قرطبی ص ۱۹۱ ج ۲۰ مکتبہ مکیہ پاکستان)

اسی وجہ سے بعض بزرگان دین کا ارشاد ہے "**من لم یعرف قدر اللیلة لم یعرف لیلة القدر**" جس شخص نے رات کی قدر نہ پہچانی یعنی عبادتِ خداوندی کے لئے شب بیداری نہیں کی وہ "لیلۃ القدر" کی عظمت وسعادت سے کو کیا پہچان پائے گا۔ (مظاہر حق جدید ص ۶۸۰ ج ۲)

۲- حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ "شبِ قدر ستائیس رمضان کو ہوتی ہے، چنانچہ مروی ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ سے کسی نے نقل کیا کہ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ "شب قدر" تمام سال میں دائر رہتی ہے، تو فرمایا کہ اللہ ابن مسعودؓ پر رحم فرمائے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ایک رات پر قناعت کر کے نہ بیٹھ جائیں پھر قسم کھا کر فرمایا کہ شبِ قدر ۲۷ر رمضان کو ہوتی ہے۔ (مسلم شریف ص ۳۷۰ ج ۱)

۳- شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ان لوگوں کا قول زیادہ صحیح ہے جو یہ کہتے ہیں کہ شب قدر تمام سال میں دائر رہتی ہے۔ اس لیے کہ میں نے دو مرتبہ اس کو شعبان میں دیکھا ہے۔ ایک دفعہ ۱۵ر کو اور ایک دفعہ ۱۹ر کو اور دو مرتبہ رمضان کے درمیانی عشرہ میں ۱۳ر اور ۱۸ر کو دیکھا ہے، اور رمضان کے آخری عشرہ کو ہر طاق رات میں دیکھا ہے۔ اس لئے مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ سال کی راتوں میں پھرتی رہتی ہے۔ البتہ رمضان میں بکثرت پائی جاتی ہے۔ (فضائل رمضان ص ۴۶)

۴- حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ شبِ قدر سال میں دو مرتبہ ہوتی ہے، ایک وہ رات جس میں احکام خداوندی نازل ہوتے ہیں اور اسی رات میں قرآن کریم لوحِ محفوظ سے اترا ہے۔ یہ رات رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ پورے سال میں دائر رہتی ہے۔ لیکن جس سال قرآن پاک نازل ہوا اس سال رمضان المبارک میں تھی اور اکثر رمضان ہی میں ہوتی ہے۔ اور دوسری شبِ قدر وہ ہے جس میں روحانیت کا خاص انتشار ہوتا ہے۔ اور ملائکہ بکثرت زمین پر اترتے ہیں اور شیاطین دور رہتے ہیں، دعائیں اور عبادتیں قبول ہوتی ہیں۔ یہ ہر رمضان میں ہوتی ہے اور آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ہوتی ہے اور بدلتی رہتی ہے۔ حضرت مولانا یحییٰ صاحب کاندھلویؒ اسی کو راجح قرار دیتے ہیں۔ (فضائل رمضان ص ۴۶)

ر عجیب لطیفے:

(۱) علامہ ابوبکر وراقؒ نے یہ نکتہ ارشاد فرمایا ہے لیلۃ القدر سورۃ القدر میں تین مرتبہ آیا ہے۔ ر لفظ لیلۃ القدر کے نو حرف ہیں اور تین کو نو میں ضرب دینے سے ستائیس حاصل نکلتا ہے لہٰذا معلوم اکہ شب قدر ستائیس رمضان کو ہوتی ہے۔ (قرطبی ص ۹۲ ج ۲۰)

(۲) سورۂ مومنون کے شروع میں جو انسان کی تخلیق کے سات مدارج ذکر کئے گئے ہیں، تفسیر رطبی میں اس جگہ اسی آیت سے استدلال کر کے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے تعین شب قدر کے تعلق یہ لطیفہ منقول ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک مرتبہ اکابر صحابہ کے مجمع سے سوال کیا کہ ب قدر رمضان کی کون سی تاریخ میں ہے؟ سب نے جواب میں کہا اللہ اعلم کوئی تعیین بیان نہیں کی۔ ر ابن عباسؓ سے پوچھا کہ آپ کیا کہتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین اللہ تعالیٰ نے آسمان سات یدا کئے اور زمینیں سات پیدا کیں۔ انسان کی تخلیق سات درجات میں فرمائی، انسان کی غذا سات چیزوں بنایا، (جو سورۂ عبس میں مذکور ہیں) اسلئے میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ شب قدر ستائیسویں شب ہے۔ روق اعظمؓ نے یہ عجیب استدلال سن کر صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ آپ حضرات سے وہ بات نہ ہو سکی جو س لڑکے نے کی جس کے سر کے بال بھی ابھی مکمل نہیں ہوئے۔ (قرطبی بحوالہ معارف القرآن)

یلۃ القدر کی علامات:

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ومن امارأتهاانهاليلة بلجة صافية ساكنة ساجبة لاحارة و لاباردة كان هاقمراساطعاو لايحل لنجم ان يترمى بتلك اللية حتى الصباح و من اماراتهاان شمس تطلع صبيحتهال شعاع لهامستوية كأنهاالقمرليلة البدروحرم الله على شيطان ان يخرج معهايو مئذ (رواہ احمد و البیھقی، قرطبی ص ۹۲ ج۲ فضائل رمضان ص ۲۷)

ترجمہ: اس رات کی علامتوں میں سے ہے کہ وہ رات کھلی ہوئی چمکدار ہوتی ہے، صاف شفاف نہ زیادہ گرم نہ زیادہ ٹھنڈی، بلکہ معتدل، گویا کہ اس رات میں (انوار کی کثرت کی وجہ سے) چاند کھلا ہوا ہے، اس رات میں صبح تک آسمان کے ستارے شیاطین کو نہیں مارے جاتے۔ نیز اس کی علامتوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس رات کی صبح کو آفتاب بغیر شعاع کے نکلتا ہے ایسا بالکل ہموار ٹکیہ ں طرح ہوتا ہے جیسا کہ چودھویں رات کا چاند ہوتا ہے۔ اللہ جل شانہ نے اس دن کے آفتاب کے طلوع کے وقت شیطان کو اس کے ساتھ نکلنے سے روک دیا۔

بعض روایات میں اور بھی کچھ علامات ذکر کی گئی ہیں۔ لیکن اس رات کی صبح "آفتاب کا بغیر شعاع کے نکلنا" یہ علامت بہت سی صحیح روایات سے ثابت ہے۔اس کے علاوہ اور علامتیں لازمی نہیں۔ مثلاً علامہ طبریؒ نے ایک جماعت سے نقل کیا ہے کہ اس رات میں درخت بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور زمین پر گر پڑتے ہیں اور پھر اپنی اصلی حالت پر واپس آجاتے ہیں اسی طرح اس رات میں ہر چیز سجدہ کرتی ہے۔ مگر ایسی چیزوں کا تعلق امورِ کشفیہ سے ہے جو ہر شخص کو محسوس نہیں ہوتے ہیں۔اور نہ شب قدر کے تعین میں ان چیزوں کا دیکھنا شرط ہے۔ (مظاہر حق جدید ص ۶۸۰ ج ۲)

لیلۃ القدر کی عبادت اور مخصوص دعاء:

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضور اقدس ﷺ سے سوال کیا کہ یارسول اللہ مجھے شب قدر کا پتہ چل جائے تو کیا دعا مانگوں تو حضور ﷺ نے یہ دعا بتلائی:

اللهم انك عفو تحب العفو فاعف عني:اے اللہ بے شک تو بہت معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے کو پسند کرتا ہے ۔لہٰذا مجھے معاف فرما۔(رواہ احمد والترمذی۔ مشکوٰۃ ص ۱۸۲ ج ۱)

نہایت ہی جامع دعا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے لطف وکرم سے آخرت کے مطالبہ کو معاف فرمادے تو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہئے علماء کرام لکھتے ہیں کہ یہ دعا دنیاو آخرت کی تمام خیر وبھلائی کے لئے جامع ہے۔

من نگویم کہ طاعتم بہ بذیر
قلم عفو برگناہم کش

حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں اس رات میں دعاء کے ساتھ مشغول ہونا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت دوسری عبادت کے ابن رجبؒ کہتے ہیں کہ صرف دعاء نہیں بلکہ مختلف عبادات میں جمع کرنا افضل ہے ، مثلاً تلاوت ،نماز، دعاء وغیرہ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ سے یہ سب امور منقول ہیں یہی قول اقرب ہے۔(فضائل رمضان ص ۴۸)

لیلۃ القدر کے فضائل:

اس رات کی سب سے بڑی فضیلت تو وہ ہے جو خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے "سورۃ القدر میں ارشاد فرمائی ہے۔ارشادِ مبارک ہے:

ليلة القدر خير من الف شهر تنزل الملئكة و الروح فيهاباذن ربهم من كل امرٍ سلام هي حتى مطلع الفجر (سورہ القدر پ ۳)

شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے (یعنی اس ایک رات میں عبادت کرنے کا ثواب ہزار مہینوں سے زیادہ عبادت کرنے کا ثواب ہے (قرطبی))اس رات میں فرشتے اور روح القدس (جبرئیل

علیہ السلام) اپنے پروردگار کے حکم سے ہر امر خیر کو لے کر اترتے ہیں (اور وہ رات) سر اپا سلامتی ہے۔ وہ شب قدر (اسی صفت کے ساتھ) طلوع فجر تک (برابر) رہتی ہے۔ (حضرت تھانویؒ)

اس سورۃ کو ذکر کرنے کے بعد احادیث کے ذکر کی زیادہ ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن چونکہ احادیث میں بھی شب قدر کے فضائل بکثرت وارد ہیں۔ ان میں سے صرف تین حدیثیں یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

گناہوں سے مغفرت:

(۱) حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من قام ليلة القدر ايماناواحتساباً فغرله ماتقدم من ذنبه (بخاری ص ۲۷۰ مسلم ص ۲۵۹)

جوشخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے (عبادت کے لئے) کھڑا ہوا سکے گذشتہ تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

دعاء رحمت :

(۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

اذاکان ليلة القدر نزل جبرئيل عليه السلام فی كبكبة من الملٰئكة يصلون علیٰ كل عبد قائم أو قاعد يذكر الله عز وجل.

جب شب قدر ہوتی ہے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام ملائکہ کی ایک جماعت کے ساتھ تشریف لاتے ہیں اور ہر اس بندہ کے لئے دعاء رحمت کرتے ہیں جو کھڑا یا بیٹھا اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو۔

(رواہ البیہقی مشکوٰۃ ص ۱۸۲ ج ۱)

"فضائل رمضان" میں ہے کہ "غالبة المواعظ" میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی کتاب "غنیة الطالبین" سے نقل کیا ہے کہ ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے کہ فرشتے حضرت جبرئیل کے کہنے سے متفرق ہو جاتے ہیں اور کوئی گھر چھوٹا یا بڑا جنگل یا کشتی ایسی نہیں ہوتی جس میں کوئی مؤمن ہو اور وہ فرشتے مصافحہ کرنے کیلئے وہاں نہ جاتے ہوں۔ لیکن اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا خنزیر ہو، یا حرام کاری کی وجہ سے جنبی ہو یا تصویر ہو۔ (فضائل رمضان ص ۴۰)

اور ابن عباسؓ ہی کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ چار آدمیوں کے علاوہ سب کی اس رات میں مغفرت کر دی جاتی ہے۔ صحابہ کرامؓ کے پوچھنے پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ چار آدمی یہ ہیں:

(۱) وہ شخص جو شراب کا عادی ہو (۲) وہ شخص جو ماں باپ کا نافرمان ہو (۳) وہ شخص جو رشتہ داری توڑے (۴) وہ شخص جو کینہ رکھنے والا اور قطع تعلق کرنے والا ہو۔ **اللهم احفظنامنهم**

(الترغیب والترہیب ص ۱۰۰ ج ۲)

خیر سے محروم:

(۴) حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ آنے پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ان هذاالشهر قد حضر كم وفيه ليلة خير من الف شهر من حرمهافقد حرم الخير كله و لايحرم خير هاالامحروم (الترغیب والترہیب ص۹۹ ج۲)

تمہارے اوپر ایک مہینہ آیا ہے جس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا تو گویا وہ ساری ہی خیر سے محروم ہو گیا۔ اور اس کی بھلائی سے محروم صرف وہی شخص رہ سکتا ہے جو حقیقۃً ہی محروم ہو۔

یقیناً اس کی محرومی میں کیا تامل ہے جو اتنی بڑی نعمت کو ہاتھ سے کھودے۔ ریلوے ملازم رات رات بھر چند کوڑیوں کی خاطر جاگتے ہیں اگر اسی برس کی عبادت کی خاطر کوئی ایک مہینہ تک رات میں جاگ لے تو کیا دقت ہے اصل میں بات یہ ہے کہ دل میں تڑپ ہی نہیں، اگر ذرا سا بھی چسکہ پڑجائے تو پھر ایک رات نہیں بلکہ سیکڑوں راتیں جاگی جاسکتی ہے۔ جو ثواب کی امید اور تمنا رکھتا ہو اس کے لئے جاگنا کوئی مشکل کی بات نہیں۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

اس لئے ہر شخص کو اپنی ہمت و وسعت کے مطابق پورے سال اس کی تلاش میں کوشش کرنی چاہئے۔ یہ نہ ہو سکے تو رمضان بھر جستجو کرنی چاہئے۔ اور اگر یہ بھی مشکل ہو تو عشرۂ اخیرہ کو غنیمت سمجھنا چاہئے، اتنا بھی نہ ہو سکے تو آخری عشرہ کی طاق راتوں کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے اور اگر خدانخواستہ یہ بھی نہ ہو سکے تو ستائیسویں شب کو تو بہر حال غنیمت باردہ سمجھنا چاہئے کہ اگر تائید ایزدی شامل حال ہے تو پھر تمام دنیا کی نعمتیں اور راحتیں اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ لیکن اگر میسر نہ بھی ہو تب بھی اجر سے خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کس قدر بڑا انعام ہے کہ کسی دینی کام میں کوشش کی جائے تو کامیابی نہ ہونے کی صورت میں بھی اس کوشش کا اجر ضرور ملتا ہے۔ اس کے برخلاف اغراض دنیویہ میں کوشش کے بعد اگر نتیجہ مرتب نہ ہو تو وہ کوشش بیکار اور ضائع ہی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود کتنے لوگ ہیں جو دینی کاموں میں اتنی کوشش کرتے ہیں جتنی دنیوی اغراض اور بے کار لغو امور کے حاصل کرنے میں کرتے ہیں کہ جان و مال دونوں کو برباد کرتے ہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

(فضائل رمضان ص۴۶)

اہم فائدے:

شب قدر کے سلسلہ میں تین اہم باتیں اور محفوظ کرلینی چاہئیں:

(۱) "سورۃ القدر" میں شب قدر کو ایک ہزار مہینوں سے افضل قرار دیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان ایک ہزار مہینوں کے اندر بھی ہر سال شبِ قدر آئے گی، تو حساب کس طرح بنے گا؟ تو اس سلسلہ میں مفسرین عظام نے فرمایا ہے کہ ایک مہینے وہ مراد ہیں جن میں شبِ قدر شامل نہ ہو۔ لہٰذا کوئی اشکال کی بات نہیں۔ (ابن کثیر عن مجاہدؒ و قرطبی عن ابی العالیہؒ)

(۲) اختلاف مطالع کے سبب مختلف ملکوں اور شہروں میں شبِ قدر مختلف دنوں میں ہو تو اس میں کوئی اشکال نہیں۔ کیونکہ ہر جگہ کے اعتبار سے جو رات شب قدر قرار پائے گی اس جگہ اسی رات میں شب قدر کے برکات حاصل ہونگے۔ (معارف القرآن پ ۳۰)

(۳) مظاہر حق میں لکھا ہے کہ اس رات میں شب بیداری کے سلسلہ میں صحیح مسئلہ یہ ہے کہ رات کے اکثر حصہ میں جاگتے رہنا معتبر ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص پوری شب جاگتا رہے تو افضل ہے بشر طیکہ اس کی وجہ سے کسی مرض و تکلیف میں مبتلا نہ ہو جائے۔ یا فرائض و سنن مؤکدہ میں نقص و خلل واقع ہو جانے کا خوف نہ ہو۔ ورنہ تو رات کے جتنے حصہ میں جاگ لیا جائے اور عبادت و ذکر میں مشغول رہنے کی توفیق حاصل ہو جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ مقصد حاصل ہو جائے گا۔ بلکہ بہت سے حضرات نے تو یہ بھی فرمایا ہے کہ جس شخص نے شب قدر میں عشاء اور فجر کی نماز باجماعت پڑھی اس نے بھی اس رات کا ثواب اور برکات پالیں۔ چنانچہ حضرت سعید بن المسیبؒ سے منقول ہے کہ جو شخص شبِ قدر میں عشاء کی نماز میں حاضر ہو جائے (یعنی عشاء کی نماز باجماعت پڑھ لے) تو اس نے لیلۃ القدر سے حصہ لیا۔ (مؤطا امام مالکؒ ص ۹۹)

لیکن جو شخص جتنا زیادہ کریگا اُتنا ہی زیادہ ثواب اور لیلۃ القدر کے انوار و برکات حاصل کرے گا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من صلی العشاء فی جماعة فكانماقام نصف الليل و من صلی الصبح فی جماعة فكانماصلى الليل كله (مسلم شریف ص ۲۳۲ ج ۱) جس شخص نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرلی تو اس نے گویا آدھی رات عبادت کرلی، اور جس نے صبح کی نماز بھی جماعت سے ادا کرلی تو گویا وہ شخص پوری رات عبادت کرتا رہا اس لئے کم از کم اگر کسی شخص کو بالکل جاگنا نصیب نہ ہو تو عشاء اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ مسجد میں ضرور ہی پورے سال ادا کرنے کا اہتمام کرتا رہے کہ اگر خوش قسمتی سے شبِ قدر میں یہ دونوں نمازیں جماعت سے میسر ہو جائیں تو کس قدر باجماعت نمازوں کا ثواب ملے گا۔

اللہ تعالیٰ سبھی مسلمانوں کو شبِ قدر میں عبادت کی توفیق عطا فرمائے (آمین ثم آمین)

یورپ آج تک عورتوں کو حقوق نہ دے سکا

از : ثمیر الدین قاسمی　　　　استاذ حدیث الجامعۃ الاسلامیہ مانچسٹر انگلینڈ

یورپ حقوق نسواں کی بازیابی کا سب سے بڑا داعی اور علمبر دار ہے، وہ اعلانات میں بار بار دہراتا ہے کہ اس صنف نازک پر ماضی میں بہت بڑا ظلم ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ خاص طور پر اسلام نے ان کو گھر کی چہار دیواری میں بند کر کے مساوات کے صراط مستقیم سے بہت دور دھکیل دیا ہے اسلئے ان کو دفتر، دکان، فیکٹری، وکالت، جج، ڈاکٹری اور پارلیمنٹ کی میز پر بحال کرنا چاہئے، تاکہ وہ مرد کی طرح کما سکے اور مرد کے شانہ بشانہ اپنے حقوق حاصل کر سکے اور وہ کسی حال میں مرد کی دست نگر نہ رہے، یورپ میں کوئی بھی ایسا پروگرام نہیں ہوتا جس میں کسی نہ کسی انداز میں اس دعوے کو دہرایا نہ جاتا ہو، ان خوش کن دعووں پر یہاں کی عورتیں فریفتہ ہیں اور سمجھتی ہیں کہ ہمیں تمام حقوق حاصل ہو گئے لیکن حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب میں اہلیہ کو لیکر برنلے کے ایک بہت بڑے ہسپتال میں گیا اور پوچھا کہ اس ہسپتال میں کوئی عورت ڈاکٹر ہے جو میری اہلیہ کا معائنہ کر سکے تو ایک خدمت گزار نرس نے کہا کہ پورے ہسپتال میں صرف ایک ہندو عورت ہے جو آج چھٹی پر ہے اس کے علاوہ سب مرد ڈاکٹر ہیں، میں نے تعجب سے پوچھا کہ یہاں تو تعلیم حاصل کرنے میں بڑی آزادی ہے، عورتیں بھی کثرت سے تعلیم حاصل کرتیں ہیں آخر عورتیں ڈکٹر کیوں نہیں بنتیں، پورے ہسپتال میں صرف ایک ہی لیڈی ڈاکٹر کیوں ہے، نرس کہنے لگی کہ کالج میں پڑھنے کا ہمیں موقع ہی کہاں ملتا ہے، ہم لوگ عموماً ہائی اسکول پاس کر کے چھوڑ دیتی ہیں، کیونکہ ہائی اسکول ہی میں لڑکے اتنے پیچھے لگ جاتے ہیں کہ ہمیں پڑھنے کا موقع ہی نہیں دیتے کالج میں تو یہ وبا اور عام ہے، جو لڑکیاں

کالج میں داخلہ لیتی ہیں پڑھتی لکھتی کم ہیں صرف لڑکوں کی باہوں میں باہیں ڈال کر گھومتی رہتی ہیں اور مشکل سے پاس نمبر کی سارٹیفکٹ لیکر گھر آجاتی ہیں، یہاں پڑھنے کی آزادی ضرور ہے لیکن مرد ہمیں پڑھنے کہاں دیتے یہ تو ہمیں ہر وقت اپنی ہوس کا شکار بنائے رکھتے ہیں۔

وہ اندھیرا ہی بھلا تھا کہ قدم راہ پہ تھا
روشنی لائی ہے منزل سے بہت دور مجھے

پھر موضوع فطرت پر بحث کرتے ہوئے نرس نے کہا کہ ہم لوگ فطری طور پر کم ہمت ہوتی ہیں، ہم میں قوت فیصلہ نہیں ہوتی، حزم واحتیاط بھی کم ہوتا ہے اسلئے ہم لوگ خطرناک مریضوں کی صحیح تشخیص نہیں کرپاتے، آپریشن کرنا ہو تو عورتوں کو اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ آپریشن کر سکیں جبکہ مرد آسانی سے کسی کا پیٹ چاک کر دیتا ہے اسلئے عورتیں آپریشن کے معاملے میں ناکام ہیں اسلئے عموماً عورتیں ڈاکٹر نہیں ہوتیں، نرس کا کام آسان ہے صرف مریضوں کی خدمت کرنی ہے اور اس کی دیکھ بھال کرنی ہے اسلئے ہسپتال میں تقریباً سارے خدمت گزار عورتیں ہیں لیکن ڈاکٹر عورتیں نہیں ہو پاتیں۔

نرس کی گفتگو انصاف آمیز اور حقیقت کی عکاس تھی اسلئے میں نے چھیڑتے ہوئے پوچھا کہ انگلینڈ میں عورتوں کی بڑی پذیرائی ہے، ان کو اونچے عہدوں پر فائز کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے اور بڑی ہمت افزائی کی جاتی ہے، بلکہ ہر محاذ پر مردوں کے مقابلے میں عورتوں کو ترجیح دی جاتی ہے اسلئے دفتر مینیجر، وکالت، جج پولیس انسپکٹر، پارلیمنٹ اور اعلیٰ عہدوں پر ان کی تعداد ۵۵ر فی صد ہونی چاہئے، اگر اتنی نہیں ہو سکتی تو کم از کم ۴۵ر فیصد تو ہونی ہی چاہئے کیونکہ یہ تعداد تو نصف سے بھی کم ہے یہ کیا بات ہے کہ اعلیٰ عہدوں پر عورتوں کی تعداد تین فیصد بھی نہیں ہے ہر جگہ ان سے بیگاری اور خدمت گزاری ہی کا کام لیا جارہا ہے، نرس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، اونچے عہدوں پر فائز نہ ہونے کی ہر جگہ وجہ وہی ہے کہ کالجوں میں ہمیں لڑکے پڑھنے ہی نہیں دیتے، کلاس، پارکوں، راستوں حد یہ ہے کہ رہائش گاہوں تک میں وہ ہمارے پیچھے لگے رہتے ہیں، کوئی خوش نصیب لڑکی ڈگری بھی حاصل کرلے تو مرد اس کو اپنے مقابلے میں آگے آنے نہیں دیتے، پھر جرأت و عقلمندی، حزم واحتیاط کی کمی کی وجہ سے وہ اعلیٰ عہدوں پر فٹ بھی نہیں ہوتیں، صرف عورتوں کی سیٹ باقی رکھنے کے لئے کسی کسی مقام پر

بدرجہ مجبوری عورت کو اونچے عہدے پر رکھ لیتے ہیں، وہاں بھی کام تو مرد ہی کرتے ہیں صرف عورت کا نام باقی رہتا ہے ان عہدوں پر بھی مرد آوازیں کستے ہیں، استہزاء و مذاق کرتے ہیں اور چلتے پھرتے اشارہ سے باز نہیں آتے، جسکی وجہ سے عورت تنگ آجاتی ہے اور اعلیٰ عہدوں کو چھوڑ کر خدمت گزاری، نرسنگ، ہوٹل میں کھانا پکانا استقبالیہ پر اور دکان پر سامان فروشی کا عہدہ اختیار کرلیتی ہیں اور گاہک آئے تو اپنا سامان بھی نیلام کرلیتی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے نرس کی آواز گلوگیر ہوگئی، آنکھوں سے بادل برسنے لگے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی کہ یورپ میں حقوق نسواں کی صدائیں بہت بلند ہیں لیکن دفتر اور ہوٹلوں میں خدمت گزاری اور سامان فروشی کے علاوہ ان کو کوئی عہدہ نہیں ملتا ہاتھی کے دکھلانے کے دانت اور ہوتے ہیں اور کھانے کے اور ہوتے ہیں۔

مجبوراً اہلیہ کو مرد ڈاکٹر کو ہی دکھلایا، واپسی میں کار پر سوار ہوا تو بہت دیر تک تصور کے پردے پر نبی امی ﷺ کی حدیث گھومتی رہی کہ عورتیں ناقصات عقل والدین پیدا کی گئی ہیں، ان کی فطرت ہی میں یہ ودیعت کی گئی ہے کہ وہ گھر کی چہار دیواری میں رہکر معاشرے اور دین کا کام کریں ،ان کو شمع محفل کے بجائے گھر کی ملکہ بنائیں، ان کو پردے سے نکال کر جس مقام پر بٹھائینگے وہیں خرافات کا لاوا پھوٹ پڑے گا نہ وہ خود اچھی طرح کام کرنگی اور نہ مردوں کا دل کام میں لگے گا۔

میں یہ بھی سوچتا رہا کہ نرس نے یورپ کے معاشرے سے تنگ آکر کس طرح کھلے دل سے اعتراف کیا کہ یورپ نے عورتوں کو حقوق نسواں کا صرف بلند و بالا نعرہ دیا ہے لیکن محفل و مجلس، دفتروں اور کلبوں میں نیم برہنہ کر کے ان سے صرف رونمائی، و لطف اندوزی، ہوس رانی و خدمت گزاری کا کام لیا جارہا ہے۔

ماسٹر شہزاد علی مظفر نگری

نحمده ونصلی علی سید المرسلین وعلی اله واصحابه اجمعین

آج ہمارا ملک جن حالات سے دوچار ہے وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں یہ ملک دنیا کا سب سے بڑا جمہوریہ ہے صوفی سنت رشیوں کا دیش ہے خواجہ معین الدین چشتی نظام الدین اولیاء شاہ ولی اللہ کا دیش ہے یہی ملک آج بے حال ہے ہر سو افراتفری مچی ہوئی ہے کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں ملے گا جو یہ کہہ سکے کہ وہ کسی طرح ملک کے حالات سے مطمئن ہے۔ اخلاقیات کا دیوالا نکال دیا گیا ہے پارلیمنٹ عدلیہ سے لے کر عام معاملات تک حکومتی سطح سے لے کر انفرادی سطح تک ہر طرف شیطانیت کا بول بالا ہے سیاسی استحکام کا تو ذکر ہی مت کیجئے۔ ...... اللہ اللہ! کسی ملک قوم یا معاشرہ کی اخلاقی اقدار ہی اس کی اصل اساس و بنیاد ہوتی ہے۔ یہ بنیادیں جتنی گہری اور مضبوط ہونگی ملک و قوم کی بقاء اور ترقی بھی اسی قدر گہری ہونگی۔ جب تک یہ بنیادی قدریں باقی رہیں گی وہ قوم و معاشرہ زندہ رہے گا باقی رہے گا اور جب وہ ختم ہو جائیں گی تو وہ ملک بھی تاریخ کا ایک حصہ بن کر رہ جائے گا چاہے اس ملک کی اقتصادی و فوجی طاقت کیسی کیوں نہ ہو۔ اس پس منظر میں امت مسلمہ پر نظر ڈالی جائے تو اس کا حال بھی لائق تشویش ہی ملتا ہے ملت اسلامیہ کے افراد بھی اخلاقی پستی کے راستے پر نظر آتے ہیں سماج معاشرہ کی غلط کاریوں میں بذات خود ملوث ہیں اور احساس تک نہیں ہے حق تعالیٰ شانہ ملت اسلامیہ کی حفاظت فرمائے۔ یہ اسی امت کا حال ہے جس کو قرآن نے "امت وسط" کے لقب سے نوازا ہے "کنتم خیر امۃ اُخرجت للناس" کہا ہے آج وہی امت خود اپنے نفع و نقصان کے سمجھنے سے عاری معلوم ہو رہی ہے۔ غیر قوم ہمارے معاملات عادات بر تاؤ دیکھ کر اس کے مطابق اسلام کی تصویر بناتی ہے اگر ہمارے اندر یہ چیزیں سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق ہونگی تو یہ تصویر صحیح ہوگی۔ اسلئے بحیثیت مسلمان ہم اپنے معاملات وعادات اسوۂ حسنہ کی روشنی میں جائزہ لے کر درست کریں جس سے غیروں کے سامنے اسلام کی بہترین تصویر دے سکیں۔

مسلمانوں کے اخلاقی وتہذیبی پستی کے بنیادی اسباب بھی کئی ہو سکتے ہیں۔ اولاً صحیح ومکمل تعلیم کابندوبست نہ ہونابقدرضرورت اپنے تعلیمی اداروں کانہ ہونااس کے متعدد وجوہ بھی ہیں ہندوستان کی علمی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے دوراقتدار میں درس وتدریس کاتمام ترانحصار مسلم حکمراں امراء پر ہوتاتھا۔ ہر شہر قصبہ میں امراء وسلاطین کی جانب سے مدرسے قائم تھے جن کے مصارف کی مکمل ذمہ داری شاہی خزانے پر ہوتی تھی یہ نظام ۱۸۵۷ء تک قائم رہااس کے بعد مسلمانوں کی حکومت کاچراغ گل ہوگیااور اقتدار ونظام تعلیم بدل دیاگیااور یہیں سے مسلمانوں کی پستی کادور شروع ہوتاہے۔ چنانچہ مسٹر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب میں ایک جگہ آور انڈین مسلمانز میں تحریر فرمایاہے۔ حکومت نے ان کے (مسلمانوں) کے لئے تمام اہم عہدوں کادروازہ بند کردیاہے دوسرے اپناطریقہ تعلیم رائج کردیاہے جس میں ان کی قوم کے لئے کوئی انتظام نہیں۔ اوراس کے اوقاف کی آمدنی جوان کی تعلیم پر خرچ ہونی چاہئے تھی غلط مصرفوں پر ہورہی ہے۔ (موج کوثر ۴۷)

پستی اور پستی کے بعد تباہی کادور شروع ہوتاہے۔ ہر طرف سے مسلمانوں کے اوپر ظلم وستم کے پہاڑ گرائے جاتے ہیں اس سلسلہ میں سب سے پہلے تعلیمی اداروں کو تباہ کیاجاتاہے جو امراء اور نوابوں کی سرپرستی میں چلتے تھے۔ علماء کرام کی بے عزتی سرعام گرفتاریاں سرعام پھانسی پر لٹکادیاجاتااور یہاں تک کہ قتل عام کیاجاتاہے زبان فارسی کی جگہ دھیرے دھیرے اردو لے لیتی ہے علماء عظام بڑی محنت کرکے تاریخ فلسفہ اور فقہ کی کتابوں کواردو میں منتقل کرناشروع کردیتے ہیں اور اپناکام پوراکرتے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے علماء کرام ان خدمات کی بدولت تاریخ وفقہ اور فلسفہ اسلامی سے عوام خواص کاتعلق باقی رکھنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں یہی پالیسی تھی جس کے ذریعہ طالب علم اور ہندوستانی عوام ذہنی فکری طور پر اپنی تہذیب سے دور اور انگریزی تہذیب کے ایک حد تک حامی بن گئے بلکہ کہناچاہئے کہ کالے انگریز تیار کرلئے گئے ہندوستان میں برصغیر میں آج آزادی کے پچاس سال گزر جانے کے بعد بھی کافی تعداد میں ایسے لوگ مل سکتے ہیں جو ذہنی فکری طور پر صرف انگریز (انگریزی تہذیب) پرستی کوہی روشن خیالی سے تعبیر کرتے ہیں آج ایک نئے انداز سے آزاد ہندوستان میں مذکورہ تجربات دہرانے کی کوشش کی جارہی ہے اور تعلیم کی راہ سے سارے ہندوستانیوں کو ہندومت میں رنگ دینے کی مہم شروع کردی گئی ہے اگرچہ تعلیمی ایجنڈہ بظاہر اور وقتی طور پر ناکام بنادیاگیاہے مگر خفیہ تدبیریں جاری ہیں اور ریاست یوپی میں یہ نظام تعلیم لاگو کرایاگیاہے ویسے تو ۱۹۴۷ء سے ہی نصاب تعلیم اکثریت پسند ہی پڑھااور پڑھایاجاتارہاہے جو صحیح طور پر سیکولر نہیں لیکن نظام تعلیم طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم صرف مذہبی اور تاریخی انتہاپسندی

پر مبنی ہو جائے گا حقیقت تو یہ ہے کہ آزادی حاصل کرتے ہی مسلمانوں سے ان کی تہذیب ثقافت تاریخ سے بیگانہ بنادیا گیا کیونکہ مادری زبان سے مسلمانوں کا رشتہ توڑ دیا گیا نونہالان ملت لاچار ہو کر رہ گئے مشہور فلسفی آرنالڈ ٹوین بی لکھتے ہیں کہ اب کسی کتب خانہ کو آگ لگانے کی ضرورت نہیں ہے صرف رسم الخط بدل دینا ہی کافی ہے رسم الخط بدل جانے سے قوم کا اس کی ماضی تہذیب و ثقافت مذہب و کلچر سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی پرانی قدریں بے معنیٰ ہو کر رہ جاتی ہیں ہندوستان میں یہی کچھ ہو رہا ہے علماء کرام اور مسلمانوں کی ملک کے لئے قربانی کا یہی بدلہ، ہندوستان میں یہی کچھ ہو رہا ہے علماء کرام اور مسلمانوں کی ملک کے لیے قربانی کا یہی بدلہ چکایا جارہا ہے کہ ان کی تہذیب کو ختم کرنے کی کوشش کریں اس ملک کی بد قسمتی ہے! مذکورہ حالات میں اگر کہیں اسلامی تہذیب و ثقافت زندہ ہے اور اسلامی تہذیب اپنی اصل حالت میں باقی ہے، مادری زبان سے کچھ لگاؤ ربط ہے تو صرف اور صرف مدارس عربیہ ہی ہیں جن کا مقصد ہی اسلامی تہذیب و تقدس کو قائم و دائم رکھنا تھا اور اس حقیقت سے بھی کوئی ہوش مند مسلمان انکار نہیں کر سکتا کہ دارلعلوم دیوبند و ندوۃ العلماء لکھنؤ اور ان سے جڑے مدارس کے فضلاء نے ہندوستان اور دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے وہ قابل داد ہے اور خصوصاً ہندوستان میں آج جو صحیح اسلامی عقائد دینی علوم اور اسلامی زندگی کے قیام و بقا اور استحکام میں بیش بہا مدد ملی ہے اس میں مدارس کا بلا شبہ بنیادی حصہ ہے۔

رجحانات جدید اور نوجوانان ملت:۔ دوسر بنیادی اور اہم وجہ تہذیبی پستی کی یہ ہے کہ اپنے آپ کو دانشور روشن خیال ظاہر کرنے والے حضرات اسلامی آثار و روایات کے مقابلہ میں مغربی جدید تہذیب کی نمائندگی کو ہی سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں یہ لوگ حالات اور تقاضے کا نام لے کر اسلامی معاشرہ اور اقدار کو مردود مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں مگر سوال یہ ہے عصر جدید کے وہ کون سے تقاضے ہیں جن کی وجہ سے اسلام اپنی حقیقی شکل میں رہتے ہوئے ان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اگر مسئلہ نئی ایجادات کا ہے کہ آج انسان اونٹ بیل گاڑی کی سواری کے بجائے خلائی طیاروں اور ہلی کاپڑوں پر اڑنے لگا ہے، دست کاری کے بجائے بڑے بڑے کارنامے قائم کرلئے ہیں تیر تلوار کے بجائے رائفل میزائل اٹیم بم کے استعمال پر قادر ہو گیا ہے۔ بتایا جائے آخر مذہب کا ان ایجادات سے کیا تصادم ہے۔ مذہب اسلام کا وہ کون سا اصول ہے جو ان تبدیلیوں کی نفی کرتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سائنسی ایجادات و تجربات اسلام کی حقانیت اور صداقت کی ہی تصدیق کرتے نظر آتے ہیں مثلاً عقیدہ آخرت کے سلسلہ میں قیامت کے دن انسان کا زندہ کیا جانا جس کو دشمن اسلام نہیں مانتے تھے، آج انسان کا مخلو

ن تیار کر کے ثابت کر دیا ہے کہ قیامت کے دن انسان دوبارہ زندہ ہوگا جس سے آواگون کے اصول کی نفی ہوتی ہے دوسرے قیامت کے روز انسان کے ہر اعضاء خدائے واحد کے سامنے اپنے اعمال کی شہادت دیں گے۔ مادہ پرستی کے پجاری اس عقیدے کو ماننے کو تیار نہ تھے مگر آج گراموفون ٹیپ ریکارڈ سیلو لرفون کے استعمال نے بندگان مشاہدہ کو اس کے ماننے پر مجبور کر دیا ہے کہ اگر لوہا سیاہ رنگ کا فیتہ بول سکتا ہے تو قادر مطلق جسم کے اجزاء کی بھی گویائی عطا کر سکتا ہے۔ وزن اعمال کے مسئلہ کو بھی سائنسی تجربہ اور مشاہدہ کی شکل میں دنیا کے روبرو کر رہی ہے آج سائنسی ترازوؤں کے ذریعہ حرارت و برودت اور ہوا تک کو تولا ناپا جارہا ہے۔

الغرض !! سائنسی انکشافات اور ایجادات تو اسلام کی پیش کردہ غیبی حقائق اور امور کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں اس لئے اسلام کا ان سے کوئی تصادم نہیں ہے۔ مگر یہ بدقسمتی ہی کہی جانی چاہئے کہ عصری ضروریات اور تقاضوں کا نام لے کر یورپ کی مردہ تہذیب کی تبلیغ کی جاتی ہے جہاں پرسود کا ہے بے بجابا رواج، مرد عورتوں کا آزادنہ میل ملاپ، کلبوں کی انسانیت کش زندگی گرل بوائے فرینڈ جیسی حیاسوز رسومات جنہوں نے یورپ کو ایسے جوار میں لا کھڑا کیا ہے جس کے چاروں طرف حیوانیت درندگی خودغرضی مایوسی اور تاریکی نے گھیر اڈال رکھا ہے۔

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

"آرنلڈ ٹوین بو" جو ایک مشہور و معروف فلسفی مورخ ہمیں لکھتے ہیں۔ اب کسی کتب خانہ کو آگ لگانے کی ضرورت نہیں ہے رسم الخط بدل، دیناہی کافی ہے۔ مثال ہماری آنکھوں کے سامنے ہے دنیائے اسلام کی قابل فخر کہے جانے والی مملکت ترکی۔ جس کے لئے آج اسلامی تہذیب بے معنی بیگانہ ہے مصطفیٰ کمال کی حیوانیت نے اسلام کی شعار کا جنازہ نکال دیا صرف رسم الخط کے ذریعہ، سویت یونین سے الگ ہوئی ریاستوں کا حال ہمارے سامنے ہے بوسینا کوسوو اور علاقہ بلقان کا نظارہ سامنے ہے۔ اسلئے اس دنیائے فانی اور خصوصاً امت مسلمہ کی بھلائی اور خیر خواہی اس میں ہے کہ اسلامی شعار کو زندہ رکھیں رحمت عالم ہادی انسانیت رسول عربی آخرالزمان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہی ہر ہر کام انجام دیا جائے جنسے انسانیت کو مکمل رہنمائی مل رہی ہے اور سنت رسول کے مطابق زندگی کو ڈھالا جائے معاملات درست کئے جائیں پھر انشاءاللہ ہمارا چمن لبریز ہو چلے گا۔

جسے فضول سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلاؤ تو روشنی ہوگی

۱۳ار رجب ۱۳۷۴ھ کی صبح نے ایک ایسے اعلان کے ساتھ سونے والوں کو بیدار کیا جس کا ہر لفظ دل و دماغ پر ہتھوڑا بن کر گرا، دنیا بیدار ہوئی اور اس نے سنا۔ ادب و فقہ، حدیث و تفسیر کی قسمت سوگئی۔ دارالعلوم دیوبند کے لاؤڈاسپیکر سے ایک بھرائی ہوئی جانی پہچانی آواز۔ مولانا عزیز احمد قاسمی کی بلند ہوئی اور بڑی مشکل سے رُک رُک کر یہ الفاظ ادا ہوئے۔ ابھی ساڑھے چار بجے شیخ الادبؒ ہم سب کو یتیم کر کے خدا کو پیارے ہوگئے ایک قیامت تھی جو بپا ہوگئی ایک طوفان تھا جس نے دل و ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھدیا۔

حضرت شیخ الادب والفقہ سیدی و مولائی مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ نے کم وبیش ۴۵ سال دارالعلوم میں مسند علوم و ہدایت کو رونق بخشی اور آج اچانک خاموش ہوگئے سوچتا ہوں علم و حکمت کے اسی تاجدار کا ذکر آج اس دن کروں جس دن یہ دولت ہم سے جدا ہوئی شاید بھولے ذہنوں کو خیال آجائے اور ذکر و کلام پاک پڑھ کر ان کے خدام ان کو بخش دیں۔ مگر میرے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ اس وسیع سمندر کے کسی گوشہ کسی ساحل پر پہونچ خراج عقیدت پیش کردوں حضرت شیخ الادبؒ اس خاندان کے چشم وچراغ تھے جہاں علوم مغربی کے ساتھ دولت و عشرت کی کمی نہ تھی آپ کے چھ بھائی ہندوستان کے مختلف شہروں اور صوبوں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے مگر قدرت کو آپؒ سے کچھ اور کام لینا تھا شاہ جہاں پور جو آپ کا آبائی وطن تھا وہاں سے آپ نہایت کم عمری میں گھر والوں کی مرضی کے خلاف خاندانی طرز تعلیم کو چھوڑ کر علم دین کے لئے نکل پڑے اور سیدھے دارالعلوم پہونچ گئے ماں کے بڑے لاڈلے تھے ماں تڑپ گئی اور دیوبند آنے کے ایک ہفتے بعد علم و دین کے راستے میں نکلنے والوں کی آزمائش شروع ہوگئی ماں کے انتقال کی خبر آئی سکون غارت ہوگیا، دل کی دنیا برباد ہوگئی، مگر اٹھا ہوا قدم اُٹھا رہا آگے چلنے کے لئے بیٹھے ہٹنے کے لئے نہیں اور اب تن من دھن سے اپنے مقصد میں لگ گئے۔

فرمایا کرتے تھے کہ گھر والوں نے اسی تعلیمی لائن پر ڈال دیا جو گھر میں رائج تھی برسوں سر مارتا رہا مگر انگریزی کی پہلی کتاب سے آگے نہ بڑھ سکا آخر خدا کی مدد شامل حال ہوتی اور میں اس مبارک راستہ پر لگ گیا جو میرے لئے مقدر تھا حضرت پھر تو اس راستہ کی تمام تر دشواریوں کو سینے سے لگایا ہمت و شوق کی تمام تر توانائیوں کے ساتھ منزلوں پر منزلیں طے کرنے لگے ایک بار فرمایا میرا حافظہ بہت کمزور تھا ابتدائی کتابوں میں مجھے بڑی محنت کرنی پڑی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ رات رات بھر عربی صرف و نحو کے قواعد رٹتا تھا آخر خدا نے فضل فرمایا اور میری مشکلیں آسان ہوگیں۔ کچھ اسی کا اثر تھا کہ دار العلوم کی زندگی میں ہر وہ طالبعلم ان کا عزیز ان کا چہیتا ہوتا تھا جو محنتی اور ہمہ وقت مطالعہ کا شوقین تھا اور ایسے طالبعلم کے لئے وہ اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار رہتے تھے ان کی ذات میں طلباء ماں باپ کی محبت محسوس کرتے تھے یوں تو عام طور پر دار العلوم کا ہر طالب علم ان کے لئے اپنے رشتہ دار کی طرح اپنے جگر گوشوں کی طرح محبوب ہوتا تھا لیکن خاص طور پر پڑھنے والا طالب علم تو ان کے دل و دماغ اور ان کی شفقت و محبت کا مالک ہوتا تھا تعلیمی ضرورتوں کے علاوہ زندگی کی دوسری چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کی ذمہ داری حضرت پر رہتی تھی۔ کوئی طالب علم بیمار ہو جائے پھر حضرت کا کھانا پینا سونا جاگنا بے چینیوں کی نظر ہو جاتا تھا مگر اس کے ساتھ ہی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت کی آواز حتی کہ مخصوص راستوں سے حضرت کے گذرنے کے اوقات اُن کے کمرے کا جنگلہ جھوٹ موٹ ان کا نام یہ تمام وہ اسباب تھے جو طلباء کے دل ہلا دینے کو کافی تھے دار العلوم میں بڑے سے بڑے اجتماعات سنگین سے سنگین ہوش رفتہ باہمی جھگڑے ایسے نہیں دیکھے جس میں حضرت شیخ الادب تشریف لائیں اور وہاں دو ایک طالب علم بھی اپنی جگہ موجود ملے اگر کبھی راستہ میں کسی طالب علم سے ملاقات ہوگئی اور حسب عادت حضرت نے پہلے سلام کر لیا تو طالبعلم یا تو الٹے پیروں واپس بھاگ جانا چاہتا تھا یا جس قدر دب سکتا دیوار میں اور راستے کے کنارہ پر دبتا چلا جاتا حضرت کی عادت تھی ہمیشہ آنکھیں نیچی کر کے راستہ چلتے تھے اور بوڑھا جوان بچہ جو بھی راستہ میں پڑتا بہت مشکل تھا سلام کرنے میں حضرت سے پہلے سبقت کر سکے آخر عمر تک مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ رات کے پرسکون ماحول میں جب دنیا آرام کرتی تو حضرت علم کی پیاس بجھاتے اگر کوئی طالبعلم پڑھنے کے شوق کا اظہار کرتا اور حضرت سے کوئی کتاب پڑھنا چاہتا تو اس کو بڑے حوصلے سے وقت عنایت فرماتے اور مشکوٰۃ شریف ترمذی شریف، حماسہ، متنبی، پڑھانے والا میزان منشعب اور نفحۃ العرب، نفحۃ الیمن بھی اسی لگاؤ سے پڑھاتے جو بڑی بڑی کتابوں کے لئے ان کے دل میں تھا عموماً شروع میں طالب علم کو صبح ۳/۴ بجے یا رات ایک بجے کا وقت عنایت فرماتے اور ایک ہفتہ کی پابندی دیکھ لیتے تو دن میں وقت دیتے کہ واقعی اس طالب علم کو پڑھنے کا شوق ہے وہی رات کا قیمتی

اور پر سکون ماحول تھا جس کے خاموش لمحات میں حضرت نے حاشیہ متنبی کنزالدقائق نفحۃ العرب السہم المصیب العربی اور نور الیضاح کے شروح و حواش اور قیمتی تخلیقات دنیا کو عنایت کیں۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے حضرت شیخ الادبؒ کو غیر معمولی عشق تھا اور عشق و محبت میں عظمت و احترام کا جذبہ پوری طرح کار فرما تھا۔ حضرت مدنی طویل سفر سے تشریف لاتے ہیں شیخ الادب نے سنا اور فوراً کتاب بغل میں دبائی اور مکان پر آگئے دیکھا خوش ہوئے اور عالم یہ کہ جس طرح ان کے سامنے طلبا دبے جاتے تھے پیچھے ہٹتے جاتے تھے وہی حالت خود ان کی دربار مدنی میں ہوتی تھی۔ اور کہیں حضرت مدنی نے پوچھ لیا سبق کا وقت ہے آپ یہاں کیسے آگئے بس پھر کیا تھا برق و رعد کی طرح تڑپے اور سیدھے درسگاہ کی طرف روانہ ہوگئے حضرت مدنیؒ کو بھی شیخ الادبؒ سے نہ صرف محبت تھی بلکہ آپ کو شیخ الادبؒ پر ناز تھا جس کا اظہار ان کے انتقال پر حضرت مدنیؒ کی تقریر کے ان الفاظ سے ہوا۔

''آہ آج میرا داہنا بازو ٹوٹ گیا'' دارالعلوم کے تعلیمی اور انتظامی امور کے علاوہ حضرت مدنیؒ کو اپنے گھر کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے معاملات میں بھی حضرت شیخ الادبؒ پر پورا بھروسہ اور اعتماد تھا۔ یہ حضرت شیخ الادبؒ کا کام تھا کہ گھر کے خرچ آئے اگر ایک ہزار قرض کی ضرورت ہے تو وہ انتظام کر کے حضرت مدنیؒ کے منتظم خصوصی اور خلیفہ حضرت قاری اصغر علی صاحبؒ کو لا کر دیں۔

حضرت مدنیؒ کا کام صرف یہ تھا کہ وقتاً فوقتاً دو سو چار سو ہزار دو ہزار شیخ الادبؒ کو دیتے رہتے کہ یہ ہمارے قرض کا حساب ہے اللہ اللہ یہ شان یہ محبت یہ خلوص اب کہاں، عقل حیران ہے موضوع کی وسعت ثریا کی بلندی کو چھو رہی ہے عظمت و بلندی کا ایک ہمالہ ہے جو شیخ الادبؒ کی صورت میں میرے سامنے ہے کس گوشہ کو لوں کس کو چھوڑ دوں۔

میرے لئے تو شیخ الادبؒ کی ذات میں باپ کی بھی محبت تھی اور مربی کی شفقت بھی میرے والد مولانا سید وحید احمد مدنی مرحوم اسیر مالٹا کو بچپن سے انہوں نے پالا تربیت کی اس کے بعد میرے بڑے بھائی مولانا فرید الوحیدی صاحبؒ میرے چچا حضرت مولانا اسعد مدنی صاحب سب پر ان کی ذاتی نگرانی اور تربیت رہی اس کا اثر تھا کہ میں نے ان کی ذات میں وہ سب کچھ پایا جو ایک بیٹا باپ میں پاسکتا ہے اور ہائے بد نصیبی وہ کچھ بھی نہ پاسکا جو ایک شاگرد اپنے استاد سے ایک چیلا اپنے گرو سے ایک مرید اپنے مرشد سے پاتا ہے کیونکہ عمر استفادے کی وہ شعوری منزل ابھی آئی بھی نہ تھی حضرت ہمیں چھوڑ گئے پھر بھی مجھے فخر ہے کہ حضرتؒ نے چار سال میرا کلام پاک سنا اور مجھے بھولا ہوا قرآن پاک یاد کرایا اور اپنی ادبی تصنیف نفحۃ العرب کے چند اسباق پڑھائے یہ میرے لئے سرمایہ دل و جان ہے۔

آہ ایک واقعہ ایک حادثہ بن گیا ایک معتقد کی محبت ایک سانحہ بن کر سامنے آئی ہوایوں کہ حضرت کے کسی شاگرد نے کوئی تحقیقی کام کیا جس پر اسے پی، ایچ ڈی، کی ڈگری ملنی تھی وہ سارا کام کتابی صورت ہے حضرت کو بھیجدیا اور لکھا کہ گستاخی معاف ہو اس کو آپ ملاحظہ فرمالیں اس کی اجرت یونیورسٹی جناب کو پیش کرے گی۔ حضرت نے وہ رجسٹری تمام وکمال واپس فرمادی اور اس معاملہ بندی پر ناگواری کا اظہار فرمایا معاملہ یہیں تک ہوتا تو غم نصیبوں کے لئے خوش نصیبی کی صورت بن جاتی وہ صاحب بھی بہر حال شاگرد تھے مزاج کو بھانپ گئے اور رجسٹری دوبارہ واپس کردی اور لکھا کہ حضرت اجرت کی بات معاف فرمائیں آپ میری اس ناچیز کوشش کو ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ کتاب رکھدی گئی وقتاً فوقتاً ملاحظہ فرمالیتے تھے سفر میں بھی ساتھ رکھتے تھے ایک سفر میں مخلصین اور اپنوں کی غفلت سے وہ پورا مسودہ گم ہو گیا حضرت شیخ الادب کے لئے یہ تصور جان لیوا تھا مالک کتاب کو کیا جواب دوں ہر طرف اعلان ہوا اشتہار نکالے گئے شاگردوں نے صورت حال کا اندازہ کر کے یہاں تک لکھا کہ حضرت پر اس قدر اثر ہے کہ جان کا خطرہ ہے مگر مسودہ نہ ملا حضرت پر اس قدر وحشت اور اثر تھا ہر کام سے بیکار ہو گئے اپنے دونوں ننھے پوتے (عزیزم مولانا حافظ ارشد سلمہ اور عزیزم مولانا حکیم امجد میاں سلمہ امام مسجد گلی پراٹھے والی چاندنی چوک دہلی سے دل بہلاتے اس غم کو غلط کرنے کی کوشش فرماتے مگر یہ تیر ایسا تھا کہ جگر کے پار نہ ہوا تھا اس لئے اس کی خلش کہاں دم لینے دیتی تھی بچوں کے سامنے اظہار افسوس فرماتے اور یہ شعر پڑھتے تھے۔

خاکِ مزار خاکِ شفابن کے لٹ گئی
ہائے اس اعتقاد نے میری مٹی خراب کی

آخر میں فرمانے لگے تھے کہ یا تو مسودہ ملا ورنہ میں چلا۔ اور آہ وہی ہوا مسودہ نہ ملا اور آپ فریاد لیکر شہنشاہ کے دربار میں پہونچ گئے کہ جو دلوں کا حال جاننے والا ہے جو دیانت بد دیانتی کو خوب دیکھتا ہے۔ چند گھنٹے حالت خراب رہی بے ہوشی طاری رہی اور منگل کی صبح ۴ر بجے روح پاک عالم بالا کو پرواز کر گئی للّٰہی سلسلہ کا ایک نونہال چلا گیا دارالعلوم اپنے سہارے سے محروم ہو گیا شیخ مدنیؒ نے خدا کی اس مشیت پر لبیک کہا حضرت اور اپنی قیمتی دعائیں اُن کے لئے روانہ فرمادیں آہ آج وہ دونوں سورج کسی اور دنیا میں چمک رہے ہیں۔

کاش ۱۳ اور ۱۴ ر رجب کو متعلقین شیخ الادبؒ قرآن پاک پڑھ کر بخش دیں

از : عبد السلام صدیقی ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نسب اور خاندان:

مولانا مناظر احسن گیلانی کے آباء واجداد "مانے" علاقے شیخوپور ضلع مونگیر کے سادات میں سے تھے۔ یہاں سادات کی بارہ بستیاں ہیں جن کو بارہ گانواں کہا جاتا ہے۔ یہ سادات حضرت جاجنیری کی اولاد ہیں جو بغداد سے ہندوستان آئے، اور حکومت دہلی نے ان کی برگزیدہ شخصیت کے پیش نظر علاقہ لکھی سرائے کے ضلع مونگیر کے ایک گاؤں ندیانواں میں خانقاہ کیلئے انھیں جگہ دی، اور ارد گرد چند مواضعات بھی جاگیر کے طور پر عطا کئے۔ حضرت کی تبلیغی مہم اس علاقہ میں نہایت کامیاب رہی۔ اللہ نے آپ کو کافی اولاد بھی دی اور بارہ گانواں میں ان کی نسل کے لوگ آباد ہیں، اسی بارہ گانواں میں مانے بھی واقع ہے۔

مولانا گیلانی کا خاندانی نسب نامہ اس طرح ہے۔ مناظر احسن ولد حافظ ابوالخیر ولد محمد احسن ولد میر شجاعت علی ولد شفاعت علی، میر شفاعت علی تک یہ خاندان مانے میں مقیم رہا پیشہ کاشتکاری اور زمینداری تھا۔

ایران کے خطہ گیلان سے ایک بزرگ سید ندیم الدین گیلانی اپنے صاحبزادہ سید شہاب الدین گیلانی اور فرزند زادہ سید منہاج الدین گیلانی کے ہمراہ دہلی تشریف لائے، سید ندیم الدین دہلی میں مدفون ہیں۔ سید شہاب الدین دہلی میں سید شرف الدین یحیٰی منیری کی عظمت کا چرچا سن کر صاحبزادہ منہاج الدین کے ہمراہ بہار شریف تشریف لائے، اور وہیں مدفون ہیں، بہار شریف موضع

گیلانی سے پچھم واقع ہے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد سید منہاج الدین کا دل وہاں سے اچاٹ ہو گیا، اکثر قرب وجوار میں سیر وسیاحت کیلئے نکل جایا کرتے ایک مرتبہ جب وہ گوبند پور پہونچے تو یہ جگہ ان کو بہت پسند آئی اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ یہیں منتقل ہو گئے، اس بستی کا نام انہوں نے سیدنا عبد القادر گیلانی کے نام نامی سے سعادت اور برکت حاصل کرنے کے لئے محی الدین پور گیلانی رکھا، اور آج تک یہ تاریخی گاؤں گیلانی کے نام سے معروف ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے شفاعت علی تک یہ خاندان مانے میں رہا۔ ان کے صاحبزادے شجاعت علی کی دوسری شادی پہلی بیوی کی وفات کے بعد گیلانی میں بی بی حیاتن سے ہوئی اور اُس کے بعد میر شجاعت مانے سے گیلانی منتقل ہو گئے۔ ان کی دوسری بیوی سے ۲/ لڑکے تولد ہوئے، مولانا محمد احسن اور مولوی محمد محسن، مولانا محمد احسن کی شادی گیلانی میں بی بی آمنہ بنت امام بخش ولد یتیم اللہ ولد میر مقیم سے ہوئی تھی، مولانا احسن کو ۳/ لڑکے ہوئے، سید ابو ظفر، سید ابو نصر، اور سید ابوالخیر۔ سید ابو ظفر کی جوانی میں موت ہو گئی، سید ابو نصر جو حافظ، عالم حکیم تھے، لاولد مرے، حافظ سید ابوالخیر کے ۳/ لڑکے جن میں ایک مولانا گیلانی، اور ۲/ ان سے چھوٹے ایک کا نام مکارم احسن اور دوسرے کا نام مظہر احسن تھا، اس کے علاوہ تین لڑکیاں تھیں، بی بی ام ہانی، بی بی صفیہ، اور بی بی ہاجرہ، بی بی ام ہانی کی شادی مظاہر حسن ساکن موضع کٹنی کول سے ہوئی، بی بی صفیہ کی شادی مولانا لطف اللہ (برادر بزرگ مولانا منت اللہ رحمانی) اور بی بی ہاجرہ کی شادی گیلانی ہی میں عبد العزیز سے ہوئی جو اپنے وقت کے ایک برگزیدہ قاری اور شاعر تھے۔

پیدائش اور تعلیم وتربیت:

مولانا گیلانی ۱۸۹۲ء میں اپنے نانیہال موضع استھانواں ضلع نالندہ میں پیدا ہوئے، تاریخ نام مناظر احسن ہے۔ آپ کے چچا مولوی ابو نصر صاحب نے آپ کی تعلیم وتربیت صغر سنی ہی سے اپنے ذمہ لے لی تھی، گرچہ اُس وقت انگریزی تعلیم کا چرچا عام تھا، لیکن چچا نے خاندانی روایت کے مطابق انہیں اسکول اور کالج کی تعلیم سے دور رکھا۔ مولوی ابو نصر خود حکیم اور عالم تھے۔ اور منطق وفلسفہ میں اپنے والد مولانا احسن کے نقش قدم پر گامزن تھے، اُس وقت گیلانی میں مولانا احسن کا مدرسہ ہندوستان میں کافی مشہور تھا۔

مولوی ابو نصر نے اپنے بھتیجے کو گیلانی ہی میں رکھ کر عربی فارسی منطق وفلسفہ اور حدیث کی تعلیم دلوائی۔ مولانا گیلانی چونکہ لڑکپن ہی سے بہت ذہین تھے، اس لئے مولوی ابو نصر کی آرزو تھی کہ

ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوائی جائے۔ خوش قسمتی سے اُس وقت مولانا احسن کے ایک شاگرد حکیم دائم علی صاحب ریاست ٹونک میں سرکاری طبیب تھے اور انہوں نے منطق و فلسفہ کے لئے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ ان کے فرزندار جمند حکیم برکات احمد سے مدرسہ کو بڑی ترقی ہوئی، شاید منطق و فلسفہ میں اس وقت ہندوستان میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا، مولانا گیلانی کی تعلیم کے سلسلہ میں مولوی ابونصر صاحب کی نظر مولانا حکیم برکات احمد صاحب پر پڑی اور اپنے بھتیجے کو مولانا برکات احمد کے پاس راجپوتانہ کی دور دراز ریاست ٹونک میں چھوڑ آئے۔ اُس وقت مولانا گیلانی کی عمر ۱۳؍ سال کی تھی، تقریباً ۷؍ سال تک ٹونک میں تعلیم پاتے رہے۔

ٹونک میں طالب علمی کے دوران علامہ انور شاہ کاشمیریؒ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کی علمی شہرت کا چرچا سن کر دارالعلوم دیوبند تعلیم حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور گیلانی آکر اپنے چچا سے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے دیوبند جانے کی اجازت مانگی۔ مولوی ابونصر صاحب نے مسلکی اختلاف کے باوجود اپنے بھتیجے کو دارالعلوم دیوبند جانے کی اجازت دے دی۔ مولانا گیلانی نے دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں داخلہ لیا، اور سالانہ امتحان امتیازی نمبرات سے پاس کر کے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ لکھنے پڑھنے کی عادت تو ٹونک سے ہی تھی، بھلا یہاں کیسے خالی بیٹھ سکتے تھے، چنانچہ شیخ الہند نے مولانا کی صلاحیت کو بھانپ لیا اور ''القاسم'' و ''الرشید'' میں مضامین لکھنے کیلئے کہا بس پھر کیا تھا تحریر کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ بسا اوقات دونوں پرچوں میں صرف مولانا ہی کے مضامین ہوتے تھے۔ اسی دوران مولانا گیلانی کی ۲؍ کتاب ''ابوذر غفاری'' اور ''کائینات روحانی'' چھپ کر علمی دنیا میں داد تحسین حاصل کر چکی تھی۔

دیوبند سے فراغت کے بعد:

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد اپنے وطن آئے۔ یہاں آکر مولانا کو حضرت مولانا محمد علی مونگیری کے زیر سایہ اپنا ایک رسالہ مونگیر سے جاری کرنے کا خیال آیا۔ اور اس کوشش میں لگے رہے، لیکن سرمایہ کی کمی کی وجہ سے اس کا کوئی نظم نہ ہو سکا اور مولانا کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، اس دوران مولانا محمد علی کی صحبت میں روحانی فیض حاصل کرتے رہے اور مولانا کے ارشاد سے اکثر بھاگلپور اور دربھنگہ وغیرہ جاکر وعظ اور تبلیغ کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ جب مونگیر میں ایک سال کے قیام کے بعد بھی پرچہ جاری کرنے کا کوئی نظم نہ ہو سکا تو مولانا نے اپنے حالات لکھ کر دیوبند بھیجے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے جو اس وقت کارپر

از مہتمم تھے فوراً جواب دیا اور فی الفور دیوبند واپس آنے کا مشورہ دیا اور لکھا۔ کہ ''القاسم اور ''الرشید'' کی ادارت پھر انہیں کے سپرد کی جائے گی اور تیس روپے ماہوار تنخواہ دی جائے گی۔ چنانچہ مولانا مونگیر سے دیوبند چلے گئے۔

توہین رسالت کا حادثہ اور کلکتہ کو روانگی:

ابھی دیوبند چند ہی مہینے ہوئے تھے کہ کلکتہ کے اخبار ''انڈین ڈیلی نیوز'' میں رسول اکرم ﷺ کی شان میں ایک گستاخانہ مضمون شائع ہو گیا جس سے مسلمانان کلکتہ سخت برہم ہو گئے۔ پورے شہر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ حکومت نے بھی سخت رویہ اختیار کر لیا اور مسلمان دھڑا دھڑ گرفتار ہونے لگے۔ حکومت نے سوچا تھا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہوا، اور یہ تحریک دوسرے شہروں میں بھی پھیلنے لگی۔ کلکتہ کے مسلمانوں نے بذریعہ تار علماء دیوبند کو اس طرف متوجہ کیا، وہاں سے متعدد علماء کا ایک وفد کلکتہ کے لئے چل پڑا، ان میں مولانا گیلانی بھی تھے۔ اسی درمیان حکومت کا رویہ اور بھی سخت ہو گیا۔ ایک مسجد کے نزدیک مجمع پر گولی چلادی گئی، جس سے مسلمان شہید ہو گئے۔ ان حالات کے مد نظر کلکتہ کے مسلمانوں نے آنے والے علماء دیوبند کو تار دے کر آنے سے روک دیا یہ تار ان حضرات کو ٹرین ہی میں بمقام الہ آباد ملا کچھ علماء کرام نے دیوبند واپسی کا فیصلہ کر لیا اور واپس ہو گئے۔ مولانا گیلانی جوانی کے جوش میں اڑ گئے کہ اب تو جہاد اور قربانی کے لئے کلکتہ جانا ضروری ہے مولانا کے عزیزوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ دیوبند سے علماء کس ٹرین سے کلکتہ جانے والے تھے، پٹنہ جنکشن پر ان لوگوں نے مولانا کو کلکتہ جانے سے بہت روکا لیکن مولانا کسی طرح نہ مانے ۔ کلکتہ پہونچکر جیسے ہی مولانا نے پر جوش تقریر کی اور فتویٰ دیا حکومت نے ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا۔ لیکن مخلصوں نے ان کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ چونکہ پٹنہ کے راستے دیوبند جانے کی صورت میں گرفتار ہونا یقینی تھا، اس لئے مولانا کے دوستوں نے ان کو دو ہفتے کے بعد اس پر راضی کیا کہ وہ مدراس میل سے حیدرآباد ہوتے ہوئے پونا اور بمبئی کی راہ سے دیوبند جائیں۔

مولانا گیلانی حیدر آباد میں:

جس روز مولانا کی گاڑی حیدر آباد میں گذر رہی تھی وہ عید کا دن تھا، اس لیے مولانا حیدر آباد میں ہی اُتر پڑے اور اپنے عزیز سید محی الدین صاحب بیرسٹر کے یہاں مقیم ہوئے، محی الدین صاحب کے یہاں ہندوستان کے مشہور و معروف مفسر قرآن مولانا حمید الدین صاحب فراہی پرنسپل مدرسہ

نظامیہ حیدر آباد کی آمد ورفت تھی، اس طرح مولانا گیلانی کی ملاقات علامہ فراہی سے ہوئی، جنہوں نے چند ہی ملاقاتوں میں ان کی غیر معمولی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کہ انہیں حیدر آباد ہی میں روک لیا جائے، اس زمانہ میں مولانا فراہی عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے لئے ایک عظیم منصوبہ تیار کر رہے تھے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مدرسہ نظامیہ کو عثمانیہ یونیورسٹی میں ضم کر دیا جائے اور اساتذہ مدرسہ نظامیہ کی ملازمت اسی یونیورسٹی سے وابستہ کر دی جائے۔ علامہ فراہی یہ منصوبہ نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی سر اکبر حیدری فنانس منسٹر اور سر راس مسعود ڈایرکٹر تعلیمات کے مشورہ سے تیار کر رہے تھے۔ علامہ فراہی نے مولانا گیلانی کو یہ کہہ کر روک لینا چاہا کہ یونیورسٹی جلد کھلنے والی ہے۔ اور وہ انہیں اس یونیورسٹی میں کسی اچھے عہدے پر تعلیمات دینیات کے لئے ملازمت دلوادیں گے۔

مولانا گیلانی نے جواب دیا کہ وہ دارالعلوم دیوبند کے ملازم تھے اور سر راہے وہاں آگئے تھے۔ ذمہ داران درالعلوم کی اجازت کے بغیر وہ کسی دوسری جگہ کی ملازمت قبول نہیں کر سکتے، البتہ وہاں کی اجازت کے بعد قبول کر سکتے ہیں اور اس کیلئے دیوبند خط لکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ مولانا نے دیوبند خط لکھا۔ وہاں سے جواب ملا کہ انہیں ضرور حیدر آباد رک جانا چاہئے اس وقت کی سخت ضرورت تھی کہ دیوبند کا کوئی نمائندہ اس نئی یونیورسٹی سے منسلک ہو جائے چنانچہ مولانا گیلانی نے قیام حیدر آباد کا فیصلہ کر لیا۔ چونکہ یونیورسٹی کھلنے میں ابھی دیر تھی اس لئے مولانا گیلانی سید محی الدین صاحب کو درس قرآن دیتے رہے اور خود علامہ فراہی سے تفسیر قرآن پڑھتے رہے۔ اس طرح پورا ایک سال گذر گیا، لیکن یونیورسٹی کے قیام میں ہنوز دیر تھی مجبوراً مولانا گیلانی ملازمت کی درخواست وہاں چھوڑ کر اپنے وطن گیلان لوٹ آئے۔ کچھ دنوں بعد جب عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوگئی تو گیلانی ہی میں مولانا کو تقرر نامہ ملا اور اس طرح مولانا گیلانی عثمانیہ یونیورسٹی میں دینیات کے لکچرار ہوگئے۔ اور تقریباً ۲۸ر سال تک تدریسی فرائض انجام دیتے ہوئے صدر شعبہ ہو کر سبکدوش ہوئے۔

بیماری اور وفات:

مولانا گیلانی دل کے مریض تھے اور مرض حیدر آباد کے آخری دور میں ناقابل برداشت ہو گیا تھا، بالآخر ملازمت کی قررہ مدت سے ایک سال قبل ہی مستعفی ہو کر حیدر آباد سے اپنے وطن گیلانی چلے آئے۔ ۵ر جون ۱۹۵۶ء کی شب کو سوانح قاسمی کی تیسری جلد کے آخری باب کو مکمل کر کے بستر خواب پر دراز ہوئے۔ اپنے بھانجے روح اللہ سے فانی کی مشہور غزل۔

کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

ترنم سے پڑھ کر سنانے کی فرمائش کی، پھر مولانا کو نیند آگئی۔ صبح جب ان کے چھوٹے بھائی مکارم احسن نے جو پاس ہی لیٹے تھے اپنے محبوب بھائی کو جگانا چاہا تو خود اپنی غفلت پر سر پیٹ کر رہ گئے۔ مولانا اکثر فرماتے تھے۔ کہ کسی جنت میں جانے والے پر بڑھاپانہ طاری ہوگا ہر شخص جوان صورت بن کر جائے گا، صبح کے وقت جب ان کی روح پرواز کر چکی تھی تو چہرہ تروتازہ تھا، دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی پچاس سالہ جوان بستر پر دراز تھا، اس منظر نے ہر شریک جنازہ کو محو حیرت بنادیا تھا۔ مولانا گیلانی کی وصیت کے مطابق جنازہ کی نماز مولانا فصیح (مرحوم) نے پڑھائی مولانا گیلانی کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ ۵/ جون کو مولانا فصیح دربھنگہ میں تھے کہ اس روز انکو مولانا گیلانی سے ملنے کی اتنی شدید خواہش ہوئی کہ وہ بغیر کسی پروگرام کے دربھنگہ سے گیلانی روانہ ہوگئے اور دوسرے روز گیلانی پہونچے تو مولانا مرحوم کی تجہیز و تکفین کے انتظامات ہو رہے تھے، اس طرح مولانا گیلانی کی وصیت پوری ہوئی:

نکاح، شادی اور اولاد:

مولانا گیلانی کی شادی اپنی بستی کے ایک بزرگ داروغہ سید محمد نظیر صاحب کی صاحبزادی آمنہ خاتون سے ۱۹۱۴ء میں ہوئی تھی۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے متعدد اولاد عطا فرمائی۔ لیکن اکثر نے صغر سنی ہی میں داغ مفارقت دیا۔ صرف ایک صاحبزادے اور ایک صاحبزادی کو اللہ نے عمر عطا فرمائی۔ صاحبزادے کا نام سید محی الدین تھا، ایم اے، کرنے کے بعد بہار ہی میں سب ڈپٹی کے عہدے پر فائز رہے، پھر قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان چلے گئے اور وہاں پی، اے ایس، میں انکا انتخاب ہو گیا۔ لیکن عمر نے وفانہ کی اور تھوڑے عرصہ میں مشرقی پاکستان میں انقلاب عظیم رونما ہونے کے بعد مغربی پاکستان منتقل ہوگئے ۱۹۷۰ء میں دل کا دورہ پڑا اور اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔

مولانا کی لڑکی کی شادی ان کے چھوٹے بھائی مکارم احسن صاحب گیلانی (مرحوم) کے بڑے لڑکے سید صلاح الدین سے ہوئی تھی۔ یہ خاندان اب تک گیلانی میں قیام پذیر ہے:

اخلاق و اوصاف:

مولانا کی زندگی بے مثال تھی، عثمانیہ یونیورسیٹی میں قریب۔ ۲۸/ سال تک دینیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے۔ اس حیثیت سے بڑی معقول تنخواہ پاتے رہے۔ لیکن مولانا نے اپنے

پاس روزمرہ خرچ کے لئے بھی کبھی ایک پیسہ نہیں رکھا، قیام حیدر آباد میں بال بچوں کو اتفاقاً ہی کبھی ساتھ رکھتے، بلکہ مولانا کا محبوب ملازم "لکوا" ہی اکثر مولانا کے ساتھ رہا، بیوی، بچوں، رشتہ داروں عزیزوں اور غریبوں پر خرچ کرنے کے بعد جو کچھ بچتا لکوا کے حوالہ کر دیتے اور لکوا جو کچھ حاضر کر دیتا مولانا خاموشی کے ساتھ اسے کھا دیتے۔

ضرورت مند جب کچھ مانگتا تو حتی الوسع اسے مایوس نہیں کرتے، جو کچھ ہوتا ضرور دیتے لیکن دینے کے بعد جو واپس نہیں کرتا اس سے منہ کھول کر طلب بھی نہیں کرتے کہ تم نے اتنی رقم قرض لی تھی اب تک واپس نہیں کی۔

یہاں تک کہ خود اپنے پاس رقم نہیں ہوتی اور ضرورت مند کہتا کہ فلاں سے لیکر دیجئے تو مولانا ایسا بھی کرتے کہ خود قرض لے کر دوسروں کو قرض کے نام پر دیتے اور لینے والے سے طلب کرتے ہوئے شرم محسوس کرتے، اگر خود کوئی دے گیا۔ تو بہتر ورنہ خود برداشت کرتے۔ صباح الدین عبد الرحمن صاحب نے درست لکھا ہے:

ان کی سادگی دیکھ کر ان کے علم کی گہرائی کا یقین نہ آتا تھا، اور اس گہرائی کو دیکھ کر ان کی سادگی پر تعجب ہوتا تھا، ان کی کل کائنات ایک چارپائی تھی اس پر قلم دوات رکھ لیتے اور علم و فن کا خزانہ لٹاتے رہتے کے بغل میں دو تخت تھے، ان پر معمولی فرش اور اس کے اوپر ایک قالین تھا، قالین اور فرش کے درمیان ان کا دفتر تھا، اُن کے سارے کاغذات اور خطوط قالین کے نیچے پڑے رہتے تھے۔ کمرے میں چار بڑی الماریاں تھیں جن میں منتخب کتابیں تھیں، یہی ان کا آفس اور کتب خانہ سب کچھ تھا، لکھتے لکھتے جب تکان محسوس کرتے تو چارپائی کے نیچے ہاتھ بڑھا کر ٹین کا ایک معمولی ساڈبہ گھسیٹے اس میں مٹی کے تین گلھڑوں میں کتھا چونا، اور ڈلی تھی، اور کپڑے کے ایک ٹکڑے میں کچھ پان لپٹے ہوئے۔ یہ پان دان انکی ساری زمینداری کھیتی باغ اور گراں قدر تنخواہ کا حاصل تھا، جس کے وہ بلا شرکت غیرے مالک تھے، بقیہ کسی چیز سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا، اس ڈبہ سے پان کی گلوری بناتے اور اس کو کھا کر تازہ دم ہو جاتے اور ان کا نہ تھکنے والا قلم پوری تیزی کے ساتھ رواں ہو جاتا (معارف اپریل ۱۹۵۷ء)

مولانا بیک وقت عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے مقبول ترین استاذ بھی تھے اور واعظ شہر بھی۔ متعدد کتابوں کے مؤلف و مصنف بھی تھے، اور بہت سارے اخبار و رسائل کے مقالہ نگار اور مضمون نگار بھی، شعر و شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے اور مجلس گفتگو کا سلیقہ بھی، جامع مسجد (حید آباد)

میں جمعہ کی امامت بھی فرماتے تھے اور روزانہ درس قرآن کا مشغلہ بھی تھا، اس نسبت کی وجہ سے مولانا کا ہر طبقہ کے لوگوں سے ملنا جلنا تھا اور اُن سے راہ ورسم اور تعلقات بھی تھے۔ مولانا عبدالباری ندوی تحریر فرماتے ہیں:

مولانا کا دائرہ تعلقات صرف یونیورسیٹی تک محدود نہ تھا، پورے حیدر آباد کے عوام وخواص ، علماء و مشائخ ،امراء وزراء ، افسروں ماتحتوں ، بڑے چھوٹے، تاجروں، دوکانداروں ، ہر طبقہ تک پھیلا ہوا تھا، اس کے باوجود شاید ایک مثال بھی کوئی بتا سکے کہ کسی طبقہ کا ایک فرد بھی مولانا سے ناراض رہا، ناراض کیا سب ہی بڑی عزت ومحبت کرتے تھے ،(مکاتیب گیلانی صفحہ ۴۵)

مولانا گیلانی ایک علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے، عالموں کے گھرانے میں پیدا ہوئے انہی کی گودوں میں پرورش پائی۔ اور اسی ماحول میں نشو نما ہوئی ، جب ذرا ہوش سنبھالا تو ابتدأ تا جوانی مدارس دینیہ اور تعلیمی درس گاہوں میں زندگی گذاری اور ارباب فضل و کمال اور شیفتگان کتاب و سنت کی صحبت میں دن رات رہنا ہوا، اور بعد فراغت تعلیم معلم اخلاق بن کر نوجوانوں کے سامنے آئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاق و اعمال میں پاکیزگی، عقائد و معاملات میں پختگی و صفائی اور نشت و برخاست میں متانت وسنجیدگی مولانا کے حصے مین پورے طور پر آئی ذہن و فکر اور حوصلہ وولولہ کی بلندی قدرت نے پوری فیاضی کے ساتھ عطا کر رکھی تھی، درست مزاجی اور تند خوئی سے کوسوں دور تھے، بلکہ اس کی جگہ رفق و ملاطفت اور ہمدردی رواداری، فطرت میں داخل تھی۔

مولانا گیلانی نے اپنے پیچھے کتابوں مقالوں مضامین اور مکاتیب کا بہت بڑا سرمایہ چھوڑا ہے، جن میں چند مشہور تصانیف و نگارشات یہ ہیں:

(۱) حضرت ابوذر غفاریؓ (۲) سوانح قاسمی (۳) تدوین حدیث (۴) تدوین قرآن (۵) تدوین فقہ (۶) الدین القیم (۷) النبی الخاتم (۸) مقالات احسانی (۹) تذکرہ شاہ ولی اللہ (۱۰) ہزار سال پہلے (۱۱) ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت (۱۲) مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ (۱۳) امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی (۱۴) اسلامی معاشیات (۱۵) اسلامی اشتراکیت (۱۶) اسلام اور ہندو دمت کی بعض مشترک تعلیمات (۱۷) اسفار اربعہ (۱۸) عبقات (۱۹) تذکیر بسورۃ الکھف (۲۰) ظہور نور (۲۱) ایک ہندوستان صحابی (۲۲) بابا رتن ہندی (۲۳) کائنات روحانی (۲۴) اطلاقی تصوف (۲۵) دربار نبوی کی حاضری (۲۶) مسئلہ سود (۲۷) روزہ اور قرآن (۲۸) حضرت اویس قرنی وغیرہ اس کے علاوہ بھی بہت سے مقالات و مکاتیب غیر مطبوع ہیں جس کی طرف اہل علم کی توجہ درکار ہے۔
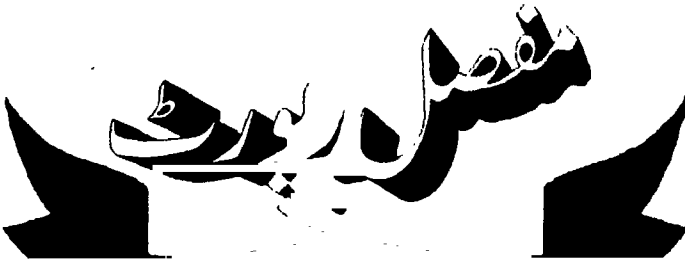
کل ہند اجتماع مدارس عربیہ

منعقدہ ۲۱ رجب ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۲ نومبر ۹۸ بروز جمعرات بمقام دارالعلوم دیوبند

ترتیب: مولانا شوکت علی قاسمی بستوی استاذ دارالعلوم
وناظم دفتر رابطہ مدارس عربیہ دارالعلوم دیوبند

حرف آغاز:

دارالعلوم دیوبند کے باکمال فضلاء اور اس سے فکری انتساب رکھنے والے علماء کرام نے ہندستان میں اسلامی علوم وفنون کی اشاعت، مسلک اہل سنت والجماعۃ کی حفاظت، اسلامی اقدار وروایات اور تہذیب وثقافت کی بقا، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برپا کی جانے والی تحریکات کے تعاقب، اور سر اٹھانے والے فتنوں کی سرکوبی، اسلام اور تعلیمات اسلام کے دفاع، ہندستان کو دوسرا اندلس بننے سے بچانے، اور ملک وملت کی صلاح وفلاح کے لیے جو قابل فخر خدمات انجام دی ہیں وہ روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔

ازہر الہند دارالعلوم دیوبند کی مرکزیت کے پیش نظر، ہندوستان کے اکثر مدارس عربیہ تعلیمی، فکری، اور مسلکی اعتبار سے دارالعلوم دیوبند سے مربوط رہے ہیں، دارالعلوم نے ہمیشہ درپیش مسائل ومشکلات کے سلسلے میں مدارس کی رہنمائی کی ہے، ضرورت پڑنے پر دارالعلوم نے ان مدارس کے ارباب حل وعقد واصحاب فضل وکمال حضرات کو اجتماعی غور خوض کی دعوت بھی دی ہے، گذشتہ چند سالوں میں دارالعلوم دیوبند میں مدارس عربیہ کے متعدد اجتماعات ہوئے ہیں جن میں بڑی تعداد میں مدارس عربیہ کے نمائندہ حضرات شریک ہوئے، اور نصاب تعلیم، نظام تعلیم وتربیت، باہمی ربط واتحاد کے استحکام اور مدارس کے خلاف کی جانی والی شازسوں اور دیگر مشکلات مدارس کے سلسلے میں غور وخوض کیا جاتا رہا ہے اور ٹھوس فیصلے ہوتے رہے ہیں۔

ماہ جمادی الاولی ۱۴۱۵ء میں ہوئے مدارس عربیہ کے ملک گیر اجتماع میں، درالعلوم کی

زیر سرپرستی رابطہ مدارس عربیہ کا قیام عمل میں آیا اور دارالعلوم میں رابطے کا مرکزی دفتر قائم کر دیا گیا۔ سال گذشتہ رابطہ سے مربوط مدارس کا کل ہند اجلاس منعقد ہوا، جس میں رابطے کے لئے دستور سازی، اس کے لئے ضابطۂ اخلاق کی ترتیب اور مشکلات مدارس کے حل وغیرہ امور کے لئے ۵۱ رکنی مجلس عاملہ رابطہ مدارس عربیہ کی تشکیل عمل میں آئی، رابطے کی مجلس عاملہ کا پہلا اجلاس ۲۰؍رجب ۱۴۱۹ھ کو مہمان خانہ دارالعلوم میں منعقد ہوا، اور ۲۱؍رجب ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۲؍نومبر ۹۸ء کو مدارس عربیہ کا کل ہند اجتماع منعقد ہوا، دونوں کی روداد بالترتیب پیش خدمت ہے:

اجلاس عاملہ رابطہ مدارس عربیہ:

رابطہ مدارس عربیہ کی مجلس عاملہ کا یہ پہلا اجلاس مہمان خانہ دارالعلوم میں، حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم، مہتمم دارالعلوم دیوبند کی زیر صدارت منعقد ہوا، اجلاس کا آغاز ساڑھے آٹھ بجے جناب قاری عبد اللہ صاحب راجستھانی استاذ تجوید دارالعلوم کی تلاوت کلام پاک سے ہوا، اس کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی، استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے افتتاحی خطاب فرمایا:

افتتاحی خطاب حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی مدظلہ

حمد وصلوۃ کے بعد آپ نے فرمایا:

"حضرت صدر محترم، حضرات علماء کرام! مجھے حضرت مہتمم صاحب کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ چند بنیادی وابتدائی باتیں ایک طالب علم کی حیثیت سے آپ حضرات کے سامنے پیش کروں، میرا یہ قطعی احساس ہے کہ اگر میں اس کام کے لیے مامور نہ کیا جاتا، تو میں اس کا اہل نہیں تھا، ان موجودہ حضرات میں، میں سب کو اپنے سے زیادہ اس بات کا مستحق سمجھتا ہوں کہ وہ اس مجلس کا افتتاح کرتے اور ابتدائی باتیں بیان کرتے، بہر حال بڑوں کا حکم ہے اس لیے چند باتیں آپ حضرات کے سامنے عرض کی جاری ہیں:

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی کام میں استحکام کے لیے تین باتیں انتہائی ضروری ہیں۔

(۱) ماضی سے تسلسل: اگر کسی قوم کا، کسی تاریخ کا، ماضی سے تسلسل ختم ہو جائے تو وہ اس درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں خشک ہو گئی ہوں۔

(۲) کشادہ ذہنی:۔ کسی کام کو پائے دار بنانے اور کسی تحریک کو مستحکم کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس تحریک کے کارکنوں کا ذہن کشادہ ہو۔ کشادہ ذہنی کا لفظ میں نے خود اختیار کیا ہے،

ورنہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے الفاظ میں اس کو "عدل" سے تعبیر کیا جائے گا، حضرت شاہ صاحبؒ جہاں ان مسائل پر بحث کرتے ہیں، تو فرماتے ہیں کہ قوموں کی زندگی کے لیے عدل ضروری ہے، پھر وہ عدل کی جزئیات پر بحث کرتے ہیں، میں نے اس لفظ کو کشادہ ذہنی سے تعبیر کیا ہے کہ ہمارا ذہن کھلا ہوا ہو، منجمد نہ ہو، کہ ہمارے اندر جو بات ہے ہم اسی کو لیے پکڑے رہیں، باہر سے جو بات آتی ہے اس طرف توجہ ہی نہ کریں یہ بات مناسب نہیں ہے عدل کا تقاضا ہے کہ اگر وہ بات عمدہ ہو تو ہم اسے اختیار کریں "خذ ماصفاد ع ماکدر" میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے، اور "**كلمة الحكمة ضالة الحكيم الخ**" میں یہی فرمایا گیا ہے،

(۳) تیسری چیز جو تحریک کو مستحکم کرتی ہے وہ احساس ذمہ داری ہے، اگر کارکنوں کے اندر احساس ذمہ داری نہ ہو تو کام ادھورا رہ جاتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ یہ چیزیں ہمارے اکابر کے یہاں بدرجہ اتم موجود تھیں اسی وجہ سے ہمارے اکابر اپنی کوششوں میں کامیاب رہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے مدارس کا تعلق، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ سے ہے حضرت شاہ صاحبؒ نے جن حالات میں آنکھیں کھولیں تھیں، وہ حالات انتہائی نامساعد اور ناگفتہ بہ تھے، آپ نے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد قوم کی اصلاح اور دین کے تحفظ کے لیے ایک پروگرام مرتب کیا، یہ وہی پروگرام ہے جسے ہم اور آپ لیکر چل رہے ہیں، حضرت کا پروگرام بڑا وسیع الذیل تھا، وہ پروگرام کہاں تک کامیاب ہوا، اور کہاں تک ناکام رہا اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک مستند مورخ لکھتا ہے کہ ،، اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا کہ اگرچہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ سیاسی طوفان روکنے میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن اس سیاسی طوفان کے پہلو میں جو الحادی طوفان تھا اس کے روکنے میں بلاشبہ وہ پوری طرح کامیاب رہے۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مولانا نے فرمایا

"مسلمانوں سے ایمان کی دولت چھیننے کے لئے کیسی کیسی سازشین کی گئیں۔ کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے، کس طرح ان کو زندگی کے تمام معاملات میں پیچھے کیا گیا۔ یہ محض اسلام دشمنی کی بنیاد پر ہو رہا تھا، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے جو راستہ دکھایا تھا، ان کے خانوادے نے اس راستے پر چل کر دین کے تحفظ کا مکمل انتظام کیا۔ اور آج ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس ظلمت کدۂ کفر میں اسلام اپنی اسی آن بان کے ساتھ زندہ ہے، یہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تحریک کی کامیابی ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے زمانے کے جو حالات تھے آج کے حالات بھی کچھ اسی طرح کے ہیں۔ ملک کے کچھ لوگ ہمارے وجود کو ہندوستان میں پسند نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے علاوہ کسی کے وجود کو پسند نہیں

کرتے۔ انھوں نے تحریکات کے ذریعہ نہ جانے کتنے مذاہب کو پنے اندر ضم کرلیاہے لیکن اگروہ مجبورو ناکام ہوئے تو مسلمانوں میں ہوئے۔ اور جب آدمی ناکام ہوتا ہے۔ تو اس کے اندر جارحیت پیدا ہو جاتی ہے اب وہ جارحیت پر اتر آئے ہیں، ایک طویل عرصے تک انہوں نے یہ کوشش کی کہ مسلم قوم کو قتل و خونریزی کے ذریعے پسپا کردیا جائے ایک زمانے تک وہ ہماری جان کے پیچھے پڑے رہے، لیکن طویل تجربے کے بعد جب انھیں اندازہ ہوگیا کہ اس طرح مسلم قوم کو نابود وفنا نہیں کیا جاسکتا۔ تو انہوں نے اپنی سازش کا رخ پلٹ دیا، پہلے وہ ہماری جان کے پیچھے پڑے تھے لیکن اب وہ ہمارے ایمان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، ہمیں اس طرف سنجیدگی سے غور کرنا ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی تحریک کے ذریعہ ہمارے ایمان، ہماری تہذیب، اور ہمارے علوم کی حفاظت کی ہے آج وہی ذمہ داری ہمارے سر پر ہے آج ہمیں اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا ہے آج مدارس عربیہ دینیہ کو دہشت گردی کا اڈہ قرار دیا جارہا ہے۔ یہ ایک خطرے کی گھنٹی ہے۔ اسے محسوس کرنا ہے۔ کس طرح یہ لوگ ہمارا احاطہ کررہے ہیں۔ ہمارے دائرے کو تنگ کررہے ہیں ایسے حالات میں ہماری ذمہ داری ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جو ورثہ ہمیں منتقل کیا تھا ہم اس کی حفاظت کریں۔ اگر ہم اس میں ناکام رہے تو تاریخ میں ہمارا نام کس انداز میں آئے گا وہ ہم خود سمجھ سکتے ہیں۔ ان چند گذارشات کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اس مجلس کے مقاصد آپ حضرات کے سامنے آگئے ہوں گے، اللہ تعالیٰ ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم امت کے لیے صحیح فیصلے کرسکیں، اور ان پر صحیح طور سے عمل کرسکیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد اللہ رب العالمین،،

دستور ساز کمیٹی کی تشکیل

اس کے بعد تبادلہ خیال کا سلسلہ شروع ہوا سب سے پہلے ناظم اجلاس حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ہر ایجنڈے کی پہلی دفعہ رابطہ مدارس عربیہ کیلئے دستور سازی کے حوالے سے دستور کا ایک ابتدائی خاکہ پیش کیا جسے دستور ساز کمیٹی (اندرون دارالعلوم) نے مرتب کیا تھا پیش کردہ خاکے کی روشنی میں غور وخوض کے بعد دستور سازی کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا۔ کمیٹی کے ارکان حسب ذیل حضرات طے پائے۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم "کنوینر" حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب نعمانی، حضرت مولانا بدرالدین صاحب قاسمی بمبئی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی، اور جناب مولانا مفتی اشفاق احمد صاحب سرائے میر، اعظم گڈھ۔

اس کمیٹی کے ذریعہ ۳۰/ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ تک دستور مرتب کرلیا جائے گا، اور ایک ایک

کاپی تمام ارکان مجلس عاملہ رابطہ کو بذریعہ ڈاک بھیجی جائے گی۔

مالی فنڈ کی تجویز:

حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی نے یہ تجویز پیش کی کہ رابطے کے دائرۂ کار کی توسیع کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مالی فنڈ ہو تاکہ پورے ملک میں اسے منظم طور پر پھیلایا جاسکے۔اس مسئلے میں مختلف آرا ٔسامنے آئیں اور یہ طے پایا کہ فنڈ کے سلسلے میں دستور ساز کمیٹی غور کرکے فیصلہ کرے گی۔

نظام تعلیم وتربیت:

معیار تعلیم بہتر بنانے کے سلسلہ میں غور وفکر ہوا۔ حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم کی ہدایت پر احقر شوکت علی قاسمی بستوی نے وہ مطبوعہ نظام تعلیم وتربیت پڑھ کر سنایا، جو کل ہند اجلاس مدارس عربیہ منعقدہ ۲۰/۲۱/۲۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ میں منظور ہوا تھا، اس کے علاوہ وہ تجاویز بھی بندے نے پڑھیں جو سال گذشتہ معیار تعلیم وتربیت بہتر بنانے اور ربط باہمی کے استحکام کے سلسلے میں دفتر رابطہ کو موصول ہوئی تھیں، نظام تعلیم وتربیت کی دفعات پسند کی گئیں، اور انہیں مدارس میں نافذ العمل قرار دینے کی تاکید کی گئی، نیز وقتاً فوقتاً وفود بھیج کر مربوط مدارس کے تعلیمی وتربیتی حالات کا جائزہ لیتے رہنے پر اتفاق کیا گیا، اس دوران نصاب تعلیم پر بھی ضمناً غور ہوا اور طے کیا گیا کہ آئندہ نصاب میں کوئی بھی ترمیم مجلس عاملہ رابطہ مدارس عربیہ میں زیر غور لاکر کی جائے۔

یہ بھی طے کیا گیا کہ مدارس عربیہ کے لئے ضابطہ اخلاق بھی دستور ساز کمیٹی مرتب کرے، اور ضابطہ اخلاق سے متعلق ضروری دفعات دستور میں شامل کی جائیں۔

مشکلات مدارس:

مشکلات مدارس کے حوالے سے، مدارس کو درپیش مسائل زیر غور آئے، داخلی اور خارجی دونوں طرح کی مشکلات زیر بحث آئیں، داخلی مشکلات کے حل کے لیے ضابطہ اخلاق کی ترتیب اور اس پر عمل پر زور دیا گیا، اور خارجی مشکلات مثلاً حکومت کی مدارس کے بارے میں منفی پالیسی، مدارس کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈے وغیرہ کے سلسلے میں طے کیا گیا کہ رابطہ مدارس عربیہ کا ایک نمائندہ وفد صدر جمہوریہ سے ملاقات کرے اور مدارس کے کردار، ان کی ملکی وملی خدمات سے انہیں روشناس کرائے اور ان سے اپیل کرے کہ وہ دستور ہند میں دی گئی آزادی کے مطابق مسلمانوں کے دینی مدارس کے تحفظ کو یقینی بنائیں، اور حکومت کو پابند کریں کہ وہ مدارس کو بدنام کرنے اور ان کے خلاف کیے جانے والے بے بنیاد پروپیگنڈے کا سلسلہ بند کرے صدر جمہوریہ سے ملاقات کرنے سے

ہلے دہلی میں ایک پریس کانفرنس کر کے میڈیا کو مدارس کے روشن ملکی و ملی کردار سے روشناس
رایا جائے، اس وفد کے لئے چند نام طے کیے گئے۔

اس نشست میں جناب مولانا عبد اللہ صاحب کاپودروی گجرات، جناب مولانا ممتاز صاحب،
شملہ جناب مولانا محمد الیاس صاحب، ہریانہ، اور جناب مولانا رشید احمد صاحب، راجستھان نے، اپنے اپنے
صوبے میں درپیش، مدارس کی مشکلات اور حکومت کے منفی رویے کی قدرے تفصیل سے وضاحت کی،
ور اس سلسلے کے بعض چونکا دینے والے واقعات سے مجلس کو آگاہ کیا پہلی نشست ساڑھے بارہ بجے دوپہر تک
جاری رہی دوسری نشست بعد نماز مغرب ہوئی اس کی صدارت بھی حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم
نے فرمائی اس نشست میں ان تجاویز پر غور ہوا جو تجاویز کمیٹی نے ظہر کے بعد مرتب کی تھیں اور جنہیں
۲۱ر رجب کو ہونے والے کل ہند اجتماع مدارس عربیہ میں پیش کیا جانا تھا، یہ کل ۶ر تجاویز تھیں جن
پر غور و فکر ہوا اور اہم ترمیمات ہوئیں، مجلس عاملہ کے اکثر ارکان نے اجلاس میں شرکت فرمائی، بعض
حضرات سفر یا بعض دیگر اہم اعذار کی بنا پر شریک نہ ہوسکے انہوں نے خطوط کے ذریعے اپنے شریک نہ
ہوسکنے پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے مجلس کی طے کردہ باتوں سے اپنے مکمل اتفاق کا اظہار فرمایا۔

کل ہند اجتماع مدارس عربیہ

۲۱ر رجب ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۲ر نومبر کو مدارس عربیہ کا کل ہند اجتماع دارالعلوم دیوبند میں منعقد
ہوا، اس اجتماع میں جن اہم مسائل پر غور و خوض ہونا تھا، دعوت نامے میں ان پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی تھی۔

"ملکی حالات و واقعات سے معمولی وقفیت رکھنے والوں پر یہ مخفی نہیں ہے کہ سرکاری
سکولوں و کالجوں میں۔ جہاں مسلمان بچوں کی بڑی تعداد زیر تعلیم ہے۔ "وندے ماترم" کا مشرکانہ
گیت پڑھنا لازم کر دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ہمارے نجی تعلیمی اداروں کا رشتہ پاکستان کی خفیہ ایجنسی
آئی، ایس، آئی سے جوڑنے کی ناروا کوشش کی جاری ہے۔..... علاوہ ازیں اپنے مذہبی مکاتب و
مدارس کے دینی مزاج و اسلامی کردار کو ہر طرح کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے گردوپیش
کے واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے پوری بالغ نظری سے اس پر بھی غور کرنا ہے کہ موجودہ حالات
میں رائج سرکاری ایڈ کیا واقعی امداد و تعاون ہے یا یہ دام زریں اس لیے بچھایا گیا ہے کہ اس کے ذریعے
ان آزاد مذہبی اداروں پر اپنی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کر لی جائے؟

نیز حالات کا تقاضا ہے کہ مدارس دینیہ کے تعلیمی و تربیتی نظام کو مزید موثر بنانے، ان کے
دینی منہاج کو برقرار رکھنے، انہیں مزید فعال و متحرک بنانے اور ان کے دائرہ عمل کو وسیع تر کرنے
کے اسباب اور تدبیروں پر غور و فکر اور موثر فیصلے کیے جائیں۔

حدی را تیز تری خواں چو محمل را گراں بینی،،

بحمد اللہ ۲۱؍رجب ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۲؍نومبر ۱۹۹۸ء کو مدارس عربیہ کا یہ ملک گیر دروح
ور اجتماع دار العلوم دیوبند کی عظیم الشان مسجد، جامع رشید میں منعقد ہوا، حضرت مولانا مرغوب
رحمٰن صاحب دامت برکاتہم مہتمم دار العلوم دیوبند کی باوقار شخصیت نے مسند صدارت کو رونق
شی، اور صوبہ جات اتر پردیش، دہلی، بہار، اڑیسہ، بنگال، آسام، منی پور، تری پورہ، میگھیالیہ ہریانہ،
باب، مدھیہ پردیش، راجستھان، گجرات، کرناٹک، مہاراشٹر، تامل ناڈو، اور جموں کشمیر کے تقریباً
ہزار مدارس کے ارباب فضل وکمال حضرات نے اجتماع میں شرکت فرمائی، اجتماع کی دو
نستیں ہوئیں، جن میں مدارس کی مشکلات، مدارس کے خلاف حکومت کی منفی پالیسی، سرکاری امداد
سے احتراز، مدارس کے نظام تعلیم و تربیت، مدارس عربیہ کے باہمی ربط و اتحاد وغیرہ
ور پر تفصیل سے تبادلۂ خیال کیا گیا، اور اجتماعی غور و فکر کے بعد ۶؍اہم تجاویز اتفاق رائے سے
ظور کی گئیں، سطور ذیل میں اجتماع کی دونوں نشستوں کی روداد پیش کی جارہی ہے۔

پروگرام نشست اول: ساڑھے آٹھ بجے صبح تا ۱۲ بجے دوپہر

مورخہ ۲۱؍رجب ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۲؍نومبر ۹۸ء

صدارت	حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم مہتمم دار العلوم دیوبند
نظامت	حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب نائب مہتمم دار العلوم دیوبند
تلاوت	جناب قاری شفیق الرحمٰن صاحب استاذ تجوید و قرأت دار العلوم دیوبند
ترانہ دار العلوم	عمران بجنوری، امیر احمد رام پوری، عمران سہارنپوری طلبۂ دار العلوم دیوبند
خطبہ صدارت	صدر اجلاس حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم، دار العلوم دیوبند
خطاب ''مدارس عربیہ کا نظام تعلیم و تربیت''	حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری استاذ حدیث دار العلوم دیوبند
خطاب ''مدارس کے خلاف حکومت کی منفی پالیسی''	حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند و رکن شوریٰ دار العلوم دیوبند۔
خطاب	حضرت مولانا محمد سلمان صاحب مظاہری ناظم اعلیٰ جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

پروگرام کے مطابق پہلی نشست کا آغاز، حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت
کاتہم، مہتمم دار العلوم دیوبند کی زیر صدارت، جناب قاری شفیق الرحمٰن صاحب بلند شہری، استاذ تجوید

دارالعلوم دیوبند کی تلاوت سے ہوا۔اس کے بعد تین طلبہ دارالعلوم (عمران بجنوری، امیر احمد، رام پوری، اور عمران احمد سہارنپوری نے ترانۂ دارالعلوم پیش کیا۔بعدازاں حضرت صدر اجلاس دامت برکاتہم نے وقیع خطبۂ صدارت پیش فرمایا، جسے سامعین نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا افادت کے پیش نظر خطبہ صدارت بعینہ نقل کیا جارہا ہے۔

خطبۂ صدارت

کل ہند اجتماع مدارس عربیہ

منعقدہ ۱۲ر رجب ۱۴۱۹ھ مطابق ۲۱ر نومبر ۱۹۹۸ء

از: حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم،
مہتمم دارالعلوم دیوبند

الحمدلله نحمده ونستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرورانفسناومن سيئات اعمالنامن يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلاهادى له ،ونشهد أن لااله إلاالله وحده لاشريك له ونشهد أن سيدناومولانامحمد أعبده ورسوله ،صلى الله عليه وعلى آله واصحابه وازواجه وذرياته أجمعين

امابعد! خداوندرحمان ورحیم کا بہت بڑاانعام ہے کہ اس نے ہمیں کسی استحقاق کے بغیر محض اپنے فضل وکرم سے دین کی نعمت عطاکی، اعتقادو عمل کے اعتبار سے صراط مستقیم پر چلنے والے بزرگوں سے وابستگی کی توفیق دی اور کتاب وسنت کی صحیح پیروی اور خدا کی مرضی کے مطابق کام کرنے والے اداروں یعنی مدارس عربیہ کی خدمت کے شرف سے نوازا، اور یہ بھی اسی کالطف وکرم ہے کہ آج ہم دین مبین کے ان روشن میناروں کے مسائل پر غور وفکر کے لیے دیوبند کی سرزمین پر جمع ہیں، دعاہے کہ پروردگار عالم ہمیں صحیح طریقۂ کار اختیار کرنے کی توفیق دے، اور تمام شرور وفتن سے ان اداروں کی حفاظت فرمائے۔ آمین

مہمانان گرامی قدر!

یہ بندۂ ناتواں، ناتوانی کے باوجود اولاً تو تابمقدور دارالعلوم کے مختلف النوع امور کی انجام دہی میں مشغول رہتاہے اور دوسرے یہ کہ بندہ اپنی بے بضاعتی سے بھی واقف ہے، اس لیے یہ کوئی رسمی انکساری نہیں حقیقت ہے کہ علماء کرام اور سربراہان مدارس کے اس موقر اجتماع کی صدارت کابندہ ہرگز اہل نہیں ،لیکن کرم فرماؤں کے حکم سے انحراف بھی آئین سعادت مندی میں داخل نہیں ہے نیز یہ کہ ارباب علم وتقوی کی معیت میں کسی بھی مجلس میں حاضری دو "**هم قوم لا يشقى جليسهم**" کامصداق ہے،

اس لیے خدا کے فضل سے یہی امید ہے کہ وہ اس حاضری اور معیت کو باعث سعادت فرمائے گا۔

اسی کے ساتھ بندہ کو شدت سے یہ احساس ہے کہ آپ حضرات نے دین کی حفاظت اور مدارس عربیہ کے مسائل پر غور وفکر کی اہمیت کے پیش نظر از راہ کرم زحمت سفر برداشت کی، اپنی مصروفیات سے کنارہ کش ہو کر دور دراز اور قرب وجوار سے تشریف آوری کا کرم فرمایا اور ہم پوری کوشش کے باوجود آپ جیسے ارباب فضل وکمال کا حق خدمت ادا کرنے سے قاصر ہیں مگر امید ہے کہ مادر علمی کی محبت ہماری تقصیرات سے چشم پوشی کی سفارش کرے گی۔

علماء ذی وقار!

اس اجلاس میں وہ مدارس بھی شریک ہیں جو رابطۃ المدارس العربیہ کی رکنیت قبول کر چکے ہیں اور ان کے علاوہ دیگر مدارس عربیہ کو بھی دعوت دی گئی ہے اور وہ بھی شریک اجلاس ہیں۔ اور جن اہم موضوعات پر غور کرنے کے لیے اس عام اجتماع کی ضرورت محسوس کی گئی ہے، ان کا دعوت نامہ میں بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں مختصر بات یہ ہے کہ تمام مدارس عربیہ ایک مقصد اور ایک نصب العین کے تحت کام کر رہے ہیں اور ان کے بنیادی مقاصد کو دارالعلوم کے دستور اساسی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

(۱) قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد، کلام اور ان علوم سے متعلق ضروری اور مفید فنون آلیہ کی تعلیم دینا اور مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہنچانا، رشد وہدایت اور تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی خدمت انجام دینا۔

(۲) اعمال واخلاق سامیہ کی تربیت اور طلبہ کی زندگی میں اسلامی روح پیدا کرنا۔

(۳) اسلام کی تبلیغ واشاعت اور دین کا تحفظ ودفاع اور اشاعت اسلام کی خدمت بذریعہ تقریر وتحریر بجالانا اور مسلمانوں میں تعلیم وتبلیغ کے ذریعہ خیر القرون اور سلف صالحین جیسے اخلاق واعمال اور جذبات پیدا کرنا۔

(۴) حکومت کے اثرات سے اجتناب واحتراز اور علم وفکر کی آزادی کو برقرار رکھنا۔

(۵) علوم دینیہ کی اشاعت کے لیے مختلف مقامات پر مدارس عربیہ قائم کرنا اور ان کا دارالعلوم سے الحاق۔

مذکورہ ان پانچ مقاصد میں پہلی دفعہ تعلیم سے متعلق ہے، دوسری دفعہ تربیت اور تیسری تبلیغ واشاعت اسلام سے متعلق ہے چوتھی دفعہ تعلیم کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے مدارس کو حکومت کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی تاکید پر مشتمل ہے اور پانچویں دفعہ میں مختلف مقامات پر ضرورت کے

مطابق مدارس کے قیام اوران کے دارالعلوم سے الحاق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

چنانچہ مدارس عربیہ اپنے اسلاف کے مقرر کردہ اسی منہاج کے مطابق عرصۂ دراز سے کام کررہے ہیں۔اور خدانے اپنے فضل وکرم سے انہی مدارس کو ہندوستان کی سرزمین پراسلام کی بقاء وتحفظ،اسلامی تعلیمات کے فروغ اور مسلمانوں کے درمیان اسلامی اقدار کی حفاظت کاذریعہ بنادیاہے،مدارس کا یہی کردار،اسلام اور مسلمانوں سے عناد رکھنے والوں کی نظر میں کھٹکتارہتاہے اور مدارس کے بارے میں کبھی درپردہ سازشیں اور کبھی کھلے بندوں غلط بیانی کرتے رہتے ہیں۔

حریم ملت کے پاسبانو!

آپ جانتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے بعد آنے والے زمانے کے بارے میں حصر کے ساتھ ارشاد فرمایاہے۔لم یبق من الدنیاالابلاء وفتنة (ابن ماجہ) دنیامیں صرف آزمائش اور فتنے باقی رہ گئے ہیں۔

اس لیے آزمائش اور فتنوں سے تو مفر نہیں، فتنے پیش آئیں گے اوران کے نقصانات سے بچنے کی کوشش بھی ضروری ہے اوراس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ عصر حاضر میں بعض فتنوں کو اتناخوبصورت لباس پہنادیاجاتاہے کہ بسااوقات ان پر مطلع ہونا بھی دشوار ہوجاتاہے، یہ فتنے داخلی بھی ہوتے ہیں اور خارجی بھی اور ہماری گفتگو کاموضوع صرف مدارس عربیہ کے داخلی وخارجی مسائل ہیں جو کبھی آزمائش کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی فتنوں کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔

داخلی اوراندورنی مسائل کے بارے میں تو صرف یہ عرض ہے کہ رابطة المدارس العربیه کے ارباب حل وعقد کی مجلس نے یہ طے کیاتھاکہ اپنی صفوں میں اتحاد کی حفاظت سب سے بڑی ضرورت ہے اوراس کے لیے مناسب معلوم ہوتاہے کہ اندرونی مسائل میں اس طرح حصہ لیاجائے کہ جس سے مدارس کی اندرونی خودمختاری بالکل متأثر نہ ہو، اس لیے اندرونی مسائل اور مشکلات کا حل، خود ذمہ داران مدارس کرتے رہتے ہیں، ضرورت ہوتی ہے تو رابطة المدارس صرف مشورہ کی حد تک حصہ لیتاہے۔

جہاں تک خارجی اور بیرونی مسائل کاتعلق ہے توان کے لیے اتحاد کو طاقتور رکھنے کی بہت زیادہ اہمیت ہے اوراس کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب متحد ہوکرایسی راہیں تلاش کریں جن سے ہمارے بنیادی مقاصد کوتقویت ملے اوراس کے ساتھ فتنوں کاسدباب ہوسکے۔اس وقت ہمارے سامنے ایسے دو مسئلے ہیں۔

(۱) مدارس کے بارے میں حکومت اوراس کے ذمہ داروں کا منفی رویہ

(۲) حکومت سے ملنے والی امداد کے سلسلے میں مدارس کے مقاصد عالیہ کی روشنی میں غور۔

حکومت کے منفی رویہ کے بارے میں آپ حضرات کو معلوم ہے کہ کئی سال سے ذمہ داران حکومت کے ایسے بیانات آرہے ہیں جن میں مدارس کو بنیاد پرستی کا مرکز قرار دیا گیا ہے۔ بعض بیانات میں اس سے آگے بڑھ کر مدارس کو دہشت گردوں کی پناہ گاہ تک کہا گیا ہے۔ ماضی قریب میں اس طرح کی باتوں میں شدت آئی ہے۔

مرکزی اور صوبائی سطح سے نیچے ضلعی حکام بھی بے خوفی کے ساتھ اس طرح کی الزام تراشیاں کر رہے ہیں۔ مختلف اضلاع کے ذمہ داروں کے دل آزار بیانات آئے۔ چند ماہ پہلے ڈی آئی جی سہارن پور کا بیان اخبارات میں آیا تھا کہ پاکستان کی خفیہ ایجنسی آئی، ایس، آئی۔ مدارس عربیہ کی آڑ میں اپنا کام پھیلا رہی ہے اور یہ کہ کچھ مدرسوں میں اساتذہ کو آٹھ دس ہزار روپے تک تنخواہ ملتی ہے (اگرچہ ڈی آئی جی نے بعد میں اس بیان کی تردید کر دی تھی) پھر چند ہفتے پہلے صوبائی تعلیمی کانفرنس میں حکومت کے غلط ارادوں کا انکشاف ہوا اور ابھی چند روز پہلے اوما بھارتی کا انٹرویو اخبارات میں آیا جس میں کہا گیا ہے کہ آج کشمیر میں جو مشکلات ہیں وہ انہی مدارس کی دین ہیں اس طرح کی بے بنیاد اور دل آزار باتیں برابر دہرائی جاتی رہتی ہیں اور ہماری جانب سے انکے بارے میں کوئی موثر کارروائی یا جواب دہی نہیں ہو رہی ہے۔

کتنی افسوسناک اور حیرت انگیز بات ہے کہ جن مدارس نے ملک و قوم کو ہزاروں مصلحین اور لاکھوں امن کے داعی اور کروڑوں امن پسند شہری عطا کئے جن مدارس نے آزادی ہند کے لئے سینکڑوں قائدین اور ہزاروں جانباز مجاہدین پیدا کئے آزادی کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیں ملک کی آبرو کو بچانے کے لئے فرقہ پرستی سے مقابلہ کا بے مثال ریکارڈ قائم کیا حیرت کا مقام ہے کہ ان مدارس کے بارے میں اس طرح کے شر انگیز بیانات دئے جائیں اور ان کے کردار کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائے تاہم ہمیں چند باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔

(۱) کچھ جماعتیں یا کچھ لوگ اس طرح کی بہتان تراشی میں مذہبی تعصب، سیاسی تنگ نظری اور عداوت کی بنیاد پر سرگرم نظر آتے ہیں ان کے بارے میں قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے " ادفع بالتی هی احسن فاذالذی بینك و بینه عداوة کانه ولی حمیم " (سورۂ حم السجدہ آیت ۳۴)

" ترجمہ: اس انداز سے جواب دیجئے جسے بہتر کہا جائے آپ دیکھیں گے کہ جن کے اور آپ کے درمیان عداوت تھی وہ حمایتی دوست ہو جائیں گے "

اس مضمون کو دوسری آیت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے " ادفع بالتی هو احسن السیئة نحن اعلم بمایصفون " (سورۂ مومنون آیت ۹۶)

(ترجمہ : برائی کا جواب اس انداز سے دیجئے جو بہتر ہو، ہم ان باتوں کو خوب جانتے ہیں جنہیں وہ بیان کرتے ہیں) دونوں آیتوں میں ادفع صیغہ اَمر ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ دفاع اور جواب دہی ضروری ہے اور اس کے لئے طریقہ احسن اختیار کرنا بھی ضروری ہے اگر ہم طریقہ احسن اختیار کریں گے تو انشاء اللہ ان کی سازشیں ناکام ہو جائیں گی۔

قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

والذین یمکرون السیئات لهم عذاب شدید ومکر اولئك هو یبور (سورہ فاطر آیت ۱۰)

(ترجمہ: اور وہ لوگ جو برائیوں کے لیے سازش کرتے ہیں انہیں سخت عذاب دیا جائے گا اور ان لوگوں کی سازش ناکام ہو جائے گی۔)

اس لئے خدا کے فضل پر اعتبار کر کے ہمیں طریقہ احسن اختیار کرنا چاہئے اور یقین رکھنا چاہئے کہ خدا ان کی سازشوں کو ناکام فرمائے گا۔

(۲) اس طرح کچھ دوسرے لوگ ہیں انھیں مسلمانوں یا ان کے اداروں سے عداوت اور عناد نہیں ہے نہ انھیں سیاسی طور پر تنگ نظر کہا جاسکتا ہے لیکن آزادئ ہند میں مسلمانوں کے قائدانہ کردار اور مجاہدانہ سرگرمیوں کی بنا پر انہیں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ شاید آج بھی اہل مدارس اس طرح کی سرگرمیوں میں مصروف ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے ہمیں یہ حقیقت واضح کرنی چاہئے کہ مذہب اسلام کی تعلیمات کے مطابق آزادی کے لیے اس طرح کی کاروائیوں کی ضرورت تھی اور ہمارے تمام کام خدا کی رضا کے لئے تھے آزادی کے بعد نوعیت تبدیل ہو گئی اور آزاد ہندوستان میں بھی اگرچہ ہمارے حقوق پامال ہو رہے ہیں لیکن ان کے حصول کی جدوجہد کے لئے پر تشدد راستہ اختیار کرنے کی ابھی تک ضرورت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد حکومت یا ارباب حکومت کے خلاف جو سازشیں ہوئی ہیں ان میں بہت سے طبقات کے لوگوں کو دیکھا جاسکتا ہے لیکن مدارس عربیہ یا ان کے فضلاء کی شرکت کو ثابت نہیں کیا جاسکتا اب یہ ارباب حکومت کا کام ہے کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی اور شہری حقوق میں مداخلت نہ کریں اور حالات کو پرامن رکھنے میں ہماری مدد کریں۔

دانشمندان ملت:

اسی طرح کا دوسرا مسئلہ ہے مدارس کو دی جانے والی سرکاری امداد بظاہر اس میں مضائقہ نظر نہیں آتا کہ مسلمان بھی اسی وطن کے شہری ہیں ہندوستان میں ان کے حقوق کسی دوسری قوم سے کم نہیں وہ گورنمنٹ کے ہر طرح کے ٹیکس ادا کرتے ہیں اس لئے بظاہر یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر حکومت مسلمانوں کی دینی تعلیم کے لئے کسی طرح کا تعاون کرتی ہے تو اس کے قبول کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔

لیکن اس سلسلے میں مجھے سب سے پہلے یہ عرض کرنا ہے کہ ہمارے اکابر واسلاف کے مقرر کردہ پانچ نکات میں دفعہ (۴) میں فرمایا گیا ہے:۔

"حکومت کے اثرات سے اجتناب واحتراز اور علم وفکر کی آزادی کو برقرار رکھنا"۔

اس لیے انھوں نے کبھی مدد طلب نہیں کی، مدد طلب کرنا تو دور کی بات، کبھی پیشکش کی گئی تو اس کو بھی قبول نہیں کیا، حد یہ ہے کہ ہمیشہ اپنی اسناد کو منظور کرانے کے نظریہ کی مخالفت کی، اکابر رحمہم اللہ کی اس دوررس نظر کا مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اعتراف کیا۔ وہ دارالعلوم میں آئے تھے اور احاطہ مولسری میں تقریر کرتے ہوئے اسناد کو حکومت کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے نظریہ کو مدلل کررہے تھے۔

حضرات اکابر کے اس نظریہ کو سمجھنے کے لیے اس واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جو ہماری ماضی بعید کی تاریخ میں اہمیت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ بغداد میں جب مدرسہ نظامیہ قائم ہوا اور اس کے اساتذہ وطلبہ کے لیے بیش بہا مشاہرے اور وظائف مقرر کیے گئے تو علماء بخارا نے اطمینان کا اظہار کرنے کے بجائے زوال علم کی مجلس ماتم منعقد کی اور اس بات پر اظہار افسوس کیا گیا کہ اب علم آخرت کے مقاصد عالیہ کے لیے نہیں بلکہ دنیا کے پست مقاصد یعنی جاہ وثروت کے لیے حاصل کیا جائے گا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ بغداد کے مدرسۂ نظامیہ کے لیے یہ سہولتیں اسلامی حکومت کی جانب سے دی گئی تھیں، مگر علماء بخارا کی دوررس نگاہوں نے اس کے مضر اثرات کو محسوس کرلیا اور تاریخ عالم نے ان کے پاکیزہ جذبات کو زریں حروف میں محفوظ رکھا۔

اور اسی لیے ہمارے اسلاف واکابر نے مدارس عربیہ کے مصارف کے لیے عوامی چندہ کو بنیاد بنایا ہے اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ نے اپنے الہامی اصول ہشتگانہ میں ارباب حکومت کی ہر طرح کی امداد سے اجتناب کی تاکید کی ہے، اور اس کو مضر بھی قرار دیا ہے۔ اور اس کے بعد ہر دور کے اکابر اسی اصول کی پیروی کرتے رہے ہیں۔

اس نظریہ کی بنیاد یہ ہے کہ حکومت اسلامی ہو یا غیر اسلامی، اس کی امداد سے مندرجہ ذیل نقصانات کا پیدا ہو جانا یقینی امر ہے۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ اسلام میں علم دین کا مقصد، رضائے خداوندی کا حصول ہے اور علم دین کو دنیوی مقاصد اور مفاد کے لیے حاصل کرنے پر شدید وعید کا ذکر کیا گیا ہے حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے:

من تعلم علماًمما يبتغى به وجه الله لايتعلمه الاليصيب به عرضامن الدنيالم يجد عرف الجنة (ترجمہ: جس نے وہ علم حاصل کیا جس سے اللہ کی رضا کو طلب کیا جاتا ہے، مگر اس نے علم کو صرف دنیا کے مقصد کے لیے حاصل کیا، تو اس کو جنت کی خوشبو بھی میسر نہیں آئے گی۔)

اس لیے علماء ہمیشہ یہ وضاحت کرتے رہے ہیں کہ اسلام میں علم دین کی آبرو کا تحفظ اسی نظریہ میں ہے کہ اس کو ذریعہ معاش نہ بنایا جائے اگر سرکاری امداد قبول کی جائے گی تو علم دین حاصل کرنے والوں کی نیت کو محفوظ رکھنا ناممکن ہو جائے گا اور ان کی نگاہیں سرکاری امداد حاصل کرنے والے اداروں کی ملازمت کی طرف اٹھیں گی۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ مذہبی تعلیم جب تک ہر طرح کے اثر و اقتدار سے آزاد نہ ہو اس وقت تک یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ علماء اپنا فرض منصبی ادا کرسکیں گے۔ علماء کی ذمہ داریاں بے شمار ہیں۔ انہیں دعوت و تبلیغ کا فرض بھی ادا کرنا ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی انھیں پر عائد ہوتا ہے، مسلمانوں کے جملہ مذہبی امور انہی علماء کے ذریعہ انجام پاتے ہیں، اور ان کا کسی بھی اقتدار کے ماتحت ہونا ان کے فرض منصبی کی ادائیگی میں حارج ہے۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہمارے مدارس عربیہ کی متعدد تعلیمی خصوصیات ہیں، اور دنیا کا کوئی نظام تعلیم ان خصوصیات کی وجہ سے ہمارے نظام تعلیم کی برابری کا دعوی نہیں کرسکتا، ہمارے یہاں اساتذہ اور طلبہ کے درمیان محبت و شفقت اور احترام کی پاکیزہ قدریں نشو و نما پاتی ہیں، تعلیم کے ساتھ تربیت او ذہن سازی کا معیاری کام ہوتا ہے، ہمارے نظام میں حصول علم کے لیے آنے والوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا، کسی سے کوئی فیس وصول نہیں کی جاتی، نہ ہمارے یہاں عمر کی کوئی قید ہے، ہمارے نظام کی بدولت علم دین کے دروازے تمام آنے والوں کے لیے بلا تفریق نسل و قوم برابری کے ساتھ کھلے ہوئے ہیں وغیرہ۔ اور سرکاری امداد حاصل کرنے کی صورت میں ان پاکیزہ اقدار کا متاثر ہونا ضروری ہے جیسا کہ مشاہدہ میں آرہا ہے اور امداد قبول کرنے والے اداروں میں ان خصوصیات کی تلاش بے سود ہے۔

۴۔ چوتھی بات یہ ہے کہ سرکاری امداد قبول کرنے کا ایک کھلا ہوا نقصان جو مشاہدہ میں آرہا ہے یہ ہے کہ کتنے ہی مدارس اس امداد کو قبول کرنے کے بعد اپنی کارکردگی کو بھی باقی نہ رکھ سکے۔ خدا شاہد ہے کہ اس بات کے تذکرے سے کسی ادارے، یا کسی علاقے کی طرف اشارہ مقصود نہیں ہے، بلکہ ایک دل گداز سانحہ سے عبرت حاصل کرنے کے لیے یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ قرب و جوار اور دور دراز کے دو چار نہیں ہزاروں ادارے ایسے ہیں جو امداد قبول کرنے کے بعد، ماضی کی روایات کے برخلاف معطل بے عمل، بے اثر اور تعلیمی اعتبار سے بالکل ختم ہوگئے ہیں اور عوامی جواب دہی سے بے نیازی کے تصور نے ان کی غفلت شعاری کو مدد پہنچائی ہے۔

اس حقیقت پر یوں بھی غور کرنا چاہیے کہ جو لوگ قرآن کریم کی تعبیر کے مطابق "لا یرجون لله وقارا" کا مصداق ہوں ان سے کیسے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اسلام یا مذہبی تعلیم کی سربلندی کے لیے

کوئی تعاون کریں گے۔ یقیناً اس امداد کے پس پردہ ان کے اپنے مقاصد ہیں اور ایک خوبصورت دام فر
ہے جسے مذہبی تعلیم کو نقصان پہنچانے کے لیے بچھایا گیا ہے۔

اس لیے امداد قبول کرنے والے ادارے۔ خواہ ان کی نیت بخیر ہو اس بات پر پوری توجہ
مبذول فرمائیں کہ ماضیٔ قریب میں سیاسی غلامی کے دور میں تعلیم کی آزادی کو برقرار رکھنے وا
اسلاف کے وارث، سیاسی آزادی کے دور میں تعلیمی غلامی پر قناعت کرلیں تو اس سے زیادہ حیر
انگیز اور پست انقلاب کیا ہو سکتا ہے۔

مہمانان عالی مقام!

عصر حاضر میں مدارس عربیہ کو درپیش مشکلات میں سے یہ چند باتوں کا تذکرہ ہے، دارالعلوم
آپ حضرات کی خواہش کے مطابق رابطۃ المدارس العربیہ کا کام شروع کردیا ہے ان کے مسا
پر غور کرنے کے لیے ہر علاقہ کے نمائندوں پر مشتمل عاملہ مقرر کردی ہے، کل گذشتہ عاملہ کا اجلا
بھی ہوا ہے اور انہوں نے مسائل پر غور و خوض بھی کیا ہے۔ اب ان تمام مسائل پر غور و فکر کر
قرآن کی ہدایت کے مطابق طریقہ احسن کی صورتیں معین کرنا، تجاویز مرتب کرنا، پھر ان کو ؑ
طور پر نافذ کرنے کے لیے طریقے تلاش کرنا۔ یہ سب آپ حضرات کا کام ہے، احقر دعا گو ہے
خدا ہمیں صحیح فیصلے کرنے کی توفیق دے اور ان پر عمل کرنا ہمارے لیے آسان بنائے۔ آمین

آخر میں احقر دو باتوں کے لیے معذرت پیش کرنا ضروری سمجھتا ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ ا
تحریر میں، بعض مقامات پر ناصحانہ موقف اختیار کرنے پر مجھے بڑی شرمندگی ہے، علماء کرام اور اساطیہ
ملت کی موجودگی میں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے، خدا معاف فرمائے اور دوسری بات یہ ہے کہ آ
حضرات نے تو دین علم دین اور مادر علمی کے لیے ہر طرح کی زحمت برداشت کی اور ہم حق خدمت ادا کر
سے قاصر رہے، اس لیے ان دونوں باتوں کے لیے صدق دل سے عفو و درگذر کی درخواست ہے
و آخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین۔

خطاب حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالنپوری مدظلہ

خطبۂ صدارت کے بعد حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری، استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
کرسیٔ خطابت پر جلوہ افروز ہوئے اور "مدارس عربیہ کا نظام تعلیم و تربیت" کے موضوع پر سامعین سے
خطاب فرمایا، حمد و صلوٰۃ کے بعد حضرت مولانا نے فرمایا:

"مدارس عربیہ کے بنیادی مقاصد آپ ذمہ داران مدارس کے علم میں ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ نے
نوع انسان کے رشد و ہدایت کے لیے نبی اکرم ﷺ کو آخری ہدایت نامہ عطا فرمایا، جسے سرکار دو عالم

عالم بالا سے جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعے حاصل کیا، آپ ﷺ سے حضرات صحابہ کرام نے حاصل کیا، اللہ کے دین کو صحیح طور پر سمجھا اور اس پر عمل کیا، قرناً بعد قرنٍ اور نسلاً بعد نسلٍ یہ علوم آگے بڑھتے رہے، کچھ دنوں تک سینہ بہ سینہ اور پھر سفینہ بہ سفینہ یہ علوم و معارف ہم تک پہونچے، جو امانت اور جو میراث ہم نے اپنے اکابر سے حاصل کی ہے وہ نہایت قیمتی سرمایہ ہے، ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں اسے ہر نگاہ بد سے بچائیں اور آئندہ نسل کو پوری امانت و دیانت سے سپرد کریں، اس کے بعد حضرت مولانا نے آیت کریمہ "**فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة الاية**، اور **من يؤت الحكمة فقد أوتى خيراً كثيراً**" اور حدیث پاک "**من يرد الله به خيراً يفقهه فى الدين الخ**" کی قدرے تفصیل سے تشریح فرمائی۔

مدارس عربیہ میں بنیادی تعلیم میں انحطاط پر حضرت مولانا نے تشویش کا اظہار کیا اور کمزوری کے اسباب و علل پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا: بنیادی تعلیم میں انحطاط کے تین اسباب ہیں:

پہلا سبب یہ ہے کہ ہم فن صَرف پر پوری توجہ نہیں دیتے نحو کی تو ہم کئی کتابیں پڑھاتے ہیں، علم صرف، نحو سے زیادہ مشکل ہے، لیکن، ہم صرف میں صرف دو سال لگاتے ہیں، فصول اکبری پر صرف کو تمام کردیتے ہیں اور صرف میں عربی کی کوئی کتاب نہیں پڑھاتے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ اب ہمارا عربی درجات کا نصاب آٹھ سالہ ہے، اور وقت کی کمی کی وجہ سے نصاب سے علوم عقلیہ کی بعض اہم کتابیں خارج کردی گئی ہیں، علوم عقلیہ میں طلبہ کو درک حاصل نہیں ہوپاتا جس کی وجہ سے ان کی استعداد پختہ نہیں ہوپاتی۔

تیسرا سبب: درجہ بندی ہے، پہلے اگر طالب علم کسی فن میں کمزور ہوتا تھا تو اگلے سال اس فن کی کتاب اسے دوبارہ پڑھنی پڑتی تھی، لیکن اب درجہ بندی کی وجہ سے اگر کسی کتاب میں کمزور ہے تو دوسری کتابوں میں کامیاب ہونے کی وجہ سے اسے ترقی مل جاتی ہے اور وہ اس فن میں کمزور ہی رہ جاتا ہے۔

تربیت کے بارے میں حضرت مولانا نے فرمایا:

تربیت کے دو بنیادی پہلو ہیں (۱) اعمال (۲) اخلاق، جس طرح انسان کے ظاہر کا اچھا و خوش نما ہونا ضروری ہے اس طرح اس کا باطن بھی پاک وصاف خوشنما ہونا چاہئے، قرآن و حدیث نے ظاہر سے زیادہ باطن کی پاکی وصفائی پر زور دیا ہے، ظاہر کا حسن، حسنِ اعمال ہے، اور باطن کا حسن حسن اخلاق ہے، مدارس عربیہ نے ہمیشہ ان دونوں پہلوؤں پر توجہ دی ہے، لیکن آج طلبہ کے اعمال و اخلاق میں کمی محسوس ہورہی ہے، اس کے تین اسباب ہیں: پہلا سبب، پیسے کی فراوانی ہے، بلاشبہ مال و دولت کی فراوانی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، جبتک اسے جائز اور صحیح مصرف میں استعمال کیا جائے لیکن اگر یہ دولت غلط

مصرف اور لایعنی چیزوں میں صرف کی جائے گی تو اس سے اچھے اعمال و اخلاق کیسے پیدا ہوں گے،

دوسرا سبب: صحبت، اچھی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے "یاایھاالذین امنو اتقو اللہ و کونو امع الصادقین" پہلے اساتذہ اور طلبہ کے درمیان اتنا قرب تھا کہ طلبہ ان کی صحبت میں رہتے تھے، اساتذہ کے اعمال واخلاق ان میں منتقل ہوتے تھے، لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے۔ اساتذہ سے قرب تقریباً ختم ہو گیا ہے، اور غلط صحبت کی وجہ سے ان کے اعمال واخلاق میں گراوٹ آتی جارہی ہے۔

تیسرا سبب بے رغبتی ہے، آج دین سے بے رغبتی بڑھتی جارہی ہے۔ دینی تعلیم کا مقصد حصول دنیا ہو گیا ہے حضرت علامہ بلیاویؒ فرمایا کرتے تھے، کہ "طلبہ تین طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ طالب علم جس کے والدین نے اسے مدرسہ بھیج دیا لیکن اس طالب علم کو کچھ معلوم نہیں کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ دوسری قسم ان طلبہ کی ہے جو کوئی بنیادی مقصد لے کر آتے ہیں مثلاً میں مہتمم، صدر مدرس، یا شیخ الحدیث بنوں گا، تیسری قسم ان طلبہ کی ہوتی ہے، جو صرف اور صرف دین کے لیے آتے ہیں یہی تیسری قسم اصل ہے، اسی نیت سے برکت ہوتی ہے۔

لہذا ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم طلبہ میں علم کی رغبت پیدا کریں، ان کو احساس دلائیں، اور ہمارے نظام تعلیم وتربیت میں جو کمزوریاں در آئی ہیں ان کے ازالے کی کوشش کریں

حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب مدظلہ کا خطاب:

اس کے بعد حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند ورکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے مدارس اسلامیہ کے خلاف حکومت کی منفی پالیسی کے موضوع پر اپنے بصیرت افروز خطاب سے شرکاء اجلاس کو مستفید فرمایا۔ خطبہ مسنونہ کے بعد حضرت مولانا نے فرمایا ہمیں اس اجتماع کو اللہ کی نعمت سمجھنا چاہیے، ہم ذمہ داران وکارکنان مدارس کے لیے ضروری ہے کہ ہم آپس میں مل کر مدارس کو درپیش مشکلات، پریشانیوں اور کمزوریوں کے سلسلے میں تبادلہ خیال کریں اور اصلاح کی فکر کریں، تاکہ ان فتنوں سے بچ سکیں۔

مدارس کے خلاف حکومت کی منفی پالیسی کے حوالے سے آپ نے فرمایا:

"حکومت کی منفی پالیسیوں سے بچنے کی دو شکل ہے، ایک یہ کہ ہم شور وہنگامہ کریں، احتجاج کریں، دوسری صورت یہ ہے کہ ہم حکومت سے ہمیشہ چوکنا رہیں، ہمیں حکمت کے ساتھ اسی دوسری صورت کو اختیار کرنا چاہیے"

حضرت مولانا نے بنگلور، تری پورہ، بنگلہ دیش اور بعض دیگر مقامات میں عیسائی مشنریوں کی ترویج و اشاعت اور مسلمانوں کو نصاریٰ بنانے کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ: وہ اس سلسلے میں جگہ جگہ مدارس و مکاتب قائم کر کے عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی تعلیمات عام کر رہے ہیں، مسلمانوں کے سادہ

لوح بچوں کو اسلام مخالف عقائد کی تعلیم دی جاتی ہے، جس سے ان کے عقائد خراب ہوتے ہیں۔

آج اسرائیل و یہود، مسلمانوں کو برباد کرنے کی طرح طرح کی سازشیں کررہے ہیں، ان تمام سازشوں کا مقصد، اسلام کو کمزور کرنا ہے ان کی پوری کوشش ہے کہ وہ اپنی دولت سے ہمارے دین وایمان کو خرید لیں، وہ جانتے ہیں کہ مسلمان بالخصوص ہندستان کے مسلمان اپنے دین وایمان کے سلسلے میں حساس اور سخت ہیں، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ پختگی مسلمانوں میں انہی مدارس دینیہ کے ذریعے آئی ہے ان کی سازش ہے کہ مدارس کی مالی امداد کر کے ہمارے دین وایمان کا سودا کیا جائے، یہ لمحات آزمائش کے اور یہ گھڑی امتحان کی ہے، ہمیں اس وقت پوری پامردی کے ساتھ، اسلام کی حفاظت اوراس کے دفاع کے لیے سینہ سپر ہوجانا چاہیے۔

فرق باطلہ کے تعاقب پرزور دیتے ہوئے حضرت مولانا نے فرمایا:

”ہمیں مدارس کی چہار دیواری سے باہر کی دنیا کا بھی جائزہ لینا چاہیے، کوئی قادیانی بن رہا ہے کوئی عیسائی بن رہا ہے، ہمیں ان تمام فتنوں بالخصوص قادیانی فتنے کی سرکوبی اور قلع قمع کے لیے تیار رہنا ہے، اس کے لیے جامع لائحہ عمل بنانا چاہیے، معاشرہ کی اصلاح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو انجام دینا چاہیے، اگر ہم لوگ اتحاد و اتفاق کے ساتھ کام کریں گے تو انشاء اللہ اس کے مفید و دوررس نتائج واثرات سامنے آئیں گے“

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب مظاہری مدظلہ کا خطاب

بعد ازاں حضرت مولانا محمد سلمان صاحب مظاہری ناظم جامعہ مظاہر علوم، سہارنپور مائک پر تشریف لائے اور حضرات شرکاء اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”آج کل مدارس کو جو مشکلات درپیش ہیں، ہمیں مل جل کر امکانی حد تک ان کے حل کی ظاہری تدابیر اختیار کرنی چاہیے، اگر کسی مدرسے کو کوئی مشکل پیش آئے تو ذمہ داران، مرکز سے رابطہ قائم کریں لیکن صرف ظاہری تدابیر سے ہم ان فتنوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے، جب تک کہ ہمارے ساتھ تائید غیبی نہ ہو جن بہتر اوصاف کو اپنانے سے تائید غیبی شامل حال ہوتی ہے، ان اوصاف کو اپنائیں، تو تائید غیبی اور نصرت خداوندی ہوگی، ہمارے اسلاف و اولیاء اللہ کے اندر روحانی طاقت تھی جس کی وجہ سے انھوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے، ہم اپنی نیتوں کو ٹٹولیں، مدرسے کے مسائل پر غور کریں آج زیادہ تر توجہ تعمیرات پر ہے ہمیں اپنے اسلاف کے طریقے کو اپنانا چاہیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے حضرت نانوتویؒ کے اصول ہشتگانہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ توجہ الی اللہ اوراس کی رضا بہت بڑا سرمایہ

ہے، جب یہ سرمایا ختم ہو جائے گا اسی دن امداد غیبی موقوف ہو جائے گی،،

حضرت مولانا نے اکابر و اسلاف کے تقویٰ اور خشیت الٰہی سے معمور زندگی کے چند اہم واقعات بھی سنائے، اتحاد و اجتماعیت کی افادیت پر روشنی ڈالی اور فرمایا: اگر ہم اجتماعیت کے ساتھ رہیں گے تو بڑے سے بڑا دشمن بھی ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا“

حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم کی دعا پر پہلی نشست ۱۲ بجے دوپہر کو اختتام پذیر ہوئی۔

پروگرام نشست دوم کل ہند اجتماع مدارس عربیہ

بعد نماز مغرب ۶ بجے تا پونے گیارہ بجے شب، مورخہ ۲۱/رجب ۱۴۱۹ھ

صدارت	حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم، دارالعلوم دیوبند
نظامت	حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند
تلاوت	جناب قاری عبدالقیوم صاحب مظفرنگری، استاذ تجوید دارالعلوم دیوبند
خطاب بموضوع مشکلات مدارس اور ان کا حل	حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب نعمانی رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند
رپورٹ رابطہ مدارس عربیہ	شوکت علی قاسمی بستوی استاذ دارالعلوم دیوبند و ناظم دفتر رابطہ مدارس عربیہ
اظہار حال حضرات مندوبین	
خطاب	حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند
خطاب بموضوع سرکاری امداد سے اجتناب	حضرت مولانا عبدالحق صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
تجاویز	
دعاء	حضرت مولانا عبدالحق صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

دوسری نشست کا آغاز بعد نماز مغرب حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم کی صدارت میں جناب قاری عبدالقیوم صاحب کی تلاوت سے ہوا اس کے بعد چند حضرات مندوبین نے اظہار خیال فرمایا، پھر حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب نعمانی، بنارسی مدظلہ نے ”مدارس کی مشکلات اور انکا حل“

کے موضوع پر سامعین سے خطاب فرمایا۔

حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب مدظلہ رکن شوریٰ دارالعلوم کا خطاب

حمد و صلوٰۃ کے بعد حضرت مولانا نے فرمایا: "مدارس کو درپیش مشکلات اور پریشانیوں سے ذہن و دماغ پریشان ہوتا ہے، ہمتیں پست ہو جاتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں ناکامی کے بعد مسلمانوں اور خاص کر علماء کے خلاف جو ظلم و تشدد ہوا وہ اگر کسی اور قوم کے خلاف ہوتا تو وہ اپنے وجود سے محروم ہو جاتی، مسلمانوں نے صبر و استقامت سے کام لیا، ورنہ آج دارالعلوم کیا، کسی مکتب فکر کا وجود نہ ہوتا، آج پورے ملک میں اس شجرۂ طوبیٰ کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں۔

مشکلات کے سلسلے میں آپ نے فرمایا۔ اللہ کا جتنا مقرب اور محبوب بندہ ہو گا اسی قدر اسے سخت سے سخت ترین حالات کا سامنا کرنا پڑے گا، آپ حضرات صحابہ کی تاریخ پڑھیے کس قدر ان کو مشقت و اذیت میں ڈالا گیا، لیکن ان کے پائے استقامت میں کبھی تزلزل پیدا نہیں ہوا اس لیے آج ضرورت ہے کہ ہم بھی ان کے نقش قدم پر چل کر سخت سے سخت خطرناک حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کریں ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے کیونکہ ہم انبیاء کے وارث اور انکے جانشین ہیں ہماری جماعت قربانی کے ذریعے آگے بڑھی ہے اور قربانی ہی سے ترقی کرے گی۔

آپ نے فرمایا: حکومت ان مدارس پر بے بنیاد الزامات لگا رہی ہے ہمیں دوسرے درجے کا شہری گردان رہی ہے کسی کو کوئی حق نہیں کہ وہ ہم سے حب الوطنی اور ملک کی وفاداری کا ثبوت مانگے، جہاں جہاں دہشت گردی ہو رہی ہے سرحدوں پر ہتھیار سپلائی ہو رہے ہیں، اس میں ہمارا آدمی نہیں ہوتا بلکہ خود وہی برادران وطن ہوتے ہیں جو حب الوطنی کا راگ الاپتے ہیں۔

اپنی تقریر کے دوران "وندے ماترم" گیت کا پس منظر بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"بنکم چڑجی نام کا ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک ملازم تھا، انگریزوں کے دور میں اس نے ایک ناول لکھا جس میں وہ وشنو دیوی کے پجاریوں کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کر کے مورتی کے سامنے قسم دلاتا ہے کہ قسم کھا کر کہو کہ ہم اس ملک کو غیروں سے پاک کریں گے، اسی سلسلے میں ایک شخص اس کے ہاتھ آتا ہے، اسے وہ آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسے مورتی کے پاس لے جاتا ہے، مورتی دس ہاتھ والی ہے، اس کے کسی ہاتھ میں گنڈاسہ ہے، کسی ہاتھ میں تلوار ہے، کسی ہاتھ میں برچھی ہے، اور کسی ہاتھ میں کسی کا کٹا ہوا سر ہے اور قدموں پر کئی سر ڈھیر ہیں، وہ شخص اسے بھڑکاتا ہے کہ یہ ملک ہمارا ہے، یہاں مسلمان موجود ہیں، ان کی عبادت گاہیں، ہیں وہ وقت کب آئے گا جب ہم ان کو یہاں سے نکال باہر کریں گے، اس وقت وہ یہی نظم، "وندے ماترم" پڑھتا ہے، اس میں انھیں جذبات کو

بھڑکایا گیا ہے، اس پورے پس منظر کے ایک جز کے طور پر یہ نظم اس ناول میں آئی ہے۔

ہمارے اکابر رحمہم اللہ نے شروع سے ہی اس نظم کی مخالفت کی ہے، مولانا محمد علی جوہرؒ شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا تھا، یہ نظم مسلمانوں کے لیے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی، اس میں مادر وطن کے لیے کئی ایسی صفات ثابت کی گئی ہیں، جو غیر اللہ کے لیے ثابت نہیں کی جاسکتیں، وطن سے محبت اور بات ہے عقیدت اور بات ہے اور عبادت اور بات ہے، اگر گیت یہ ہم پر تھوپا گیا تو ہم عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ ہم پوری قوت اور طاقت کے ساتھ ان چیلنجوں کا مقابلہ کریں گے اور اس سلسلے میں جس طرح کی قربانی مطلوب ہوگی ہم اس سے دریغ نہیں کریں گے،،۔

رابطہ مدارس عربیہ کی رپورٹ:

اس کے بعد راقم الحروف، شوکت علی قاسمی بستوی، خادم دفتر رابطہ مدارس عربیہ دارالعلوم دیوبند نے رابطے کی رپورٹ پیش کی، جس میں رابطے کے قیام کا پس منظر اور دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام انعقاد پذیر، مدارس عربیہ کے کل ہند اجتماعات کی مختصر روداد بیان کی گئی تھی اور رابطے کے قیام کے بعد انجام پانے والے کاموں پر اجمالی جائزہ پیش کیا گیا تھا، آخر میں ۲۱ر رجب کے اجتماع کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالی گئی تھی، اس ضمن میں حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم کے نام حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کے مکتوب گرامی کا اقتباس دیا گیا تھا جس میں اس اجتماع کے انعقاد پر حضرت مولانا مد ظلہ نے اپنی قلبی مسرت واطمینان کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا تھا:

”گرامی نامہ مورخہ ۱۵ر جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ پہونچ کر باعث مسرت واعزاز ہوا، ۲۱ر رجب ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۲ر نومبر ۱۹۹۸ء دارالعلوم دیوبند میں مدارس عربیہ کے کل ہند اجتماع کے انعقاد کی خبر سے مسرت بھی ہوئی اور ذہنی ودینی طور پر تسکین واطمینان بھی، یہ اجتماع بہت ضروری اور بروقت ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ اسے کامیاب اور مثمر برکات بنائے“

یہ مختصر رپورٹ تھی تفصیلات الگ کتابچے میں شامل تھیں، جسے ”رابطہ مدارس عربیہ، دارالعلوم دیوبند، قیام، اجتماعات، سرگرمیاں“ کے نام سے طبع کرا کے حضرات مندوبین کو پیش کیا گیا تھا۔

حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی مد ظلہ کی تقریر

رابطے کی رپورٹ کے بعد حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند کا مختصر خطاب ہوا جس میں آپ نے فرمایا:

یہ میری محرومی ہے کہ مجھے کل آنا چاہیے تھا لیکن میں کل نہیں آسکا آج حاضر ہوا ہوں، آج

یہاں ماشاء اللہ دارالعلوم کی طرف پورے ملک کے مدارس کا رجوع ظاہر ہورہا ہے ۔ سب طرف سے اصحاب علم و فضل جمع ہیں اور صرف دارالعلوم دیوبند کا فرمان سننے کے لیے آئے ہیں کہ ام المدارس دارالعلوم موجودہ حالات میں ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے، کس طرح مدارس کا تحفظ کیا جائے ،دارالعلوم جو تجویز پیش کررہا ہے،وہ اپنی سطح سے کرے گا لیکن کچھ چھوٹی باتیں بھی سن لینی چاہیں۔

مدارس کی حفاظت انہیں آباد رکھنے سے ہوگی، مدارس کے قیام کا بالکل یہ مقصد نہیں ہے کہ انھیں ہی ذریعۂ معاش بنالیا جائے اس لیے بنیادی کام یہ ہے کہ ہم خالص دینی مقاصد سے مدارس قائم کریں، خالص دینی ادارے جب ہوں گے، جب ہمارا بھروسہ اللہ پر قائم ہوگا، تمام مدارس عربیہ دین کی حفاظت کے لیے قائم کیے گئے ہیں، تمام مدارس اللہ کے بھروسے پر ہیں، مدرسے قائم ہونے کے بعد اس سے متعلق ناجائز افعال کے صدور پر اللہ تعالیٰ ضرور سوال کرے گا، ہمیں داخلی اور خارجی دونوں اعتبار سے مدارس کی حفاظت کرنی ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم سرکاری امداد سے اجتناب کریں، دارالعلوم نے طے کردیا ہے کہ ہم سرکاری امداد نہیں لیں گے، مظاہر علوم نے طے کردیا ہے، ندوۃ العلماء نے طے کردیا ہے سرکاری امداد نہیں لیں گے تو اپنی بات پوری قوت سے کہہ سکیں گے، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہیں گے۔،،

"وندے ماترم" گیت کے خلاف دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ

اس اجتماع کا ایک اہم مقصد، حکومت اترپردیش کے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کرنا بھی تھا، جس کے ذریعے تمام اسکولوں اور کالجوں میں جس میں ۔مسلم بچے بھی بڑی تعداد میں زیر تعلیم ہیں۔ وندے ماترم گیت پڑھنا لازم قرار دیا گیا ہے، اور ہندوستان کی فرضی تصویر کے سامنے پھول مالا چڑھانا ضروری کردیا گیا ہے، اس موقع پر دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے اس مشرکانہ گیت کے خلاف حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی کا اہم فتویٰ صادر کیا گیا، یہ فتویٰ حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب نعمانی رکن شوریٰ دارالعلوم نے اجتماع میں پڑھا اور اس کی فوٹو کاپیاں شرکاء اجتماع میں تقسیم کی گئیں، افادیت کے پیش نظر [illegible] جارہا ہے۔

ستفتا

حضرت محترم　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ !

ازراہ کرم دائرہ میں درج وندے ماترم کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ حکومت اترپردیش کی وزارت تعلیم (بیسک) نے سرکاری پرائمری اسکولوں میں ہندو مسلمان تمام بچوں کے لئے نافذ کیا ہے۔ اس کو دیکھ کر فتویٰ کی شکل میں مطلع فرمائیں کہ یہ اسلامی عقیدۂ توحید کے منافی ہے یا نہیں اور مسلمان بچوں

کے لئے اس کا پڑھنا شرعی اعتبار سے درست و جائز ہے یا نہیں، اسی کاغذ پر عبارت تحریر فرمادیں اور مہر بھی لگادیں اور بواپسی ڈاک روانہ فرمادیں۔　　　نیاز مند۔

مسعود الحسن عثمانی

بخدمت جناب حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دار العلوم دیوبند، ضلع سہارنپور

سکریٹری دینی تعلیمی کونسل عارف آشیانہ چوک لکھنؤ

۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۹ا۱۴ھ مطابق ۲۸؍ اگست ۱۹۹۸ء

وندے ماترم کا اردو ترجمہ

(۱) میں تیری وندنا کرتا ہوں اے میری ماں

تیرے اچھے پانی اچھے پھلوں

بھینی خشک جنوبی ہواؤں

شاداب کھیتوں والی میری ماں

(۲) حسین چاندنی سے روشن رات والی

شگفتہ پھولوں والی گنجان درختوں والی

میٹھی ہنسی میٹھی زباں والی، سکھ دینے والی برکت دینے والی میری ماں

(۳) ۳۰؍ کروڑ لوگوں کی پرجوش آوازیں ۶۰؍ کروڑ بازؤں میں سنبھلنے والی تلواریں کیا اتنی قوت کے ہوتے ہوئے بھی اے ماں تو کمزور ہے؟!

تو ہی ہمارے بازؤں کی قوت ہے۔ میں تیرے قدم چومتا ہوں میری ماں

(۴) تو ہی میرا علم ہے تو ہی میرا دھرم ہے

تو ہی میرا باطن تو ہی میرا مقصد ہے تو ہی جسم کے اندر کی جان ہے تو ہی بازؤں کی قوت ہے۔

دلوں کے اندر تیری ہی حقیقت ہے تیری ہی محبوب مورتی ہے ایک ایک مندر میں

(۵) تو ہی درگا دس مسلح بانہوں والی تو ہی ہے کنول کے پھولوں کی بہار

تو ہی پانی ہے علم سے بہرہ ور کرنے والی۔ میں تیرا غلام ہوں غلام کا غلام ہوں غلام کے غلام کا غلام ہوں۔

(۶) لہلہاتے کھیتوں والی مقدس موہنی آراستہ پیراستہ۔ بڑے قدرت والی قائم و دائم ماں میں تیرا بندہ ہوں

فتویٰ

نمبر ۸ب؍

الجواب وباللہ التوفیق

گیت "وندے ماترم" خالص مشرکانہ اور ملحدانہ ہے، یہ گیت اسلامی عقیدۂ توحید اور اسلامی تعلیمات

کے قطعاً منافی ہے یہ گیت مسلمانوں کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں، بچوں کے لیے اس کا پڑھنا قطعاً حرام ہے۔ یہ گیت دستور ہند میں دی گئی مذہبی آزادی کے بھی خلاف ہے اور اس کا تیسرا بند فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے تصنیف کیا گیا ہے اس لیے ملک کے تمام مسلمانوں کو اور سیکولر ذہن رکھنے والے تمام انصاف پسند لوگوں کو اس گیت کے خلاف سخت احتجاج کرنا چاہئے۔

اس گیت میں خاکِ وطن کے لئے گیارہ ایسی صفات ثابت کی گئی ہیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے غیر اللہ کے لئے ثابت نہیں کی جاسکتیں وہ صفات یہ ہیں۔

(۱) سکھ دینے والی (۲) برکت دینے والی (۳) تو ہی ہمارے بازوؤں کی قوت ہے (۴) تو ہی میرا علم ہے (۵) تو ہی میرا باطن ہے (۶) تو ہی میرا مقصد ہے (۷) تو ہی جسم کے اندر کی جان ہے (۸) دلوں کے اندر تیری ہی حقیقت ہے (۹) بڑی قدرت والی (۱۰) قائم ودائم (۱۱) مقدس

اس گیت میں بار بار خاکِ وطن کا بندہ اور غلام ہونے کا اعتراف کیا گیا ہے، یہ بات بھی اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔

حدیث میں ہے:

لایقولَنَّ أحدُ کم عبدی و أمتی ، کلکم عبید اللہ ، و کل نسائکم اِماء اللہ و لکن لیقل : غلامی و جاریتی و فتای و فتاتی، و لایقلِ العبدُ ، ربی ولکن لیقل : سیِّدی ، وفی روایة لیقل سیدی و مولای و فی روایة : لایقل العبد لسیده : مولای فإن مولاکم اللہ (رواہ مسلم)

اس گیت میں مندروں کی تمام مورتیوں کو خاکِ وطن کا عین قرار دیا گیا ہے۔ یہ خالص مشرکانہ نظریہ ہے نیز اس گیت میں خاکِ وطن کو درگا دیوی اور کملا دیوی فرض کیا گیا ہے یہ بھی قطعاً مشرکانہ عقیدہ ہے۔

اس گیت میں خاکِ وطن ہی کو دھرم قرار دیا گیا ہے جبکہ مسلمانوں کا دھرم صرف مذہب اسلام ہے اور اس گیت میں خاکِ وطن کے سامنے وندنا کی جاتی ہے یعنی سر جھکا کر، ہاتھ جوڑ کر سلام کیا جاتا ہے۔ یہ بھی اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے، بادشاہ روم کے دربار میں رکوع کی طرح سر جھکا کر داخلہ سے انکار کرتے ہوئے ایک صحابی نے فرمایا تھا کہ مجھے کافر کے سامنے رکوع کی طرح سر جھکانے میں رسول اللہ ﷺ سے شرم آتی ہے کہ میں آپ ﷺ کو کیا منہ دکھاؤں گا" **اِنی أستحي من محمد علیه السلام أ ادخل علی کافر علی هیئة الرکوع** (نصاب الاحتساب باب ۴۹ صفحہ ۹۸)

اور یہ گیت بھارت کے نقشہ پر پھول چڑھا کر شروع کیا جاتا ہے۔ یہ عمل بھی غیر اللہ کی عبادت کے مشابہ ہے اور قطعاً حرام ہے، وطن سے محبت کرنا اور بات ہے اور اس کی پوجا کرنا بالکل دوسری بات ہے اس لیے وندے ماترم کا گیت مسلمانوں کے لئے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہر مسلمان پر

دینی فریضہ ہے کہ وہ اس گیت کو روکنے لئے ہر ممکن کوشش کرے۔ واللہ الموفق فقط واللہ اعلم

حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ
مفتی دارالعلوم دیوبند
۱۲ / ۷ / ۱۴۱۹ھ

الجواب صحیح احقر محمود غفرلہ بلند شہری
الجواب صحیح عبداللہ کشمیری غفرلہ
الجواب صحیح کفیل الرحمٰن نشاط

فتوی کی صدائے باز گشت اجتماع کے دوسرے دن امر اجالا اور دیگر اخبارات میں یہ فتویٰ شائع ہوا، اس کا بحمد اللہ خاطر خواہ اثر ہوا، میڈیا نے اسے خوب پھیلایا، اخبارات اور ریڈیو وغیرہ پر اس بارے میں تبصرے ہونے لگے اس فتوے کے بعد بعض دیگر حلقوں کی جانب سے بھی وندے ماترم گیت کے خلاف بیانات آئے، چند روز بعد حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کا بیان بھی اخبارات میں شائع ہوا، اور بالآخر وزیر داخلہ ہند مسٹر ایڈوانی کو یہ بیان دینا پڑا کہ وندے ماترم گیت پڑھنے پر کسی کو مجبور نہ کیا جائے، اور آج ۴ / دسمبر کی صبح آل انڈیا ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوئی ہے کہ وزیر اعلیٰ یوپی کلیان سنگھ نے یوپی کے اسکولوں میں وندے ماترم گیت پڑھنے کو لازم قرار دینے کے سلسلے میں وزیر تعلیم یوپی رویندر شکلا کا بیان گمراہ کن ہے، اور اس بارے میں کوئی "جی او" جاری نہیں کیا گیا ہے اسی الزام میں وزیر مذکور کو روزارت سے برطرف بھی کر دیا گیا ہے۔ جب کہ وزیر کا کہنا ہے کہ جی او جاری کیا گیا تھا اور سخت احتجاج کو دیکھتے ہوئے اسے واپس لے لیا گیا ہے، بحمد اللہ دارالعلوم کے فتوے اور دیگر قائدین کے متفقہ موقف کی بڑی کامیابی ہے کہ حکومت اپنا اہم فیصلہ واپس لینے پر مجبور ہوئی۔

اظہار خیال مندوبین کرام:

دوسری نشست میں حضرات مندوبین کرام نے بھی متعلقہ موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا:

جناب مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی گجرات، رکن مجلس عاملہ رابطہ مدارس عربیہ دارالعلوم دیوبند نے فرمایا:

سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ارباب مدارس حالات کا صحیح اندازہ کریں، دنیا میں اس وقت سب سے بڑی طاقت میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی ہے، یہودی قوم چھوٹی سی قوم ہے، سال گذشتہ مجھے امریکا میں بتایا گیا کہ امریکا میں چھوٹے چھوٹے قصبات میں یہودی دفاتر موجود ہیں اگر کسی

بھی اخبار میں کسی یہودی شخص، یا یہودی تنظیم کے بارے میں کوئی خبر شائع ہوتی ہے تو وہ فوراً فیکس کے ذریعے نیویورک میں اپنے مرکزی دفتر کو اطلاع کرتے ہیں اور دوسرے دن اخبارات میں اس کی تردید شائع ہو جاتی ہے، ہمارا رابطہ ایسا مضبوط ہونا چاہیے کہ آج اگر گجرات میں بنگال یا بہار میں مدارس کے خلاف کوئی بات شائع ہوتی ہے تو شام تک دیوبند اس کی خبر ہو جانی چاہیے اور یہاں مرکز میں ادارہ اتنا فعال ہو کہ فوراً اس پر کوئی رائے ظاہر کرے، کوئی حکمت عملی وضع کی جائے" ۹

جناب مولانا مفتی عبدالرزاق صاحب بھوپال رکن مجلس عاملہ رابطہ نے فرمایا:

"اسلام دشمن تمام طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کو نسیت ونابود کرنے پر تلی ہوئی ہیں اس کے لیے انہوں نے تین پروگرام بنائے ہیں، (۱) پہلا پروگرام جو بہت آسان ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو سود میں لگادیا جائے، (۲) دوسرا پروگرام جو مشکل ہے وہ یہ ہے کہ مسلم عورتوں کو بے پردہ کر دیا جائے اور (۳) تیسری بات جو بڑی مشکل ہے وہ یہ ہے کہ مسلم علماء اور مدرسوں کو بدنام کیا جائے۔

ہم نے ابتک دفاع کیا ہے لیکن اب ہمیں اقدام کرنا ہے، حملہ کرنا ہے، اور اس کے لیے ہمیں تین ہتھیار اپنانے ہیں (۱) تقویٰ (۲) توکل (۳) صبر، قرآن کریم نے ان تین چیزوں کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ اور ان تینوں چیزوں کا تقاضہ ہے کہ ہم حکومت کی امداد نہ لیں۔

جناب مولانا رحیم الدین انصاری معتمد دارالعلوم حیدرآباد نے تجویز پیش

کی کہ: حکومت ہند نے ایک قانون (.F.C.R.A غیر ملکی تعاون رجسٹریشن ایکٹ) ۱۹۷۶ء میں بنایا ہے جس کی رو سے ہر اس ادارے کو جو باہر سے امداد کا خواہاں ہو، وزارت داخلہ سے رجسٹرڈ کرانا پڑتا ہے، مسلم اداروں کو خصوصاً دینی مدارس کو حکومت ہند اس قانون کے تحت رجسٹرڈ نہیں کر رہی ہے اور بہت زیادہ پریشان کرتی ہے، براہ کرام اس خصوص میں غور فکر کر کے کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ دینی مدارس اس پریشانی سے چھٹکارا حاصل کر سکیں"

جناب مولانا زین العابدین صاحب استاذ تخصص فی الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور

نے اظہار خیال فرمایا: کہ "اللہ سبحانہ تعالیٰ نے قسم کھا کر فرمایا ہے "لقد خلقنا الانسان فی کبد" مشقت میں انسان کو پیدا ہی کیا گیا ہے، اس لیے مصائب آنے ہیں، اور انہیں جانا بھی ہے کیونکہ ہر عارضی چیز جانے ہی کے لئے ہوتی ہے، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ آج ہماری حفاظت خوداختیاری ہم سے چھینی جارہی ہے، ضرورت ہے کہ ہم اپنی خوداختیاری کی حفاظت کیلئے کھلی تحریک شروع کریں، اسلحہ رکھنے کی اجازت

حاصل کریں، ہر ایک شخص کو یہ حق ہے کہ اگر اس پر حملہ کیا جائے تو وہ اپنی پوری حفاظت کرے دفاع کرے، (۲) دوسری بات یہ ہے کہ یہ جو کہا جارہا ہے کہ ہم سرکاری ایڈ لیں گے تو حکومت ہمارے مدارس پر قبضہ کر لے گی میرے نزدیک یہ درست نہیں ہے، حکومت جو رقم دیتی ہے وہ صرف دھوتی باندھنے والوں کی نہیں ہوتی اس میں مسلمانوں کی کمائی بھی شامل ہوتی ہے اس لیے یہ ایڈ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے حکومت کی نیت اگر خراب ہوگی تو اس کی زد میں ایڈ لینے والے اور نہ لینے والے دونوں طرح کے مدرسے آئیں گے جیسا کہ ندوۃ العلماء کے ساتھ ہوا ہے۔

جناب مولانا کبیر الدین فاران مظاہری مسّر والا، ہماچل پردیش:

نے ان الفاظ میں اظہار خیال فرمایا:

حکومت یہ ثابت کرنیکی کوشش کررہی ہے کہ مدارس اسلامیہ ملک دشمن افراد تیار کررہے ہیں، مدارس کے طلبہ کو دہشت گرد قرار دیا جارہا ہے، حالانکہ یہ مدارس ہی ہیں جو امن، محبت اور شانتی کی تعلیم دیتے ہیں مدرسہ میں حب الوطنی کا سبق دیا جاتا ہے کوئی نہیں ثابت کرسکتا کہ کبھی دارالعلوم کے طلبہ نے ریلوے کی پٹری اکھاڑی ہو، اس کے علاوہ جو اسکول ہمارے برادران وطن کی نگرانی میں چلتے ہیں، وہ دہشت گردی میں مبتلا ہیں، پاکستان سے اسلحہ کون فراہم کرتا ہے، ملک کے خفیہ راز کون فروخت کرتا ہے، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، مدارس کے ذمہ دار حضرات سے گذارش ہے کہ وہ علاقے کے انتظامی افسران سے رابطہ رکھیں کبھی کبھی انہیں مدرسوں میں دعوت دے کر صحیح صورت حال انہیں بتائی جائے، طلبہ سے انہیں ملایا جائے اس سے غلط فہمیاں دور ہوں گی۔،،

جناب مولانا عبدالغنی صاحب ازہری کشمیری، بادشاہی باغ

کی رائے تھی کہ "ہمارے پاس مدارس میں قوم کے ایک فیصد بچے آتے ہیں باقی ۹۹ رفی صد انگلش میڈیم، ہندی میڈیم اسکولوں میں چلے جاتے ہیں، ان کی تعلیم وتربیت کا ہمیں کوئی نظام بنانا چاہئے کشمیر میں ہمارے ۱۶ ر ہزار بچے عیسائی اسکولوں ۶ ر ہزار بہائی و قادیانی اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور دینی مدارس میں چار ہزار سے زیادہ بچے آتے ہیں ان بچوں کے لیے ایک بنیادی نصاب کی ضرورت ہے جس میں جدید علوم کو سمودیا جائے،،

جناب مولانا توحید مظاہری، مدرسہ رحمانیہ سپول بہار نے فرمایا:

حضرت مولانا محمد ولی رحمانی جو جلسہ دستار بندی کی وجہ سے اس اجتماع میں تشریف نہیں لائے ہیں مجھے تاکید کی تھی کہ میں یہ تجویز اجلاس میں پیش کروں کہ: جب مدارس پر یہ الزام لگایا جائے کہ یہ دہشت گردی کا اڈہ ہیں، آئی ایس آئی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز ہیں تو الزام لگانے والے

کے خلاف فوراً ایف آئی آر کیا جائے، اس پر اچھے نتائج مرتب ہوں گے"

جناب مولانا مجاہدالاسلام قاسمی، ناظم تعلیمات جامعہ اسلامیہ جلالیہ ہوجائی آسام

نے تجویز پیش کی کہ: (۱) رابطہ مدارس عربیہ کو فعال بنانے اور اس کے ماتحت مدارس کے نظام تعلیم و تربیت کو بہتر بنانے کے لیے ہر صوبے میں ایک صوبائی رابطہ کمیٹی قائم کی جائے۔

(۲) مرکزی دفتر رابطہ مدارس عربیہ کی طرف سے ہرسال مربوط مدارس کے تعلیمی معائنہ کا نظم کیا جائے۔

(۳) مدارس کی چند جماعتوں کا سالانہ امتحان، یکجا، دار العلوم دیوبند کی نگرانی میں لیا جائے"

ان کے علاوہ جن حضرات نے اظہار خیال فرمایا ان میں مفتی محبوب علی صاحب مفتی شہر رامپور، مولانا صدیق اللہ صاحب چودھری، مولانا شمس الدین صاحب نانوتہ، مولانا احسن اللہ صاحب، جامعہ مدینۃ العلوم معماری بردوان، مولانا سمیع الدین صاحب اشرف العلوم لکھیم پور مولانا اظہار الحق صاحب اشرف العلوم سیتامڑھی، مولانا سمیع اللہ صاحب کلید العلوم عمری کلاں اور مولانا شمیم احمد صاحب مدرستہ اشرف العلوم چرتھاول کے اسماء گرامی شامل ہیں۔

تجاویز

مندوبین کرام کے اظہار خیال کے بعد تجاویز کا سلسلہ شروع ہوا پہلی تجویز جو مدارس کی مشکلات اور ان کے خلاف حکومت کی منفی پالیسی سے متعلق تھی، حضرت مولانا مفتی عبد الرزاق صاحب بھوپالی نے پیش کی۔

تجویز میں کہا گیا ہے کہ "رابطہ مدارس عربیہ کا کل ہند اجتماع مدارس عربیہ کی پیش آمدہ مشکلات کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے، اور مدارس عربیہ کے خلاف لگائے جانے والے بے بنیاد غلط الزامات...... کو ایک منظم و منصوبہ بند سازش خیال کرتا ہے،... کل ہند اجتماع مدارس عربیہ کے خلاف اس طرح کی سازشوں کی پرزور مذمت کرتا ہے۔..... نیز حکومت ہند سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ مدارس اسلامیہ کے خلاف اس قسم کی سازشی مہم کو بالکلیہ فوری طور پر بند کیا جائے۔

دوسری تجویز جو سرکاری امداد سے احتراز کے متعلق تھی اور جس میں مدارس عربیہ کو سازشوں سے ہوشیار رہنے اور حکومت سے کسی بھی طرح کا مالی تعاون حاصل کرنے سے احتراز کرنے کی تاکید کی گئی تھی، جناب مولانا صدیق اللہ چودھری کلکتہ نے پیش کی۔

تیسری تجویز میں کہا گیا ہے تھا، مدارس عربیہ کا یہ کل ہند اجتماع ربط باہمی اور اس کے استحکام کو مفید ضروری اور وقت کا اہم تقاضا سمجھتا ہے، رابطے کی طرف سے منظور شدہ تجاویز کی روشنی میں

رابطہ مدارس عربیہ کی مجلس عاملہ کی تشکیل دستور ساز کمیٹی کا انعقاد، مدارس عربیہ کے دورے کے لیے وفود کی ترتیب اور تدریب المعلمین کے سلسلے میں عمل اقدامات کو بنظر استحسان دیکھتا ہے، اور رابطہ مدارس عربیہ کے لیے حوصلہ افزا تصور کرتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ رابطے کے مجوزہ تعلیمی و تربیتی نظام کو اپنے اپنے مدارس میں لازمی طور پر نافذ کریں اور اپنا فرض منصبی ادا کرنے کی کوشش کریں اور مرکزی دفتر سے مزید ارتباط پیدا کریں، یہ تجویز جناب مولانا ممتاز صاحب شملہ نے پڑھی۔

چوتھی تجویز حضرت مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی نے پیش کی، اس تجویز میں اسلام دشمن طاقتوں، عیسائی مشنریوں اور قادیانیوں کے مقابلے اور ان کے رد کے لیے افراد سازی اور طلبہ کی تربیت پر زور دیا گیا ہے۔

پانچویں تجویز میں اصلاح معاشرہ کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا گیا ہے، یہ تجویز جناب مولانا بیر الدین صاحب فاران مظاہری ہماچل پردیش نے پڑھی۔

چھٹی تجویز حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب نعمانی، رکن شوریٰ دارالعلوم نے پیش کی اس میں ہندوستان میں مذہبی تعلیم کے خواہاں دینی طلبہ کو تعلیمی ویزا دینے کا حکومت ہند سے مطالبہ کیا گیا ہے یہ تمام تجاویز شرکاء اجتماع نے مکمل اتفاق رائے سے منظور کیں ان تجاویز کا مکمل متن رسالہ دارالعلوم کے نومبر ۱۹۹۸ء کے شمارے میں شائع کیا جا چکا ہے۔

خطاب حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ

آخر میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب استاذ حدیث دارالعلوم نے سرکاری امداد سے اجتناب کے موضوع پر اپنے پراثر خطاب سے مستفید فرمایا حضرت مولانا نے اولاً توکل کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس کے شرائط بیان فرمائے اس سلسلے میں آپ نے فرمایا توکل ہمارا قیمتی سرمایہ ہے، اصول ہشتگانہ میں اصل چیز جو مدارس کے لیے ضروری ہے وہ توکل ہی ہے سرکاری امداد سے اجتناب ضروری ہے مستقل آمدنی نہیں ہونی چاہئے ورنہ اصل سرمایہ رجوع الی اللہ ختم ہو جائے گا۔ بار بار یہاں کی حکومت نے دارالعلوم کو امداد دینے کی خواہش کی لیکن ہمارے اکابر نے انکار فرمادیا آپ نے حکومتی امداد کے نقصانات پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ اگر ہم حکومت کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے تو دین کے لئے کچھ نہیں کرسکتے۔ اس امداد میں بے شمار خرابیاں ہیں جاننے والے جانتے ہیں کہ حکومت کی امداد پر چلنے والے اداروں کا پورا عملہ حکومت کا دست نگر بن کر رہ جاتا ہے، اس میں رشوت بھی دینی پڑتی ہے حالانکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے "لعن اللہ الراشین الخ" ہمیں یہ تہیا کرنا چاہئے کہ ہم تعلیم و تعلم کا یہ کام رضاء الٰہی کے لیے کریں گے اللہ تعالیٰ پر توکل کریں گے اللہ تعالیٰ بلا سبب بھی عطا کرتا ہے ہم سلف صالحین کے نقش قدم پر چلیں گے، حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ کی دعا پر پونے گیارہ بجے شب میں اجتماع کی

سری نشست اختتام پذیر ہوئی مجلس عاملہ رابطہ اور کل ہند اجتماع کی دونوں نشستوں کی نظامت حضرت لانا قاری محمد عثمان مدظلہ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے فرمائی۔

تماع کی کامیابی کے لیے انتظامی کمیٹیاں:

اجتماع کے امور بخیر و خوبی انجام دینے کے لیے متعدد انتظامی کمیٹیاں تشکیل دی گئی تھیں اور امی قدر محترم حضرت اقدس مہتمم صاحب دامت برکاتہم کی زیر سرپرستی ان کمیٹیوں کی حسن کارکردگی بدولت اجتماع کامیابی سے ہم کنار ہوا، حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب، صدر المدرسین مدظلہ وگرام کمیٹی کے کنوینر تھے، اس کمیٹی نے مجلس عاملہ رابطہ اور کل ہند اجتماع کی دونوں نشستوں پروگرام مرتب کیا جس کے مطابق کاروائی عمل میں آئی اور اجتماع کو کامیاب بنانے میں مدد ملی، حضرت ولانا سید ارشد صاحب، مدنی طعام کمیٹی و تیاری طعام کمیٹی کے کنوینر تھے، لیکن حضرت والا کے سفر کے ش نظر حضرت مولانا محمد امین صاحب پالن پوری، طعام کمیٹی اور جناب مولانا مزمل صاحب آسامی باری طعام کمیٹی کے کنوینر قرار پائے دونوں حضرات کے حسن انتظام کی بدولت مہمانان کرام نے خوش القہ ناشتہ و کھانا تناول فرمایا، قیام کمیٹی کے کنوینر جناب مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی تھے، ولانا موصوف نے جناب قاری فخر الدین صاحب و دیگر ارکان کے تعاون سے مہمانوں کے قیام اور ان کی احت رسانی کا معقول بندوبست کیا، حضرت مولانا قمر الدین صاحب فراہمی اجناس اور جناب مولانا محمد مال صاحب گوشت کمیٹی کے ذمہ دار تھے، ان حضرات کی بھرپور دلچسپی کے سبب متعلقہ امور باحسن جوہ انجام پذیر ہوئے۔

قیام گاہوں کے سامان اور لائٹ وغیرہ کے امور کے ذمہ دار جناب مولوی عبد الولی صاحب تھے، انہوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ان امور کا انتظام کیا۔

جناب عادل صدیق صاحب نشر و اشاعت کمیٹی کے کنوینر تھے، موصوف نے اپنے ارکان جناب مولانا کفیل احمد صاحب اور جناب منشی اشرف عثمانی صاحب کے تعاون سے اخبارات میں اجتماع کی اچھی پورٹنگ کی متعدد اردو، ہندی، اور انگریزی اخبارات نے اجتماع کی کاروائی شائع کی، اسٹیج کمیٹی کے ذمہ ار جناب مولانا محمد خضر صاحب کشمیری قرار پائے، موصوف نے اپنی نفاست طبع کو کام میں لاکر اسٹیج اور جلسہ گاہ ا بہترین نظم کیا،

استقبالیہ کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے راقم الحروف کا نام طے کیا گیا تھا، الحمد للہ حضرت مولانا قاری مد عثمان صاحب کے مشوروں اور جناب مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری اور دیگر ارکان استقبالیہ کے تعاون سے یہ مرحلہ بھی بآسانی طے ہوا اسٹیشن پر حضرات اساتذہ کی نگرانی میں مہمانوں کے استقبال اور گاڑیوں کے

ذریعے انہیں دارالعلوم پہونچانے کا بہترین انتظام تھا مہمانوں کے اندراج کے لیے دفتر استقبالیہ کے پاس تین اندراج کاؤنٹر بنائے گئے تھے۔ اندراج کا نظم حضرات اساتذہ کی نگرانی میں انجام پارہا تھا، مندوبین کرام کو اندراج کے وقت فائل دی گئی جس میں رسالہ دارالعلوم کا خصوصی شمارہ، دارالعلوم دیوبند کے جامع تعارف پر مشتمل کتابچہ اور رابطہ مدارس عربیہ کے تعارف، اجتماعات کی روداد اور سرگرمیوں پر مشتمل کتابچہ دفتر تحفظ ختم نبوت کی بارہ سالہ رپورٹ اور "قادیانیت کا تعاقب کیسے کریں" نامی کتابچہ شامل تھا۔ مندوبین کو دیئے گئے لٹریچر کی طباعت میں جناب مولانا طالب حسن صاحب دفتر محافظ خانہ کا خصوصی تعاون شامل رہا۔

الحمد للہ یہ اجتماع بے حد کامیاب و نتیجہ خیز رہا اس کے اچھے اثرات مرتب ہوئے، اجتماع میں تقریباً دو ہزار نمائندگان مدارس نے شرکت کی، مشاہیر اور مدعوین خصوصی میں، حضرت مولانا سید اسعد مدنی، حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب سہارنپور، حضرت مولانا محمد سلمان صاحب مظاہری، حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب، بنارس حضرت مولانا عبد العزیز صاحب، حیدرآباد، حضرت مولانا محمد ازہر صاحب رانچی، حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی، حضرت مولانا عبدالرزاق صاحب، بھوپالی، حضرت مولانا رشید الدین صاحب مرادآباد، حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی گجرات، حضرت مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی، حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب بحیثیت نمائندہ خصوصی حضرت مولانا ابو الحسن علی میاں صاحب ندوی، حضرت مولانا مفتی عبدالرحمٰن صاحب دہلی، جناب مولانا حکیم عرفان اللہ صاحب کلکتہ جناب مولانا عبدالرشید صاحب آسام، جناب مولانا مفتی خیر الاسلام صاحب آسام، جناب مولانا مفتی اشفاق صاحب اعظم گڈھ، جناب مولانا صدیق اللہ صاحب چودھری کلکتہ، جناب مفتی خلیل صاحب مہاراشٹر، جناب مولانا حیات اللہ صاحب بہرائچ، جناب مولانا کبیر الدین صاحب فاران ہماچل پردیش، کے نام شامل ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ جل شانہ رابطہ مدارس عربیہ کو استحکام بخشیں اور اسے مدارس کے نظام تعلیم و تربیت کو فعال بنانے اور مدارس کے مابین ربط و اتحاد کو فروغ دینے کا ذریعہ بنائیں (آمین)

حامداً ومصلیا! حضور ﷺ نے طلبہ عزیز کے ساتھ خیر خواہی کی وصیت فرمائی ہے، آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

اِنَّ رِجالاً یَاتُونَکُم مِن اَقطَارِ الاَرَضِ یَتَفَقَّھُونَ فِی الدِینِ فَاِذَااَتَو کُم فَاستو صُوابھم خَیراً (رواہ الترمذی)

ترجمہ: بیشک بہت سے لوگ زمین کے گوشہ گوشہ سے علم دین میں تفقہ حاصل کرنے کے لئے تمہارے پاس آئیں جب وہ آئیں تو تم ان کے بارے میں خیر خواہی کی وصیت قبول کرو۔

اس لئے طلبہ عزیز کے ساتھ خیر خواہی تمام مدارس عربیہ کے ذمہ داروں کا فرض اولین ہے، طلبہ عزیز کے لیے بہتر تعلیم، عمدہ تربیت، اچھا انتظام اور حسب استطاعت راحت رسانی خیر خواہی کے ضمن میں آتی ہے اور الحمد للہ مدارس عربیہ کے ذمہ داراس وصیت پر عمل پیرا ہیں، ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس کی ترقی علم وفن کی ترقی دین کی ترقی اور مسلمانان عالم کی ترقی ہے۔ ان ہی چیزوں کے پیش نظر ذمہ داران مدارس کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ وہ طلبہ کی استعداد سازی پر سب سے زیادہ توجہ فرمائیں اور دارالعلوم میں جس جماعت میں داخلہ کا ارادہ ہے وہاں تک قابل اعتماد استعداد کا پیدا ہو جانا دارالعلوم میں حاضری سے پہلے ضروری سمجھیں اور اسی لیے چند سالوں سے ماہ رجب المرجب ہی میں ضروری اصول وضوابط کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ آپ حضرات سے درخواست ہے کہ ان چیزوں پر عملدرآمد کے سلسلہ میں خدام دارالعلوم کا تعاون فرمائیں۔

عربی درجات میں جدید داخلے کے قواعد:

(۱) دارالعلوم دیوبند میں عربی درجات کے طلبہ کی تعداد ڈھائی ہزار ہوگی، جن میں دارالافتاء تکمیلات، کتابت، دارالصنائع کے شعبے قدیم طلبہ کے لئے ہیں۔ بقیہ شعبوں میں قدیم طلبہ کے بعد جو

عدد باقی بچے گا اس کو جدید طلبہ سے مقابلہ کے امتحان کے ذریعہ پُر کرلیا جائے گا یعنی ہر جماعت
مقررہ تعداد کو اونچے نمبرات سے شروع کر کے پورا کیا جائے گا۔

(۲) آنے والے جدید طلباء سب سے پہلے فارم برائے شرکت امتحان داخلہ پُر کریں گے۔
فارم انہیں دفتر تعلیمات سے ۸ر شوال کی شام تک دیا جائے گا واپسی ۹ر شوال کی شام تک ضروری ہوگی

(۳) سال اول دوم کے لیے امتحان داخلہ تقریری ہوگا، تقریری امتحان سے پہلے اردو املا
کا تحریری امتحان ہوگا۔

(۴) سال سوم کے امیدوار جدید طلبہ کا نفحۃ الادب اور ہدایۃ النحو اور نور الایضاح کا تحریری
امتحان ہوگا بقیہ تمام کتابوں کا تقریری ہوگا اور عربی کے سال اول سال دوم اور سال سوم کا تقریری
امتحان ۱۱ر ۱۲ر شوال میں ہوگا۔

(۵) سال چہارم سال پنجم سال ششم سال ہفتم اور دورۂ حدیث کے امیدواروں کا امتحان
داخلہ تحریری ہوگا، امتحان ۱۱ر شوال المکرم سے شروع ہوگا۔

(۶) شعبہ دینیات کے قدیم طالب علم کے لیے سال اول عربی میں داخلہ کے واسطے
پرائمری درجہ پنجم کی سند ضروری ہوگی۔ نیز ان طلبہ کا فارسی حساب اور اردو املاء کا امتحان لیا جائے گا
سال اول عربی کے لیے دار العلوم سے فارغ ہوکر آنے والے طالب علم کا اول عربی میں داخلہ کے لیے
امتحان نہیں ہوگا۔

اور داخلہ کے خواہشمند جدید طلبہ کے لیے پرائمری درجۂ پنجم کے مضامین کی صلاحیت
ضروری ہوگی اور فارسی اردو املا اور رسم الخط اور صرف و نحو کی اصطلاحات کی جانچ ہوگی۔

سال چہارم، سال پنجم، سال ششم، سال ہفتم اور دورۂ حدیث کے لیے پچھلے درجات کی
تمام کتابوں کا امتحان تحریری ہوگا۔ سال چہارم کے لیے قدوری (از کتاب البیوع تا ختم) ترجمہ القرآن
(سورہ ق آخر تک) تہذیب، نفحۃ العرب اور کافیہ یا شرح شذور الذہب یا شرح جامی کا تحریری امتحان
ہوگا۔ سال پنجم کے لیے کنز الدقائق مع شرح وقایہ ثانی یا شرح وقایہ اول، دوم اصول الشاشی، تلخیص
المفتاح یا دروس البلاغۃ، ترجمۃ القرآن (آل عمران تا سورۂ مریم) یا سورۂ یوسف سے سورۂ ق تک) اور قطبی
کا تحریری امتحان ہوگا۔ سال ششم کے لیے ہدایہ اول، نور الانوار، مختصر المعانی، سلم العلوم، مقامات
حریری کا تحریری امتحان ہوگا۔

سال ہفتم کے لیے جلالین، ہدایہ ثانی، حسامی، میبذی، دیوان المتنبی کا تحریری امتحان
ہوگا درجہ ہفتم میں داخلے کے لیے قرآن کریم صحیح مخارج سے پڑھنا لازم ہوگا۔ اور دورۂ حدیث۔

لیے ہدایہ آخرین مشکوۃ شریف، شرح عقائد نسفی،نخبۃ الفکر اور سراجی کا تحریری امتحان ہوگا، نیز پارۂ عم صحیح مخارج کے ساتھ حفظ ہونا ضروری ہوگا اس کا امتحان بروقت لیا جائے گا۔

(نوٹ) اپنی سابقہ تعلیم کی کوئی سند بھی کسی کے پاس اگر ہو تو داخلہ فارم کے ساتھ منسلک کردیں۔

(۷) سال اول و دوم میں نابالغ بیرونی بچوں کا داخلہ نہ ہوگا۔

(۸) جو طالب علم اپنے ساتھ صغیر السن بچوں کو لائے گا ان کا داخلہ ختم کردیا جائے گا۔

(۹) جن امیدواروں کی وضع قطع طالب علمانہ نہ ہوگی مثلاً غیر شرعی بال، ریش تراشیدہ ہونا ٹخنوں سے نیچے پاجامہ ہونا یا دارالعلوم کی روایات کے خلاف کوئی بھی وضع ہو ان کو شریک امتحان نہ کیا جائے گا اور اس سلسلے میں کوئی رعایت نہیں کی جائیگی۔

(۱۰) سرحدی صوبوں میں آسام و بنگال کے امیدواروں کو تصدیق نامہ وطنیت پیش کرنا ضروری ہوگا۔

تصدیق نامہ وطنیت میں گورنمنٹ اسکول کی ٹی سی یا راشن کارڈ یا شناختی کارڈ برائے ووٹ اور یا ہندوستانی پاسپورٹ کا مصدقہ فوٹو اسٹیٹ کاپی پیش کرنا لازم ہوگا۔ اصل کاپی دیکھنے کے لئے طلب جاسکتی ہے اس لئے اصل کاپی بھی ہمراہ لائیں۔

(۱۱) جدید امیدواروں کو لازم ہوگا کہ وہ دارالعلوم میں آتے وقت تاریخ پیدائش کا سرٹیفکٹ لے کر آئیں یہ سرٹیفکٹ کارپوریشن میونسپل بورڈ ٹاؤن ایریا یا گرام پنچایت نامہ کا ہونا ضروری ہے۔

(۱۲) جدید امیدواروں کے لئے سابقہ مدرسہ کا تعلیمی و اخلاقی تصدیق نامہ، اور مارک شیٹ (نمبرات کتب) پیش کرنا ضروری ہوگا۔

(۱۳) نجی تصدیقات یا سماعت وغیرہ کا اعتبار نہ ہوگا۔

(۱۴) غیر ملکی امیدوار تعلیمی ویزا لے کر آئیں ٹورسٹ ویزا پر داخلہ نہیں ہو سکے گا فارم برائے شرکت امتحان کے ساتھ پاسپورٹ و ویزا کی فوٹو اسٹیٹ پیش کریں۔

(۱۵) بنگلہ دیشی امیدواران تعلیمی ویزا کے علاوہ حسب ذیل علماء کرام سے تصدیق بھی لے کر آئیں۔ (۱) مولانا شمس الدین صاحب قاسمی جامعہ ارض آباد میرپور ڈھاکہ۔ (۲) مولانا حافظ عبد الکریم صاحب محلہ چوکی دیکھی سلہٹ، بنگلہ دیش۔

(۱۶) کیرالہ کے امیدواران مندرجہ ذیل علمائے کرام کی تصدیق لے کر آئیں (۱) مولانا نوح صاحب (۲) مولانا حسین مظاہری (۳) مولانا محمد کویا قاسمی۔ یہ تصدیقات درخواست برائے شرکت امتحان کے ساتھ فوٹو اسٹیٹ کی شکل میں پیش کرنی ہوں گی داخلہ فارم کے اجراء پر اصل

تصدیقات پیش کرنا ضروری ہوں گی۔ تنبیہ: طلبہ کو خاص طور پر یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ امتحان کی کاپیاں کوڈ نمبر ڈال کر ممتحن کو دی جاتی ہیں۔ اس لئے امیدوار صرف ان ہی درجات کا امتحان دیں جن کی وہ تیاری کر چکے ہیں۔ بوقت داخلہ جدید فارم میں جو پتہ لکھا جائے گا اس میں آئندہ کبھی بھی کسی طرح کی ترمیم نہ ہوگی۔

قدیم طلبہ کے لئے:

(۱) تمام قدیم طلبہ کے لیے ۲۰؍ شوال تک حاضر ہونا ضروری ہے۔

(۲) جو طلبہ تمام کتابوں میں کامیاب ہوں گے ان کو ترقی دی جائے گی جو طلبہ دو کتابوں میں ناکام ہوں گے ان کا ضمنی امتحان داخلہ کے ساتھ لیا جائے گا بصورت کامیابی ترقی دی جائے گی ورنہ بالامداد سال کا اعادہ کر دیا جائے گا اعادۂ سال کی رعایت صرف ایک سال کے لئے ہوگی اور اگر دوسرے سال بھی اعادہ کی نوبت آئی تو داخلہ نہیں ہو سکے گا۔

(۳) عربی سال اول میں مشق تجوید کے اور سال دوم میں جمال القرآن کے نمبرات بسلسلہ ترقی درجہ اوسط میں شمار ہوں گے بقیہ سالوں میں تجوید و کتابت کے نمبرات بسلسلۂ ترقی درجہ اوسط میں شمار نہ ہوں گے۔ البتہ فوائد مکیہ اور صرف عربی کے نمبرات ترقی و اجراء امداد کے سلسلہ میں شمار کئے جائیں گے۔

(۴) حسب تجویز مجلس شوریٰ شعبان ۱۴۱۷ھ بقائے امداد کے لئے اوسط لانا ضروری ہوگا۔

(۵) تکمیل ادب میں صرف ان فضلاء کا داخلہ ہو سکے گا جن کا دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں اوسط کامیابی ۴۴ ہو اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ ہو۔

(۶) امیدواروں کے زیادہ ہونے کی صورت میں نمبرات اور انٹرویو کو وجہ ترجیح بنایا جائے گا۔

(۷) ایک تکمیل کے بعد دوسری تکمیل کے لیے ضروری ہوگا کہ امیدوار نے سابقہ تکمیل میں کم از کم ۴۵ اوسط حاصل کیا ہو اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ رہا ہو۔

(۸) ایک تکمیل کی درخواست دینے والے دوسری تکمیل کے امیدوار نہ ہو سکیں گے الا یہ کہ ان کے درجہ تکمیل میں تعداد پوری ہونے کے سبب ان کا داخلہ نہ ہو سکا ہو۔

(۹) دارالافتاء کے فضلاء کا کسی شعبہ میں داخلہ نہ ہوگا۔

(۱۰) جس کی کوئی بھی شکایت دارالاقامہ، تعلیمات یا اہتمام میں کسی بھی وقت درج ہوئی ہو اس کو دورۂ حدیث کے بعد کسی بھی شعبہ میں داخل نہیں کیا جائے گا۔

(۱۱) کسی بھی شعبہ میں داخلہ لینے والے قدیم فضلاء کو فراغت کے بعد ہی سند فضیلت دی جائے گی۔

(۱۲) کسی بھی تکمیل میں علاوہ افتاء کے داخلہ کی تعداد ۲۰؍ سے زائد نہ ہو گی اور وہ تعداد مقابلہ کے نمبرات کے ذریعہ پوری کی جائے گی۔

دیگر شعبوں کے بارے میں:

دارالعلوم دیوبند کا بنیادی کام اگرچہ عربی دینیات کی تعلیم ہے، لیکن حضرات اکابر نے مختلف دینی اور دنیوی فوائد اور مصالح کے پیش نظر متعدد شعبے قائم فرمائے، شعبۂ تجوید حفص اردو عربی خوشنویسی، دارالصنائع وغیرہ، ان شعبوں میں داخلہ کے لئے درج ذیل قواعد پر عمل ہو گا۔

دارالافتاء:

(۱) دارالافتاء میں داخلہ کے امیدواروں کے لیے وضع قطع کی درستگی کی اہمیت سب سے زیادہ ہو گی اس میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

(۲) دورۂ حدیث سے دارالافتاء کے لیے صرف وہ طلبہ امیدوار ہوں گے جن کا اوسط کامیابی ۴۵؍ ہو گا۔

(۳) کسی بھی تکمیل سے دارالافتاء میں داخلے کے امیدوار کے لیے سابقہ تکمیل میں اوسط ۴۶؍ حاصل کرنا ضروری ہو گا۔

(۴) دارالافتاء میں داخل کی تعداد ۲۵ سے زائد نہ ہو گی اور کوشش کی جائے گی کہ معیار مذکور کو پورا کرنے والے ہر صوبہ کے طلبہ کو داخلہ دیا جائے۔ لیکن اگر کسی صوبہ سے کوئی امیدوار مندرجہ بالا شرائط کا حامل نہ پایا گیا تو دوسرے صوبوں سے یہ تعداد پوری کر لی جائے گی، ان ۲۵ طلبہ کی امداد جاری ہو سکے گی۔

(۵) دارالافتاء میں ممتاز نمبرات سے کامیاب ہونے والے دو طلبہ کا انتخاب تدریب الافتاء کے لیے کیا جائے گا یہ انتخاب دو سال کے لیے ہو گا اور ان کا وظیفہ ۸۰۰ روپے ماہوار ہو گا۔

شعبۂ دینیات، اردو، فارسی شعبہ حفظ قرآن:

(۱) شعبۂ دینیات اردو، فارسی اور شعبہ حفظ میں مقامی بچوں کو داخلہ دیا جائے گا۔

(۲) دینیات کے درجہ اطفال شعبہ ناظرہ اور شعبہ حفظ میں مقامی بچوں کا داخلہ ہر وقت ممکن ہو گا۔

(۳) دینیات کے بقیہ درجات میں داخلہ ذی الحجہ کی تعطیل تک کیا جائے گا اس کے بعد داخلہ نہیں کیا جائے گا۔

قرأت سبعہ عشرہ :

(۱) اس درجہ میں داخل کے لیے حافظ ہونا ضروری ہے اور یہ کہ وہ عربی کی سال چہارم تک کی جید استعداد رکھتے ہوں۔

(۲) اس درجہ میں داخل طلبہ کے لیے حفص عربی سے فارغ ہونا ضروری ہے اور ان کی تعداد دس سے زائد نہ ہوگی اور ان دس کی امداد مع وظیفہ خصوصی جاری ہو سکے گی۔

شعبۂ خوشنویسی:

(۱) اس درجہ میں داخل طلبہ کی تعداد تیس ہوگی اور ان کی امداد جاری ہو سکے گی۔

(۲) داخلہ کے امیدوار میں فضلاء دارالعلوم کو ترجیح دی جائے گی۔

(۳) شعبہ میں مکمل داخلہ کے امیدواروں کو امتحان داخلہ دینا ضروری ہوگا اور صرف اس فن کی ضروری صلاحیت رکھنے والوں کو داخل کیا جائے گا۔

(۴) قدیم طلبہ اگر فن کی تکمیل نہیں کر سکے ہیں تو ناظم شعبہ کی تصدیق اور سفارش پر ان کا مزید ایک سال کے لیے غیر امدادی داخلہ کیا جائے گا بشرطیکہ کوئی شکایت نہ ہو۔

(۵) جو طلبہ مکمل امدادی یا غیر امدادی داخلہ لیں گے ان کو اوقات مدرسہ میں پورے چھ گھنٹے درسگاہ میں بیٹھ کر مشق کرنا ضروری ہوگا۔

(۶) جو طلبہ عربی تعلیم کے ساتھ کتابت کی مشق کر چکے ہوں اور ناظم شعبہ ان کی صلاحیت کی تصدیق کریں تو دورۂ حدیث کے بعد مکمل داخلہ اور امداد میں ان کو ترجیح دی جائے گی۔

(۷) تمام طلبہ کے لیے طالب علمانہ وضع اختیار کرنا ضروری ہے۔

(۸) پہلے نصف سال میں مقررہ تمرینات کی تکمیل نہ کی گئی تو داخلہ ختم کر دیا جائے گا۔

دارالصنائع

(۱) طالب علمانہ وضع قطع کے بغیر داخلہ نہیں لیا جائیگا۔

(۲) معلم دارالصنائع جن کی صلاحیت کی تصدیق کریں گے ان کو داخل کیا جائے گا۔

(۳) پہلے تین ماہ میں کام کی تکمیل نہ کی گئی تو داخلہ ختم کر دیا جائے گا۔

(۴) اس شعبہ میں دس سے زائد کا داخلہ نہ ہو سکے گا۔ اور ان سب کی صرف امداد طعام جاری ہو سکے گی۔

(۵) اوقات مدرسہ میں پورے وقت حاضر رہ کر کام کرنا ضروری ہوگا۔